شرحِ دلائل السلوک

قاسمِ فیوضات حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ، ضلع چکوال

التبیان فی مسائل السلوک والاحسان

شرح دلائل السلوک

قاسمِ فیوضات

حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ

شعبہ نشرواشاعت

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

Phone: +92-543-562200

darulirfanoffice1@gmail.com

www.naqshbandiaowaisiah.org

Scanned with CamScanner

مصنف دلائل السلوک

آپؒ کی پیدائش 1904 میں اپنے آبائی گاؤں چکڑالہ ضلع میانوالی میں ہوئی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم چک 10 بی، ضلع سرگودھا میں حاصل کی اور دورہ حدیث مدرسہ امینیہ دہلی 1933ء میں زیرِ سرپرستی مفتی کفایت اللہ مرحوم مکمل کیا۔ یونانی طب کے مطالعہ سے فارغ ہوکر درس وتدریس شروع فرمایا۔ 1936ء میں آپ نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا اور 24 برس کی مسلسل کاوشوں سے اس میں کمال حاصل کیا۔

1962ء میں آپ نے سالکین کی تربیت بطریق نسبت اویسیہ شروع فرمائی۔ آپ کے تربیت یافتہ آج دنیا کے کونے میں موجود ہیں جن میں سینکڑوں صاحب کشف وکرامت بھی ہیں اور اس کتاب کی تعلیم کی منہ بولتی تصویر بھی۔

آپ کی بیشتر زندگی مذاہب باطلہ کے ردّ میں گزری۔ آپ چوٹی کے مناظر رہے اور باطل فرقوں کو بے نقاب کرنے میں اپنی تقریر وتحریر کا بے دریغ استعمال فرمایا۔ عبداللہ چکڑالوی کے باطل مذہب کی بیخ کنی بھی آپؒ ہی کے حصہ میں آئی۔ اس ضمن میں آپ نے 'تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین'، 'الدین الخالص' اور 'ایمان بالقرآن' جیسی معرکۃ الآرا کتب تصنیف فرما کر اُمتِ مرحومہ کو کسی مزید تحقیق سے رہتی دنیا تک بے نیاز فرمادیا۔ تصوف کے موضوع پر قلم اٹھایا تو 'دلائل السلوک'، 'حیاتِ برزخیہ'، 'حیاتِ انبیاء' اور 'اسرار الحرمین' جیسے گوہر ہائے نایاب سالکین کے ہاتھ آئے۔

یہی مشاغل دمِ واپسیں تک آپ کی مبارک زندگی کا جزوِ لاینفک بنے حتیٰ کہ 18 فروری 1984ء بمطابق 18 جمادی الاول 1404ھ تقریباً 80 برس کی عمر میں آپ نے اسلام آباد میں دار الفنا کو خیر باد کہا اور 19 فروری 1984ء غروبِ آفتاب کے ساتھ ساتھ تصوف وسلوک کا یہ بحرِ بیکراں اپنے جملہ کمالات کے ساتھ ظاہری نظر سے اوجھل ہوکر اپنی آخری آرام گاہ موضع مرشد آباد، داخلی چکڑالہ میں موجزن ہوا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

Scanned with CamScanner

عرضِ حال

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَعَلٰى مَنْ تَبِعَهُمْ اَجْمَعِيْنَ...

تصوف اور صوفیائے کرام کے متعلق عوام بلکہ علماء کے دلوں میں بھی کچھ شبہات پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات وہ حضرات اس قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں کہ طریقت اور شریعت دو الگ چیزیں ہیں، یا اسلامی تصوف عجمی سریت اور باطنیت کے مترادف ہے، یا یہ کہ تصوف تکلیفاتِ شرعیہ سے آزادی کا نام ہے۔ ان غلط فہمیوں کے ازالہ اور عوام و خواص کی علمی تشفی کی خاطر اللہ رب العزت نے یہ کتاب تحریر کرنے کی توفیق عنایت فرمائی ہے۔

اگرچہ میری زندگی کا اکثر حصہ متکلمین کے نہج پر اسلام کی حقانیت کے اثبات اور فرقِ باطلہ کی تردید میں گزرا ہے اور کلامی مباحث اور تصوف و سلوک میں بظاہر تغائر اور بُعد نظر آتا ہے لیکن احقاقِ حق کے لئے علمِ کلام سے کام لینے اور تصوف کے ذریعے ایمان و یقین کی کیفیت پیدا کرنے میں فرق صرف دلیل سمعی اور دلیل ذوقی کا ہے۔ مگر بایں ہمہ لوگ یہ سن کر حیران ضرور ہوتے ہیں کہ وہ شخص جسے کل تک ہم ایک مناظر اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے جانتے تھے، آج تصوف، ذکر، حلقۂ ذکر، تزکیۂ نفوس اور منازلِ سلوک پر اظہارِ خیال ہی نہیں کر رہا بلکہ اپنا باطنی رشتہ صوفیائے کرام سے جوڑ رہا ہے، مگر ان کی حیرت پر تعجب ہوتا ہے کہ:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ... کیا وہی آپ کے ربّ کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟

اور اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ... یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

تبلیغ و اشاعتِ دین کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفوس کا کام انبیاء علیہم السلام سے لیا جاتا رہا۔ مگر نبی آخر الزمان ﷺ کی اس آخری امت میں اس کی ذمہ داری علمائے ربانیین پر عائد ہوتی ہے، جو ورثۃ الانبیاء ہیں اور ہر مادی اور الحادی دور کی تاریکیوں میں روشن چراغ کی مانند ہوتے ہیں۔ موجودہ دورِ پُرفتن میں اس ذمہ داری کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس دور میں اسلام کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی دینی پستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ سے ان کا ایمانی اور روحانی تعلق برائے

Scanned with CamScanner

نام ہی رہ گیا ہے۔ان کی اعتقادی خرابیوں اور عملی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ انہیں اس قعرِ مذلت سے نکال کر اور اس خوابِ غفلت سے جگا کر شریعتِ مطہرہ کے اتباع، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی طرف توجہ دلاتا ہے تو اس کی آواز پر لبیک کہنے کی بجائے الٹا اپنے آپ کو اوہام و تشکیک کی وادیوں میں دھکیل دیتے ہیں اور:

ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ... تاریکیوں پر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔

کی صورت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حق کی حفاظت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔اس کی رحمت یہ کب گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے۔چنانچہ ہر دور میں وہ اپنے خاص بندوں کے ذریعے حق کی حمایت اور اصلاحِ خلق کی خدمت لیتا رہا، اور صوفیائے کرام نے جس خلوص اور للّٰہیت سے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔

صوفیائے کرام کے ہاں تعلیم وارشاد اور تزکیہ و اصلاحِ باطن کا طریقہ القائی اور انعکاسی ہے اور یہ تصوف کا عملی پہلو ہے جس کا انحصار صحبتِ شیخ پر ہے۔بقول امام ربانیؒ مجدد الف ثانی، "تصوف کا تعلق احوال سے ہے، زبان سے بیان کرنے کی چیز نہیں"، مگر جہاں تک تصوف کے علمی پہلو کا تعلق ہے، صحیح اسلامی تصوف کے خدوخال کا تعین اور اس کی حقیقت سے علمی حلقوں کو روشناس کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ آج کل جس چیز کو تصوف کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پیش کیا جاتا ہے اسے تصوف اسلامی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ صحیح اسلامی تصوف کو بھی شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ عامۃ المسلمین کو صحیح اسلامی تصوف سے روشناس کرایا جائے جس کی اساس کتاب وسنت پر ہے تاکہ اس کی روشنی میں اپنی فکری اور عملی اصلاح کر کے ابدی فلاح حاصل کر سکیں۔اسی احساسِ فرض کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

قلزمِ فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خان مدظلہٗ

چکڑالہ (ضلع میانوالی)

یکم شعبان ۱۳۸۵ھ

Scanned with CamScanner

شارحِ دلائل السلوک

قاسمِ فیوضات حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوانؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں کہ آپؒ بین الاقوامی سطح پر سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ اور ایک تبحر عالمِ دین کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپؒ کے تعارف کے حوالوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ آپؒ مترجم قرآن ہیں، مفسّرِ قرآن ہیں اور معدودے چند مفسرین میں سے ہیں جنہیں قرآنِ پاک کی تین تفاسیر لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ شارحِ حدیث ہونے کے علاوہ تصوف پر لکھی گئی دو شہرۂ آفاق کتابوں ''مسائل السلوک'' (مصنفہ: مولانا اشرف علی تھانویؒ) اور ''دلائل السلوک'' (مصنفہ: مولانا اللہ یار خانؒ) کے شارح ہیں جس کی شرح اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔۔۔

قلزمِ فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خانؒ اس دور کے مجددِ طریقت ہیں جنہوں نے تصوف کے شفاف و دلآویز چہرے سے بدعات، رسومات اور غلط فہمیوں کی گرد جھاڑ کر اسے نئے سرے سے پوری آن بان کے ساتھ امت کے روبرو کیا۔ آپؒ نے جو محنتِ شاقہ و جہدِ مسلسل ان برکات و فیوضاتِ نبوت کو حاصل کرنے اور پھر اس بیش قیمت سرمایہ کو سالکین تک پہنچانے میں کی، وہ ایک الگ اور طویل تر داستان ہے۔۔۔ حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوانؒ جو اپنی اوائلِ عمری سے امت کے اس گم گشتہ خزانے کی تلاش میں ہر در اور دیار کی خاک چھان رہے تھے، تلاشِ بسیار کے بعد انہیں اپنا گوہرِ مقصود حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کی شکل میں ملا تو وہ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

یہ مریدِ باصفا جنہوں نے خود سالہا سال جہاں نوردی کے بعد اپنا گوہرِ مراد اپنے شیخ کی صورت میں پایا تھا، خود اپنے شیخ کی مراد ٹھہرے۔ حضرت مولانا اللہ یار خانؒ آپ کو اپنا مرید نہیں، اپنی 'مراد' فرمایا کرتے لیکن اُس وقت کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ علاقہ ونہار کے ایک عظیم عسکری پس منظر رکھنے والے خاندان میں پیدا ہونے والا یہ ہونہار سپوت آگے چل کر تصوف کا مردِ میدان ثابت ہوگا۔ ولایت کی اُن منزلوں کا راہی بنے گا جن پر صدیوں سے کسی کا نقشِ پا نہیں ملتا۔

اسلامی تصوف کا وہ پودا جس کا بیج برسوں کی خاک تلے دب چکا تھا، حضرت مولانا اللہ یار خانؒ نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ پھر اس شجرِ صحیحہ کی آبیاری شیخ المکرم حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوانؒ نے اپنے خونِ جگر سے کچھ یوں کی کہ اس کی شاخیں ایک عالم کو سایہ فراہم کر رہی ہیں اور اس کا پھل تو امتِ مسلمہ کی نسلیں صدیوں تک کھائیں گی۔

حضرت مولانا اللہ یار خانؒ نے اپنی تقریر و تحریر اور سالکین کی براہِ راست تربیت کے ذریعے تصوف کا بیش قیمت خزانہ عامۃ الناس تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ خود فرماتے ہیں: ''صوفیائے کرام کے ہاں تعلیم و ارشاد اور تزکیہ و اصلاحِ باطن کا طریقہ القائی اور انعکاسی ہے اور یہ تصوف کا عملی پہلو ہے جس کا انحصار صحبتِ شیخ پر ہے۔۔۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ عامۃ المسلمین کو صحیح تصوف سے روشناس کرایا جائے جس کی اساس کتاب و سنت پر ہے تا کہ اس کی روشنی میں اپنی فکری اور عملی اصلاح کر کے ابدی فلاح حاصل کر سکیں۔ اسی احساسِ فرض کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔''

یعنی قرآن و سنت کی روشنی میں سلف صالحین کے ذریعے تصوف و سلوک کی جو عملی صورت ہم تک پہنچی، اس کا بیان اس کتاب کا مرکزِ بحث ہے۔ کم و بیش چالیس سال پہلے یہ نابغۂ روزگار کتاب تصنیف کی گئی۔ چونکہ صدیوں بعد تصوف کو اس کی اصلی شکل و

Scanned with CamScanner

صورت میں صفحۂ قرطاس پر تصویر کیا گیا تھا لہٰذا علمی حلقوں میں اسے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی اور اہلِ علم نے اس سے خوب استفادہ کیا۔ بہت سے تو محض یہ کتاب ہی پڑھ کر سلوک کے سالک بن گئے۔۔۔۔ البتہ عوام الناس کو ایک مشکل ضرور درپیش تھی۔ کتاب چونکہ ایک چوٹی کے عالم صوفی کی تحریر کردہ تھی، اس لیے صرف ونحو کے پیچیدہ نکات، علم الکلام کی مشکل اصطلاحات اور خود اصطلاحاتِ تصوف ایک عام قاری کے لیے سمجھنا بے حد مشکل تھیں۔ حضرت شیخ المکرمؒ نے لوگوں کے سوالات واستفسارات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا اور بالآخر اس کی تشریح وتوضیح کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے اپنے بیانات کے ذریعے اس کتاب کی سطر سطر پڑھ کر سنائی اور اس کی سیر حاصل تشریح فرمائی۔

شیخ المکرمؒ نے 'دلائل السلوک' کی تشریح فرماتے ہوئے انتہائی سادہ اور روزمرہ کی زبان استعمال فرمائی ہے۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں مختلف واقعات اور مثالوں سے بات کو سمجھایا ہے اور بہت سی جگہوں پر وضاحت کی خاطر آپؒ نے اپنے ذاتی تجربات بیان فرمائے ہیں۔ آپؒ نے صرف ونحو کی اصطلاحات کو یا تو کھول کر بیان کیا ہے، یا ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بات سلیس زبان میں سمجھا دی ہے کہ ایک کم پڑھا لکھا قاری بھی اس کی تہہ تک پہنچ جائے۔۔۔۔ آپؒ نے تصوف کی مختلف اصطلاحات کی انتہائی جامع اور عام فہم تعریفات بھی بیان فرمائی ہیں۔ ہاں! چند ایک جگہوں پر کچھ نکات بغیر وضاحت کے بھی چھوڑے ہیں جو خود اُن کے فرمان کے مطابق "ہر ایک کے لیے نہیں ہیں۔ جو اس بات کا اہل ہو گا وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔"

قارئین کرام! تصوف کی انعکاسی اور سینہ در سینہ سفر کرنے والی کیفیات وبرکات کو الفاظ کا جامہ پہنانا ہی ایک کارِ دارد تھا جو حضرت مولانا اللہ یار خانؒ نے انجام دیا، پھر اس کتاب کی لیلائے معنیٰ کو منت پذیرِ شانہ کرنا تو از حد مشکل کام تھا جو اُنہی کے جانشین مرید باصفا نے انجام دیا۔ اصل میں بات کچھ یوں ہے کہ حضرت شیخ المکرمؒ کو فہمِ قرآن کا علمِ لدنی کیا عطا ہوا کہ ان کے ذہن رسا، ان کے قلبِ باصفا سے علم وعرفان کے وہ سوتے پھوٹ نکلے کہ ہر طالب، جس پہلو سے قرآن کی تشریح چاہتا تھا، اس کی طلب وذوق کی شافی تسکین ہوئی۔ آپؒ کی تفسیراتِ قرآنی کو پڑھنے کے بعد ہر طرح کے ابہام وتشکیک کو تو کہیں ٹھہرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔

بات تفسیرِ قرآن سے شروع ہوئی تو پھر الحمد للہ! شرحِ حدیث تک بھی آ گئی۔ آپؒ نے تفسیر وتوضیحِ دین کے اس سفر کو جاری رکھا اور پھر۔۔۔ تصوف تو وہ دشتِ لیلیٰ تھا جس کی بادیہ پیمائی میں آپؒ نے جنونِ شوق کے جذبے کی تمام تر وارفتگی کے ساتھ اپنی عمرِ عزیز کا غالب حصہ گزار دیا تھا۔ 'دلائل السلوک' کے حقائق ومعارف کا بیان تو خود آپؒ کی آپ بیتی تھا۔ وہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا تھا، حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوانؒ تو اس کتاب کے حرف حرف کی مجسم تفسیر تھے۔ جو کچھ اس کتاب میں بیان کیا گیا، آپؒ اسے تقریباً نصف صدی سے اپنی دھڑکنوں، اپنی نبضوں پر آزما رہے تھے۔ یہ کتاب تو گویا خود اُنؒ کے قلب پر اتری تھی، اُنؒ کے دل کے ہر رگ وریشے میں اتری تھی۔ وہ جو خود اُنؒ کی اپنی وارداتِ قلبی تھی، اس کی تفسیر وتشریح ان کے لیے کیا مشکل تھی۔

لہٰذا آپؒ نے بڑی سہولت وآسانی سے بلند عالمانہ معیار کی سربلند چٹانوں میں گھرے ہوئے اس ذخیرۂ نور کو ایک سبک رو، رواں ندی میں بدل دیا جس کے کنارے پر بیٹھ کر کوئی بھی اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔

مسز سرور اعوان

فہرست مضامین

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
1	شرح دلائل السلوک	13
	باب:(1) اسلامی تصوف کی حقیقت	14
2	تصوف کیا ہے؟	14,15
3	موضوعِ علمِ تصوف	14
4	علمِ تصوف کی تعریف اور غایت	19,20
5	تصوف کیا نہیں	22
	باب:(2) تصوف کے متعلق نظریات	23
6	منکرینِ تصوف	23
7	قائلینِ تصوف	24,25
	باب:(3) تصوف کا ثبوت	26
8	حدیث جبرئیلؑ	26,28
9	بعثتِ انبیاء کا مقصد	30
10	دین میں تصوف بمنزلہ روح	30,31
11	تصوف کا حصول فرضِ عین ہے	31,32
12	تصوف اصولِ دین سے ہے	33,34
13	اہل السنۃ والجماعت کا مدار شریعت وطریقت پر ہے	34
14	تصوف تواتر سے ثابت ہے	35
15	حدیثِ احسان پر تفصیلی بحث	35,41
16	قربِ نوافل	47,50
17	قربِ فرائض، قربِ نوافل میں فرق	52,56
	باب:(4) بحثِ قلب	60,61
18	موضوعِ تصوف	60
19	اصل مکلف قلب ہے	63
20	عقل کا مقام قلب ہے	64
21	محلِ تقویٰ قلب ہے	64
22	مخاطب اور محلِ وحی قلب ہے	65
23	جزا وسزا کا تعلق اعمالِ قلب سے ہے	66
24	علم وفہم کی نسبت قلب کی طرف ہے	66,67
25	قلبِ سلیم	69
	باب:(5) بحثِ روح	70
26	روح کی تعریف	70,71
27	روح جسمِ لطیف ہے	71
28	روح جوہرِ فرد نہیں	72,73
29	روح لامکانی ہے	74,78
30	روح عالمِ امر سے ہے	80
31	عالمِ امر کیا ہے؟	80
32	کون سی چیزیں عالمِ امر سے ہیں	81,82
33	روح کی شکل وصورت	82,84
	باب:(6) بحثِ نفس	86
34	وجہِ تسمیہ	86
35	نفس اور روح ایک حقیقت کے دو نام ہیں	87
36	نفس اور روح میں فرق	88

Scanned with CamScanner

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
37	سکون کیا ہے؟	89
38	مسمی واحد کے مختلف اسماء	89
	باب:(7) لطائف اور شیخ کامل	91
39	لطائف پانچ ہیں	92,93
40	لطائف کے بارے میں اختلاف	93,94
41	وجۂ اختلاف	96,97
42	شیخ کامل کی پہچان	99,100
43	ضرورت شیخ	104,105
	باب:(8) منازل سلوک	106
44	سلوک کے ابتدائی منازل	106
45	استغراق کی حقیقت	106,107
46	انبیاء کی نیند ناقض وضو نہیں	108,111
47	نوم انبیاء وحی ہے	114,116
48	مراقبات کی حقیقت	119,
49	دوائر ثلاثہ	121
50	سیر کعبہ	121,122
51	منازل سالک المجذوب	123,124
52	ولایت اولیاء کے منازل	127,129
	باب:(9) ولایت انبیاء علیہم السلام	132
53	سلوک کے اعلیٰ منازل	132,135
	باب:(10) شرائط مناصب اولیاء اللہ	141
54	اصطلاحات صوفیاء احادیث سے ماخوذ	141,144
	باب:(11) مناصب اولیاء اللہ پر بحث	147
55	غوث اور قطب	148,149
56	اقطاب کے فرائض	150,151
57	قطب ابدال	151
58	قطب ارشاد	151
59	قطب مدار	151,152
60	قیوم	153,154
61	انسانِ کامل	154,155
62	لفظ غوث کی تشریح	156
63	مستجاب الدعوات ہونے کا مفہوم	157
64	شرائط و آدابِ دعا	160,163
65	عدم قبولیت دعا	166,167
	باب:(12) اولیاء اللہ بزبانِ رسول اللہ ﷺ	169
66	قیامت کے دن اولیاء اللہ کی شان	169,172
67	دنیوی زندگی میں اولیاء اللہ کی حالت	175,176
68	قرب الٰہی کے مدارج	178
69	قرب فرائض	179,180
70	قرب نوافل	180,181
71	درجہ محبوبیت	182,183
72	اولیاء اللہ کی پہچان	187,188
73	اولیاء اللہ کی امتیازی شان	191,192
74	اولیاء اللہ سے دشمنی، اللہ سے دشمنی	193,194
	باب:(13) ذکر الٰہی	196

Scanned with CamScanner

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
75	ذکرِ مطلق منصوص ہے	196,197
76	تلاوتِ قرآن کے علاوہ بھی ذکر ہے؟	198,199
77	نماز کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت؟	202
78	ذکر کثیر مامور بہ ہے	204,205
79	ذکر کی مختلف صورتیں	206
80	ذکرِ قلبی افضل ہے	206,207
81	ذکرِ خفی کی فضیلت قرآن میں	207,209
82	ذکرِ خفی کی فضیلت حدیث میں	211,212
	باب:(14) حلقۂ ذکر	215
83	اجتماعی ذکر کا ثبوت	215,216
84	حدیث سے اجتماعی ذکر کی تائید	216,217
85	مجالس ذکر قائم کرنے کا حکم	219,220
86	اجتماعی حلقۂ ذکر	220,221
87	صوفیاء کا معمول قرآن وسنت پر مبنی	222,223
88	قرآن کریم سے حلقۂ ذکر کا ثبوت	224,225
	باب:(15) فضیلت ذکرِ الٰہی	226
89	ذکرِ الٰہی تمام عبادات سے افضل ہے	226
90	حضورِ اکرم ﷺ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے	227
91	حضور ﷺ نے ذکرِ الٰہی کو سب سے افضل عبادت فرمایا	228
92	ذکرِ الٰہی جانی اور مالی عبادتوں سے افضل	229
93	ذکرِ الٰہی مومن کے لیے ایک قلعہ ہے	230

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
94	ذکرِ الٰہی سے غفلت شیطان کے ہاتھ	230
	پر بیعت کرنے کے مترادف ہے	231
	باب:(16) توجہ اور تصرف شیخ	232
95	قرآن مجید سے القا اور تصرفِ باطنی	234
96	حدیثِ فعلی میں توجہ اور تصرفِ فعلی	235
97	حدیث ابی ؓ بن کعب	236,237
98	توجہ شیخ	238
99	توجہ شیخ	240
	باب:(17) الکشف والالہام	242
100	حصولِ علم کے ذرائع	242
101	عدمِ کشف بڑا حجاب ہے	245,246
102	حدیثِ نفس اور القائے شیطانی	248
103	کشف والہام کی صحت کا معیار	250
104	دلائلِ کشف قرآن حکیم سے	251,254
105	کشف اور الہام میں فرق	258
106	حالتِ برزخی	259,260
107	انبیاءؑ و اولیاء کو	261
	قبل از وجود اشیاء کا انکشاف	265
107	علم غائب کی تعریف	264,269
108	کشف اور الہام از قبیل وحی انبیاء	269
109	کشف اور خواب میں فرق	269
110	کشف والہام بدکاروں کا حصہ نہیں	270
111	الہام کا انکار مردود ہے	270,271

Scanned with CamScanner

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
112	کشف والہام خاص اہل اللہ کا حصہ	271
113	کشف میں انقلابی اثر ہے	271,272
114	حقیقی ایمان بھی ایمانِ شہودی ہے	272,274
115	اصل ایمان اطمینانِ قلب ہے	275,282
116	محاکمہ مابین علمائے ظواہر وعلمائے باطن	289,292
	باب:(18) رویت انبیاء وملائکہ	301
117	رویت انبیاء کا ثبوت	302,303
118	رویتِ ذات اور صورتِ مثالی میں اختلاف	304,305
119	حالتِ بیداری میں رویت کی بنیاد	307
120	مشائخ کے اقوال	307,309
121	علمائے امت کی تحقیق	310,312
122	رویتِ جنات وشیاطین	313,314
123	رویتِ جنات کا ثبوت	314,316
124	خرقِ عادت اور اہل السنۃ والجماعت کا مسلک	317,320
	باب:(19) رسولِ کریم ﷺ سے روحانی بیعت	324,325
	باب:(20) کلام بالارواح	326,344
	باب:(21) تصوف اور اصحابِ تصوف	357
125	پہلا اعتراض: تصوف ایک بدعت ہے	357,359
126	دوسرا اعتراض: اظہارِ کشف والہام جائز نہیں	363
127	تحدیثِ نعمت اور اظہارِ دین	364,366
128	عدم اظہار مشروط بہ شرط ہے	367,368
129	تیسرا اعتراض: جب سماعِ موتی ممکن ہی نہیں تو اُن سے رابطہ کیونکر قائم کیا جاسکتا ہے؟	369 370
130	بعد از موت جسمانی روح کا علم اور حافظہ	370,371
131	روح سنتی بھی ہے	371,372
132	سوال وجواب نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن	373 374
133	قبر میں انبیاء کے جسم کا تعلق روح سے دائمی ہوتا ہے	375 376
134	عذابِ قبر جسم اور روح دونوں پر ہوتا ہے	376,377
135	سماعِ موتی پر اجماعِ امت ہے	378,385
136	چوتھا اعتراض: روح سے اکتسابِ فیض ممکن نہیں	395 396
137	حضور اکرم ﷺ کی ارواحِ انبیاء سے ملاقات	396
138	روح سے کسبِ فیض	397,398
139	روح سے اجرائے فیض	398,400
140	پانچواں اعتراض	402,403
141	حدیث کی حقیقت	403,404
142	چھٹا اعتراض	405,407
143	تصورِ رسول ﷺ اور کشفِ قبور	408,409
144	مدرسۂ محمدیہ ﷺ	409,412
145	دورِ صحابہؓ کے بعد کشف والہام	415,416
146	ساتواں اعتراض: قرأت سلسلۂ مشائخ کی کوئی سند نہیں بلکہ یہ شرک ہے	417 418
147	آٹھواں اعتراض	420
148	اسماء الرجال سے شواہد	422,424

Scanned with CamScanner

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
149	دلائل نقلی	427,428
150	نواں اعتراض:	428,432
	باب:(22) آداب مریدین مع الشیخ	435,436
151	حضور ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرامؓ کی حالت	439,440
152	صحابہ اکرامؓ اور اطاعتِ رسول ﷺ	440,441
153	صحابہ کرامؓ اور تعظیمِ نبوی ﷺ	442,444
154	صحابہ کرامؓ اور محبتِ رسول ﷺ	445,446
155	صحابہ کرامؓ کا باہمی حفظِ مراتب اور	447
	تعلیم نبوی ﷺ کا لحاظ رکھنا	448
156	تصوف وسلوک ابتداء سے انتہا تک	449
	ادب ہی ادب ہے	452
157	اخذِ فیض کے لیے آداب	457,461
	باب:(23) باب الکرامات	467,468
158	کراماتِ اولیاء تواتر سے ثابت ہیں	469,472
159	۱۔فرقِ فاعلی	475
160	۲۔فرقِ مادی	475,476
161	۳۔فرقِ صوری	476
162	۴۔علتِ غائی	476
163	۵۔کہانت اور جادو	477,478
164	۶۔معجزہ اور کرامت میں فرق	479,481
165	۱۔الرشدی	483,487
166	۲۔محمد بن حمزہ	489,490
167	۳۔عمر بن مبارکؒ	491,492
168	۴۔محمد بن یوسف بولاقیؒ	492,493
169	۵۔ابوالغیث بن جمیلؒ	493
170	۶۔عامر بن عبداللہؒ	494
171	۷۔شیبان الراعیؒ	494,495
172	۸۔شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	495,496
173	۹۔ذوالنون مصریؒ	496,497
174	۱۰۔غوث یوسف ہمدانی بغدادیؒ	497,499
175	۱۱۔حضرت ابراہیم دسوقیؒ	500
	باب: (24) سلسلۂ اویسیہ	501,505
176	حرفِ آخر	511,513
177	کابل (افغانستان) سے ایک عالمِ دین کا خط	514,524
178	خط کا جواب	516
179	پہلا سوال	516,524
180	دوسرا سوال	518,529
181	تیسرا سوال	519,529
182	چوتھا سوال	519,529
183	پانچواں، چھٹا اور ساتواں سوال	519,530
184	آٹھواں سوال	521,533
185	مصادر و مراجع	538
186	شجرہ مبارک سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ	544

Scanned with CamScanner

التبیان فی مسائل السلوک والاحسان

شرح

دلائل السلوک

''دلائل السلوک، التبیان فی مسائل السلوک والاحسان'' قلزم فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو اپنے موضوع پر سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر چہ اس موضوع پر بیشمار تصانیف اور نامور صوفیا کی کتب دستیاب ہیں مگر زیرِ نظر کتاب ان سب میں منفرد اور اپنی مثال آپ ہے کہ پہلی بار احسان کے موضوع کو قرآن وحدیث کے دلائل سے ثابت فرمایا گیا ہے۔ یہ تقریباً نصف صدی پیشتر کی تصنیف ہے اور بار بار چھپ کر تقسیم ہو چکی ہے۔ علماء کے لیے تو آسان مگر دیگر حضرات کے لیے مشکل ضرور ہے۔ پھر اصطلاحات تو ہوتی ہی مشکل ہیں۔ جو توفیق الٰہی اس کی شرح بیان کرنے کی سعادت ہوئی لہٰذا استفادہ عام کے لیے اس کی شرح کو بھی کتابی شکل میں طالبانِ حقیقت تک پہنچانا ضروری جانتے ہوئے یہ کوشش کی جا رہی ہے۔ اللہ کریم اسے قبول فرمائے۔ آمین!

والسلام

قاسمِ فیوضات حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ

Scanned with CamScanner

باب (1)

اسلامی تصوف کی حقیقت

تصوف کیا ہے؟

لغت کے اعتبار سے تصوف کی اصل خواہ صوف ہو اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا رشتہ چاہے صفا سے جا ملے، اس میں شک نہیں کہ یہ دین کا ایک اہم شعبہ ہے جس کی اساس خلوص فی العمل اور خلوص فی النیت پر ہے اور جس کی غایت تعلق مع اللہ اور حصولِ رضائے الٰہی ہے۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ، نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور آثار صحابہؓ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے۔

عہدِ رسالت اور صحابہ کرامؓ کے دور میں جس طرح دین کے دوسرے شعبوں، تفسیر، اصول، فقہ، کلام وغیرہ کے نام اور اصطلاحات وضع نہ ہوئی تھیں ہر چند کہ ان کے اصول وکلیات موجود تھے اور ان عنوانات کے تحت یہ شعبے بعد میں مدوّن ہوئے اسی طرح دین کا یہ اہم شعبہ بھی موجود تھا کیونکہ تزکیۂ باطن خود پیغمبر ﷺ کے فرائض میں شامل تھا۔

صحابہؓ کی زندگی بھی اسی کا نمونہ تھی لیکن اس کی تدوین بھی دوسرے شعبوں کی طرح بعد میں ہوئی۔ صحابیت کے شرف اور لقب کی موجودگی میں کسی علیحدہ اصطلاح کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے لیے متکلم، مفسر، محدث، فقیہہ اور صوفی کے القاب استعمال نہیں کیے گئے۔ اس کے بعد جن لوگوں نے دین کے اس شعبہ کی خدمت کی اور اس کے حامل اور مخصص قرار پائے، ان کی زندگیاں زہد واتقاء اور خلوص وسادگی کا عمدہ نمونہ تھیں۔ ان کی غذا سادہ، لباس موٹا (جھوٹا) اکثر صوف وغیرہ کا ہوتا تھا اس لیے یہ صوفی کے لقب سے یاد کیے گئے اور اس نسبت سے ان سے متعلقہ یہ شعبۂ دین تصوف کہلایا۔ 'تصوف' کو قرآن حکیم میں تقویٰ، تزکیہ یا خشیت اللہ (اللہ کا خوف، اللہ کی نافرمانی سے ڈرنا) کا نام دیا گیا ہے اور حدیث شریف میں اسے 'احسان' سے موسوم کیا گیا ہے (احسان خلوصِ نیت کی انتہا اور دلی جذبوں کا نام ہے)۔ اسے دین کا ماحصل قرار دیا گیا ہے (یعنی خلوصِ نیت، خلوصِ قلب اور خلوصِ عمل ہی دین کا حاصل ہے)۔ اس کی تفصیل حدیثِ جبرئیل میں موجود ہے۔ مختصر یہ کہ تصوف، احسان، سلوک اور اخلاص ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔

نبوت کے دو پہلو ہیں اور دونوں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔۔۔(اٰلِ عمران:۱۶۴)

"حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے جبکہ انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

نبوت کے ظاہری پہلو کا تعلق تلاوتِ آیات اور تعلیم وتشریح کتاب سے ہے اور اس کے باطنی پہلو کا تعلق

تزکیہ باطن سے ہے۔ جن نفوسِ قدسیہ کو نبوت کے صرف ظاہری پہلو سے حصہ وافر ملا وہ مفسر، محدث، فقیہہ اور مبلغ کے ناموں سے موسوم ہوئے، اور جنہیں اس کے ساتھ ہی نبوت کے باطنی پہلو سے بھی سرفراز فرمایا گیا ان میں سے بعض غوثیت، قطبیت، ابدالیت اور قیومیت وغیرہ کے مناصب پر فائز ہوئے مگر ان سب کا سرچشمہ کتاب وسنت ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان علاقہ قائم رکھنے والی چیز اعتصام بالکتاب والسنۃ ہے، یہی مدارِ نجات ہے۔ قبر سے حشر تک اتباعِ کتاب وسنت کے متعلق ہی سوال ہوگا، یہی وجہ ہے محققین صوفیا کرام نے شیخ یا پیر کے لیے کتاب وسنت کا عالم ہونا لازم قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ہوا میں اڑتا آئے مگر اس کی عملی زندگی کتاب وسنت کے خلاف ہے تو وہ ولی اللہ نہیں بلکہ جھوٹا ہے، شعبدہ باز ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کے لیے اتباعِ سنت لازمی ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ... (آلِ عمران:۳۱)

"آپ فرمادیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔"

اتباعِ سنت کا پورا پورا حق ان اللہ والوں نے ادا کیا جنہوں نے نبوت کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کی اہمیت کو محسوس کیا اور ہمیشہ پیش نظر رکھا اور تبلیغ واشاعتِ دین کو تزکیہ نفوس سے کبھی جدا نہ ہونے دیا۔ تمام کمالات اور سارے مناصب صرف حضور اکرم ﷺ کی اتباع کی بدولت ہی حاصل ہوتے ہیں اور تصوف کا اصل سرمایہ اتباعِ سنت ہے۔

تصوف کیا ہے؟

لفظ تصوف کی اس طرح سے تشریح کی گئی کہ کسی نے کہا کہ یہ صوف سے بنے ہوئے موٹے کپڑے پہنتے تھے اس لیے انہیں صوفی کہا گیا اور اس فن کو تصوف کہا جانے لگا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ صفائے قلب سے اخذ کیا گیا لفظ ہے اور جو لوگ یہ کام کرتے تھے انہیں صوفی کہا جانے لگا لہٰذا یہ شعبہ تصوف کہلانے لگا لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ قرآنِ کریم نے جو فرائضِ نبوت ارشاد فرمائے: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ... یعنی "اللہ کا رسول ﷺ لوگوں پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے یعنی اللہ کا پیغام پہنچاتا ہے اور جو قبول کرلے اس کا تزکیہ فرماتا ہے۔"

لفظ تزکیہ تو ٹھہرا عربی کا لفظ، اب اس کا فارسی ترجمہ صفائے قلب بنتا ہے۔ سرزمینِ فارس (ایران) میں بڑے بڑے علما ہوئے ہیں۔ قرآنِ کریم کا ترجمہ جب فارسی زبان میں کیا گیا تو میری ذاتی رائے میں لفظ 'تزکیہ' کا ترجمہ 'صفائے قلب' کیا گیا اور اس فن کے ماہرین کو صوفی کہا جانے لگا۔ خیر یہ تو ایک ضمنی سی بات ہے کہ تزکیہ کو تصوف کس وجہ سے کہتے ہیں لیکن تزکیہ ہی کے نام کو آگے جاکر تصوف کہا جانے لگا۔ یہ دین کا ایک اہم شعبہ ہے اور دین کا بہت ضروری حصہ ہے، دین سے الگ ہرگز نہیں۔ اس کی اساس یعنی بنیاد، عمل اور نیت کی درستگی پر ہے۔ عبادات ہوں، اذکار ہوں یا

Scanned with CamScanner

معاملات، ہر عمل میں اطاعتِ الٰہی کی جائے تو صرف اس کی ظاہری صورت نہ ہو بلکہ خلوصِ دل سے کی جائے تو یہ تصوف ہے۔ عقائد سے لے کر اعمال تک، زندگی کے ہر شعبے میں اتباعِ سنت و اطاعتِ الٰہی کی کوشش کی جائے اور اس کوشش میں پورا خلوص شامل ہو۔ نیت اور ارادے میں بھی خلوص ہو (ورنہ زندگی کے ہر شعبے میں، عبادات میں، اعمال میں بعض اوقات دکھاوا آجاتا ہے)۔ تو اس ساری محنت کا مقصد اور اس کی انتہا یا غایت یہ ہے کہ اللہ سے تعلق استوار ہو جائے، اللہ سے تعلق مضبوط ہو جائے اور اللہ کی رضا نصیب ہو۔ قرآن و حدیث کو پڑھیں اور نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرامؓ کے کردار کا مطالعہ کریں تو اس حقیقت کا ثبوت ہر جگہ موجود ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ دین کے باقی جتنے بھی شعبے ہیں، عہدِ نبوی ﷺ میں یا صحابہ کرامؓ کے زمانے میں ان کے لیے مخصوص نام یا اصطلاحات وضع نہیں کی گئی تھیں لیکن اصول اور کلیات، قاعدے اور قرینے بہر طور موجود تھے۔ انہی عنوانات کے تحت یہ شعبے بعد میں مدون ہوئے یعنی سب کچھ پہلے سے موجود تھا صرف ترتیب بعد میں دی گئی۔ تزکیۂ باطن خود پیغمبر ﷺ کے فرائض میں شامل تھا۔ اسی طرح دین کا یہ اہم شعبہ پہلے سے موجود تھا جیسے میں نے پہلے آیہ کریمہ کی تلاوت کی: یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ...

کوئی صحابیؓ صوفی کیوں نہیں کہلایا؟

صحابہؓ کیونکہ نبی کریم، معلمِ اعظم ﷺ کے براہِ راست شاگرد تھے اس لیے صحابیؓ ہونے کا مطلب ہے کہ اس ہستی میں یہ ساری چیزیں، یہ سارے علوم و کمالات بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس لیے کسی صحابیؓ کو متکلم، مفسر یا صوفی نہیں کہا گیا کہ صحابیؓ ہونا دراصل بیک وقت ان سب اوصاف کا درجۂ کمال پر ہونا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دین کے اس شعبے کی خدمت کی اور خاص اخلاص اسی شعبے سے وابستہ ہو گئے، اس شعبے کے لیے مخصوص ہوئے، ان کی زندگیاں نیکی، پارسائی اور سادگی کا بہترین نمونہ تھیں۔ ان کی غذا سادہ، لباس موٹا جھوٹا، اکثر صوف وغیرہ کا ہوتا تھا اس لیے یہ صوفی کے لقب سے یاد کیے گئے اور یہ شعبۂ دین 'تصوف' کہلایا۔ 'تصوف' کو قرآنِ حکیم میں تقویٰ، تزکیہ یا خشیت اللہ (اللہ کا خوف، اللہ کی نافرمانی سے ڈرنا) کا نام دیا گیا ہے اور حدیث شریف میں اسے 'احسان' سے موسوم کیا گیا ہے۔ 'احسان' خلوصِ نیت کی انتہا اور دلی جذبوں کا نام ہے۔ اسے دین کا ماحصل قرار دیا گیا ہے یعنی خلوصِ نیت، خلوصِ قلب اور خلوصِ عمل ہی دین کا حاصل ہے۔ اس کی تفصیل حدیثِ جبرئیل میں موجود ہے۔ مختصر یہ کہ تصوف، احسان، سلوک اور اخلاص ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ یہ نام مختلف ہیں، چیز ایک ہی ہے، کیفیت ایک ہی ہے۔

نبوت کے دو پہلو ہیں اور دونوں یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ... (اٰلِ عمران:۱۶۴)

''حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا جب انہیں میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے پھر انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

نبوت کے وہ دو پہلو، ایک ظاہری اور ایک باطنی ہیں۔ ظاہری دین یا تعلیم کتاب وحکمت یہ ہے کہ عقائد کا پتہ ہونا، حلال وحرام، جائز وناجائز، اوامر ونواہی یعنی کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا، فرائض، سنت، واجبات اور مستحبات دین کا پتہ ہونا، دین کے احکام کا پتہ ہونا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمائیں۔ آپ ﷺ نے جو ارشاد فرمایا، یا تو وہ اللہ کا کلام ہے، قرآن حکیم ہے یا پھر حدیث نبوی ﷺ۔ حدیث بھی وحی الٰہی ہے لیکن اس میں الفاظ حضور اکرم ﷺ کے ہیں، مفہوم اللہ کی طرف سے ہے۔ قرآن میں الفاظ بھی اللہ کے ہیں، مفہوم بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لیے اسے وحیِ مَتلُوّ (جس کی تلاوت کی جائے) اور حدیث کو غیر مَتلُوّ (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) کہتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہو رہا تھا کہ جن کو علومِ ظاہری نصیب ہوئے، تفسیر کے شعبے سے متعلق لوگ 'مفسر'، حدیث کے شعبے کے ماہرین 'محدث'، فقہ کے عالم 'فقیہہ' کہلائے۔ گو کہ نورِ باطن سے ان کے سینے بھی منور تھے، ان کے پاس بھی یہ نعمتِ عظمیٰ تھی کہ اس کے بغیر مومن کا دین مکمل نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی آگے آئے گی کہ تصوف بھی دینی علم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ دونوں میں سے ایک بات ضروری ہوتی ہے یا بندہ خود عالم ہو یا کسی عالم کے دامن سے وابستہ ہو جو اس کی رہنمائی کرتا رہے۔ یا پھر اللہ اسے اپنی طرف سے علوم عطا کر دے جسے علمِ لدنی کہتے ہیں۔ بہر حال علم کے بغیر تصوف نہیں چل سکتا اور تصوف کے بغیر علم کا مزا نہیں آتا۔ علم صرف زبانی باتوں تک رہ جاتا ہے۔ علوم ظاہری میں دینی علوم کی طرح دنیوی علوم بھی بیشمار ہیں۔ سائنس ہے، طب ہے اور دوسرے اور بیشمار علوم ہیں لیکن ان میں وہ کیفیات نہیں ہوتیں جو دلوں کو متاثر کریں، یہ صرف ذہنوں تک محدود ہوتے ہیں۔ دین ایسا علم ہے جو صرف ذہنوں تک نہیں رہتا۔ المختصر یہ کہ اگر کوئی دین کے علمِ ظاہری میں مشہور ہوا تو مفسر، محدث، متکلم یا فقیہہ کہلایا اور اس کے ساتھ جن کو باطنی کیفیات سے حصۂ وافر نصیب ہوا وہ مناصب سے نوازے گئے، غوث بنے، قطب ہوئے، ابدال ہوئے، قیوم ہوئے۔ ان مناصب کی تفصیل بعد میں آئے گی مگر ان سب کا سرچشمہ کتاب وسنت ہے۔ یہی دو چیزیں ان تمام نعمتوں کی اصل اور بنیاد ہیں۔ اللہ اور بندے کے درمیان علاقہ (تعلق) قائم رکھنے والی چیز اعتصام بالکتاب والسنہ ہے یعنی اللہ کی کتاب اور سنت نبوی ﷺ کے ساتھ وابستگی ہے۔ اعتصام کا مطلب ہے مضبوطی سے پکڑ کر رکھنا یعنی اس پر پوری کوشش سے عمل پیرا ہونا، اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ یہی مدارِ نجات ہے، سببِ نجات ہے۔ قبر سے حشر تک اتباعِ کتاب وسنت کے متعلق ہی سوال ہوگا کہ کیا اللہ کی کتاب، نبی ﷺ کے ارشادات کو قبول کیا؟ قبول کیا تو ان پر کس حد تک عمل کیا؟ یہی وجہ ہے کہ محققین صوفیا کرام نے شیخ یا پیر کے لیے کتاب وسنت کا عالم ہونا لازم قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص ہوا میں اُڑتا ہوا آئے مگر اس کی زندگی کتاب وسنت کے خلاف ہے تو وہ ولی اللہ نہیں بلکہ جھوٹا ہے، شعبدہ باز ہے کیونکہ اگر کوئی ہوا میں بھی اڑتا ہے تو مچھر بھی اُڑ رہا ہے، پرندے بھی اُڑ رہے ہیں، مردار کھانے والا گدھ بھی اڑتا ہے۔ ہوا میں اڑنا کوئی کمال نہیں ایسا اللہ کی بیشمار مخلوق کرتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ ولی اللہ کے پاس اللہ کا دین ہو، ظاہری علوم ہوں اور باطنی وقلبی کیفیات ہوں۔ اس کی عملی زندگی کتاب وسنت کے مطابق ہو۔ اگر کتاب وسنت کے خلاف ہے

Scanned with CamScanner

تو پھر اسے ولی اللہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ تعلق مع اللہ کے لیے اتباعِ سنت لازمی ہے۔ اتباعِ سنت سے باہر کوئی راستہ نہیں جس سے بندے کا تعلق اللہ سے قائم ہو۔ وہ ربّ ہے، سارے جہان کا مالک ہے، ہر ایک کو روزی دے رہا ہے۔ بندے سے اس کا یہ تعلق ربوبیت کا یا رحمانیت کا ہے اور یہ ہر بندے کے ساتھ ہے۔ لیکن ایک تعلق رحمت کا، کرم کا، احسان کا، بخشش کا، عطا کا ہے۔ وہ صرف اس بندے کے ساتھ قائم ہوگا جو نبی کریم ﷺ کا اتباع کرے گا۔ اللہ نے خود فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ... (آلِ عمران:۳۱)

”آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا۔“

یعنی محبت کا تعلق اللہ کے کرم و عطا کا ہے۔ یہ صرف اس بندے کے ساتھ قائم ہوگا جو حضورِ اکرم ﷺ کا اتباع کرے گا۔ اتباعِ سنت کا پورا پورا حق اُن اللہ والوں نے ادا کیا جنہوں نے نبوت کے دونوں پہلوؤں کی اہمیت کو جانا اور ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ تبلیغ و اشاعتِ دین کو تزکیۂ نفوس سے کبھی جدا نہ ہونے دیا۔ تصوف کا اصل سرمایہ اتباعِ سنت ہے۔ حقیقتاً حضورِ اکرم ﷺ کی اطاعت و غلامی کا حق ان لوگوں نے ادا کیا جنہوں نے علومِ ظاہری بھی سیکھے، کیفیاتِ باطنی بھی حاصل کیں پھر اس دولت کو دنیا میں تقسیم کر کے دوسروں تک پہنچایا، قرآن و سنت کو عملی زندگی پر لاگو کیا، قلبی کیفیات حاصل کیں اور انہیں کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ سارے کمالات، سارے مناصب نبی کریم ﷺ کے اتباع کی بدولت حاصل ہوتے ہیں کیونکہ تصوف کا اصل سرمایہ اطاعتِ رسول ﷺ، اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔

تصوف یہی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی اطاعت، آپ ﷺ کا اتباع کیا جائے اور پورے خلوص سے کیا جائے۔

موضوعِ علمِ تصوف

کسی علم کے موضوع کا تعین اس کے عوارضاتِ ذاتیہ کی بحث سے ہوتا ہے پس علمِ تصوف کا موضوع مکلفین کے احوال ہیں مگر مطلقاً احوال نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ کون سا فعل قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہے اور کون سا فعل اللہ سے دوری کا موجب۔ جیسا کہ علمِ طب میں موضوع بدنِ انسانی ہے لیکن مطلقاً بدن نہیں بلکہ مِنْ حَيْثُ الصِّحَّةِ وَالْمَرَضِ... صحت اور بیماری کی حیثیت سے۔ پس علمِ تصوف میں بھی احوالِ مکلفین کے متعلق اللہ تعالیٰ کے قرب و بُعد کی حیثیت سے بحث ہوگی۔

موضوعِ علمِ تصوف

یعنی اس کا موضوع کیا ہے؟ تصوف کس چیز کے بارے میں بات کرتا ہے، یہ کیا سکھاتا ہے، کیا سمجھاتا ہے، کس بات پہ رُوئے سخن کھولتا ہے؟ کسی بھی موضوع کا تعین اس کے عوارضاتِ ذاتیہ کی بحث سے ہوتا ہے یعنی کسی بھی موضوع پر جو بحث کی

Scanned with CamScanner

جاتی ہے، وہ ان چیزوں سے کی جاتی ہے جو اس سے حاصل ہوتی ہیں، وہ اچھی ہیں یا بُری۔ فی ذاتہٖ کسی علم پر بحث کی جائے یا کسی شعبے پر بحث کی جائے تو اس کے موضوع کا تعین اس کے عوارضاتِ ذاتیہ کی بحث سے ہوگا یعنی اس کو حاصل کرنے سے کیا فائدہ ملتا ہے یا اس کو چھوڑ دینے سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ پس علمِ تصوف کا موضوع مکلفین کے احوال یعنی صوفیوں کے حالات ہیں کہ جنہوں نے تصوف حاصل کیا انہیں اس سے کیا فائدہ ہوا، یا اس میں انہیں کیا نقصان ہوا۔ ان کے احوال اور کیفیات اس کا موضوع ہوں گے مگر مطلقاً احوال نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ کون سا فعل قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہے اور کون سا فعل اللہ سے دوری کا موجب، یعنی صرف احوال کی بات نہیں ہوگی بلکہ اس میں یہ جانچا جائے گا کہ اگر انسان تصوف سیکھتا ہے یعنی اس فن کو حاصل کرتا ہے تو اس کے لیے اُس نے کیا کیا کیا اور اس کے نتیجے میں کیا کیا کیفیات نصیب ہوئیں جو اللہ کے قرب کا سبب بنتی ہیں۔ یا علمِ تصوف سے محرومی سے کون سا نقصان ہوتا ہے اور اس محرومی کے سبب آدمی کن باتوں میں پھنس جاتا ہے جو اللہ سے دوری کا سبب بنتی ہیں۔ جیسا کہ علمِ طب میں موضوع بدنِ انسانی ہے لیکن مطلقاً بدن نہیں یعنی طب، میڈیکل سائنس کا موضوع انسانی وجود ہے لیکن صرف وجود نہیں بلکہ وجود کو صحت یا بیماری کے اعتبار سے دیکھا جاتا ہے کہ طبیب کے فلاں نسخے سے شفا ہوئی، یا اس کے کھانے کا کوئی شافی اثر ہوا یا اس دوا سے اسے اور خرابی لاحق ہوگئی۔

تو علمِ طب کا موضوع تو بدنِ انسانی ہے لیکن صرف بدن نہیں بلکہ صحت و بیماری کے اعتبار سے بدن پر بحث کی جائے گی۔ اسی طرح علمِ تصوف میں بھی اس علم کے حامل لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کے قرب و بُعد کے لحاظ سے بحث ہوگی اور اسی طرح علمِ تصوف پر اس لحاظ سے بھی بحث ہوگی کہ اس کے حاملین کو اس فن کے کس عمل سے یا کس کیفیت میں قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے یا یہ کوئی ایسا کام ہے جو خدانخواستہ اللہ سے دور کر دے۔

علمِ تصوف کی تعریف اور غایت

هُوَ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهٖ اَحْوَالُ تَزْكِيَةِ النُّفُوْسِ وَ تَصْفِيَةِ الْاَخْلَاقِ وَ تَعْمِيْرِ الْبَاطِنِ وَ الظَّاهِرِ لِنَيْلِ السَّعَادَةِ الْاَبَدِيَّةِ وَ يَحْصُلُ بِهٖ اِصْلَاحُ النَّفْسِ وَ الْمَعْرِفَةُ وَ رِضَاءُ الرَّبِّ وَ مَوْضُوْعُهُ التَّزْكِيَةُ وَ التَّصْفِيَةُ وَ التَّعْمِيْرُ الْمَذْكُوْرَاتُ وَ غَايَتُهٗ نَيْلُ السَّعَادَةِ الْاَبَدِيَّةِ...

"تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیۂ نفوس اور تصفیۂ اخلاق اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں تاکہ سعادتِ ابدی حاصل ہو، نفس کی اصلاح ہو اور ربّ العالمین کی رضا اور اس کی معرفت حاصل ہو اور تصوف کا موضوع تزکیہ، تصفیہ اور تعمیرِ باطن ہے اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔"

Scanned with CamScanner

تعریف، موضوع اور غایت کا بیان اس لیے کیا گیا ہے کہ ہر علم کی شان ان امور سہ گانہ سے واضح ہو جاتی ہے اور ہماری غرض یہ ہے کہ تصوف وسلوک کا دین اسلام میں جو مقام اور مرتبہ ہے وہ ظاہر ہو جائے اور کسی کے لیے اس امر کی گنجائش نہ رہ جائے کہ محض اس احتمال سے کہ یہ علم ظنی ہے وہ اسے قابل اعتنا نہ سمجھے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دین کے دوسرے شعبوں میں ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن کی حیثیت ظنی مسائل کی ہے۔ انہیں قبول کر لینا اور علمِ تصوف میں صرف ظنی کا احتمال پیدا کر کے اسے چھوڑ دینا اور اس عقیدہ میں غلو کرنا، علمی دیانت سے بعید ہے۔ ایسا کرنا درحقیقت اربابِ تصوف یعنی اولیاء اللہ سے عداوت کرنے کے مترادف ہے۔ جس کے لیے

مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ... (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۲: ۹۶۳)

"جس نے میرے ولی سے عداوت کی میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں" کی وعید موجود ہے اس لیے تصوف کے معاندین اپنی عاقبت کی فکر کریں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جو شخص کسی فن میں مہارت نہیں رکھتا اسے اس فن اور اہل فن پر تنقید کا حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فلاسفہ جنہیں علم وتحقیق پر بہت ناز ہے جب تصوف پر بحث کرتے ہوئے مسئلہ کشف پر آتے ہیں تو ان کے لیے اس عاجزانہ اعتراف کے بغیر اور کوئی راستہ نہیں ملتا کہ

هٰذَا طَوْرٌ وَرَآءَ طَوْرِ الْعَقْلِ لَا يُدْرِكُهٗ اِلَّا اَصْحَابُ قُوَّةِ الْقُدْسِيَّةِ...

علم تصوف کی تعریف اور غایت

یعنی علم تصوف کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ هُوَ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهٖ... یعنی یہ ایک ایسا علم ہے جس کے حالات کا پتہ تزکیہ، تعمیرِ باطن اور تعمیرِ ظاہر سے چلتا ہے یعنی تصوف کا موضوع یہ ہے کہ بندے کے ظاہر اور باطن دونوں کی تعمیر ہو۔ ظاہر کی اصلاح بھی ہو اور قلبی کیفیات میں بھی خلوص آئے، اعمال میں خلوص آئے اور قلبی کیفیات بھی نصیب ہوں۔ لِنَيْلِ السَّعَادَةِ... تا کہ اسے سعادت نصیب ہو یعنی اللہ کا کرم نصیب ہو، قربِ الٰہی، رضائے الٰہی اور ابدی سعادت نصیب ہو۔ اس سے اصلاحِ نفس نصیب ہوتی ہے اور اس کا موضوع تزکیہ اور تصفیہ یعنی اخلاقِ باطن اور ظاہر کی تعمیر ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا قرب اور رضا نصیب ہو ورنہ صوفی نے تصوف کو چندہ جمع کرنے یا لوگوں سے گھٹنوں کو ہاتھ لگوانے یا ہاتھوں کو بوسے نہیں دلوانے ہوتے اور نہ ہی وہ تصوف کے ذریعے کوئی مافوق الفطرت انسان بن جاتا ہے۔ امورِ سہ گانہ یعنی تین چیزوں سے اس کی مثال واضح ہوتی ہے کہ خلوص ہو، پھر اعمالِ ظاہری درست ہوں، باطنی تعمیر ہو اور منزل اللہ کی رضا ہو۔ ان تینوں چیزوں سے اس کی غرض واضح ہوتی ہے اور دین اسلام میں اس کا مقام ومرتبہ واضح ہو جاتا ہے تا کہ کسی کے لیے اس امر کی گنجائش ہی نہ رہے کہ محض اس کے ظنی علم ہونے کے احتمال سے اسے اتنا غیر اہم یعنی دین کا ضروری حصہ نہ سمجھا جائے۔ یعنی کوئی اس بات کو

Scanned with CamScanner

سو فیصد یقینی سمجھنے کی بجائے کہ اللہ اللہ کرنے سے تعمیر باطن ہو سکتی ہے محض یہ سمجھ لے کہ 'ہو سکتا ہے ایسا ہوتا ہو' نہیں! یہ ظنی علم نہیں ہے۔ اس کے نتائج یقینی ہیں۔ اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ علم ظنی ہے تو دین کے باقی شعبوں میں ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن کی حیثیت ظنی مسائل کی ہے۔ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی حیثیت ایسی ہے کہ ان سے بھلائی کا احتمال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی حیثیت ظنی نہیں، یقینی ہے۔ یہ الگ بات کہ جو لوگ نہیں جانتے، بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ اس کی حیثیت ظنی ہے یعنی احتمال ہے کہ (ہو سکتا ہے کہ) اصلاح ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ کوئی نہ بھی مانے تو بھی اسے چھوڑنے کی گنجائش باقی نہیں کہ دین کے باقی مسائل میں بھی ظنی مسائل موجود ہیں۔ اس طرح چھوڑنے لگے تو پھر تو سارا دین چھوٹ جائے گا۔ علمِ تصوف میں صرف ظنی کا احتمال پیدا کر کے چھوڑ دینا اور اس عقیدہ میں غلو کرنا علمی دیانت سے بعید ہے۔ ایسا کرنا حقیقت میں اولیاء اللہ سے عداوت کرنا ہے کیونکہ اگر کوئی اس علم کی تحقیر یا توہین کرتا ہے تو یہ علم کی توہین نہیں، حاملینِ علم کی توہین ہے۔ علمِ تصوف کے حاملین اولیاء اللہ ہیں اور اولیاء اللہ سے دشمنی کرنے والوں کے لیے اللہ کا ارشاد ہے۔

حدیثِ قدسی ہے:

مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ... یعنی جس نے میرے ولی کو دکھ پہنچایا، میں اسے جنگ کے لیے للکارتا ہوں۔ گویا معاندینِ تصوف کے لیے اللہ کا اعلانِ جنگ ہے تو چاہیے کہ یہ لوگ اپنی عاقبت کی فکر کریں۔ اگر کوئی تصوف حاصل نہیں بھی کرتا تو کم از کم اس کی مخالفت نہ کرے، اس کے حاملین پر اعتراض نہ کرے کہ یہ بات اللہ سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو شخص کسی فن میں مہارت نہیں رکھتا اسے اس فن اور اہلِ فن پر تنقید کرنے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔ عجیب بات ہے کہ جتنے بھی لوگ تصوف پر اعتراض کرتے ہیں، خود صوفی نہیں ہیں۔ یہ کہاں کا اصول ہے کہ جس علم، جس فن کو کوئی شخص سرے سے جانتا ہی نہیں وہ اس پر تنقید بلکہ اعتراض بھی کرے۔ ایک آدمی گاڑی چلانا نہیں جانتا وہ ایک ڈرائیور کو کیا بتائے گا کہ وہ غلط چلا رہا ہے یا صحیح۔ تصوف پر اعتراض کرنے والے سارے لوگ اس کی ابجد سے بھی واقف نہیں تو پھر طے شدہ بات ہے کہ اُن کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ فلاسفہ جب تصوف پر بحث کرتے ہوئے مسئلہ کشف پر آتے ہیں تو مجبور ہو کر اس عاجزانہ اعتراف کے ساتھ لکھتے ہیں کہ

هٰذَا طَوْرٌ وَرَاءَ طَوْرِ الْعَقْلِ... مان لیں کہ یہ باتیں عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ علمِ فلسفہ سارے کا سارا عقل کا محتاج ہے، عقل کی کاوش ہے، دماغ کی کاوش ہے لیکن کشف و مشاہدہ عقل کی رسائی سے بہت آگے کی چیز ہے۔

لَا يُدْرِكُهٗ اِلَّا اَصْحَابُ الْقُوَّةِ الْقُدْسِيَّةِ... اس کی بات وہی کر سکتے ہیں جو قدسی طاقتوں کے مالک ہیں، جن کے قلوب روشن ہیں، جن کے سینے تجلیاتِ باری سے منور ہیں، جن کے قلوب برکاتِ نبوت سے روشن ہیں، وہی اس موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

تصوف کیا نہیں
تصوف کے لیے نہ کشف وکرامات شرط ہے نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی دلانے کا نام تصوف ہے، نہ تعویذ گنڈوں کا نام تصوف ہے نہ جھاڑ پھونک سے بیماری دور کرنے کا نام تصوف ہے۔ نہ دعا سے مقدمات جیتنے کا نام تصوف ہے نہ قبروں پر سجدہ کرنے، ان پر چادریں چڑھانے اور چراغ جلانے کا نام تصوف ہے اور نہ آنے والے واقعات کی خبر دینے کا نام تصوف ہے۔ نہ اولیاء اللہ کو غیبی ندا کرنا، مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا تصوف ہے۔ نہ اس میں ٹھیکیداری ہے کہ پیر کی ایک توجہ سے مرید کی پوری اصلاح ہو جائے گی اور سلوک کی دولت بغیر مجاہدہ اور بدون اتباع سنت حاصل ہو جائے گی۔ نہ اس میں کشف والہام کا صحیح اترنا لازمی ہے اور نہ وجد و تواجد اور رقص وسرود کا نام تصوف ہے۔ یہ سب چیزیں تصوف کا لازمہ بلکہ عین تصوف سمجھ جاتی ہیں حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر بھی تصوفِ اسلامی کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ ساری خرافات اسلامی تصوف کی عین ضد ہیں۔

تصوف کیا نہیں
اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہ تھا کہ تصوف کیا ہے؟ اب ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف کیا نہیں ہے؟ یہ عنوان تقاضا کرتا ہے کہ اسے توجہ سے سنا جائے اور اس پر بے حد غور کیا جائے۔ فرماتے ہیں ''تصوف کے لیے نہ تو کرامت شرط ہے، نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی دلانے کا نام تصوف ہے''۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی سے بڑی کرامتیں ظاہر ہوں تو وہ صوفی ہے یا کسی کو بہت کشف ہوتا ہے تو وہ صوفی ہے۔ اور نہ ہی یہ لازم ہے کہ اگر کوئی شخص صوفی ہے تو اس کی وجہ سے آپ کے کاروبار میں ترقی ہو گی۔ تعویذ گنڈے، جھاڑ پھونک بھی تصوف نہیں ہے نہ ہی دعا سے مقدمات جیتنے کا نام تصوف ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آج کل لوگ پیری مریدی کا تصور اور مقصد ہی یہ رکھتے ہیں۔ قبروں کو سجدے کرنا، قبروں پر چراغ جلانا، ان پر بوسے دینا، چادریں چڑھانا تصوف نہیں ہے نہ آنے والے واقعات کی خبر دینا تصوف ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ صوفی علمِ غیب جانتا ہے۔ نہ ہی ایسا ہے کہ بیعت ہوتے ہی یا پیر کی محض ایک توجہ سے مرید کی ایک دم خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔ انسانی مزاج بدلتے بدلتے بدلتا ہے۔ ہاں! اللہ چاہے تو پل میں بدل دے۔ یہ ممکن نہیں کہ سلوک محنت و مجاہدے کے بغیر حاصل ہو جائے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے اتباع کے بغیر تو اس کا تصور بھی محال ہے۔ نہ اس میں کشف والہام کا صحیح اترنا لازمی ہے، نہ وجد و تواجد، رقص سرود، نہ گانے بجانے کے وہ ادارے جو حکومت تصوف کے نام پر بنا رہی ہے اور نہ ہی بے ہنگم اچھل کود تصوف ہے۔ یہ خرافات آج کل تصوف بلکہ عین تصوف سمجھی جاتی ہیں جو سراسر غلط ہے۔

Scanned with CamScanner

باب (2)

تصوف کے متعلق مختلف نظریات

منکرین تصوف

تصوف کا انکار مختلف بہانوں اور مختلف الزامات کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ تصوف بدعت ہے۔ بدعت کی بحث مناسب مقام پر آئے گی اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ تصوف بدعت ہے یا سنت اور روح اسلام ہے۔ یہاں ہم اصولی طور پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ منکرین تصوف کی حیثیت نہ تو مجتہد کی ہے کہ ان کا انکار کسی کے لیے حجت ہو اور نہ ہی یہ علمائے حق اور صوفیا محققین پر کسی طرح فوقیت رکھتے ہیں کہ ان کی رائے کا احترام کیا جائے بلکہ بقول مولانا احمد علیؒ لاہوری، یہ منکرینِ تصوف چور، ڈاکو اور رہزن ہیں جو دین کا ایک اہم جز و دین سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ امام حسن بصریؒ سے لے کر آج تک کروڑوں نفوسِ قدسیہ کو بدعتی کہنے کی بجائے یہ زیادہ قرینِ عقل وانصاف ہے کہ ان منکرین تصوف کو ہی بدعتی سمجھا جائے۔ ان کے انکار کی وجہ ان کی جہالت اور کم علمی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسے لوگ ہمیشہ ایسا کرتے آئے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ... (یونس:۳۹) ''بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کو اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے۔''

اگر یہ لوگ ارشادِ ربانی کو پیشِ نظر رکھتے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ... (بنی اسرائیل:۳۶) ''اور جس بات کی تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد کیا کر۔'' تو ممکن ہے کہ انہیں انکار کی جرأت نہ ہوتی۔

منکرین تصوف

تصوف کا انکار کرنے والے یا تو عجیب وغریب دلیلیں پیش کرتے ہیں یا صوفیائے عظام کے طور طریقوں اور نظریات پر بے دلیل الزام تراشی کرتے ہیں۔ ان کے تمام بہانوں اور تاویلوں کا مقصد تصوف کو بدعت ثابت کرنا ہے۔ شرع کی رو سے بدعت کی کیا تعریف ہے؟ بدعت کسے کہتے ہیں؟ یہ بحث اس کتاب میں مناسب مقام پر آئے گی اور وہیں یہ ثابت ہوجائے گا کہ آیا تصوف بدعت ہے یا درحقیقت سنت اور روحِ اسلام ہے۔ ہم یہاں اصولی طور پر ایک بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ منکرینِ تصوف کی حیثیت نہ تو مجتہد کی ہے کہ ان کا انکار کسی کے لیے دلیل وحجت بنے اور نہ ہی یہ لوگ علمائے حق اور صوفیا محققین پر کسی قسم کی فوقیت رکھتے ہیں کہ ان کی بے بنیاد رائے کا احترام کیا جائے بلکہ بقول احمد علیؒ لاہوری:

''یہ منکرینِ تصوف، چور، ڈاکو اور راہزن ہیں جو دین کا ایک جزِ دین سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ امام حسن بصریؒ سے لے کر آج تک کروڑوں نفوسِ قدسیہ کو بدعتی کہنے کی بجائے، یہ زیادہ قرین عقل وانصاف ہے کہ ان منکرین تصوف ہی کو بدعتی سمجھا جائے۔ ان کے انکار کی وجہ ان کی جہالت اور کم علمی ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ... ''بلکہ ایسی چیز کو جھٹلانے لگے جس کو اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے۔''

Scanned with CamScanner

اگر یہ لوگ ارشادِ ربانی کو پیشِ نظر رکھتے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ... ''اور جس بات کی تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر۔'' تو انہیں انکار کی جرأت نہ ہوتی۔

قائلینِ تصوف

قائلینِ تصوف کے پھر دو گروہ ہیں۔ ایک قلیل جماعت اعتقاداً تصوف کی قائل ہے اور عملاً بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ درحقیقت یہی لوگ اہلِ حق ہیں اور وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ... (السبا: ۱۳) ''اور میرے شکر گزار بندے تھوڑے ہیں'' کے مصداق ہیں۔ ان کا وجود ہر زمانے میں رہا ہے اور نبوت کے اس شعبہ کی برکات انہی کے وسیلے سے دنیا میں پھیلتی رہی ہیں۔

ایک جماعت ایسی ہے جو بظاہر تو تصوف کی قائل ہے مگر عملاً اس کی منکر ہے۔ ان کے نزدیک تصوف صرف کتبِ تصوف کا مطالعہ کر لینے، اولیاء اللہ کی حکایات سن لینے، سَر دھننے اور جھومنے تک محدود ہے۔ یہ لوگ اوّل تو کسی عارفِ کامل، مزکّی و مصلح کی تلاش کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے جو عملاً سلوک سکھائے اور اتباعِ سنت پر زور دے۔ اور اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو تزکیۂ باطن کا طریقہ سکھائے یا راہِ سلوک طے کروائے تو اس پر یقین نہیں کرتے بلکہ اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے حالانکہ ان کی بے یقینی کی اصلی وجہ ان کا فکری اور عملی جمود ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ محنت نہ کرنی پڑے، محض زبانی باتوں اور حکایتوں سے سلوک طے ہو جائے۔ یہ لوگ بھی دراصل تصوفِ اسلامی کے منکر ہیں۔ اس جماعت میں بعض اوقات اس نعرہ کی گونج بھی سنائی دیتی ہے کہ ''شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور چیز ہے۔'' یہ نعرہ کیا ہے؟ کتاب و سنت سے آزادی اور اتباعِ سنّت سے فرار کی ایک راہ نکال لی ہے۔

وَالنَّاسُ فِيْ اِنْكَارِ الْكَرَامَاتِ مُخْتَلِفُوْنَ. فَمِنْهُمْ مَنْ يُّنْكِرُ كَرَامَاتِ الْاَوْلِيَاءِ مُطْلَقًا، وَ هٰٓؤُلَآءِ اَهْلِ مَذْهَبٍ مَعْرُوْفٍ عَنِ التَّوْفِيْقِ مَصْرُوْفٌ وَمِنْهُمْ مَنْ يُّكَذِّبُ بِكَرَامَاتِ اَوْلِيَاءِ زَمَانِهٖ وَيُصَدِّقُ بِكَرَامَاتِ الْاَوْلِيَآءِ الَّذِيْنَ لَيْسُوْا فِيْ زَمَانِهٖ كَمَعْرُوْفٍ وَسَهْلٍ وَالْجُنَيْدِ وَاَشْيَاهِهِمْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ فَهٰؤُلَآءِ كَمَا قَالَ الشَّيْخُ اَبُو الْحَسَنِ الشَّاذِلِيُّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ: وَاللّٰهِ مَا هِيَ اِلَّا اِسْرَائِيْلِيَّةٌ صَدَّقُوْا بِمُوْسٰى وَكَذَّبُوْا بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّهُمْ اَدْرَكُوْا زَمَنَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يُّصَدِّقُ بِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَوْلِيَاءَ لَهُمْ كَرَامَاتٌ وَلٰكِنْ لَّا يُصَدِّقُ بِاَحَدٍ مُّعَيَّنٍ مِّنْ اَهْلِ زَمَانِهٖ فَهٰؤُلَآءِ مَحْرُوْمُوْنَ اَيْضًا... (روض الریاحین: ۳۸)

''انکارِ کرامات کے اعتبار سے لوگوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو مطلقاً منکر ہیں، یہ مشہور اہلِ مذہب اور پرہیزگاری سے منحرف ہیں۔ دوسرے وہ جو اگلے لوگوں کی کرامات کے قائل ہیں مگر اپنے زمانے کی کرامات کے منکر ہیں۔ یہ لوگ بقول سیدی ابوالحسن شاذلیؒ، بنی اسرائیل کے مشابہ ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کی اس وقت تصدیق کی جب ان کو نہیں دیکھا اور محمد ﷺ کی تکذیب کی (دیکھ کر) اور اس کا باعث حسد و عداوت و شقاوت کے سوا کچھ نہ تھا۔ تیسرے وہ ہیں جو اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے زمانے کے لوگوں میں بھی خدا کے اولیا ہیں لیکن کسی ایک معین شخص کی تصدیق نہیں کرتے۔ ایسے لوگ اولیاء اللہ کی رہنمائی سے محروم ہیں۔''

Scanned with CamScanner

قائلین تصوف:

جولوگ تصوف کے قائل ہیں، وہ مزید دو گروہوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ان میں سے ایک گروہ جو تعداد میں خاصا کم ہے، وہ تصوف پر اعتقاد و یقین بھی رکھتا ہے اور اس راہ میں عملاً بھی کوشش کرتا ہے۔تصوف جو برکاتِ نبوت کا نام ہے، وہ ان برکات کو اپنے سینے میں اتارنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اہلِ حق ہیں اور
وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ... (السبا: ۱۳) اور میرے شکر گزار بندے تھوڑے (ہی) ہیں، کے مصداق ہیں۔یہ ہر زمانے میں رہے ہیں اور نبوت کے اس شعبہ کی برکات ان ہی کے وسیلے سے دنیا میں پھیلتی رہی ہیں۔

تصوف کے ماننے والوں کا دوسرا گروہ جو زبانی کلامی تو تصوف کا قائل ہے لیکن ان کا عمل، ان کے زبانی اقرار کی تصدیق نہیں کرتا۔وہ اس راہ میں نہ تو تلاش و جستجو ہی کے قائل ہیں نہ کوشش اور مجاہدہ کرنے کے۔ان کے نزدیک تصوف کو محض مان لینا ہی اس شعبۂ دین کا حق ادا کرنا ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ صرف تصوف پر لکھی گئی کتابیں پڑھ کر اور اولیائے کرام کی کرامات و حکایات سن کر واہ واہ کرنا ہی کافی ہے۔یہ لوگ کسی مردِ کامل، کسی صوفی استاد کی تلاش کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے جو انہیں عملاً سلوک سکھائے اور دل وجان سے اتباعِ سنت کرنا سکھائے۔یہ لوگ ماضی کے اولیا کرام کو مانتے ہیں۔ان کی زندگیوں کی اس تمام جدوجہد کو جو انہوں نے عوام کے صفائے قلب و باطن کے لیے کی، نظر انداز کرتے ہوئے بس اُن اللہ والوں کی زندگی پر ایک پراسرار سا افسانوی غلاف چڑھائے پھرتے ہیں۔اگر زمانۂ حال میں انہیں تزکیۂ باطن کرنے والا مل جائے جو انہیں راہِ سلوک طے کرواسکتا ہوتو وہ اس پر یقین نہیں کرتے بلکہ اس کی تکذیب و تمسخر پر اتر آتے ہیں۔ان کی اس بے یقینی کی اصل وجہ یہ ہے کہ کہ ایک تو وہ ماضی کے مافوق الفطرت قصے کہانیوں ہی سے نہیں نکلتے۔ان کی سوچ وفکر یہیں پر رکی رہتی ہے۔دوسرے وہ ایک عملی جمود کا شکار ہوتے ہیں یعنی وہ محنت کرنا ہی نہیں چاہتے۔چاہتے ہیں کہ زبانی باتوں اور بے سروپا حکایتوں، بے بنیاد اعتقادات اور ماضی کے صوفیا کرام سے مبالغہ آمیز عقیدت ہی کے بل پر سلوک کی راہ طے ہوجائے۔یہ لوگ بھی حقیقت میں اسلامی تصوف کے منکر ہی ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں، ''شریعت اور چیز ہے، طریقت اور چیز ہے۔''

یہ نعرہ دراصل کتاب وسنت سے آزادی اور شریعتِ محمدی ﷺ سے فرار حاصل کرنے کا ایک بہانہ ہے۔

روض الریاحین کے مطابق تصوف کا انکار کرنے والے بھی آگے مزید دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ایک تو وہ جو سرے سے تصوف کا انکار کیے بیٹھے ہیں۔وہ تصوف کو دین کا جز نہیں مانتے حتیٰ کہ گروہِ صوفیا کرام کی پرہیز گاری، ورع وتقویٰ اور دینداری بھی ان کے نزدیک مشکوک ہے۔ان کا دوسرا گروہ وہ ہے جو ماضی کے اولیا کرام کی کرامات و بزرگی کا قائل ہے مگر یہ لوگ زمانۂ حال کے صوفیا کی کرامات وکمالِ درجات کے منکر ہیں۔یہ لوگ بقول حضرت ابوالحسن شاذلیؒ، بنی اسرائیل کے مشابہ ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کی اس وقت تصدیق کی جب انہیں نہیں دیکھا تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب، آپ ﷺ کو دیکھ کر کی۔جس کا باعث ان کا حسد اور عداوت و شقاوت کے سوا کچھ نہ تھا۔ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو زمانۂ حال کے صوفیا کی تصدیق تو کرتا ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ لوگ موجود ہیں مگر کسی ایک مخصوص و معین شخص کی تصدیق نہیں کرتے۔ایسے سب لوگ اولیا اللہ کی رہنمائی سے محروم ہیں۔

Scanned with CamScanner

باب(3)

تصوف کا ثبوت

حدیث جبرئیلؑ
حدیث جبرئیلؑ کو اصولِ دین کے بیان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے جس میں دین کو اسلام، ایمان اور احسان سے مرکب بیان فرمایا گیا ہے۔ احسان کی وضاحت یوں بیان کی گئی ہے:
کتب احادیث میں حدیث جبرئیلؑ

قَالَ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ قَالَ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) لِيْ يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ...(مشکوٰۃ: کتاب الایمان، باب سوال جبرائیل النبی عن الایمان و الاسلام، و الاحسان و علم الاساعۃ، ۱:۱۱:۱۱)

"جبرئیلؑ نے کہا مجھے احسان کے متعلق بتایئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے، پس اگر تُو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اے عمر! کیا تم جانتے ہو سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: یہ جبرئیلؑ تھے تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔"

اس حدیث کی شرح میں شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے امام مالکؒ کا قول نقل فرمایا ہے:

قَالَ الْاِمَامُ مَالِكٌ مَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَحَقَّقَ...(اشعۃ اللمعات، کتاب الایمان، فصل اول، ۱:۴۵)

"امام مالکؒ نے فرمایا جس نے فقہ کے بغیر تصوف حاصل کیا وہ زندیق ہوا اور جس نے تصوف سیکھے بغیر فقہ کا علم حاصل کیا وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوا۔"

بدآنکہ بنائے دین و کمال آں بر فقہ و کلام و تصوف است و ایں حدیث شریف بیان ایں ہر سہ مقام کردہ اسلام اشارت بہ فقہ است کہ متضمن بیان اعمال و احکام شرعیہ است و ایمان اشارت باعتقادات کہ مسائل اصول کلام اند و احسان اشارت بہ اصل تصوف است کہ عبارت از صدق توجہ الی اللہ است و جمیع معانی تصوف کہ مشائخ طریقت بآں اشارت کردہ اند راجع بہمیں معنی

Scanned with CamScanner

ست و تصوف و کلام لازم یکدیگراند که ہیچ یکے بے دیگرے تمامی نه پذیرو درصورت نه بندو و تصوف بے فقه صورت نه بندد زیرا که حکم الٰہی بے فقه شناخته نشودو فقه بے تصوف تمام نشودو زیرا که عمل بے صدق توجه تمام نه پذیردو ہردو بے ایمان صحیح نگردد، بر مثال روح و جسد که ہیچ کدام بے دیگرے وجود نگیرددو کمال نه پذیرد۔

(اشعۃ اللمعات، کتاب الایمان، فصل اول، ۱:۴۵)

”خوب سمجھ لو کہ دین کی بنیاد اور اس کی تکمیل کا انحصار فقہ، کلام اور تصوف پر ہے اور اس حدیث شریف میں ان تینوں کا بیان ہوا ہے۔ اسلام سے مراد فقہ ہے کیونکہ اس میں شریعت کے احکام اور اعمال کا بیان ہے اور ایمان سے مراد عقائد ہیں جو علمِ کلام کے مسائل ہیں اور احسان سے مراد اصل تصوف ہے جو صدقِ دل سے توجہ الی اللہ سے عبارت ہے۔ مشائخ طریقت کے تمام ارشادات کا حاصل یہی احسان ہے۔ تصوف اور کلام لازم وملزوم ہیں کیونکہ تصوف بغیر کلام کے اور فقہ بغیر تصوف بے معنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے احکام فقہ کے بغیر معلوم نہیں ہوتے اور فقہ بغیر تصوف کے کامل نہیں ہوتی کیونکہ کوئی عمل بغیر اخلاصِ نیت کے مقبول نہیں اور یہ دونوں ایمان کے بغیر بیکار ہیں۔ ان کی مثال روح اور جسم کی ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر ناتمام رہتے ہیں۔“

فائدہ:

تصوف جزوِ دین ہے اور انتفائے جزو مستلزم ہے انتفائے کل کو، پس انکارِ تصوف مستلزم ہوگا انکارِ دین کو۔

عالم جب تک تصوف وسلوک سے بے بہرہ ہے، نہ وارثِ رسول ﷺ ہے، نہ نائب رسول ﷺ۔

وَ لَا یَکُوْنُ الْخَلِیْفَةُ اِلَّا مَنْ جَمَعَ الْمَقَاصِدَ الثَّلَاثَةَ الَّتِیْ ذَکَرْنَاھَا وَ حِفْظَ الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَتَدَرَّبَ فِیْ قَوَانِیْنِ السُّلُوْكِ وَ تَرْبِیَةِ السَّالِکِیْنَ۔۔۔ (تفہیمات الٰہیہ، ۱:۱۳-۱۴)

”خلیفۂ رسول ﷺ صرف وہ شخص ہوگا جس نے دین کے تینوں شعبے جمع کیے ہوں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کو یاد کیا ہوا ور قوانین علمِ سلوک اور تربیتِ سالکین میں کوشش کی ہو۔“

فائدہ:

(۱) اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَآءِ۔۔۔

(سنن ابن ماجه، مقدمة الكتاب، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۲۰)

”علماء انبیاء کے وارث ہیں“ سے مراد وہ علماء ہیں جنہوں نے دین کے ان تینوں اجزاء کو جمع کیا ہو۔

کیونکہ فَاِنَّهٗ جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ۔۔۔ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دین کی تعلیم کے

Scanned with CamScanner

لیے جبرئیلؑ کو بھیجا اور انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو پہنچایا، وہ تین اجزا اسلام، ایمان اور احسان سے مرکب ہے جس
میں سلوک جسے لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے بھی شامل ہے۔

(۲) اگر یہ تسلیم کرلیں کہ سلوک بدعت ہے تو ماننا پڑے گا کہ دین مرکب بدعت سے ہے اور جب دین بدعت وغیر بدعت
سے مرکب ہوا تو پورا دین بدعت ٹھہرا۔

حدیثِ جبرئیل

کتبِ احادیث میں 'حدیثِ جبرئیل' کو اصولِ دین کے بیان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس حدیث کی رُو سے
دین کو اسلام، ایمان اور احسان سے مرکب فرمایا گیا ہے یعنی اس حدیث میں دین کے تین اجزا ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ یہ تین حصے
مل کر پورا اور مکمل دین بنتا ہے۔ تیسرے حصہ دین کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔ "قَالَ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ..."
جبرئیلؑ نے عرض کیا، "یارسول اللہ ﷺ! مجھے احسان کے بارے میں ارشاد فرمائیے"۔
حضرت جبرئیل امینؑ شکلِ انسانی میں حاضر ہوئے، حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے۔ پوری حدیث یہ ہے کہ
پہلے اسلام، پھر ایمان اور آخر میں احسان کے بارے میں ارشاد فرمانے کے لیے عرض کیا۔ قَالَ: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ...
قَالَ: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ... حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "احسان یہ ہے کہ تُو اللہ کی عبادت ایسے کرے جیسے
تُو اسے روبرو دیکھ رہا ہے۔" فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ... اگر تم میں یہ استعداد نہیں ہے، یا تجھے یہ مقام نصیب نہیں ہے تو پھر
فَاِنَّهٗ يَرَاكَ... تو پھر کم از کم یہ یقین کامل ہو کہ "اللہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" (یہ احسان ہے)۔ اس کے بعد جبرئیلِ امینؑ چلے گئے تو
حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا، يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ... اے عمر! کیا تم جانتے ہو کہ سائل کون تھا؟ حضرت عمرؓ فرماتے
ہیں کہ میں نے عرض کیا، اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ "اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا:
فَاِنَّهٗ جِبْرَئِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ... یہ جبرئیل تھے اور وہ اس لیے آئے تھے کہ آپ لوگوں کو آپ کا دین سکھائیں۔
یعنی دین مکمل ہو چکا تھا اور یہ آیت نازل ہو چکی تھی، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا... (المائدہ: ۳) یہ آیت حجۃ الوداع میں آپ ﷺ کے آخری خطبہ حج کے بعد نازل ہوئی تھی۔
اس کے بعد جبرئیل امینؑ مندرجہ بالا سوالات کے ساتھ حاضر ہوئے تھے۔ اس سے مراد تھی کہ تمہارا دین مکمل ہو گیا، اللہ کی نعمتیں تم پر
مکمل ہو گئیں اور اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا تو سارے دین کا خلاصہ یا ماحصل سمجھانے کے لیے جبرئیلؑ انسانی شکل
میں حاضر ہوئے اور تینوں سوالوں کے جامع جوابات بارگاہِ رسالت سے پائے۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کیا
تم سائل کے بارے میں جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا، "اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا،
"وہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔" اس حدیث کی شرح میں شاہ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالکؒ کا

Scanned with CamScanner

قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں، "جس نے تصوف سیکھنے کی کوشش کی لیکن فقہ یعنی دین نہیں سیکھا، وہ بے دین ہو گیا۔ جس نے فقہ حاصل کیا لیکن تصوف نہیں سیکھا یعنی دین کا ظاہری علم حاصل کیا لیکن کیفیات قلبی حاصل نہیں کیں، اس نے برائی کی، گناہگار و فاسق ہو گیا۔ وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا... اور جس نے دونوں چیزوں کو حاصل کیا یعنی علمِ ظاہری اور کیفیاتِ باطنی دونوں کو حاصل کیا وہ محقق ہوا۔" اسی حدیثِ جبرئیل کی شرح میں شاہ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت موجود ہے کہ

بدآنکه بنائے دین کمال آں بر فقه و کلام و تصوف است... الخ

"یہ جان لو کہ دین کے کمال کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوف پر ہے... الخ"

فقہ مسائل دین ہیں، کلام عقائد ہیں اور تصوف کیفیاتِ باطنی ہیں۔ حدیث جبرئیل میں ان تینوں کا بیان ہو گیا۔ احکام کا بیان جو ہمارے کردار سے متعلق ہیں۔ اسلام شرعی احکام ارشاد فرماتا ہے۔ ایمان عقائد کا نام ہے جو اصولِ کلام سے تعلق رکھتا ہے اور احسان حقیقت ہے تصوف کی کہ یہ عبارت ہے: "از صدقِ توجه الی الله است۔"

یعنی احسان، اللہ کی طرف خلوصِ دل سے متوجہ ہونے کا نام ہے اور بھی جتنے مشائخِ طریقت نے تصوف کا معنی کیا ہے انہوں نے یہی ارشاد فرمایا ہے۔ مزید یہ کہ تصوف اور علم الکلام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ایمان بغیر تصوف کے اور تصوف بغیر فقہ کے مکمل نہیں ہوتا۔ فقہ کے بغیر احکامِ الٰہی کا پتہ نہیں چلتا اور احکامِ الٰہی کا یہ علم تصوف کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتا کہ جب تک کوئی عمل خلوص سے نہ کیا جائے، مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دین کو جانتا ہے، عمل بھی کرنا چاہتا ہے مگر عقیدہ درست نہیں تو بھی بات نہیں بنتی کیونکہ ایمان، عمل اور خلوص کا رشتہ ایسے ہی ہے جیسے روح اور جسم کا۔ روح بغیر جسم کے شریعت پر عمل نہیں کر سکتی اور جسم بغیر روح کے کچھ نہیں، لہٰذا ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

فائدہ:

"تصوف جزوِ دین ہے اور "انتفائے جزو مستلزم ہے انتفائے کُل کو، پس انکارِ تصوف مستلزم ہوگا انکارِ دین کو" یعنی تصوف دین کا ایک اہم حصہ ہے اور جو جزو کا انکار کرے وہ دراصل کُل کا انکار کرتا ہے۔ مثلاً روح اور بدن انسانی حیات کے دو جزو ہیں۔ دونوں میں سے ایک کو بھی اگر انسان کا حصہ نہ سمجھا جائے تو یہ صریحاً حیاتِ انسانی کا انکار ہے۔ اسی طرح کسی اصول کے اگر ایک حصے کا انکار کیا جائے تو اس پورے کا انکار لازم آتا ہے اور یہ بات ایک قانون کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا تصوف کا انکار پورے دین کا انکار ہوگا۔ عالم جب تک تصوف و سلوک سے بے بہرہ ہے، نہ وارثِ رسول ﷺ ہے نہ نائبِ رسول ﷺ۔ وہ عالم جس نے مقاصدِ ثلاثہ اپنے اندر جمع نہیں کیے یعنی ایمان، علمِ دین اور خلوص جمع نہیں کیے وہ وارثِ رسول ﷺ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ حضورِ اکرم ﷺ حدیثِ جبرئیلؑ میں دین کے یہ تین جزو ارشاد فرما چکے ہیں۔ وہ عالم جس نے عقیدہ، کتاب و سنت کی تعلیم اور عمل کے ساتھ قوانینِ سلوک یاد کیے، سالکین کی تربیت کی اور کیفیاتِ قلبی حاصل کیں، وہ عالم خلیفۂ رسول اللہ ﷺ ہوگا کیونکہ دین مکمل کرنے کے بعد اللہ نے جبرئیلؑ کو خلاصۂ دین بتانے کے لیے بھیجا، انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو پہنچایا۔ سارا دین تین اجزا ایمان، اسلام اور احسان سے مرکب ہے، جس میں سلوک جسے لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے بھی شامل ہے۔ یعنی تصوف بھی اتنا ہی اہم ہے

Scanned with CamScanner

جتنا عقیدہ اہم ہے۔اس کے بعد علم وعمل کی اہمیت ہے اور عمل سے زیادہ اُس خلوص کی اہمیت ہے جو اُس عمل میں ہے۔اگر یہ تسلیم کر لیں کہ سلوک بدعت ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ دین کا ایک حصہ بدعت ہے۔جب دین میں بدعت وغیر بدعت سب جمع ہو گیا تو پھر تو کوئی تمیز ہی نہ رہی کہ حقیقت کیا ہے اور جھوٹ کیا۔

بعثتِ انبیاء کا مقصد

انبیاء علیہم السلام تین اغراض کو پورا کرنے کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔اوّل تصحیح عقائد، دوم تصحیح اعمال اور سوم تصحیح اخلاص۔

وَ قَدْ تَكَفَّلَ بِهٰذَا الْفَنِّ (الْاَوَّلِ) اَهْلُ الْاُصُوْلِ مِنْ عُلَمَآءِ الْاُمَّةِ ... وَ قَدْ تَكَفَّلَ بِهٰذَا الْفَنِّ (الثَّانِيْ) فُقَهَاءُ الْاُمَّةِ فَهَدَى اللّٰهُ بِهِمْ كَثِيْرِيْنَ ...وَ قَدْ تَكَفَّلَ (بِفَنِّ الثَّالِثِ) بِهِ الصُّوْفِيَّةُ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ ...(تفہیمات الٰہیہ،۱: ۱۲، ۱۳)

"علمائے امت میں تصحیح عقائد کے فن کے کفیل علمائے اصول ہوتے ہیں، اعمال کی تصحیح کے کفیل فقہائے امت ہوتے ہیں اور فنِ خلوص واحسان کے کفیل صوفیا کرام ہوتے ہیں۔"

بعثتِ انبیاءؑ کا مقصد

ہر نبیؑ کی بعثت کا مقصد تین چیزیں ہیں۔بندگانِ خدا کا عقیدہ صحیح ہو، عمل صحیح ہو اور عمل میں اخلاص ہو۔عمل کی صحت کے لیے خلوص شرط ہے۔خلوص کے بغیر عمل محض دکھاوا اور اداکاری بن کر رہ جاتا ہے۔یعنی عقیدے کی درستگی، عمل کی درستگی، اخلاص کی درستگی۔یہ تین فرائض انبیاءؑ کے ذمہ تھے۔علمائے امت نے ان کا حق ادا کیا۔عقائد کی درستگی کے فن کا حق علمائے اصول نے ادا کیا جنہوں نے عقائد پر بحث کر کے حق اور باطل کو علیحدہ علیحدہ کر دکھایا۔دوسرا فرضِ نبوت اعمال کی درستگی کا تھا، اس سے متعلقہ فن فقہ کا ہے۔فقہاء نے عمریں لگا کر عمل و کردار سے متعلق احکام و مسائل کو مرتب کیا اور واضح کیا۔اللہ کریم نے فقہاء کے سبب بیشمار لوگوں کو ہدایت نصیب کی۔خلوص کے فن کا حق صوفیا نے ادا کیا۔المختصر، تصحیح عقائد کے فن کے کفیل علمائے اصول ہوئے، اعمال کی تصحیح کے کفیل فقہائے امت ہوئے اور فن خلوص واحسان کے کفیل صوفیائے کرام ہوئے ہیں۔

دین میں تصوف بمنزلہ روح فی الجسد ہے

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ هٰذِهِ الثَّالِثُ اَدَقُّ الْمَقَاصِدِ الشَّرِيْعَةِ مَاْخَذًا وَ اَعْمَقُهَا مَحْتَدًا وَهُوَ بِالنِّسْبَةِ اِلٰى سَائِرِ الشَّرَائِعِ بِمَنْزِلَةِ الرُّوْحِ مِنَ الْجَسَدِ وَ بِمَنْزِلَةِ الْمَعْنٰى مِنَ اللَّفْظِ...

(تفہیمات الٰہیہ،۱: ۱۳-۱۴)

Scanned with CamScanner

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ یہ تیسرا فن، مقاصد شرعیہ کے ماخذ کے لحاظ سے بہت باریک اور گہرا ہے اور تمام شریعت کے لیے اس فن کی وہی حیثیت ہے جو جسم کے لیے روح کی ہے، اور لفظ کے لیے معنی کی ہے۔"

فائدہ:

(۱) یہ فن ثالث، اخلاص اور احسان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اخلاص واحسان ساری شریعت کی روح ہے۔
جس طرح روح کے بغیر بدن بیکار ہے، اسی طرح بدون اخلاص عقائد و اعمال بیکار ہیں۔

(۲) تصوف کے بغیر نہ شریعت زندہ رہ سکتی ہے نہ دین سلامت رہ سکتا ہے۔
جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ نے وضاحت فرمادی ہے۔

دین میں تصوف بمنزلہ روح فی الجسد کے ہے

یعنی جس طرح جسم میں روح ہوتی ہے وہی مقام تصوف کا دین میں ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی ؒ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ تیسرا فن یعنی اخلاص واحسان مقاصد شریعہ کے ماخذ میں سے ہے۔ یہ بے حد باریک اور گہرا ہے اور اس کی حیثیت دین کے لیے وہی ہے جو جسم کے لیے روح کی ہے یعنی اخلاص یا احسان ساری شریعت کی روح ہے۔ جس طرح روح کے بغیر بدن بیکار ہے، اسی طرح بدونِ اخلاص، عقائد بیکار ہیں۔ عقیدے میں خلوص کی ضرورت ہے، عمل میں خلوص کی ضرورت ہے۔ اخلاص نہ ہو تو عقیدہ و عمل دونوں کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

تصوف کا حصول فرضِ عین ہے

قاضی ثناء اللہ ؒ پانی پتی سورۃ التوبہ کی آیت ۱۲۲۔ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً... کی تفسیر کے سلسلے میں تصوف کے مقام اور اہمیت کی وضاحت فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا الْعِلْمُ اللَّدُنِّیُّ الَّذِیْ یُسَمُّوْنَ اَھْلَھَا بِالصُّوْفِیَّةِ الْکِرَامُ فَھُوَ فَرْضُ عَیْنٍ لِاَنَّ ثَمَرَاتِھَا تَصْفِیَۃُ الْقَلْبِ عَنِ اشْتِغَالٍ بِغَیْرِ اللّٰہِ وَ اِتِّصَافُہٗ بِدَوَامِ الْحُضُوْرِ وَ تَزْکِیَۃُ النَّفْسِ عَنْ رَذَائِلِ الْاَخْلَاقِ مِنَ الْعُجْبِ الْکِبْرِ وَ الْحَسَدِ وَ حُبِّ الدُّنْیَا وَ الْجَاہِ وَ الْکَسْلِ فِی الطَّاعَاتِ وَ اِیْثَارِ الشَّھَوَاتِ وَ الرِّیَآءِ وَ السُّمْعَةِ وَ غَیْرِ ذٰلِكَ وَ تَحْلِیَتُھَا بِکَرَامِ الْاَخْلَاقِ مِنَ التَّوْبَةِ وَ الرِّضَاءِ بِالْقَضَاءِ وَ الشُّکْرِ عَلَی النَّعْمَآءِ وَ الصَّبْرِ عَلَی الْبَلَاءِ وَ غَیْرِ ذٰلِكَ وَ لَا شَكَّ اِنَّ ھٰذِہِ الْاُمُوْرَ مُحَرَّمَاتٌ وَ فَرَائِضُ عَلٰی کُلِّ مُؤْمِنٍ اَشَدُّ تَحْرِیْمًا مِنْ مَعَاصِی الْجَوَارِحِ وَ اَھَمُّ اِفْتِرَاضًا مِنْ فَرَائِضِھَا مِنَ الصَّلٰوةِ وَ الصَّوْمِ وَ الزَّکٰوةِ وَ شَیْئٍ مِنَ الْعِبَادَاتِ لَا یُعْبَأُ بِشَیْئٍ مِنْھَا مَا لَمْ تَقْتَرِنْ بِالْاِخْلَاصِ وَ النِّیَّةِ... (تفسیر مظہری، ۴: ۳۲۴)

Scanned with CamScanner

"صوفیا کرام جس علم کو لدنی کہتے ہیں اس کا حصول فرضِ عین ہے کیونکہ اس کا ثمرہ صفائی قلب ہے غیر اللہ کے شغل سے
اور قلب کا مشغول ہونا ہے دوام حضور سے اور تزکیہ نفس ہے رزائل اخلاق سے جیسے عجب، تکبر، حسد، حبِ دنیا، حبِ جاہ، عبادات
میں سستی، شہواتِ نفسانی، ریا، سمعہ وغیرہ۔ اور اس کا ثمرہ فضائلِ اخلاق سے متصف ہونا ہے جیسے توبہ من المعاصی، رضا بالقضاء،
شکرِ نعمت اور معصیت میں صبر وغیرہ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام امور مومن کے لیے اعضاء و جوارح کے گناہوں سے
زیادہ شدت سے حرام ہیں اور نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے زیادہ اہم فرائض ہیں کیونکہ ہر وہ عبادت جس میں خلوصِ نیت نہ ہو بے کار
ہے اور خلوص ہی کا نام تصوف ہے۔"

امام غزالیؒ کی رائے:

وَ كَذَالِكَ يَفْتَرِضُ عَلَيْهِ عِلْمُ اَحْوَالِ الْقَلْبِ مِنَ التَّوَكُّلِ وَالْخَشْيَةِ وَالرِّضَاءِ...

(تعلیم المتعلمین: ۲۱، بحوالہ دلائل السلوک، ۱۴۰)

"(جیسے باقی علوم فرض ہیں) اسی طرح علمِ سلوک بھی فرض ہے جو علم احوالِ قلب ہے جیسے توکل، خشیت، رضا بالقضاء۔"

فائدہ:

امام غزالیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ علمِ تصوف کا حصول فرضِ عین ہے۔

مولانا تھانویؒ نے بھی تعلیمِ تصوف کو فرضِ عین قرار دیا ہے۔ (التکشف عن مہمات التصوف: ۷)

علامہ شامی نے احوالِ قلب کی تفصیل بیان فرما کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

فَيَلْزَمُهُ اَنْ يَّتَعَلَّمَ مِنْهَا مَا يَرٰى نَفْسَهٗ مُحْتَاجًا اِلَيْهِ وَاِزَالَتُهَا فَرْضُ عَيْنٍ...

(ردالمختار علی الدر المختار، مقدمۃ الکتاب، قولہ وعلم القلب، ۱: ۴۰)

"پس مومن کو لازم ہے کہ رزائل کے دفعیہ کے لیے اتنا علم حاصل کرے جتنا اپنے نفس کو اس کا محتاج سمجھے،
ان کا ازالہ فرضِ عین ہے۔"

تصوف کا حصول فرضِ عین ہے

نام نہاد علماء نے تصوف کو غیر ضروری قرار دیا ہے، اور جو اس میں زیادتی کر گئے اُنھوں نے اسے بدعت قرار دے دیا
لیکن علمائے حق فرماتے ہیں کہ اس کا حاصل کرنا فرضِ عین ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی" سورہ توبہ کی آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً... کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ علمائے کرام جس علم کو لدنی فرماتے ہیں، علمِ لدنی یا کیفیاتِ باطنی کا حصول فرض ہے
کیونکہ ان کے نتیجے میں صفائے قلب حاصل ہوتی ہے۔ ماسوا اللہ کے، دل ہر خواہش سے پاک ہوتا ہے۔ قلب اللہ کے لیے خالص
ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت ترقی کرتے کرتے دوام حضور تک جا پہنچتی ہے، اور یہ کیفیتِ قلب ہے جسے حدیث پاک میں كَاَنَّكَ تَرَاهُ

Scanned with CamScanner

... سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں نفس کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ نفس رزائل اخلاق سے یعنی گھٹیا اخلاق سے خلاصی پا لیتا ہے جیسے عُجب، تکبر، حسد، حُبِّ دنیا، حبِّ جاہ، عبادات میں سستی، خواہشاتِ نفسانی، ریا، سمعہ وغیرہ۔ تصوف کا حاصل یہ ہے کہ انسان گھٹیا اخلاق و عادات سے چھٹکارا پا کر اعلیٰ اخلاق و اطوار مثلاً گناہ کا احساس اور اس سے توبہ کا نصیب ہونا یا توبہ عن المعاصی اور رضا بالقضاء، اللہ کی طرف سے جو چیز آئے اس پر راضی رہے۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور مصیبت میں صبر کرے۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ رزائل اخلاق مومن کے لیے اعضاء و جوارح کے گناہوں سے بھی زیادہ شدت سے حرام ہیں یعنی حسد، تکبر، ریا وغیرہ، چوری، قتل یعنی ہاتھ پاؤں سے کیے جانے والے گناہوں سے کہیں زیادہ برے ہیں کیونکہ یہ سب قلبی کیفیات ہیں اور قلب کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اسی طرح فضائلِ اخلاق کا حصول نماز، روزہ، زکوٰۃ سے زیادہ اہم فرائض ہیں کیونکہ ہر وہ عبادت جس میں خلوصِ نیت نہ ہو بے فائدہ ہے اور خلوصِ نیت کا نام ہی تصوف ہے۔

امام غزالیؒ کی رائے:

امام غزالیؒ نے باقی علوم دینیہ کی طرح علمِ سلوک کو بھی فرض قرار دیا ہے کیونکہ ان کے فرمان کے مطابق علمِ سلوک، قلب کے احوال و کیفیات کا علم ہے۔ مولانا تھانویؒ نے بھی تصوف کو فرضِ عین قرار دیا ہے۔ اسی طرح علامہ شامیؒ نے احوالِ قلب کی تفصیل بیان فرما کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مومن کے لیے لازم ہے کہ رزائل کو نفس سے دور کرنے کے لیے علمِ سلوک اس حد تک حاصل کرے جتنا کہ وہ سمجھے کہ اس کے نفس کو ضرورت ہے کیونکہ رزائل نفس کا ازالہ فرضِ عین ہے۔

تصوف اصولِ دین سے ہے

تفسیر جمل میں ہے:

وَالدِّيْنُ الَّذِيْ لَا يَقْبَلُ التَّغَيُّرَ هُوَ التَّوْحِيْدُ وَالْإِخْلَاصُ وَالْإِيْمَانُ بِمَا جَاءَتْ جَمِيْعُ الرُّسُلِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ... (تفسیر جمل، ۱: ۴۹۷)

"دین وہ چیز ہے جو تغیر و تبدل کو قبول نہیں کرتا، وہ توحید اور اخلاص ہے جسے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لے کر آئے۔"

فائدہ:

اس سے ثابت ہوا کہ تصوف اسلامی اصولِ دین سے ہے۔ اور یہ عبارت ہے خلوص و احسان سے اور بغیر خلوص نہ توحید مقبول ہے نہ ایمان و عمل۔

Scanned with CamScanner

تصوف اصولِ دین سے ہے

تفسیر جمل میں ہے، دین وہ چیز ہے جو تغیر و تبدل کو قبول نہیں کرتا یعنی دین میں تبدیلی نہیں ہوتی کہ حضور اکرم ﷺ نے کچھ فرمایا اور بعد والے کچھ اور کہہ دیں۔ اگر ایسے ہو جائے تو دین، دین نہیں رہے گا۔ دین وہی ہے جو بغیر کسی تبدیلی یا تحریف کے ہے اور وہ ہے توحید و اخلاص جو تمام انبیاءؑ لے کر آئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تصوفِ اسلامی، اصولِ دین سے ہے اور یہ خلوص و احسان پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ خلوصِ قلب نہ ہو تو توحید و ایمان سلامت ہیں نہ مقبول۔

اہل السنۃ والجماعت کا مدار شریعت و طریقت پر ہے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"اہل سنت کا مدار شریعت اور طریقت پر ہے۔ انہی دونوں باتوں کو موقع ریاست اور بزرگی کا گنتے ہیں۔"

(تحفہ اثناء عشریہ، ۲:۷۲۳)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ منکرینِ تصوف، اہل السنۃ والجماعت میں داخل نہیں۔ اہل سنت اور صوفیا محققین نے تصوف اور عقیدۂ تصوف کو کتاب و سنت سے وراثتاً پایا ہے، اس میں سلف سے خلف تک یکسانی کے ساتھ متفق رہے ہیں۔ یہ صوفیا کرام کا اجماعی مسلک ہے۔ ہاں وقتاً فوقتاً جو خرابیاں اس میں پیدا ہوتی رہیں محققین ان کی اصلاح کرتے رہے۔

اہل السنۃ والجماعت کا مدار شریعت و طریقت پر ہے

اہل سنت کے مذہب کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری پہلو شریعت اور باطنی پہلو طریقت ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اپنی کتاب 'تحفہ اثناء عشریہ' میں اہل سنت کے مذہب کو طریقت اور شریعت پر مشتمل گردانتے ہیں اور ان دونوں پہلوؤں کو مذہب اہل سنت میں ایک اعلیٰ مقام دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ منکرینِ تصوف، اہل السنۃ والجماعت میں داخل نہیں ہیں۔ اہل سنت اور صوفیائے محققین نے تصوف اور عقیدۂ تصوف کتاب و سنت سے وراثتاً پایا ہے۔ اس معاملے میں سلف سے خلف تک یعنی سلف صالحین سے لے کر بعد میں آنے والے علمائے حق تمام کے تمام متفق ہیں۔ ہاں وقتاً فوقتاً اس میں جو خرابیاں پیدا ہوتی رہیں محققین اس کی اصلاح کرتے رہے۔ کچھ نا اہل لوگ اس میں کچھ نئی چیزیں داخل کرنے کی کوشش کرتے رہے، بدعات کو تصوف کا حصہ بنانے میں کوشاں رہے لیکن اللہ کے بندے اس کی اصلاح کی کوشش بھی کرتے رہے۔ اور یہ چیزیں کہاں نہیں ہوتیں۔ قرآن تک کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حدیث شریف کے مقابلے میں جھوٹی حدیثیں گھڑی گئیں۔ اسی طرح اس فن کے جھوٹے دعویدار پیدا ہوئے لیکن محققین اُن کو رد کرتے رہے۔

Scanned with CamScanner

تصوف تواتر سے ثابت ہے

تصوف وسلوک تواتر سے ثابت ہے اور اتنی بڑی جماعت کا تواتر ہے جو علم وعمل، زہد وتقویٰ اور خشیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ایسی اور اتنی بڑی جماعت کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہے۔
(اس اجمال کی تفصیل کے لیے کتاب ہذا کے اکیسویں باب میں اعتراض نمبر ۸ کے ذیل میں دیے گئے مندرجات ملاحظہ ہوں)۔

تصوف تواتر سے ثابت ہے

اولیاء وصوفیائے کرام کی اتنی بڑی جماعت کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً بھی محال ہے۔اتنے بڑے بڑے بزرگ اور ساری امت میں سے مثالی اور نیک ترین لوگ! کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ سارے جھوٹ پر متفق ہوں گے۔اس بات کو تو عقل بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

حدیثِ احسان پر تفصیلی بحث

"مرقاۃ شرح مشکوۃ" میں ہے:

قَالَ اَخۡبِرۡنِیۡ عَنِ الۡاِحۡسَانِ...اَلۡمَعۡهُوۡدُ ذِهۡنًا فِی الۡاٰیَاتِ الۡقُرۡاٰنِیَّةِ مِنۡ قَوۡلِهٖ تَعَالٰی لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَ قَالَ هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ وَ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللهَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ وَ الۡاَظۡهَرُ اَنَّ الۡمُرَادَ بِهٖ فِی الۡاٰیَاتِ مَا اشۡتَمَلَ عَلَی الۡاِیۡمَانِ وَ الۡاِسۡلَامِ وَغَیۡرِهِمَا مِنَ الۡاَعۡمَالِ وَالۡاَخۡلَاقِ وَالۡاَحۡوَالِ...

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح،فوائد الایمان بالقدر،۱:۵۹)

ترجمہ: اَلۡاِحۡسَانِ میں الف لام عہد ذہنی ہے جس میں اشارہ قرآنی آیات کی طرف ہے جن میں لفظ احسان وارد ہوا ہے۔اور ظاہر بات یہ ہے کہ مراد ان آیات سے وہ احسان ہے جو شامل ہے ایمان اور اسلام وغیرہ، اعمال ظاہری، اخلاق اور احوال (صوفیا) پر۔

اور "فیض الباری" میں ہے:

اِنَّ الۡاِحۡسَانَ یَنۡقَسِمُ اِلٰی حَالٍ وَ عِلۡمٍ فَاِنَّ مُشَاهَدَةَ الۡحَقِّ بِقَلۡبِهٖ کَاَنَّهٗ یَرَاهُ حَالٌ لَهٗ وَ صِفَتُهٗ قَائِمَةٌ بِهٖ وَلَیۡسَتۡ عِلۡمًا...

(فیض الباری، کتاب الایمان،باب سوال جبرئیل علیہ السلام — الخ،۱:۱۴۹)

Scanned with CamScanner

"احسان منقسم ہے حالِ صوفیا اور علم پر کیونکہ قلب سے حق کا مشاہدہ کرنا، گویا سالک نے آنکھوں سے دیکھا، یہ ایک حالت ہے جو صوفی سالک کی صفتِ قائمہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ حالت علم نہیں۔"

"فیض الباری" کی عبارت سے ظاہر ہے کہ احسان یا تصوف و سلوک صرف علم کا نام نہیں، اس لیے اس علم کے پڑھ لینے سے آدمی عارف باللہ نہیں بن جائے گا۔ جیسے کسی شخص کو نماز، روزہ اور حج کے مسائل کا علم ہو تو محض علم ہونے سے وہ نہ نمازی بن گیا، نہ صائم نہ حاجی۔ یہ تو اعمال ہیں جن کا تعلق محض علم سے نہیں بلکہ کرنے سے ہے۔ اسی طرح تصوف و سلوک حال اور کیفیات ہیں جو شیخ کے سینے سے نکل کر سالک کے قلب کو منور کرتی ہیں۔ ان احوال اور کیفیات کے لیے واضع نے کوئی الفاظ وضع نہیں کیے۔ کتبِ تصوف سے تصوف و سلوک کے متعلق علم کی حد تک رہنمائی مل سکتی ہے لیکن وہ احوال و کیفیات جو اصل مطلوب ہیں وہ شیخ کامل کی توجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ جسے اپنے ربّ سے رشتہ جوڑنے اور تعلق باللہ قائم کرنے کی طلب ہو وہ اس عاجز کے پاس آ جائے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم نہیں رہے گا۔

تصوف و سلوک کا انکار علم یا استدلال پر مبنی نہیں ہے بلکہ جہالت، ضد یا عناد پر مبنی ہے کیونکہ قرآن کریم کی بیسیوں آیات تصوف و سلوک کی اصل اور بنیاد ہیں۔ محدثین نے آیاتِ احسان اس سلسلے میں بطور ثبوت پیش کی ہیں۔ ان کی تفصیل احادیث نبوی ﷺ اور اقوالِ مشائخ میں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کے کلیات کے علاوہ جزئیات تک نصوصِ قرآنی اور آثار سے مؤید ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ صوفیا کے مختلف طرائق اور سلسلے جن میں اشغال و اعمال اور ان کے نتائج و ثمرات کا ذکر ہے، ان کے کلیات اور جزئیات تک کی تائید نصوص و آثار اور روایات سے ہوتی ہے، جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

اسلامی عقائد، فقہی جزئیات، اعمال، اخلاق اور عبادات اسلام کا قالب ہیں۔ مگر اس کا قلب اور روح، اخلاص و احسان یعنی تصوف و سلوک ہے۔ مثلاً تمام فقہاء نے لکھا ہے کہ غیبت سے روزہ نہیں ٹوٹتا یعنی اس عبادت کا قالب مجروح نہیں ہوتا، اور قانون اور ضابطے کی رُو سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر صحیح حدیث میں موجود ہے کہ روزہ کی روح غیبت سے نکل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جیسے جسدِ بے روح بیکار ہے، اسی طرح جس روزہ سے روح نکل گئی، اس کی حیثیت کیا رہ گئی! یہ حقیقت تصوف سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے مولوی علم ہے اور صوفی عمل ہے۔ مولوی قالب ہے اور صوفی قلب ہے۔ مولوی جن اعمال کی جزا و سزا آخرت میں دیکھے گا، صوفی دنیوی زندگی میں برزخ کے حالات دیکھتا ہے۔ مولوی جو چیزیں خواب میں دیکھتا ہے، صوفی عالمِ بیداری میں بذریعہ کشف دیکھتا ہے۔ اسی لیے صوفی کو ایک طرح کی ملائکہ سے مشابہت ہے، جیسا کہ 'مشکوٰۃ' میں ہے:

عَنْ جَابِرٍ فِيْ شَانِ اَهْلِ الْجَنَّةِ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُلْهَمُوْنَ التَّسْبِيْحَ وَ التَّحْمِيْدَ كَمَا تُلْهَمُوْنَ النَّفَسَ... (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفتن فی صفۃ الجنۃ و اھلھا،۴۹۶)

"حضرت جابرؓ سے اہل جنت کے متعلق روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ان پر تسبیح و تہلیل انعام کی جائے گی، جیسے سانس لینا تمہاری فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔"

صوفیا کے ذکر پاسِ انفاس میں یہی حالت ہوتی ہے جو اہل جنت کی بیان ہوتی ہے۔ یہی حدیث سانس سے ذکر کرنے کی

Scanned with CamScanner

اصل اور اس کا ثبوت بھی ہے۔ حدیثِ جبرئیل میں حبسِ دم کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھے اتنا بھینچا کہ بَلَغَ مِنِّی الْجَهْدُ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّهُ الْمَوْتُ ... یعنی مجھے اتنی تکلیف ہوئی کہ میں نے اسے موت خیال کیا۔ یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب سانس رک جائے، دم گھٹنے لگے۔ یہی حبسِ دم کے وقت کیفیت ہوتی ہے اور جب انوار و تجلیاتِ باری کی کثرت ہوتی ہے تو اس وقت ذاکر پر دباؤ پڑتا ہے اور سانس رکنے لگتی ہے۔

اور فیض الباری میں اذکار، اشغال، نسبت، سلاسلِ تصوف وغیرہ کا بیان:

وَاعْلَمْ اَنَّ لَفْظَ الْاِحْسَانِ شَامِلٌ لِجَمِيْعِ اَنْوَاعِ الْبِرِّ مِنَ الْاَذْكَارِ ... وَالْاَشْغَالِ وَغَيْرِهَا وَالْاَذْكَارُ تُقَالُ لِلْاَوْرَادِ الْمَسْنُوْنَةِ وَمَا ذَكَرَهُ الْمَشَائِخُ مِنَ الضَّرَبَاتِ وَالْكَيْفِيَاتِ يُقَالُ لَهَا الْاَشْغَالُ وَالنِّسْبَةُ فِيْ اِصْطِلَاحِهِمْ رَبْطٌ خَاصٌّ سِوَى الرَّبْطِ الْخَالِقِيَّةِ وَالْمَخْلُوْقِيَّةِ فَمَنْ حَصَلَ لَهُ رَبْطٌ سِوَى الرَّبْطِ الْعَامِّ يُقَالُ لَهُ صَاحِبُ النِّسْبَةِ وَالطُّرُقُ الْمَشْهُوْرَةُ فِي التَّصَوُّفِ اَرْبَعَةٌ اَلسُّهْرَوَرْدِيَّةُ وَالْقَادِرِيَّةُ وَالْجِشْتِيَّةُ وَالنَّقْشَبَنْدِيَّةُ وَالسِّلْسِلَةُ السُّهْرَوَرْدِيَّةُ قَدْ تَسَلْسَلَتْ فِيْ اَجْدَادِنَا مِنْ عَشَرَةٍ مُتَّصِلَةٍ ثُمَّ مَا نُقِلَ اِلَيْنَا مِنَ الْاَوَامِرِ وَالنَّوَاهِيْ وَالْوَعْدِ الْوَعِيْدِ سُمِّيَ شَرِيْعَةً وَالتَّخَلُّقُ بِهَا يُسَمّٰى طَرِيْقَةً وَحِيْنَئِذٍ تَنْصَبِغُ الْاَعْمَالُ بِصِبْغِ الْاِيْمَانِ كَمَا كَانَ فِي السَّلَفِ اَمَّا الْيَوْمَ فَعِلْمٌ بِلَا عَمَلٍ وَاِيْمَانٌ بِلَا تَصْدِيْقٍ مِنَ الْجَوَارِحِ رُبَّ تَالِ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ يَلْعَنُهُ ثُمَّ الْفَوْزُ بِالْمَقْصَدِ الْاَعْلٰى وَالنَّيْلُ بِالْمَارِبِ الْاَعْلٰى يُسَمّٰى حَقِيْقَةً وَمِنْ هٰهُنَا ظَهَرَ اَنَّ الطَّرِيْقَةَ وَالشَّرِيْعَةَ لَا تَتَغَايَرَانِ كَمَا زَعَمَهُ الْعَوَامُ ...

(فیض الباری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل علیہ السلام ... الخ، ۱:۱۴۹-۱۵۰)

" احسان کا لفظ تمام نیکیوں پر مشتمل ہے خواہ اذکار ہوں یا اشغالِ صوفیا۔ اذکار کا اطلاق اورادِ مسنونہ پر ہوتا ہے اور مشائخ صوفیا نے جو ضربوں اور کیفیتوں کا ذکر کیا ہے انہیں اشغال کہتے ہیں۔ اور نسبت اصطلاحِ صوفیا میں ایک خاص قسم کے ربط کو کہا جاتا ہے جو خالقیت اور مخلوقیت سے جدا ہے اور جسے یہ ربطِ خاص حاصل ہو جائے اس کو صاحبِ نسبت کہتے ہیں۔ اور تصوف میں چار مشہور سلسلے ہیں: سہروردی، قادری، چشتی اور نقشبندی، اور سلسلہ سہروردی ہمارے خاندان میں دس پشتوں سے متصل چلا آ رہا ہے۔ پھر جو اوامر و نواہی، وعدے اور وعید نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں اسے شریعت کہتے ہیں، ان پر عمل پیرا ہونا، اور اس رنگ میں رنگا جانا طریقت کہلاتا ہے۔ اس وقت تمام اعمال ایمان کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ سلف صالحین کی یہی حالت تھی۔ مگر آج کل علم ہے عمل نہیں، ایمان ہے مگر اعضاء و جوارح سے اس کی تصدیق نہیں، بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کر رہا ہوتا ہے۔ پھر اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنا، اعلیٰ نصب العین تک پہنچنا اصل کامیابی ہے، اس کا نام حقیقت ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شریعت اور طریقت دو مختلف چیزیں نہیں جیسا کہ عوام میں مشہور ہے۔"

الفاظ اور معنی کا تعلق وضع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَاِنِّیْ لَسْتُ مِمَّنْ یَّاْخُذُوْنَ الدِّیْنَ مِنَ الْاَلْفَاظِ بَلْ اَوْلَی الْاُمُوْرِ عِنْدِیْ تَوَارُثُ الْاُمَّةِ وَاِخْتِیَارِ

Scanned with CamScanner

الْاَئِمَّةِ فَإِنَّهُمْ هُدَاةُ الدِّيْنِ وَأَعْلَامُهُ وَلَمْ يَصِلِ الدِّيْنُ إِلَيْنَا إِلَّا مِنْهُمْ فَعَلَيْهِمُ الْاِعْتِمَادُ فِيْ هٰذَا الْبَابِ فَلَا نُسِيْءُ بِهِمُ الظَّنَّ... (فیض الباری، کتاب الوضوء، باب المسح علی الخف... الخ، ۱: ۳۰۲)

"اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دین کو صرف الفاظ سے اخذ کرتے ہیں بلکہ میرے نزدیک الفاظ کے حقیقی معنی امت کا توارث اور وہ صورت ہے جو ائمہ نے اختیار کی ہے کیونکہ وہی دین کے ہادی اور نشان ہیں۔ ہمیں دین تو انہی کے ذریعے پہنچا۔ ہم اس بارے میں انہی پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہم ان کے متعلق سوئے ظن سے بچتے ہیں۔"

بلاشبہ دین متین الفاظ کی شکل میں نقل ہو کر ہم تک پہنچا، مگر ان الفاظ میں حقیقی معنی بتانے والی جماعت بھی ساتھ ساتھ نسلاً بعد نسلٍ چلتی آئی۔ الفاظ دین کے معنی جو ان حضرات نے سمجھے اس کے مطابق عمل کر کے دکھاتے رہے۔ یہی تعامل اور توارث ہے جو دین کی روح ہے۔ اس پر حقیقی اعتماد ہی اصل دین ہے۔ اور یہی دین ایک طرف چار فقہی مذاہب میں اور دوسری طرف چار روحانی سلسلوں میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کا مدار نبوت کے انہی دو پہلوؤں پر ہے۔ اگر الفاظ کو معنی پہنانے کے سلسلے میں آزادی ہو تو وہ دین نہیں بلکہ نفس پرستی ہوگی۔ اس لیے جہاں تک منقول دین کے الفاظ کے معنی سمجھنے کا تعلق ہے اس کا انحصار تعامل امت اور عرف پر ہوگا۔

جہاں تک علم وعمل کا تعلق ہے ہمارے اندر بہت بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں علم کا بہت چرچا ہے مگر عمل کا فقدان ہے۔ اس علم کی حیثیت ایک بے پھل درخت سے زیادہ کچھ نہیں۔ جیسا کہ عارف جامیؒ نے فرمایا:

چو کسب علم کردی در عمل کوش　　　کہ علم بے عمل زہریست بے نوش

رہا ایمان وتصدیق کا سوال تو ایمان ایک دعویٰ ہے۔ کسی دعوے کے ثابت ہونے کا مدار اس کے حق میں صحیح شہادت کے ملنے پر ہے۔ اگر شہادت نہ ملے تو دعویٰ غلط اور مدعی جھوٹا ہے۔ اس لیے ایمان کے دعوے کے لیے اعضاء وجوارح کی شہادت درکار ہے۔ اگر اعضاء وجوارح سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اس دعوے کی تصدیق کریں تو دعوے ثابت، ورنہ دعوے غلط اور مدعی جھوٹا ہے۔ بدقسمتی سے عام مسلمانوں میں یہی دورنگی پائی جاتی ہے۔

دین سے کیا مراد ہے؟

عمدۃ القاری میں حدیث مبارکہ جَاءَ جِبْرَئِيْلُ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ أَيْ يُعَلِّمُوا الْعَقَائِدَ الدِّيْنِيَّةَ وَالْاَعْمَالَ الظَّاهِرَةَ وَالْاَعْمَالَ الْقَلْبِيَّةَ... کی شرح میں اس طرح بحث کی گئی ہے:

"جبرئیلؑ آئے کہ تمہیں دین سکھائیں۔ یعنی تاکہ تم جان لو کہ عقائدِ دینیہ کیا ہیں، اعمالِ ظاہری اور اعمالِ قلبی کون کون سے ہیں۔ (عمدۃ القاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ۔ ۱: ۲۸۲)

اور تحفۃ القاری میں ہے:

دَلَّ الْحَدِيْثُ عَلٰى أَنَّ عُلُوْمَ الدِّيْنِ ثَلَاثَةٌ... اَلْاَوَّلُ عِلْمُ الْعَقَائِدِ وَهُوَ عِلْمُ الْكَلَامِ وَالثَّانِيْ عِلْمُ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَمَعْرِفَةُ الْاَحْكَامِ وَهُوَ عِلْمُ الْفِقْهِ وَالثَّالِثُ عِلْمُ الْمُكَاشَفَاتِ وَالْمُرَاقَبَاتِ وَهُوَ

Scanned with CamScanner

عِلْمُ التَّصَوُّفِ وَمَجْمُوعُهَا الدِّيْنُ وَالْإِحْسَانُ هُوَ أَصْلُ التَّصَوُّفِ الَّذِيْ هُوَ عِبَارَةٌ عَنْ صِدْقِ التَّوَجُّهِ إِلَى اللهِ تَعَالَى وَ جَمِيْعِ مَعَانِي التَّصَوُّفِ الَّتِيْ جَاءَتْ عَنْ مَشَايِخِ الطَّرِيْقَةِ كُلُّهَا رَاجِعَةٌ إِلَى هٰذَا الْمَعْنٰى فَالدِّيْنُ وِتْرٌ ثَلَاثُ رَكَعَاتٍ اَلْأُوْلٰى رَكْعَةُ الْإِيْمَانِ وَ الثَّانِيَةُ رَكْعَةُ الْإِسْلَامِ وَ الثَّالِثَةُ رَكْعَةُ الْإِحْسَانِ وَهِيَ الَّتِيْ تُوَتِّرُ مَا قَدْ صَلّٰى وَ لَا يَصِحُّ الْإِقْتِصَارُ عَلٰى رَكْعَةِ الْإِحْسَانِ فَقَطْ مَالَمْ يَنْضَمَّ إِلَيْهَا شَفْعُ الْإِيْمَانِ وَ الْإِسْلَامِ قَالَ إِمَامُ الْقُرْطُبِيُّ هٰذَا الْحَدِيْثُ يَصِحُّ اَنْ يُّقَالَ لَهٗ اُمُّ السُّنَّةِ...وَ قَالَ قَاضِيْ عِيَاضٌ إِشْتَمَلَ هٰذَا الْحَدِيْثُ عَلٰى جَمِيْعِ وَظَائِفِ الْعِبَادَاتِ الظَّاهِرَةِ وَ الْبَاطِنَةِ...وَمِنْ أَعْمَالِ الْجَوَارِحِ وَمِنْ أَخْلَاصِ السَّرَائِرِ قَالَ عَلَّامَةُ الزَّمَانِ الشَّيْخُ مَحْمُوْدُ الْحَسَنِ الدِّيْوبَنْدِيُّ قُدِّسَ سِرُّهٗ مَقْصُوْدُ الْمُؤَلِّفِ بِهٰذَا التَّرْجَمَةِ اَنَّ الْاَصُوْلَ وَ الْفُرُوْعَ وَالْاَعْمَالَ وَ الْإِيْمَانَ وَ الْإِسْلَامَ وَ الْإِحْسَانَ وَ الْإِخْلَاصَ وَ الْأَخْلَاقَ كُلَّهٗ مِنَ الدِّيْنِ...وَ أَشَارَ بِهٰذَا الْبَابِ إِلٰى اَنَّ مَنْ ذَاقَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ شَرَحَ اللهُ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ وَ خَالَطَ بِشَاشَةَ الْقَلْبِ خَلْطًا رَابِطِيًّا إِتِّحَادِيًّا فَيَجُوْزُ اَنْ يُّقَالَ فِيْ حَقِّهٖ اَنَّهٗ مَحْفُوْظٌ مِنَ الْإِرْتِدَادِ وَ أَمَّا لَيْسَ كَذٰلِكَ فَلَا يَجُوْزُ لَهُ الْوُثُوْقُ عَلٰى إِيْمَانِهٖ...(تحفۃ القاری، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان۔الخ،۱:۱۲۱-۱۲۳)

"حدیثِ جبرئیلؑ تین علوم پر دلالت کرتی ہے:

اوّل عقائد: یہ علمِ کلام ہے۔دوسرا حلال وحرام اور احکام کی معرفت، یہ فقہ ہے۔تیسرا مکاشفات اور مراقبات کا علم ہے، یہ علمِ تصوف ہے۔اور تینوں کے مجموعے کا نام دین ہے۔اور احسان تصوف کی اصل ہے اور اس سے مراد صدقِ توجہ یا اخلاص ہے۔مشائخ سے تصوف کے جتنے معنی منقول ہیں وہ اسی حقیقت کی طرف راجع ہیں۔پس دین اسلام وتر ہوا، تین رکعات: پہلی رکعت ایمان ہے، دوسری اسلام اور تیسری احسان۔اور یہ احسان وتر بنائے گا۔فقط ایک رکعت احسان پر اختصار کرنا درست نہ ہوگا۔جب تک ایمان اور اسلام کی دو رکعتیں ساتھ نہ ملائی جائیں۔علامہ قرطبی نے فرمایا حدیثِ جبرئیلؑ کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سنت کی اصل اور بنیاد ہے۔قاضی عیاض نے کہا کہ حدیثِ جبرئیل تمام وظائف عبادات ظاہری اور باطنی اور اعمال و جوارح اور دل کے اخلاص سب پر مشتمل ہے۔اور شیخ الہند نے فرمایا کہ اس ترجمہ سے امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ اصول وفروع اعمال، ایمان، اسلام، احسان، اخلاص، اخلاق سب دین کے اجزا ہیں اور ہرقل روم والی حدیث میں بشاشۃ الایمان سے مراد یہی احسان ہے اور اس سلسلے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے ایمان کی حلاوت چکھ لی، اس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے کھول دیا اور ایمان کی لذت دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکی، اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ مرتد نہیں ہوگا۔اور جس میں یہ حقیقت نہیں پائی جاتی، اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ایمان پر قائم رہے گا۔"

امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے "مکتوبات" میں لکھا ہے کہ "مراقبہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ جب سالک کو راسخ ہو جائے تو وہ یقیناً ایمان پر مرتا ہے"۔حدیث میں لفظ بشاشت آیا ہے۔امام صاحب نے اسی سے راسخ کی قید لگائی ہے۔

Scanned with CamScanner

علامہ قسطلانی نے اس حدیث کو از قبیل جوامع الکلم قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

هٰذَا الْحَدِيْثُ مِنْ جَوَامِعِ الْكَلِمِ ﷺ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ ... الخ الْاَوَّلُ اِشَارَةٌ اِلٰى مَقَامِ الْمُشَاهَدَةِ وَالْمُكَاشَفَةِ وَالثَّانِيْ نُزُوْلٌ مِّنْ مَقَامِ الْمُشَاهَدَةِ وَالْمُكَاشَفَةِ اِلَى الْمُرَاقَبَةِ ... (ارشاد الساری شرح صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل، ۱:۱۴۰)

"پہلی صورت اشارہ ہے مقام مشاہدہ اور مکاشفہ کی طرف۔ دوسری صورت اشارہ مقام مراقبہ کی طرف ہے۔"

گویا سالک کی دو حالتوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض صوفیا کو کشف ہو جاتا ہے۔ وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ تجلیات باری تعالیٰ، ملائکہ اور ارواح وغیرہ کا۔ بعض کو کشف نہیں ہوتا، وہ مشاہدہ نہیں کر سکتے مگر اس کے باوجود ان میں مراتب کا فرق نہیں ہوگا۔

حدیث جبرئیلؑ کی تاریخی حیثیت اس حدیث کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کرتی ہے۔ جبرئیل کا انسانی شکل میں آکر یہ کلام کرنا اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضور اکرم ﷺ حجۃ الوداع سے واپس آ چکے تھے۔ گویا حضور ﷺ کی عمر کے آخری حصے میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت دین اسلام کی تکمیل ہو چکی تھی۔ احکام نازل ہو چکے تھے۔ گویا ایک ہی مجلس میں دین کا خلاصہ جبرئیلؑ کی زبانی سنوا کر حضور ﷺ کی زبان سے کہلوا دیا کہ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ ... گویا حدیث جبرئیل کا مقصد بتقرير جميع امور الدين متفرقة في مجلس واحد لتضبيطه... یعنی مجلس واحد میں احکام دین کو منضبط اور پختہ کرنے کے لئے دین کا خلاصہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کر دیا کہ دین مرکب ہے تین امور سے، جیسے مغرب کی نماز میں تین رکعتیں ہوتی ہیں۔ اگر کسی شخص نے دو رکعتیں پڑھ لیں مگر تیسری چھوڑ دی تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ اسی طرح جب تصوف کو چھوڑ دیا تو دین کا تیسرا حصہ چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ تکمیل دین نہیں ہوئی۔ جہاں تک تصوف کا تعلق ہے لوگ دو قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اول وہ جو تارک تصوف ہیں، ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے کوئی تارک صلوٰۃ ہو، ایسے شخص کو فاسق کہتے ہیں۔ مگر جو منکر تصوف ہو اس نے تو دین کے تہائی حصے کا انکار کر دیا اور انکار جزو مستلزم ہے انکار کل کو۔ تو ایسے شخص کے متعلق اس کے بغیر کیا کہا جا سکتا ہے، اللہ اسے ہدایت دے۔

شرح 'عقیدۃ السفارینی' میں اس حدیث کے متعلق لکھا ہے:

وَحَاصِلُ ذَالِكَ اَنَّ الدِّيْنَ وَاَهْلَهٗ كَمَا اَخْبَرَ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَاِمَامُ الْمُرْسَلِيْنَ ﷺ ثَلَاثُ طَبَقَاتٍ اَوَّلُهَا الْاِسْلَامُ وَاَوْسَطُهَا الْاِيْمَانُ وَاَعْلَاهَا الْاِحْسَانُ فَمَنْ وَصَلَ اِلَى الْعُلْيَا فَقَدْ وَصَلَ اِلَى الَّتِيْ تَلِيْهَا فَالْمُحْسِنُ مُؤْمِنٌ وَالْمُؤْمِنُ مُسْلِمٌ هٰكَذَا جَاءَ الْقُرْاٰنُ فَجَعَلَ الْاُمَّةَ عَلٰى هٰذِهِ الْاَصْنَافِ الثَّلَاثَةِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذَالِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ فَالْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَمْ يَقُمْ بِوَاجِبِ الْاِيْمَانِ هُوَ الظَّالِمُ لِنَفْسِهٖ وَالْمُقْتَصِدُ الَّذِيْ اَدَّى الْوَاجِبَ وَتَرَكَ الْمُحَرَّمَ هُوَ الْمُؤْمِنُ الْمُطْلَقُ وَالسَّابِقُ بِالْخَيْرَاتِ

Scanned with CamScanner

هُوَ الْمُحْسِنُ الَّذِیْ عَبَدَ اللّٰہَ کَاَنَّہٗ یَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ یَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاہُ ... (شرح عقیدہ سفارینی، ۱:۴۳۰)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ دین اور اہل دین کے تین طبقے ہیں جیسا کہ خاتم النبیین اور امام المرسلین ﷺ نے خبر دی ہے۔ پہلا طبقہ لفظ اسلام سے، دوسرا ایمان سے اور تیسرا احسان سے ظاہر ہے۔ پس جو شخص درجۂ اعلیٰ پر پہنچا وہ انتہائی بلندی کو پہنچ گیا۔ پس محسن مومن ہے، اور مومن مسلم ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں آچکا ہے، اللہ نے امت کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ پھر وارث کردیا ہم نے کتاب کا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں انتخاب کرلیا ہے۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنے نفس کے حق میں ظالم ہیں، کچھ وہ ہیں جو میانہ روی اختیار کرتے ہیں، کچھ وہ جو اللہ کی مدد سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اور یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ وہ مسلم جو واجبات ایمان کو قائم نہ کرے وہی اپنے نفس کے حق میں ظالم ہے اور مقتصد وہ ہے جس نے واجبات کو ادا کیا اور محرمات سے پرہیز کیا، یہ مطلق مومن ہے۔ اور سابق بالخیرات وہ محسن ہے جس نے اللہ کی عبادت کی، گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا تو اللہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔

حدیث احسان پر تفصیلی بحث

'مرقاۃ شرح مشکوٰۃ' میں ہے:

قَالَ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ ... وَالْاَخْلَاقِ وَالْاَحْوَالِ ...

'الاحسان' میں الف لام عہدِ ذہنی ہے۔ الف لام حرفی کی قسم 'غیر زائدہ' کی آگے مزید چار قسموں میں سے 'عہد ذہنی' مزید ایک قسم ہے جو بعض لیکن غیر معین افراد کو ظاہر کرتی ہے۔ الاحسان میں عہد ذہنی درحقیقت ان تمام آیات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں لفظ احسان آیا ہے۔ گویا جبریلؑ کا لفظ احسان ارشاد فرمانا درحقیقت ان تمام قرآنی آیات کو اپنے احاطے میں لیتا ہے جو احسان کے بارے میں ہیں اور سب مل کر احسان کی ایک جامع تشریح بھی بن جاتی ہیں اور اس کے انعام وصلے کی خبر بھی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان آیات سے مراد وہ احسان ہے جو ایمان اور اسلام، اعمالِ ظاہری و باطنی، اخلاق اور احوالِ صوفیاء پر مشتمل ہے۔

فیض الباری، کتاب الایمان، باب سوال جبریلؑ میں ہے کہ:

احسان کے دو پہلو ہیں، حالِ صوفیا اور علم۔ کیونکہ قلب سے حق کا مشاہدہ کرنا گویا سالک نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، یہ ایک حالت ہے جو صوفی سالک کی صفت قائمہ ہے اور ظاہر ہے کہ حالت علم نہیں ہے۔ 'فیض الباری' کی عبارت سے ظاہر ہے کہ احسان یا تصوف وسلوک صرف علم نہیں کہ انسان کو اس کے بارے میں پتہ ہونا یا خبر ہونا کافی ہو۔ اس لیے سلوک کو پڑھ لینے سے کوئی عارف باللہ نہیں بن سکتا۔ جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مسائل سے باخبر انسان حاجی، نمازی نہیں ہوجاتا۔ یہ اعمال ہیں جن کا تعلق محض علم سے نہیں عمل سے ہے۔ علم ہونا ضروری ہے، بنیادی چیز ہے کہ علم ہوگا تو عمل ہوگا لیکن صرف علم ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی طرح تصوف وسلوک درحقیقت وہ حال اور کیفیات ہیں جو شیخ کے سینے سے آتی ہیں اور سالک کے قلب تک پہنچ کر اسے

Scanned with CamScanner

منور کرتی ہیں۔ ان احوال و کیفیات کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ ان کو بتانے، سمجھانے کے لیے کوئی لفظ وضع نہیں کیے جاسکے، نہ ہوسکتے ہیں۔ یہ محسوس کرنے کی چیزیں ہیں جن کا تجربہ قلب کو ہوتا ہے۔ بتائی یا سمجھائی نہیں جاسکتیں۔ کتب تصوف سے صرف علم کی حد تک تصوف وسلوک کے متعلق رہنمائی مل جاتی ہے لیکن احوال و کیفیات کا حصول جو کہ تصوف کا حاصل وصول اور مطلوب حقیقی ہیں، وہ شیخ کامل کی توجہ کے بغیر ممکن نہیں۔

یہاں قلزمِ فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خانؒ کمال مہربانی سے برادرانِ اسلام کو دعوت عام دیتے ہیں کہ جسے اپنے ربّ سے رشتہ جوڑنے، تعلقِ عبد و معبود کو درجۂ احسان پر لے جانے کی طلب ہو وہ میرے پاس آجائے۔ جو نعمتِ عظمیٰ میرے ربّ نے مجھے عطا فرمائی ہے، اس کا اقرار و شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ وہ میرے پاس آجائے، ان شاء اللہ وہ اس نعمتِ بے بدل سے محروم نہیں رہے گا۔

اور یہی دعوتِ عام قاسمِ فیوضات حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوانؒ بھی اپنی حیاتِ مبارکہ میں دیتے رہے۔ اور یہی دعوت و پیشکش شیخ سلسلہ حضرت امیر عبدالقدیر اعوان مدظلہ العالی کی طرف سے آج بھی ہر کسی کو ہے۔

تصوف وسلوک کا انکار کسی علم یا دلیل کی بنا پر نہیں کیا جاتا۔ محض جہالت کی بنیاد پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ جاہل کے پاس دلیل تو ہوتی نہیں لہٰذا ضد اور عناد اسے اپنی بات پر اڑے رہنے پر اکساتا ہے۔ اگر کوئی صاحبِ علم ہو تو قرآن کی بیسیوں آیات اس کی رہنمائی کرنے کو موجود ہیں کیونکہ وہ تصوف وسلوک کی اصل اور بنیاد ہیں۔ محدثین نے قرآن پاک سے آیاتِ احسان کو بطور ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کی تفصیل احادیث نبوی اور اقوالِ مشائخ میں ملتی ہے۔ تصوف کے بنیادی قوانین اور کلیے ہی نہیں، تصوف کی جزئیات تک قرآن وسنت اور صلحائے امت کے متواتر تعامل اور روایات سے ثابت ہوتی ہیں، ان کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

اسلامی عقائد، فقہی جزئیات، اعمال، اخلاق اور عبادات اسلام کا بدن (ظاہر) ہیں۔ مگر اسلام کی قلب اور روح، اخلاص و احسان ہے جسے تصوف اور سلوک کہا جاتا ہے۔ مثلاً تمام فقہاء نے لکھا ہے کہ غیبت سے روزہ نہیں ٹوٹتا یعنی اس عبادت کا قالب (ظاہر یا جسم) نہیں ٹوٹتا مگر صحیح حدیث سے واضح ہے کہ غیبت سے روزہ کی روح نکل جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ جسم بغیر روح کے محض بیکار ہے۔ جس روزے سے روح نکل گئی، اس کی حیثیت کہاں رہ گئی! اس حقیقت کا احساس وادراک تصوف ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مولوی یعنی اسلام کا علمِ ظاہری رکھنے والا اگر علم ہے تو صوفی عمل ہے۔ مولوی قالب (جسم) ہے تو صوفی قلب ہے۔ مولوی اعمال کی جزا و سزا آخرت میں دیکھے گا لیکن صوفی دنیا کی زندگی ہی میں برزخ کے حالات دیکھ لیتا ہے۔ مولوی جو چیزیں خواب میں دیکھتا ہے، صوفی حالت بیداری میں بذریعہ کشف دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرح سے صوفی کو ملائکہ سے مشابہت ہے جیسا کہ ''مشکوٰۃ'' میں حضرت جابرؓ سے اہلِ جنت کے متعلق روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، ''ان پر تسبیح وتہلیل (اس طرح) انعام کی جائے گی جس طرح سانس لینا تمہاری فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔''

صوفیاء کے طریقۂ ذکر پاسِ انفاس (جس میں ہر سانس میں اللہ کا نام دل سے لیا جاتا ہے) کی یہی کیفیت وحالت ہوتی

Scanned with CamScanner

ہے جو اہل جنت کی بیان کی گئی۔ یہی حدیث مبارکہ ہے جو بنیاد ہے ذکر پاس انفاس کی جس میں ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ دل اللہ کے مبارک نام کا ذکر کرتا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ اس طریقہ ذکر کی اصل بھی ہے اور اس کا ثبوت بھی۔

اسی طرح حدیث جبرئیلؑ میں حبس دم (سانس رکنے کے دوران انوارات کا حصول) کی کیفیت وحالت پائی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جبرئیلؑ نے اس قدر بھینچا کہ بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدُ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهُ الْمَوْتُ... یعنی مجھے اتنی تکلیف ہوئی کہ میں نے اسے موت خیال کیا۔ یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب سانس رک جائے، دم گھٹنے لگے۔ یہی حالت حبس دم کے وقت ہوتی ہے اور جب انوارات وتجلیات باری کی کثرت ہوتی ہے تو اس وقت ذاکر پر دباؤ پڑتا ہے اور سانس رکنے لگتی ہے۔

اور 'فیض الباری' میں اذکار، اشغال، نسبت اور سلاسل تصوف کا بیان، تعریف وتشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

لفظ 'احسان' میں تمام نیکیاں یعنی اعمال صالحہ آجاتے ہیں۔ خواہ اذکار ہوں یا اشغال صوفیا۔ اذکار سے مراد وہ تمام ورد آجاتے ہیں جو سنت سے ثابت ہیں۔ اور مشائخ صوفیا نے جو ضربوں اور کیفیتوں کا ذکر کیا ہے، انہیں اشغال کہتے ہیں۔ نسبت صوفیا کے نزدیک ایک اصطلاح تصوف ہے جس سے مراد ایک خاص قسم کا ربط (تعلق) ہے جو خالقیت اور مخلوقیت کے رشتے سے مختلف ہے اور جسے یہ رشتہ، یہ ربط حاصل ہو جائے وہ صاحب نسبت کہلاتا ہے۔ تصوف میں چار سلسلے ہیں: سہروردی، قادری، چشتی اور نقشبندی۔ سہروردی سلسلہ ہمارے (سید انور شاہ کشمیریؒ کے) خاندان میں دس پشتوں سے چلا آرہا ہے، اور وہ تمام اعمال جنہیں کرنے کا حکم ہم تک قرآن وسنت اور تعامل صحابہ کے ذریعے پہنچا، اور وہ تمام اعمال جن کے کرنے سے ہمیں روک دیا گیا ان اعمال کی جزا یا سزا کا بیان، یہ سب شریعت کہلاتا ہے۔ ان پر عمل پیرا ہونا، احکام الٰہی کو حرز جان بنالینا، اس رنگ میں رنگا جانا طریقت کہلاتا ہے۔ اس وقت تمام اعمال ایمان کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ انسان کا یقین اس کمال کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کے اعمال اس کے یقین کا مظہر بن جاتے ہیں۔ سلف صالحین کی یہی کیفیت تھی۔ افسوس! آج کل علم تو ہے، عمل نہیں ہے۔ ایمان تو ہے مگر اتنا کمزور کہ اعضاء وجوارح (اعمال) سے اس کی تصدیق وشہادت نہیں ملتی۔ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کررہا ہوتا ہے۔ پھر اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنا، زندگی کا اعلیٰ مقصد (رضائے باری کا حصول) متعین کرنا، اس اعلیٰ نصب العین تک پہنچنا اصل کامیابی ہے۔ اس کا نام 'حقیقت' ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شریعت اور طریقت دو مختلف چیزیں نہیں جیسا کہ عوام الناس میں مشہور ہے۔

الفاظ معنیٰ کا تعلق وضع (مقرر) کرتے ہوئے سید انور شاہؒ فرماتے ہیں:

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دین کو صرف الفاظ سے اخذ کرتے ہیں بلکہ میرے نزدیک الفاظ کے حقیقی معنی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ارشاد فرمائے اور امت کو نسل در نسل منتقل ہوتے چلے گئے اور وہ صورت ہے جو آئمہ نے اختیار کی ہے کیونکہ وہی دین کے علمبردار اور ہادی ہیں۔ ہمیں دین انہی کے ذریعے پہنچا۔ اس لیے اس معاملے میں ہم انہی پر اعتبار کرتے ہیں۔ ہم ان کے متعلق غلط رائے قائم کرنے سے بچتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ گو اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ دینِ اسلام ہم تک الفاظ کی شکل میں نقل ہو کر پہنچا مگر ان الفاظ کے حقیقی معنی جو نبی اکرم ﷺ سے صحابہ تک پہنچے کہ وحیِ الٰہی کی تلاوت صحابہؓ کی مجلس میں کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ صحابہ کرامؓ سے اس کا مطلب پوچھتے تو جواب میں صحابہؓ اہلِ زبان ہونے کے باوجود ہمیشہ یہی عرض کرتے کہ واللہ ورسولہٗ اعلم (اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں)۔ یوں الفاظ کے ساتھ ہادیِ برحق ﷺ معنی بھی عنایت فرماتے اور یاد رہے کہ قرآن کی رو سے آپ ﷺ اپنی مرضی سے کچھ بھی ارشاد نہ فرماتے تھے، جو حق تعالیٰ کا حکم ہوتا وہی فرماتے۔

المختصر، دین اگر الفاظ کی صورت منتقل ہوتا رہا تو ان الفاظ کے حقیقی معنی بتانے والی جماعت بھی ساتھ ساتھ نسلاً بعد نسلٍ چلتی آئی۔ انہوں نے الفاظ پر ان کے معنی کے مطابق عمل کر کے بھی دکھایا۔ اُن کے ان اعمالِ صالحہ اور نسل در نسل منتقل ہونے والے دین ہی کو 'تعامل اور توارث' کہتے ہیں جو دین کی روح ہے۔ اس پر کامل اعتماد ہی اصل دین ہے اور یہ دین ظاہری طور پر چار فقہی مذاہب اور دوسری طرف چار روحانی سلسلوں میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کا مدارِ ثبوت کے انہی دو پہلوؤں پر ہے۔ یہ یاد رہے کہ وحیِ الٰہی صرف الفاظ ہی نہیں، وہ معانی بھی ہیں جو قلبِ اطہر رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے۔ لہٰذا وحی کے الفاظ کو اپنے مطلب ومرضی کے معانی پہنانے کی آزادی کا مطلب نفس پرستی ہوگا، دین ہرگز نہیں۔ اس لیے جہاں تک نسل در نسل منتقل ہو کر آنے والے دین کے الفاظ کے معنی سمجھنے کا تعلق ہے، اس کا انحصار تعاملِ امت اور عرف (فقہ) پر ہوگا۔ اب رہ گئی علم وعمل کی بات تو اس سلسلے میں ہمارے اندر بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں علم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے مگر عمل کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ بے عمل علم کی حیثیت ایک بے پھل درخت سے کچھ زیادہ نہیں۔ جیسا کہ عارف باللہ عبدالرحمٰن جامیؒ فرماتے ہیں:

چو کسب علم کردی در عمل کوش   کہ علم بے عمل زہریست بے نوش

ترجمہ: اگر تُو نے علم حاصل کر لیا ہے تو اب عمل پر کمربستہ ہو جا کیونکہ علم اگر عمل کے بغیر ہو تو مہلک زہر بن جاتا ہے۔

رہا ایمان وتصدیق کا سوال کہ جس بات پر ایمان ویقین کا کوئی دعویٰ کرتا ہے، اس پر اس کا دل کس درجے کا یقین رکھتا ہے۔ اس کا دل کس حد تک اسے صحیح اور سچا جانتا ہے یعنی کس حد تک وہ اس کی تصدیق کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ہمیشہ شہادت یا ثبوت درکار ہوتا ہے۔ اگر صحیح ثبوت وشہادت نہ ملے تو دعویٰ باطل ٹھہرتا ہے اور مدعی (دعویٰ کرنے والا) جھوٹا قرار پاتا ہے۔ اس لیے ایمان کے دعویٰ کی تصدیق کے لیے اعضاء وجوارح (اعمال وافکار) کی شہادت درکار ہے۔ اگر اعضاء وجوارح سے ایسے اعمال سرزد ہوتے ہوں جو کیے گئے دعویٰ کی تصدیق کریں تو دعویٰ ثابت، ورنہ دعویٰ غلط اور مدعی جھوٹا۔ بدقسمتی سے عام مسلمانوں میں دعویٰ وعمل کی یہی دورنگی پائی جاتی ہے۔

دین سے کیا مراد ہے؟

'عمدۃ القاری'، جلد اوّل، صفحہ ۲۸۲ پر حدیث مبارکہ (جآء جبرئیل ﷺ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ...) کی تشریح میں کچھ اس طرح بحث کی گئی ہے۔ "جبرئیلؑ آئے کہ تمہیں دین سکھائیں۔ (یعنی) تم جان لو کہ عقائد دینیہ کیا ہیں۔ اعمالِ ظاہری اور اعمالِ قلبی کون کون سے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

اور 'تحفۃ القاری' جلد اول، صفحہ ۱۲۱ - ۱۲۳ پر ہے:

سلیس ترجمہ: حدیث جبرئیل تین علوم پر دلالت کرتی ہے:

اول: عقائد، یہ علم الکلام ہے۔ دوم: حلال وحرام کی معرفت وتمیز، یہ فقہ ہے۔

سوم: مکاشفات اور مراقبات کا علم، یہ علم تصوف ہے۔ ان تینوں علوم کے مجموعے کا نام دین اسلام ہے اور احسان تصوف کی اصل ہے۔ اس سے مراد یعنی اس کا مفہوم ومطلب انتہا درجے کا صدق، توجہ، اخلاص اور یکسوئی ہے۔ مشائخ نے تصوف کے جتنے بھی مطالب بتائے ہیں، سب اسی حال وحقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اخلاص فی النیت اور اخلاص فی العمل۔ دوئی کا کوئی تصور نہیں۔ بندہ صرف اللہ کا ہے اور اس کا سب کچھ صرف اللہ کے لیے ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں نبی اکرم ﷺ کے لیے حکم ہے کہ آپ اعلان فرمادیجئے کہ

(اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ...)

پس دین اسلام وتر ہوا۔ تین رکعات، پہلی رکعت ایمان ہے، دوسری اسلام اور تیسری احسان۔ اور یہ احسان وتر مکمل کرے گا۔ فقط ایک ہی رکعت احسان پر اختصاص کرنا ہرگز درست نہ ہوگا جب تک کہ ایمان اور اسلام کی دو رکعتیں ساتھ ملائی نہ جائیں۔ علامہ قرطبیؒ نے فرمایا ''حدیث جبرئیلؑ کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ سنت کی اصل اور بنیاد ہے۔'' قاضی عیاضؒ نے کہا ''حدیث جبرئیل تمام وظائف، عبادات ظاہری وباطنی اور اعمال وجوارح اور دل کے اخلاص، سب پر مشتمل ہے۔'' شیخ الہندؒ نے فرمایا ''اس ترجمہ سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ اصول وفروع اعمال (اعمال کی بنیادی باتوں سے لے کر جزئیات تک) ایمان، اسلام، احسان، اخلاص، اخلاق، سب دین کے اجزا ہیں اور ہرقل روم والی حدیث میں 'بشاشۃ الایمان' سے مراد یہی احسان ہے۔

(یہ حدیث مبارکہ بخاری شریف میں عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کی گئی ہے جس میں ہرقل روم نے حضرت ابوسفیانؓ (جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے) کو بلا کر نبی اکرم ﷺ کے متعلق معلومات لی تھیں۔ اس طویل حدیث میں ہرقل روم نے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ کیا کوئی اُن کے دین میں آکر بعد میں برا سمجھ کر پھر جاتا ہے؟

ابوسفیانؓ نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا، تو ہرقل نے کہا تھا کہ

وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ...

ترجمہ: ایمان کا یہی حال ہے کہ جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے (تو پھر نہیں نکلتی)۔

اور اس سلسلے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے ایمان کی حلاوت چکھ لی، اس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے کھول دیا اور ایمان کی لذت اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی، جڑ پکڑ گئی، اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ کبھی مرتد نہیں ہوگا۔ جس کے ایمان کی یہ حقیقت وکیفیت نہ ہو، اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ایمان پر قائم رہے گا۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے 'مکتوبات' میں لکھا ہے کہ ''جب سالک کا مراقبہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ راسخ ہوجائے تو وہ یقیناً ایمان پر مرتا ہے۔ حدیث میں لفظ 'بشاشت' آیا ہے۔ امام صاحبؒ نے اسی سے راسخ کی قید (شرط) لگائی ہے۔

Scanned with CamScanner

علامہ قسطلانیؒ نے 'حدیث جبرئیل' کو از قبیل جامع الکلم قرار دیا ہے۔ جوامع الکلم وہ صفت عالیہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی اُن چار صفات مطہرات میں سے ہے جو صرف آپ ﷺ ہی کو ودیعت کی گئیں۔ جوامع الکلم کا مطلب ہے کہ ایک فصیح اللسان ہستی جو کم سے کم الفاظ میں معنی ومطالب کے خزانے عطا فرمادے۔ اور آپ ﷺ اس کائنات کے سب سے افضل جوامع الکلم انسان ہیں۔

علامہ قسطلانیؒ نے ارشاد الساری، جلد اول، صفحہ ۱۴۰ پر اس حدیث مبارکہ کو آپ کی اسی صفت مبارکہ کی مظہر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے: پہلی صورت (كَأَنَّكَ تَرَاهُ...) اشارہ ہے مقام مشاہدہ ومکاشفہ کی طرف۔

دوسری صورت (فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ...) اشارہ ہے مقام مراقبہ کی طرف۔

گویا اس حدیث مبارکہ میں سالک کی دونوں حالتوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض صوفیا کو کشف ہوجاتا ہے وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں تجلیات باری تعالیٰ، ملائکہ اور ارواح وغیرہ کا۔ بعض کو کشف نہیں ہوتا، وہ مشاہدہ نہیں کرسکتے لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں مراتب ودرجات کا فرق نہیں ہوگا۔

حدیث جبرئیلؑ کی تاریخی حیثیت اس حدیث کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کرتی ہے۔ حضرت جبرئیلؑ کا انسانی شکل میں آکر یہ سب سوال کرنا اور پھر ان کے جوابات کی تصدیق بھی کرنا اُس زمانے کا واقعہ ہے جب حضور اکرم ﷺ حجۃ الوداع سے واپس مدینہ تشریف لاچکے تھے۔ گویا حضور ﷺ کی حیات مطہرہ کے بالکل آخری دنوں میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت دین اسلام کی تکمیل ہوچکی تھی، تمام احکام دین مکمل ہوچکے تھے جس کا اعلان اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ... الخ کی آیہ مبارکہ میں ہوچکا تھا۔ اس ایک مجلس مبارکہ میں دین کا خلاصہ جبرئیلؑ کی زبانی امت کو سنوا کر نبی اکرم ﷺ کی زبان اصدق سے یہ بھی کہلوا دیا گیا کہ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ... گویا حدیث جبرئیلؑ کا مقصد بتقریر جمیع امور الدین متفرقۃ فی مجلس واحد لتضبیطہ... یعنی مجلس واحد میں احکام دین کو نظم وترتیب دینے اور پختہ کرنے کے لیے دین کا خلاصہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کردیا کہ دین مرکب ہے تین امور سے یعنی دین تین امور کا مجموعہ ہے۔ جیسے مغرب کی نماز میں تین رکعتیں ہوتی ہیں اور کسی نے اگر دو رکعتیں پڑھ لیں مگر تیسری چھوڑ دی تو اس کی نماز ہرگز نہ ہوگی۔ بالکل اسی طرح اگر تصوف کو چھوڑ دیا تو دین کا تیسرا حصہ چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ دین کی تکمیل نہیں ہوئی۔ تصوف کے حوالے سے لوگ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ سرے سے ہی تارک تصوف ہے جو تصوف کو مانتے ہیں نہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسے کوئی نماز کو ترک کرنے والا ہو تو ایسے شخص کو فاسق کہتے ہیں لیکن جو منکر تصوف ہو تو اس نے تو دین کے تہائی حصے کا ہی انکار کردیا اور جزو کا انکار ہو تو لازماً کل کا انکار بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ اُسے ہدایت دے۔

شرح 'عقیدۃ السفارینی'، جلد اول، صفحہ ۴۳۰ پر اس حدیث کے متعلق لکھا ہے:

اس حدیث مبارکہ کا حاصل یہ ہے کہ دین اور دین کے ماننے والوں کے تین طبقے ہیں جیسا کہ خاتم النبیین اور امام المرسلین ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے۔ ہمیں بتایا سمجھایا ہے۔ پہلا طبقہ لفظ اسلام سے، دوسرا ایمان سے اور تیسرا احسان سے

Scanned with CamScanner

ظاہر ہے۔ پس جو شخص ایمان وعمل کے درجہ اعلیٰ پر پہنچا، وہ انتہائی بلندی کو پہنچ گیا، وہ محسن ہے۔ وہ تیسرے درجے تک پہنچا تو پہلے درجے اسے لازماً حاصل ہیں۔ پس محسن مومن بھی ہے، اور مومن مسلم ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے۔ اللہ کریم نے امت کو تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''پھر وارث کردیا ہم نے کتاب کا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کرلیا ہے۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو اپنے نفس کے حق میں ظالم ہیں، کچھ وہ ہیں جو درمیانے درجے پر ہیں، کچھ وہ ہیں جو اللہ کی مدد سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اور یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔'' (الفاطر: ۳۲)

جو مسلم واجبات ایمان کو قائم نہ کرے، فرائض وسنن سے اعراض کرے، وہی اپنے نفس، اپنی جان کے حق میں ظالم ہے۔ مقتصد وہ ہے جس نے واجبات (جو اس پر دین کی طرف سے لازم تھے) کو ادا کیا اور جو مذہب کی رو سے ناجائز وحرام تھا، اس سے پرہیز کیا۔ یہ بالکل مومن ہے اور سابق بالخیرات وہ محسن ہے جو ہمیشہ رب کی حضوری کے احساس سے سرشار رہا اور اس نے اللہ کی اطاعت وعبادت یوں کی گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا تو اللہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ یعنی پہلی کیفیت کے متعلق شیخ المکرم ''فرماتے ہیں کہ حضور حق کا احساس اتنا شدید ہو کہ جس طرح ایک خادم دیکھتا ہے کہ مالک سامنے ہے تو وہ ساری جان سے کوشش کرکے خدمت وتابعداری بجالاتا ہے۔ یا ملازم مالک کو سامنے تو نہیں پاتا مگر اسے یہ یقین ہو کہ وہ ہر وقت مالک کی نگرانی میں ہے تو بھی وہ اپنے فرائض سے بہت زیادہ بڑھ کر خدمت گزاری کرتا ہے۔

قرب نوافل

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ (بِمِثْلِ) بِشَیْئٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ ثُمَّ لَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَ بَصَرَهُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِهٖ ...الخ (البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۹۶۳)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا بندہ فرائض کی پابندی سے جو قرب حاصل کرتا ہے اس جیسا کوئی قرب نہیں۔ پھر میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو جب میں اسے پسند کرلیتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ گزشتہ صفحے پر لکھا جاچکا ہے۔

اس کی تشریح فیض الباری میں حضرت انور شاہ کشمیری صاحبؒ نے یہ فرمائی ہے:

وَمَرَّ عَلَیْهِ الذَّهَبِیُّ فِی الْمِیْزَانِ وَقَالَ: لَوْلَا هَیْبَةُ الْجَامِعِ لَقُلْتُ فِیْهِ: سُبْحَانَ اللهِ... قُلْتُ: اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَلْیَضَعْهُ عَلَی الرَّاْسِ وَ الْعَیْنِ وَ اِذَا تَعَالٰی شَیْئٌ مِّنْهُ عَنِ الْفَهْمِ فَلْیَکِلْهُ اِلٰی اَصْحَابِهٖ وَ لَیْسَ

Scanned with CamScanner

سَبِيْلُهُ اَنْ يَجْرِحَ فِيْهِ اَمَّا عُلَمَاءُ الشَّرِيْعَةِ فَقَالُوْا: مَعْنَاهُ اَنَّ جَوَارِحَ الْعَبْدِ تَصِيْرُ تَابِعَةً لِّلْمَرْضَاةِ الْاِلٰهِيَّةِ حَتّٰى لَا تَتَحَرَّكُ اِلَّا عَلٰى مَا يَرْضٰى بِهٖ رَبُّهُ فَاِذَا كَانَتْ غَايَةُ سَمْعِهٖ وَبَصَرِهٖ وَجَوَارِحِهٖ كُلِّهَا هُوَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ فَحِيْنَئِذٍ صَحَّ اَنْ يُّقَالَ: اِنَّهُ لَا يَسْمَعُ اِلَّا لَهُ وَلَا يَتَكَلَّمُ اِلَّا لَهُ فَكَانَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ صَارَ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ قُلْتُ: وَهٰذَا الْعُدُوْلُ عَنْ حَقِّ الْاَلْفَاظِ لِاَنَّ قَوْلَهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ بِصِيْغَةِ الْمُتَكَلِّمِ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّهُ لَمْ يَبْقَ مِنَ الْمُتَقَرِّبِ بِالنَّوَافِلِ اِلَّا جَسَدُهُ وَ شَبَحُهُ وَ صَارَ الْمُتَصَرِّفُ فِيْهِ الْحَضْرَةُ الْاِلٰهِيَّةُ فَحَسْبُ وَ هُوَ الَّذِيْ عَنَاهُ الصُّوْفِيَّةُ بِالْفَنَاءِ فِي اللّٰهِ اَيِ الْاِنْسِلَاخُ عَنْ دَوَاعِيْ نَفْسِهٖ حَتّٰى لَا يَكُوْنَ الْمُتَصَرِّفُ فِيْهِ اِلَّا هُوَ... وَهٰذَا كَمَا فِي الْقُرْاٰنِ فِيْ قِصَّةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ (فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ) فَالْمَرْئِيُّ وَالْمُشَاهَدُ لَمْ يَكُنْ اِلَّا النَّارُ دُوْنَ الرَّبِّ جَلَّ مَجْدُهُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ مَا تَجَلّٰى فِيْهَا قَالَ: (يَا مُوْسٰى اِنِّيْ اَنَا اللّٰهُ...) الخ قَالَ فَانْظُرْ فِيْهِ اَنَّهُ كَيْفَ سَمِعَ صَوْتًا مِّنَ النَّارِ... (اِنِّيْ اَنَا اللّٰهُ...) فَهُوَ نَارٌ ثُمَّ صَحَّ قَوْلُهُ: (اِنِّيْ اَنَا اللّٰهُ...) اَيْضًا فَالْمُتَكَلِّمُ فِي الْمَرْئِيِّ كَانَ هُوَ الشَّجَرَةُ ثُمَّ اُسْنِدَ تَكَلُّمُهَا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَ ذٰلِكَ لِاَنَّ الرَّبَّ جَلَّ مَجْدُهُ لَمَّا تَجَلّٰى فِيْهَا صَارَتِ الْوَاسِطَةُ لِمَعْرِفَتِهٖ اِيَّاهُ هِيَ الشَّجَرَةُ فَاَخَذَ الْمُتَجَلّٰى فِيْهِ حُكْمَ الْمُتَجَلِّيْ بِنَفْسِهٖ... اِلٰى اَنْ قَالَ وَاِنَّمَا تَجَلّٰى رَبُّهُ فِي النَّارِ لِحَاجَةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِلَيْهَا ثُمَّ قَالَ: فَاِنْ فَهِمْتَ مَعْنَى التَّجَلِّيْ كَمَا هُوَ حَقُّهُ وَبَلَغْتَ مَبْلَغَهُ فَدَعِ الْاَمْثَالَ وَالصُّوَرَ الْمَنْصُوْبَةَ، وَارْقَ اِلٰى رَبِّكَ حَنِيْفًا فَاِنَّهُ اِذَا صَحَّ لِلشَّجَرَةِ اَنْ يُّنَادٰى فِيْهَا بِاِنِّيْ اَنَا اللّٰهُ فَمَا بَالُ الْمُتَقَرِّبِ بِالنَّوَافِلِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ اللّٰهُ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ كَيْفَ! وَاِنَّ ابْنَ اٰدَمَ الَّذِيْ خُلِقَ عَلٰى صُوْرَةِ الرَّحْمٰنِ لَيْسَ دُوْنَ مِنْ شَجَرَةِ مُوْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَ قَالَ الْمُحَشِّيْ وَ عَلَيْكَ اَنْ تَتَاَمَّلَ تِلْكَ الْمَبَاحِثَ بِعَيْنِ التَّحْقِيْقِ فَاِنَّهَا لَا تَنْحَلُّ بِالْعُلُوْمِ الظَّاهِرَةِ فَقَطْ مَا لَمْ تُرْجَعْ اِلٰى كُتُبِ الصُّوْفِيَّةِ فَاِنَّ لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالًا فَلَا تَعُدُّهَا تَافِهًا... (فیض الباری، کتاب الرقاق، باب تواضع، ۴ :۴۲۸-۴۲۹)

’’میزان الاعتدال میں جب امام ذہبی اس حدیث پر پہنچے تو کہا کہ ”اگر ’صحیح بخاری‘ کی ہیبت میرے دل پر نہ ہوتی تو میں اس حدیث کے بارے میں یوں کہتا۔“ سید انور شاہؒ فرماتے ہیں ”سبحان اللہ!“ (امام ذہبی نے علم منطق نہ پڑھا تھا کہ اس میں دلیل و حجت کرتے۔) میں کہتا ہوں جب حدیث صحیح ہے تو چاہیے کہ بسر و چشم قبول کی جائے۔ جب کوئی مسئلہ کسی کے فہم سے بالاتر ہو تو اس علم کے جاننے والوں کے سپرد کر دینا چاہیے۔ یہ نہیں کہ اس مسئلہ پر خود ہی جرح شروع کر دے۔ بہرحال علمائے ظواہر نے اس حدیث کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ بندہ کے اعضاء و جوارح اللہ کی رضا کے تابع ہو جاتے ہیں، ان سے وہی حرکت ہوتی ہے جو اللہ کو پسند ہو، اور اس کے تمام اعضاء کی انتہا اور غایت ذاتِ باری تعالیٰ ہو تو یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ بندہ سنتا ہے تو خدا کے لیے، دیکھتا ہے تو خدا کے لیے، گویا اللہ تعالیٰ اس بندے کے کان اور آنکھیں بن گیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ معنی لینا حدیث کے الفاظ سے پھر جانا

ہے۔ حدیث میں صیغہ متکلم استعمال ہوا ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جو بندہ نوافل سے قرب الٰہی حاصل کر چکا ہو، جسم اور صورت کے بغیر اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور اس میں تصرف کرنے والا ربّ العالمین ہی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو صوفیا فنافی اللہ کہتے ہیں۔ یعنی خواہشات و دواعی سے وہ شخص نکل جاتا ہے اور اس میں صرف اللہ کا تصرف رہ جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں موجود ہے کہ جب آپ آگ کے پاس پہنچے تو اس کے اندر سے آواز آئی، ''برکت والی ہے وہ ذات جو آگ کے اندر ہے'' مگر سامنے آگ ہی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ کی تجلی اس آگ سے ظاہر ہوئی تو آواز آئی، ''میں اللہ ہوں'' تو اس میں غور کرو کہ حضرت موسیٰؑ نے کس طرح آگ میں سے کلام باری سنی، کلام کرنے والا بظاہر وہ درخت ہے۔ پھر کلام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کردی گئی کیونکہ ربّ العالمین کے نور کی تجلی درخت میں ظاہر ہوئی اور وہ درخت معرفت الٰہی کا واسطہ بن گیا۔ تو تجلی فیہ (درخت) متجلی بنفسہٖ (ربّ العالمین) کے حکم میں آگیا۔ بات یہ تھی نور کا ظہور آگ میں ہوا، کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو اس وقت آگ کی ضرورت تھی۔ پھر فرمایا کہ اگر تم نے تجلی کے حقیقی معنی سمجھ لیے تو مثالوں اور صورتوں سے آگے بڑھ اور ترقی کر کے قرب الٰہی حاصل کر، کیونکہ جب ایک درخت کے متعلق درست ہے کہ اس میں آواز آئے ''میں اللہ ہوں''، تو اللہ کے مقرب بندہ کے لیے کیوں درست نہ ہو کہ ربّ العالمین اس کے کان، آنکھ وغیرہ بن جائے۔ جب بندہ صورتِ رحمٰن پر پیدا ہوا ہے تو اسے شجرِ موسیٰ سے کم تو خیال نہ کرنا چاہیے۔ ان بحثوں پر پوری تحقیق سے غور کرنا چاہیے۔ یہ عقدے صرف علوم ظاہری سے نہیں کھل سکیں گے جب تک علوم صوفیا کی طرف رجوع نہ کیا جائے کیونکہ ہر مردے و ہر کارے، یہ کام صوفیا ہی کا ہے۔

اس بحث سے ایک عقدہ یہ کھلا کہ کلامِ الٰہی قدیم اور تجلی ذاتِ باری قدیم، مگر حادث درخت میں ظاہر ہوئی اور سنائی دی۔ اس طرح قرآن کریم کلام قدیم ہے، غیر مخلوق ہے مگر اس کا ظہور حادث مخلوق کی زبان سے ہوتا ہے۔ اسی کلامِ باری تعالیٰ کا بطور کشف والہام ایک صوفی عارف کی زبان پر ظاہر ہونا بعید نہیں۔ جبھی تو عارف رومی نے فرمایا:

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

حدیث کی شرح کی ابتدا میں جو شیخ انورؒ نے ''سبحان اللہ'' کہہ کر بات ابہام میں رکھ دی اس کی تفصیل میزان الاعتدال میں یوں ملتی ہے:

وَلَوْلَا هَيْبَةُ الْجَامِعِ الصَّحِيحِ لَعَدَدْتُهُ فِي مُنْكَرَاتِ خَالِدِ بْنِ مَخْلَدٍ... (میزان الاعتدال، ۱: ۶۴۱)

"اگر صحیح بخاری کی ہیبت میرے دل پر طاری نہ ہوتی تو میں اس حدیث کو خالد بن مخلد کی منکرات میں شمار کرتا۔"

حافظ العصر علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں اس قول کو بڑی خوبی سے ردّ کیا ہے اور شیخ انور نے بات فیصلہ کن کہہ دی کہ ہر فن کی بات صاحب فن کے سپرد کرنی چاہیے۔ وہی اس پر فیصلہ کن رائے دینے کا اہل ہوتا ہے۔ آدمی کو جس فن سے واقفیت نہ ہو اپنا بھرم رکھنے کے لیے خواہ مخواہ اس پر جرح نہ شروع کردے۔

Scanned with CamScanner

قربِ نوافل

بخاری شریف کی حدیثِ مبارکہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا بندہ فرائض کی پابندی سے جو قرب حاصل کرتا ہے، اس جیسا کوئی قرب نہیں۔ پھر میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو جب میں اسے پسند کر لیتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔۔۔ الخ

اس حدیثِ مبارکہ کا ترجمہ گزشتہ صفحات میں موجود ہے اس کی تشریح فیض الباری میں حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے یوں فرمائی ہے کہ 'میزانِ اعتدال' میں امام ذہبی اس حدیث پر پہنچے تو کہا کہ "اگر 'صحیح بخاری' کی ہیبت میرے دل پر نہ ہوتی تو میں اس حدیث کے بارے میں یوں کہتا۔" سید انور شاہؒ فرماتے ہیں۔۔۔ سبحان اللہ! امام ذہبی نے علمِ منطق نہ پڑھا تھا کہ اس میں دلیل و حجت کرتے۔ انہوں نے حدیثِ نبوی ﷺ پڑھی تھی اور جب حدیث صحیحہ ہے تو چاہیے کہ بسر و چشم قبول کی جائے (حدیثِ صحیحہ وہ حدیث ہے جو اپنے تمام راویوں کے حوالے سے صحیح تسلیم کی جائے)۔ ہاں! اگر کوئی مسئلہ کسی کے فہم سے بالاتر ہو تو اسے اس علم کے جاننے والوں کے سپرد کر دینا چاہیے۔ یہ مناسب نہیں کہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ایسے مسئلے پر خود ہی جرح شروع کر دے۔ بہر حال علمائے ظواہر نے اس حدیث کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ بندہ کے اعضاء و جوارح اللہ کی رضا کے تابع ہو جاتے ہیں اور ان سے وہی افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اس کے ہر ہر قول و فعل، حرکات و سکنات کی غرض و غایت اور مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہو۔ یوں کہیے کہ اس کا نصب العین ذاتِ باری ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ اس کی خاطر کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے تو اس کے لیے، سنتا ہے تو اس کے لیے۔ گویا اللہ تعالیٰ اس بندے کے کان، آنکھیں بن گیا ہے۔

مزید فرماتے ہیں کہ علمائے ظواہر کی رائے اپنی جگہ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس حدیث کے یہ معنی لینا حدیث کے الفاظ سے پھر جانا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں صیغہ متکلم استعمال ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ جو بندہ نوافل سے قربِ الٰہی حاصل کر چکا ہو، جسم و صورت کے علاوہ اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی، بلکہ اللہ کے قبضہ و تصرف میں چلی جاتی ہے۔ اس کا دل، روح، خواہش، ارادہ، ہر جذبہ اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اس پر خود اللہ تصرف کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کو صوفیا فنا فی اللہ کہتے ہیں یعنی اپنی خواہشاتِ نفس، اپنی مرضی، پسند، ناپسند، ہر جذبے کے دعویٰ سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ ہے جو اسے اپنی مرضی، اپنے تصرف سے چلاتا ہے۔ یعنی صورتِ ظاہری کے علاوہ جو کچھ ہے اس میں بس اللہ ہی اللہ ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ جب آپؑ آگ کے پاس پہنچے تو اس کے اندر سے آواز آئی "برکت والی ہے وہ ذات جو آگ کے اندر ہے" مگر بظاہر سامنے آگ تھی۔ جب اللہ کی تجلی اس آگ سے ظاہر ہوئی تو آواز آئی۔ "میں اللہ ہوں۔" مقامِ غور و فکر ہے کہ کس طرح حضرت موسیٰؑ نے آگ میں سے کلام باری سنا۔ کلام کرنے والا بظاہر وہ درخت ہے لیکن کلام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی گئی کیونکہ رب العالمین کے نور کی تجلی درخت میں ظاہر ہوئی اور یوں وہ درخت معرفتِ الٰہی کا واسطہ بن گیا۔ تو متجلی فیہ یعنی جس پر تجلی ظاہر کی گئی (درخت)، متجلی من نفسہٖ یعنی جس ذات کی وہ تجلی تھی (رب العالمین) کے حکم میں آ گیا۔ بات یہ ہے کہ نور کا ظہور آگ

Scanned with CamScanner

میں ہوا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو اس وقت آگ کی ضرورت تھی۔

سید انور شاہؒ یہاں پہنچ کر فرماتے ہیں کہ اگر تم نے تجلی کے حقیقی معنیٰ سمجھ لیے تو مثالوں اور صورتوں سے آگے بڑھ کر قرب الٰہی حاصل کرو کیونکہ اگر ایک درخت کے متعلق درست ہے کہ اس سے آواز آئے "میں اللہ ہوں" تو اللہ کے مقرب بندے کے لیے کیوں درست نہ ہو کہ رب العالمین اس کے کان، آنکھ وغیرہ بن جائے۔ جب بندہ صورتِ رحمٰن پر پیدا ہوا ہے تو اسے شجرِ موسیٰؑ سے کم تو خیال نہ کرنا چاہیے۔ ان معاملات اور بحثوں پر پوری تحقیق سے غور کرنا چاہیے۔ لیکن یاد رہے! یہ عقدے صرف علوم ظاہری کے بل بوتے پر نہیں کھلیں گے جب تک علوم صوفیا کی طرف رجوع نہ کیا جائے کیونکہ ہر مرد ے و ہر کارے، یہ کام صوفیا ہی کا ہے۔"

سید انور شاہ کشمیریؒ کی اس ساری بحث کا حاصل وصول یہ ٹھہرا کہ کلامِ الٰہی قدیم اور تجلیِ ذاتِ باری قدیم (جو ہمیشہ سے ہے) مگر اس کا مظہر حادث (جو ہمیشہ سے نہیں تھا، نہ ہمیشہ رہے گا) درخت ٹھہرا، یعنی اس لافانی وقدیم ذات کی تجلی ایک فانی درخت پر ظاہر ہوئی اور سنائی بھی دی۔ اسی طرح قرآنِ کریم کلامِ قدیم ہے (کلام الٰہی اللہ کی صفات میں سے ہے اور اللہ کی تمام صفات اس کی ذات کی طرح قدیم یعنی ہمیشہ سے ہیں)، غیر مخلوق ہے مگر اس کا ظہور حادث مخلوق کی زبان سے ہوتا ہے۔ اسی طرح کلامِ باری تعالیٰ بطور کشف والہام ایک صوفی عارف کی زبان پر ظاہر ہونا بعید نہیں۔ اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں:

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

"ان کی کہی بات اللہ کی کہی بات ہے اگرچہ وہ اللہ کے بندے کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔"

اس حدیث مبارکہ کی شرح کی ابتدا میں امام ذہبی کی جس بات کو سبحان اللہ کہہ کر نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

'میزان الاعتدال' میں وہ ساری بات جلد اول، صفحہ ۳۰۱ پر یوں لکھی ملتی ہے:

وَلَوْلَا هَيْبَةُ الْجَامِعِ الصَّحِيحِ لَعَدَدْتُهُ فِي مُنْكَرَاتِ خَالِدِ بْنِ مَخْلَدٍ ...

یعنی، "اگر صحیح بخاری کی ہیبت میرے دل پر طاری نہ ہوتی تو میں اس حدیث کو خالد بن مخلد کی منکرات میں شمار کرتا۔"

حافظ العصر علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں اس قول کو بڑی خوبی سے رد کیا ہے اور شیخ انور نے بات فیصلہ کن کہہ دی کہ ہر فن کی بات صاحبِ فن کے سپرد کرنی چاہیے۔ وہی اس پر فیصلہ کن رائے دینے کا اہل ہوتا ہے۔ آدمی کو جس فن سے واقفیت نہ ہو اپنا بھرم رکھنے کے لیے خواہ مخواہ اس پر جرح نہ شروع کر دے۔

قربِ فرائض اور قربِ نوافل میں فرق:

فیض الباری میں ہے:

وَهٰهُنَا بَحْثٌ لِلصُّوْفِيَةِ فِي فَضْلِ الْقُرْبِ بِالنَّوَافِلِ وَالْقُرْبِ بِالْفَرَائِضِ فَقَالُوْا: إِنَّ الْعَبْدَ فِي قُرْبِ الْأَوَّلِ يَصِيْرُ جَارِحَةً لِلّٰهِ جَلَّ مَجْدُهٗ وَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ نَفْسُهٗ يَكُوْنُ جَارِحَةً لِعَبْدِهٖ فِي الْقُرْبِ الثَّانِيْ ... (فیض الباری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۴:۴۲۷)

Scanned with CamScanner

''یہاں قربِ فرائض اور قربِ نوافل کے سلسلے میں صوفیوں کے لیے بحث ہے۔ صوفیا نے فرمایا کہ قربِ فرائض میں بندہ اعضائے خدا تعالیٰ بنتا ہے اور قربِ نوافل میں خدا تعالیٰ اعضائے بندہ بن جاتا ہے۔''

جب بندہ اپنے رب کا قرب اس درجہ کا حاصل کر لیتا ہے تو رب کی طرف سے یہ اعلان کوئی انوکھا نہیں معلوم ہوتا:

(مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا) وَاِنَّمَا قَالَ: مَنْ عَادٰی لِیْ وَلَمْ یَقُلْ وَلِیًّا لِّیْ تَضْخِیْمًا لِشَانِ الْعَدَاوَۃِ لِاَنَّ فِی الْاَوَّلِ اِیْذَانًا بِاَنَّ عَدَاوَۃَ وَلِیٍّ کَاَنَّھَا عَدَاوَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی بِخِلَافِ الثَّانِیْ...

(فیض الباری شرح صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۴:۴۲۷)

حضور اکرم ﷺ نے عَادٰی لِیْ وَلِیًّا ... فرمایا، وَلِیًّا لِّیْ نہیں فرمایا۔ اس سے دشمنی کی شان ظاہر کرنا مقصود تھا، کیونکہ پہلی صورت میں حقیقتاً دشمنی خدا سے ہے، ولی سے نہیں۔ دوسری صورت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

علامہ سیوطی نے اس حدیث کی تفصیل کی غرض سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے 'القول الجلی فی حدیث الولی...' یہ رسالہ ہمارے کتب خانے میں موجود ہے۔ اور 'الحاوی للفتاوٰی' میں علامہ نے اس حدیث کو مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف راویوں سے نقل کیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ عَنْ جِبْرَئِیْلَ عَنِ اللّٰہِ یَقُوْلُ عَزَّ وَجَلَّ: مَنْ اَھَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْمُحَارَبَۃِ وَاِنِّیْ لَاَغْضَبُ لِاَوْلِیَآئِیْ کَمَا یَغْضَبُ اللَّیْثُ الْحَرْدُ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ... الخ

(الحاوی للفتاوٰی، ۱:۵۶۰)

۲۔ عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدِ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِیْ وَ مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِمِثْلِ الْفَرَائِضِ... (الحاوی للفتاوٰی، ۱:۵۶۲)

۳۔ عَنْ مَیْمُوْنَۃَ اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ: مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدِ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِیْ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِمِثْلِ اَدَآءِ الْفَرَائِضِ ... الخ (الحاوی للفتاوٰی، ۱:۵۶۲)

۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی: مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ نَاصَبَنِیْ بِالْمُحَارَبَۃِ ... الخ (الحاوی للفتاوٰی، ۱:۵۶۳)

۵۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ: مَنْ اَھَانَ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ بَارَزَنِیْ بِالْعَدَاوَۃِ یَا ابْنَ اٰدَمَ لَمْ تُدْرِكْ مَا عِنْدِیْ اِلَّا بِاَدَآءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْكَ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَحَبَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاَکُوْنُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ، وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِہٖ وَلِسَانَہُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِہٖ وَ قَلْبَہُ الَّذِیْ یَعْقِلُ بِہٖ، فَاِذَا دَعَانِیْ اَجَبْتُہٗ وَاِنْ سَاَلَنِیْ اَعْطَیْتُہٗ وَاِنِ اسْتَنْصَرَنِیْ نَصَرْتُہٗ... (الحاوی للفتاوٰی، ۱:۵۶۳)

ان احادیث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ حضور اکرم ﷺ نے امت کو تعلیم فرمائی ہے کہ اولیاء اللہ سے محبت پیدا کریں اور ان سے دشمنی رکھنے کی جرأت نہ کریں۔ چنانچہ آخری حدیث کے متعلق ابن جوزی لکھتے ہیں:

فَاَرَدْتُّ تَفْھِیْمَنَا لِتَحْقِیْقِ الْمُحَبَّۃِ لِلْوَلِیِّ ... (الحاوی للفتاوٰی، ۱:۵۶۴)

"ولی اللہ کی محبت اپنے دل میں ثابت کرنے کے لیے ہمیں سمجھایا گیا ہے۔"

پھر حدیث میں حضور ﷺ کی یہ دعا ملتی ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ ...

(جامع الترمذی، ابواب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالیه، ۱۸۷:۲)

یعنی "اے خدا! میں تجھ سے تیری محبت کا سوال کرتا ہوں اور اس کی محبت کا جو تجھے دوست رکھتا ہے۔"

علامہ شوکانی نے 'تحفۃ الذاکرین' میں اس حدیث کی شرح میں فرمایا:

وَقَدْ وَرَدَ فِی السُّنَّةِ ذِكْرُ الْاَسْبَابِ الَّتِیْ یَتَسَبَّبُ بِهَا الْعِبَادُ اِلٰی مَحَبَّةِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَ سَئَالَهٗ حُبَّ مَنْ یُّحِبُّهٗ فَاِنَّهٗ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ اِلَّا الْخُلَّصَ مِنْ عِبَادِهٖ فَحُبُّهُمْ طَاعَةٌ مِّنَ الطَّاعَاتِ وَ قُرْبَةٌ مِّنَ الْقُرَبِ ... (تحفۃ الذاکرین، ۳۳۱)

"اور حدیث میں ان اسباب کا ذکر ہے جن کو خدا کے بندے محبتِ الٰہی کا ذریعہ بناتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ نے ان لوگوں کی محبت کا سوال کیا جو اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف مخلص بندے ہی خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ پس! ان کی محبت اطاعتوں میں ایک اطاعت ہے اور قربِ الٰہی کی ایک صورت ہے۔"

ان روایات میں دو امور کی تلقین اور تاکید کی گئی ہے، ایک کا تعلق پرہیز یا اجتناب سے ہے، اور وہ ہے اولیاء اللہ کی دشمنی۔ اس سے اتنا ڈرایا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کی دشمنی حقیقت میں اللہ سے دشمنی ہے۔ دوسرے کا تعلق ایک کام کرنے کی تاکید سے ہے اور وہ ہے اولیاء اللہ سے محبت کرنا، اور اسے اطاعت اور ذریعہ قرب قرار دیا گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اللہ والوں سے محبت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ سے محبت کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ ان حضرات کے پاس ایک ہی مجرب نسخہ ہے کہ وہ بندے کو اللہ کا ذکر کرنے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان کی صحبت میں رہ کر جب ذکر کیا جاتا ہے تو لازماً اللہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ "بخاری" اور "مسلم" میں اس اجتماعی ذکر کے فوائد اور نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے:

لَا یَقْعُدُ قَوْمٌ یَّذْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَآئِكَةُ وَ غَشِیَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَ نَزَلَتْ عَلَیْهِمُ السَّكِیْنَةُ وَ ذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنْ عِنْدَهٗ ... (شرح نووی علی الصحیح المسلم، کتاب الذکر والدعا والتوبه والاستغفار، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن و علی الذکر، ۳۴۵:۲)۔

"جب کچھ لوگ مل کر ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں تو ملائکہ انہیں ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت ان پر چھا جاتی ہے۔ اور ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ملائکہ میں ان کا ذکر کرتا ہے۔"

هُمُ الْقَوْمُ لَا یَشْقٰی بِهِمْ جَلِیْسُهُمْ ... (شرح نووی علی الصحیح المسلم، کتاب الذکر والدعا والتوبه والاستغفار، باب فضل مجالس ذکر، ۳۴۴:۲)

هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا یَشْقٰی بِهِمْ جَلِیْسُهُمْ ... "وہ ایسی جماعت ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا۔"

(الصحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ۹۴۸:۲)

اس حدیث صحیح سے ذکرِ الٰہی اور اولیاء اللہ کی صحبت کا اثر واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی صرف صحبت سے ہی اتنا

Scanned with CamScanner

فائدہ ہوتا ہے کہ انسان بدبخت ہو کر نہیں مرتا۔

•فیض الباری شرح صحیح بخاری" میں حضرت انور شاہ صاحب" اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

(أَلَا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهِمْ) فَيَحُفُّوْنَهُمْ بِأَجْنِحَتِهِمْ...وَفِي الْحَدِيْثِ أَنَّهُمْ يُحِيْطُوْنَ بِهِمْ كَالْهَالَةِ بِالْقَمَرِ عَلَى شَاكِلَةِ الدَّائِرَةِ...وَاعْلَمْ أَنَّ ذِكْرَ اللهِ يَحْدُثُ دَائِرَةً حَوْلَ الذَّاكِرِ كَمَا أَنَّكَ تَقْذِفُ حَجَرًا إِلَى الْمَاءِ فَتَرَى الْأَمْوَاجَ تَتَلَاطَمُ مِنْ حَوْلِهٖ تَمْتَدُّ بِقَدْرِ قُوَّةِ الرَّامِيْ وَضُعْفِهَا فَكَمَا أَنَّ الْمَاءَ يَتَحَرَّكُ مُدَى الْحَرَكَةِ كَذَالِكَ حَالَ الْأَشْيَاءِ الَّتِيْ تَشْمَلُهَا دَائِرَةُ الذِّكْرِ فَإِنَّهَا تَصِيْرُ ذَاكِرَةً وَ نُقِلَ عَنِ الشَّعْرَانِيِّ أَنَّهُ جَلَسَ مَرَّةً يَذْكُرُ اللهَ فَرَأَى أَنَّ مَا مِنْ شَيْءٍ حَوْلَهٗ إِلَّا جَعَلَ يَذْكُرُ اللهَ، حَتّٰى إِذَا أَصْبَحَ رَأَى أَنَّ ذِكْرَهٗ قَدِ اسْتَغْرَقَ الْأَرْضَ بِضَوَاحِيْهَا وَلَمْ يَبْقَ شَيْءٌ إِلَّا كَانَ يُسَاعِدُهٗ فِي الذِّكْرِ وَ هُوَ مَعْنٰى قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: هُوَ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ فَإِنَّهٗ بِجُلُوْسِهٖ بَيْنَ الذَّاكِرِيْنَ صَارَ مَشْمُوْلًا بِالذِّكْرِ وَ الذَّاكِرِيْنَ فَكَانَ مَعَهُمْ وَ السِّرُّ فِيْهِ أَنَّ ذِكْرَ اللهِ حَيَاةٌ فَلَا يَبْلُغُ شَيْئًا إِلَّا يَحْدُثُ فِيْهِ حَيَاةٌ وَ حِيْنَئِذٍ تَتَّسِعُ دَائِرَةُ الذِّكْرِ بِقَدْرِ اتِّسَاعِ صَوْتِ الذَّاكِرِ حَتّٰى تَصِيْرَ الْأَشْيَاءُ كُلُّهَا حَوْلَ الذَّاكِرِ إِحْيَاءً ذَاكِرِيْنَ وَإِنْ كُنْتَ قَدْ ذُقْتَ حَلَاوَةَ مَا أَلْقَيْنَا عَلَيْكَ تَبَيَّنَتْ مَعْنٰى تَسْبِيْحِ الْجِبَالِ وَ الطَّيْرِ مَعَ دَاوٗدَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ... لَمْ يَكُنْ يَذْكُرُ وَيُسَبِّحُ رَبَّهٗ كَمَا أَخْبَرَ بِهِ الْقُرْآنُ إِلَّا جَعَلَ مَا حَوْلَهٗ مِنَ الْجِبَالِ وَ الطَّيْرِ يُسَبِّحُ مَعَهٗ لِدُخُوْلِهٖ فِيْ حَلْقَةِ ذِكْرِهٖ وَ إِذْ كَانَ نَبِيًّا مِّنَ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ كَانَ ذِكْرُهٗ أَيْضًا بِقَدْرِ مَرْتَبَتِهٖ فَكَانَتِ الْأَشْيَاءُ تَتَأَثَّرُ مِنْهُ مَا لَا تَتَأَثَّرُ بِذِكْرِ أَحَدٍ...

(فیض الباری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر الله، ۴:۴۲۱)

"ملائکہ اپنے پروں سے ان پر سایہ کر لیتے ہیں، اور حدیث میں ہے ملائکہ ان کا یوں احاطہ کر لیتے ہیں جیسے چاند کے گرد ہالہ، اور جان لو کہ اللہ کا ذکر، ذاکرین کے گرد دائرہ کی طرح پھیل جاتا ہے، جیسے تُو پانی میں پتھر پھینکے تو دیکھتا ہے کہ لہریں اردگرد موجیں مارنے لگتی ہیں، اور لہروں کا پھیلاؤ پتھر پھینکنے والے کی قوت کے متناسب ہوگا۔ جس طرح پتھر پھینکنے سے پانی متحرک ہوتا ہے تو وہ حرکت پانی میں دور تک پہنچ جاتی ہے اسی طرح جو چیزیں دائرہ ذکر میں آتی ہیں وہ سب متاثر ہوتی ہیں اور ذاکر بن جاتی ہیں۔ امام شعرانی سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ ذکر کرنے بیٹھے دیکھا کہ اردگرد کی تمام چیزیں ذکر کرنے لگی ہیں حتیٰ کہ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ ان کے ذکر کا اثر پوری زمین میں پھیل چکا ہے اور ہر چیز ذکر میں ان کی موافقت کر رہی ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان کہ "یہ وہ جماعت ہے جس میں بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا" کا مطلب یہی ہے، کیونکہ ذاکرین میں بیٹھنا ان میں شامل ہو جانا ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ اللہ کا ذکر زندگی ہے، جس چیز تک یہ پہنچتا ہے اسے زندہ کر دیتا ہے اور ذاکر کی آواز کے مطابق یہ دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ سارا ماحول زندہ ہو جاتا اور ذاکر بن جاتا ہے۔ اگر تجھے اس حقیقت کا احساس ہو جائے تو داؤد علیہ السلام کے ساتھ جبال وطیور کی تسبیح کا راز معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ جب ذکر کرتے تو ماحول ذاکر بن جاتا، جیسا کہ قرآن حکیم بتاتا ہے کیونکہ یہ چیزیں ان کے حلقۂ ذکر میں داخل ہو جاتی تھیں، اور چونکہ آپ ﷺ نبی تھے اس لیے ان کے ذکر کی قوت بھی ان کے منصب کے متناسب تھی۔ تمام اشیاء ان کے ذکر سے متاثر ہوتی تھیں، جو دوسروں کی شان سے بلند ہے۔"

Scanned with CamScanner

شجرو حجر اور جبال وطیور کے ذکر کرنے کا ثبوت واضح طور پر حدیث میں موجود ہے۔

چنانچہ ابن ماجہ، باب الحج؛ ترمذی، باب الحج اور بخاری شریف باب الاذان میں ہے: عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ مُلَبٍّ يُلَبِّي إِلَّا لَبَّى مَا عَنْ يَمِينِهِ وَشِمَالِهِ مِنْ حَجَرٍ أَوْ شَجَرٍ أَوْ مَدَرٍ حَتَّى تَنْقَطِعَ الْأَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا... (سنن ابن ماجه، ابواب الحج، باب التلبية، ٢١٥)

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ مَرْفُوْعًا مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُلَبِّي إِلَّا لَبَّى يَمِيْنَهُ وَشِمَالَهُ مِنْ حَجَرٍ أَوْ شَجَرٍ أَوْ مَدَرٍ حَتَّى تَنْقَطِعَ الْأَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا... (جامع ترمذی، کتاب الحج، باب، ما جاء فی فضل التلبيه والنحر ۱: ۱۰۳)

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان تلبیہ کرتا ہے اس کے دائیں بائیں کے تمام پتھر، درخت، ڈھیلے تک تلبیہ کہتے ہیں، حتیٰ کہ مشرق سے مغرب تک تمام تلبیہ کہتے ہیں۔"

وَفِي الْبُخَارِيِّ عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ فِي الْأَذَانِ أَيْضًا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا يَسْمَعُ مَدٰى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَالْإِنْسُ وَلَا شَيْءٌ إِلَّا شَهِدَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ...

(الصحیح البخاری، کتاب الاذان، باب رفع الصوت بالنداء، ۱: ۸۶)

اور بخاری میں اذان کے سلسلے میں ہے کہ "حضور ﷺ نے فرمایا، جنوں اور انسانوں اور دوسری مخلوق میں سے جو بھی اذان کی آواز سنتی ہے وہ موذن کے حق میں قیامت کے دن گواہی دے گی۔"

شرح حدیث سے واضح ہوا کہ شیخ کی توجہ کے اثرات سارے ماحول میں پھیل جاتے ہیں، حلقۂ ذکر کے دوران شاگردوں کا شیخ کے قریب یا دُور بیٹھنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ ذاکر جب ذکر میں بیٹھتا ہے تو اثرِ ذکر سے سارا ماحول زندہ ہو جاتا ہے اور تمام چیزیں ذاکر بن جاتی ہیں۔

اس حدیث سے ضمناً ایک اور فائدہ بھی اٹھاتے جائیں۔ جو لوگ سماعِ موتیٰ کے منکر ہیں وہ ذرا آنکھیں کھولیں اور اس پر غور کریں کہ جب مٹی، شجر، حجر، غرض تمام چیزیں تلبیہ اور اذان کی آواز سنتی ہیں تو وفات کے بعد آدمی کے ریزہ ریزہ اور مٹی ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب مٹی سنتی ہے تو جس آدمی کا جسم مٹی ہو گیا وہ کیوں نہ سنے گا؟ ہاں! اس میں اختلاف ہے کہ جب میت کے اجزأ بکھر گئے، مٹی میں مل گئے یا پانی میں گھل گئے یا ہوا میں اڑ گئے تو اس وقت اجزأ نے جو صورت اختیار کی اسی کی خصوصیت کے مطابق ذکر و تسبیح کرے گا، یا میت کے اجزأ کی ہی مناسبت سے ذکر کرے گا؟ اس اختلاف کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب مٹی، پتھر، شجر، حجر میں فہم و ادراک موجود ہے تو میت مٹی بن کر بھی شعور و ادراک اور فہم سے محروم نہیں رہ سکتا، ورنہ غیر ذی شعور پر غیر ذی فہم سے ذکر و تسبیح کرنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

گذشتہ صفحات میں جو روایات اور ان کی شرح بیان ہوئی ہے اس سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ کی محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک مجرب ذریعہ ہے۔

۲۔ اولیاء اللہ کے پاس کامیاب نسخۂ ذکرِ الٰہی کی تلقین اور اس کا سلیقہ سکھانا ہے۔

۳۔ ذکرِ الٰہی کی کثرت اور اولیاء اللہ کی صحبت سے انسان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

اور وہ کبھی بد بخت ہو کے نہیں مرتا۔

۴۔ اولیاء اللہ سے دشمنی خدا سے دشمنی ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ایک روز فرمایا تھا: "اولیاء اللہ سے دشمنی کفر تو نہیں مگر توہین کرنے والے مرتے کفر پر ہی ہیں۔"

۵۔ فرائض راس المال ہیں، ترقی ہمیشہ نوافل سے ہوتی ہے۔

مگر جس کے فرائض پورے نہیں اس کے نوافل کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

۶۔ ان احادیث سے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

۷۔ منکرینِ کشف والہام کو سوچنا چاہیے کہ کیا امت محمدیہ شجر موسوی سے بھی گئی گزری ہے؟

۸۔ اس حدیث سے اجتماعی حلقۂ ذکر کا ثبوت بھی مل گیا۔

۹۔ ذاکرین صوفیاء محلِ نزولِ انوار و تجلیات باری ہیں۔

قربِ فرائض اور قربِ نوافل میں فرق:

'فیض الباری'، جلد چہارم، صفحہ ۴۲۷ پر ہے:

ترجمہ: "یہاں قربِ فرائض اور قربِ نوافل کے سلسلے میں صوفیوں کے لیے بحث ہے۔ صوفیا نے فرمایا کہ قربِ فرائض میں بندہ اعضائے خدا تعالیٰ بنتا ہے اور قربِ نوافل میں خدا تعالیٰ اعضائے بندہ بن جاتا ہے۔"

حق بات ہے کہ جب بندہ اپنے رب کا قرب اس درجہ کا حاصل کر لیتا ہے تو رب کی طرف سے یہ اعلان کوئی انوکھا معلوم نہیں ہوتا کہ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا ...الخ

'فیض الباری' میں بیان کردہ مندرجہ بالا حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے "عَادٰی لِیْ وَلِیًّا" فرمایا، "وَلِیَّ لِیْ" نہیں فرمایا۔ اس سے دشمنی کی شان ظاہر کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ پہلی صورت (عَادٰی لِیْ وَلِیًّا) میں حقیقتاً دشمنی خدا سے ہے ولی سے نہیں۔ جبکہ صورت (وَلِیَّ لِیْ) میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

علامہ سیوطی نے 'القول الجلی فی حدیث الولی' کے نام سے اس حدیث مبارکہ کی تفصیل و تشریح کی غرض سے ایک باقاعدہ رسالہ لکھا ہے (حضرت العلام مولانا اللہ یار خانؒ فرماتے ہیں کہ یہ نایاب رسالہ ہمارے کتب خانے میں موجود ہے) اور اپنی کتاب 'الحاوی للفتاوی' میں علامہ نے اسی حدیث کو مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف راویوں سے نقل کیا ہے اور ان تمام احادیث مبارکہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے امت کو تعلیم فرمائی ہے کہ اولیاء اللہ سے محبت پیدا کریں۔ ان سے دشمنی کرنے کی جرأت نہ کریں۔ مزید یہ کہ ولی کیسے بنتا ہے، وہ کس طرح مجاہدہ کر کے اللہ کی محبت کا مستحق بنتا ہے۔ آخری حدیث مبارکہ کے متعلق ابن جوزی فرماتے ہیں: فَارْتَدَّ تَفْهِيْمُنَا لِتَحْقِيْقِ الْمَحَبَّةِ لِلْوَلِيِّ...

"اللہ کے ولی کی محبت اپنے دل میں ثابت کرنے کے لیے ہمیں سمجھایا گیا ہے۔"

Scanned with CamScanner

پھر حدیثِ مبارکہ میں حضور ﷺ کی یہ دعا ملتی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ ...

یعنی اے خدا! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس کی محبت، جو تجھ سے محبت کرتا ہے۔

علامہ شوکانیؒ نے 'تحفۃ الذاکرین' کے صفحہ ۳۳۱ پر اس حدیث کی تشریح فرمائی ہے:

اور حدیث میں ان اسباب کا ذکر ہے جن کو خدا کے بندے محبتِ الٰہی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان لوگوں کی محبت کا سوال کیا ہے جو اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ محبت خلوص کو چاہتی ہے۔ خلوص کے بغیر محبت ہو نہیں سکتی۔ حقیقت ہے کہ صرف مخلص بندے ہی اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ پس ان کی محبت اطاعتوں میں ایک اطاعت ہے کہ وہ خالصتاً اللہ کے ہوتے ہیں۔ ان کی ہر سوچ، ہر عمل، ہر ارادہ، ہر محبت، ہر نفرت خالص اللہ کے لیے ہوتی ہے اور یہ اطاعت کی بہترین صورت ہے۔ لہٰذا ان کی محبت اطاعت کی ایک صورت ہے، قربِ الٰہی کی صورت ہے۔

اولیاء کرام کی دشمنی سے پرہیز واجتناب کی جس شدت سے تاکید کی گئی ہے اسی شدت سے ان کی محبت پر زور دیا گیا ہے۔ اولیاء اللہ کی محبت کو اطاعت و قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ غور کیا جائے تو اس شدت سے دیے گئے ان دونوں احکام کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اولیاء اللہ پہلے خود رب کی ذات کے ساتھ رشتۂ محبت والفت استوار کرتے ہیں۔ وہ درجۂ اطاعت سے ایک قدم بڑھ کر درجۂ محبت تک آتے ہیں اور پھر اللہ کی محبت میں ڈوب کر سراپا محبت بن جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین ہی یہ ہو جاتا ہے کہ وہ تمام لوگوں کو اپنے محبوبِ حقیقی کی محبت میں سرشار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اللہ سے محبت کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور اس کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں۔ یہاں آکر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا نسخۂ کیمیا ہے جس کی مدد سے وہ یہ آفاقی جذبہ طالب کے دل میں اتار دیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر ہی وہ مجرب نسخہ ہے جو وہ ہر دل پر آزماتے ہیں۔ وہ بندے کو اللہ کے ذکر کا طریقہ وسلیقہ سکھاتے ہیں۔ وہ طالب کے دل کو اللہ کی ہمہ وقت یاد کا عادی بنا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ان کی صحبت میں رہ کر ان کے بتائے ہوئے طریقے سے ذکر کیا جائے تو لازماً اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری ومسلم میں اس اجتماعی ذکر کے فوائد اور نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے۔

"جب کچھ لوگ مل کر ذکر کے لیے بیٹھتے ہیں تو ملائکہ اُنہیں ڈھانپ لیتے ہیں اور رحمت اُن پر چھا جاتی ہے اور اُن پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ملائکہ میں اُن کا ذکر کرتا ہے۔" اور یہ کہ "وہ ایسی جماعت ہے کہ اُن کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا۔" (اس حدیثِ صحیح سے ذکرِ الٰہی اور اولیاء اللہ کی صحبت کا اثر واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ محض اُن کے پاس بیٹھنے سے جو انوارات وبرکات حاصل ہوتے ہیں، وہ انسان کی نیت، ارادے اور باطن کی اصلاح کا باعث بن کر اسے رب کی راہ پر لے آتے ہیں یہاں تک کہ انسان کا انجام بدبختوں کے ساتھ نہیں ہوتا یعنی اس کی آخرت سنور جاتی ہے۔)

'فیض الباری' شرح صحیح بخاری' میں حضرت انور شاہ صاحبؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ملائکہ اپنے پروں سے اُن پر سایہ کر لیتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

ایک اور حدیث میں ہے کہ "ملائکہ ان کا یوں احاطہ کر لیتے ہیں جیسے چاند کے گرد ہالہ۔"

مزید فرماتے ہیں، اور جان لیجیے کہ اللہ کا ذکر ذاکرین کے گرد دائرہ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ اگر کوئی پانی میں پتھر پھینکے تو لہریں دائرہ در دائرہ موجیں مارنے لگتی ہیں۔ لہروں کا پھیلاؤ اس قوت کے متناسب یعنی اس قوت کے حساب سے ہوگا جس سے وہ پتھر پھینکا گیا۔ اور جس طرح پتھر پھینکنے سے پانی متحرک ہوتا ہے تو وہ حرکت دور تک پہنچ جاتی ہے، بالکل اسی طرح جو کچھ بھی دائرۂ ذکر میں آتا ہے، وہ ذکر کی برکات سے حصہ پاتا ہے اور متاثر ہوتا ہے۔ برکاتِ ذکر کی بدولت وہ سب خود ذاکر ہو جاتا ہے۔ امام شعرانیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ ذکر کرنے بیٹھے تو دیکھا کہ ارد گرد کی تمام چیزیں ذکر کرنے لگیں، حتیٰ کہ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ انؒ کے ذکر کا اثر پوری زمین میں پھیل چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لوگوں کے برے اعمال کے سبب پوری زمین، خشکی اور تری پر فساد پھیل جاتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے کہ:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ... (الروم: ۴۱) تو پھر ذکرِ الٰہی جو سب سے مبارک اور بابرکت عمل ہے، اس کا اثر تمام دنیا میں پھیل جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اور ہر چیز ذکر میں اُن کی موافقت کر رہی ہے یعنی ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمانِ مبارک "یہ وہ جماعت ہے جس میں بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا" کا مطلب یہی ہے کیونکہ ذاکرین کی ہم نشینی اختیار کرنا در اصل ان میں شامل ہو جانا ہے۔ اس ساری بات میں نکتۂ راز یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی زندگی ہے۔ جس چیز تک پہنچتا ہے، اسے زندہ کر دیتا ہے۔ اور ذاکر کی آواز کے ساتھ ساتھ یہ دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ سارا ماحول جی اُٹھتا ہے اور ذاکر ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو اس حقیقت کا ادراک ہو جائے تو داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کا راز معلوم ہو جائے جیسا کہ اس بارے میں قرآن نے بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ذکر و تسبیح کرتے تو ان کے ارد گرد کے پہاڑ اور ان پر رہنے والے پرندے بھی اس حلقۂ ذکر میں شامل ہو جاتے۔

اور جب امام الانبیاء ﷺ ذکر فرماتے تو آپ ﷺ کے ذکر کی قوت تو پھر آپ ﷺ کے منصبِ عالی کے مطابق تھی۔ تمام ماحول اور اشیاء آپ ﷺ کے ذکر سے اس درجہ متاثر ہوتی تھیں جو دوسروں کی شان سے بہت بلند ہے۔

شجر و حجر اور پہاڑوں، پرندوں کے ذکر کرنے کا واضح ثبوت حدیث میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ ابن ماجہ، باب الحج؛ ترمذی، باب الحج اور بخاری شریف، باب الاذان میں ہے:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان تلبیہ کرتا ہے، اس کے دائیں بائیں کے تمام پتھر، درخت، ڈھیلے تک تلبیہ کہتے ہیں، حتیٰ کہ مشرق سے مغرب تک تمام تلبیہ کہتے ہیں۔

اور بخاری شریف میں اذان کے سلسلے میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "جنوں، انسانوں اور دوسری مخلوق میں سے جو بھی اذان کی آواز سنتی ہے، وہ قیامت کے دن مؤذن کے حق میں گواہی دے گی۔"

تشریح: حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ کی توجہ کے اثرات سارے ماحول میں پھیل جاتے ہیں۔ حلقۂ ذکر میں ذکر کے دوران شاگردوں کا شیخ کے قریب یا دور بیٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ آپ نے دیکھ ہی لیا کہ ذاکر جب ذکر کرتا ہے تو ذکر کے اثر سے سارا ماحول زندہ ہو جاتا ہے اور تمام چیزیں ذاکر بن جاتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس حدیثِ مبارکہ سے ضمناً ایک نتیجہ اور بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ سماعِ موتی کے منکر ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ قبر میں مردہ ہماری بات سن سکتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ ذرا غور فرمائیں۔ جب مٹی، شجر و حجر، غرض تمام زندہ وغیر جاندار اشیاء تلبیہ اور اذان کی آواز سنتی ہیں تو مرنے کے بعد آدمی کے ریزہ ریزہ اور مٹی ہو جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب مٹی سن سکتی ہے تو جس آدمی کا جسم مٹی ہو گیا، وہ کیوں نہ سنے گا؟ البتہ اس میں دو رائے ہو سکتی ہیں کہ اگر میت کے اجزا بکھر گئے، مٹی میں مل کر منتشر ہو گئے۔ پانی میں گھل گئے یا ہوا میں اُڑ گئے تو اس وقت اجزا نے جو صورت اختیار کی اسی کی خصوصیت کے مطابق ذکر و تسبیح کرے گا یا میت کے اجزا ہی کی مناسبت سے ذکر کرے گا؟

سماعِ موتی کے مسئلے میں اختلاف کے باوجود اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ مٹی، پتھر، درخت اور فضا کے معلق اجزا میں فہم و ادراک موجود ہے تو میت مٹی بن کر شعور اور ادراک و فہم سے کیونکر محروم ہو سکتی ہے ورنہ غیر ذی شعور اور غیر ذی فہم سے ذکر و تسبیح کرنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

گزشتہ صفحات میں جو روایات اور ان کی شرح بیان ہوئی ہے اس سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ سے محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت پانے کا ایک مجرب اور آزمودہ ذریعہ ہے۔

۲۔ اولیاء اللہ کے پاس کامیاب نسخہ ذکرِ الٰہی کی تلقین اور اس کا سلیقہ سکھانا ہے۔

۳۔ ذکرِ الٰہی کی کثرت سے اور اولیاء اللہ کی صحبت سے، دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور وہ کبھی بدبخت ہو کر نہیں مرتا۔ آخرت سنور جاتی ہے۔

۴۔ اولیاء اللہ سے دشمنی، اللہ سے دشمنی ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا،

"اولیاء اللہ سے دشمنی کفر تو نہیں مگر توہین کرنے والے مرتے ہمیشہ کفر پر ہی ہیں۔"

۵۔ فرائض رأس المال ہیں۔ رأس المال اس سرمائے کو کہتے ہیں جو انسان اپنے پاس سے تجارت میں لگاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس سرمایہ اتنا ہی رہے جتنا اس نے کاروبار میں لگایا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ اسے تجارت میں اگر نقصان نہیں ہوا تو فائدہ بھی نہیں ہوا۔ ترقی ہمیشہ نوافل سے ہوتی ہے مگر جس کے فرائض پورے نہیں، اس کے نوافل کا کوئی اعتبار نہیں کہ جب رأس المال ہی تجارت میں نہیں لگایا تو منافع کہاں سے آئے گا۔

۶۔ ان احادیثِ مبارکہ سے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مراقبات کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

۷۔ منکرینِ تصوف، کشف والہام کو سوچنا چاہیے کہ کیا امتِ محمدیہ شجرِ موسوی سے بھی گئی گزری ہے!

۸۔ اس حدیثِ مبارکہ سے اجتماعی حلقۂ ذکر کا ثبوت واضح طور پر ملتا ہے۔

۹۔ ذاکرین صوفیا محلِ نزولِ انوار و تجلیات ہیں۔

Scanned with CamScanner

باب(4)

بحثِ قلب

موضوعِ تصوف:

اصلاحِ باطن ہے اور اس کا مدار اصلاحِ قلب پر ہے، اس لیے اب ہم اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَ اِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَ هِیَ الْقَلْبُ...

(صحیح بخاری: کتاب الایمان، باب فضل من استبراء لدینه، ۱:۱۳)

''حضور ﷺ نے فرمایا، جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو سارا جسم درست ہو گیا اور اگر وہ بگڑا تو سارا جسم بگڑا، سنو! وہ قلب ہے۔''

اس حدیث میں بیان تو مضغہ، لحمِ صنوبری کا ہوا ہے مگر حکم اس لطیفہ کا ہے جس کو اس مضغہ سے گہرا تعلق اور اتصال ہے، اسی وجہ سے بیان مضغہ کا کر دیا گیا۔ حدیث میں درستئ قلب کو درستئ بدن کا سبب بتایا گیا ہے اور یہ درستئ قلب بغیر فنا بقا محال ہے۔ (ان اصطلاحات کی تشریح منازلِ سلوک کے باب میں ملاحظہ ہو)۔ اس درجہ میں سالک فنائیت قلبی کے بعد واصل باللہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ایمان کے متزلزل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ صوفیا کرام میں مشہور مقولہ ہے:

''اَلْفَانِیْ لَا یُرَدُّ وَالْوَاصِلُ لَا یَرْجِعُ...''

اس کی تصدیق بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ابوسفیان اور ہرقل روم کا مکالمہ درج ہے:

وَسَاَلْتُكَ هَلْ یَرْتَدُّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ عَنْ دِیْنِهٖ بَعْدَ اَنْ یَّدْخُلَ فِیْهِ سُخْطَةً لَهٗ، فَزَعَمْتَ اَنْ لَا وَ كَذٰلِكَ الْاِیْمَانُ اِذَا خَالَطَ بَشَاشَةَ الْقُلُوْبِ... (صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، الِ عمران، باب قل یا اهل الکتاب تعالوا الی... فصد ۲:۱، ۶۵۳)

''میں نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ کیا لوگ اس کا دین قبول کر لینے کے بعد اسے برا سمجھ کر ترک بھی کر دیتے ہیں، تو تم نے جواب دیا کہ ''نہیں'' اور ایمان کی بھی یہی حالت ہے جب اس کی تازگی قلوب میں جم جاتی ہے (تو پھر دور نہیں ہوتی)۔''

فنا فی اللہ، بقا باللہ کے مقامات پر فائز ہونے کے بعد ایمان دل میں جم جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور صورت میں بیان فرمایا ہے:

وَلٰكِنَّ اللهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ... (الحجرات:۷)

''لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔''

Scanned with CamScanner

اس کی تفصیل یہ ہے۔ اصل مکلف قلب ہے، مخاطب قلب ہے۔ عالم، متکلم، فاہم قلب ہے۔ سمع وبصر رکھنے والا قلب ہے۔ ماخوذ قلب ہے۔ باقی بدن سے اس کا تعلق صرف تدبر و تصرف کا ہے۔ آنکھیں اور کان قلب کے جاسوس ہیں، زبان قلب کی ترجمان ہے۔ اصل انسان اور بدن کا بادشاہ قلب ہے۔

بحثِ قلب

آج کا موضوع 'بحثِ قلب' ہے۔ تصوف کی غرض وغایت یا تصوف کا مقصد ہے کہ باطن کی، قلب کی، قلب کے اندر کی اصلاح ہو جائے اور اب اس کا مدار اصلاحِ قلب پر ہے۔ کیونکہ باطن کی اصلاح کا دارومدار قلب کی اصلاح پر ہے اس لیے اس موضوع کا تقاضا ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ "انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور وہ بگڑ جائے تو سارے جسم کو بگاڑ دیتا ہے"۔ فرمایا، "غور سے سنو! وہ قلب ہے"۔ اس حدیثِ مبارکہ میں قلب اس گوشت کے لوتھڑے کو کہا گیا ہے جو سینے میں دھڑکتا ہے، پورے جسم کو خون پہنچاتا ہے لیکن اس سے مراد وہ لطیفۂ ربانی ہے جو اس کے اندر ہے۔ قلب بظاہر تو دل ہے جو پمپنگ مشین ہے، جو جسم کو خون پہنچاتا ہے۔ اور ایک لطیفۂ قلب ہے جسے انگریزی میں Subtle heart کہتے ہیں، عالمِ امر کا ایک لطیفہ جو اس کے اندر رکھ دیا گیا ہے کیونکہ قلب اور لطیفۂ قلب کا آپس میں گہرا اتصال ہے، ایک میں دوسرے کا مقام ہے چنانچہ بیان صرف 'مضغہ' کا کر دیا گیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں درستیٔ بدن کا سبب درستیٔ قلب بتایا گیا ہے اور یہ درستیٔ قلب بغیر فنا بقا کے محال ہے۔ درستیٔ قلب کے لیے ضروری ہے کہ خواہشاتِ دنیا سے، لذاتِ دنیا سے فرد کا دل اُٹھ جائے۔ دنیا کو محض ضرورت کے لیے استعمال کرے، مقصد نہ بنائے۔ فنا سے مراد یہ سب ہے۔ بقا کا مطلب ہے کہ اللہ کی رضا کے ساتھ باقی رہے یعنی اپنی ساری کوشش، ساری محنت اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے صرف کر دے۔ اگر دنیا کے اعتبار سے دیکھیں تو اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، یہ فانی ہے۔ اور اللہ جل شانہٗ کی ذات کے اعتبار سے دیکھیں تو اس ذات کی طلب میں بندہ باقی ہے۔ اسے فنا بقا کہتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ تعلق جب اس درجہ تک پہنچ جائے تو ایک طرح سے ایمان پر قائم رہنے کی ضمانت بن جاتا ہے۔ پھر دنیا کی محبت اس کے دل سے فنا ہو جاتی ہے۔ دنیا میں رہتا ہے، دنیا کی غذا کھاتا ہے، دنیا ہی کا لباس پہنتا ہے، دنیا کا کاروبار کرتا ہے لیکن وہ یہ سب سنت کے دائرے میں رہ کر کرتا ہے۔ اس کا مقصد محض حصولِ دنیا یا حصولِ زر نہیں بلکہ اتباعِ سنت ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کشتی پانی پر تیرتی ہے تو کشتی پانی میں ہوتی ہے۔ اگر پانی کشتی میں آ جائے تو کشتی غرق ہو جاتی ہے۔ فنا سے مراد یہ ہے کہ کشتی پانی پر رہے لیکن پانی کو اندر نہ آنے دے۔ اسی طرح صوفی دنیا میں رہتا ہے مگر دنیا کو اپنے اندر نہیں آنے دیتا۔ دنیا کی محبت اور طلب کو مقصدِ زندگی نہیں بناتا۔ اور بقا سے مراد یہ ہے کہ اس کا ہونا محض رضائے باری کے لیے ہے۔ اس کی طلب، اس کا مقصدِ حیات، قربِ الٰہی ہے۔ اس فنائیتِ قلبی کے بعد اسے اللہ جل شانہٗ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ایمان متزلزل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے یعنی اگر کسی کو یہ نعمت نصیب نہیں تو وہ اس خطرے میں رہتا ہے کہ کسی وقت بھی دنیا کی کوئی لذت، دنیا کا کوئی لالچ اسے صراطِ مستقیم سے ہٹا نہ دے۔ صوفیا میں مقولہ ہے "جسے فنا حاصل ہوگئی وہ رد نہیں کیا جاتا۔" اَلْفَانِیْ لَا یُرَدُّ... "جسے درجۂ فنا حاصل ہو گیا وہ واپس نہیں پلٹتا"، وہ اس میں محو ہو جاتا ہے۔ "اَلْوَاصِلُ لَا یَرْجِعُ..."،

Scanned with CamScanner

"جسے وصالِ الٰہی نصیب ہو جائے وہ مڑ کر نہیں دیکھتا۔" ساری حیات اسی دُھن، اسی نشۂ وصل میں گزار دیتا ہے۔ اس کی تصدیق بخاری شریف کی ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں ابوسفیان اور ہرقل روم کا مکالمہ درج ہے۔ ہرقل نے سوال کیا تھا کہ کیا اس دین کو قبول کرنے والوں میں سے کچھ اسے بُرا سمجھ کر چھوڑ بھی دیتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں"۔ ہرقل روم نے کہا، "ایمان کی یہ حالت ہے، جب اس کی تازگی قلب میں جم جاتی ہے تو پھر دور نہیں ہوتی۔"

فنائی اللہ اور بقاباللہ کے مقامات پر فائز ہونے کے بعد ایمان دل میں جم جاتا ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور صورت میں بیان کیا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ... "اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا۔"

وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ... "اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا۔"

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اصل مکلف قلب ہے۔ قلب میں اگر ایمان ہے، قلب درست ہے تو پھر سارا معاملہ درست ہے۔ یہ آیت کریمہ یہی بات سمجھاتی ہے۔ ہرقلِ روم اگرچہ عیسائی تھا لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ ایمان کی خصوصیت یہ ہے کہ جب دل میں جم جاتا ہے تو پھر آدمی اسے چھوڑتا نہیں۔ قرآنِ کریم نے بھی ایمان کا رشتہ قلب ہی سے بتایا ہے۔ اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں کی زینت بنا دیا تو اس سے مراد یہ ہے کہ اصل مکلف قلب ہے۔ مخاطب قلب ہے، فاہم (سمجھنے والا) قلب ہے۔ عالم، متکلم، فاہم قلب ہے یعنی علمِ الٰہیہ کا عالم قلب ہے۔ اللہ کی ذات وصفات، آخرت، ملائکہ سے متعلق علم کو علمِ الٰہیات کہتے ہیں۔ علمِ کونی ان معاملات کا علم ہے جو دنیا میں ہو رہے ہیں، اس کا محل دماغ ہے۔ دماغ مادی ہے، جسم مادی ہے۔ دماغ کا کام جسم کی ضروریات کا ادراک کرنا، ان کی تکمیل کے ذرائع اختیار کرنا ہے۔ اس سارے نظام کے علم کو علمِ کونی کہتے ہیں جو کچھ دنیا میں امکانی طور پر ہو رہا ہے، سامنے ہے۔ جبکہ ذات وصفاتِ باری اور مغیبات جتنے بھی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانا ضروری ہے جیسے حشر ونشر، قبر، برزخ، جنت، دوزخ، ان سب کو علمِ الٰہیات کہا جاتا ہے۔ ان علوم کا عالم قلب ہے، ان پر بات کرنے کا اختیار دل کے پاس ہے۔ ان کا فہم وادراک بھی صرف قلب کی استعداد ہے۔ سننے اور دیکھنے والا قلب ہے۔ مؤاخذہ قلب کا ہوگا۔ جو انعام عطا ہوتا ہے وہ بھی قلب کی کیفیت پہ ہوتا ہے، سزا بھی قلبی کیفیت پہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی گناہ کرتا ہے تو اس میں دلی طور پر کتنا مشغول ہے اسی حساب سے گناہ کی شدت بڑھ جائے گی کہ وہ گناہ کو کس درجہ محبوب رکھتا ہے، اور اگر نیکی کرتا ہے تو اس میں کتنا خلوص ہے، قلبی طور پر وہ اس میں کتنا محو ہے۔ جتنی گہرائی اور گیرائی ہوگی وہ قلب کے اعتبار سے ہوگی۔ باقی بدن سے اس کا تعلق صرف تدبر وتصرف کا یعنی تدبیر کرنے اور عمل کرنے کا ہے۔ قلب ایک حکم دیتا ہے تو دماغ بھی اس کے تابع ہے۔ دماغ اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہو جاتا ہے، اعضاء وجوارح کو حرکت دیتا ہے، سارا بدن اس کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا ہے لیکن اصل میں یہ مرضی یا خواہش دل کی ہوتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ فضول کام کرتے ہیں حالانکہ عقلاً اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ جوا کھیلتے ہیں، دولت برباد ہو جاتی ہے۔ بات کرو تو مانتے ہیں کہ یہ بری عادت ہے۔ کہیں کہ کیوں کرتے ہو تو جواب ملتا ہے "دل چاہتا ہے۔" شرابی شراب کے نقصانات جانتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس کی اولاد اس سے بچی رہے لیکن اگر خود اسے روکا جائے تو پھر وہی بات کہ "دل چاہتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

اس کا مطلب ہے کہ اصل حاکم دل ہے۔ قلب جو چاہتا ہے دماغ بھی اس کی تکمیل میں لگ جاتا ہے اوراعضاء و جوارح بھی۔ اور یہی ارشادِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے: إِذَا صَلَحَتْ...اگر قلب کی اصلاح ہوجائے، صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ... توسارا جسم درست سمت میں چل پڑتا ہے۔ وَإِذَا فَسَدَتْ...اگر قلب خراب ہوگیا توسمجھ لیں کہ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ... پھر سارا کام خراب ہوگیا۔

اصل مکلف قلب ہے

تکلیف مشروط ہے عقل اور فہم سے اور ان دونوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے:

كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالَى حَاكِيًا عَنْ أَهْلِ النَّارِ... وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحٰبِ السَّعِيْرِ...(الملک: 10) مَعْلُوْمٌ أَنَّ الْعَقْلَ فِي الْقَلْبِ... وَلِأَنَّ التَّكْلِيْفَ مَشْرُوْطٌ بِالْعَقْلِ وَالْفَهْمِ... وَقَالَ اللهُ تَعَالَى: إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا...(بنی اسرائیل :٣٦) وَ قَرَنَ تَعَالَى بِذِكْرِهٖ مِنْ ذِكْرِ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ فَذٰلِكَ لِأَنَّهُمَا آلَتَانِ لِلْقَلْبِ فِي تَأْدِيَةِ صُوَرِ الْمَحْسُوْسَاتِ وَالْمَسْمُوْعَاتِ...

(تفسیر الکبیر، ٦: ٣٩٠، ٣٩١)

"اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کا قول نقل فرمایا کہ کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔ معلوم ہوا کہ عقل قلب میں ہے اور مدار تکلیف کا عقل اور فہم پر ہے۔ اور فرمایا کان، آنکھ اور دل، ہر شخص سے ان سب کی پوچھ ہوگی۔ اور سمع و بصر کو قلب سے جوڑ دیا ہے کہ یہ دونوں دیکھی اور سنی ہوئی چیزوں کو پہچاننے کے لیے آلہ کا حکم رکھتے ہیں۔"

اصل مکلف قلب ہے

شریعت کے احکام عقل وفہم کی بنیاد پر لاگو ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص پاگل ہے تو اس پر کوئی شرعی پابندی یا حکم لاگو نہیں ہوتا کیونکہ شریعت کا نفاذ عقل وفہم پر ہے۔ ان دونوں کا ذکر قرآنِ حکیم میں موجود ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کی بابت ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔ 'تفسیر کبیر' میں اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''معلوم ہوا کہ عقل قلب میں ہے اور تکلیف کا مدار عقل وفہم پر ہے۔'' (تکلیف سے مراد شرعی احکام کا مکلف ہونا ہے۔) دوزخی دوزخ میں اقرار کریں گے کہ ہم نے دل کو دنیا میں اس قدر لگا لیا کہ دین کو سنا اور نہ سمجھا۔ کاش ہم سنتے، ہمارا دل سنتا اور سمجھتا اور دل دین کی طرف لگتا تو آج ہم دوزخ میں نہ ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ إِنَّ الْعَقْلَ فِي الْقَلْبِ... کہ اصل سمجھ قلب میں ہے۔

اللہ کریم نے فرمایا ہے، إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ... سمع و بصر اور فواد یعنی دیکھنے اور سننے کی قوت اور دل کے

Scanned with CamScanner

نہاں خانے کی کیفیت۔ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ... ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔
صاحب 'تفسیر کبیر' فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سننے اور دیکھنے کی قوت کو اس لیے ساتھ ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں قلب کے چوکیدار ہیں، وہ اس تک اطلاع پہنچاتے ہیں۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، اس کی تصویر بھی قلب میں جاتی ہے۔ کان جو کچھ سنتا ہے اس کی اطلاع بھی قلب میں پہنچتی ہے۔ لہٰذا قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا ذکر بھی ارشاد فرمایا ہے۔ یہ دونوں مادی اطلاعات کو قلب تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کا قول نقل فرمایا ہے کہ کہیں گے کہ "اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔" معلوم ہوا کہ عقل قلب میں ہے اور کسی کو مکلف ٹھہرانے کے لیے عقل شرط ہے۔ اور فرمایا، کان، آنکھ اور دل، ہر شخص سے ان سب کی پوچھ ہوگی یعنی سمع و بصر قلب کے ہتھیار ہیں جن کے استعمال سے وہ چیزوں تک پہنچتا ہے کیونکہ یہ دونوں دیکھی اور سنی ہوئی چیزوں کو پہچاننے کے لیے آلہ کا حکم رکھتے ہیں۔

عقل کا مقام قلب ہے

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا ... (الحج:۴۶)
"ان کے دل ہوتے کہ ان سے سمجھنے لگتے۔"

عقل کا مقام قلب ہے

مقامِ عقل قلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ان کے دل ہوتے کہ ان سے سمجھنے لگتے۔" یعنی کاش ان کے دل سلامت ہوتے، دنیا کی محبت میں تباہ نہ ہوتے، ان میں سلامتی ہوتی، اُن کے پاس قلبِ سلیم ہوتا تو پھر وہ بات سمجھنے لگتے۔

محلِ تقویٰ قلب ہے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ... (الحجرات:۳)
یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے۔

محلِ تقویٰ قلب ہے

نیکی کی اصل بنیاد قلب ہے۔ جیسی کیفیت قلب میں ہو، وہ زبان سے بھی ظاہر ہوتی ہے، آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہے، اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہے۔ بندہ بات بھی نیک کرتا ہے، دیکھتا ہے تو نیکی کی نظر سے دیکھتا ہے اور کام کرتا ہے تو وہ شریعت کے مطابق کرتا ہے لیکن اصل کیفیت قلب میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحجرات کی اس آیۂ مبارکہ میں خادمانِ نبوت صحابہ کرامؓ کی

Scanned with CamScanner

تعریف فرماتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے، أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ... ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دل پرہیزگاری کے لیے آزما لیے ہیں۔'' تو قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق تقویٰ کا بھی اصل محل قلب ہے۔

مخاطب اور محلِ وحی قلب ہے

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ o (الشعرا: ۱۹۲۔۱۹۴)

''اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانتدار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر تاکہ آپ منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔''

فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ وَثَبَتَ أَنَّ الْقَلْبَ هُوَ الْمُخَاطَبُ فِي الْحَقِيقَةِ لِأَنَّهُ مَوْضِعُ التَّمْيِيزِ وَالْإِخْتِيَارِ وَأَمَّا سَائِرُ الْأَعْضَاءِ فَمُسَخَّرَةٌ لَهُ... (تفسیر کبیر، ۶: ۳۹۰)

''اس قرآن کو آپ کے قلب پر اتارا۔ پس ثابت ہوا کہ حقیقت میں مخاطب قلب ہے کیونکہ یہی مقام تمیز و اختیار کا ہے اور باقی اعضا اس کے ماتحت ہیں۔''

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ... (قٓ: ۳۷)

''تحقیق اس میں اس شخص کے لیے بڑی نصیحت ہے جس کے پاس قلب ہو۔''

مخاطب اور محلِ وحی قلب ہے

جس طرح نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ پاک مخلوقات میں بے مثل اور بے مثال ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی ہر صفت پوری مخلوق میں بے مثال ہے، کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے۔ حسنِ ظاہری ہو یا حسنِ باطنی، کوئی آپ ﷺ کا ثانی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح آپ ﷺ کا دماغ عالی پوری مخلوق میں بے مثل و یکتا ہے لیکن اس کے باوجود جب وحی نازل ہوئی تو قلبِ اطہر پر نازل ہوئی۔ قرآن کریم میں ہے وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ o (الشعرا: ۱۹۲۔۱۹۴) ''اور یقیناً یہ (قرآن) ربّ العالمین کا نازل فرمایا ہوا ہے، اس کو امانتدار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب (اطہر) پر تاکہ آپ (بھی انجام بد سے) ڈرانے والوں میں سے ہوں۔''

نزولِ وحی کا محل قلب اطہر ہے۔ 'تفسیر کبیر' میں اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ ''پس ثابت ہوا کہ حقیقت میں مخاطب قلب ہے کیونکہ یہی مقام تمیز و اختیار کا ہے اور باقی اعضا اس کے ماتحت ہیں''۔ حقیقی محل نزولِ قرآن قلب ہے، اس لیے اصل بادشاہ قلب ہے۔ آگے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ... قرآن کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ''قرآن سراپا نصیحت ہے۔'' إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى... اس کے ایک ایک لفظ میں نیک نصیحت ہے، خوبی ہے،

Scanned with CamScanner

اچھی باتیں ہیں لیکن اُن کے لیے ہیں لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ... جن کے پاس قلب ہے۔ اگر کسی نے اپنا قلب کھو دیا، ضائع کر دیا، خراب کر دیا اس پر گناہ کا زنگ چڑھ گیا یا اس پر کفر کی تاریکی چھا گئی تو اسے اتنی قیمتی بات یعنی قرآن سے کیا حاصل ہوگا۔ ایک آدمی کی آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں تو بھلے بہار کا موسم ہو، اسے اس کے رنگوں سے کیا لینا دینا۔ گویا قرآن کی نصیحت قبول کرنے والا بھی قلب ہی ہے۔ یعنی قرآن اترا بھی قلب پر اور آگے اس کو قبول کرنے کے لیے بھی قلب ہی درکار ہے۔

جزاوسزا کا تعلق اعمالِ قلب سے ہے

وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ... (البقرہ:۲۲۵)

''لیکن مؤاخذہ فرمائیں گے اس چیز پر جو تمہارے دلوں نے کمائی ہے۔''

جزاوسزا کا تعلق اعمالِ قلب سے ہے

وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ... ''اور لیکن تمہارا محاسبہ کیا جائے گا اس کے سبب جو تمہارے دلوں نے کمایا۔'' یعنی جزاوسزا کا مدار قلب پر ہے۔ پہلے بھی یہ ذکر گزر چکا ہے کہ جو کچھ بھی ہم کرتے ہیں اس کی تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اچھا یا برا جو بھی ہم کرتے ہیں، اس میں دل کس حد تک مشغول و مستغرق ہے اسی اعتبار سے اس کی شدت کا اندازہ کیا جائے گا، اور انعام یا سزا کا درجہ بھی اسی حساب سے مقرر ہوگا۔ ارشاد ہے کہ ''مؤاخذہ ہوگا اس چیز پر جو تمہارے دلوں نے کمائی۔'' اب دل نہ تو چوری کرتا ہے نہ کسی کا مال ناحق کھاتا ہے نہ کسی کو گالی دیتا ہے تو پھر جتنے اعمال اعضاء جوارح کے ہیں، ان کا مؤاخذہ دل سے کیوں؟ اس لیے کہ جتنے اعمال و افعال بدن کرتا ہے، ان کے پیچھے تحریک، قلب کی ہوتی ہے اور اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو کتنے خلوص سے کر رہا ہے، غلطی کر رہا ہے تو کتنی دلی رغبت اور دلچسپی سے کر رہا ہے۔ اسی دلی رغبت و محبت کی بناء پر اعمال کی جزاوسزا میں شدت یا نرمی ہوگی۔

علم وفہم کی ضد کی نسبت قلب کی طرف ہے

(۱) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ... (البقرہ:۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

(۲) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ... (البقرہ:۸۸) اور انہوں نے کہا کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں۔

(۳) بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ... (المطففین:۱۴) بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

(۴) لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا... (الاعراف:۱۷۹) ان کے دل ایسے ہیں جن سے سمجھتے نہیں۔

وَثَبَتَ اَنَّ مَوْضِعَ الْجَھْلِ وَالْغَفْلَۃِ ھُوَ الْقَلْبُ... (تفسیر کبیر، ۳۹۱:۶)

''اور ثابت ہو گیا کہ جہالت اور غفلت کا محل قلب ہے۔''

Scanned with CamScanner

فائدہ:

ان آیاتِ قرآنی سے ثابت ہوا کہ امینِ وحی ونبوت، امین اسرارِ الٰہی وشریعت اور خزانۂ اسرارِ غیبیہ قلب ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جس پر عقل کا راہزن ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ قلب ہی تجلیاتِ باری، ولایت اولیاء اللہ اور کشف والہام کا خزانہ ہے۔

ہر انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہے اور وہی محل تجلیات باری کے لیے مخصوص ہے، اس لیے باری تعالیٰ اس میں غیر کا قبضہ پسند نہیں فرماتا۔ جب قلب تجلیات باری کا مسکن بن جاتا ہے تو تمام رذائل ذلیل ہو کر چلے جاتے ہیں۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً... (النمل:۳۴)

چنانچہ جب قلب کی پورے طور پر اصلاح ہو جاتی ہے تو غیر اللہ کا اس میں گزر نہیں ہوتا اور ولی اللہ کہہ اٹھتا ہے، اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ... (الزمر:۳۶)۔ معاصی کی وجہ سے قلب اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے مگر معالج روحانی کے علاج سے یہ امراض دور ہو جاتے ہیں۔ وہ قلب سقیم، قلب سلیم بن جاتا ہے اور اخروی فلاح کے لیے راس المال بن جاتا ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ... (الشعرآ:۸۸،۸۹)

اُس روز نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، ہاں مگر اللہ کے پاس جو شخص پاک دل لے کر آئے۔

(اس کے لیے مفید ثابت ہوگا)

علم وفہم کی ضد کی نسبت قلب کی طرف ہے

جس طرح ہدایت کو قبول کرنے کی استعداد صرف دل میں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نہیں سمجھتا، نہیں جاننا چاہتا، ضد کرتا ہے، حقیقی علم وہدایت کی مخالفت کرتا ہے تو قرآن نے اس کو دل کا فعل قرار دیا ہے۔ فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ... "اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔" انہوں نے اتنے گناہ کیے، اتنے جرائم کیے کہ سزا کے طور پر ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی یعنی دلوں کے فہم وادراک کو سرے سے ختم کر دیا گیا، توفیقِ توبہ سلب کر لی گئی۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ... کفار نے کہا، آپ ارشاد فرماتے رہیے، تبلیغ فرماتے رہیے، ہمارے دلوں پر تو غلاف لپٹے ہوئے ہیں، ان تک آپ کی بات نہیں پہنچتی۔ قرآنِ حکیم نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ لوگ ہدایت کی بات کیوں نہیں سنتے، نبی اکرم ﷺ کے ارشادات، قرآنِ کریم کے فرامین کیوں نہیں سنتے۔ فرمایا، بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ... کیونکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے، ان کے دل ناکارہ ہو گئے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا، لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا... یعنی ایسا نہیں ہے کہ انہیں دل ہی ایسے دیئے گئے ہیں جن میں سمجھنے کی استعداد نہیں ہے، بلکہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا... (ان کے دل ایسے ہیں جن سے سمجھتے نہیں)۔ دراصل تفقہ ہوتا ہے بات کو سمجھنا۔ ان کے دل ایسے ہیں جن کی سمجھ ماری گئی ہے۔ "تفسیر کبیر" میں فرمایا گیا ہے کہ

"علم وفہم کی ضد کی نسبت بھی قلب کی طرف ہے۔"

وَثَبَتَ اَنَّ مَوْضِعَ الْجَهْلِ وَالْغَفْلَةِ هُوَ الْقَلْبُ...

Scanned with CamScanner

''اور ثابت ہو گیا کہ جہالت اور نادانی یا غفلت کا محل بھی دل ہے۔''

ان قرآنی آیات سے ثابت ہوا کہ امین وحیِ نبوت، امین اسرارِ الٰہی و شریعت وخزانۂ اسرارِ غیبیہ دل ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جس پر عقل و دلیل کا راہزن ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ قلب ہی تجلیاتِ باری، ولایتِ اولیاء اللہ اور کشف والہام کا خزانہ ہے۔ ہر انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہے اور وہی تجلیاتِ باری کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ اس میں غیر کا قبضہ پسند نہیں فرماتا۔ جب قلب تجلیاتِ باری کا مسکن بن جاتا ہے تو تمام رذائل ذلیل ہو کر چلے جاتے ہیں۔ حُبِّ دنیا، حسد، تکبر، بخل غرضیکہ تمام بری خصلتیں قلب سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی آیتِ مبارکہ ہے:

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً... (النمل: ۳۴)

''جب بادشاہ فاتح بن کر کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو تاخت وتاراج کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل ورسوا کر دیتے ہیں۔''

تو یہاں مراد ہے کہ تجلیاتِ الٰہی اور عشقِ الٰہی بھی جب بادشاہ کی حیثیت سے کسی قلب کو فتح کر لیتے ہیں اور فاتح کی حیثیت سے قلب میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں سے حسد وتکبر کے بڑے بڑے بتوں کو ذلیل ورسوا کر کے نکال باہر کرتے ہیں (جذبۂ عشق کسی فاتح شہنشاہ سے کم نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے سرکش اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں)۔ چنانچہ جب قلب کی پوری اصلاح ہو جاتی ہے تو پھر غیر اللہ کا اس میں گزر نہیں ہو سکتا۔ قلب کی اصلاح سے مراد یہ ہے کہ اس میں اللہ کی محبت رہ جائے اور پھر انسان جو کام بھی کرے، کمائے، خرچ کرے، کھائے پیے، کچھ لے یا دے، دوستی یا دشمنی کرے، ہر کام میں اس کے پیشِ نظر اللہ کی رضا ہو۔ دشمنی ہو تو ذاتی نہ ہو کہ میں نے فلاں کو ذلیل کرنا ہے وغیرہ۔ دشمنی اس سے ہو جو اللہ کا دشمن ہے، اگر وہ توبہ کر لے تو دشمنی بھی ختم ہو جائے۔ اسی طرح دوستی بھی اللہ کے لیے ہو، اگر کوئی اللہ کے حکم کے خلاف جاتا ہے تو وہاں دوستی کی ضرورت نہ رہے۔ یعنی زندگی کو اس انداز میں ڈھال لے کہ اس کا ہر جذبہ، اس کا ہر عمل، اللہ کے لیے ہو۔ وہ کہہ اٹھے،

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ... (الزمر: ۳۶) ''کیا اللہ اپنے بندے (حضرت محمد ﷺ) کے لیے کافی نہیں؟''

بلکہ اس کی پوری حیات زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ اپنے بندے کو اللہ ہی کافی ہے۔ اللہ کے ولی کی ایک ایک حرکت، اس کے تعلقات، اس کے اعمال، اس کا کردار اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اسے صرف اللہ چاہیے اور وہ بس اللہ کے ساتھ مطمئن ہے۔

معاصی کی وجہ سے قلب اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے، یعنی گناہ قلب کی بینائی اور سماعت چھین لیتے ہیں مگر معالجِ روحانی کے علاج سے یہ امراض دور ہو جاتے ہیں۔ شیخ وہ چاہیے جو ان امراض کا قلع قمع کرے تاکہ ان سے شفا نصیب ہو۔ وہ قلبِ سقیم سے قلبِ سلیم بن جائے۔ معالجِ روحانی کی صحبت نصیب ہو تو وہ قلبِ سلیم بن جاتا ہے۔ یہی قلبِ سلیم اخروی فلاح کے لیے راس المال بن جاتا ہے، آخرت کمانے کے لیے سرمایہ بن جاتا ہے۔

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝ (الشعراء: ۸۸،۸۹)

''اس دن مال نفع دے گا نہ اولاد (کام آئے گی)، ہاں وہ (فائدے میں رہے گا) جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا۔''

Scanned with CamScanner

قلبِ سلیم

قلب کے سلیم ہونے کے لیے دو شرائط ہیں،

اوّل: صحت از امراض۔ قرآن مجید نے قلب کے امراض کفر، شرک، شک اور خواہشات نفسانی کے اتباع کو قرار دیا ہے۔ ان امراض سے صحت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ کسی معالجِ روحانی سے علاج کرایا جائے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ قلب کو غذائے صالح بہم پہنچائی جائے۔ جس طرح غذائے صالح سے جسمِ انسانی صحت مند اور قوی ہو جاتا ہے اسی طرح قلب کی صحت اور قوت کے لیے بھی غذائے صالح درکار ہے۔ مگر قلب کی غذا جسم کی غذا سے مختلف ہے۔ قلب کے لیے غذائے صالح کی نشاندہی یوں کی گئی ہے، قال اللہ تعالیٰ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔۔۔ (الرعد: ۲۸) "سنو! ذکرِ الٰہی سے ہی قلوب مطمئن ہوتے ہیں۔"

علاجِ قلب اور غذائے قلب، عارفین کاملین کے بغیر کہیں سے نہیں ملتی۔

قلبِ سلیم

قلب کے قلبِ سلیم بننے کے لیے دو شرائط ہیں۔ قلب کو تمام امراض سے صحت حاصل ہو۔ کفر، شرک، حسد اور خواہشاتِ نفسانی کا اتباع، قلب کے امراض ہیں۔ ان سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ کسی معالجِ روحانی سے علاج ہے۔ عارفِ کامل ہی روحانی امراض کا معالج ہو سکتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ قلب کو غذائے صالح پہنچائی جائے۔ جس طرح غذائے صالح سے جسمِ انسانی صحت مند اور قوی ہوتا ہے اسی طرح قلب کی صحت اور قوت کے لیے غذائے صالح درکار ہے، مگر قلب کی غذا جسم کی غذا سے مختلف ہے۔ قلب کی صالح غذا کی نشاندہی یوں کی گئی ہے کہ جس طرح ہم جسم کو صاف ستھری غذا دیتے ہیں تو وہ صحت مند رہتا ہے، خراب غذا کھانے سے بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح قلب کو بھی صاف ستھری غذا چاہیے، خراب غذا ملے گی تو وہ بیمار ہو جائے گا۔ اور قلب کی غذا ہے، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔۔۔ "خوب غور سے سن لو! اللہ کے ذکر سے دلوں کو قرار حاصل ہوتا ہے۔" دوائے قلب و غذائے قلب عارفینِ کاملین کے بغیر کہیں سے نہیں ملتی۔ قلب کی غذا بھی، قلب کا علاج و دوا بھی اللہ کے کامل بندوں سے ملتی ہے، کسی بازار سے نہیں۔

یہاں تک قلب اور قلب کی اہمیت واضح ہو گئی کہ نزولِ وحی کا مقام بھی قلب، مکلف بھی قلب، سمجھتا بھی قلب ہے اور نادانیاں بھی قلب ہی کرتا ہے۔ قلب کو زنگ لگ جائے تو اسے اچھی بات سنائی نہیں دیتی۔ نیز آخرت میں مؤاخذہ بھی قلبی کیفیات پر ہوگا۔ ان تمام باتوں سے قلب کی اہمیت خوب واضح ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

باب (5)

بحثِ روح

پہلے یہ لینا چاہیے کہ یہاں روح کی تعریف بالوجہ ہوگی، نہ کہ بالکنہ۔ کیونکہ روح کی حقیقت کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا... (بنی اسرائیل:۸۵)
تعریفِ روح میں اختلاف ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کے مذہب کے مطابق اس کی تعریف یہ ہے:

روح کی تعریف

وَدَلَّ عَلَيْهِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ وَاِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ وَاَدِلَّةُ الْعَقْلِ اِنَّهٗ جِسْمٌ مُّخَالِفٌ بِالْمَاهِيَّةِ لِهٰذَا الْجِسْمِ الْمَحْسُوْسِ وَهُوَ جِسْمٌ نُوْرَانِیٌّ عُلْوِیٌّ خَفِيْفٌ حَیٌّ مُتَحَرِّكٌ يَنْفُذُ فِیْ جَوْهَرِ الْاَعْضَآءِ وَيَسْرِیْ فِيْهَا سَرَيَانَ الْمَآءِ فِی الْوَرْدِ وَسَرَيَانَ الدُّهْنِ فِی الزَّيْتُوْنِ وَالنَّارِ فِی الْفَحْمِ... (کتاب الروح، ۲۲۰)

"کتاب و سنت، اجماعِ صحابہؓ اور عقلی دلائل دال ہیں کہ روح ایک جسم ہے جو اپنی ماہیت کے لحاظ سے اس محسوس جسمِ عنصری کے مخالف ہے۔ وہ جسم نورانی، علوی، ہلکا، زندہ اور متحرک ہے جو تمام اعضائے بدن میں نفوذ کر جاتا ہے۔ بدن میں اس کا سریان ایسا ہے جیسے گلاب کے پھول میں پانی، زیتون میں روغن اور کوئلہ میں آگ کا سریان ہوتا ہے۔"

بحثِ روح

فرمایا کہ روح کی تعریف 'بالوجہ' ہوگی، یعنی روح کے موجود ہونے سے جسم پر کیا اثر پڑتا ہے، روح کس طرح زندگی عطا کرتی ہے؟ جب روح بدن میں نہیں ہوتی تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ جس بدن سے روح نکل جاتی ہے، اس پر کیا اثر ہوتا ہے؟ 'بالوجہ' یعنی روح کے ساتھ جو خصوصیات وابستہ ہیں، جو جو چیزیں روح سے متعلق ہیں ان کے اعتبار و لحاظ سے بحث ہوگی۔ 'بالکنہ' یعنی روح کی ذات پر بحث نہیں ہوگی کہ روح کیا ہے، کس چیز سے بنی ہے؟ اس کو کس طرح کی نظر آنا چاہیے وغیرہ۔ چونکہ اس کے بارے میں اللہ کریم نے فرمادیا ہے کہ

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ... (بنی اسرائیل:۸۵)

"(اے نبی) کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے۔"

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا... (الاسراء:۸۵)

کیونکہ اس سے زیادہ انسانی علم کی استعداد ہی نہیں کہ وہ سمجھ سکے۔ روح کی کُنہ کو یعنی روح کی حقیقت کو سمجھنے کے

Scanned with CamScanner

لیے انسانی علم محدود ہے، بہت کم ہے۔لہٰذا اس کے وجود پہ بحث نہیں ہوگی، بس روح کے اثرات کے حوالے سے بحث ہوگی۔

روح کی تعریف:

کتاب وسنت، اجماع صحابہؓ اور عقلی دلائل اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ روح ایک جسم ہے جو اصلیت و ماہیت کے لحاظ سے اس محسوس جسمِ عنصری (مادی جسم) کے مخالف ہے۔یعنی جس طرح یہ جسمِ عنصری محسوس ہوتا ہے اسے ہم چھو سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں، توڑ سکتے ہیں، جوڑ سکتے ہیں، روح کے معاملے میں یہ سب نہیں ہوتا۔وہ جسم تو ہے لیکن مادی جسم کے بالکل برعکس ہے۔وہ نہ تو نظر آتی ہے، نہ ہم اسے محسوس کرسکتے ہیں۔وہ جسمِ نورانی ہے، علوی ہے (عالمِ اعلیٰ سے ہے)۔ہلکا، زندہ اور متحرک ہے۔بے وزن ہے، حرکت کرتا ہے اور تمام اعضائے بدن حتیٰ کہ وجود کے ہر ذرے میں نفوذ کرجاتا ہے، بالکل اس طرح جیسے گلاب کے پھول میں پانی، زیتون کے پھل میں تیل رچا بسا ہوتا ہے، یا کوئلے میں آگ کا سریان ہوتا ہے۔

روح جسمِ لطیف ہے

روح کا جسمِ لطیف ہونا اور اس جسمِ عنصری کا مخالف ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے:

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ...(الحجر:۲۹)

"پس جب میں بدنِ آدم کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونکوں۔"

پس معلوم ہوا کہ تسویہ بدن کے بعد نفخ روح ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ بدن اور روح دو مختلف چیزیں ہیں۔پھر یہ کہ بدن میں روح کا نفخ کیا، اور نفخ جسم کا ہوتا ہے۔اس سے روح کا جسمِ لطیف ہونا ثابت ہوا جیسا کہ ایک اور آیت ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ... (المومنون:۱۴) میں اس پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے کہ پہلے جسمِ انسانی وجود میں آیا جس کی تفصیل منی، خون، گوشت، ہڈی اور ہڈی پر گوشت چڑھانے کے مدارج سے کی۔اس کے بعد اسے ایک دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا یعنی اس میں روح پھونکی اور وہ تمام اجزائے بدن میں سریان کرگئی۔اس سے روح کا جسم سے الگ ایک مستقل حقیقت ہونا ثابت ہوا، اور یہ کہ وہ ایک جسمِ لطیف رکھتی ہے جو اس جسمِ کثیف میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

روح جسمِ لطیف ہے

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ... بدنِ مادی اور چیز ہے، اور روح اور طرح کی چیز ہے۔اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ پس جب میں بدنِ آدم کو سنوار لوں، فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ ... جب میں اسے مکمل کردوں، اس کی نوک پلک درست کرلوں، وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ... اس میں اپنی روح پھونکوں۔اس کا مطلب ہے کہ بدن اور اس کی نوک پلک کچھ اور چیز ہے، اور بعد میں جو پھونکا گیا یعنی روح، وہ اور چیز ہے۔مزید یہ کہ تسویہ بدن کے بعد نفخ روح ہے۔اس سے

Scanned with CamScanner

ثابت ہوا کہ بدن اور روح دو مختلف چیزیں ہیں۔ نفخ جسم کا ہوتا ہے، کسی وجود کا ہوتا ہے اور روح پھونکی گئی۔ اب پھونک مارتے ہیں تو کسی چیز کو دباؤ یا پریشر کے ساتھ منہ سے نکالتے ہیں، تو جب روح کا نفخ ہوا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی چیز ہے جو باقاعدہ وجود رکھتی ہے، جسے مادی بدن میں داخل کیا گیا، خواہ وہ نظر آتی ہے یا نہیں۔ وہ جسمِ لطیف ہے، علوی ہے، جیسا بھی ہے، بہر حال ہے اس وجود کا لطیف ہونا خود قرآن سے ثابت ہے۔

ہم نے منی کے قطرے کا خون بنایا، اس سے گوشت کا لوتھڑا، ہڈی، پھر ہڈی پر گوشت چڑھایا، ان مدارج سے گزر کر بدنِ انسانی بنا تو ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ... ''پھر ہم نے اسے ایک دوسری طرح کی مخلوق بنا دیا۔''

یعنی اس میں روح پھونکی اور وہ اجزائے بدن میں سرایت کر گئی، یعنی ایک وجود، ایک اور دوسرے وجود میں داخل ہو گیا۔ اس سے روح کا جسم سے الگ مستقل حقیقت ہونا ثابت ہے۔ منی سے خون، خون سے ہڈی، گوشت بنا پھر اس پر کھال چڑھائی گئی، بدنِ انسانی مکمل ہو گیا تو اس میں روح پھونکی گئی تو وہ ایک دوسری طرح کی مخلوق بن گیا۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بدن کی ایک الگ حیثیت ہے اور روح ایک الگ حقیقت ہے۔ وہ جسمِ لطیف ہے، مادی آنکھوں سے نظر آنے والی نہیں، نہ ہم اسے مادی ہاتھوں سے چھو کر یا ٹٹول کر محسوس کر سکتے ہیں لیکن وہ جسمِ کثیف میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

روح جوہرِ فرد نہیں

حدیث میں موت کے وقت روح کی کیفیت یوں بیان ہوئی کہ فَتَفَرَّقَ فِي جَسَدِهٖ... کہ ''وہ (روح) میت کے بدن میں متفرق ہو جاتی ہے۔'' اس سے روح کا جوہرِ فرد ہونا باطل ہوا۔ بہر حال روح کوئی جسمِ لطیف ہے مگر اس کی حقیقت سوال کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے نہیں بتائی۔ حالانکہ ملائکہ، جنوں اور انسانوں کی پیدائش بغیر پوچھے بتا دی اور روح کے متعلق سوال کرنے پر بھی صرف اتنا بتایا کہ:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ... ''کہہ دو کہ روح تو میرے ربّ کے امر سے ہے۔''

اگر اس کی پیدائش کسی مادہ مثلاً پانی، ہوا، آگ، مٹی یا نور سے ہوتی تو اس کا ذکر کیا جاتا۔

معلوم ہوا کہ یہ نور سے بھی زیادہ لطیف ہے۔

كَمَا قَالَ سُهَيْلِيٌّ وَالْاَرْوَاحُ خُلِقَتْ مِمَّا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَهُوَ النَّفْخُ الْمُتَقَدِّمُ الْمُضَافُ اِلَى الْمَلَكِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ خُلِقَتْ مِنْ نُّوْرٍ كَمَا جَآءَ فِي حَدِيْثِ الْمُسْلِمِ... فَهُوَ (اَيْ رُوْحٌ) اَيْضًا جِسْمٌ وَلٰكِنَّهٗ مِنْ جِنْسِ الرِّيْحِ وَلِذٰلِكَ سُمِّيَ رُوْحًا مِّنْ لَّفْظِ الرِّيْحِ وَنَفْخُ الْمَلَكِ فِي مَعْنَى الرِّيْحِ غَيْرَ اَنَّهٗ ضَمَّ اَوَّلَهٗ... وَهِيَ مِنْ ذَوَاتِ الْوَاوِ لِهٰذَا تُجْمَعُ عَلَى الْاَرْوَاحِ اَيْ ضَمَّ اَوَّلَهٗ... لِاَنَّهٗ نُوْرَانِيٌّ وَالرِّيْحُ هَوَاءٌ مُّتَحَرِّكٌ... (روض الانف، 1:197)

Scanned with CamScanner

"ابوالقاسم سہیلی نے کہا کہ روح کی پیدائش اس چیز سے ہے جو اللہ نے فرمائی ہے اور وہ نفخ ہے جو مضاف فرشتہ کی طرف ہے اور فرشتوں کی پیدائش نور سے ہے جیسا کہ حدیثِ مسلم میں ہے اور وہ روح بھی جسم ہے مگر ریح یعنی ہوا کی جنس سے ہے، اس وجہ سے اس کو روح سے موسوم کرتے ہیں جو ریح سے مشتق ہے۔
نفخ ملک ریح کے معنی میں ہے سوائے اس کے کہ اس کا اوّل مضموم ہے اور لفظِ روح، صاحب 'واؤ' ہے، اس وجہ سے اس کی جمع ارواح آتی ہے۔ روح کی 'ر' پر ضمہ ہے کہ وہ جسمِ نورانی ہے اور ہوا تو جسمِ متحرک ہے۔"

فائدہ:

معلوم ہوا کہ ملائکہ کے نفخ سے روح کی پیدائش ہوئی اور ملائکہ نور سے ہیں اس لیے روح ملائکہ سے زیادہ لطیف ہوئی۔ جیسے انسان جسمِ عنصری ہے، انسان کا سانس اس کے جسم سے زیادہ لطیف ہے اسی طرح ملائکہ کا سانس ان کے جسم سے زیادہ لطیف ہوا۔

روح جوہرِ فرد نہیں

حدیثِ مبارکہ میں موت کے وقت روح کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے کہ فَتَفَرَّقَ فِيْ جَسَدِهٖ... روح میت کے جسم میں متفرق ہو جاتی ہے۔ اس سے روح کا جوہرِ فرد (وہ چیز جو آگے مزید اجزا میں تقسیم نہ ہو سکے) ہونا باطل ہوا۔ اس کے اپنے اجزا ہیں جیسے لطائف وغیرہ۔ بہر حال روح جسمِ لطیف ہے مگر اس کی حقیقت سوال کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے نہیں بتائی حالانکہ ملائکہ، جنوں اور انسانوں کی پیدائش بغیر پوچھے اللہ نے اپنی مرضی سے بتا دی۔ جنوں کو آگ، فرشتوں کو نور اور انسان کو خاک سے پیدا کیا۔ روح کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ تم نہیں جان سکتے، تمہارا علم بہت کم ہے۔ صرف اتنا بتایا:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ... "کہہ دو کہ روح تو میرے رب کے امر سے ہے۔"

اگر اس کی پیدائش کسی مادہ مثلاً پانی، ہوا، آگ، مٹی یا نور سے ہوتی تو اس کا ذکر کیا جاتا۔ اور یہ نور سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ نور سے فرشتے پیدا کیے گئے۔ یہاں ایک بات سمجھنا بے حد ضروری ہے، 'نور' کے لفظ پر بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک نور ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ ذاتِ باری خالق ہے، مخلوق نہیں۔ ازلی و ابدی ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ ایک نور مخلوق ہے جس سے فرشتے پیدا ہوئے۔ یہاں آکر مغالطہ لگ جاتا ہے اور ایک دوسرے پر فتوے لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تو یہ تمیز ہونی چاہیے کہ اللہ کی ذات کو جب نور کہا جاتا ہے تو اس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ فرشتے کو نور کہا جاتا ہے یا کسی اور چیز کو نور کہا جاتا ہے تو اس کی حقیقت اور ہے۔ وہ نور مخلوق ہے۔ جب لفظ 'نور' مخلوق کے لیے بولا جائے تو اس سے مراد وہ نور ہے جو مخلوق ہے۔ وہ نورِ خالق نہیں ہے۔ جیسے کہتے ہیں حضور اکرم ﷺ نور ہیں۔ اس سے مراد وہ نور ہوتا ہے جو مخلوق ہے، مخلوق کی ہدایت کے لیے ہے۔ آپ ﷺ کا ہر قول نور ہے، آپ ﷺ کا ہر فعل نور ہے، آپ ﷺ کی ذات کا ذرہ ذرہ نور ہے۔

روح نور سے بھی لطیف چیز ہے۔ ابو قاسم سہیلی کے مطابق روح 'ریح' یعنی ہوا سے مشتق ہے۔ جو ہوا دنیا میں چلتی

Scanned with CamScanner

ہے، روح اس طرح کی ہوا نہیں ہے کیونکہ ملائکہ کے نفخ سے روح کی پیدائش ہوئی۔ اور ہر جاندار کا سانس اس کے جسم سے لطیف ہوتا ہے اسی طرح ملائکہ کا سانس ان کے جسمِ نورانی سے زیادہ لطیف ہے۔ اس لیے روح نور سے بھی زیادہ لطیف ہے۔

روح لامکانی ہے

امام رازیؒ نے روح کی تعریف میں جو بیان فرمایا ہے وہی اہل حق کا مذہب ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ الْقَائِلِیْنَ بِاِثْبَاتِ النَّفْسِ فَرِیْقَانِ: اَلْاَوَّلُ وَهُمُ الْمُحَقِّقُوْنَ مِنْهُمْ مَنْ قَالَ الْاِنْسَانُ عِبَارَةٌ عَنْ هٰذَا الْجَوْهَرِ الْمَخْصُوْصِ، وَ هٰذَا الْبَدَنِ وَ عَلٰى هٰذَا التَّقْدِیْرِ فَالْاِنْسَانُ غَیْرُ مَوْجُوْدٍ فِیْ دَاخِلِ الْعَالَمِ وَ لَا فِیْ خَارِجِهٖ وَغَیْرُ مُتَّصِلٍ فِیْ دَاخِلِ الْعَالَمِ وَلَا فِیْ خَارِجِهٖ وَغَیْرُ مُتَّصِلٍ بِالْعَالَمِ وَلَا مُنْفَصِلٍ عَنْهُ لٰكِنَّهٗ مُتَعَلِّقٌ بِالْبَدَنِ تَعَلُّقَ التَّدْبِیْرِ وَالتَّصَرُّفِ... (تفسیر الکبیر، ۵:۴۴۰)

”خوب جان لیں کہ روح کے اثبات کے قائلین کے دو فریق ہیں۔ اول جو محققین ہیں، ان میں سے بعض کا قول ہے کہ روح نہ عالم میں داخل ہے نہ خارج میں، نہ داخل میں متصل ہے نہ خارج میں، نہ متصل ہے نہ اس سے منفصل لیکن انسانی بدن سے اس کا تعلق تدبیر و تصرف کا ہے۔“

معلوم ہوا کہ روح ایک جوہرِ مجرد ہے، بہت لطیف ہے، لامکانی ہے (لامکانی روح کے لیے مجازاً بولا گیا ہے) اس کے لیے مکان نہیں۔ مکان مادیات کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ مجردات کے لیے۔ یہ بدن سے پہلے بھی موجود تھا اور اس کے بعد بھی موجود رہتا ہے۔ سنتا ہے، دیکھتا ہے، کلام کرتا ہے۔ اس کی لامکانی کیفیت حدیث میں لفظ 'عماء' سے بیان کی گئی ہے، جب رسول کریم ﷺ سے سوال کیا گیا، اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا... تو آپ ﷺ نے فرمایا،

فِیْ عَمَاءٍ مَکَانٍ... مکان ذات باری کے لیے منفی ہے۔

سوال: متکلمین کے نزدیک ”تجرد“ اخص صفاتِ باری تعالیٰ سے ہے،

اگر یہ صفت روح کے لیے تسلیم کر لی جائے تو شرک فی الذات لازم آئے گا۔

الجواب: اخص صفاتِ باری تعالیٰ سے وجوب اور قدمِ مطلق ہے، نہ وہ تجرد جو مسبوق بالعدم ہو اور ممکن اور حادث بھی ہو۔

امام رازیؒ نے خوب جواب دیا ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ الْجَمَاعَةَ مِنَ الْجُهَّالِ یَظُنُّوْنَ اَنَّهٗ لَمَّا کَانَ الرُّوْحُ مَوْجُوْدًا لَیْسَ بِمُتَحَیِّزٍ وَلَا حَالٍ فِی الْمُتَحَیِّزِ وَجَبَ اَنْ یَّكُوْنَ مِثْلًا لِلّٰهِ... وَ ذٰلِكَ جَهْلٌ فَاحِشٌ وَ غَلَطٌ قَبِیْحٌ وَ تَحْقِیْقُهٗ مَا ذَكَرْنَا اَنَّ الْمُسَاوَاةَ فِیْ اَنَّهٗ لَیْسَ بِمُتَحَیِّزٍ وَ لَا حَالٍ فِی الْمُتَحَیِّزِ مُسَاوَاةٌ فِیْ

Scanned with CamScanner

صِفَةٍ سَلۡبِیَّۃٍ لَا تُوۡجِبُ الۡمُمَاثَلَۃَ... (تفسیر الکبیر، ۵:۴۴۵)

"خوب جان لیں کہ جہال کی ایک جماعت گمان کرتی ہے کہ جب روح موجود ہے، کسی چیز میں متحیز نہیں ہے، اور نہ متحیز میں حال ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ خدا کی مثیل ہو۔ یہ کہنا صریح جہالت اور بدترین غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ وہ 'غیر متحیز اور نہ متحیز میں حال ہے'۔ یہ اوصاف سلبیہ میں مساوات ہے جس سے مماثلت لازم نہیں آتی۔"

فائدہ:

(۱) ثابت ہوا کہ باری تعالیٰ کے اوصاف سلبیہ اور اضافیہ میں غیر کا شریک ہونا شرک نہ ہوگا۔

(۲) لامکان کی حقیقت سمجھنے کے لیے عقل اندھی ہے، حدیث کا لفظ 'عَمَاء' اس پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ لفظ 'عَمَاء' عدم بینائی پر بولا جاتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے اَلرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ... یعنی روح عالمِ امر کی چیز ہے۔ جب عقل انسانی عالمِ امر کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے تو عالمِ امر کی چیزوں کا ادراک کیونکر کرسکتی ہے، اس لیے علوم عقلی یا علوم ظاہری سے روح کی معرفت بالکل محال ہے۔ درحقیقت روح کی معرفت کا تعلق دلائلِ ذوقیہ، نورِ بصیرت یعنی کشف سے ہے اور جب دلائلِ ظاہریہ، ذوق اور کشف کی تائید کردیں تو نورٌ علیٰ نور ہے۔

جہاں تک ذوق اور کشف کا تعلق ہے اس بارے میں صرف محققین اصحابِ کشف اور اربابِ ذوق کا فیصلہ ہی حجت قرار دیا جاسکتا ہے اور دیا جانا چاہیے۔ اور محققینِ صوفیا کاملین اصحابِ کشف کا فیصلہ یہ ہے کہ روح مادی، نورانی اور لطیف چیز ہے۔ اور جہاں ہم نے یہ کہا ہے کہ جوہرِ مجرد ہے اس میں جوہر سے مراد یہ ہے کہ 'عرض' نہیں اور مجرد سے مراد یہ ہے کہ 'کثیف' نہیں۔ بلکہ جسمِ لطیف نورانی ہے اور اس کی شکل اس جسم کی شکل کے عین مطابق ہوتی ہے جس بدن کا وہ روح ہے۔ قدوقامت اور ہیئت میں ہو بہو اس جسم کے مطابق ہوتی ہے اور جمہور علمائے اسلام بھی اسی کی تائید کرتے ہیں جیسا کہ حضرت انور شاہ صاحبؒ نے ترمذی کی شرح 'عرف شذی' میں فرمایا:

وَ اَمَّا الرُّوۡحُ فَعِنۡدَ اَھۡلِ الۡاِسۡلَامِ جِسۡمٌ لَطِیۡفٌ عَلٰی شَکۡلِ کُلِّ ذِیۡ ذٰلِکَ الرُّوۡحِ وَ احۡتَجُّوۡا عَلٰی ھٰذَا اَیۡ عَلٰی جِسۡمِیَّۃِ الرُّوۡحِ بِمَا وَرَدَ فِی الۡاَحَادِیۡثِ کَمَا فِیۡ حَدِیۡثِ بَرَآءِ ابۡنِ عَازِبٍ فَیَنۡزِعُھَا کَمَا یُنۡزَعُ السَّفُّوۡدُ مِنَ الصُّوۡفِ الۡمَبۡلُوۡلِ... اِلٰی اَنۡ قَالَ... وَ اَحَادِیۡثُ اُخَرُ دَالَّۃٌ عَلٰی جِسۡمِیَّۃِ الرُّوۡحِ... فَاِنَّا نَتَمَسَّکُ بِنُصُوۡصِ الشَّرِیۡعَۃِ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ وَ الۡحَدِیۡثِ ...وَ الۡمُتَقَدِّمُوۡنَ مِنۡ عُلَمَآءِ الۡاِسۡلَامِ یُرِیۡدُوۡنَ بِالتَّجَرُّدِ عَدَمَ الۡکَثَافَۃِ یَظۡھَرُ ذٰلِکَ مِنۡ تَفۡسِیۡرِ سُوۡرَۃِ الۡاِخۡلَاصِ لِلۡحَافِظِ ابۡنِ تَیۡمِیَّۃَ... ثُمَّ اخۡتَلَفَ الصُّوۡفِیَّۃُ بَعۡدَ اِتِّفَاقِھِمۡ عَلٰی مَادِیَّۃِ الرُّوۡحِ... (عرف شذی، ابواب الطہارۃ، باب ما جاء فی فضل الطہور، ۱۰)

"اور جہاں تک روح کا تعلق ہے، اہل اسلام کے نزدیک وہ ایک لطیف جسم ہے اور اسی بدن کی شکل پر ہوتا ہے جس میں

Scanned with CamScanner

وہ ہو۔ روح کی اس جسمیت پر احادیث سے استدلال کیا گیا ہے جیسا کہ حدیث براء بن عاذب میں وارد ہے کہ فرشتہ روح کو بدن سے یوں کھینچ لیتا ہے جیسا کہ سیخ گیلی اون سے کھینچی جاتی ہے۔ دوسری حدیثیں جسمیتِ روح پر دلالت کرتی ہیں۔ پس ہم تو شریعت کی نصوص یعنی قرآن وحدیث سے تمسک کرتے ہیں۔ اور متقدمین علمائے اسلام نے تجرد سے مراد عدم کثافت لی ہے۔ یہ حقیقت امام ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ اخلاص سے ظاہر ہے۔ روح کے مادہ ہونے پر متفق ہونے کے بعد صوفیا نے کچھ اختلاف کیا ہے۔"

پھر رسالہ "روح وماھیتھا" میں علامہ بیونی فرماتے ہیں:

قَالَ الْإِمَامُ مَالِكٌ وَهُوَ مِنَ الْمُحَقِّقِيْنَ قَالَ: إِنَّ الرُّوْحَ هِيَ صُوْرَةٌ نُوْرَانِيَّةٌ عَلٰى شَاكِلَةِ الْجِسْمِ تَمَامًا... (رسالہ روح وماھیتھا، ٦٧)

"امام مالک جو محققین میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ روح نورانی جسم ہے جو مکمل طور پر اس بدن کی شکل پر ہوتا ہے جس میں وہ ہے۔"

اور 'روح المعانی' میں ہے:

وَاعْلَمْ أَوَّلًا أَنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْ أَنَّ الْإِنْسَانَ مَاهُوَ؟ فَقِيْلَ هُوَ هٰذَا الْهَيْكَلُ الْمَحْسُوْسُ مَعَ أَجْزَاءٍ سَارِيَةٍ فِيْهِ سَرَيَانَ مَاءِ الْوَرْدِ فِي الْوَرْدِ وَالنَّارِ فِي الْفَحْمِ وَهِيَ جِسْمٌ لَطِيْفٌ نُوْرَانِيٌّ مُخَالِفٌ بِالْحَقِيْقَةِ وَالْمَاهِيَّةِ لِلْأَجْسَامِ الَّتِيْ مِنْهَا ائْتَلَفَ هٰذَا الْهَيْكَلُ وَإِنْ كَانَ لِسَرَيَانِهٖ فِيْهِ بِشِبْهِهٖ صُوْرَةً وَلَا نَعْلَمُ حَقِيْقَةَ هٰذَا الْجِسْمِ وَهُوَ الرُّوْحُ الْمُشَارُ إِلَيْهَا بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ عِنْدَ مُعْظَمِ السَّلَفِ الصَّالِحِ وَبَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْبَدَنِ عَلَاقَةٌ... (روح المعانی، ۳۹:۱۴۔ ۴۳ ؛ ۱۵۵:۱۵۔ ۱۶۴)

"پہلے یہ سمجھو کہ مسلمانوں نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ انسان کیا چیز ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ ایک شکلِ محسوس ہے جس میں اجزا اس طرح ساری ہیں جیسے پھول میں نمی اور انگارے میں آگ۔ اور یہ جسمِ لطیف نورانی ہے جو حقیقت اور ماہیت میں ان اجسام سے مختلف ہے جن سے یہ شکلِ محسوسہ مرکب ہے۔ یہ روح اس بدن میں جاری وساری ہے اور شکل وصورت میں اس کے مشابہ ہے اور اس جسم یعنی روح کی حقیقت ہم نہیں جانتے جس کی طرف قولِ باری تعالیٰ میں اشارہ کیا گیا ہے، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ... اور یہ بات سلف صالحین کے نزدیک مسلّم ہے کہ روح اور بدن کے درمیان تعلق ہے۔"

وَهٰذَا الْجِسْمُ الْمُعَبَّرُ عَنْهُ بِالرُّوْحِ عَلٰى مَاقَالَ الْإِمَامُ الْقُرْطَبِيُّ فِي التَّذْكِرَةِ مِمَّا أَوَّلٌ وَلَيْسَ لَهٗ اٰخِرٌ بِمَعْنٰى أَنَّهٗ لَا يَفْنٰى وَإِنْ فَارَقَ الْبَدَنَ الْمَحْسُوْسَ وَذُكِرَ فِيْهَا أَنَّ مَنْ قَالَ إِنَّهٗ يَفْنٰى فَهُوَ مُلْحِدٌ... (روح المعانی، ۳۹:۱۴۔ ۴۳ ؛ ۱۵۵:۱۵۔ ۱۶۴)

"اور یہ جسم جسے روح سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ امام قرطبی نے تذکرہ میں فرمایا ہے اس کے لیے ابتدا ہے مگر اس کے لیے انتہا نہیں یعنی اس کے لیے فنا نہیں اگرچہ بدن سے جدا ہو جائے اور اس ضمن میں ذکر کیا

Scanned with CamScanner

ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ روح فانی ہے، وہ ملحد ہے۔"
ثابت ہوا کہ محققین سلف صالحین اور محققین صوفیا کا یہی مذہب ہے۔
دوسرا قول جو مردود ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:
حضرت انور شاہ صاحبؒ نے عرف شذی میں نقل کیا ہے۔
اس قول کے قائلین اصل میں فلاسفہ ہیں اور جن صوفیاء یا علماء نے اس قول کو نقل کیا ہے وہ محض فلاسفہ سے متاثر اور مرعوب ہو کر کیا ہے۔

قَالَ جُهَلَاءُ الْفَلَاسَفَةِ اِنَّ الرُّوْحَ مُجَرَّدٌ... "جاہل فلاسفہ کہتے ہیں کہ روح مجرد ہے۔"
(عرف شذی، ابواب الطہارہ، باب ما جاء فی فضل الطھور، ۱۰)

روح المعانی اور عرف شذی میں ہے:

وَذَهَبَ اِلٰی تَجَرُّدِ الرُّوْحِ قَاضِیْ زَادَهْ وَ الْحَلِیْمِیُّ وَ الْغَزَالِیُّ وَ الرَّاغِبُ وَ اَبُوْ زَیْدٍ الدَّبُوْسِیُّ مِنَ الْحَنَفِیَّةِ وَ مَعْمَرٌ مِنْ قُدَمَاءِ الْمُعْتَزِلَةِ وَ جُمْهُوْرُ مُتَاَخِّرِی الْاِمَامِیَّةِ وَ کَثِیْرٌ مِنَ الصُّوْفِیَّةِ... وَعِنْدَهُمُ الرُّوْحُ جَوْهَرٌ مُجَرَّدٌ وَلَیْسَتْ دَاخِلَةً فِی الْبَدَنِ وَلَا خَارِجَةً عَنْهُ فَنِسْبَتُهَا اِلَیْهِ کَنِسْبَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی اِلَی الْعَالَمِ وَ هِیَ بَعْدَ حُدُوْثِهَا الزَّمَانِیِّ عِنْدَهُمْ لَا تَفْنٰی... اَیْضًا وَرَدَّ هٰذَا الْمَذْهَبَ ابْنُ الْقَیِّمِ فِیْ کِتَابِ الرُّوْحِ مَالَا مَزِیْدَ عَلَیْهِ... (روح المعانی، ۲۳:۵۷؛ عرف شذی، ابواب الطہارہ، باب ما جاء فی فضل الطھور، ۱۰)

"اور تجرد روح کا قول قاضی زادہ علامہ حلیمی، امام غزالی اور امام راغب اور ابوزید دبوسی حنفی اور قدیم معتزلہ سے معمر اور تمام متاخرین شیعہ کا ہے اور بہت سے صوفیا کا قول بھی ہے۔ ان کے نزدیک روح جوہر مجرد ہے، نہ بدن میں داخل ہے نہ بدن سے خارج ہے، اور اس کا تعلق بدن سے ایسا ہے جیسا اللہ کا تعلق جہان سے ہے۔ ان کے نزدیک روح کے لیے حدوث زمانی ہے اور روح فانی نہیں ہے۔ اور ابن قیم نے اس مذہب کو کتاب الروح میں ایسے دلائل سے رد کیا ہے کہ مزید تردید کی حاجت نہیں چھوڑی۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ روح کے متعلق اس دوسرے مذہب میں شافعی، حنفی، معتزلہ اور امامیہ کے افراد شامل ہیں جو سارے کے سارے فلاسفہ سے مرعوب ہو کر اس رو میں بہہ گئے ہیں اور قول اول جو بیان ہو چکا اس میں جمہور علمائے اسلام اور محققین صوفیا کا ایک عظیم گروہ شامل ہے۔ بالخصوص عظیم سلف صالحین نے یہی مذہب اختیار کیا ہے کہ روح جسم مادی ہے، لطیف ہے، نورانی ہے۔ جس بدن میں وہ ہے اسی کی شکل پر ہے۔ بدن سے جدا ہونے کے بعد اس کے لیے جسم مثالی ضرورت نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ حیات کسے کہتے ہیں؟ حیات نام ہے جسم

Scanned with CamScanner

حرکت، دیکھنا، سننا، بولنا، قویٰ ظاہری وباطنی کا موجود ہونا۔ روح دنیا میں بدن کو زندگی بخشتا ہے۔ دنیا میں مادی چیزوں کو سننے میں مادی آلات کا محتاج ہے، نہ کہ اپنی حیات میں مادی بدن کا محتاج ہے، بلکہ روح بدن کو حیات بخشتا ہے۔ برزخ میں جاکر روح مادی دنیا کو اپنی آواز نہیں سنا سکتا۔ اسی لیے مادی آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں، مادی کان اس کی بات نہیں سن سکتے حالانکہ وہ خود بولتا ہے، سنتا ہے۔ اس کے سارے اعضا ذاتی ہیں جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے کہ روح اپنے بدن کی شکل پر ہوتا ہے۔ روح خود جسمِ لطیف، اس کے کان لطیف، اس کی آواز لطیف، اس کو تمام لطیف چیزیں دیکھ لیتی ہیں، اس کی آواز سن لیتی ہیں جیسا کہ ملائکہ، قلوبِ انبیاء، قلوبِ اولیاء۔ لطیف چیزوں کو دیکھنے یا سننے سنانے میں کسی غیر جسم کے آلات کا محتاج نہیں ہوتا کہ برزخ میں اس کے لیے جسمِ مثالی تسلیم کیا جائے۔ اگر لطیف چیزوں کو دیکھنے یا سننے سنانے میں جسمِ مثالی کا محتاج مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ روح حیات بخش نہیں بلکہ روح کو جسمِ مثالی حیات بخشتا ہے اور روح کے کوئی ذاتی آلات نہیں وہ ایک پتھر ہے (العیاذ باللہ)۔ جسمِ مثالی کا تسلیم کرنا خلافِ قرآن، خلافِ حدیث اور خلافِ سلف صالحین ہے اور جو شخص جسمِ مثالی کا قائل ہوا ہے اس نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اللہ اس کو ہدایت دے۔

روح لامکانی ہے

امام رازی تفسیر کبیر میں قائلینِ تصوف کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول جو محققین ہیں جن میں سے بعض کا قول ہے کہ روح نہ عالم میں داخل ہے نہ خارج، یعنی جب عالم یا عالمین کی بات ہوتی ہے تو روح اس میں شامل بھی نہیں اور اس سے الگ بھی نہیں کہ اسی میں بستی ہے، اس کا حصہ نہیں ہے۔ جیسے قرآن میں ارشاد ہے، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ... تو یہ عالمِ امر کی شئے ہے۔ عالمِ خلق میں بستی ہے لیکن عالمِ خلق میں اس کا شمار نہیں ہوتا۔ اور ان میں بعض کا قول ہے کہ "روح نہ عالم میں داخل نہ خارج، نہ داخل میں متصل ہے نہ اس سے منفصل"، یعنی عالم میں داخل ہو کر کسی چیز کے ساتھ بھی بندھی ہوئی نہیں ہے۔ متصل سے مراد ہوتا ہے جڑ جانا۔ اور نہ خارج میں، نہ عالمِ امکان کے باہر کسی چیز سے یہ مقید ہے۔ "انسانی بدن سے اس کا تعلق تدبیر وتصرف کا ہے۔" یعنی جب روحِ انسانی، بدن میں موجود ہوتی ہے تو جو کچھ وہ کرتا ہے، سوچتا ہے، سمجھتا ہے، اس کا سبب روح ہے۔ روح نہ ہو تو یہ ساری چیزیں اس میں نہیں رہتیں۔ معلوم ہوا "روح مجرد (ایسی چیز جو قائم بالذات ہو اور اپنے افعال میں اسباب وآلات اور محل کی محتاج نہ ہو) ہے"، بہت لطیف ہے، لامکانی ہے، اس کے لیے مکان نہیں ہے۔ مکان مادیات کے لیے ہوتا ہے۔" یعنی کوئی مخصوص جگہ اس کے لیے ہوتی ہے جس کا مادی وجود ہو۔ جب روح کا مادی وجود ہی نہیں تو اس کے لیے کوئی خاص جگہ نہیں ہے، یعنی روح بدن سے پہلے موجود تھی اور اس کے بعد بھی موجود رہتی ہے۔ بدن کے وجود میں آنے سے پہلے بھی روح سنتی، دیکھتی، کلام کرتی ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا، اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا... (ہمارا ربّ کہاں ہے؟)

تو آپ ﷺ نے فرمایا، "فِیْ عَمَاءٍ مَکَانٍ..." "مکان ذاتِ باری کے لیے منفی ہے۔"

Scanned with CamScanner

لامکان کی حقیقت سمجھنے کے لیے عقل اندھی ہے۔ حدیث کا لفظ 'عماء' اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عماء عدم بینائی کے لیے بولا جاتا ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے ذاتِ باری کے بارے میں فرمایا 'عماء' یعنی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی نہ مادی عقل اسے سمجھ سکتی ہے۔ اس کے لیے یہ اندھے ہیں اس لیے آپ ﷺ نے فِيْ عَمَاءٍ مَكَانٍ... کے الفاظ استعمال فرمائے۔

سوال: متکلمین کے نزدیک تجرد بالمحصل علیہ، عالم میں داخل بھی نہیں خارج بھی نہیں اور لامکانی ہے تو یہ تو صفت اللہ کی ہے کہ اس کے لیے کوئی مکان نہیں ہے، اگر یہ صفت روح میں تسلیم کرلی جائے تو شرک فی الذات نہ ہوگا؟

جواب: جواب دیا گیا کہ اگر اس طرح روح میں یہ صفت تسلیم کرلی جائے تو یہ شرک نہیں ہوگا کیونکہ اللہ کی صفات کی خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گی۔ یعنی ان کا وجود میں لانا صفاتِ باری میں سے ہے اور ایسا تجرد ذاتِ باری میں نہیں ہے جس پر فنا بھی آسکتی ہو، جس میں تغیر وتبدل بھی ہوسکتا ہو۔ جبکہ روح کے حالات میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ یہ عالمِ امر سے دنیا میں آتی ہے اور دنیا سے برزخ میں جائے گی۔ جن میں تبدیلیاں ہوسکتی ہیں وہ صفات اللہ کی صفات نہیں ہیں کہ ممکن بھی ہو اور حادث بھی ہو یعنی ایسی صفت کہ ہو بھی سکتی ہے اور ایسی جو کبھی ضائع بھی ہوسکتی ہے۔ امام رازیؒ نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا ہے کہ جان لیں کہ جہلاء کی ایک جماعت گمان کرتی ہے کہ روح موجود ہے اور کسی چیز میں متحیز نہیں ہے یعنی اس سے شرک لازم آتا ہے۔ "نہ متحیز ہے......" تو اس سے لازم ہوگا کہ خدا کی مثیل ہو۔ فرماتے ہیں کہ "یہ کہنا صریح جہالت اور بدترین غلطی ہے۔ حقیقت وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ وہ غیر متحیز، نہ کہ متحیز ہے"۔ متحیز 'حیز' سے ہے جس کا مطلب 'مل جانا' ہے جیسا کہ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۱۶ میں ہے:

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ... الخ (الانفال:16)

''اور جو شخص اس موقع پر ان (دشمن) سے اپنی پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس کے کہ پینترا بدلے یا اپنی فوج سے جاملنا چاہے۔''

اسی طرح اوصافِ اضافیہ میں غیر کا شریک ہونا شرک نہ ہوگا۔ اوصافِ اضافیہ میں اللہ کی طرف اضافت (نسبت) کی جاتی ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ پہلی اضافتِ مطلقہ ہے۔ اگر ایسی اشیاء جو اپنا ایک وجود رکھتی ہوں، اُن کی اضافت اللہ کی طرف کی جائے تو وہ ان اشیاء کے شرف واختصاص کے لیے ہوتی ہے مثلاً بیت اللہ، ناقۃ اللہ، اسد اللہ وغیرہ۔ اضافت کی دوسری قسم ایسی صفات جو صرف ذاتِ باری کے ساتھ ہی قائم ہیں مثلاً اللہ کا علم، اس کی حیات، قدرت، عزت، سمع، بصر۔ اب یہ صفات انسان میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اس مماثلت سے شرک لازم نہیں آتا کیونکہ انسان کے اندر جو اوصاف ہیں، ان کی کیفیت ہمارے سامنے ہے لیکن جب ان اوصاف کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو ان کی کیفیت کا علم اللہ کو ہے۔ اگر تکییف یعنی کیفیت کے لحاظ سے مماثلت کہی جائے تو شرک لازم آئے گا۔ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا صریح جہالت اور بدترین غلطی ہے۔ حقیقت وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ ''وہ غیر متحیز نہ متحیز ہے۔''

Scanned with CamScanner

روح عالمِ امر سے ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح کی پیدائش کس چیز سے ہوئی؟

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

اَلرُّوْحُ عِنْدَ اِلٰهِ الْعَرْشِ مَبْدَؤُهٗ وَ تُرْبَةُ الْاَرْضِ اَصْلُ الْجِسْمِ وَ الْبَدَنِ قَدْ اَلَّفَ الْمَلِكُ الْحَنَّانُ بَيْنَهُمَا لِيَصْلُحَا لِقَبُوْلِ الْاَمْرِ وَ الْمِحَنِ فَالرُّوْحُ فِيْ غُرْبَةٍ وَ الْجِسْمُ فِيْ وَطَنٍ فَاَعْرِفْ ذِمَامَ الْغَرِيْبِ النَّازِحِ الْوَطَنِ... (تفسیر الکبیر، ۱۵: ۴۱۱)

"روح کی ابتدا صاحبِ عرش سے ہے (مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ) اور بدنِ انسانی کی اصل مٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں الفت ڈال دی تاکہ ان میں اوامر اور محنتیں قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔ پس روح مسافر ہے اور بدن اپنے وطن میں ہے، پس غریب الوطن مسافر کی ذمہ داری کا خیال رکھو۔"

روح عالمِ امر سے ہے

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ روح امرِ ربی سے ہے، عالمِ امر سے ہے اور بدن مٹی سے اور اپنے وطن میں ہے۔ روح عالمِ امر سے آکر اس میں ٹھہری ہے لہٰذا مسافر ہے۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ مسافر کا خیال رکھو، اسے واپس پلٹ کر گھر جانا ہے۔ اسے آگے اسفل السافلین کی طرف مت دھکیلو بلکہ ایسا کردار اپناؤ کہ اس کا تعلق واپس اپنے مقام سے ہو، وہ واپس اپنے گھر جائے۔

عالمِ امر کیا ہے؟

حضرت امام غزالیؒ نے عالمِ امر اور عالمِ خلق پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان عرش بطور برزخ حائل ہے۔

وَ عَالَمُ الْاَمْرِ عِبَارَةٌ مِّنَ الْمَوْجُوْدَاتِ الْخَارِجَةِ مِنَ الْحِسِّ وَ الْخَيَالِ وَ الْجِهَةِ وَ الْمَكَانِ وَ هُوَ مَا لَا يَدْخُلُ تَحْتَ الْمَسَاحَةِ وَ التَّقْدِيْرِ لِانْتِفَاءِ الْكَمِّيَّةِ عَنْهُ... (رسالہ روح و ماھیتہا، ۳۶)

"عالمِ امر عبارت ہے موجودات سے جو حس، خیال، جہت، مکان اور چیز سے خارج ہے۔ عالمِ امر انتفائے کمیت کی وجہ سے مساحت و تقدیر کے تحت نہیں آسکتا۔"

عالمِ امر کیا ہے

حضرت امام غزالیؒ نے عالمِ امر اور خلق پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں کے درمیان عرش ہیں۔ عرش کے اوپر عالمِ امر ہے اور نیچے عالمِ خلق ہے۔ خود عرش بھی عالمِ خلق میں شامل ہے۔ فرماتے ہیں "عالمِ امر عبارت موجودات سے

Scanned with CamScanner

ہے۔ ایسی موجودات جو حس، خیال، جہت، مکان سے خارج ہے۔" عالمِ امر کی کسی چیز کی کوئی ہیت، کوئی رُخ نہیں ہے۔ آنکھ اس کی کوئی چیز دیکھ نہیں سکتی۔ اس کا وجود محسوس نہیں ہوتا، اس سے خارج ہے لیکن موجود ہے۔ "انتفائے کمیت نہیں ہے۔" کمیت مقدار مادہ کو کہتے ہیں اور مادہ اُس چیز کو کہتے ہیں جو جگہ گھیرتی اور وزن رکھتی ہے تو اس کا مطلب وہاں یہ اندازے کہ کتنا بڑا ہے، چھوٹا ہے، پتلا ہے، چوڑا ہے، نہیں لگائے جا سکتے۔ عالمِ امر کی کوئی چیز کسی اندازے میں نہیں آسکتی۔

کون سی چیزیں عالمِ امر سے ہیں

صاحب تفسیر مظہری نے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ... کی تفسیر میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے:

قَالَتِ الصُّوْفِيَةُ الْمُرَادُ بِالْخَلْقِ وَ الْاَمْرِ. عَالَمُ الْخَلْقِ يَعْنِيْ جِسْمَانِيَةُ الْعَرْشِ وَ مَا تَحْتَهُ وَ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ اُصُوْلُهَا الْاَرْبَعَةُ الْعَنَاصِرُ... اَلنَّارُ وَ الْهَوَآءُ وَ الْمَآءُ وَ التُّرَابُ وَ مَا يَتَوَلَّدُ مِنْهَا مِنَ النُّفُوْسِ الْحَيَوَانِيَةِ وَ النَّبَاتِيَةِ وَ الْمَعْدَنِيَةِ وَ هِيَ اَجْسَامٌ لَطِيْفَةٌ سَارِيَةٌ فِيْ اَجْسَامٍ كَثِيْفَةٍ. وَ عَالَمُ الْاَمْرِ يَعْنِي الْمُجَرَّدَاتِ مِنَ الْقَلْبِ وَ الرُّوْحِ وَ السِّرِّ وَ الْخَفِيِّ وَ الْاِخْفَاءِ اَلَّتِيْ هِيَ فَوْقَ الْعَرْشِ سَارِيَةً فِي النُّفُوْسِ الْاِنْسَانِيَةِ وَ الْمَلَكِيَةِ وَ الشَّيْطَانِيَةِ سَرَيَانَ الشَّمْسِ فِي الْمِرْاٰةِ سُمِّيَتْ بِعَالَمِ الْاَمْرِ لِاَنَّ اللهَ تَعَالٰى خَلَقَهَا بِلَا مَادَّةٍ بِاَمْرِهٖ كُنْ. قَالَ الْبَغَوِيُّ قَالَ سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ فَرَّقَ بَيْنَ الْخَلْقِ وَ الْاَمْرِ فَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ كَفَرَ... (تفسیر مظہری، ۳ : ۴۰۷)

"صوفیا کرام نے کہا کہ مراد عالمِ خلق اور عالمِ امر سے یہ ہے کہ عالمِ خلق میں عرش اور جو ماتحت عرش ہے اور جو چیز آسمان اور زمین اور ان کے مابین ہے، شامل ہے اور اس کے اصول عناصرِ اربعہ، آگ، پانی، ہوا اور مٹی اور جو چیزیں ان سے پیدا ہوتی ہیں، یعنی نفوسِ حیوانی، نباتاتی اور معدنی ہیں اور یہ اجسامِ لطیفہ ان اجسامِ کثیفہ میں ساری ہیں، سب عالمِ خلق سے ہیں۔ اور عالمِ امر سے مراد مجردات ہیں، یعنی (لطائفِ خمسہ) قلب، روح، سری، خفی اور اخفاء۔ یہ فوق العرش ہیں اور یہ نفوسِ انسانیہ، ملکیہ اور شیطانیہ میں یوں ساری ہیں جیسے سورج کی شعاعیں آئینہ میں ساری ہوتی ہیں۔ لطائف کو عالمِ امر اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی مادہ سے نہیں، بلکہ اپنے اَمرِ کُنْ سے پیدا کیا، اور بغویؒ فرماتے ہیں کہ سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس نے ان دونوں کو ایک سمجھا، اس نے کفر کیا۔"

فائدہ:

معلوم ہوا کہ روح اور دیگر لطائف عالمِ امر کی مخلوق ہیں جو بغیر مادہ کے پیدا کیے گئے۔ عالمِ امر کو عالمِ حیرت اور لامکان بھی کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

کون سی چیزیں عالم امر سے ہیں

قرآن کریم کی آیت ہے، اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ...

"غور سے سنو! عالمِ خلق بھی اللہ کا ہے اور عالمِ امر کا بھی وہی مالک ہے۔"

صاحب تفسیر مظہری نے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ... کی تفسیر میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

جتنے وجود مادے سے بنے ہیں، سورج، چاند، ستارے ہیں یا نباتات، حیوانات، چرند، پرند، انسان یہ سب عالمِ خلق ہیں۔ نویں عرش کے بعد اوپر عالمِ امر شروع ہوتا ہے۔ عالمِ امر میں کوئی ایسا وجود نہیں جس کی کوئی کیفیت یا حد ہو یا اُسے چھوا اور محسوس کیا جا سکے اس لیے کہ وہ کسی مادے سے نہیں بنا۔ محض اللہ کے حکم کُن سے بنا ہے، "ہو جا" وہ ہو گیا۔ یہ ساری مخلوق جو عرش سے نیچے ہے ان کا مادہ اللہ نے بیان فرمایا، آگ، مٹی، ہوا، پانی یا نور۔ عالمِ امر کسی مادے سے نہیں بنا اور عالمِ امر کے حصے (لطائفِ خمسہ) نفوسِ قدسیہ میں، انبیاءؑ میں موجود ہوتے ہیں اور اُن کی صحبت سے دوسروں میں منتقل ہوتے ہیں۔ ہر انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان لطائف کو راسخ کرے۔ الا یہ کہ وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ معلوم ہوا کہ روح اور دیگر لطائف عالمِ امر کی مخلوق ہیں جو بغیر مادہ کے پیدا کیے گئے ہیں۔ عالمِ امر کو عالمِ حیرت اور لامکان بھی کہتے ہیں۔

بغویؒ فرماتے ہیں کہ سفیان بن عیینہؒ نے فرمایا کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق دو مختلف چیزیں ہیں۔ جس نے ان دونوں کو ایک سمجھا، اس نے کفر کیا۔

روح کی شکل وصورت

جسمِ انسانی ایک ٹھوس مادی شکل رکھتا ہے۔ اس کی وضع قطع، قدوقامت اور اس کے اعضا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا روحِ انسانی کی بھی کوئی شکل وصورت ہے یا بس جوہرِ لطیف ہے؟

یہ سوال ذہن میں پیدا ہونا قدرتی بات ہے، اس کے متعلق بخاری شریف میں ایک بحث کی گئی ہے:

وَلِلرُّوْحِ صُوْرَةٌ لَطِيْفَةٌ عَلٰى صُوْرَةِ الْجِسْمِ لَهَا عَيْنَانِ وَ اُذُنَانِ وَ يَدَانِ وَ رِجْلَانِ فِیْ دَاخِلِ الْجِسْمِ يُقَالُ بَلْ كُلُّ جُزْءٍ مِّنْهُ عُضْوُ نَظِيْرِهٖ فِی الْبَدَنِ وَ قَدْ اَبْهَمَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَمْرَ الرُّوْحِ وَتَرَكَ تَفْصِيْلَهٗ... (تحفة القاری بحل مشکلات البخاری، باب قول اللہ تعالیٰ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا، ۲:۴۴)

"جسم کی شکل کے مطابق روح کی بھی لطیف صورت ہے۔ روح کی بھی دو آنکھیں ہیں، کان ہیں، ہاتھ اور پاؤں ہیں بلکہ روح کے ہر عضو کی نظیر بدنِ انسانی میں موجود ہے اور روح کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا اور اس کی تفصیل چھوڑ دی ہے۔"

Scanned with CamScanner

اس سے معلوم ہوا کہ روح کی شکل بعینہٖ وہی ہوتی ہے جو بدن کی شکل ہے جس میں وہ روح داخل کی گئی ہے۔
عالمِ برزخ قیامتِ صغریٰ ہے جہاں روح زندہ رہتی ہے، اور عالمِ آخرت قیامتِ کبریٰ ہے۔
جس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ... (العنکبوت: ۶۴) "یقیناً آخرت کا گھر ہی تو زندگی ہے۔"

اور ظاہر ہے کہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی کے مقابلے میں اکمل زندگی ہے۔ دنیا اور اس کی ہر شے کے لیے موت اور فنا ہے مگر آخرت کی زندگی ابدی ہے۔ اس لیے دارِ آخرت کی ہر شے، کیا جزو کیا کل، موت سے پاک ہے۔ جب روح کے لیے جزا و سزا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ زندہ ہے کیونکہ مردہ اور معدوم کے لیے جزا و سزا نہیں ہے۔ اس لیے روح سنتی ہے، دیکھتی ہے، بولتی ہے بلکہ اس کی ساری قوتیں اور تمام صلاحیتیں اسی جگہ کامل درجے پر معرضِ اظہار میں آتی ہیں۔

روح کو جب بدن میں داخل کیا جاتا ہے تو بدن کی خصوصیات سامنے آتی ہیں مثلاً بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ اور بچپن میں ذہن، عقل، فہم و ادراک وغیرہ کا ناقص ہونا، پھر رفتہ رفتہ عمر کے ساتھ ترقی کرنا وغیرہ، یہ بدن کی خصوصیات ہیں ورنہ روح تو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی عاقل، بالغ اور ذی فہم ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ... کے جواب میں بَلٰی... کیوں کہتی؟ سوال سننا سمجھنا، اور جواب دینا روح کے پیدائشی عاقل بالغ ہونے کی دلیل ہے۔

جب روح کو کسی بدن کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا تعلق استقرائی ہوتا ہے۔ پھر اسے بدن کے اعضاء دیے جاتے ہیں۔ اس بدن میں کچھ قوتیں اور آلات ودیعت کر دیے گئے ہیں جن میں بعض حسی اور بعض معنوی قوتیں ہیں۔ یہاں رہ کر روح انہی قوائے بدن کے ذریعے علم حاصل کرتی ہے۔ حسی قوتیں پیدائش کے وقت کمزور ہوتی ہیں اور چونکہ روح کو یہاں جسم کے تابع بنایا گیا ہے اس لیے جسم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان قوتوں میں ترقی محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہاں روح کو بدن کے تابع نہ بنایا جاتا تو پیدا ہوتے ہی ہر شخص مکلف ہوتا کیونکہ روح تو پیدائش سے ہی عاقل بالغ ہے۔ مگر بدن سے وابستگی کی وجہ سے مکلف ہونے کے لیے عمر کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جسے سنِ بلوغت کہتے ہیں۔ انسان دنیا سے رخصت ہوا، روح کی جسم سے مفارقت ہوئی تو روح بالذات مکلف ہوگئی۔ یہاں سے بعض لوگوں نے ایک بڑی ٹھوکر کھائی ہے کہ برزخ میں روح کے لیے جسمِ مثالی ثابت کرنے کی کوشش کی، جس کا مطلب یہ ہے کہ روح کسی وقت بھی بدن کے بغیر مکلف نہیں۔ یہ عقیدہ باطل ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ برزخ میں روح بالذات مکلف ہے اور بدن روح کے تابع ہوتا ہے اور اس بدنِ خاکی کو روح ہی حیات بخشتی ہے۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہے:

محرکِ تن روح است، و محرکِ روح نور و محرکِ نور ذات۔
عزیزِ من! ایں مقام را کما ینبغی دانستن کمال محال است و شب و روز بذکر و فکر و سیر و طیران مقامات ماندن بجز طالبِ صادق و توجہٗ مرشدِ کامل حصولِ انتہا نمی تواند شد۔۔۔

Scanned with CamScanner

"بدن کو حرکت دینے والا روح ہے اور روح کو حرکت اور زندگی نور سے ملتی ہے اور نور کو حیات اور حرکت دینے والا ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ میرے عزیز اس مقام کو کما حقہٗ سمجھنا محال ہے۔ رات دن ذکر و فکر، سیر ملکوتی اور عالم بالا میں پرواز سوائے طالب صادق اور بغیر مرشد کامل کی توجہ کے ممکن نہیں۔"

روح کی شکل وصورت

جسمِ انسانی ایک ٹھوس مادی شکل رکھتا ہے۔ اس کی وضع قطع، قد وقامت اور اس کے اعضا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا انسانی جسم میں رچی بسی روحِ انسانی کی بھی کوئی شکل وصورت ہے یا وہ محض ایک جوہرِ لطیف ہے؟ ایسا سوال ذہن میں آنا ایک فطری بات ہے۔ اس موضوع پر 'تحفۃ الباری شرح صحیح بخاری' میں تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔

ترجمہ: جسم کی شکل کے مطابق روح کی بھی لطیف صورت ہے۔ روح کی بھی دو آنکھیں ہیں، کان ہیں، ہاتھ اور پاؤں ہیں بلکہ روح کے ہر عضو کی نظیر (مثال، اس جیسی) بدنِ انسانی میں موجود ہے اور روح کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ روح کی شکل بعینہٖ وہی ہوتی ہے جو بدن کی شکل ہے جس میں کہ وہ روح داخل کی گئی ہے۔ عالمِ برزخ قیامتِ صغریٰ ہے جہاں روح زندہ رہتی ہے (خواہ بدن بکھر جائے)، اور عالمِ آخرت قیامتِ کبریٰ ہے جس کے متعلق ارشادِ باری ہے:

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ... (العنکبوت: ۶۴) "یقیناً آخرت کا گھر ہی تو زندگی ہے۔"

اور ظاہر ہے کہ آخرت کی زندگی ہی تو کامل و اکمل زندگی ہے۔ اس کے برعکس دنیا اور اس کی ہر شے کے لیے موت اور فنا ہے جبکہ آخرت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے۔ آخرت کی ہر شے کل سے لے کر جزو تک موت سے پاک ہے۔ یہ نہیں کہ انسان زندہ ہے مگر کوئی اعضا کٹ یا جل گیا۔ نہیں! وہاں چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کے لیے بھی ابدی زندگی ہے۔

جب روح کے لیے جزا و سزا ہے تو ظاہر ہے کہ روح زندہ ہے۔ جان اور احساس رکھتی ہے۔ کیونکہ جو مر جائے، ختم ہو جائے، اس کے لیے سزا کیسی؟ روح کی ساری صلاحیتیں، ساری قوتیں دارالآخرت میں اپنے کامل اور اعلیٰ ترین درجے پر معرضِ اظہار میں آتی ہیں۔ وہ دنیا کی زندگی کی بہ نسبت زیادہ بلکہ کہیں زیادہ بہتر طریق پر دیکھتی، ہنستی اور بولتی ہے۔

روح کو جب بدن میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کے وسیلے سے بدن کی خصوصیات سامنے آتی ہیں مثلاً بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ بچپن میں ذہن، عقل، فہم وادراک کا ناقص ہونا، پھر جسمانی قویٰ کا مضبوط اور طاقتور ہونا اور عمر کے ساتھ ساتھ تمام صلاحیتوں کا ترقی کرنا وغیرہ بدن کی خصوصیات ہیں جبکہ روح اپنی پیدائش کے وقتِ آغاز ہی سے عاقل و بالغ ہے، ذی فہم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ... کے جواب میں بَلٰی--- کیونکر کہتی؟ سوال کو سننا، سمجھنا اور جواب دینا روح کے شروع ہی سے عاقل و بالغ ہونے کی دلیل ہے۔

Scanned with CamScanner

جب روح کو کسی بدن کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اُس کا تعلق استقرائی یعنی ٹھکانا کرنے کا ہوتا ہے۔ پھر اسے بدن کے اعضاء دیے جاتے ہیں، ہر عضوِ بدن میں اس کا دخل ہو جاتا ہے۔ بدنِ انسانی میں کچھ قوتیں اور آلات ودیعت کر دیے گئے ہیں جن میں بعض معنوی قوتیں ہیں مثلاً ذہانت وغیرہ اور بعض حسی قوتیں ہیں مثلاً جسم کے قویٰ کی طاقت اور قوتِ کار وغیرہ۔ بدن میں روح استقراءً یعنی ٹھکانا کرتی ہے اور انہی قوائے بدن کے ذریعے علم حاصل کرتی ہے۔ حسی قوتیں پیدائش کے وقت کمزور ہوتی ہیں اور چونکہ روح کو دنیا میں جسم کے تابع بنایا گیا ہے، اس لیے جسم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان قوتوں میں ترقی محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہاں روح کو بدن کے تابع نہ بنایا جاتا تو روح کی بلوغت کی وجہ سے ہر شخص پیدا ہوتے ہی مکلف ہوتا۔ مگر بدن سے وابستگی کی وجہ سے مکلف ہونے کے لیے عمر کی ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جسے سنِ بلوغت کہتے ہیں۔ انسان دنیا سے رخصت ہوا۔ روح اور بدن کی آپس میں جدائی ہوئی تو روح بالذات مکلف ہو گئی۔ یہاں آ کر بعض لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے کہ برزخ میں روح کے لیے جسمِ مثالی (ایک اور جسم) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ روح کسی وقت بھی، کسی عالم میں بھی بدن کے بغیر مکلف نہیں۔ یہ غلط عقیدہ ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ برزخ میں روح مکلف بالذات ہے اور بدن روح کے تابع ہوتا ہے اور بدنِ خاکی کو روح ہی حیات بخشتی ہے۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہے:

> "بدن کو حرکت دینے والی روح ہے اور روح کو حرکت اور زندگی نور سے ملتی ہے اور نور کو حرکت و حیات دینے والی ذاتِ باری ہے۔ میرے عزیز! اس مقام کو (اس سارے سلسلے کو) کما حقہٗ (جیسا کہ اس کا حق ہے یعنی مکمل طور پر) سمجھنا محال ہے۔ رات دن ذکر و فکر، سیرِ ملکوتی اور عالمِ بالا میں پرواز، سوائے طلبِ صادق اور بغیر مرشدِ کامل کی توجہ کے، ممکن نہیں۔"

باب (6)

بحثِ نفس

وجہ تسمیہ
نفس کا لفظ نفاست سے ہے تو بوجہ شرافت و لطافت کے نفس کہا جاتا ہے، یا تنفس سے ہے تو بوجہ سانس کی آمد و شد کے
نفس کہا جاتا ہے۔ اگر آنے جانے کی صفت کی وجہ سے نفس سے مراد روح لی جائے تو یہ اس لیے درست ہے کہ نیند کے وقت روح
خارج ہو جاتی ہے، پھر لوٹ آتی ہے۔

وجہ تسمیہ
نفس کا لفظ یا تو نفاست سے ہے تو شرافت و لطافت کی وجہ سے نفس کہا جاتا ہے۔ اگر یہ لفظ تنفس سے ماخوذ ہے تو بوجہ
سانس کی آمد و شد کے نفس کہا جاتا ہے مگر آنے جانے کی صفت کی وجہ سے نفس سے مراد روح لی جائے تو یہ اس لیے درست ہے
کہ نیند کے وقت روح خارج ہو جاتی ہے، پھر لوٹ آتی ہے۔ جب آگ، پانی، مٹی اور ہوا ملے تو ان سے ایسے بخارات پیدا ہوئے
جو مادی حیات کا سبب بنے، جسے روحِ حیوانی کہتے ہیں اور اسے نفس بھی کہتے ہیں اور نفس کا لفظ روح پر بھی بولا گیا ہے۔
حدیثِ مبارکہ میں بھی اور قرآن کریم میں بھی بولا گیا ہے۔ چونکہ جو نفس عناصرِ اربعہ کے ملنے سے بنتا ہے وہ بھی روح کا کام کرتا ہے،
اس لیے روح پر بھی اسی لفظ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ یہ بھی مادی حیات کا سبب بنتا ہے لیکن کیونکہ یہ مادی چیزوں کے ملاپ سے وجود
میں آتا ہے اس لیے اس کا زیادہ رجحان نفسانی اور مادی خواہشات کی طرف ہوتا ہے، اسے نفسِ امارہ کہتے ہیں۔ اِنَّ النَّفۡسَ
لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ... (یوسف: ۵۳) نفسِ امارہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ برائی کا حکم دیتا ہے، خواہش کی تکمیل غلط طریقے سے کرنے
پر اکساتا ہے۔ لوٹ لو، رشوت لو، غلط راہ سے عہدہ لو، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب وہ روح جو عالمِ امر سے ہے غلبہ پانے لگے، نفس کی
تربیت کی جائے تو بندہ ایمان لے آتا ہے اور اللہ کا نام لینا شروع کرتا ہے، اللہ کی اطاعت شروع کرتا ہے پھر روح اس پر غالب آ جاتی
ہے۔ پہلے نفسِ امارہ ہوتا ہے یعنی برائی پہ اکسانے والا نفس، پھر ان مراحل سے گزرتا ہے تو برائی سے منع کرتا ہے اور برائی کرنے پر
ملامت کرنے والا یعنی نفسِ لوامہ بن جاتا ہے۔ جب اس سے آگے ترقی کرتا ہے اور اسے فنا فی اللہ نصیب ہوتا ہے تو یہ نفسِ مطمئنہ بن
جاتا ہے۔ اسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً... (الفجر: ۲۷، ۲۸)

"مطمئن نفس خوش باش اپنے رب کی طرف لوٹ جا۔"

یوں کیفیت کے لحاظ سے نفس کے تین درجے ہوتے ہیں۔ چاہے اسے تنفس کی وجہ سے ہی نفس کہا جاتا ہو کیونکہ سانس

Scanned with CamScanner

بھی تو زندگی کی علامت ہے۔ اگر آنے جانے کی وجہ سے کہا جائے تو پھر روح پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔

نفس اور روح ایک حقیقت کے دو نام ہیں

اَلنَّفْسُ وَالرُّوْحُ اِسْمَانِ لِمَعْنًی وَّاحِدٍ... (الاصول والفروع، ۲:۳۱۶)

"نفس اور روح ایک حقیقت کے دو نام ہیں۔"

اس کی دلیل حدیث لیلۃ التعریس ہے:

قَالَ بِلَالٌ: اَخَذَ بِنَفْسِی الَّذِیْ اَخَذَ بِنَفْسِكَ۔

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ اَرْوَاحَنَا...

(مؤطا امام مالك، كتاب وقوت الصلوة، باب النوم عن الصلوة، ۱:۵)

"بلالؓ نے کہا میری روح کو اسی ذات نے پکڑا جس نے آپ کی روح کو پکڑا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے ارواح کو قبض کر لیا تھا۔"

فائدہ:

ایک ہی چیز کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نفس سے تعبیر فرماتے ہیں اور رسول اکرم ﷺ روح سے۔ تو اس کی تطبیق یوں ہوتی ہے کہ روح اور نفس کو ایک ہی مانا جائے۔

قرآن کریم نے بھی روح پر لفظِ نفس کا اطلاق فرمایا ہے:

قَالَ تَعَالٰی: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا... (الزمر:۴۲)

"اللہ تعالیٰ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت۔"

قَوْلُهٗ تَعَالٰی: اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ... (الانعام: ۹۳) "اپنی جانیں نکالو۔"

ان دونوں آیتوں میں ذکر نفس کا ہے اور مراد روح ہے۔ جمہور علماء بھی نفس اور روح کے اتحاد کے قائل ہیں۔

اَلنَّفْسُ وَالرُّوْحُ۔ مُسَمَّاهُمَا وَاحِدٌ وَهُمُ الْجُمْهُوْرُ... (کتاب الروح، ۲۶۴)

"نفس اور روح کا مصداق واحد ہے اور جمہور اس کے قائل ہیں۔"

نفس اور روح ایک حقیقت کے دو نام ہیں

یہ ایک حقیقت کے دو نام ہیں اور اس بات کی تصدیق حدیث لیلۃ التعریس سے ہوتی ہے۔ لیلۃ التعریس اس رات کا نام ہے جب نبی کریم ﷺ صحابہؓ کے ساتھ سفر میں تھے۔ صحابہؓ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ کسی کی آنکھ نہ کھلی، حتیٰ کہ حضرت بلالؓ

Scanned with CamScanner

جو موذن تھے وہ بھی نہ اٹھ پائے اور اذانِ فجر بھی نہ ہو سکی۔ جب نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ آپ نے تو سب کو جگانا تھا، اذان دینا تھی......تو حضرت بلالؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ ﷺ! میرا نفس بھی اُسی ذات کے قبضے میں تھا جس کے قبضے میں آپ ﷺ کا نفسِ عالی تھا، تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو روک لیا تھا۔" تو فرمایا: یہاں حضرت بلالؓ نے روح پر نفس کا لفظ بولا اور حضور اکرم ﷺ نے اسی نفس پر روح کا لفظ بولا۔ لہٰذا نفس اور روح دونوں نام روح پر بولے جاتے ہیں۔ یعنی جب نبی اکرم ﷺ نے ایک چیز کو روح فرمایا، اُسی چیز کو حضرت بلالؓ نفس سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کی تطبیق (مطابقت) یوں ہوتی ہے کہ دونوں یعنی روح اور نفس کو ایک مانا جائے۔ اللہ کریم نے بھی روح پر نفس کا لفظ بولا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر: ۴۲) "اللہ ہی قبض کرتا ہے روحوں کو اُن کی موت کے وقت۔" تو یہاں يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ سے مراد روح ہے جبکہ نفس کا لفظ بولا گیا ہے۔ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ... (فرشتے کہتے ہیں مرنے والوں کو) "اپنی جانیں نکالو۔" تو فرمایا کہ یہاں مراد تو روح ہوتی ہے۔ جمہور علماء بھی نفس اور روح کے اتحاد کے قائل ہیں۔ النَّفْسُ وَالرُّوْحُ مُسَمَّاهُمَا وَاحِدٌ وَهُمُ الْجُمْهُوْرُ... "نفس اور روح ایک ہی چیز ہیں، اور جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں۔"

نفس اور روح میں فرق

علامہ ابوالقاسم سہیلی نے 'روض الانف' میں الروح والنفس والفرق بینھما کے عنوان کے تحت بحث کی ہے کہ روح اور نفس شئے واحد ہے۔ تغایر بوجہ اوصاف کے ہے، باعتبار اولیت کے تو روح ہے۔ جب فرشتہ ماں کے پیٹ میں پھونکتا ہے، روح ہے۔ جب پیدا ہوتا ہے اور کسبِ اخلاق و اوصافِ حمیدہ یا ذمیمہ کرتا ہے اور بدن سے عشق و محبت پیدا کر لیتا ہے اور مصالحِ بدن میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس پر لفظ نفس بولا جاتا ہے۔ قبل از اکتسابِ اوصاف روح پر لفظ نفس کا بولنا ٹھیک نہیں۔ جب یہ اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے تو اس میں صفتِ غفلت اور شہوت پیدا ہو جاتی ہے تو اس پر لفظ نفس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ نفس کا فعل بھی غفلت اور شہوت ہے۔ (الروض الانف، ۱: ۱۹۵۔ ۱۹۷)

نفس اور روح میں فرق

علامہ ابوالقاسم سہیلی نے 'روض الانف' میں بحث کی ہے کہ روح اور نفس شئے واحد ہے۔ فرق اوصاف کی وجہ سے ہے۔ یعنی روح اور نفس ایک حقیقت کے دو نام ہیں لیکن صفات الگ الگ ہونے کی وجہ سے ان میں فرق آ جاتا ہے۔ جب روح غلط عادات واطوار اور ناپسندیدہ اخلاق اپنا لیتا ہے۔ بدنِ مادی کی محبت میں گرفتار ہو کر اسی کی پرورش و زینت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دنیا پر فدا ہو کر حصولِ دنیا کے لیے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ دنیوی امور اور لذاتِ دنیا میں شریعت کو بھول جاتا ہے، احکامِ الٰہی سے

Scanned with CamScanner

بے پرواہ ہو کر مادی خواہشات کی تکمیل میں لگ جاتا ہے تو اس روح پر "نفس" کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ نفس کا فعل بھی غفلت اور شہوت ہے۔ فرمایا، اصل میں تو روح ہی ہوتی ہے، جب وہ امورِ دنیا میں ملوث ہو کر اللہ کو بھول جائے اور شہوت و غفلت میں مبتلا ہو جائے تو نفس کہلاتا ہے۔

سکون کیا ہے؟

نفس کی صفتِ غفلت اور شہوت کو مجاہدہ اور ریاضت سے کم کیا جاسکتا ہے۔ ان رذائل کو قلتِ طعام، قلتِ کلام، تخلیہ اور تقویٰ سے کم کیا جاسکتا ہے۔ ان رذائل میں کمی کا نام اصطلاحِ صوفیا میں سکون ہے۔

سکون کے تین مدارج ہیں۔

اول: سکونِ تام و کامل، یہ درجہ اطمینانِ نفس کا ہے۔ اس درجہ میں نفس کو مطمئنہ کہتے ہیں۔

دوم: سکونِ غیر تام و غیر کامل، یہ نفسِ لوامہ ہوا۔ سوم: عدمِ سکون (مطلقاً)، یہ نفس امارہ ہوا۔

سکون کیا ہے؟

نفس کی صفتِ شہوت و غفلت کو مجاہدہ اور ریاضت سے کم کیا جاسکتا ہے۔ نفس کی دنیا سے محبت کو عبادات میں محنت اور 'اللہ اللہ' سے کم کیا جاسکتا ہے۔ ان رذائل کو قلتِ طعام، قلتِ کلام، تخلیہ اور تقویٰ سے کم کیا جاسکتا ہے۔ باتیں کم کرنا، کم کھانا، کم سونا یعنی جسمانی قویٰ کو کمزور کرنا تاکہ اوصافِ ملکوتی پیدا ہوں۔ تو ان رذائل میں کمی کا نام اصطلاحِ صوفیا میں سکون ہے، یعنی صوفیا کے نزدیک سکون یہ ہے کہ بری عادتیں کم ہو جائیں تو از خود جو کیفیت نصیب ہوتی ہے اسے سکون کہتے ہیں۔ سکون کے تین درجے ہیں۔ سب سے اعلیٰ اور اکمل درجہ یہ ہے کہ اطمینانِ نفس نصیب ہو جائے جس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں۔ اس کو سکونِ تام و کامل بھی کہتے ہیں۔ اس سے نچلا یعنی دوسرا درجہ سکونِ غیر تام و غیر کامل یعنی سکون تو ہے مگر مکمل طور پر نہیں، کبھی پریشانی، کبھی سکون۔ اس درجہ میں نفس کو لوامہ کہتے ہیں۔ تیسرا درجہ عدمِ سکون ہے، اس کو نفسِ امارہ کہتے ہیں۔

مسمیٰ واحد کے مختلف اسماء

اگر ذاتِ واحد کو مختلف الفاظ سے بیان کر دیا جائے اور ان الفاظ کا مرجع واحد ہو تو کوئی تضاد لازم نہیں آئے گا۔ جیسے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق قرآنِ مجید میں مختلف الفاظ آئے ہیں:

قَالَ تَعَالٰی مَرَّةً:

خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ... (آل عمران:۵۹) "اسے مٹی سے پیدا کیا۔"

مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ... (الحجر:۲۶) "بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا۔"

مِنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ... (الصّٰفّٰت:۱۱) "چکنی مٹی سے پیدا کیا۔"

مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ... (الرحمٰن:۱۴) "بجنے والی مٹی سے پیدا کیا۔"

پس روح اور نفس شئے واحد کے دو نام ہیں۔ فرق باعتبار صفات کے ہے۔

اَلْفَرْقُ بَيْنَ النَّفْسِ وَالرُّوْحِ فَرْقٌ بِالصِّفَاتِ لَا فَرْقَ بِالذَّاتِ... (کتاب الروح، ۲۶۵)

"نفس اور روح کے درمیان فرق باعتبار صفات کے ہے، نہ کہ باعتبار ذات کے۔"

مسمّیٰ واحد کے مختلف اسماء

یعنی جس کی ذات وحقیقت تو ایک ہے مگر نام کئی ہیں۔ فرمایا، اگر ذات باری کو مختلف الفاظ سے بیان کر دیا جائے تو ان الفاظ کا مرجع چونکہ واحد ہے تو کوئی تضاد لازم نہیں آئے گا۔ یعنی ایک وجود کے مختلف نام ہوں اور ان سب سے مراد وہی ہو تو اس میں اختلاف کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ یعنی روح کو نفس کہہ کر جانا جاتا ہے، یا لوامہ یا مطمئنہ کہا جاتا ہے تو اس کی حقیقت میں تبدیلی مراد نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر پیدائشِ آدم کے متعلق بظاہر مختلف بیان جو قرآن میں آئے ہیں، یہاں پیش کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ "آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا۔" دوسری جگہ فرمایا "بجنے والی مٹی سے پیدا کیا"، "بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا"، "چکنی مٹی سے پیدا کیا"۔ تو یہ چاروں حالتیں مٹی کی ہیں۔ گارا بنا، پھر گارا سڑ گیا، پھر چکنی مٹی بنا جیسا کہ گوندھ گوندھ کر مٹی چکنی ہو جاتی ہے۔ پھر خشک ہو کر کھنکنے لگی تو ان چاروں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چاروں حالتیں مٹی کی ہیں۔ قرآن نے مٹی کی تیاری کے مختلف مراحل کو بیان کیا ہے۔

پس روح اور نفس ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ فرق باعتبار صفات کے ہے۔

اَلْفَرْقُ بَيْنَ النَّفْسِ وَالرُّوْحِ فَرْقٌ بِالصِّفَاتِ لَا فَرْقَ بِالذَّاتِ...

"نفس اور روح کے درمیان فرق باعتبار صفات کے ہے، نہ کہ باعتبار ذات کے۔"

یاد رہے کہ یہاں نفس اور لطیفۂ نفس میں فرق ہے۔

(لطیفۂ نفس کی تفصیل کے لئے کتاب ہٰذا کا باب: ۷، "لطائف اور شیخ کامل" ملاحظہ ہو۔)

Scanned with CamScanner

باب(7)

لطائف اور شیخِ کامل

صوفیاء کرام فنِ طریقت وعلمِ حقیقت وتصوف کے احکام باطنیہ میں مجتہد ہیں۔ یہ حضرات احکام ظاہریہ باطنیہ کا اسی طرح استخراج کرتے ہیں جیسے فقہاء مجتہدین بغیر نصوص صریحہ کے بعض احتمالات کی بناء پر محض اپنے ذوق سے احکام ظاہرہ کا استنباط کرتے ہیں۔ صوفیاء کرام میں فقہاء مجتہدین کے مقابلے میں ایک قوت زائد ہوتی ہے کہ وہ صاحب کشف و الہام ہوتے ہیں۔ فقہاء محض ذاتی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ الہام وکشف کی روشنی میں۔ اور کشف و الہام اعلام واطلاع من اللہ ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اعلام من اللہ محض ذاتی رائے سے افضل ہے۔ جس طرح قیاس ورائے کی صحت کا معیار یہ ہے کہ کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو، اسی طرح کشف والہام کی صحت کا معیار بھی کتاب وسنت کی موافقت ہے۔ بہرحال اس کی فوقیت مسلّم ہے۔

اِنَّمَا الْاِلْهَامُ نُوْرٌ يَخْتَصُّ بِهِ اللهُ تَعَالٰى بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ...

(صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب رأی النبی ﷺ فی المنام، ۱۲:۳۱۵)

"الہام ایک نور ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کے ساتھ مختص کر دیتا ہے۔"

میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو صوفیاء کے کشف والہام پر مقدم سمجھتا ہوں۔ اس کی دلیل صوفیاء کا تعامل ہے۔ تمام صوفیاء محققین مجتہدین کے مقلد رہے ہیں۔ پس فقیہ کے اجتہاد کا مقدم ہونا ثابت ہوگیا۔

لطائف اور شیخ کامل

سلوک وطریقت کے احکام کا احکامِ شرعی سے استخراج اور اس میں اجتہاد کرنا صوفیوں کا کام ہے، جس طرح مجتہدین اجتہاد کرتے ہیں۔ اجتہاد اس بات پر ہوتا ہے کہ جس کا کوئی صریح حکم، کوئی واضح حکم قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی ارشاد میں موجود نہ ہو تو پھر جو ملتے جلتے احکامات ہوتے ہیں ان میں سے مثالیں لے کر اس پر احتمال (ممکنات) کی یا ظن کی بنیاد رکھ کر حکم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کو اجتہاد کہتے ہیں۔ تو جس طرح علمائے ظواہر احتمالات، ظن (اندازہ) اور اپنے ذوق سے احکام کا استخراج کرتے ہیں اسی طرح صوفیائے کرام بھی سلوک وطریقت کے احکامِ باطنیہ کا استخراج احتمال، ظن اور ذوق سے کرتے ہیں لیکن ان کے پاس ایک بے حد مضبوط اور مستند ذریعہ اور بھی ہوتا ہے، وہ کشف والہام ہے یعنی وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ فقہاء ذاتی رائے سے استخراج کرتے ہیں، یعنی فقہاء ملتے جلتے شرعی احکام سے مثالیں تلاش کر کے اپنی ذاتی رائے اور اندازہ کو شامل کر کے پھر حکم حاصل کرتے ہیں جبکہ صوفیاء اپنی ذاتی رائے سے مسئلے کا استخراج کرنے کی بجائے کشف والہام کی روشنی میں احکام حاصل کرتے ہیں۔ کشف والہام وہ علم ہے جو اللہ کی طرف سے دیا جاتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ وہ اطلاع ہے جو اللہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور ظاہر ہے الہام من اللہ محض ذاتی رائے سے بدرجہا افضل ہے۔ لیکن یہ بات بہر طور پیش نظر رہے کہ ہر کشف یا الہام جو صوفی کو ہوتا ہے اس کی صحت کا معیار قرآن وسنت ہے۔ وہ قرآن کی نصوص یا ارشادِ حدیث کے خلاف نہ جاتا ہو بلکہ اس کے مطابق و تابع ہو۔ چونکہ قرآن بھی کشفاً عطا ہوا ہے۔ اللہ کا کلام الہامی طور پر انبیائے کرام کو عطا ہوا ہے تو نبی کا کشف صحیح ہوتا ہے، اس میں کسی شبے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کشف ولی کا بھی صحیح ہوتا ہے لیکن ولی کی ذاتی حیثیت وہ نہیں ہوتی۔ نبی معصوم ہوتا ہے، ولی معصوم نہیں ہوتا۔ اسے اپنا کشف سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے۔ اس لیے ولی کا کشف نبی کے کشف کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر نبیؑ کا کشف ذاتی ہوتا ہے۔ اللہ اس کی ذات میں وہ کمال رکھ دیتا ہے۔ ولی کا کشف ذاتی نہیں ہوتا، ولی کو کشف نبیؐ کے اتباع اور غلامی کے صدقے میں ہوتا ہے۔ تو ولی کے کشف کے صحیح ہونے کا معیار کتاب وسنت سے مطابقت ہے۔ اگر کتاب وسنت کے خلاف ہے تو باطل ہے۔

بہر حال ولی کی فوقیت فقیہہ پر مسلم ہے۔ صوفیاء کی رائے ایک وزن رکھتی ہے، کیونکہ "فتح الباری" میں ہے:

"الہام ایک ایسا نور ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اسے عطا کر دیتا ہے، اسے اس کے ساتھ مختص کر دیتا ہے"۔ اس کے بعد حضرتؒ فرماتے ہیں کہ:

"میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو صوفیا کے کشف والہام پر مقدم سمجھتا ہوں۔"

اعلیٰ حضرتؒ کی رائے کی بنیاد یہ بات ہے کہ صوفیا احکامِ ظاہری میں اجتہاد نہیں کرتے یعنی وہ احکامِ ظاہری میں فقہائے کرام کی تقلید کرتے ہیں۔ تصوف وسلوک کے مسائل میں صوفیا کے اجتہاد کی حیثیت مسلم ہے اور ان کی رائے زیادہ وزن رکھتی ہے، جس طرح احکامِ ظاہری میں مجتہدینِ ظاہری اور آئمہ فقہاء کی۔ لہٰذا تمام صوفیا نے احکامِ ظاہری میں آئمہ فقہاء کی اقتدا کی ہے، اُن کا اتباع کیا ہے۔

لطائف پانچ ہیں

اس اصولی تمہید کے بعد اب یہ سمجھ لیں کہ صوفیاء کرام بدنِ انسانی کو دس اجزاء سے مرکب مانتے ہیں: عناصرِ اربعہ اور نفسِ مادی، اور پانچ لطائف جن کا ذکر پہلے ہو چکا، غیر مادی بلکہ مجرد ہیں۔

بعض کے نزدیک گیارہ ہیں، یعنی پانچ مادی، پانچ مجرد اور ایک سلطان الاذکار۔ بعض فرماتے ہیں کہ دس لطائف ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ لطائف تو مجرد اور لطیف چیزوں کا نام ہے، پھر دس لطائف کیونکر ہوئے؟ البتہ تغلیباً انھیں لطائف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے لطائف خمسہ کے علاوہ نفس بھی تغلیباً لطائف میں شمار کیا جاتا ہے اور سلطان الاذکار لطیفہ نہیں بلکہ ایک طریقہ ذکر ہے جس میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سارے بدن سے بلکہ ہر بن مو سے ذکر جاری ہے۔ بہر حال لطائف پانچ ہی ہیں، باقی تغلیباً ان میں شامل کیے جاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

لطائف پانچ ہیں

اس اصولی تمہید کے بعد اب یہ سمجھ لیں کہ صوفیاء کرام بدنِ انسانی کو دس اجزأ سے مرکب مانتے ہیں۔ یعنی مٹی، پانی، آگ اور ہوا۔ ان چاروں کے ملنے سے نفس پیدا ہوا۔ عناصرِ اربعہ اور نفس، یہ پانچ مادی اجزأ ہو گئے اور پانچ لطائف (جن کا ذکر پہلے ہو چکا) غیر مادی بلکہ مجرد ہیں۔ یہ بھی بدنِ انسانی کا حصہ ہیں۔ لطائف کی تعداد میں صوفیا میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک گیارہ ہیں، یعنی پانچ مادی، پانچ مجرد اور ایک سلطان الاذکار۔ گویا مادی اجزأ کو بھی لطائف میں شمار کرتے ہیں۔ پھر سلطان الاذکار جس میں سارے لطائف اور سارا بدن شامل ہو جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ دس لطائف ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ لطائف تو مجرد اور لطیف چیزوں کا نام ہے پھر دس لطائف کیونکر ہوئے۔ البتہ تغلیباً (غالب خیال) انہیں لطائف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے لطائفِ خمسہ کے علاوہ نفس بھی تغلیباً لطائف میں شمار کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں، لطائف تو مجرد ہیں۔ یعنی ان میں کوئی کیت یا کیفیت نہیں ہے، ان کی لمبائی، چوڑائی ناپی نہیں جا سکتی، انہیں چھو کر محسوس نہیں کیا جا سکتا، پھر دس کس طرح ہوئے؟ البتہ انہیں تغلیباً لطائف میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیسے نفس کو بھی ذاکر بنا کر لطائف میں شمار کیا جاتا ہے۔ یاد رکھیں! یہ نفس جو اجزأ سے مرکب ہوتا ہے یہ اور شئے ہے اور لطیفۂ نفس ایک اور چیز ہے۔ وہ اس سے لطیف تر ہے۔ یعنی یہ نفس بھی ایک جسمِ لطیف ہے، بخارات کی شکل میں جو روحِ حیوانی پیدا ہو جاتی ہے لیکن لطیفۂ نفس اس سے بھی لطیف تر ہے تو یہ غالب حکم کی وجہ سے لطائف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور سلطان الاذکار لطیفہ نہیں بلکہ ایک طریقۂ ذکر ہے۔ اسے بھی تغلیباً یعنی غلبے کی وجہ سے ذوقی طور پر جو غلبہ اسے حاصل ہوتا ہے لطیفہ کہہ دیا جاتا ہے۔

بہر حال لطائف پانچ ہی ہیں۔ باقی تغلیباً ان میں شامل کیے جاتے ہیں یعنی حقیقتاً عالمِ امر کے لطائف پانچ ہیں۔ باقی جو ہیں چونکہ ان پر بھی لطائف کی کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے تو تغلیباً انہیں بھی لطائف شمار کیا جاتا ہے۔

لطائف کے بارے میں اختلاف

بعض صوفیا لطائف کے تغائر کے قائل ہیں اور یہ تغائر حقیقی ہے۔ بعض محققین اتحادِ لطائف کے قائل ہیں اور اصل حقیقی لطیفہ صرف قلب کو بتاتے ہیں اور اسی کو اوصافِ متعددہ سے موصوف مانتے ہیں۔ جیسے زید متعدد اوصاف سے موصوف ہو، مثلاً عالم، قاری، کاتب، واعظ وغیرہ تو اس تعددِ اوصاف کی وجہ سے زید میں تعدد پیدا نہ ہوگا۔ تو گویا دیگر لطائف کا محل و مصداق و موصوف بھی قلب ہے۔ رہی یہ بات کہ ہر لطیفہ کے آثار و الوان، انوار جدا ہوتے ہیں اور یہ کہ ہر لطیفہ کا فعل جدا ہے مثلاً قلب کا فعل ذکر ہے، روح کا حضور، سری کا مکاشفہ، خفی کا شہود و مشاہدہ اور فنا، اخفیٰ کا معائنہ اور فناء الفنا۔ تو یہ دراصل تعددِ اوصاف کی وجہ سے افعال میں تعدد پیدا ہوا۔ ورنہ اصل حقیقی لطیفہ صرف قلب ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اصل لطیفہ

Scanned with CamScanner

صرف قلب ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام ذکر کی تعلیم میں مختلف مقام اور محال کی طرف خیال کرنے کی ہدایت کیوں فرماتے ہیں؟ حالانکہ صوفیا کا یہ طریقہ ذکر متواتر چلا آرہا ہے اور اسے کشف کی تائید بھی حاصل ہے۔ اس لیے تغائر کو ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے، جس طرح ذکرِ قلبی میں قلب ہی پر توجہ مرکوز رہتی ہے کیونکہ وہ تجلیاتِ باری کا محل ہے۔ مگر جس طرح لطیفہ ربانی کو بھی قلب صنوبری سے تعلق ہے، اسی طرح دیگر لطائف کو بھی خواہ مجازاً سہی ان محال و مقام سے تعلق ہے۔ محال و مقام کی تخصیص کی تائید حدیث ابی محذورہؓ سے ہوتی ہے:

ثُمَّ وَضَعَ یَدَہٗ عَلٰی نَاصِیَةِ اَبِیْ مَحْذُوْرَةَ ثُمَّ اَمَرَّھَا عَلٰی وَجْھِهٖ ثُمَّ عَلٰی ثَدْیَیْهِ (وَفِیْ نُسْخَةٍ) ثُمَّ عَلٰی کَبِدِهٖ ثُمَّ بَلَغَتْ یَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ سُرَّةَ اَبِیْ مَحْذُوْرَةَ ثُمَّ قَالَ ﷺ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَ بَارَكَ عَلَیْكَ... (ابن ماجه، کتاب الأذان والسنة فيه، باب الترجيع في الأذان، ۵۲)

"پھر رسول اکرم ﷺ نے ابو محذورہؓ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر آپ ﷺ اپنے ہاتھ کو اس کے چہرے پر لے گئے، پھر سینے پر۔ (اور ایک نسخہ میں ہے کہ) اس کے جگر پر لے گئے، پھر آپ ﷺ کا ہاتھ ان کی ناف تک پہنچا۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے دعا دی کہ اللہ تجھے برکت دے۔"

فائدہ:

حضور اکرم ﷺ نے خواہ اتفاق سے ہاتھ پھیرا، خواہ کسی غرض سے مانا جائے، ان مقامات کا متبرک ہونا ثابت ہوگیا۔ فَھُوَ الْمَقْصُوْدُ...

قائلینِ اتحاد کہتے ہیں کہ حدیث شریف میں صرف ذکرِ قلبی ملتا ہے، باقی لطائف کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض لطائف کا ذکر کیا ہے اور ان میں اتحاد ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ روح، قلب، عقل اور نفس ایک ہی چیز ہے، تغائر اعتباری ہے اور اتحاد ذاتی۔ (احیاء العلوم، بیان معنی النفس والروح والقلب والعقل، ۳:۳، ۴)

لطائف کے بارے میں اختلاف

بعض صوفیا تغائرِ لطائف کے قائل ہیں۔ یعنی بعض صوفیا کا خیال ہے کہ ہر لطیفہ الگ الگ ہے، ہر لطیفہ اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے جبکہ بعض محققین جو اتحادِ لطائف کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ لطیفہ تو ایک ہی ہے مگر اس کی کیفیات مختلف ہیں۔ مختلف مقامات پر اس کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں اور اصل لطیفہ ایک ہی ہے اور وہ قلب ہے۔ جب وہ عروج پر پہنچتا ہے تو اس کی کیفیت بدل جاتی ہے، تو کہتے ہیں دوسرا لطیفہ ہے۔ لطیفۂ سرّی پر پہنچتے ہیں تو اس کی کیفیت پھر بدل جاتی ہے تو کہتے ہیں تیسرا لطیفہ ہوگیا۔ لطیفۂ خفی پر اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے تو چوتھا شمار کرلیتے ہیں۔ لطیفۂ اخفیٰ پہ کچھ اور ہوتی ہے تو پانچواں۔

Scanned with CamScanner

اسی طریق پر انہیں ایک دوسرے سے مختلف سمجھا جاتا ہے لیکن اصل میں ایک ہی ہے، اسی کو اوصاف متعددہ سے موصوف مانتے ہیں۔ جیسے زید متعدد اوصاف سے موصوف ہو مثلاً عالم، قاری، واعظ، کاتب وغیرہ۔ مختلف صفات ہوسکتی ہیں تو ان کی وجہ سے وہ متعدد انسان نہیں گنا جائے گا، بندہ تو ایک ہی رہے گا۔ بعض صوفیا کا خیال ہے کہ اصل لطیفہ قلب ہی ہے۔ مختلف مقامات پر اس کی خصوصیات اور اس کے رنگ، اس کے انوارات تبدیل ہو جاتے ہیں تو انہیں متعدد گنتے ہیں۔ تو گویا دیگر لطائف کا محل و مصداق و موصوف بھی قلب ہے۔ یعنی اگر یہ بات مانی جائے تو پھر یہ ثابت ہوگا کہ تمام لطائف کی اصل قلب ہے۔ اب یہ بات ہے کہ ہر لطیفہ پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ الگ ہیں۔ انوارات کے رنگ الگ ہیں، انوار جدا ہیں، اور یہ کہ ہر لطیفہ کا فعل جدا ہے یعنی قلب کا فعل ذکر ہے۔ لطیفۂ قلب کا جو حقیقی فعل ہے وہ یہ ہے کہ ذکرِ دوام نصیب ہو جائے، کبھی اس پر غفلت نہ آئے۔ لیکن دوسرے لطیفۂ روح کا اثر 'حضور' ہے یعنی حضورِ حق نصیب ہو جائے۔ سِرّی کا 'مکاشفہ' ہے یعنی مکاشفات و مشاہدات ہوں۔ خفی کا 'شہود و مشاہدہ' ہے یعنی مشاہدہ حق ہو اور شہود و تجلیاتِ ذاتِ باری نصیب ہوں اور فنا۔ جبکہ اخفیٰ کا اثر 'معائنہ اور فناء الفنا' ہے یعنی پانچویں لطیفے اخفیٰ کا فعل ہے کہ فنا سے بھی فنا ہو جائے اور سوائے ذاتِ باری کے کچھ نہ رہے۔ اتحادِ لطائف کے قائلین صوفیا فرماتے ہیں کہ دراصل تعددِ اوصاف کی وجہ سے افعال میں تعدد پیدا ہوا۔ مختلف اوصاف قلب ہی کے ہیں۔ مختلف لطائف پر جا کر مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اصل لطیفہ صرف قلب ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ صوفیاء کرام ذکر کی تعلیم میں مختلف مقام اور محال کی طرف خیال کرنے کی ہدایت کیوں فرماتے ہیں؟ اگر اصل لطیفہ صرف قلب ہے پھر ذکر کرتے وقت مختلف مقامات پہ کیوں متوجہ کیا جاتا ہے؟ دائیں طرف، بائیں طرف، سینے کے درمیان، پیشانی میں، حالانکہ صوفیا کا طریقۂ ذکر تو متواتر چلا آرہا ہے اور اسے کشف کی تائید حاصل ہے۔ یعنی صوفیا کے طریقۂ ذکر میں تواتر ہے (جو چیز حقیقی طور پر صحیح گواہوں، صحیح روایت کے راویوں سے نبی کریم ﷺ تک پہنچے اسے تواتر کہتے ہیں)، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ ہر لطیفہ یعنی پانچوں لطیفے الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ جس طرح ذکرِ قلبی میں قلب پر توجہ مرکوز رہتی ہے چونکہ وہ تجلیاتِ باری کا محل ہے مگر جس طرح لطیفۂ ربانی قلب کو قلبِ صنوبری سے تعلق ہے اسی طرح دیگر لطائف کو بھی خواہ مجازاً سہی ان محال و مقام سے تعلق ہے۔ یعنی جس طرح لطیفۂ قلب کرتے ہوئے گوشت سے بنے دل پہ توجہ رہتی ہے کیونکہ یہ اس کا مقام ہے تو اسی طرح دوسرے لطائف پر، جب دوسرے مقام پر توجہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اُن لطائف کا ان مقامات سے اسی طرح تعلق ہے جس طرح لطیفۂ قلب کا دل سے ہے اور اس سے ان مقامات کی تخصیص اور تائید ثابت ہوتی ہے۔ یہ تائید و تخصیص حدیث ابی محذورہؓ سے بھی ہوتی ہے۔ جو روایت وہ کرتے ہیں، اس سے بھی ان مقامات کی تائید ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے ماتھے، سینے پر ہاتھ پھیرا تو خواہ آپ ﷺ نے اتفاقاً پھیرا، یا کسی وجہ سے پھیرا لیکن پورے بدن میں سے ان مخصوص حصوں پر ہاتھ پھیرنے سے ان کی تخصیص ثابت ہوگئی اور یہی مقصد ہے کہ یہ لطائف کی جگہیں ہیں۔ قائلینِ اتحاد کہتے ہیں کہ حدیثِ مبارک میں صرف ذکرِ قلبی ملتا ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اصل لطیفہ صرف قلب ہے، باقی اسی کے رنگ

Scanned with CamScanner

ہیں۔ وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ حدیث شریف میں صرف ذکرِ قلبی کا ذکر ملتا ہے، باقی لطائف کا نہیں۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے بعض لطائف کا ذکر کیا ہے اور ان میں اتحاد ثابت کیا ہے۔ پھر بتایا کہ روح، عقل، قلب اور نفس ایک ہی چیز ہے۔ تغائر اعتباری ہے اور اتحاد ذاتی۔ یعنی امام غزالیؒ کی رائے بھی یہ ہے کہ باقی لطائف ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تغائر اعتباری ہے جو کیفیات ہیں ان پر اعتبار کیا جائے تو وہ الگ الگ ہیں لیکن حقیقتاً اتحاد ذاتی ہے، یعنی فی الواقعہ وہ ایک ہی ہیں۔ قلب ہی کی مختلف کیفیات ہیں اور مختلف مقامات سے متعلق ہیں۔ اگر ان کی کیفیات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو الگ الگ ہیں، ورنہ حقیقتاً ایک ہیں۔

وجہِ اختلاف

چونکہ لطائف میں سخت اتصال ہے، اس لیے ذکرِ قلب سے باقی لطائف میں بھی آثار، انوار، الوان و افعال سرایت کر جاتے ہیں جیسے متعاکس آئینوں میں شعاعِ آفتاب۔ جو آئینہ سورج کے مقابل ہو، اس کے مقابل دوسرا تیسرا آئینہ رکھ دیں تو شعاعِ آفتاب کا عکس سب میں ظاہر ہوگا۔

عدمِ تغائر کی دلیل کشفِ صحیح بھی ہے۔ چنانچہ جب سالک کے لطائف منور ہو جاتے ہیں تو منازلِ سلوک شروع ہوتے ہیں اور ان منازل کا تعلق زمین و آسمان سے نہیں، بلکہ یہ عرشِ اول سے شروع ہوتے ہیں۔ تو ان منازل میں سالک کو اپنی روح پرواز کرتی نظر آتی ہے، مگر دیگر لطائف نظر نہیں آتے۔ اگر سالک کو اپنی روح پرواز کرتی نظر نہ آئے تو اسے کیے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ منازلِ سلوک طے کرتا جا رہا ہے؟ رہا یہ سوال کہ اتنی دور تک روح نظر کیسے آتی ہے؟ تو اس کا تعلق عقلی موشگافیوں سے نہیں، بلکہ اس راہ پر چلنے اور شیخِ کامل کی صحبت اختیار کرنے سے ہے۔

میں دعویٰ تو نہیں کرتا مگر بطورِ تشکر اور تحدیثِ نعمت اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی میں طلبِ صادق ہو، نکتہ چینی اور امتحان مقصود نہ ہو، اور اس کے علاوہ کوئی اور غرضِ فاسد نہ رکھتا ہو تو صرف چھ ماہ کے لیے اس ناچیز کے پاس آ جائے، اس پر چند پابندیاں عائد کی جائیں گی مثلاً صالح اور پاک غذا اور وہ بھی مقدار میں کم دی جائے گی۔ قلتِ کلام کا عادی بنایا جائے گا، نیند کم کرنی ہوگی، خلوت میں رکھا جائے گا۔ ذکر و اذکار میں مشغول رکھا جائے گا۔ دو وقت توجہ دی جائے گی، پھر ان شاء اللہ تعالیٰ وہ دیکھ لے گا کہ روح کیسے پرواز کرتی ہے اور دورانِ پرواز کیسے نظر آتی ہے۔ یہ چھ ماہ کا عرصہ رسول اکرم ﷺ کے عرصہ کی مقدار پر ہے اور کثرتِ ذکر ارشادِ ربانی کی تعمیل کے طور پر کرایا جائے گا کہ:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ... (آل عمران:۴۱)

اور خلوت و قلتِ کلام کی پابندیاں اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا... (آل عمران:۴۱) کے مطابق تربیتِ سالک کے لیے ضروری ہیں۔

Scanned with CamScanner

عزیز من! طلب صادق کا فقدان ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا، علماء بھی اس کی ضرورت کے احساس سے محروم ہیں، الا ماشاء اللہ! علماء کا کہنا یہ ہے کہ ظاہر شریعت پر عمل کر لینا کافی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تزکیۂ باطن کے بغیر شریعت پر کما حقہٗ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ لا الٰہ الا اللہ پڑھنے سے الٰہ ظاہری کی نفی تو ہو گئی، مگر جب تک تزکیۂ نفس نہ ہو گا الٰہ باطنیہ کی نفی نہ ہو سکے گی۔

علمائے ظواہر حلال وحرام بیان کر سکتے ہیں مگر حلال وحرام میں تمیز نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا انحصار نور بصیرت پر ہے اور وہ ناپید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سمجھنے کے لیے انسان کو تین قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہم، عقل اور نور بصیرت۔ عقل کے مقابلے میں وہم ہیچ ہے اور نور بصیرت کے مقابلے میں عقل کوئی چیز نہیں۔ عالمِ ظاہر بین نور بصیرت سے محروم ہے۔ یہ دولت انبیاء علیہم السلام کے ہاں سے ان کے صحیح ورثاء، علمائے ربانیین اور صوفیاء کرام کو ملی ہے۔

یہ دولت تصوف کے ادارے قائم کرنے سے نہیں ملتی، نہ تصوف کے جرائد جاری کرنے سے ہاتھ آتی ہے، نہ تصوف کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ القائی اور انعکاسی چیز ہے، جو القاء اور صحبتِ شیخ سے حاصل ہوتی ہے۔

وجہِ اختلاف

اصل بات تو یہی ہے کہ سب لطائف پر انوارات وتجلیاتِ باری ہوتی ہیں۔ اس لیے لطیفۂ قلب پر ذکر کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ جو انوار، آثار، الوان (رنگ) اس پر آتے ہیں، وہ لطیفۂ قلب پر ذکر کرنے سے دوسرے لطائف میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اگر کسی کو ساری زندگی صرف ایک لطیفۂ قلب ہی کروایا جائے تو دوسرے لطائف ساتھ ہی از خود روشن ہو جاتے ہیں۔ انوارات منعکس ہو کر ان پر پڑتے رہتے ہیں۔ جس طرح شعاعِ آفتاب کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیں، دوسرا اس کے مقابل اور تیسرا دوسرے کے مقابل رکھ دیں تو وہ شعاع منعکس ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح جب انوارات قلب پر آتے ہیں تو باقی لطائف میں بھی منعکس ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس سے بعض حضرات کو غلطی لگی ہے کہ لطیفہ صرف ایک، قلب ہی ہے، باقی اس کے حصے ہیں۔ اور "عدم تغائر کی دلیل کشفِ صحیح بھی ہے"، یعنی لطائف الگ الگ نہ ہونے کے نظریئے کی دلیل کشف سے بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب سالک کے لطائف منور ہو جاتے ہیں اور منازلِ سلوک شروع ہوتے ہیں تو ان منازل کا تعلق زمین وآسمان سے نہیں بلکہ یہ عرشِ اول سے شروع ہوتے ہیں۔ مراقبۂ احدیت عرشِ اول کی ابتدا ہے۔ ان منازل میں سالک کو اپنی روح پرواز کرتی نظر آتی ہے مگر دیگر لطائف نظر نہیں آتے۔ اب اگر کوئی یہ پوچھنے لگ جائے کہ یہ عرش تک جاتی ہوئی روح نظر کیسے آتی ہے؟ تو فرمایا کہ اس کا تعلق نہ مادی نظر سے ہے اور نہ مادی دماغ سے۔ یہ کیفیات سے متعلق ہے اور کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ جسے اس کا شوق ہو وہ کر کے دیکھے۔

اعلیٰ حضرتؒ آگے ارشاد فرماتے ہیں، "میں دعویٰ تو نہیں کرتا مگر بطور تشکر اور تحدیثِ نعمت اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر سچی طلب لے کر آئے (محض آزمائش یا اعتراض مقصد نہ ہو)، اس کے علاوہ کوئی غلط مقصد نہ ہو تو صرف چھ ماہ کے لیے میرے پاس آ جائے۔ اس پر چند پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ مثلاً صالح اور پاک غذا اور وہ بھی مقدار میں کم دی

Scanned with CamScanner

جائے گی۔ قلتِ کلام کا عادی بنایا جائے گا۔ نیند کم ہوگی، خلوت میں رکھا جائے گا۔ ذکر واذکار میں مشغول رکھا جائے گا، دو وقت توجہ دی جائے گی۔ پھر انشاء اللہ تعالیٰ وہ دیکھ لے گا کہ روح کیسے پرواز کرتی ہے اور دورانِ پرواز کیسے نظر آتی ہے۔ جس طرح نبی اکرم ﷺ غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوتے تھے۔ قرآن وسنت کے مطابق ذکر کروایا جائے گا اور قرآن کا حکم ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ... ''اور ذکر کر اپنے رب کا کثرت سے اور رات دن اس کی پاکی بیان کر'' بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ... رات دن یعنی ہمہ وقت۔ اور خلوت اور قلتِ کلام کی پابندی جس طرح حضرت زکریاؑ کو حکم ہوا، أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا... کہ ''تین دن آپ کسی سے بات نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ اشارے سے بات کریں۔ زبانِ مبارک سے آپؑ نہیں بولیں گے۔'' یہ بنیادیں ہیں سلوک کی تربیت کی۔

اب کے دور کچھ ایسا آ گیا ہے کہ لوگ مادی دنیا اور مادی لذات میں کچھ ایسے کھو گئے ہیں کہ حق کی طلب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ معرفت کی تلاش والا کوئی نہیں ملتا۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا، اب تو علماء بھی اس کی ضرورت کے احساس سے محروم ہیں۔ علماء جنہوں نے سارا دین پڑھا ہے، قرآن پڑھا ہے، تفسیر قرآن وحدیث پڑھی ہے، فقہ پڑھا ہے، انہیں احساس نہیں کہ معرفت کا حصول کتنا ضروری ہے سوائے ان کے کہ جنہیں اللہ توفیق دے۔ اکثر علماء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ظاہری شریعت ہمارے پاس ہے، اس پر عمل کرنا ہی کافی ہے۔ ہم شرعی احکام کو سمجھتے ہیں، ان کے مطابق عمل کر لیتے ہیں۔ تو اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جب تک تزکیۂ باطن نہ ہو شریعت پر عمل بھی اداکاری بن کر رہ جاتا ہے۔ یعنی جس طرح جو کچھ کسی فلم یا ڈرامے میں ہو رہا ہوتا ہے وہ حقیقت میں نہیں ہوتا، اسی طرح عمل کی محض صورت ہی ہوتی ہے تزکیۂ باطن کے بغیر اس میں حقیقتِ عمل نہیں ہوتی۔ اور ''جب تک تزکیۂ نفس نہیں ہوگا الٰہیانِ باطلہ کی نفی نہیں ہوگی''۔ یعنی جب تک قلب میں، ضمیر میں اللہ کا نام نہیں ہوگا، تب تک الٰہیانِ باطلہ (خواہشاتِ نفس، دنیا کی طلب، طلبِ جاہ، لوگوں کی خوشامد اور لوگوں سے امیدیں وابستہ کرنا) کی نفی نہیں ہوگی۔ فرمایا: ان کی نفی صرف انواراتِ الٰہیہ سے ہوتی ہے، جب وہ انوارات قلب میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

ایک اور خوبصورت بات اعلیٰ حضرتؒ نے ارشاد فرمائی کہ علمائے ظواہر بتا سکتے ہیں کہ شرعاً حلال کیا ہے، حرام کیا ہے لیکن اگر حلال حرام ملا کر آگے رکھ دیا جائے تو اس میں تمیز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ قوت ان کے پاس نہیں ہے، اس کا انحصار نورِ بصیرت پر ہے۔ یعنی جب تک قلب کی آنکھ نہیں ہوگی قلب دیکھ نہیں سکے گا تو حلال حرام کہاں نظر آئے گا؟ ظاہری دلائل سے آپ حلال حرام بیان تو کر سکتے ہیں اسے پہچان نہیں سکتے، الگ نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمجھنے کے لیے تین قوتیں دی ہیں۔ انسانی شعور کے تین شعبے ہیں جن سے وہ چیزوں کو سمجھتا ہے۔ پہلا وہم، دوسری عقل، تیسری قوت نورِ بصیرت۔ فرماتے ہیں، عقل کے مقابلے میں وہم کی کوئی حیثیت نہیں، اسی طرح نورِ بصیرت کے مقابلے میں عقل کی کوئی حیثیت نہیں۔ نورِ بصیرت یعنی قلب کی آنکھ سے جو کچھ نظر آتا ہے اس کے مقابلے میں عقل ہار جاتی ہے۔ عالمِ ظاہر بھی نورِ بصیرت سے محروم ہے۔ وہ کتنا بھی علمِ ظاہری پڑھا ہوا ہو، اگر اس نے فنِ سلوک وتصوف نہیں سیکھا، ذکر اذکار نہیں کیے تو ظاہر ہے نورِ بصیرت سے محروم رہے گا کیونکہ قلب کی آنکھ کھولنے کے لیے کسی شیخ کو اختیار کرنا پڑتا ہے، صحبتِ شیخ اختیار کر کے ذکر واذکار کرنا پڑتے ہیں تو یہ کیفیاتِ باطنی حاصل ہوتی ہیں۔ یہ دولت انبیاءؑ کے ہاں سے ان کے صحیح ورثاء علمائے ربانیین اور صوفیاء کرام کو

Scanned with CamScanner

ملتی ہے۔ کیفیاتِ باطنی اور نورِ بصیرت انبیاء کرامؑ کی وراثت ہے اور ان کے صحیح وارثوں کو ورثے میں ملتی ہے۔ علمائے ربانیین صوفیائے کرام کو کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس علم ظاہر بھی ہوتا ہے، علوم الٰہیات بھی اور کیفیاتِ قلبی بھی ہوتی ہیں۔ یہ دولت تصوف کے ادارے قائم کرنے سے نہیں ملتی کہ آپ بڑے بڑے مراکز بنادیں اور ان کا نام رکھ دیں۔ نہ تصوف کے جرائد جاری کرنے سے، اخباروں میں تصوف پر مضامین شائع کرنے سے، نہ تصوف کی کتب کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو القائی اور انوکاسی چیز ہے جو القاء اور صحبتِ شیخ سے حاصل ہوتی ہے۔ دیئے سے دیا جلتا ہے، دل سے دل روشن ہوتا ہے، اس کے لیے شیخ اور صحبتِ شیخ سے حصولِ فیض شرط ہے۔ جس طرح ڈاکٹری کی کتابیں پڑھ کر کوئی ڈاکٹر نہیں بن جاتا، اگرچہ اس کی معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی فن کی کتابیں پڑھ لینے سے کوئی اس فن کا ماہر نہیں ہو جاتا جب تک عملاً اس کو اختیار نہیں کر لیتا۔ اسی طرح تصوف مطالعہ کرنے کی نہیں، سیکھنے کی چیز ہے۔ یہ صحبتِ شیخ کامل سے ملتی ہے۔ لیکن شیخ کامل کون ہے؟ شیخِ کامل کی کیا پہچان ہے؟

شیخِ کامل کی پہچان

(۱) عالمِ ربانی ہو۔ کیونکہ جاہل کی بیعت ہی سرے سے حرام ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا... (فاطر:۲۸)

قَالَ الشَّیْخُ شِهَابُ الدِّیْنِ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ تَعْرِیْضًا ... اِلٰی...

اَنَّهٗ مَنْ لَّا خَشِیَةَ لَهٗ فَهُوَ لَیْسَ بِعَالِمٍ...

(۲) صحیح العقیدہ ہو کیونکہ فسادِ عقیدہ اور تصوف و سلوک کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں۔

(۳) متبعِ سنتِ رسول ﷺ ہو کیونکہ سارے کمالات حضور اکرم ﷺ کے اتباع سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۴) شرک و بدعت کے قریب بھی نہ جائے کیونکہ شرک ظلمِ عظیم ہے اور بدعت ضلالت و گمراہی ہے۔

(۵) دنیا دار نہ ہو، کیونکہ ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ... (الکہف:۲۸) ''اس شخص کا اتباع نہ کر جس کا دل ذکرِ الٰہی سے غافل ہو اور خواہشاتِ نفس کا تابع ہو۔''

(۶) علمِ تصوف و سلوک میں کامل ہو کیونکہ جس راہ سے واقف نہ ہو اس پر گامزن کیسے ہو سکتا ہے؟

(۷) شاگردوں کی تربیتِ باطنی کے فن سے واقف ہو اور کسی ماہرِ فن سے تربیت پائی ہو۔

(۸) حضور نبی اکرم ﷺ سے روحانی تعلق قائم کردے جو بندے اور خدا کے درمیان واحد واسطہ ہیں۔

اس ناچیز کا طریقہ یہی ہے کہ اولاً اپنے ہاتھ پر بیعتِ طریقت کبھی نہیں لی، صرف تعلیم دیتا ہوں اور ابتدائی منازل طے کرا کے دربارِ نبوی ﷺ میں پیش کر دیتا ہوں جو تمام جہان کے پیر ہیں۔ صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں کہ پیر صاحب فرما دیں کہ لو تمہیں دربارِ نبوی ﷺ میں پہنچا دیا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سالک خود مشاہدہ کرے کہ منازلِ سلوک طے کر رہا ہے اور دربارِ نبوی ﷺ میں پہنچ کر حضور اکرم ﷺ کے دستِ مقدس پر بیعت کر رہا ہے۔ اگر کوئی مدعی دربارِ نبوی ﷺ تک

Scanned with CamScanner

رسائی نہیں رکھتا پھر بیعت لیتا ہے تو وہ دھوکہ باز ہے، ماخوذ ہوگا۔ پس کامل و ناقص کی یہی پہچان ہے۔ خوب سمجھ لو!

بعض سادہ لوح دریافت کرتے ہیں کہ اگر پیر فوت ہو جائے تو کیا دوسری جگہ بیعت جائز ہے؟ خدا کے بندو! پہلے اس بات پر غور کرو کہ بیعت بجائے خود مقصد نہیں بلکہ ایک مقصد کے حصول کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ مقصد ہے اللہ کی رضا حاصل کرنا اور بیعت ذریعہ ہے تاکہ ایک کامل کی شاگردی اختیار کر کے یکسو ہو کر تعلیم حاصل کرتا رہے اور ترقی کرتا چلا جائے۔ اگر پیر کے فوت ہو جانے پر آدمی کوئی دوسرا استاد تلاش نہ کرے گا تو ظاہر ہے کہ اول تو اپنا نقصان کرے گا اور اس سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کے پیش نظر رضائے الٰہی کا حصول نہیں بلکہ وہ شخصیت پرستی کا شکار ہے۔ پھر یہ سوچو کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد کیا صحابہ کرامؓ نے خلفائے راشدین کی بیعت نہیں کی تھی؟ پھر یہ سوال کیوں پیدا ہوا کہ پیر کے فوت ہو جانے کے بعد دوسری جگہ بیعت جائز ہے یا نہیں؟

تصوف اور تزکیۂ باطن میں شیخ اور سالک کا تعلق بڑا نازک ہے۔ ظاہری علوم میں معاملہ اور قسم کا ہے۔ استاد سے نفرت اور اس کی مخالفت کے باوجود آدمی ظاہری علم حاصل کر سکتا ہے مگر اس راہ میں شیخ کامل میسر آجائے تو اس کی مخالفت مانع فیض ہی نہیں بلکہ حرام ہے۔ شیخ کامل کی مخالفت دراصل تزکیۂ باطن اور رضائے الٰہی کے حصول سے نافرورمیدہ (نفرت) ہونے کی دلیل ہے۔

شیخ کامل کی پہچان

اعلیٰ حضرت نے شیخ کامل کی پہچان کے سلسلے میں آٹھ نکات ارشاد فرمائے ہیں۔ یہ آٹھ نشانیاں شیخ کامل کی پہچان ہیں۔

سب سے پہلی نشانی ہے کہ عالمِ ربانی ہو کیونکہ جاہل کی بیعت ہی سرے سے حرام ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا... فرماتے ہیں کہ شیخ شہاب الدینؒ نے اس آیت کے متعلق فرمایا کہ شیخ کا عالم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ علماء کے علاوہ اللہ جل شانہٗ کی عظمت کو دوسرا نہیں پہچان سکتا۔ عالم جانتا ہے کہ اللہ کی عظمت سے خائف رہتا ہے یا اس سے ڈر کر نافرمانی نہیں کرتی۔ یہ کیفیت غیر عالم کو نصیب نہیں ہوتی۔ شیخ شہاب الدینؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی کتابیں پڑھ بھی جائے اور اس میں خشیتِ الٰہی نہ ہو، حرام حلال کھاتا رہے، لوٹ کھسوٹ کرتا رہے، شریعت کے خلاف عمل کرے تو فرمایا، لَيْسَ بِعَالِمٍ... اسے علماء میں شمار نہ کرو۔ وہ عالم نہیں ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ بیعت کی مختلف اقسام ہیں۔ حضرتؒ جس بیعت کے متعلق فرما رہے ہیں وہ بیعتِ تصوف ہے۔ بیعت کی چند خاص اقسام ہیں جو یہاں بتا دیتا ہوں۔ بیعت کی ایک قسم بیعتِ اصلاح ہے۔ ایک شخص اگر خود نہیں جانتا کہ روزمرہ کے معمولات شریعت کے مطابق کس طرح کرنے ہیں تو وہ شریعت کے کسی عالم سے بیعت کر لیتا ہے اور عام زندگی میں پیش آنے والے امور، اوامر و نواہی، عبادات کے مسائل وغیرہ کے متعلق رہنمائی لیتا ہے تو یہ بیعتِ اصلاح کہلاتی ہے۔

دوسری قسم بیعتِ امارت ہے، جیسے ہم کسی کو خلیفہ یا امیر المومنین منتخب کرتے ہیں۔ آج کل اس کی جدید شکل ووٹ ہے جس کے ذریعے اسمبلی کے ممبر، صدر اور وزیر اعظم منتخب کرتے ہیں۔ ایک اور بیعت ہے جو موت پر لی جاتی ہے جیسے صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے کم و بیش چودہ سو صحابہؓ سے لی تھی جو اس وقت آپ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ اس بیعت کی اپنی ایک

Scanned with CamScanner

صورت حال، اپنا ایک وقت ہوتا ہے۔

بیعت کی چوتھی قسم بیعتِ تصوف ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں اس کے لیے ایسا شخص اہل ہے جو کم از کم فنافی الرسول ﷺ کرانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اگر خود فنافی الرسول ﷺ ہے مگر دوسرے کو کروانے کی اہلیت نہیں رکھتا تو بھی بیعتِ تصوف لینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہاں اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ عالمِ ربانی ہو کیونکہ جاہل کی بیعت ہی سرے سے حرام ہے۔ صحیح العقیدہ ہو کیونکہ فسادِ عقیدہ اور تصوف کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔ بدعات میں مبتلا غلط عقیدے والا شخص صوفی ہو ہی نہیں سکتا۔ متبع سنت ہو کیونکہ سارے کمالات حضور اکرم ﷺ کے اتباع سے حاصل ہوتے ہیں، آپ ﷺ کے قدموں سے ملتے ہیں۔ شرک و بدعت کے قریب بھی نہ جائے کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے۔ شرک کرنے سے تو بندے کا ایمان ہی نہیں رہتا جبکہ تصوف تو کمالِ ایمان کا نام ہے۔

بدعات و رسومات کی پیروی بھی گمراہی ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ...

(سنن نسائی، کتاب صلوٰۃ العیدین، باب کیف الخطبۃ، ۳:۱۸۸)

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جائے گی۔''

دنیا دار نہ ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ بھوکا رہے، پیسے ہونے کے باوجود پھٹے پرانے کپڑے پہنے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی محبت نہ ہو۔ دنیا کو اس طرح برتے جس طرح کوئی مہمان گھر میں آتا ہے۔ اب وہ یہ تو نہیں کرتا کہ آپ اسے اچھے بستر پہ بٹھائیں تو وہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ اچھا کھانا دیں تو پھینک دے۔ ہونا یہ چاہیے کہ اسے پتہ ہو کہ مجھے تو یہاں رات بسر کرنی ہے، میزبان نے رہنے کھانے کو پوچھا تو اس کی مہربانی ہے، میں تو یہ سب چھوڑ کر صبح چلا جاؤں گا۔

صوفیا میں بڑے بڑے رئیس ہو گزرے ہیں۔ مال و دولت کا پاس ہونا برا نہیں، اس میں دل لگانا برا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بہت مالدار رئیس آدمی تھے۔ آپ کے مالِ تجارت کی درآمد برآمد بحری جہازوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ بہت بڑے تاجر تھے۔ دیگر صوفیا میں بڑے بڑے مالدار لوگ گزرے ہیں۔ سیدنا عبیداللہ احرارؒ کی زمینوں پر سو ہل چلا کرتے تھے۔ آپ بہت بڑے زمیندار تھے۔ سو ہل چلنے کا مطلب ہے کہ دو سو بیل کم از کم ہوں گے جن سے ہل چلتے تھے۔ باقی مویشی جوان کے ساتھ ہوں گے ان کا کیا شمار ہوگا۔ سو ملازم تو وہ ہو گئے جو ہل چلاتے تھے۔ ہر ملازم کا خاندان بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ تو یوں سمجھیں کہ ایک دنیا ان کے ساتھ پلتی تھی۔ ایک دن ایک دوست کو خیال آیا کہ یہ دنیا میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ محض آزمانے کے لیے ایک رات اس نے حضرتؒ سے کہا کہ لوگ حج پہ جا رہے ہیں، آپ کا ارادہ ہو تو حج کو چلیں؟ صبح وہ شخص نمازِ فجر کے لیے مسجد میں نماز ادا کر کے فارغ ہوا۔ آپؒ نے گٹھری سی اٹھائی ہوئی تھی، فرمایا، بھئی تم تیاری کر کے کیوں نہیں آئے؟ رات کہہ رہے تھے حج کو جانا ہے، تو چلو اب چلیں۔ وہ شخص تو پریشان ہو گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرا تو چھوٹا موٹا کاروبار ہے، آپ کی جائیداد کا نظام کیونکر چلے گا؟ آپؒ نے جواب دیا، بیوقوف! یہ جاگیر میری نہیں، یہ سب اللہ کا مال ہے، میرے پاس تو امانت ہے۔ مجھے کل مر جانا ہے، پھر اس جائیداد کو کوئی اور سنبھال لے گا۔ آج میں حج پہ چلا جاؤں گا تو پھر بھی یہ سب چلتا رہے گا، یہ اللہ کا نظام ہے وہ اسے چلا رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

میلے کپڑے پہن کر، بھوکا رہ کر تصوف پر قائم رہنا آسان ہے۔ دنیاداروں اور دنیا کے ساتھ رہ کر اس چیز کو قائم رکھنا ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ یہ توفیق اللہ تعالیٰ گنتی کے چند بندوں کو دیتا ہے۔

خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

"یعنی دنیاداری کیا ہے؟ دنیاداری یہ ہے کہ تُو خدا کو بھول جائے اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ گھر بار ہونا، بیوی بچے یا مال و زر ہونا، یہ دنیا نہیں ہے۔"

بات شیخ کامل کی خصوصیات کی ہو رہی ہے۔ حضرتؒ مزید فرماتے ہیں کہ شیخ کامل وہ ہے جو شاگردوں کی تربیت باطنی کے فن سے واقف ہو اور خود کسی ماہرِ فن کا تربیت یافتہ ہو۔ اسے پتہ ہو کہ شاگردوں کی تربیت کس انداز سے کرنی ہے، تربیت باطنی کے ڈھنگ سے واقف ہو۔ آٹھویں شرط ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے روحانی تعلق قائم کرا دے جو بندے اور اللہ کے درمیان واسطہ ہیں۔ یعنی کم از کم شرط یہ ہے کہ بندے کو، سالک کو فنافی الرسول ﷺ تک تو پہنچا سکتا ہو۔ آگے فرماتے ہیں، اس ناچیز کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے ہاتھ پر بیعت کبھی نہیں لی، صرف تعلیم دیتا ہوں اور ابتدائی منازل طے کرا کے دربار نبوی ﷺ میں پیش کر دیتا ہوں جو تمام جہان کے پیر ہیں۔ صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں کہ پیر صاحب فرما دیں کہ لو بھئی تمہیں دربارِ نبوی ﷺ میں پہنچا دیا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سالک خود مشاہدہ کرے کہ منازلِ سلوک طے کر رہا ہے اور دربار نبوی ﷺ میں پہنچ کر حضور اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پہ بیعت کر رہا ہے۔ اگر کوئی مدعی دربارِ نبوی تک رسائی نہیں رکھتا اور بیعت لیتا ہے تو وہ دھوکہ باز ہے، ماخوذ ہوگا (اس سے باز پرس ہوگی)۔ پس کامل و ناقص کی یہی پہچان ہے۔ اگر کوئی یہ استعداد نہیں رکھتا تو وہ بہت بڑا جھوٹ بولتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ... أَوْ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... (صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب مایکرہ من النیاحۃ علی المیت، ۱:۱۷۲)

"جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنی جگہ دوزخ میں تلاش کرے۔"

صحیح بخاری، کتاب العلم میں ہے:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ... أَوْ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ...

(صحیح بخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی، ۱: ۲۱)

"جس نے مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنی جگہ دوزخ میں تلاش کرے۔"

اگر کوئی جھوٹا پیر ایسے ہی کہہ دے کہ تمہیں دربارِ نبوی تک پہنچا دیا تو وہ ماخوذ ہوگا۔ اب یہ جھوٹ نبی اکرم ﷺ پر بول رہا ہے کہ میں آپ ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعت کروا رہا ہوں، تو پھر وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے۔

Scanned with CamScanner

ایک وضاحت جو یہاں ضروری ہے۔ کشف و مشاہدہ، علم کے ذرائع میں سے ایک ہے۔ جیسے سالک روحانی بیعت کے وقت صاف اپنی روح کو دیکھ رہا ہو، حضور اکرم ﷺ کی زیارت ہو جائے، یہ بہت بڑی بات ہے لیکن یہ چیزیں ثمرات ہیں۔ ثمرات من جانب اللہ ہوتے ہیں۔ بندہ مجاہدہ کرتا ہے لیکن اس پر جو پھل لگتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ کسی کو کشف و مشاہدہ دے دیتا ہے، کسی کو وجدان عطا کر دیتا ہے۔ وجدان ایک قطعی علم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے دل میں آجاتا ہے جس پر بندے کو یقین ہو جاتا ہے۔ وجدان کشف سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ کشف میں وہ مقام نظر آتا ہے جیسے ایک تصویر نظر آتی ہے، اس میں غلطی لگ سکتی ہے جبکہ وجدان وہ حقیقت ہے جو (اللہ کی جانب سے) سیدھی دل میں مترشح ہوتی ہے اور بندے کو یقین ہو جاتا ہے۔

بعض سادہ لوح دریافت کرتے ہیں کہ اگر پیر فوت ہو جائے تو کیا دوسری جگہ بیعت جائز ہے؟ اور یہ سوال آج بھی اکثر سامنے آتا ہے۔ کئی اصحاب ذکر کے لیے آتے ہیں، انہوں نے پہلے کسی پیر صاحب سے بیعت کی ہوتی ہے پھر وہ بڑے متذبذب ہوتے ہیں کہ میں نے تو پہلے بھی بیعت کی ہوئی ہے۔ تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ خدا کے بندو! اتنا تو غور کرو کہ بیعت بجائے خود مقصد نہیں بلکہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ کسی سے بیعت ہو جاؤ، مقصد تو برکات حاصل کرنا ہے۔ حضرتؒ نے لکھا ہے کہ ''میں بیعت نہیں لیتا۔'' واقعی یہ بات ایسے ہی تھی۔ حضرتؒ ظاہری بیعت نہیں لیا کرتے تھے۔ فنافی الرسول ﷺ جسے نصیب ہو جاتا، بارگاہِ نبوی میں اس کی بیعت کروا دی جاتی۔ ۱۹۷۶ء میں آ کر یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ لوگوں کو چونکہ رسماً بیعت کرنے کی عادت ہے، وہ نمائشی پیروں کی جلدی سے بیعت کر لیتے ہیں پھر خود کو ان سے پکا وابستہ کر لیتے ہیں خواہ وہ بدعتی ہو، مشرک ہو، کیسی ہی گمراہیوں میں لے جائے۔ تو مشائخ کے حکم سے ۱۹۷۶ء میں حضرتؒ نے ظاہری بیعت شروع کی تا کہ لوگوں کو گمراہی سے بچایا جائے۔ نمائشی پیروں سے ان کی جان چھڑائی جائے۔ کچھ لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ بیعت کے مقصد کا پتہ ہو نہ ہو، ذکر و مجاہدہ بھلے نہ کریں، یہ جلدی ہوتی ہے کہ بس کہیں بیعت ہونا چاہیے، کوئی پیر ہونا چاہیے۔ ہم لوگوں نے بھی ظاہری بیعت سلسلہ میں آنے کے سولہ سترہ سال بعد کی۔ مقصد تو یہ ہے کہ برکات حاصل کی جائیں۔ مقصد تو اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، بیعت اس کا ایک ذریعہ ہے تا کہ کسی کامل کی شاگردی اختیار کر کے یکسو ہو کر تعلیم حاصل کرتے رہیں، ترقی کرتے رہیں۔ اگر پیر فوت ہونے پر سالک دوسرا کامل تلاش نہیں کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کے پیشِ نظر رضائے الٰہی کا حصول نہیں، شخصیت پرستی ہے۔ شیخ زندہ ہو اور صحیح معنوں میں شیخ بھی ہو تو اگر انہیں پتہ چلے کہ ان سے زیادہ مقام والا، زیادہ اہل شیخ موجود ہے تو وہ اپنے شاگردوں کو وہاں بھیج دیتے ہیں کہ میں نے اپنی اہلیت کے مطابق تمہیں سکھا دیا، اب وہاں جا کر آگے سیکھو۔ یہ معاملہ بھی علومِ ظاہری کی طرح ہے کہ مڈل، میٹرک کے بعد کالج جاتے ہیں۔ کوئی شخص استاد کی محبت میں سکول میں نہیں ٹک جاتا۔

بیعت اصلاح کے لیے بھی ہو تو پیر صاحب قبر سے آ کر تو نہیں سکھائیں سمجھائیں گے۔ بیعت تصوف میں بھی فوت شدہ شخص سے آپ کو کیا فیض ملے گا۔ ذرا سوچئے! حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد کیا صحابہ کرامؓ نے خلفائے راشدین کی بیعت نہیں کی؟ تو نعوذ باللہ! آپ کا پیر کیا نبی اکرم ﷺ سے بڑا ہو گیا کہ آپ اس کے فوت ہونے کے بعد سوچتے ہیں بیعت دوسری جگہ ہوتی ہے یا نہیں؟

Scanned with CamScanner

تصوف اور تزکیۂ باطن میں شیخ اور سالک کا تعلق بڑا نازک ہے۔ ظاہری علوم میں معاملہ مختلف ہے۔ استاد سے نفرت و مخالفت کے باوجود آدمی ظاہری علم حاصل کر سکتا ہے۔ دل سے کسی استاد کو اچھا نہ بھی سمجھتا ہو اس سے کتابیں پڑھ کر علم حاصل کر لیتا ہے۔ مگر راہِ سلوک میں شیخ کامل میسر آ جائے تو اس کی مخالفت مانع فیض ہی نہیں بلکہ حرام ہے۔ اس کی مخالفت کا سوچنا بھی حرام ہے۔ اس لیے کہ جب آپ کے دل میں کدورت آئے گی، تو برکات تو دل نے دل سے حاصل کرنی ہیں، وہ لائن کٹ جائے گی۔ برکات سے محرومی تو ہوگی ہی لیکن شیخ کی مخالفت شرعاً بھی حرام ہے کیونکہ شیخ کی مخالفت دراصل کمالاتِ باطنی اور رضائے الٰہی سے نفرت کرنے کی دلیل ہے۔ یہ درحقیقت ان برکات سے اپنا آپ دور لے جانا ہے۔ ایک شخص چینی کا تاجر ہے، اگر آپ نے تاجر سے دشمنی مول لے لی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو چینی سے کوئی رغبت نہیں کیونکہ اگر چینی حاصل کرنے کی خواہش ہوتی تو آپ تاجر سے کیوں بگاڑتے۔ آپ اس کی دکان پر جانا پسند نہیں کرتے تو وہ چینی دینے آپ کے گھر نہیں آئے گا۔

اگر ظاہری چیزوں میں یہ معاملہ ہے تو جس کے پاس قلبی دولت ہے آپ نے اس سے محبت پیدا کرنی ہے۔ محبت کے جذبے سے اس کے دل کو اپنے دل کی طرف متوجہ کرنا ہے تو دل سے دل میں یہ دولت منتقل ہوتی ہے۔ جب آپ کے دل میں مخالفت آئے گی تو وہ ذریعہ تو کٹ جائے گا۔ بظاہر آپ کا رویہ کتنا ہی اچھا ہو بات نہیں بنے گی۔ شیخِ کامل سے عداوت اصل میں ان برکات سے عداوت ہے، اس نعمت سے عداوت ہے جو اس کے پاس ہے۔ رضائے الٰہی کی مخالفت ہے، کمالاتِ باطنی سے بیر ہے۔

ضرورتِ شیخ

ضرورتِ شیخ کے سلسلے میں ایک سوال بعض ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ جب کتبِ تصوف میں ہر قسم کے اذکار اور وظائف اور ان کے پڑھنے کے طریقے درج ہیں تو ان پر عمل کر کے انسان کامل بن سکتا ہے، پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ طب کی کتابوں میں ہر قسم کے نسخہ جات، وزن، ادویہ اور طریقِ علاج واستعمال موجود ہے، پھر کسی ماہر طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کسی معقول آدمی کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ آخر اس کی وجہ؟

وجہ صرف یہی ہے کہ جان عزیز ہے اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ طب کی کتابوں اور اپنے علم پر بھروسہ نہ کیا جائے بلکہ اچھی طرح چھان بین کر کے کسی ماہر طبیب کو تلاش کیا جائے اور اسی سے علاج کرایا جائے۔ اسی طرح اگر ایمان عزیز ہو اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا مقصود ہو تو معقولیت کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی کسی معالج روحانی کو تلاش کرے کیونکہ روحانی طبیب کے بغیر روحانی صحت اور تزکیۂ باطن اور تعلق مع اللہ پیدا ہونا محال ہے۔

Scanned with CamScanner

ضرورتِ شیخ

ضرورتِ شیخ کے متعلق ایک سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ جب کتبِ تصوف میں ہر طرح کے اذکار و وظائف اور ان کے پڑھنے کے طریقے درج ہیں تو ان پر عمل کر کے انسان کامل بن سکتا ہے پھر شیخ کی کیا ضرورت؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کے پاس جتنی بھی طب کی کتابیں پڑی ہوں اور وہ جتنا بھی مطالعہ کرے، ان پر انحصار نہیں کرتا۔ کسی طبیب کو تلاش کرتا ہے اور اس سے بیماری کا علاج کرواتا ہے کہ کہیں خواہ مخواہ تجربوں میں جان ضائع نہ کر بیٹھوں، کہیں غلط نسخہ نہ آزما بیٹھوں۔ وہ کسی تجربہ کار طبیب سے علاج کرواتا ہے اس لیے کہ جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا مقصد ہو تو معقولیت کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی کسی معالجِ روحانی کو تلاش کرے کیونکہ طبیبِ روحانی کے بغیر روحانی صحت، تزکیۂ باطن، تعلق مع اللہ پیدا ہونا محال ہے۔ صحتِ ظاہری کے لیے تو ایک حد تک ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی کتاب سے نسخہ پڑھ کر اسے استعمال کرنے سے شفا حاصل ہو جاتی ہے لیکن باطنی علم میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ یہ کیفیات کا انعکاس ہے۔ کتابوں میں الفاظ ہوتے ہیں، کیفیات کے لیے کوئی الفاظ نہیں ہوتے۔ کیفیات تو محسوس کی جا سکتی ہیں۔ کیفیات القائی اور انعکاسی چیز ہیں، دلوں سے دلوں میں القا کی جاتی ہیں۔

ان پر پھر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ان کے متعلق یہ تو بتایا جا سکتا ہے کہ ان برکات و کیفیات کے طفیل فلاں فلاں مراقبہ نصیب ہو گیا۔ عملی زندگی میں یہ تبدیلی آتی ہے کہ انسان ذاکر ہو جاتا ہے، اس میں اللہ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، وہ نبی اکرم ﷺ کی سنت کا تابع ہو جاتا ہے۔ یہ سب ان کیفیات کے نتائج و اثرات ہیں، لیکن وہ کیفیت ہے کیا؟ اسے لکھا نہیں جا سکتا، بتایا نہیں جا سکتا، وہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔

بات ہو رہی تھی برکات کے طریقۂ حصول کی، تو پھر وہی مثال کہ جسمانی علاج کے سلسلے میں بعض اوقات احتمال ہوتا ہے کہ نسخہ پڑھ کر انسان اپنا علاج خود کر کے شفا حاصل کر لے گا۔ لیکن لوگ احتیاطاً ایسا نہیں کرتے، طبیب کے پاس جانے کو ترجیح دیتے ہیں کہ کہیں اپنا علاج آپ کرنے کے چکروں میں جان ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ تو کیفیاتِ باطنی اور شفائے باطنی کا معاملہ تو اس سے کہیں نازک تر ہے۔ اس میں تو اس بات کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہوتا کہ کتاب پڑھ کر کچھ حاصل ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ دلوں سے دلوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ صحبتِ پیغمبر ﷺ سے صحابہؓ بنے اور جب یہ صحبت نہ رہی تو قرآن کریم بھی موجود تھا، ذخیرۂ حدیث بھی موجود تھا، پھر کوئی صحابیؓ تو نہ بن سکا۔ کیوں؟ اس لیے کہ صحابیت صرف حضور ﷺ کی صحبت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ چیز انعکاسی اور القائی ہے اس لیے اس کے لیے صحبت شرط ہے اور اس کے بغیر حاصل ہونا محال ہے۔ آج بھی تعلق مع اللہ پیدا کرنے اور حصولِ ولایت کے لیے صحبتِ شیخ ضروری ہے۔

Scanned with CamScanner

باب (8)

منازلِ سلوک

سلوک کے ابتدائی منازل

جب سالک کے لطائف منور ہو جائیں اور اس میں مزید استعداد پیدا ہو جائے تو شیخ کامل اسے سلوک کی منازل اس ترتیب سے طے کراتا ہے۔ اوّل استغراق اور رابطہ کرایا جاتا ہے، پھر مراقبات ثلاثہ، پھر دوائرِ ثلاثہ، پھر مراقبہ اسم الظاہر والباطن، پھر سیر کعبہ، سیر صلوٰۃ اور سیر قرآن اور اس کے بعد فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل آتی ہے۔

سلوک کے ابتدائی منازل

سلوک کے منازل یا مراقبات یا انگریزی میں Stations کہہ لیں۔ شیخ کامل سلوک کے منازل اس ترتیب سے طے کراتا ہے کہ اول استغراق اور رابطہ کرایا جاتا ہے یعنی جب لطائف روشن ہو جائیں اور ان میں ایک قوت پیدا ہو جائے تو پھر سارے لطائف کے انوارات کو قلب پہ جمع کر کے سالک کو رابطہ کرایا جاتا ہے۔ رابطہ ایک عجیب قوت ہے جس میں بنیادی طور پر ایک استغراقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ استغراق کا مطلب ہے پوری طرح ایک طرف متوجہ ہو جانا۔ یعنی دنیا سے کٹ کر، ماحول سے کٹ کر اللہ کریم کی طرف متوجہ ہو جائے اور ذکرِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کا بالائی مقامات سے رابطہ ہو جائے۔ یہ رابطہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اصحابِ کہف کے بارے میں بھی آتا ہے، وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ... (الکھف: ۱۴) مخلوق سے کٹ کر غار میں آگئے تو ''ہم نے ان کے دلوں کو رابطہ عطا کر دیا'' کا مطلب ہے کہ دنیا و مافیہا سے کٹ کر متوجہ الی اللہ ہونا، یہ رابطے کا کمال تھا کہ وہ تین سو سال غار میں سوتے رہے، بھوک پیاس لگی نہ تھکاوٹ محسوس کی اور نہ آنکھ کھلی۔ اسی استغراق میں تین سو سال گزر گئے۔

اس لیے رابطہ کرایا جاتا ہے کہ سالک دنیا و مافیہا سے کٹ کر متوجہ الی اللہ ہو جائے۔ اس کے بعد مراقباتِ ثلاثہ، پھر دوائرِ ثلاثہ، پھر مراقبہ اسم ظاہر والباطن پھر سیر کعبہ، سیر صلوٰۃ، سیر قرآن، اس کے بعد فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل ہے۔

استغراق کی حقیقت

استغراق ایک کیفیت ہے۔ اس کی صحیح حقیقت تو مستغرق کو ہی معلوم ہوتی ہے مگر اتنا بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس میں جسم کی مادی آنکھیں محوِ خواب ہوتی ہیں مگر قلب بیدار ہوتا ہے۔ آدمی باتیں سنتا ہے، وضو ٹوٹ جائے تو معلوم ہو جاتا ہے، جس طرح بیداری میں معلوم ہوتا ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے استغراق میں بڑا فرق ہے۔ انبیاء کا استغراق تام ہوتا

ہے، ناقضِ وضو نہیں ہوتا اور اولیا کا استغراق تام نہیں ہوتا، اس لیے ناقضِ وضو ہوتا ہے کیونکہ اس میں نیند مل جاتی ہے۔

علامہ شامیؒ نے اس پر بحث کی ہے:

نَوْمُ الْاَنْبِيَاءِ غَيْرُ نَاقِضٍ لِاَجْمَاعٍ عَلٰى اَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ نَوَاقِضِ الْوُضُوْءِ كَالْاُمَّةِ اِلَّا مَا صَحَّ مِنِ اسْتِثْنَاءِ النَّوْمِ... ''اِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ...'' اَلْحَدِيْث... (الدر المختار وعلی ھامشه کشف الاستار، ۱:۲۷)

''انبیاء کی نیند ناقضِ وضو نہیں ہوتی اور اجماعِ امت اس پر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نواقضِ وضو میں امت کے ساتھ شریک ہیں، مگر ان کی نیند نواقض سے مستثنیٰ ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ:

''میری آنکھیں سوجاتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا۔''

استغراق کی حقیقت

استغراق ایک ایسی کیفیت ہے کہ اس کا حال تو اسی کو معلوم ہوتا ہے جس پر استغراق وارد ہوتا ہے مگر اتنا بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس میں مادی حسیات مثلاً آنکھیں، کان وغیرہ بند ہوتے ہیں یعنی مادی ذرائع اطلاع معطل ہوتے ہیں لیکن قلب بیدار ہوتا ہے۔ انسان باتیں سنتا ہے، وضو ٹوٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جس طرح بیداری میں معلوم ہوتا ہے، البتہ انبیاءؑ کے استغراق اور اولیاء کرام کے استغراق میں بڑا فرق ہے۔ انبیاءؑ کا استغراق مکمل ہوتا ہے، ان کا وضو استغراق میں نہیں ٹوٹتا بلکہ انبیاءؑ کی نیند بھی استغراق ہوتی ہے۔

کتنی احادیث ملتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ مسجد میں تشریف لائے، فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر لیٹے اور سو گئے۔ آپ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ سوتے میں ہلکے ہلکے خراٹے لیتے تھے، ہلکی سی آواز آیا کرتی تھی۔ چونکہ نیند میں بعض اوقات نزولِ وحی ہوتا تھا اس لیے کوئی آپ ﷺ کو بیدار نہیں کرتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ خود ہی اٹھ جاتے اور نمازِ فجر پڑھاتے لیکن وضو نہیں فرماتے تھے کیونکہ انبیاءؑ کی نیند استغراقِ تام یعنی مکمل استغراق ہوتی ہے اس لیے وضو ٹوٹنے کا باعث نہیں بنتی۔ ولی کے استغراق میں وضو ٹوٹ سکتا ہے لیکن نیند کے برعکس استغراق میں وضو ٹوٹنے کی خبر ہوجاتی ہے۔

علامہ شامیؒ نے اس میں بحث کی ہے، فرمایا کہ باقی نواقضِ وضو (وہ ساری باتیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) میں سارے احکام نبی اکرم ﷺ پر بھی اسی طرح وارد ہوتے ہیں جس طرح ساری امت پر لیکن سوائے نیند کے۔ نیند میں آپ ﷺ کو استثناء حاصل ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ کا ارشادِ عالی ہے:

اِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ... اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

''میری آنکھیں سوجاتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔''

Scanned with CamScanner

انبیاء کی نیند ناقضِ وضو نہیں

محدثین وفقہاء کا اس بارے اتفاق ہے کہ نوم انبیاءؑ ناقضِ وضو نہیں۔

چنانچہ قاضی عیاضؒ کی 'شفاء' میں اور 'بحرالرائق' میں اس پر بحث کی گئی ہے:

فَاِنَّ النَّوْمَ مُضْطَجِعًا نَاقِضٌ اِلَّا فِیْ حَقِّ النَّبِیِّ ﷺ صَرَّحَ فِی الْقُنْیَۃِ بِاَنَّہٗ مِنْ خَصُوْصِیَاتِہٖ ﷺ وَلِھٰذَا...ھُوَ الْمَشْھُوْرُ فِیْ کُتُبِ الْمُحَدِّثِیْنَ وَ فُقَھَاءَ...

(شفا بتحقیق حقوق مصطفٰی، ۱:۲۸۱؛ بحر الرائق، ۱:۳۹)

نبی کریم ﷺ کے علاوہ سب کے لیے لیٹ کر سوجانا ناقضِ وضو ہے۔ صاحب 'فتاویٰ قنیہ' نے اس کی تصریح کی ہے کہ نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا حضور ﷺ کی خصوصیات سے ہے اور محدثین اور فقہاء کا مشہور مذہب یہی ہے۔

اور 'فتاویٰ قنیہ' میں ہے:

وَ فِیْ مُشْکِلِ الْاٰثَارِ وَ شَرْحِ السُّنَّۃِ اَنَّ نَوْمَ النَّبِیِّ ﷺ لَیْسَ بِحَدَثٍ وَرَوٰی مُحَمَّدٌ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ...اَنَّہٗ ﷺ نَامَ عَلٰی جَنْبِہٖ وَ صَلّٰی بِغَیْرِ وُضُوْءٍ قَالَ تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ وَ ھُوَ مِنْ خَصَائِصِہٖ ﷺ... (فتاویٰ قنیہ، ۱:۵)

"امام طحاویؒ کی 'مشکل الآثار' اور امام بغویؒ کی 'شرح السنۃ' میں ہے کہ انبیاءؑ کا سوجانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ اور امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ پہلو کے بل سوگئے اور اٹھ کر وضو کے بغیر نماز پڑھی اور فرمایا، میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا قلب نہیں سوتا، اور یہ بات حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔"

اور 'کتاب الآثار' امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ قَالَ تَوَضَّاَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَخَرَجَ اِلَی الْمَسْجِدِ فَوَجَدَ الْمُؤَذِّنَ قَدْ اَذَّنَ فَوَضَعَ جَنْبَہٗ فَنَامَ حَتّٰی عُرِفَ مِنْہُ النَّوْمُ وَ کَانَتْ لَہٗ نَوْمَۃٌ تُعْرَفُ کَانَ یَنْفُخُ اِذَا نَامَ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰی بِغَیْرِ وُضُوْءٍ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَیْسَ کَغَیْرِہٖ... (کتاب الآثار، ۹۴)

"حماد بیان کرتے ہیں ابراہیم سے، وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے وضو کیا پھر مسجد میں گئے۔ دیکھا مؤذن اذان کہہ چکا ہے آپ پہلو کے بل لیٹ گئے اور سوگئے اور آپ کا سوجانا معلوم ہوگیا۔ آپ کے سوجانے کی علامت یہ تھی کہ آپ (بہت ہلکے ہلکے) خراٹے بھرتے تھے، جب آپ جاگے تو اٹھ کر وضو کیے بغیر نماز پڑھی۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔" اور:

قَالَ مُحَمَّدٌ وَبِقَوْلِ اِبْرَاھِیْمَ نَاْخُذُ بَلَغَنَا اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا

Scanned with CamScanner

يَنَامُ قَلْبِيْ فَالنَّبِيُّ ﷺ فِيْ هٰذَا لَيْسَ كَغَيْرِهٖ فَأَمَّا مَنْ سِوَاهُ فَمَنْ وَضَعَ جَنْبَهٗ فَنَامَ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْوُضُوْءُ وَهُوَ قَوْلُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ... (کتاب الآثار، ۹۴)

"امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب وہی ہے جو ابراہیم نے بیان کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا پس حضور ﷺ اس نیند اور وضو کے معاملے میں دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ دوسروں میں جو پہلو کے بل سو جائے اس کے لیے وضو کرنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول یہی ہے اور یہی ان کا مذہب ہے۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ

محدثین، فقہاء اور بالخصوص امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہی ہے کہ نیند سے نبی کریم ﷺ کا وضو نہیں ٹوٹتا۔

شیخ القرآن نے اپنی تفسیر "جواہر القرآن" جلد اوّل، صفحہ ۱۲۳-۱۲۴ پر اس عنوان کے تحت تفصیل دے کر لکھا ہے کہ:

"نوم انبیاء علیہم السلام کے بارے میں محدثین کرام کا مسلک یہ ہے کہ وہ ناقضِ وضو نہیں۔"

یہاں تک تو درست فرمایا، لیکن آگے صفحہ ۱۲۵ پر فرماتے ہیں کہ:

"یہ کوئی قانون نہیں، چنانچہ لیلۃ التعریس میں حضور ﷺ سو گئے تھے۔"

یعنی شیخ القرآنؒ کے اجتہاد نے محدثین کرام کے مسلمہ مذہب کو باطل قرار دیا۔

اپنے اس قول کی تائید میں فرمایا کہ شیخ (مولانا حسین علی) کا فرمان ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں اختلاف ہے۔ راویوں میں اختلاف کا مطلب کیا ہے؟ کیا کسی راوی نے یہ بیان کیا کہ نومِ انبیاءؑ ناقضِ وضو ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ حدیث پیش کریں۔

اصول یہ ہے کہ جب راویوں کے الفاظ میں اختلاف آجائے تو قدرِ مشترک نکالا جائے گا تو روایات کا قدرِ مشترک یہ کہ نومِ انبیاءؑ غیر ناقض ہیں۔ خواہ کوئی راوی بعد عشاء کہے، خواہ وقتِ سحر کہے، یا بعد وتر کے بیان کرے، فجر کی سنتوں کے بعد کہے، یہ بات تو سب نے کہی کہ نومِ انبیاءؑ ناقضِ وضو نہیں۔ پھر راویوں کے اختلاف نے آپ کے قول کو کیا تقویت دی؟

جب آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ محدثین کا مذہب یہی ہے کہ نومِ انبیاءؑ غیر ناقض ہیں۔ پھر آپ کے قول سے جمہور محدثین کے اجماعی مذہب کو کیونکر ترک کر دیا جائے؟ رہا لیلۃ التعریس کا حوالہ تو تمام محدثین، فقہاء اس کا جواب دے چکے ہیں کہ آفتاب مدرکِ قلب نہیں بلکہ مدرکاتِ چشم سے ہے، یعنی آفتاب کا ادراک قلب کا کام نہیں بلکہ آنکھ کا کام ہے۔ قلب تو لطیف چیزوں کو دیکھ سکتا ہے، پھر ہو سکتا ہے کہ نیند استغراقِ تام ہو، توجہ الی باری تعالیٰ ہو اور شمس سے غفلت ہو۔ مختصر یہ کہ شیخ القرآن کا مذہب حدیث وفقہ کے خلاف ہے۔ محدثین کے مخالف ہے۔ امام حماد، ابراہیم، امام محمد اور امام ابوحنیفہ کے خلاف ہے۔

ترجمان القرآن اور حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس کا مذہب "سنن ابوداؤد" اور اس کی شرح "بذل المجہود" میں بیان ہوا ہے:

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ مَحْفُوْظًا مِنْ أَنْ يَخْرُجَ مِنْ حَدَثٍ وَلَمْ يَشْعُرْ بِهٖ...

Scanned with CamScanner

عَنْ عَائِشَةَ تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ... أَيْ هٰذَا مِنْ خَصَائِصِ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَ سَلَامُ عَلَيْهِمْ... وَ قَلْبُ الْمُصْطَفٰى فَإِنَّهُ إِكْرَامٌ لَهُ لِئَلَّا يَخْلُوَ وَقْتُهُ مِنْ مَعَارِفِ الْإِلٰهِيَّةِ وَ الْمَصَالِحِ الدِّيْنِيَّةِ... (سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی الوضو من النوم، ۱:۲۵-۲۶؛ بذل المجہود شرح ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی الوضو من النوم، ۱:۱۲۵)

"حضور اکرم ﷺ اس امر سے محفوظ تھے کہ آپ کے اندر سے ریح خارج ہو اور آپ کو معلوم نہ ہو سکے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی آنکھیں سو جاتی تھیں اور قلب پر نیند یا غفلت نہ آتی تھی اور نیند میں وضو نہیں ٹوٹتا تھا۔ یہ بات انبیاءؑ کی خصوصیات سے ہے اور حضور ﷺ کے قلب کی خصوصیات سے ہے، تاکہ حضور ﷺ کے قلب پر کوئی ایسا وقت نہ گزرے کہ معارف الٰہیہ اور مصالح دینیہ کے حصول سے غافل ہو۔"

اس روایت سے حضرت عبداللہ ابن عباس کا مذہب واضح ہے کہ نوم انبیاءؑ ناقضِ وضو نہیں۔ رہا لیلۃ التعریس کا سوال تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ:

وَإِنَّهُ قِيْلَ: إِنَّهُ كَانَ فِيْ وَقْتٍ يَنَامُ قَلْبُهُ وَفِيْ وَقْتٍ لَا يَنَامُ فَصَادَفَ الْوَادِيْ نَوْمُهُ وَالصَّوَابُ الْأَوَّلُ... (شرح نووی علی الصحیح المسلم، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ اللیل وعدد رکعات النبی ﷺ، ۱:۲۵۴)

"کہا گیا ہے کہ کسی وقت حضور ﷺ کا قلب سو جاتا اور کسی وقت غافل نہیں ہوتا۔ اس وادی میں نیند آ گئی اور صحیح بات یہی ہے (انبیاءؑ کے قلب پر غفلت نہیں آتی)۔"

اصل بات تو وہی کہ والصواب الاوّل یعنی بات صحیح یہی ہے کہ انبیاءؑ کے قلب پر غفلت نہیں آتی۔ مگر پہلی بات بھی آخر کہی تو گئی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ "قیل" کا قائل کون ہے۔ اگر قائل کا پتہ ہی نہیں تو اس کی بات کو حجت قرار دینا کون سی دانشمندی ہے۔

حدیث تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ... بخاری، جلد اول، صفحہ ۱۱۹ پر موجود ہے۔

اس کے علاوہ صفحہ ۲۲، ۱۹۷ اور ۲۵۴، پر اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح "مسلم شریف" میں بھی موجود ہے، اور "خصائص الکبریٰ" میں صفحہ ۱۷۲-۱۷۳ پر متعدد احادیث مذکور ہیں:

۱۔ أَخْرَجَ الشَّيْخَانِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرَ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ يَا عَائِشَةُ أَنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ...

۲۔ أَخْرَجَ أَبُوْ نُعَيْمٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَنَامُ عَيْنَيَّ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ...

۳۔ وَأَخْرَجَ الشَّيْخَانِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ:
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْأَنْبِيَاءُ ﷺ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُهُمْ...

Scanned with CamScanner

۴۔ وَاَخْرَجَ ابْنُ سَعْدٍ عَنْ عَطَآءٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ
قَالَ اِنَّا مَعْشَرَ الْاَنْبِیَآءِ تَنَامُ اَعْیُنُنَا وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُنَا...

۵۔ وَعَنِ الْحَسَنِ مَرْفُوْعًا، تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ...

۶۔ وَاَخْرَجَ اَبُوْ نُعَیْمٍ عَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِاللّٰہِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ تَنَامُ عَیْنَاہُ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ...

۷۔ وَاَخْرَجَ اَبُوْ نُعَیْمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ...الخ.
اِلٰی اَنْ قَالَ ھٰذَا النَّبِیُّ تَنَامُ عَیْنَاہُ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ...

۸۔ وَاَخْرَجَ الْحَاکِمُ وَصَحَّحَہٗ عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ تَنَامُ عَیْنُہٗ وَلَا یَنَامُ قَلْبُہٗ...

جمہور اہلِ اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی آنکھوں پر نیند طاری ہوتی ہے مگر ان کے قلب پر غفلت طاری نہیں ہوتی۔ یہی عقیدہ حضور ﷺ نے تمام صحابہؓ کو سکھایا، جیسا کہ حضرت عائشہؓ، ابن عباسؓ، انسؓ بن مالک، ابوہریرہؓ، اور امام حسن بصریؒ، امام بخاریؒ، امام محدث حاکمؒ، محدث ابونعیمؒ اور ابوداؤدؒ، امام نوویؒ، امام سیوطیؒ، قاضی عیاضؒ، عطاء خراسانیؒ، اور امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہی ہے۔ اس کے علاوہ بحر الرائق " "فتاویٰ شامی"، اور "فتاویٰ قنیہ" میں یہی عقیدہ ہے اور ملا علی قاری کا یہی عقیدہ ہے۔ اور سابقہ امتوں کا بھی یہی عقیدہ چلا آیا ہے جیسا کہ "خصائص الکبریٰ" ۱:۱۷۳۔۱۷۴ پر تفصیل موجود ہے۔

اس عظیم جماعت کے مقابلے میں شیخ القرآن کا مذہب ہے جو جمہور کے مخالف ہے، اور اس کی بناء یا تو شیخ القرآن کی ذاتی رائے پر ہے یا "قیل" پر ہے۔ جس کا قائل نہ تو روایت میں بیان ہوا ہے نہ شیخ القرآن نے نشاندہی فرمائی اور اس نامعلوم شخص کی بات پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔

انبیاء کی نیند ناقضِ وضو نہیں

تمام محدثین کرام اور فقہائے عظام کا اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ انبیاءؑ کا نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ چنانچہ قاضی عیاضؒ کی 'شفاء' میں اور 'بحر الرائق' میں اس پر بحث کی گئی ہے۔

نبیٔ اکرم ﷺ کے علاوہ سب کے لیے لیٹ کر سونا وضو ٹوٹنے کا باعث ہے۔ 'فتاویٰ قنیہ' کے مصنفِ محترم نے اس کی تشریح اور وضاحت کی ہے کہ نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا حضور نبی کریم ﷺ کی خصوصیاتِ مطہرہ میں سے ایک ہے۔ اور یہ محدثین اور فقہا کا مشہور مذہب ہے (سب اس بات پر متفق ہیں)۔ اور 'فتاویٰ قنیہ' میں ہے کہ

امام طحاویؒ کی 'مشکل الآثار' اور امام بغویؒ کی 'شرح السنۃ' کے مطابق انبیاءؑ کا سوجانا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ پہلو کے بل سو گئے اور پھر اٹھ کر وضو کیے بغیر نماز پڑھی اور فرمایا "میری آنکھیں

Scanned with CamScanner

سوتی ہیں لیکن میرا قلب نہیں سوتا (متوجہ الی اللہ رہتا ہے)" اور یہ خصوصیات حضور اکرم ﷺ کا خاصہ ہیں۔

اور "کتاب الآثار، مصنفہ امام محمدؒ" میں ہے:

حماد روایت کرتے ہیں کہ ابراہیم سے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے وضو کیا پھر مسجد میں گئے اور سو گئے اور آپ ﷺ کا سو جانا معلوم ہو گیا (آپ ﷺ کے سو جانے کی علامت یہ تھی کہ آپ ﷺ بے حد ہلکے ہلکے خراٹے بھرتے تھے)۔ جب آپ ﷺ جاگے تو اٹھ کر بغیر وضو کیے نماز پڑھی۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ باقی تمام لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔

امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب (نظریہ یا خیال یا عقیدہ) وہی ہے جو ابراہیم نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔" پس حضور ﷺ نیند اور وضو کے معاملے میں باقی تمام لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔ عامۃ الناس کے لیے یہ ایک کلیہ قاعدہ ہے کہ جو کوئی پہلو کے بل سو جائے، اُٹھ کر اس کے لیے وضو کرنا واجب ہے (خواہ وہ باوضو سویا ہو)۔ یہی عقیدہ اور قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔ ان تمام اقتباسات سے معلوم ہوا کہ محدثین، فقہاء اور بالخصوص امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے کہ نیند سے آپ ﷺ کا وضو نہیں ٹوٹتا۔

شیخ القرآن مولانا حسین علی نے اپنی تفسیر 'جواہر القرآن' جلد اوّل، صفحہ ۱۲۳-۱۲۴ پر اس عنوان کے تحت تفصیل دے کر لکھا ہے کہ "نومِ انبیاءؑ کے بارے میں محدثین کرام کا مسلک یہ ہے کہ وہ ناقضِ وضو نہیں۔" یہاں تک تو انہوں نے درست فرمایا لیکن آگے صفحہ ۱۲۵ پر یہ کہہ گئے ہیں کہ:

"یہ کوئی قانون نہیں، چنانچہ لیلۃ التعریس میں حضور ﷺ سو گئے تھے۔"

یعنی شیخ القرآن کے اجتہاد (رائے) نے محدثینِ کرام کے عقیدے کو باطل قرار دیا۔ اپنے اس قول کی تائید میں مزید یہ فرمایا کہ "شیخ (مولانا حسین علی) کا فرمان ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں اختلاف ہے۔"

راویوں میں اختلاف کا مطلب کیا ہے؟ کیا کسی راوی (روایت کرنے والا) نے یہ بیان کیا ہے کہ نومِ انبیاءؑ ناقضِ وضو ہے؟ اگر ایسا ہے تو حدیث پیش کریں۔

اصول یہ ہے کہ جب راویوں کے الفاظ میں اختلاف آ جائے تو تمام روایتوں میں قدرِ مشترک نکالا جائے گا یعنی وہ بات لی جائے گی جو ان تمام روایتوں میں کہی گئی ہے گو الفاظ مختلف ہوں۔ اور ان تمام روایات میں لفظوں کے فرق سے قطع نظر ایک ہی بات بیان کی گئی ہے کہ "انبیاءؑ کی نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔" پھر راویوں یا روایتوں میں الفاظ کے فرق نے آپ کے قول کو کیا تقویت دی؟

جب آپ (شیخ القرآن) یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ محدثین کا مذہب یہی ہے کہ "نومِ انبیاء غیر ناقضِ وضو ہے"، پھر محض آپ کی رائے سے جمہور (تمام) محدثین کے اجماعی مذہب کو کیونکر ترک کر دیا جائے؟ رہا لیلۃ التعریس کا حوالہ جب آپ ﷺ اور مجاہدین صحابہؓ جنگل میں رات گزارنے کو رکے۔ سفر کی تھکاوٹ اس درجہ تھی کہ کسی کی آنکھ نہ کھلی اور فجر قضا ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

تو اس اعتراض کہ آپ ﷺ کو آفتاب طلوع ہونے کا علم کیوں نہ ہو سکا، کا جواب تمام محدثین اور فقہا پہلے ہی دے چکے ہیں کہ سورج کا ادراک اور اندازہ آنکھ لگاتی ہے اور آپ ﷺ کا فرمانا ہے کہ "میری آنکھ سوتی ہے لیکن میرا دل نہیں سوتا۔"

جبکہ قلب لطیف چیزوں کا احساس و ادراک کرتا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

"میری آنکھ سوتی ہے لیکن میرا دل نہیں سوتا۔" یعنی آپ ﷺ کا قلبِ اطہر ہمہ وقت متوجہ الی اللہ رہتا ہے، غافل نہیں ہوتا۔ ایک متوجہ الی اللہ دل آفتاب سے غافل ہو سکتا ہے۔

ترجمان القرآن اور حبر الامت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا نوم انبیاءؑ کے بارے میں عقیدہ 'سنن ابوداؤد' اور اس کی شرح 'بذل المجہود' میں بیان ہوا ہے۔

رسول کریم ﷺ بفضلِ الٰہی اس امر سے محفوظ تھے کہ اخراجِ ریح کا آپ ﷺ کو احساس نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی آنکھیں سو جاتی تھیں لیکن قلبِ اطہر ﷺ پر نیند یا غفلت نہ آتی تھی اور نیند میں وضو نہیں ٹوٹتا تھا۔

یہ بات انبیاءؑ کی خصوصیات میں سے ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کے قلب کی خصوصیات سے ہے تاکہ آپ ﷺ کے قلبِ مبارک پر کوئی وقت ایسا نہ گزرے کہ معارفِ الٰہیہ اور مصالحِ دینیہ کے حصول سے غافل ہو۔

اس روایت سے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کا عقیدہ 'نوم انبیاء ناقضِ وضو نہیں' واضح ہے۔ رہا لیلۃ التعریس کا سوال تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وَاِنَّہٗ قِیْلَ:... وَالصَّوَابُ الْاَوَّلُ...

(شرح نووی علی الصحیح المسلم۔ کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ اللیل و عدد رکعات النبی ﷺ، ۱: ۲۵۴)

"کہا گیا کہ کسی وقت حضور ﷺ کا قلب مبارک سو جاتا اور کسی وقت غافل نہ ہوتا، اس وادی میں نیند آ گئی اور صحیح بات یہی ہے کہ انبیاءؑ کے قلب پر غفلت نہیں آتی۔"

اصل بات تو وہی کہ 'والصواب الاول' یعنی صحیح بات یہی ہے کہ انبیاءؑ کے قلب پر غفلت نہیں آتی۔ مگر پہلی بات بھی تو آخر کہی ہی گئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ 'قیل' (کہا گیا) کا 'قائل' کون ہے یعنی کہنے والا کون ہے؟ ایک بات ہم کرتے ہیں "فلاں بات ایسے بھی کہی گئی ہے" یہ رواجاً کہہ دیا جاتا ہے لیکن یقین کرنے سے پہلے دیکھنا تو چاہیے کہ کہنے والا ہے کون؟ اگر کہنے والے ہی کا پتہ نہیں۔ ویسے ہی کہہ دیں کہ "ایسا کہا جاتا ہے" تو ایسی بات کو حجت قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔

حدیث: تَنَامُ عَیْنَایَ وَلَا یَنَامُ قَلْبِیْ... بخاری شریف کی جلد اول، صفحہ ۱۱۹ پر موجود ہے۔

اس کے علاوہ صفحہ ۲۲، ۱۹۷ اور ۲۵۴ پر اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

اسی طرح 'مسلم شریف' میں بھی موجود ہے۔ اور 'خصائص الکبریٰ' میں صفحہ ۱۷۲-۱۷۳ پر متعدد احادیث مذکور ہیں۔

جمہور اہلِ اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ انبیاءؑ کی آنکھوں پر نیند طاری ہوتی ہے مگر ان کے قلب پر غفلت طاری نہیں ہوتی۔

یہی عقیدہ حضور ﷺ نے تمام صحابہؓ کو سکھایا جیسا کہ حضرت عائشہؓ، ابنِ عباسؓ، انس بن مالکؓ، ابوہریرہؓ اور امام حسن بصریؒ، امام بخاریؒ، امام محدث حاکمؒ، محدث ابونعیمؒ اور ابوداؤدؒ، امام نوویؒ، امام سیوطیؒ، قاضی عیاضؒ، عطا خراسانیؒ اور امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ

Scanned with CamScanner

کا مذہب یہی ہے۔ اس کے علاوہ 'بحر الرائق'، 'فتاویٰ شامی' اور 'فتاویٰ قنیہ' میں یہی عقیدہ ہے اور ملا علی قاری کا بھی عقیدہ ہے
سابقہ امتوں کا بھی یہی عقیدہ چلا آ رہا ہے جیسا کہ 'خصائص کبریٰ' میں تفصیل موجود ہے۔

اس عظیم جماعت کے مقابلے میں شیخ القرآن کا عقیدہ امت کے اجماعی عقیدے کے خلاف ہے۔ اب اس کی بنیاد یا تو شیخ القرآن کی ذاتی رائے پر ہے یا 'قیل' پر ہے جس کے 'قائل' کا نہ تو روایت میں بیان ہوا ہے نہ شیخ القرآن نے نشاندہی کی ہے۔ اُنہوں نے نامعلوم شخص کی سنی سنائی بات پر اپنے عقیدے کی بنیاد رکھی ہے۔

نومِ انبیاءؑ وحی ہے

قَالَ تَعَالٰى قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى...
قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ... (الصّٰفّٰت:۱۰۲)

"حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ برخوردار میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو، تمہاری کیا رائے ہے۔ وہ بولے ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجیے۔"

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا نَامَ لَمْ يُوْقَظْ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ يَسْتَيْقِظُ لِاَنَّا لَا نَدْرِيْ مَا يَحْدُثُ لَهٗ فِيْ نَوْمِهٖ... (فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب الصعید الطیب وضوء المسلم یکفیہ من الماء، ۱:۴۴۷)

"نبی کریم ﷺ جب نیند میں ہوتے تو آپ کو جگایا نہیں جاتا تھا جب تک خود بیدار نہیں ہوتے کیونکہ ہم نہیں جانتے تھے کہ نیند میں آپ پر کیا کچھ نازل ہو رہا ہے۔"

'ابن کثیر' اور 'بخاری' میں ہے کہ:

قَالَ عَمْرٌو سَمِعْتُ عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُوْلُ رُؤْيَا الْاَنْبِيَآءِ وَحْيٌ...

(صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب التخفیف فی الوضوء، ۱:۲۵؛ تفسیر ابن کثیر، ۴:۱۴)

"ابن ابی عمیرؒ جلیل القدر تابعی فرماتے ہیں کہ انبیاءؑ کا خواب وحی ہوتا ہے۔"

علامہ سہیلی لکھتے ہیں کہ:

حَتّٰى اَتَوْهُ لَيْلَةً اُخْرٰى فِيْمَا يَرٰى قَلْبُهٗ وَتَنَامُ عَيْنُهٗ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهٗ وَكَذٰلِكَ الْاَنْبِيَآءُ تَنَامُ اَعْيُنُهُمْ وَلَا يَنَامُ قُلُوْبُهُمْ... (روض الانف، ۱:۲۴۳)

"ملائکہ کرام رسول اکرم ﷺ کے پاس رات کو سوتے میں آئے، اس حالت میں کہ حضور ﷺ کا قلب بیدار تھا اور آنکھیں سو رہی تھیں اور دل نہیں سو رہا تھا۔ اسی طرح انبیاءؑ کی آنکھیں سو رہی ہوتی ہیں

Scanned with CamScanner

اور قلب بیدار ہوتا ہے۔"

اور فتح الباری میں ہے کہ

قَالَ الْخَطَّابِیُّ وَإِنَّمَا مُنِعَ قَلْبُهُ النَّوْمَ لِيَعِيَ الْوَحْيَ الَّذِيْ يَأْتِيْهِ فِي الْمَنَامِ...

(فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب تخفیف فی الوضوء،۱: ۲۳۹)

"خطابی فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے قلب کو نیند سے روکا گیا ہے، تاکہ اس وحی کو یاد رکھیں جو نیند میں نازل ہوتی ہے۔"

فَأَخْبَرَنِيْ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: بَيْنَمَا أَنَا نَائِمٌ، رَأَيْتُ فِيْ يَدَيَّ سِوَارَيْنِ مِنْ ذَهَبٍ فَأَهَمَّنِيْ شَأْنُهُمَا، فَأُوْحِيَ إِلَيَّ فِي الْمَنَامِ: أَنِ انْفُخْهُمَا... (فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، ۶: ۶۲۷)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہیں۔ مجھے ان کی وجہ سے رنج ہوا، پس میری طرف وحی کی گئی کہ انہیں پھونک دے۔"

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ... (تفسیر ابن کثیر، ۴: ۲۸)

"ابن عباسؓ نے فرمایا کہ انبیاءؑ کا خواب وحی ہوتا ہے۔"

أَنَّ الْوَحْيَ يَأْتِيْ لِلْأَنْبِيَاءِ مِنَ اللهِ أَيْقَاظًا وَنِيَامًا... (تفسیر ابن کثیر، ۳: ۲۳)

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاءؑ کی طرف خواب اور بیداری میں وحی آتی ہے۔"

فائدہ:

نصِ قرآن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ عقیدہ ثابت ہوا کہ انبیاءؑ کا خواب وحی ہوتا ہے۔ حدیث و آثار صحابہؓ سے یہی عقیدہ ثابت ہوتا ہے، تابعین کا بھی یہی عقیدہ تھا، فقہائے امت کا یہی عقیدہ تھا جیسا کہ 'شامی' میں آچکا ہے بلکہ ساری امت کا یہی عقیدہ ہے جیسا کہ 'روض الانف' کی عبارت میں لفظ 'کَذٰلِکَ' سے متبادر ہوتا ہے۔

سوال: لیلۃ التعریس میں حضور ﷺ کی نماز فوت ہوگئی، اگر نومِ انبیاءؑ میں قلوب غافل نہ ہوتے تو وقتِ نماز اور وقت طلوعِ شمس معلوم کر لیتے۔

الجواب:

(۱) آفتاب چشمِ ظاہری کے مدرکات سے ہے۔ تعطلِ چشم سے اس کے مدرکات میں بھی تعطل آگیا۔ آفتاب قلب کے مدرکات سے نہیں۔ یہ سوال ہی جاہلانہ ہے۔

(۲) استغراق میں قلب ماسوائے اللہ سے منقطع ہوجاتا ہے اور انوار و تجلیات میں مستغرق ہوجاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سوال: حدیثِ لیلۃ التعریس میں نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کی غفلت کا سبب نیند ہی بیان کیا گیا ہے، استغراق نہیں اور استغراق کا ذکر حدیث میں نہیں ہے۔

الجواب: اثر سے موثر پر استدلال غلط ہے۔ نماز سے غفلت ایک اثر ہے مگر ممکن ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا موثرِ غفلت استغراق ہو، جس کا قرینہ دوسری حدیثیں ہیں اور صحابہؓ کا سبب موثر نیند ہو۔

سوال: اگر قلب کی غفلت تسلیم نہ کی جائے تو خدا سے شرکت لازم آتی ہے لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ...

الجواب: قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ملائکہ کو نیند نہیں آتی یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ... (الانبیا:۲۰) اور شیطان کو بھی نیند نہیں آتی۔ دیکھیے 'احیاء العلوم' جلد ۳، صفحہ ۳۱ (بیان تسلط الشیطان علی قلب بالوساوس)۔ صاحب! یہ اوصاف سلبیہ ہیں اور اوصاف سلبیہ میں شرک کہاں؟ آنکھیں خود حادث ہیں اور حادث مسبوق بالعدم کو خالقِ کل سے کیا نسبت؟

حدیث میں استغراق کے مذکور نہ ہونے کی وجہ سے رسول کریم ﷺ کی نیند کو سببِ غفلت نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ حدیث شریف میں غفلتِ نومی کو بوجہ شیطان بیان کیا گیا ہے۔ کیا رسول اکرم ﷺ کی غفلتِ نماز کا سبب نیند ہو سکتی ہے؟ نیز کسی امر کے نص میں سکوت عنہ ہونے سے اس کا دعویٰ کرنا نص کے مخالف نہیں ہوتا۔

نومِ انبیاءؑ وحی ہے

انبیاءؑ کو اگر خواب بھی آئے تو وحیِ الٰہی ہوتی ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو مخاطب ہو کر فرمایا، یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی... (الصّٰفّٰت: ۱۰۲)۔ جب حضرت حاجرہؑ سے تیار کروا کر انہیں منیٰ میں لے گئے اور ساری بات باپ بیٹے میں علیحدگی میں ہوئی۔ حضرت حاجرہؑ کو نہیں بتایا گیا۔ چونکہ نبیؑ کا خواب بھی وحی ہوتی ہے، وحی کو سمجھنا بھی نبیؑ ہی کا کام ہے۔ یہاں ایک بڑا مزے کا لیکن بڑا قابلِ غور نکتہ اٹھتا ہے کہ غیر نبی وحی کی تشریح نہیں کرسکتا۔ ہمارے یہاں نام نہاد علماء اور بزعمِ خود دانشور قرآنِ حکیم سے اپنی اٹکل سے معنی نکال لیتے ہیں۔ یہ قطعی غلط ہے۔ غیر نبی وحی کی تشریح نہیں کرسکتا۔ قرآن وحیِ الٰہی ہے تو اس کی تشریح اگر کی جائے گی تو باطل ہوگی۔ مائی حاجرہؑ کتنی عظیم ہستی تھیں جنہیں اللہ کے نام پر بیابان میں چھوڑا گیا، جہاں کعبہ کی بنیادیں تھیں جو مٹی میں دبی ہوئی تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ حضرت جبرئیلؑ کی معیت میں انہیں سینکڑوں میل چلا کر پہلے وہاں لے گئے، پھر ایک ننھے بچے سمیت وہاں چھوڑ دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ مجھے اس بیابان میں کس کے سہارے چھوڑ رہے ہو؟ ابراہیمؑ نے فرمایا جس نے مجھے تمہیں یہاں چھوڑنے کا حکم دیا۔ تو بولیں "پھر میرے لیے وہ کافی ہے، آپ تشریف لے جائیے۔" جب آپ کا راشن پانی ختم ہو گیا اور صفا مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑیں تو یہ عمل اللہ کے ہاں اتنا مقبول ہوا، تب سے قیامت تک اسے

Scanned with CamScanner

حج کا رکن بنا دیا گیا حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ نے بھی صفا مروہ پر سعی فرمائی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کیونکہ اماں حاجرہ نبی نہیں تھیں، ابراہیمؑ نے ان سے بات نہیں کی کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ وحی کو سمجھنا صرف نبیؑ کا کام ہے۔ اسماعیلؑ اگرچہ بہت کمسن تھے، ابھی چلنا اور دوڑنا شروع ہی کیا تھا لیکن جب ابراہیمؑ نے انہیں اپنا خواب بتایا اور ان سے رائے طلب کی تو ابا جواب سنیے قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۔۔۔ باپ اللہ کا نبی ہے تو بیٹا ہے اگرچہ کمسن، ہے وہ بھی اللہ کا نبیؑ۔ کیونکہ نبیؑ ہی جانتا ہے کہ باپ کا خواب وحیِ الٰہی ہے، اللہ حکم دے رہا ہے۔ فرمایا کہ اے اباجان آپ کو جس بات کا حکم دیا جارہا ہے کر گزریئے۔

سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ۔۔۔ (الصّٰٓفّٰت:۱۰۲)

آپ کو فکر ہے کہ میں کمسن ہوں " اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔"

تو یہ قاعدہ سمجھ میں آگیا کہ وحی کو سمجھنا، اس کا مفہوم اور تشریح کرنا نبیؑ کا کام ہے۔ قرآن کی تفسیر وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے اور جو صحابہ کرامؓ نے سمجھی ہے۔ اس کے علاوہ ہر تشریح و تفسیر باطل ہوگی۔ جتنے بھی باطل فرقے ہیں ان کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ قرآنی آیات کو اپنی مرضی کے معنی پہناتے ہیں۔ اگر ساری امت اس بات پر متفق ہو جائے کہ وہ تشریح سمجھی جائے جو صحابہؓ نے سمجھی تو آج بھی اسلام میں کوئی فرقہ نہیں رہے گا۔

بات ہو رہی تھی نومِ انبیاءؑ کی۔ 'فتح الباری' میں رقم ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نیند میں ہوتے تو آپ ﷺ کو جگایا نہیں جاتا تھا جب تک کہ آپ ﷺ خود بیدار نہیں ہو جاتے تھے کیونکہ ہم نہیں جانتے تھے کہ نیند میں آپ ﷺ پر کیا کچھ نازل ہو رہا ہے۔ نیند میں آپ ﷺ سے کیا بات ہو رہی ہے یا آپ ﷺ خواب دیکھ رہے ہیں۔" ابنِ کثیر" اور "بخاری" میں ہے کہ جلیل القدر تابعی ابن ابی عمیر فرماتے ہیں کہ انبیاءؑ کا خواب وحی ہوتا ہے۔ علامہ سہیلی لکھتے ہیں "ملائکہ کرام رسولِ اکرم ﷺ کے پاس رات کو سوتے میں آئے، اس حالت میں حضورِ اکرم ﷺ کا قلب بیدار تھا اور آنکھیں سو رہی تھیں اور دل نہیں سو رہا تھا۔ اسی طرح انبیاءؑ کی آنکھیں سوتی ہیں اور قلب بیدار ہوتا ہے۔" فتح الباری میں ہے' خطابیؒ نے کہا کہ "اللہ کریم نے آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر نیند کو منع کر دیا تھا تاکہ اس وحی کو یاد رکھیں جو نیند میں نازل ہوتی ہے۔" یعنی نیند قلبِ اطہر ﷺ پر طاری نہیں ہوتی تھی۔ ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں آقائے نامدار ﷺ سے کہ" میں سو رہا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ یہ کنگن میرے ہاتھوں میں کیوں ہیں فَاُوۡحِیَ فِی الۡمَنَامِ ۔۔۔ مجھ پر خواب میں وحی کی گئی اَنِ انۡفُخۡهُمَا ۔۔۔ ان پر پھونک ماریں" (یہ اُڑ جائیں گے)۔ اس نیند سے آپ بیدار نہیں ہوئے تھے جب آپ پر وحی نازل ہوئی۔ نبیؑ کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ 'فتح الباری' میں ہے کہ انبیاءؑ پر جاگتے میں بھی وحی آتی ہے، سوتے میں بھی وحی نازل ہوتی ہے۔ نصِ قرآن سے حضرت اسماعیلؑ کا یہ عقیدہ ثابت ہوا کہ انبیاءؑ کا خواب وحی ہوتا ہے۔ حدیث و آثارِ صحابہؓ سے یہی عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ تابعین کا بھی یہی عقیدہ تھا، فقہائے امت اور تمام امت کا یہی عقیدہ ہے جیسا کہ 'روض الانف' کی عبارت میں کَذٰلِكَ ۔۔۔ سے واضح ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انبیاءؑ کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا تو جس رات فجر کی نماز قضا ہوگئی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار نہیں ہوئے، حضرت بلالؓ بھی سوتے رہے، انہوں نے بھی اذان نہیں دی۔ تو جب قلب اطہر بیدار تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے کیوں نہیں؟ اُس رات جسے لیلۃ التعریس کہتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام صحابہؓ کی نماز فجر قضا ہوگئی تو نوم انبیاءؑ میں اگر قلوب غافل نہیں ہوتے تو وقتِ نماز، وقتِ طلوعِ شمس معلوم کر لیتے۔ اگر قلب اطہر پر نیند نہیں تھی تو قلب اطہر کو پتہ چل جانا چاہیے تھا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرتؒ فرماتے ہیں کہ سورج چشمِ ظاہری کے مدرکات (جن کا ادراک کیا جائے، جن کی سمجھ آئے کہ یہ کیا ہیں) میں سے ہے۔ سورج کو ظاہری آنکھ دیکھتی ہے۔ مدرکات دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جنہیں مادی آنکھ دیکھتی، سمجھتی ہے۔ دوسرے وہ جنہیں دل کی آنکھ دیکھتی ہے، مادی آنکھ نہیں۔ اب سورج ہے، درخت ہے، آسمان ہے یا زمین، یہ دیکھنا چشمِ ظاہری کا کام ہے۔ یہ سب مدرکاتِ چشمِ ظاہری ہیں اور تعطلِ چشم سے اس کے مدرکات میں تعطل آئے گا آنکھ بند ہوگی تو کہاں نظر آئے گا۔ اور نیند میں انبیاءؑ کی آنکھ بھی بند ہو جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تَنَامَانِ عَيْنَيَّ... ''میری آنکھیں سو جاتی ہیں'' تو مدرکاتِ ظاہری تو انبیاءؑ کے بھی بند ہو جاتے ہیں لیکن قلب اطہر جاگتا رہتا ہے اور جو مدرکاتِ قلب ہیں ان میں خطا نہیں ہوتی۔ یعنی وحیِ الٰہی آتی ہے یا خواب آتا ہے جو وحیِ الٰہی ہی ہوتا ہے، اسے یاد رکھنے میں کوتاہی یا خطا نہیں ہوتی۔ اب آفتاب قلب کے مدرکات میں تو نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ استغراق میں قلب ماسوا اللہ کے منقطع ہو جاتا ہے۔ انوارات وتجلیات میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ قلب متوجہ الی اللہ ہوتا ہے، باقی چیزوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔

اگلا اعتراض یہ ہے کہ استغراق کا ذکر حدیث شریف میں نہیں یعنی لیلۃ التعریس کے بارے میں جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان میں تو استغراق کا لفظ نہیں آیا۔ حضرتؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں، ''اثر سے موثر پر استدلال غلط ہے۔'' یعنی ایک آدمی کو چوٹ لگی ہے یہ اثر ہے، اب یہ نہیں کہہ سکتے (چوٹ کو دیکھ کر) یہ چوٹ لاٹھی کی ہے یا ڈنڈے کی، ڈنڈے کا سائز کیا تھا، وہ ڈنڈا کون سا تھا، وغیرہ۔ نیند سے نماز کا قضا ہو جانا ایک اثر ہے، اس سے آپ یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ اس کا سبب استغراق تھا یا نہیں۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور حدیث کے بیان سے ملے گا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہیں کہ ''میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔'' اس حدیث کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ اس کا سبب استغراق ہے یا نیند ہے۔

اگلا سوال ہے کہ اگر قلب کی غفلت تسلیم نہ کی جائے تو خدا سے شرک لازم آتا ہے۔

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ... (البقرہ:۲۵۵) یہ تو اللہ کی صفت ہے کہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ آپ کہتے ہیں کہ قلب ذاکر ہو جائے تو اسے کبھی نیند نہیں آتی، وہ کبھی بند نہیں ہوتا، تو یہ تو اللہ سے شرک ہوگا؟

جواب: اعلیٰ حضرتؒ ارشاد فرماتے ہیں، قرآن مجید سے ثابت ہے کہ فرشتوں کو نیند نہیں آتی، يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ... (الانبیا:۲۰) فرشتے رات دن اللہ کی تسبیح کرتے ہیں کوئی کوتاہی (ذکر الٰہی میں) نہیں کرتے۔ اس کا مطلب ہے کہ فرشتے رات اور دن میں کبھی بھی نہیں سوتے۔ 'احیاء العلوم' کی جلد ۳، صفحہ ۱۳۱ پر ہے کہ ''یہ اوصاف سلبیہ ہیں اور اوصاف سلبیہ میں مماثلت پر شرک لازم نہیں آتا۔ آنکھیں خود حادث ہیں، حادث مسبوق بالعدم (فانی چیز) کو خالق کل سے کیا

Scanned with CamScanner

نسبت۔" آنکھیں بجائے خود فنا ہونے والی چیز ہیں۔ ایسی چیز جسے فنا ہو جاتا ہے، معدوم ہو جاتا ہے اسے اللہ سے کیا نسبت۔
حدیث میں استغراق کے مذکور نہ ہونے سے رسول اللہ ﷺ کی نیند کو غفلت نماز کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ حدیث شریف میں غفلت نومی کو بوجہ شیطان بیان کیا گیا ہے۔ کیا نبی اکرم ﷺ کی غفلت نماز کا سبب نیند ہو سکتی ہے؟
دراصل بات یوں ہے کہ تعلیم امت کے لیے وہ نماز قضا ہوئی۔ اس میں امت کو قضا نماز ادا کرنے کا سلیقہ سکھایا گیا۔ انبیاءؑ پر وہ کیفیات آتی ہیں جن سے تعلیم امت مراد ہوتی ہے۔ لیلۃ التعریس کے معاملے میں حضور اکرم ﷺ کی طرف غفلت کی نسبت کرنا صریحاً بے ادبی اور گستاخی ہوگی۔

مراقبات کی حقیقت

مراقبۂ احدیت کا مفہوم اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے مقابلے میں تمام عالم معدوم ہے۔

پناہِ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

مراقبۂ معیت میں سوچے کہ ہر جگہ ذات باری تعالیٰ حاضر و ناظر ہے، صرف باعتبارِ علم کے نہیں بلکہ باعتبار ذات کے میرے ساتھ ہے، اس کی ہیبت اپنے قلب پر طاری رکھے۔
مراقبۂ اقربیت میں قرب ذات کے وجود کا خیال رکھے کہ وہ باعتبار ذات کے قریب اور باعتبار وجدان کے بعید ہے۔

مراقبات کی حقیقت

مراقبۂ احدیت میں سالک پر جو کیفیت وارد ہوتی ہے وہ یوں ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ کے علاوہ تمام عالم کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اور وہ پوری طرح متوجہ الی اللہ ہو جاتا ہے۔

پناہِ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

جیسا کہ اس فارسی شعر میں کہا گیا ہے کہ ہر بلندی اور پستی کی پناہ تیری ذات ہے اور حقیقی ذات اللہ کی ہے، باقی کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ یہیں سے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا فلسفہ پیدا ہوا۔ شیخ ابن العربی نے وحدت الوجود کی اصطلاح دی۔ مراد یہ تھی کہ حقیقی وجود قائم بالذات اللہ کا ہے۔ یعنی اللہ کا وجود اپنی ذات سے قائم ہے۔ اللہ کے سوا باقی جتنے وجود ہیں، عرش و فرش، زمین و آسمان یعنی تمام مخلوق اللہ کے قائم رکھنے سے قائم ہے۔ وہ جسے مٹا دے، وہ مٹ جاتا ہے، ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آگے چل کر اس فلسفے کو سمجھنے میں لوگ ٹھوکر کھا گئے۔ وحدت الوجود کا مطلب اصل کے الٹ بنا دیا گیا۔ کہا جانے لگا کہ ہر چیز میں

Scanned with CamScanner

اللہ موجود ہے، ہر چیز ہی اللہ ہے۔

پھر مجدد الف ثانی ؒ نے اس نظریئے کی اصلاح فرمائی۔ انہوں نے وحدت الوجود کی جگہ وحدت الشھود کا نظریہ پیش کیا کہ کائنات کی ہر چیز قدرتِ باری پر گواہ ہے۔ ساری مخلوق اس کی عظمت پر گواہ ہے۔ ذاتی طور پر کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں، اللہ کے قائم رکھنے سے سب کچھ قائم ہے۔

مراقبۂ احدیت میں یہ کیفیت وارد ہوتی ہے اور اسی پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے کہ حقیقی وجود صرف ذاتِ باری کا ہے۔

مراقبۂ معیت میں سوچے کہ ذاتِ باری تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ...(الحدید:۴) اللہ تمہارے ساتھ ہے، تم جہاں بھی ہو جس حال میں بھی ہو۔ اس مراقبہ میں کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اللہ ہر جگہ باعتبارِ ذات موجود ہے۔ یہاں بھی علمائے ظواہر نے ایک نئی اصطلاح نکالی ہے کہ اللہ اپنے علم کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے یعنی وہ جانتا ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اللہ نہ جانے کہاں ہے لیکن وہ دیکھ رہا ہے، وہ جانتا ہے۔ باعتبارِ علم کے موجود ہونا تو ایسے ہی ہے جیسے ہم یہاں بیٹھے ہیں لیکن دور تک جو کچھ نظر آ رہا ہوتا ہے اس کے متعلق ہمیں علم ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات کو کسی جگہ مقید نہیں کیا جا سکتا، وہ ہمہ وقت، ہر جگہ ذاتی طور پر موجود ہے۔ اس چیز کو محسوس کرنا چاہیے اور جو کیفیت از خود وارد ہوتی ہے وہ اسی طرح سے ہوتی ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ میرا اللہ ہر وقت، ہر جگہ میرے ساتھ ہے اور اس کا اثر پوری عملی زندگی پر ہوتا ہے کہ وہ گناہ سے پرہیز کرتا ہے اور اللہ کی اطاعت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد مراقبۂ اقربیت ہے۔ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ...(قٓ:۱۶)۔ "اور ہم اس کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں"۔ یہ مراقبہ اس آیتِ کریمہ کے تابع کیا جاتا ہے۔ اب بدنِ انسانی میں ڈھائی کھرب سے بھی زیادہ سیل (خلیے) موجود ہیں۔ ہر خلیے کی اپنی موت و حیات ہے۔ ہر سیل میں مثبت منفی اجزا موجود ہیں۔ نئے سیل پیدا ہوتے ہیں، پرانے مرتے رہتے ہیں۔ چھ مہینے میں پورا جسمِ انسانی تبدیل ہو جاتا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ ہر سیل میں ایک کتاب موجود ہے جس میں اس شخص کی پوری زندگی کا نصاب درج ہے۔ حتیٰ کہ سائنسدان دعویٰ کرتے ہیں کہ ہر سیل کے DNA میں یہ تک درج ہے کہ کس عمر میں انسان کا پہلا بال سفید ہوگا، کب اس کی بینائی میں فرق آئے گا۔

تو جو ہستی اتنے چھوٹے چھوٹے سیل تخلیق کرتی ہے اور اتنی باریک بینی سے اسے زندگی کا پہلے سے لکھا ہوا روزنامچہ بنا دیتی ہے وہ انسان کے کتنے قریب ہوگی۔ اسی لیے فرمایا گیا، وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ... تو وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔ مراقبۂ اقربیت میں اس کے بے حد قُرب کی کیفیت وارد ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ ہم پڑھ کر یا سن کر مانتے ہیں، پڑھ سن کر علم حاصل کرنا اور شئے ہے بالکل ایسے ہی جیسے کسی کو علم ہو کہ آگ جلا دیتی ہے لیکن اگر کوئی آگ سے جل جائے تو وہ کیفیت اس علم سے زیادہ شدید اور یقینی ہوتی ہے۔ اسی طرح مراقبات کی کیفیات کا علم ہونا اور بات ہے لیکن کیفیات کا تجربہ بالکل اور چیز ہے۔ اس آیہ مراقبہ کی تلاوت کرتے ہوئے سالک واقعی محسوس کرتا ہے کہ اللہ ہر شئے کی نسبت مجھ سے زیادہ قریب ہے اور یہاں یہ خیال رکھے کہ وہ باعتبارِ ذات کے قریب ہے اور باعتبارِ وجدان (سمجھ) کے بعید ہے

Scanned with CamScanner

یعنی اس کی ذات ہر سیل سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن باعتبار وجدان کے ہم اُسے دیکھ لیں یا محسوس کر لیں یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ وہ خالق ہے، ہم مخلوق۔ میرے محسوسات، میری سوچ کی رسائی اس تک نہیں ہے۔ ہماری سوچ سمجھ ہمارے پانچ حواسوں میں مقید، ہمارا علم محدود، ہمارے محسوسات فانی ہیں۔ وہ لافانی وقدیم ان میں کیسے سما سکتا ہے؟ لیکن وہ ذاتی طور پر بہر طور ہمارے قریب ہے۔ ان تینوں مراقبات کو مراقبات ثلاثہ کہتے ہیں۔

دوائر ثلاثہ

ان مراقبات میں اس کی مشق کرائی جاتی ہے کہ غیر اللہ کی محبت دل سے دور کر دے۔ وہ ذات محبت اختیاری میں غیر کی شرکت پسند نہیں کرتی کیونکہ یہ شرک فی المحبت ہے۔

دوائر ثلاثہ

مراقباتِ ثلاثہ کے بعد دوائرِ ثلاثہ ہیں۔ انہیں دوائرِ محبت کہا جاتا ہے۔ ان کی تسبیح یہ آیۂ کریمہ ہے:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ۔۔۔(المائدہ: ۵۴) ''اللہ اُن سے محبت کرتے ہیں اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔''

انسان ان اشیاء یا ان ہستیوں سے تو محبت کر سکتا ہے جنہیں وہ دیکھ اور پہچان سکتا ہے۔ اب اللہ کریم خالق ہے اور مخلوق کے احاطۂ علم سے ماورا ہے تو انسان اس سے کس طرح محبت کر سکتا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ کریم نے عطا فرمایا ہے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔۔۔(آلِ عمران: ۳۱)

''اگر تم اللہ سے محبت کے طالب ہو تو میرا اتباع کر لو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔''

محبت ہمیشہ بے لوث اور بے غرض ہوتی ہے۔ اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنا جواب حاصل کرتی ہے۔ اگر انسانی جذبہ محبت جواب چاہتا ہے تو پھر اللہ کی محبت کا کیا رنگ ہوگا؟ اسی لیے ارشاد ہے کہ اللہ اُن سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیا لوگ ہوں گے جن سے اللہ کریم محبت کرتا ہے اور وہ کیا جذبہ ہوگا کہ وہ اللہ کریم سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ! اللہ! یہ کرنے کے کام ہیں، باتوں سے سمجھنے سمجھانے کے نہیں۔ ہاں اللہ کریم اس کا کوئی ذرہ بھی عطا کر دیں تو بات بن جاتی ہے۔

سیر کعبہ

اس مراقبہ میں یہ احتیاط ہوتی ہے کہ سالک یہ خیال نہ کرے کہ ان پتھروں کا مراقبہ کر رہا ہوں، کعبہ کی حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔

وَالْبَيْتُ عِبَارَةٌ عَنْ لَطِيفَةٍ رَبَّانِيَّةٍ فِيْ بُعْدٍ مَوْهُوْمٍ مَهْبَطِ التَّجَلِّيَاتِ الذَّاتِيَّةِ

Scanned with CamScanner

فَمُخْتَصَّةٌ بِهٖ... فَصُوْرَةُ الْكَعْبَةِ مَعَ كَوْنِهَا مِنْ عَالَمِ الْخَلْقِ اَمْرٌ مُبْطِنٌ لَا يُدْرِكُهُ حِسٌّ وَلَا خَيَالٌ بَلْ هُوَ مَعَ كَوْنِهٖ مِنَ الْمَحْسُوْسَاتِ لَيْسَ بِمَحْسُوْسٍ وَ كَوْنِهٖ فِيْ جِهَةٍ لَيْسَ لَهٗ جِهَةٌ مُتَمَثِّلٌ وَ لَا مِثْلَ لَهٗ هٰذَا شَانُ صُوْرَتِ الْكَعْبَةِ ... وَ حَقِيْقَةُ الْكَعْبَةِ...
(تفسیر مظہری، ۲:۱۰۱)

"بیت اللہ عبارت ہے لطیفۂ ربانیہ سے جو بُعدِ موہوم ہے جو مہبطِ تجلیاتِ ذاتیہ فیہ ہے جو اسی سے مختص ہیں۔ پس صورتِ کعبہ کہ باوجودیکہ عالمِ خلق سے ہے، باطن ہے جس کو حس اور خیال نہیں سمجھ سکتے۔ باوجودیکہ محسوسات میں سے ہے مگر محسوس نہیں، اور جہت میں ہے مگر اس کے لیے جہت نہیں، اور وہ متمثل ہے مگر اس کی مثال نہیں۔ یہ ہے شان کعبہ کی اور یہ ہے حقیقت بیت اللہ کی۔"

جب یہ مراقبہ راسخ ہو جاتا ہے تو استعداد کے بعد سالک کو کعبۂ ملائکہ بیت العزۃ اور بیت المعمور کا مراقبہ کرایا جاتا ہے اور تجلیاتِ انوارِ الٰہی کعبہ سے لے کر عرش تک نظر آتی ہیں۔

سیرِ کعبہ

اس مراقبہ کی کیفیات کیا ہیں۔ اس ضمن میں اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ سالک یہ خیال نہ کرے کہ ان پتھروں کا مراقبہ کر رہا ہے۔ اس معاملے میں سخت احتیاط لازم ہے کیونکہ حقیقتِ کعبہ کچھ اور ہے۔ 'تفسیر مظہری' میں حقیقتِ کعبہ سے متعلق عبارت حضرتؒ نے نقل فرمائی ہے اس کا سادہ اور آسان سا مطلب یہ ہے کہ کعبہ ان پتھروں کا نام نہیں ہے بلکہ یہ مکان، پتھر اس مقام کی نشاندہی کرتے ہیں جو اللہ کی تجلیات کا مرکز ہے۔ جو پتھر بیت اللہ میں لگے ہوئے ہیں اگر یہی پتھر اکھیڑ لے جائیں اور ایسی ہی عمارت کسی اور جگہ بنا دی جائے تو وہ بیت اللہ یا کعبہ نہیں بنے گا، یعنی کعبۃ اللہ اس خاص مقام کا نام ہے۔ رُوئے زمین پر یہ واحد مقام ہے جو ذاتی تجلیات کے نزول کا مرکز ہے، جہاں اللہ کی ذاتی تجلیات ہوتی ہیں اور یہ تجلیاتِ ذاتی اسی بیت اللہ سے مختص ہیں یعنی کہیں اور پائی نہیں جاتیں۔ اللہ کی تجلیات بے شمار ہیں، اس کی جتنی صفات ہیں، ہر صفت کی اپنی تجلی ہے اور ذاتی تجلیات بھی اُس کی ذات کے مطابق ہیں۔ کہیں وہ رحمت کرتا ہے، رحم فرماتا ہے تو تجلی رحمت کی ہوتی ہے۔ کہیں گرفت ہوتی ہے، غضب ہوتا ہے تو تجلی بھی اُسی طرح کی ہوتی ہے۔ اسی طرح بیت اللہ کی تجلی اسی کے ساتھ خاص ہے۔ یہ تجلی اس کی معبودیت ذاتی کی ہے جہاں وہ مخلوق کی عبادات کو قبول کرتا ہے۔ بظاہر نظر آ رہا ہے کہ ایک عمارت بنی ہوئی ہے یعنی بظاہر تو اس کی ایک صورت ہے لیکن یہ اس کی حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت اس صورت کے اندر ہے، یہ صورت اس مرکز کی نشاندہی کر رہی ہے۔ ایک دفعہ کچھ غیر مقلدین مجھ سے کہنے لگے کہ ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ غیر مقلدین کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کو وہم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ ہر بندہ ہی شرک میں ہے۔ بہرحال انہوں نے قرآن کریم کے ایک نسخے میں عقیدۂ توحید سے متعلق آیات کو خط کشیدہ کر رکھا تھا کہ جی ہم ان پر کچھ

Scanned with CamScanner

بیان کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا" ان آیات پر بحث کو چھوڑو، مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ سارے مسلمان ہی بت پرست ہیں"۔ حیران ہو کر پوچھا "وہ کیسے؟" میں نے جواب دیا کہ "ہندوؤں نے بت تراش کر انسانی صورت بنالی۔ آپ نے ویسے ہی پتھر لگا کر ایک عمارت بنالی۔ رُوئے زمین کے سارے مسلمان اسی کو سجدہ کیے جارہے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پتھر تراش کر شکل انسانی ہی بنائی جائے تو اسے ہی بت کہا جائے، جب ہم کعبہ کو سجدہ کر رہے ہیں تو وہ بھی بت نہیں؟" یہاں آ کر ان کا سارا علم ختم ہو گیا۔ بات بھی انہیں عجیب لگی۔ میں نے پھر کہا کہ عجیب بات ہے تو غور کرو، سوچو، جب سمجھ میں آجائے تو مجھے بتانا۔

حیرت ہے کہ یہ سادہ سی حقیقت ان پر آشکار نہیں ہو رہی تھی کہ ان پتھروں کو سجدہ کوئی نہیں کرتا، یہ پتھر مسجود خلائق نہیں ہیں۔ یہ اس مرکزِ تجلیات کی نشاندہی کر رہے ہیں جسے اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ اس حصۂ زمین پر قبولیتِ عبادت یا مسجودیت کی تجلیٔ ذاتی ہمہ وقت متوجہ رہتی ہے۔ یہ بات بظاہر آسان نہیں مگر سمجھ میں آجائے تو بہت سادہ ہے۔ تو سمجھ لینا چاہیے کہ کعبہ مخلوقات میں سے ہے، پتھر مخلوق ہیں لیکن اس کے اندر جو حقیقت ہے وہ تجلیٔ ذاتی ہے جو اسی سے مختص ہے، کہیں اور نہیں ملتی۔ اور باطناً یہ ایسا ہے کہ اسے حس اور خیال سمجھ نہیں سکتے۔ اس کی اصل حقیقت کو سوچ سمجھ یا پڑھ سن کر سمجھا نہیں جاسکتا۔ صرف اللہ اور رسول ﷺ کے بتانے پر ایمان لانا پڑے گا۔ ہمارے علم وفہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہے۔ کعبہ محسوس چیزوں میں سے ہے۔ ہم اسے ہاتھ لگاتے ہیں، لپٹ کر دعائیں مانگتے ہیں لیکن اس کی حقیقت محسوس نہیں کرتے کیونکہ یہ محسوس درو دیوار، حقیقت میں تجلیٔ ذاتی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ کعبہ جہت ہے یعنی ایک سمت ہے، ہم اس سمت منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن اس کی حقیقت کسی سمت میں مقید نہیں ہے۔ جنگل میں رات ہو جائے تو حکم ہے کہ جدھر اندازہ ہو کہ بیت اللہ ہے، ادھر منہ کر کے نماز پڑھ لے۔

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ... (البقرہ:۱۱۵)

جدھر منہ کرو گے، اللہ موجود ہے۔ کعبہ کی سمت سمجھ میں نہ بھی آئے تو سجدہ کرنا ہے، صلوٰۃ تو ادا کرنی ہے تو جدھر تمہارا دل کہتا ہے منہ کرلو۔ اس صورت میں خواہ پشت بیت اللہ کی طرف ہو جائے تو بھی صلوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ باوجودیکہ اس کی جہت ہے، مگر وہ جہت میں قید نہیں ہے۔ حج وعمرہ پہ جائیں تو وہ عمارت محسوس ہوتی ہے، نظر آتی ہے مگر مراقبہ سیر کعبہ میں حقیقتِ کعبہ نظر آتی ہے۔

منازل سالک المجذوبی

اس کے بعد مراقبۂ فنا وبقا کرایا جاتا ہے، اس کے بعد سالک المجذوبی کے منازل طے کرائے جاتے ہیں۔ خیال رہے کہ 'سالک المجذوب' اور 'مجذوب سالک' میں بڑا فرق ہے۔ سالک المجذوب متبع شریعت ہوتا ہے اور مجذوب سالک ظاہراً متبع شریعت نہیں ہوتا اس کے قوائے باطنی جل چکے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نابینا، یا بینا کو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر موٹر میں بٹھا کر پشاور سے لاہور لے جائیں، پھر اس سے راستے کی تفصیلات یا نشانِ راہ پوچھے جائیں تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا۔ اس لیے مجذوب سالک سے کسی کو فیض نہیں مل سکتا کیونکہ راستہ سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ مگر سالک المجذوب منازل طے کر کے جاتا ہے،

ایسے ہے جیسے آپ کے پڑھنے پڑھانے میں ابجد ہوتی ہے یعنی الف ب ج د۔

ولایت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ولایت کبریٰ اور ولایت صغریٰ۔ نبی تخلیقی طور پر نبیؐ ہوتا ہے۔ دنیا میں تشریف لانے کے بعد اعلانِ نبوت تک جب تک کہ اس پر نبوت کے منازل نہیں کھلتے، تب بھی اس کے پاس ایک ولایت ہوتی ہے جو انبیاءؑ کے ساتھ مختص ہے۔ اسے ولایت کبریٰ کہتے ہیں۔ یعنی وہ ولایت جو قبلِ بعثت انبیاءؑ کو نصیب ہوتی ہے۔ جو ولایت نبیؐ کا اتباع کرنے سے اولیاء اللہ کو نصیب ہوتی ہے اسے ولایت صغریٰ کہا جاتا ہے، تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ولایت صغریٰ کی انتہا مقامِ تسلیم ہے۔ مقامِ تسلیم عالمِ امر میں ہے۔ احدیت پہلے عرش کی ابتدا ہے، اُس کا دروازہ ہے، پھر نو عرش ہیں اور بہت وسیع ہیں۔ حضرتؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے کوشش کی ہے کہ پہلے عرش کے منازل گنوں، فرماتے تھے کہ میرے اندازے میں کم و بیش سوا لاکھ منازل پہلے عرش کے اندر ہیں۔ ہر منزل کے درمیان فاصلہ کتنا ہے، اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اگر مسجدِ نور پر کھڑے ہو کر دیکھیں جہاں سے آگے پہلی منزل آتی ہے تو ایسے نظر آتا ہے جیسے زمین سے دور ہلکا سا ستارہ ٹمٹماتا نظر آتا ہے۔ اس کا فاصلہ تو ناپنا ممکن نہیں کیونکہ وہ نظر روح کی ہوتی ہے جبکہ ہم ظاہری آنکھ سے آسمان پر ستارے دیکھتے ہیں۔ بدن کی آنکھ اور روح کی آنکھ میں بڑا فرق ہے اور وہ منزل روح کی آنکھ سے تارے جیسی دکھائی دیتی ہے، اور پھر ہر منزل کا فاصلہ پہلی منزل کی نسبت بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح سوا لاکھ منازل پہلے عرش میں آتی ہیں۔ یہیں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی وسعت کا عالم کیا ہوگا۔ پھر اس کے اور دوسرے عرش کے درمیان خلا ہے۔ پھر دوسرے عرش کے منازل ہیں، اور یہ یاد رکھیں کہ ہر اوپر والی منزل کا دائرہ پہلی منزل سے بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ یہ شیخ کامل ہی ہوتا ہے جو روح کو صحیح راستے پر آگے لے جاتا ہے ورنہ تو احدیت پر ہی لوگوں کی عمریں تمام ہو گئیں کیونکہ احدیت کا دائرہ بھی عالم کو محیط ہے اور عرشِ اول کی ابتدا ہے، لیکن عرش ساری کائنات کو محیط ہے۔ اگر شیخ توجہ دے تو وہ اسے سیدھا نکال کر عبور کرا دیتا ہے ورنہ روح میں قوت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے تھوڑا سا دائیں ہوا پھر بائیں ہوا، یونہی چلتا چلتا ساری عمر اسی دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ ساری عمر سفر کرتا رہتا ہے سمجھتا ہے ترقی ہو رہی ہے لیکن جب موت آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ میں اسی دائرے میں سرگرداں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مقامِ احدیت پر دیکھیں گے کہ بڑی بڑی عمریں گزار کر بڑے بڑے بزرگ بیٹھے ہیں۔ 'معیت' پر بھی اسی طرح بے شمار مخلوق ہے، اسی طرح 'اقربیت' پر بھی ہے۔ یہ بے شمار لوگ جن کی زندگیاں وہیں بسر ہو گئیں، ساری زندگی اللہ اللہ بھی کرتے رہے، محنت مجاہدہ بھی کرتے رہے، اللہ نے قبول بھی فرمایا لیکن کوئی ایسا نہیں ملا جو اس سے آگے نکال دیتا۔ یہ سب شیخ کی توجہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ تو فرمایا، تسلیم سے آگے ولایت انبیاءؑ شروع ہوتی ہے جسے ولایت کبریٰ کہتے ہیں۔ ہم ولایت کے منازل کی تفصیل بیان کر دیتے اور ہر مقام کی نشاندہی بھی مگر ایک قابل ہستی نے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا اور وہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ اس تحریر سے فائدہ اٹھا کر کوئی جھوٹا مدعی، ولایت کے مقامات کا نام بتا کر اور اپنی ولایت کا سکہ جما کر اللہ کے بندوں کو گمراہ نہ کرتا رہے۔

ولایت اولیاء کی تو ایک حد ہے، اور آگے جب ولایت انبیاءؑ شروع ہوتی ہے تو یہاں ایک فرق ہے۔ ولی اللہ کو بھی ولایت انبیاءؑ نصیب ہوتی ہے، اس میں جا سکتا ہے لیکن اس حیثیت سے کہ جس طرح شاہی خادم شاہی محل میں یا شاہی دربار میں

Scanned with CamScanner

جاتا ہے لیکن وہ محل اس خادم کا ذاتی تو نہیں ہو سکتا۔ محل تو بادشاہ کا ہی ہے مگر وہ وہاں بحیثیتِ خادم ہوتا ہے۔ جہاں تک ولایت اولیاء ہے، وہ مقامات اللہ تعالیٰ اس کے ذاتی بنا دیتا ہے کیونکہ وہاں تک اولیاء اللہ کی رسائی ہے۔ فرماتے ہیں "ولایت انبیاءؑ کی حد اور انتہا نہیں۔" درحقیقت سلوک کی کوئی انتہا ہے ہی نہیں کیونکہ سلوک عبارت ہے قربِ الٰہی سے اور قربِ الٰہی کی کوئی حد نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ یہاں پہنچے اور اللہ کریم یہ بیٹھے ہیں، بس کام ختم۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ایسی کوئی حد نہیں آتی لہٰذا ولایت کی کوئی حد نہیں اور یہ درجات زندگی میں نصیب ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ چاہے تو برزخ میں بھی، میدانِ حشر میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے اور جنت میں اہلِ جنت کی ترقی مسلسل ہوتی رہے گی۔ جنت کا تو یہ عالم ہے کہ جنتی کے ہر لقمے کی لذت پہلے لقمے سے زیادہ ہوگی۔ جنت کی نعمتیں کسی ایک حال یا درجے پر ٹھہر نہیں جائیں گی۔ اسی طرح ہر لحہ، ہر آن، قربِ الٰہی، تجلیاتِ باری کی لذتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

انسان کا مزاج ایسا ہے کہ جنت بھی ایک حال پر ٹھہر جائے تو یہ دوسرے دن اکتا جائے گا کہ یار کیا مصیبت ہے وہی کھانا ہے، وہی سب کچھ ہے۔ بنی اسرائیل کو من و سلویٰ ملتا تھا، جلد ہی اکتا گئے۔ کہنے لگے یا اللہ! ہمیں کوئی دال ساگ اُگا نے دے، ہم تو مر گئے یہ حلوہ گوشت کھا کھا کے۔ اسی طرح جنت میں کسی حال میں یکسانیت آجائے تو انسان تو شاید وہاں بھی اکتا جائے۔ اس لیے جنت میں بھی لذتیں اور نعمتیں ایک درجہ یا حال پر نہیں رکیں گی، وہاں ہر لحہ ترقی ہوتی رہے گی۔ عنایاتِ الٰہی میں بھی، قربِ الٰہی میں بھی۔ تو یہی ولایت ہے یعنی قربِ الٰہی کا حصول کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ لہٰذا ولایت کسی ایک مقام پر جا کر ختم نہیں ہو جاتی۔

ولایتِ اولیا کے منازل طے کرنے کے لیے چند شرائط

ان منازل و مقامات کے طے کرنے کے لیے پانچ شرائط ہیں:

(۱) شیخ کامل و اکمل اور صاحبِ تصرف ہو جو توجہ دے کر سالک کو اس راہ پر چلاتا جائے مگر اس کے لیے کافی عرصہ تک دوام صحبتِ شیخ لازمی ہے۔ گاہے گاہے توجہ اور صحبتِ شیخ سے تو ولایتِ صغریٰ کے منازل طے ہونے سے رہے۔

(۲) کسی کامل کی روح سے رابطہ پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ مبتدی کا کام نہیں، البتہ بعض منازل طے ہونے کے بعد ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کامل کے مزار پر جا کر اس کی روح سے رابطہ قائم کر کے فیض حاصل کرے۔ اس کے لیے بھی مسلسل کافی عرصہ تک محنت کرنے کی ضرورت ہے جس طرح زندہ شیخ کی صورت میں مسلسل توجہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۳) قبر پر جانے کی بجائے روحانی طور پر رابطہ قائم کر کے فیض حاصل کرے۔

نوٹ: فیض سے مراد وہ روحانی تربیت ہے جو اہل اللہ سے حاصل کی جاتی ہے، جہلاء والا فیض نہیں کہ قبروں کا طواف کرتے رہیں، قبروں پر سجدے کرتے رہیں، یا ندا غائبانہ کرتے رہیں اور انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے رہیں۔

(۴) شیخ زبردست جذبے کا مالک ہو، مقناطیسی قوت رکھتا ہو، اس کے انوار میں اتنی طاقت ہو کہ سالک کی روح کو اپنے انوار کے ذریعے کھینچ کر لے جائے اور توجہ غیبی سے روحانی طور پر سالک کی تربیت کر سکے۔

Scanned with CamScanner

(۵) سالک اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے درمیان نسبت پیدا ہوجائے جس کی وجہ سے سالک کو اس طرح فیض ملے جیسے انبیاء علیہم السلام کو براہ راست فیض ملتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا مگر ولی اللہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ ہوگا، یعنی اسے یہ فیض بواسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ملے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے فیض حاصل کرے گا۔

آخری دو شعبوں میں جن حضرات کا ذکر کیا گیا ہے، اس قسم کے آدمی صدیوں کے بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام تو عام آتے رہے مگر اولوالعزم رسول قلیل بلکہ اقل۔ اسی طرح ایسے آدمی بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی غوث، قیوم، فرد یا قطب وحدت ہوتے ہیں، ان کے بلند مناصب کی وجہ سے ان کی توجہ اور فیض رسانی میں بڑا فرق ہے۔ قیوم کی ایک توجہ غوث کی سو توجہ کے برابر ہوتی ہے، اور اسی طرح سے سلسلہ آگے چلتا ہے۔ قیوم، فرد اور قطب وحدت دراصل اولوالعزم رسولوں کے مناصب ہیں، ان تینوں کی شان اولیا میں اس طرح ہوتی ہے جس طرح انبیائے کرام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابرہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔

ان انتہائی بلند منازلِ سلوک میں سب سے اونچا درجہ صدیقیت ہے۔ ان کی ترتیب یوں ہے غوث، قیوم، فرد، قطب وحدت اور صدیق۔ ان مناصب پر صحابہ کرامؓ تو کافی تعداد میں تھے، مگر بعد میں بہت ہی قلیل لوگوں کو یہ منصب عطا ہوئے مگر خیال رہے کہ ان مناصب میں بظاہر برابری کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم پلہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ ان کی فضیلت نص سے ثابت ہے۔

قطب وحدت میں تین امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں:

(۱) اگر کوئی آدمی رات دن مسلسل اس کی صحبت میں رہے تو القا کیے بغیر اس کے لطائف منور ہوجاتے ہیں بلکہ منازلِ سلوک بھی شروع ہوجاتے ہیں۔

(۲) اس کا کوئی تربیت یافتہ اس کی اجازت کے بغیر بھی اگر کسی کو لطائف کرانا شروع کردے تو دوسرے آدمی کے لطائف منور ہوجاتے ہیں بلکہ صرف لطائف والا شاگرد بھی کسی کی تربیت شروع کردے تو اسے ضرور فائدہ پہنچتا ہے۔

(۳) صدیق اور نبی میں اتنا قریبی اتصال ہے کہ جہاں صدیقیت ختم ہوتی ہے، وہاں سے نبوت شروع ہوتی ہے۔

كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ...(النساء:۶۹)

"اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین۔" اور

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا...(مریم:۴۱)

"اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجیے وہ صدیق اور نبی تھے۔"

Scanned with CamScanner

صدیقیت سے بلند تر ولایت کا کوئی مرتبہ نہیں، اس کے بعد منازلِ نبوت شروع ہوتے ہیں جن میں کسی ولی کا عارضی طور پر داخل ہونا تو ممکن ہے، جیسے کوئی معمولی خادم بادشاہ کے حکم سے شاہی محل میں کسی خدمت کے لیے چلا جائے مگر مستقل مقام اور مستقر کے طور پر ان منازل میں جانا کسی ولی کے لیے ممکن نہیں۔

كَلَامُنَا إِشَارَاتٌ وَ بَشَارَاتٌ وَ اَسْرَارٌ وَ كُنُوزٌ وَ رُمُوزٌ لَا نَصِيبَ لِلْاَ كْثَرِ فِيْهَا اِلَّا اَنْ يُؤْمِنُوْا بِهَا بِحُسْنِ الظَّنِّ فَيَنْتَجُ اِيْمَانُهُمْ ثَمَرَاتٍ تَضَعُ لَهُمْ وَلَا يُؤْمِنُ بِهَا اِلَّا مَنْ اٰمَنَ بِقُدْرَةِ الْقَادِرِ وَبِحِكْمَةِ الْحَكِيْمِ...

"ہماری باتیں حقیقت کی طرف اشارے ہیں، بشارتیں ہیں اور اسرار ہیں۔ ان سے فائدہ صرف وہی اٹھا سکتا ہے جو حسنِ ظن کے ساتھ ان پر یقین رکھے، صرف اسی صورت میں اس کا یقین نتیجہ خیز ہو سکتا ہے اور ان پر یقین وہی رکھ سکتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمت پر ایمان ہو۔"

ولایتِ اولیاء کے منازل طے کرنے کے لیے چند شرائط

ولایتِ اولیاء کی منازل طے کرنے کے لیے پانچ شرائط ہیں:

۱۔ شیخ ایسا ہو جس نے ایک تو مکمل صحیح طریقے سے خود سلوک حاصل کیا ہو، دوسرے وہ اگلے شخص کو کرا بھی سکتا ہو۔ ایک آدمی پڑھ لیتا ہے اس کے پاس علم ہوتا ہے لیکن وہ پڑھا نہیں سکتا۔ ایک آدمی پڑھا سکتا ہے، مدرس بہت اچھا ہے لیکن جلسے میں تقریر نہیں کر سکتا۔ تو شیخ ایسا ہو جو خود بھی کامل و اکمل ہو، اس نے کسی کامل شیخ سے یہ نعمت حاصل کی ہو۔ پھر صاحبِ تصرف بھی ہو یعنی اس میں یہ کمال بھی ہو کہ وہ دوسرے کو منتقل کر سکتا ہو، توجہ دے کر سالک کو اس راہ پر چلاتا جائے۔ مگر چونکہ یہ عمل انعکاسی ہے اس لیے جتنا شیخ کی صحبت میں رہے گا، جتنا قریب رہے گا اتنا زیادہ فائدہ پائے گا۔ کبھی کبھار ملنے سے تو اتنا زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔

۲۔ کسی کامل کی روح سے رابطہ ہو جائے یعنی جو فیض اولیاء اللہ کی ارواح سے لیا جاتا ہے، لیکن یہ مبتدی کے بس کا کام نہیں۔ ابتدائی منازل طے ہونے کے بعد جب اتنی تربیت ہو جائے کہ اس کی برزخ میں رسائی ہو جائے، کلام بالارواح نصیب ہو جائے، پھر کسی کامل کی روح سے رابطہ ہو جائے تو وہ بھی اسے منازل کرا سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کامل کے مزار پر جا کر اس کی روح سے رابطہ قائم کر کے فیض حاصل کرے۔ اس کے لیے بھی مسلسل کافی عرصہ تک محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح زندہ شیخ کی صورت میں مسلسل توجہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ تیسری صورت اخذِ فیض کی یہ ہے کہ قبر پر جانے کی بجائے سالک روحانی طور پر رابطہ کر کے فیض حاصل کرے۔ لیکن یاد رہے کہ فیض سے مراد وہ روحانی تربیت ہے جو اہل اللہ سے لی جاتی ہے۔ جہلاء والا فیض نہیں کہ قبروں پر طواف و سجدہ کریں، ان کو حاجت روا سمجھیں۔ یہاں ہمارے ایک دوست نے اپنے ٹرکوں پر لکھوا رکھا ہے "فیضانِ باہو" وہ ان

Scanned with CamScanner

ڈکوں ہی کو باہوؒ کا فیضان سمجھتے ہیں۔

۴۔ مسکین اور کمزور شخصیت کا مالک شیخ نہیں بن سکتا۔ شیخ صاحب جرأت اور بقول حضرتؒ اعلیٰ جذبے کا مالک ہو۔ ایک مقناطیسی قوت رکھتا ہو۔ ایسا جاذب کہ انسان سامنے آئے تو اس کا الگ ہونے کو دل نہ چاہے۔ اس کے انوارات میں اتنی طاقت ہو کہ وہ سالک کی روح کو اپنے انوارات سے کھینچ کر لے جائے اور سالک دور بھی ہو تو توجہ غیبی سے روحانی طور پر سالک کی تربیت کر سکے۔ ایسی نابغۂ روزگار ہستیوں سے ملاقات بھی رہے تو بہت فائدے کی بات ہے۔ ملاقات نہ بھی ہو تو ان کی توجہ تربیتِ غیبی کرتی رہتی ہے بشرطیکہ سالک کا اپنے شیخ کے ساتھ سچا کھرا تعلق ہو۔

۵۔ پانچویں شرط ہے کہ سالک اور اللہ کی ذات کے درمیان نسبت پیدا ہو جائے، اس کا مطلوب و مقصود محض اللہ کی ذات کا قرب حاصل کرنا ہو، اس بناء پر اس کے اور اللہ کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو جائے۔ اس تعلق کی وجہ سے سالک کو اس طرح فیض ملے جیسے انبیاءؑ کو براہِ راست فیض ملتا ہے۔ نبیؑ کی تربیت کوئی انسان نہیں کرتا، نہ ولایت میں نہ نبوت میں۔ انہیں براہِ راست اللہ سے فیض ملتا ہے۔ سالک جب ایک خاص مقام پر پہنچ جاتا ہے تو براہِ راست قدرتِ باری سے فیضیاب ہونے لگتا ہے اور من جانب اللہ اس کے منازل چلنا شروع ہو جاتے ہیں، لیکن یہاں ایک فرق ہے۔ انبیاءؑ کو براہِ راست فیض ملتا ہے کہ نبیؑ اور اللہ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ولی اور اللہ کے درمیان نبیؑ کی ذات اور اس کا اتباع واسطہ ہوتی ہے، یعنی ولی کو یہ فیض بواسطہ نبی کریم ﷺ ملے گا۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی جوتیوں کے صدقے فیضیاب ہوگا۔

آخری دو شعبوں میں جن حضرات کا ذکر کیا گیا ہے اس طرح کے آدمی صدیوں بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح انبیاءؑ تو عام آتے رہے لیکن اولوالعزم رسول گنتی کے چند ہیں۔ اسی طرح اس پایہ کے ولی بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ غوث، قیوم، فرد اور قطبِ وحدت کہلاتے ہیں۔ ان کے بلند مناصب کی وجہ سے ان کی توجہ اور فیض رسانی میں بڑا فرق ہے۔ قیوم کی ایک توجہ غوث کی سو توجہ کے برابر ہوتی ہے اور اسی نسبت سے سلسلہ آگے چلتا ہے۔ فرد، قیوم اور قطبِ وحدت دراصل اولوالعزم رسولوں کے مناصب ہیں۔ ان تینوں کی شان اولیا میں اس طرح ہوتی ہے جس طرح انبیاءؑ میں حضور اکرم ﷺ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ہے۔

قطب چار ہوتے ہیں، پانچ نہیں ہوتے۔ تین ہو سکتے ہیں، کوئی ایک آدھ فوت ہو گیا، دوسرا آنے تک تین رہ گئے، لیکن پانچ نہیں ہو سکتے۔ ان کے اوپر غوث ہوتا ہے۔ غوث رُوئے زمین پر ایک ہوتا ہے۔ پھر صدیوں بعد ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کریم ایسے بندے پیدا کر دیتا ہے جو غوث سے بھی ترقی کر جاتے ہیں۔ وہ قیوم کہلاتے ہیں اور قیوم ترقی کر جائے تو فرد کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ ان میں سے اعلیٰ منصب والے ولی کی توجہ اپنے سے کم منصب والے ولی کی توجہ سے سو گنا طاقتور ہوتی ہے۔ غوث جیسی اعلیٰ منصب والی ہستی اگر سو دفعہ توجہ کرے تو وہ قیوم کی ایک توجہ کے برابر ہوتی ہے۔ قیوم سو دفعہ توجہ کرے تو 'فرد' کی ایک توجہ کے برابر ہوتی ہے۔ فرد ترقی کر کے 'قطبِ وحدت' بنتا ہے۔ یہ مناصب میں آخری منصب ہے۔ قطبِ وحدت کی ایک توجہ 'فرد' کی توجہ سے سو گنا طاقتور ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس طرح ممتاز ہوتے ہیں جس طرح انبیائے کرامؑ میں نبی اکرم ﷺ، حضرت ابراہیمؑ

Scanned with CamScanner

اور حضرت موسیٰ ہیں۔

انتہائی منازلِ سلوک میں سے سب سے اونچا درجہ صدیقیت کا ہے۔ ان کی ترتیب کچھ یوں ہے۔ غوث، قیوم، فرد، قطبِ وحدت اور صدیق۔ ان مناصب پر صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد فائز تھی مگر بعد میں بہت ہی قلیل لوگوں کو یہ مناصب نصیب ہوئے۔ لیکن ایک بات بہر صورت پیشِ نظر رہے کہ کوئی ولی اللہ ان مناصب پہ پہنچ بھی جائے تو بھی وہ صحابہؓ کی شان کو نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قرآن سے ان کی شانِ صحابیت اور اعلیٰ مدارج ثابت ہیں۔ منصب کا نام ایک جیسا رہتا ہے لیکن ولی صحابیؓ کا خادم ہی رہتا ہے۔ اب سیدنا ابوبکر صدیقؓ بھی صدیق ہیں، جنہیں نبی اکرم ﷺ نے صدیق فرمایا۔ انبیاءؑ کے بعد روئے زمین پر ساری نسلِ انسانیت سے افضل انسان ہیں اور صدیق بھی ہیں مگر صدیقیت میں وہ بھی سیدنا ابراہیمؑ خلیل اللہ کے برابر نہیں ہو سکتے۔ حضرت ابراہیمؑ صدیق ہیں، نبی بھی ہیں اور خلیل اللہ بھی۔ اسی طرح ولی کو جب یہ مراتب ملتے ہیں جو صحابہؓ کو ملے تھے تو یہ بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ ولی، صحابیؓ کی جوتیوں کا خادم ہوتا ہے۔

قطبِ وحدت کے منصب تک کسی کی رسائی ہو جائے تو اس میں تین خاص باتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ قطبِ وحدت کی صحبت میں رہنے والے کو وہ توجہ نہ بھی دے تو بھی اس کے لطائف روشن ہو جاتے ہیں بلکہ منازلِ سلوک بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ کہ قطبِ وحدت کے شاگردوں کو باقاعدہ اجازت نہ بھی ہو تو اگر وہ کسی کو لطائف بتا کے شروع کرا دیں تو کرنے والے کے لطائف روشن ہو جاتے ہیں بلکہ صرف لطائف والا شاگرد بھی اگر کسی کی تربیت شروع کر دے اسے بھی ضرور فائدہ پہنچتا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہوں، توجہ دیتا ہے (ورنہ اس کے لیے عموماً صحبت شرط ہوتی ہے)۔ اس توجہ غیبی سے ان کے منازل بدستور طے ہوتے رہتے ہیں اور مراقبات آگے چلتے رہتے ہیں لیکن اس کے لیے ایک حد ہے۔ صدیق اور نبی کا قریبی اتصال ہے، یعنی صدیقیت نبوت سے یوں جڑی ہوئی ہے جیسے کوئی کسی کے پاؤں سے لپٹا ہوا ہو۔ جہاں سے صدیقیت ختم ہوتی ہے وہاں سے نبوت شروع ہوتی ہے، یعنی صدیق نبی کریم ﷺ کے اتنا قریب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انعام یافتہ لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے انبیاءؑ کے ساتھ ملحق ذکر صدیق کا کیا یعنی نبوت اور صدیقیت جڑی ہوتی ہے۔ جہاں صدیقیت کی انتہا ہے وہاں سے نبوت کی ابتدا ہوتی ہے۔ دوسری آیت میں ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا ''وہ صدیق اور نبی تھے۔'' صدیقیت سے بلندتر ولایت کا کوئی مرتبہ نہیں۔ اس کے بعد منازلِ نبوت شروع ہو جاتے ہیں جن میں کسی ولی کا عارضی طور پر داخل ہونا تو ممکن ہے جیسے کوئی معمولی خادم بادشاہ کے محل میں اس کے حکم سے بغرضِ خدمت چلا جائے مگر مستقل قیام یا ذاتی ٹھکانے کے طور پر ولی کا ان منازل میں رہنا ممکن نہیں۔

اس سے آگے حضرتؒ نے عربی کے چند جملے لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں، "ہماری باتیں اشارے بھی ہیں اور خوشخبریاں بھی، یہ اسرار بھی ہیں اور خزانے بھی۔ ان میں رمز و کنایہ ہے۔ یہ انہی کو نصیب ہوتے ہیں جن کا ایمان کامل ہو، حسنِ ظن ہو اور ان کا ایمان انہیں نتائج تک پہنچا دے۔ اور ان پر وہ بندہ یقین نہیں کرے گا جو اللہ کو قادر نہیں مانتا۔ پہلے قدرتِ قادر پہ یقین ہوگا تو ہماری باتیں اس کی سمجھ میں آئیں گی۔"

Scanned with CamScanner

باب(9)

ولایتِ انبیاء علیہم السلام

سلوک کے اعلیٰ منازل

انسانی نسل کے وجود کا باعث اور زمین کی آبادی کا سبب حضرت آدم علیہ السلام کا وجود ہے اور محبت اور محبوبیت کا سبب بھی ان کا وجود ہے۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔(البقرہ:۳۰) اس بناء پر رب العالمین نے دائرہ محبت کا صدر نشین بھی انہی کو بنایا۔ ولایت انبیاء کے کئی دائرے اور بھی ہیں۔ ولایتِ عیسوی، ولایتِ موسوی اور ولایت محمدی ﷺ کے دائرے، ان کے علاوہ مقامِ تکلیمی اور دائرہ ولایتِ ابراہیمی بھی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا گیا، وہ ہر امتحان میں پورے اترے اس لیے رب العالمین نے انہیں اپنا خلیل بنایا۔ ان کی ولایت کے دائرہ کا نام مقامِ خُلّہ ہے۔ جس طرح بادشاہ کے مقربین خاص ہوتے ہیں جن سے راز و نیاز کی باتیں کی جاتی ہیں، خفیہ اسرار بتائے جاتے ہیں۔ یہ کلیم اللہ ہیں جن سے راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ ان کی ولایت کے دائرہ کا نام محبیت ہے۔ پھر رأس و رئیس المحبوبین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کی ولایت کے دائرہ کا نام دائرہ محبوبیت ہے اور دائرہ حُبِّ صرفہ۔ حُبِّ صرفہ کے بعد مقامِ رضا ہے۔ جس کے متعلق امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اِنَّهٗ یَنْبَغِیْ مُجَاوَزَتُهَا وَالْوُصُوْلُ اِلٰی مَقَامِ الرِّضَآءِ الَّذِیْ هُوَ نِهَایَةُ مَقَامَاتِ السُّلُوْكِ وَالْجَذْبَةِ وَهُوَ عَزِیْزٌ لَا یَصِلُ اِلَیْهِ اِلَّا وَاحِدٌ مِّنَ الْاُلُوْفِ...

(روح المعانی، ۱۶:۲۰)

"شان یہ ہے کہ کشف و کرامت سے آگے قدم رکھا جائے اور مقامِ رضا کو حاصل کیا جائے جو مقاماتِ سلوک و جذب کی انتہا ہے اور اس کا حصول بہت ہی مشکل ہے۔ ہزاروں اولیاء میں سے کوئی ایک اس مقام تک پہنچتا ہے۔"

بعض صوفیاء کرام کا خیال ہے جیسا امام ربانی" کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایتِ انبیاء مقامِ رضا پر ختم ہوتی ہے۔ مگر مقامِ رضا کے آگے دائرہ کمالاتِ نبوت، پھر دائرہ کمالاتِ رسالت اور دائرہ کمالاتِ اولوالعزمی ہیں۔ اور اس پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ یہ دائرے مقامِ رضا کے بعد آتے ہیں۔ پھر مقامِ رضا کو انتہا کیونکر کہا جائے گا؟

ان تمام دائروں کے مراقبات میں اصل مقصود مراقبہ ذاتِ باری کا ہے اور اس کی ذات کے فیض کا انتظار ہے۔ پس کمالاتِ نبوت و رسالت اور کمالاتِ اولوالعزمی کا منشاء وہی ذات ہے مگر حیثیت بدلتی ہے اور باعتبار حیثیت کے یہ مراقبات اور ان کی کیفیات بدلتی ہیں۔ مثلاً اس حیثیت سے کہ وہ ذات منشاء ہے جمیع قربات یعنی مسجودیت وغیرہ کا، یہ دائرہ حقیقتِ صلوٰۃ کا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اور اس حیثیت سے کہ وہ ذات تمام نقائص تمام احتیاجات اور تمام رذائل سے مبرّا اور منزہ ہے یہ دائرہ حقیقت صوم کا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ ذات منشاء ہے کتب سماوی کا اور وہ ذات واسع بے کیف و بے جہت ہے، اس کو دائرہ حقیقت قرآن کہتے ہیں۔ قرآن مجید ذات واسع و بے کیف کا مظہر ہے۔ دائرہ حقیقت صوم کے علاوہ باقی تینوں دائرے حقیقت الٰہیہ ہیں۔ اس کو سیر الی حقائق اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ تمام دائرے مقام رضا سے آگے ہیں۔ ان کے بعد دائرہ قیومیت، اس کے بعد دائرہ افرادیت، پھر دائرہ قطب وحدت اور اس کے بعد دائرہ صدیقیت ہے جو سلوک کی انتہا ہے۔

مقام احدیت سے لے کر دائرہ اولوالعزمی تک نصف سلوک ہے اور باقی نصف اس کے بعد ہے۔ جب یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں ولی اللہ نے یا فلاں خلیفہ صاحب نے پورا سلوک طے کیا ہوا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ کسی عارف نے فنا و بقا تک منازل طے کر لیے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ... حالانکہ مقام فنا و بقا سلوک کی بالکل ابتدا ہے اور اولیاء اللہ کے تمام کمالات بمقابلہ ولایت نبوت کے مثل مشک کی رطوبت کے ہیں، جیسے مشک پانی سے بھری ہوئی ہو اور اس کی بیرونی سطح پر رطوبت ظاہر ہو رہی ہو۔ پھر یہ کمالات جو بمنزلہ رطوبت کے ہیں صرف مدرسہ تقویٰ میں معلمِ متقی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ تمام علومِ ظاہری محبتِ دنیا کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں مگر علوم صوفیا اور محبتِ دنیا کا ایک جگہ جمع ہونا اجتماع نقیضین کا حکم رکھتا ہے۔

أَنَّ الْعُلُوْمَ كُلَّهَا لَا يَبْعُدُ تَحْصِيْلُهَا مَعَ مَحَبَّةِ الدُّنْيَا وَالْإِخْلَالِ بِحَقَائِقِ التَّقْوٰى وَرُبَّمَا كَانَتْ مَحَبَّةُ الدُّنْيَا عَوْنًا عَلٰى اِكْتِسَابِهَا... وَعُلُوْمُ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ يَعْنِي الصُّوْفِيَّةَ لَا تَحْصُلُ بِمَحَبَّةِ الدُّنْيَا وَلَا تَنْكَشِفُ اِلَّا بِمُجَانَبَةِ الْهَوٰى وَلَا تُدَرَّسُ اِلَّا فِيْ مَدْرَسَةِ التَّقْوٰى... قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ...

(الفتاویٰ الحدیثیہ، ۱: ۲۲۰)

”تمام علوم محبتِ دنیا کے ساتھ حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ اکثر محبتِ دنیا ان کے حصول میں معاون ہوتی ہے سوائے علوم صوفیا کے۔ یہ علوم محبتِ دنیا کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتے۔ ان کا حصول خواہشِ نفس کے دور ہونے پر موقوف ہے اور ان علوم صوفیا کی تعلیم مدرسہ تقویٰ میں دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو، وہ تمہیں علم عطا فرما دے گا۔“

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصوف و سلوک محض شجرہ خوانی، ٹوپی اوڑھنے، خرقہ پہننے، لمبی تسبیح ہاتھ میں رکھنے، عرس منانے، قوالی سننے، وجد و تواجد اور ناچنے کودنے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لیے شرطیں دوسری ہیں جن میں سے سرفہرست اتباع شریعت ہے جس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ دل میں راسخ ہو اور اتباع سنت نبوی ﷺ اس کامل درجے کا ہو کہ اس میں بدعت کو مطلق دخل نہ ہو، شرک و بدعت کی ہوا بھی مانع فیض ہے۔ پھر شیخ کامل سے تعلق اور اس سے دلی عقیدت ضروری ہے، اس کی مخالفت مانع فیض ہے۔ اس پر قصہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ شاہد ہے۔ پھر پورے خلوص سے ذکرِ الٰہی کی کثرت اور مجاہدہ و ریاضت، ان شرائط کے ساتھ منازلِ سلوک دس بیس سال میں طے ہو سکتے ہیں

Scanned with CamScanner

بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور ہو۔ تصوف تعلق مع اللہ اور اخذِ حقائق کا نام ہے اور اس کا حصول ایسے اخلاص مع اللہ پر منحصر ہے جس میں مخلوق سے کسی قسم کی امید کی آمیزش نہ ہو۔

ولایت علیا جو ولایت انبیاء ہے، اُن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کو انبیاء علیہم السلام سے ظاہری اور باطنی مناسبت ہو۔ ظاہری مناسبت یہ ہے کہ کامل اتباع شریعت ہو، احکام ظاہری کی بجا آوری میں ہر گز سستی نہ ہو، اتباع سنت میں قدم راسخ ہو۔ شریعت حقہ سے بے التفاتی اور تصوف وسلوک کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں اور مناسبتِ باطنی یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے قلوب منور ہیں اور ملائکہ کے وجود منور ہیں، اسی طرح عارف کا باطن بھی منور ہو، دل میں استمرار کبیرہ وصغیرہ کو جگہ نہ دے۔ ولی اللہ معصوم نہیں ہوتا، عصمت تو انبیاء کا خاصہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو وہ محفوظ ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کاروبار ترک کردے بلکہ:

کُنْ ظَاهِرًا جِسْمَانِيًّا وَفِي الْبَاطِنِ رُوْحَانِيًّا...

قَالَ تَعَالٰی: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ...(لمعات، ٦٩)

"اللہ کے بندوں کو تجارت اور بیع وشرٰی اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔"

پس ذکرِ الٰہی کے لیے ترکِ دنیا ضروری نہیں، ہاں یہ ضروری ہے کہ غیر اللہ کی محبت دل میں گھسنے نہ پائے۔

ہم نے مقصد اور ذریعہ حصولِ مقصد کی نشاندہی کردی ہے۔ صرف کتب ورسائل تصوف سے تزکیہ باطن نہیں ہو سکتا۔ اس دولت کا ملنا شیخ کامل کی صحبت اور القاء وانعکاس کے بغیر محال ہے۔

ولایت کی انتہائی منزل دائرہ صدیقیت ہے۔ اس سے آگے کے منازل سلوک خاص نبوت کی منازل ہیں۔ کسی ولی اللہ کا ان منازل میں جانا ایسا ہے جیسا شاہی محل میں کسی مالی یا ماشکی یا خاکروب کا چلا جانا، یا جیسے جنت میں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے ہمراہ غیر انبیاء جائیں گے۔ جیسے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جنت میں ازواج مطہرات کا جانا ہے۔ ان منازل کی تفصیل یہ ہے:

دائرہ قربِ نبوت، قربِ رسالت، قربِ اولوالعزمی، قربِ محمدی، وصالِ محمدی، قربِ الٰہی، وصالِ الٰہی، رضائے الٰہی، قربِ رحمت، بحرِ رحمت، خزانۂ رحمت، منبعِ رحمت، اور حجاباتِ الوہیت۔ ان حجابات کو طے کرنے کے لئے عمرِ نوح بھی ناکافی ہے۔ حجابات کے بعد بھی غالباً اور منازلِ سلوک ہوں گے مگر ابھی تک علم نہیں ہوا۔ ممکن ہے اس گنہگار پر اللہ تعالیٰ اپنا خاص فضل فرما کر آگے منازل بھی طے کرا دے۔ وہ قادر کریم ہے، اس کی رحمت سے کوئی بعید نہیں۔ ان منازل کو طے کرنے کے لیے تین ہی طریقے ہیں:

اول یہ کہ عارف کی تربیت روح پرفتوح آنحضرت ﷺ خود فرمائیں۔ دوم بہ اتباع نبوی کے واسطے سے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سے فیض ملے۔ سوم یہ جس کو رسولِ خدا ﷺ یا فیضِ ربی سے تربیت مل رہی ہو اس کی تربیت میں رہ کر کامل بن کر اس کی غیبی توجہ سے فیض حاصل کرے۔

Scanned with CamScanner

سلوک کے اعلیٰ منازل

جس طرح زمین کی انسانی آبادی کا سبب حضرت آدمؑ کا وجود ہے، اسی طرح محبتِ الٰہی اور اللہ سے تعلق کا سبب بھی آدمؑ ہی کا وجود ہے۔ تمام انسانی کمالات وہیں سے شروع ہوئے اور سب سے بڑا انسانی کمال جس کی غرض سے انسان کو پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کرے، اس کی بنیاد بھی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا، اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً... (البقرہ: ۳۰) اس بنیاد پر رب العالمین نے دائرہ محبت کا صدر نشین بھی انہی کو بنایا۔ ولایت انبیاءؑ کے کئی دائرے اور بھی ہیں۔ ولایتِ عیسوی، ولایتِ موسوی اور ولایتِ محمدی ﷺ۔ ان کے علاوہ مقامِ تکلیمی اور دائرہ ولایت ابراہیمی بھی ہیں۔ فرمایا، یہ سارے مختلف انبیاءؑ کی ولایت کے دوائر ہیں لیکن دائرہ محبت کے صدر نشین آدمؑ ہی ہیں کیونکہ ہر چیز کی بنیاد انہی سے شروع ہوئی۔ محبتِ الٰہی، عشقِ الٰہی، قربِ الٰہی اور حصولِ الٰہی۔ ساری نعمتوں کی ابتدا اُن کے مبارک وجود سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کی راہ میں طرح طرح کی آزمائشیں آئیں اور وہ ہر امتحان پر پورے اترے۔ اس لیے رب العالمین نے انہیں اپنا خلیل بنایا۔ ان کی ولایت کے دائرے کا نام مقامِ خُلّہ ہے۔ یہ بھی عالمِ امر میں آتا ہے یعنی دائرۂ مقامِ خُلّہ۔

جس طرح بادشاہ کے مقربینِ خاص ہوتے ہیں جن سے راز و نیاز کی باتیں کی جاتی ہیں، خفیہ اسرار بتائے جاتے ہیں۔ یہ کلیم اللہ ہیں جن سے اللہ نے راز و نیاز کی باتیں کیں۔ حضرت موسیٰؑ جنہیں براہ راست اس دنیا میں شرفِ کلیمی سے نوازا گیا، اللہ نے ان سے کلام فرمایا۔ ان کی ولایت کے دائرے کا نام 'محبّیت' ہے۔ پھر رأس و رئیس المحبوبین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کی ولایت کے دائرے کا نام 'محبوبیت' ہے۔ یہ دوائر بہت آخر میں جا کر آتے ہیں۔ بہت بلندی پر عالمِ امر میں بھی بہت سے دائرے طے کرنے کے بعد آتے ہیں۔ اور دائرہ حُبِّ صرفہ، حُبِّ صرفہ کے بعد مقامِ رضا ہے جس کے متعلق امام ربانی مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں، ''یہ شان ہے کہ کشف و کرامت سے آگے قدم رکھا جائے اور مقامِ رضا کو حاصل کیا جائے جو مقاماتِ سلوک و جذبہ کی انتہا ہے۔ اس کا حصول بہت ہی مشکل ہے۔ ہزاروں اولیاء میں سے کوئی ایک اس مقام تک پہنچتا ہے۔''

یہ عالمِ امر کے دوائر ہیں جن کو سمجھنے کے لیے وہاں تک رسائی بہت ضروری ہے۔ جو وہاں پہنچتا ہے اسے سمجھ آجاتی ہے، جن کو یہ نصیب نہیں اُن سے بحث فضول ہے۔ مجھے یاد ہے، لالہ موسیٰ میں ہمارے ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ سکول کی ایک صبح کی دعا میں جو آیات تلاوت کی گئیں، ان میں جنت کا ذکر تھا۔ فرمانے لگے، ''دنیا میں جنت کی جتنی بھی باتیں سن لیں آپ اس کو سمجھ نہیں سکتے، سمجھ وہیں جا کر آئے گی۔ مثلاً ایک آدمی نے نہ کبھی پہیہ دیکھا ہو نہ کوئی گاڑی کا تصور ہو، آپ اس سے جنگل میں کہیں مل جائیں اب لاکھ اسے بتانا چاہیں کہ ٹرین کیا ہوتی ہے، سو طرح کی مثالیں دیں، وہ لاکھ اپنے ذہن میں تصور کے تانے بانے بنے، ریل کی کوئی تصویر اس کے ذہن میں نہیں آئے گی۔'' پھر فرمانے لگے کہ اگر دنیا کی چیزوں کا یہ عالم ہے تو

Scanned with CamScanner

جنت کی صحیح تصویر ہمارے ذہن میں کہاں آسکتی ہے؟ تب پتہ چلے گا جب بیتے گی۔

یہ دوائر جو حضرتؒ زیر بحث لائے ہیں، آپؒ نے صرف ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ان پر زیادہ بات نہیں کی کہ جس کو وہاں تک رسائی نصیب ہوگی وہ خود ہی سمجھ جائے گا۔ جس کا معاملہ الٹ ہے اسے سمجھایا جا نہیں سکتا۔ پھر آگے انبیاء کی ولایت کا ذکر فرمایا کہ بعض صوفیا کا خیال ہے جیسا کہ امام ربانیؒ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت انبیاءؑ مقام رضا پہ منتہی ہوتی ہے، لیکن 'مقامِ رضا' کے آگے دائرۂ کمالاتِ نبوت، دائرۂ کمالاتِ رسالت اور دائرۂ کمالات اولوالعزمی ہیں اور اس بات پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ یہ دائرے 'مقامِ رضا' کے بعد آتے ہیں۔ پھر مقام رضا کو انتہا کیونکر کہا جاسکتا ہے؟ ان دائروں کے مراقبات میں اصل مقصود مراقبۂ ذاتِ باری کا ہے اور اس کی ذات کے فیض کا انتظار ہے۔ یعنی جوں جوں مراقبات آگے جاتے ہیں اور آگے جو ان کے نام ہیں، اصل کیفیت بنیادی وہی ہے کہ ہر دائرے میں مزید رضائے الٰہی، مزید برکات، مزید کرم بندے کو نصیب ہوتا ہے اور مزید قرب نصیب ہوتا ہے۔ پس کمالاتِ نبوت و کمالاتِ رسالت اور کمالاتِ اولوالعزمی کا منشا وہی ذات ہے مگر حیثیت بدلتی ہے اور باعتبار حیثیت کے یہ مراقبات اور ان کی کیفیت بدلتی ہے۔ شاہی دربار میں کئی لوگ جاتے ہیں۔ ایک عام آدمی اپنی درخواست لے کر جاتا ہے تو وہ بھی شاہی دربار میں داخل ہوتا ہے بادشاہ کو دیکھتا ہے۔ ایک شخص کسی ملک کے سفیر کی حیثیت سے اپنے بادشاہ کا پیغام لے کر دربارِ شاہی میں آتا ہے۔ اب یہ دونوں آدمی بادشاہ کے قریب کھڑے ہیں لیکن ان کی حیثیت کے اعتبار سے کیفیت میں کتنا فرق ہے۔ یہی بات یہاں ارشاد فرماتے ہیں کہ سب دوائر کا مقصد قربِ الٰہی ہے لیکن ہر دائرے کی اپنی حیثیت اور اپنی کیفیت ہے اور باعتبارِ کیفیت بہت فاصلہ ہے۔ باعتبارِ حیثیت یہ مراقبات اور ان کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں مثلاً اس حیثیت سے کہ وہ ذات منشا ہے جمیع قربات یعنی مسجودیت وغیرہ کا، یہ کہ سجدہ صرف اس ذات کو کیا جائے گا۔ اور یہ مقام صرف اللہ کو حاصل ہے، اس کا مرکز دائرۂ حقیقتِ صلوٰۃ ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ ذات تمام نقائص، احتیاج اور رزائل سے پاک ہے۔ اسی طرح باقی دوائر مثلاً دائرۂ حقیقتِ صوم، دائرۂ حقیقتِ کعبہ، دائرۂ حقیقتِ قرآن ہیں۔ یہ تمام دوائر اللہ کی ذات کی مختلف جہتوں اور حیثیتوں کے مظہر ہیں۔ حضرتؒ نے ان کی تفصیل بیان کی ہے۔

یاد رہے کہ سیر کعبہ اور چیز ہے اور حقیقتِ کعبہ اور ہے۔ سیر صلوٰۃ اور بات ہے اور حقیقتِ صلوٰۃ اور ہے۔ سیر قرآن اور ہے اور حقیقتِ قرآن اور ہے۔ سیرِ کعبہ میں آپ کی روح بیت اللہ میں حاضر ہوتی ہے۔ سیرِ صلوٰۃ میں ارواح کو بیت اللہ میں نماز نصیب ہوتی ہے۔ سیرِ قرآن میں روحانی طور پر آپ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے ہیں۔ یہ مراقبات بیت اللہ شریف میں اور رُوئے زمین پر ہوتے ہیں جبکہ حقیقتِ کعبہ، حقیقتِ صوم، حقیقتِ صلوٰۃ اور حقیقتِ قرآن، عالمِ امر کے بلند ترین دائروں میں سے ہیں اور بڑی منازل طے کرنے کے بعد آتے ہیں۔ اقل قلیل (بہت ہی کم) لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔
"قرآن مجید ذاتِ واسع و بے کیف کا مظہر ہے۔ دائرۂ حقیقتِ صوم کے علاوہ باقی تینوں دائرے حقیقتِ الٰہیہ کے ہیں۔ ان کو

Scanned with CamScanner

سیرالی حقائق اللہ کہا جاتا ہے۔" یعنی اللہ کے حقائق کی جانب بڑھنا اور ان کی برکات حاصل کرنا۔ یہ تینوں دائرے مقامِ رضا سے آگے ہیں۔ ان کے بعد دائرۂ قیومیت، پھر دائرۂ افرادیت، پھر دائرۂ قطب وحدت اور اس کے بعد دائرۂ صدیقیت ہے جو سلوک کی انتہا ہے۔

یہاں بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ دائرۂ قیومیت طے کر لینا اور بات ہے (حالانکہ اقل قلیل لوگ وہاں پہنچتے ہیں)، اور منصب قیومیت اور بات ہے۔ جیسے کتنے ہی لوگ کوالیفکیشن رکھتے ہیں لیکن سارے تو گورنر نہیں بن جاتے۔ حالانکہ کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کی قابلیت گورنرز سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ تو مناصب یا عہدے اور چیز ہیں جبکہ منازل تو حقیقت میں علم ہوتا ہے۔ اب علم ایک کے پاس زیادہ بھی ہو سکتا ہے لیکن عہدہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے کو مل جائے۔ تو یہ دائرے طے کر جانا اور بات ہے، یہ بھی صدیوں میں کوئی ایک آدھ بندہ ہی ہوتا ہے۔ اگر عہدہ مل جائے تو نورٌ علیٰ نور ہے کہ دائرہ طے کرنا علم کا حصول ہے اور منصب تو عہدہ، مرتبہ ہوتا ہے۔ تو فرماتے ہیں، "اس کے بعد دائرۂ قیومیت، دائرۂ افرادیت، دائرۂ قطب وحدت اور آخر میں دائرۂ صدیقیت جو سلوک کی انتہا ہے۔" یہ انتہا باعتبارِ منصب ہے کہ یہ آخری منصب ہے۔ "مقامِ احدیت سے لے کر دائرہ اولوالعزمی تک نصف سلوک ہے۔" اب یہ دائرۂ اولوالعزمی کہنا آسان ہے، یہاں تک پہنچنا آسان نہیں۔ تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہاں تک نصف سلوک (اندازاً) ہے۔ جب یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں ولی اللہ، فلاں خلیفہ صاحب نے سلوک پورا طے کیا ہوا ہے۔ کسی عارف نے فنا و بقا تک منازل طے کر لیے تو یہ بھی بڑی بات ہے، حالانکہ فنا بقا سلوک کی ابتدا ہے اور اولیاء اللہ کے تمام کمالات بمقابلہ ولایت نبوت مثل مشک کی رطوبت کے ہیں۔ جیسے کوئی مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا ہو تو اس کے باہر جو رطوبت آ جاتی ہے، وہ ولایت اولیاء ہے۔ اس کے اندر جو پانی ہے، وہ ولایت انبیاءؑ ہے۔ یہ نسبت ولایت اولیاء کو ولایت انبیاء سے ہے۔ مشکیزے کی رطوبت کی حیثیت رکھنے والے کمالات بھی کسی متقی معلم سے، تقویٰ کے مدرسے سے جہاں تقویٰ ہی تقسیم ہوتا ہو، بڑی محنت کے بعد حاصل ہوتے ہیں تو ولایت انبیاءؑ تک جانا کون سا آسان ہے۔

فرمایا، "باقی سارے علوم، فلسفہ، طب، سائنس، تاریخ غرضیکہ دنیا کا کوئی علم بھی آپ دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کر حاصل کر سکتے ہیں لیکن صوفیا کا علم تب حاصل ہوتا ہے جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہو۔" علمِ تصوف اور حُبِّ دنیا ایک دوسرے کی ضد ہیں، جیسے روشنی اور اندھیرا ایک جگہ جمع نہیں کیے جا سکتے۔ دنیوی علوم کے لیے بعض اوقات دنیا کی محبت معاون ثابت ہوتی ہے۔ کوئی عہدہ حاصل کرنے کے لیے انسان بڑی جدوجہد سے کوئی خاص علم حاصل کرتا ہے یا مال و دولت کمانے کی ہوس مختلف ہنر اور علوم سیکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے لیکن اگر حُبِّ دنیا سالک کے دل میں موجود ہو تو علومِ صوفیا کا کوئی دروازہ اس پر نہیں کھلتا۔ دل میں تقویٰ موجود ہو، خواہشِ نفس سے دل پاک ہو تو اللہ فرماتا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ... الخ (البقرہ:۲۸۲)

"تقویٰ اختیار کرو، اللہ تمہیں علم عطا کرے گا۔" اس سے مراد یہی علومِ صوفیا ہیں۔

Scanned with CamScanner

حقیقت یہ ہے اسلامی تصوف ان رسومات سے حاصل نہیں ہوتا جو آج کل ہم نے اختیار کر لی ہیں بلکہ ان کے حصول کے لیے دوسری شرائط ہیں جن میں سرفہرست اتباع شریعت ہے۔ اس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ دل میں راسخ ہو، اتباع سنتِ نبوی ﷺ کامل درجے کا ہو اور اس میں بدعت کو مطلق دخل نہ ہو۔ یہاں برسبیل تذکرہ بتاتا چلوں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں، بدعتِ شرعی اور بدعتِ لغوی۔ بدعتِ شرعی وہ ہوتی ہے کہ جس کا وجود عہدِ نبوی یا خلفائے راشدین کے زمانے میں نہ پایا جائے مثلاً نبی کریم ﷺ نے کوئی کام کیا، وہ سنت ہے۔ اگر آپ ﷺ نے کسی کام کے کرنے کی خواہش کی مگر کسی ظاہری وجہ سے وہ نہیں ہو سکا، وہ بھی سنت ہے۔ اگر آپ ﷺ نے کسی کام کو ہوتے دیکھا، اسے پسند فرمایا، وہ بھی سنت ہو گیا۔ کسی کام کو کرنے کا حکم دیا وہ بھی سنت ہو گیا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ ... اوکما قال رسول اللہ ﷺ۔

(شرح معانی الآثار، کتاب الطہارۃ، باب المسح علی الخفین کم وقتہ للمقیم والمسافر، ۱:۸۰)

"تم پر ہے کہ میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت مضبوطی سے پکڑو۔"

"میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت" اس لیے فرمایا کہ خلفائے راشدین سے کسی ایسے کام کی توقع ہی نہیں جو انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے نہ دیکھا یا نہ سنا ہو۔ لہٰذا ان ؓ کا کام بھی سنتِ نبوی ہوگا کہ وہ حقیقی طور پر فنا فی الرسول ﷺ تھے۔ کوئی ایسی چیز جس کا وجود عہدِ نبوی ﷺ میں ملتا ہو مثلاً ہم تراویح کی نماز باجماعت پڑھتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے دو دن پڑھائی، تیسرے دن لوگ انتظار کرتے رہے، حضور اکرم ﷺ مسجد میں تشریف نہیں لائے۔ فرمایا کہ اپنی اپنی تراویح پڑھ لو میں نے باقاعدہ پڑھانا شروع کر دی تو تم پر فرض ہو جائے گی (مفہوم)۔ اس طرح تراویح سنت تو ہو گئیں اور کوئی نہیں پڑھتا تو تارکِ سنت ہونے کا گناہ تو لازماً ہوگا، لیکن اگر فرض ہو جاتیں تو پھر بہت زیادہ سختی کا معاملہ ہو جاتا۔ لیکن عہدِ فاروقی میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اب نہ تو وحی آنی ہے نہ تراویح کے فرض ہونے کی کوئی سبیل باقی ہے لہٰذا اب تو باجماعت پڑھی جائیں کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے دو روز باجماعت پڑھائیں۔ تو یہ سنت ہے، بدعت نہیں۔ یعنی لغت (لفظی معنیٰ) میں آپ اسے بدعت کہہ دیں، نیا کام شروع کیا۔ لیکن یہ بدعتِ شرعی نہیں چونکہ اس کی اصل عہدِ نبوی ﷺ میں موجود ہے جبکہ وہ چیز بدعت شرعی ہوتی ہے جو رسوم و رواج ہم مذہب کے نام پر کرتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ ہر بدعت سنت کی عمارت کو ڈھا کر اس پر بنائی جاتی ہے۔ ہر بدعت کا جرم یہ ہے کہ سنت وہاں سے ہٹ جاتی ہے تو بدعت جگہ پاتی ہے۔ سنت کو گرا کر بدعت شروع کرنا، اور پھر بدعتی کو تصوف نصیب ہو یہ کسی طور بھی ممکن نہیں۔ "شرک اور بدعت کی ہوا بھی مانع فیض ہے۔" حضرتؒ نے شرک کو بدعت کے ساتھ اس لیے جوڑ دیا کہ جس طرح شرک ظلمِ عظیم ہے، مشرک کو تصوف کا شمہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا کہ یہ بات انتہائی ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ بدعت کی ہوا بھی مانع فیض ہے یعنی بدعت نہ بھی کرتا ہو لیکن اگر اسے دل میں اچھا سمجھتا یا کم از کم برا نہ جانتا ہو تو بھی مانع فیض ہے، اسے تصوف نصیب نہ ہوگا۔

Scanned with CamScanner

فرمایا، "شیخ کامل سے دلی تعلق وعقیدت ضروری ہے اور اس کی مخالفت مانع فیض ہے۔" اس پر قصۂ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ شاہد ہے۔ پورے خلوص سے ذکر الٰہی، مجاہدہ کی کثرت، ریاضت یعنی پورے خلوص وشوق سے بھرپور جدوجہد، ان شرائط کے ساتھ منازلِ سلوک دس بیس سال میں طے ہوتے ہیں۔ لہٰذا منازلِ سلوک کی بنیاد توحیدِ خالص ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہے کہ اس کے دل میں سنت کی محبت عشق کی حد تک ہو اور خلافِ سنت سے نفرت، بدعت سے بیزار ہو۔ اب بعض لوگ بدعت کی اصل تعریف سے بے خبر اپنی عقل ادھر اُدھر دوڑاتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یارا چائے تو آپ ﷺ کے زمانہ مبارک میں نہیں تھی لہٰذا اس کا پینا بدعت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جیسے جوتے کپڑے آج ہیں حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تو ایسے نہیں تھے، یہ بھی بدعت ہوگئی۔ یہ سب بے سروپا، لایعنی باتیں ہیں۔ یاد رکھیں! بدعت تب بنتی ہے جب اس کو ثواب سمجھا جائے۔ جو نئے کھانے ہیں، ان کے لیے پاکیزہ اور حلال ہونا شرط ہے۔ نئے طرز کے ملبوسات کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ خلافِ شریعت نہ ہوں لیکن یہ تو نہیں کہ اس کپڑے کو پہننا یا نئے کھانے کھانا کوئی باعثِ ثواب سمجھتا ہو، عبادت سمجھتا ہو۔ جب رسومات کو ہم عبادت کا درجہ دے دیتے ہیں اور ثواب کا باعث سمجھتے ہیں جبکہ ان کی اصل شریعت میں نہیں ہے، وہ بدعت ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ تصوف کے حصول کے لیے پہلی چیز اخلاص مع اللہ ہے یعنی انسان اللہ کے ساتھ خالص ومخلص ہو۔ غیر اللہ سے کسی قسم کی امید نہ رکھے، ہر امید اللہ سے وابستہ کرے۔ ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاءؑ ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کو انبیاءؑ سے ظاہری اور باطنی مناسبت ہوجاتی ہے، یعنی ان کی عبادات، معاملات، مخلوق سے تعلقات، کسبِ رزق وغیرہ میں نبیوں کی سنت کی پیروی کر کے ان ہستیوں سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں اور پھر باطنی کیفیات میں بھی انبیاءؑ سے مناسبت ہوجاتی ہے۔ انہیں انبیاءؑ کے مناصب نصیب ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شریعت کو اہمیت نہیں دیتا اور اس پر عمل نہیں کرتا اور پھر وہ سمجھے کہ سلوک حاصل کر لے گا تو یہ ممکن نہیں۔ مناسبتِ باطنی یہ ہے کہ جس طرح انبیاءؑ کے قلوب اور فرشتوں کے وجود منور ہوتے ہیں، اسی طرح عارف کا باطن بھی منور ہو، اس کے دل میں گناہ جمع نہ ہونے پائے۔ ولی سے گناہ ہوسکتا ہے، وہ غلطی کر سکتا ہے، لیکن گناہ یا غلطی کی تکرار یعنی بار بار دہرانا منافیٔ ولایت ہے۔ غلطی کا ہوجانا منافیٔ ولایت نہیں، آخر وہ بھی انسان ہے لیکن گناہ کو دہراتے رہنا ولایت کے مناصب سلب ہونے کا باعث بنتا ہے۔ ولی اللہ معصوم نہیں ہوتا۔ عصمت صرف نبوت کا خاصہ ہے، نبی سے گناہ کا صدور ممکن ہی نہیں۔ لیکن ولی اگر اللہ چاہے تو محفوظ ہوسکتا ہے۔ ولایت کا خاصہ ہے کہ اسے حفاظتِ الٰہیہ حاصل ہوجاتی ہے، اللہ اس کی حفاظت فرماتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کاروبار ترک کردے، کام کاج چھوڑ کر گوشہ نشین ہوجائے۔ تصوف تو یہ ہے کہ بظاہر لوگ دیکھیں تو عام آدمی لگے۔ لوگوں کی طرح کام کرتا ہو، بچے پالتا ہو، گھر چلاتا ہو، مگر اندر سے، باطنی طور پر، روحانی طور پر، وہ اللہ کے ساتھ ہو۔ صوفیا تو اس بات سے بھی منع کرتے ہیں کہ آپ اپنے خاندانی یا علاقائی لباس میں کوئی تبدیلی کریں۔ اپنی ولایت ظاہر کرنے کے لیے چوغے بنا لیے، گلے میں تسبیح پہن لی، یہ سارے حیلے بہانے تصوف میں جائز نہیں۔ سالک کو چاہیے، جیسا ہے، ویسا ہی رہے۔ عام آدمی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ یہ کوئی خاص بندہ ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ

Scanned with CamScanner

رہے، میل جول، لین دین کرے لیکن اس کا میل جول، لین دین شریعت کے مطابق ہو۔ حلال اور جائز ہو جیسا کہ اللہ نے سورۂ نور میں فرمایا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ... (النور: ۳۷)

یعنی اللہ تعالیٰ نے بھی اسی بات کی نشاندہی کی ہے کہ میرے بندے سارے کام کرتے ہیں لیکن وہ کام انھیں میری یاد سے غافل نہیں کر سکتے۔ پس یادِ الٰہی کے لیے ترکِ دنیا ضروری نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ غیر اللہ کی محبت دل میں گھسنے نہ پائے۔

ہم نے مقصد اور مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ صرف تصوف کی کتابیں پڑھ کر تصوف کا حصول ناممکن ہے۔ شیخ کامل کی صحبت اور القاوانعکاس کے بغیر یہ دولت حاصل نہیں کی جا سکتی۔

ولایت کی انتہائی منزل 'دائرہ صدیقیت' ہے۔ اس سے آگے کی منازلِ سلوک، خاص نبوت کی منازل ہیں۔ کسی ولی اللہ کا ان منازل میں جانا ایسا ہے جیسے شاہی محل میں کسی مالی یا ماشکی یا خاکروب کا چلا جانا، یا جیسے جنت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ غیر انبیاء جائیں گے۔ جیسے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جنت میں ازواجِ مطہرات کا جانا ہے۔

ان منازل کی تفصیل یہ ہے:

دائرۂ قربِ نبوت، قربِ رسالت، قربِ اولوالعزمی، قربِ محمدی، وصالِ محمدی، قربِ الٰہی، وصالِ الٰہی، رضائے الٰہی، قربِ رحمت، بحرِ رحمت، خزانۂ رحمت، منبعِ رحمت اور حجاباتِ الوہیت۔ ان حجابات کو طے کرنے کے لیے عمرِ نوح بھی ناکافی ہے۔ حجابات کے بعد بھی غالباً اور منازلِ سلوک بھی ہوں، مگر ابھی تک علم نہیں ہوا۔ ممکن ہے اس گنہگار پر اللہ تعالیٰ اپنا خاص فضل فرما کر آگے منازل بھی طے کرا دے (حضرت مولانا اللہ یار خانؒ اپنی بات کر رہے ہیں)۔ وہ قادر کریم ہے، اس کی رحمت سے کچھ بعید نہیں۔

ان منازل کو طے کرنے کے تین ہی طریقے ہیں:

اول۔ یہ کہ عارف کی تربیت روحِ پُرفتوح آنحضرت ﷺ خود فرمائیں۔

دوم۔ اتباعِ نبوی ﷺ کے طفیل براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات سے فیض ملے۔

سوم۔ یہ کہ جس کو رسول اللہ ﷺ یا فیضِ ربی سے تربیت مل رہی ہو، اس کی تربیت میں رہ کر کامل بن کر اس کی غیبی توجہ سے فیض حاصل کرے۔

Scanned with CamScanner

باب (10)

مناصبِ اولیاءاللہ

صوفیاء کی اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں

اولیاءاللہ کے مختلف مناصب کے متعلق عام ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اور جن کے خلاف 'بدعت' کا نام لے کر نفرت پھیلائی جاتی ہے انہیں دور کرنے کے لیے ذخیرۂ احادیث میں سے چند شواہد پیش کیے جاتے ہیں۔ دوسرے باب میں ان مناصب پر تفصیلی بحث ہوگی۔

۱۔ (ذَکَرَ اَبُو نُعَیْمٍ فِی الْحِلْیَۃِ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: خِیَارُ اُمَّتِیْ فِیْ کُلِّ قَرْنٍ خَمْسُ مِائَۃٍ وَالْاَبْدَالُ اَرْبَعُوْنَ ــــ کُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مِنَ الْخَمْسِ مِائَۃٍ مَکَانَہٗ، وَاَدْخَلَ مِنَ الْاَرْبَعِیْنَ مَکَانَھُمْ۔ (حلیۃ الاولیا وطبقات الاصفیا، ۱:۸)

"ابونعیم نے 'حلیۃ الاولیا' میں ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ہر زمانہ میں پانچ سو اخیار ہوں گے اور چالیس ابدال، ان دونوں میں کمی نہ ہوگی، ان میں سے جو فوت ہوگا ان پانچ سو میں سے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے شخص کو ان چالیس میں داخل کردے گا۔"

۲۔ وَمِنْھَا حَدِیْثُ اَحْمَدَ. اَلْاَبْدَالُ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ ثَلَاثُوْنَ مِثْلُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلِ الرَّحْمٰنِ کُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللّٰہُ مَکَانَہٗ رَجُلًا۔ (مسند امام احمد بن حنبل، مسند الانصار، ۷، ۳۷:۴۱۳)

"امام احمدؒ کی حدیث: اس امت میں ابدال تیس ہوں گے جو (جن کے قلوب) مثل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہوں گے، ان میں سے جو فوت ہوگا اللہ اس کی جگہ دوسرا ابدل دے گا۔"

۳۔ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ: لَا تَسُبُّوْا اَھْلَ الشَّامِ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ یَقُوْلُ: فِیْھِمُ الْاَبْدَالُ وَبِھِمْ تُنْصَرُوْنَ وَبِھِمْ تُرْزَقُوْنَ... (فتاویٰ الحدیثیہ، ۲۷۷)

حدیثِ طبرانی: "ان میں ابدال ہوں گے جن کے سبب تمہاری مدد کی جائے گی اور تمہیں رزق دیا جائے گا۔"

۴۔ وَمِنْھَا حَدِیْثُ ابْنِ عَسَاکِرٍ: اَنَّ الْاَبْدَالَ بِالشَّامِ یَکُوْنُوْنَ وَھُمْ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا بِھِمْ تُسْقَوْنَ الْغَیْثَ وَبِھِمْ تُنْصَرُوْنَ عَلٰی اَعْدَآئِکُمْ وَیُصْرَفُ عَنْ اَھْلِ الْاَرْضِ الْبَلَاءُ وَالْغَرَقُ... (تاریخ دمشق، ۱:۲۸۹)

"ابدال شام میں ہوتے ہیں اور وہ چالیس مرد ہیں۔ ان کے سبب سے تمہیں بارش دی جاتی ہے اور ان کی وجہ سے تمہیں دشمنوں پر فتح دی جاتی ہے اور ان کے سبب سے اہلِ زمین سے تکالیف اور مصائب دور کیے جاتے ہیں۔"

۵۔ وَمِنْھَا حَدِیْثُ الطَّبْرَانِیِّ. اَنَّ الْاَبْدَالَ فِیْ اَھْلِ الشَّامِ بِھِمْ تُنْصَرُوْنَ وَبِھِمْ تُرْزَقُوْنَ...

(المعجم الکبیر، ۱۸:۶۵)

Scanned with CamScanner

"ابدال اہل شام میں ہیں، ان کی وجہ سے تمہیں مدد دی جائے گی اور تمہیں رزق دیا جائے گا۔"

۶۔ وَمِنْهَا حَدِيثُ أَحْمَدَ: اَلْأَبْدَالُ يَكُونُونَ بِالشَّامِ وَهُمْ أَرْبَعُونَ رَجُلًا كُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ أَبْدَلَ اللهُ مَكَانَهُ رَجُلًا يُسْقَى بِهِمُ الْغَيْثُ وَيُنْتَصَرُ بِهِمْ عَلَى الْأَعْدَاءِ وَيُصْرَفُ عَنْ أَهْلِ الشَّامِ بِهِمُ الْعَذَابُ... (مسند امام احمد بن حنبل، مسند علی بن ابی طالب، ۲۳۱:۲)

"ابدال شام میں ہیں اور وہ چالیس مرد ہیں۔ جو ان میں سے فوت ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا ابدل دیتا ہے ان کے سبب سے تمہیں بارش دی جاتی ہے اور دشمنوں کے مقابلہ میں امداد دی جاتی ہے اور اہل شام سے ان کے سبب سے عذاب دور کیا جاتا ہے۔"

۷۔ وَمِنْهَا حَدِيثُ الْخَلَّالِ الَّذِي رَوَاهُ فِي كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ وَ رَوَاهُ الدَّيْلَمِيُّ أَيْضًا. اَلْأَبْدَالُ أَرْبَعُونَ رَجُلًا وَأَرْبَعُونَ امْرَأَةً كُلَّمَا مَاتَ رَجُلٌ أَبْدَلَ اللهُ مَكَانَهُ رَجُلًا وَكُلَّمَا مَاتَتِ امْرَأَةٌ أَبْدَلَ اللهُ مَكَانَهَا امْرَأَةً... (الفردوس بمأثور الخطاب، ۱۱۹:۱)

"خلال کی حدیث جو اس نے 'کراماتِ اولیاء' میں بیان کی ہے اور دیلمی نے 'مسندِ فردوس' میں۔ ابدال چالیس مرد اور چالیس عورتیں ہیں۔ جب ان میں سے کوئی مرد مر جاتا ہے اللہ اس کی جگہ دوسرا مرد بدل دیتا ہے اور جب عورت مر جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری عورت بدل دیتا ہے۔"

۸۔ وَمِنْهَا خَبَرُ الْحَاكِمِ عَنْ عَطَاءٍ مُرْسَلًا اَلْأَبْدَالُ مِنَ الْمَوَالِي...

(فیض القدیر، شرح الجامع الصغیر، ۱۷۰:۳)

حاکم کی حدیث۔ "ابدال موالی میں سے ہیں۔"

۹۔ وَمِنْهَا خَبَرُ ابْنِ أَبِي الدُّنْيَا مُرْسَلًا. عَلَامَةُ أَبْدَالِ أُمَّتِي أَنَّهُمْ لَا يَلْعَنُونَ شَيْئًا أَبَدًا...

(الأولیاء، صفات الابدال، ۲۸:۱)

ابن ابی الدنیا، الاولیاء۔ "میری امت کے ابدالوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کبھی کسی چیز پر لعن طعن نہیں کرتے۔"

۱۰۔ وَمِنْهَا خَبَرُ ابْنِ حِبَّانَ. لَنْ تَخْلُوَ الْأَرْضُ مِنْ ثَلَاثِينَ مِثْلِ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلِ الرَّحْمٰنِ... بِهِمْ تُغَاثُونَ وَبِهِمْ تُرْزَقُونَ وَبِهِمْ تُمْطَرُونَ... (المجروحین لابن حبان، ۶۱:۲)

ابن حبان۔ "تیس اور اسی مردوں سے زمین خالی نہ رہے گی جو مثل ابراہیم خلیل اللہ کے ہوں گے، جن کے سبب سے تمہاری فریاد رسی ہوگی، ان کے سبب سے تمہیں رزق دیا جائے گا اور بارش برسائی جائے گی۔"

۱۱۔ وَمِنْهَا خَبَرُ الْبَيْهَقِيِّ... أَنَّ أَبْدَالَ أُمَّتِي لَمْ يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِالْأَعْمَالِ وَلٰكِنْ إِنَّمَا دَخَلُوهَا بِرَحْمَةِ اللهِ وَسَخَاوَةِ الْأَنْفُسِ وَسَلَامَةِ الصُّدُورِ... الخ

(شعب الایمان، الجود والسخاء، ۴۳۹:۷)

Scanned with CamScanner

بیہقی: "میری امت کے ابدال اپنے اعمال کے سبب سے جنت میں داخل نہ ہوں گے بلکہ اللہ کی رحمت سے، نفسوں کی سخاوت سے اور سینوں کی سلامتی سے داخل ہوں گے۔"

۱۲- وَمِنْهَا خَبَرُ ابْنِ عَدِيٍّ فِيْ كَامِلِهٖ: اَلْبُدَلَاءُ اَرْبَعُوْنَ اِثْنَانِ وَعِشْرُوْنَ بِالشَّامِ وَثَمَانِيَةَ عَشَرَ بِالْعِرَاقِ كُلَّمَا مَاتَ مِنْهُمْ وَاحِدٌ بَدَّلَ اللّٰهُ مَكَانَهٗ آخَرَ... فَاِذَا جَاءَ الْاَمْرُ قُبِضُوْا كُلُّهُمْ فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ... (الکامل فی ضعفاء الرجال، ۶:۳۷۸)

ابن عدی۔ "ابدال چالیس ہیں، بائیس شام میں ہوتے ہیں اور اٹھارہ عراق میں۔ ان میں سے جو فوت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دیتا ہے اور جب اللہ کا حکم آجائے گا سب فوت ہو جائیں گے، اس وقت قیامت آئے گی۔"

۱۳- وَمِنْهَا خَبَرُ الطَّبَرَانِيِّ فِي الْاَوْسَطِ: لَنْ تَخْلُوَ الْاَرْضُ مِنْ اَرْبَعِيْنَ رَجُلًا مِثْلَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِ الرَّحْمٰنِ فَبِهِمْ يُسْقَوْنَ وَبِهِمْ يُنْصَرُوْنَ مَا مَاتَ مِنْهُمْ اَحَدٌ اِلَّا اَبْدَلَ اللّٰهُ مَكَانَهٗ آخَرَ...
(المعجم الاوسط، ۴:۲۴۷)

حدیثِ طبرانی: "چالیس مرد جو مثل خلیل اللہ کے ہیں ان سے زمین کبھی خالی نہ ہوگی۔ ان کی وجہ سے ان پر بارش برسائی جائے گی اور انہیں مدد دی جائے گی۔ جب ان میں سے کوئی فوت ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دے گا۔"

۱۴- وَمِنْهَا خَبَرُ اَبِيْ نُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ: لَا يَزَالُ اَرْبَعُوْنَ رَجُلًا مِنْ اُمَّتِيْ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ اِبْرَاهِيْمَ، يَدْفَعُ اللّٰهُ بِهِمْ عَنْ اَهْلِ الْاَرْضِ يُقَالُ لَهُمُ الْاَبْدَالُ...
(حِلیة الأولیا وطبقات الأصفیا، ۴:۱۷۳)

حدیثِ ابی نعیم:

"میری امت میں چالیس مرد ہمیشہ ایسے رہیں گے جن کے قلوب قلبِ ابراہیم علیہ السلام کی مانند ہوں گے، ان کی وجہ سے اہلِ زمین سے تکالیف دور کی جائیں گی۔ ان کو ابدال کہا جاتا ہے۔"

وَمِمَّا جَاءَ فِي الْقُطْبِ كَمَا قَالَ بَعْضُ الْمُحَدِّثِيْنَ خَبَرُ اَبِيْ نُعَيْمٍ فِي الْحِلْيَةِ... اَنَّهٗ وَرَدَتْ اَحَادِيْثُ تُؤَيِّدُ كَثِيْرًا مِمَّا فِيْهِ مِمَّا جَاءَ فِيْ جَمِيْعِ مَنْ ذُكِرَ وَغَيْرِهِمْ حَدِيْثُ التِّرْمِذِيِّ الْحَكِيْمِ وَاَبِيْ نُعَيْمٍ فِيْ كُلِّ قَرْنٍ مِنْ اُمَّتِيْ سَابِقُوْنَ وَحَدِيْثُ اَبِيْ نُعَيْمٍ لِكُلِّ قَرْنٍ مِنْ اُمَّتِيْ سَابِقُوْنَ... (الفتاوی الحدیثیة، ۱:۲۳۲)

"اور قطب کے متعلق جو بیان ہوا، جیسا بعض محدثین نے لکھا ہے۔ ابو نعیم نے 'حلیہ' میں بیان کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں اس کی تائید میں وارد ہو چکی ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے، اور وہ بھی جو مذکور نہیں۔ مثلاً حدیث حکیم ترمذی اور ابو نعیم کہ ہر زمانہ میں میری امت میں سابقون ہوں گے اور ہر زمانہ کے لیے سابقون ہوں گے۔"

Scanned with CamScanner

تنبیہ:

مذکورہ بالا احادیث کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے۔اس سلسلے میں علامہ سیوطی کی تحقیق ملاحظہ ہو:

وَقَدْ وَرَدَ ذِكْرُ الْأَبْدَالِ أَيْضًا مِنْ حَدِيْثِ عَلِيٍّ أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ فِي مُسْنَدِهِ وَسَنَدُهُ حَسَنٌ وَلَهُ عِدَّةُ طُرُقٍ
مُتَعَدِّدَةٍ وَمِنْ حَدِيْثِ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَسَنَدُهُ حَسَنٌ وَمِنْ حَدِيْثِ عَوْنِ بْنِ مَالِكٍ
أَخْرَجَهُ الطَّبْرَانِيُّ وَمِنْ حَدِيْثِ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ أَخْرَجَهُ أَبُوْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْبَلْخِيُّ فِي كِتَابِ سُنَنِ الصُّوفِيَّةِ وَ
مِنْ حَدِيْثِ أَبِي الدَّرْدَاءِ أَخْرَجَهُ الْحَكِيْمُ التِّرْمِذِيُّ فِي نَوَادِرِ الْأُصُوْلِ وَمِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَخْرَجَهُ ابْنُ
حِبَّانَ فِي الضُّعَفَاءِ وَالْخَلَّالُ فِي كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ وَمِنْ حَدِيْثِ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي
شُعَبِ الْإِيْمَانِ وَمِنْ حَدِيْثِ أُمِّ سَلَمَةَ أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَأَبُوْ دَاوُدَ فِي سُنَنِهِ وَالْحَاكِمُ
وَالْبَيْهَقِيُّ وَمِنْ مُرْسَلِ الْحَسَنِ أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي الدُّنْيَا فِي كِتَابِ السَّخَاءِ وَالْحَكِيْمِ التِّرْمِذِيِّ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي
الشُّعَبِ الْإِيْمَانِ. وَمِنْ مُرْسَلِ عَطَاءٍ أَخْرَجَهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَمِنْ مُرْسَلِ بَكْرِ بْنِ خُنَيْسٍ أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي
الدُّنْيَا فِي كِتَابِ الْأَوْلِيَاءِ وَوَرَدَ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ مَوْقُوْفًا أَخْرَجَهُ الْحَكِيْمُ التِّرْمِذِيُّ فِي نَوَادِرِ
الْأُصُوْلِ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَوْقُوْفًا أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ فِي الزُّهْدِ وَقَدْ جُمِعَتْ طُرُقُ هٰذِهِ الْحَدِيْثِ كُلُّهَا فِي
تَأْلِيْفٍ مُسْتَقِلٍّ... (فاغنی عن سوقها هُنَا الالی المصنوعه، ۲:۳۳۲)

علامہ سیوطیؒ نے تقریباً بیس کتب ورواۃ سے ابدال کی احادیث نقل کی ہیں، اور تمام کو صحیح اور حسن فرمایا ہے۔تمام طرق احادیث کو جمع کرنے پر قدر مشترک یعنی ابدال کا وجود یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا۔جس مستقل کتاب کا حوالہ علامہ موصوف نے دیا ہے اس کا نام ”الخبر الدّال من وجود القطب والنجبآء والابدال“ ہے جو ہمارے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

صوفیاء کی اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں

مناصب اولیاءاللہ جن میں اوتاد، ابدال، قطب، غوث وغیرہ ہیں ان پر بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں، صوفیا کی اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں۔یعنی مناصب کے جو نام اور اصطلاحات ہیں، ان کی بنیاد حدیث نبویؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر ہے۔اولیاءاللہ کے مختلف مناصب کے متعلق عام ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جن کے خلاف 'بدعت' کا نام لے کر نفرت پھیلائی جاتی ہے، انہیں دور کرنے کے لیے ذخیرۂ احادیث میں سے چند شواہد پیش کیے گئے ہیں۔اور صوفیا نے ان مناصب کے نام ذخیرۂ احادیث سے اخذ کیے ہیں۔

۱۔ ابونعیمؒ نے 'حلیہ' میں ذکر کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، میری امت میں ہر زمانہ میں پانچ سو اخیار ہوں گے اور چالیس ابدال ہوں گے۔ان دونوں میں کمی نہ ہوگی۔ان میں سے جو فوت ہوگا ان پانچ سو میں سے اس کی جگہ

Scanned with CamScanner

اللہ تعالیٰ دوسرے شخص کو ان چالیس میں داخل کردے گا۔

۲۔ امام احمدؒ کی روایت کردہ حدیث میں ہے، اس امت میں تیس ابدال ہوں گے جن کے قلوب حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قلوب پر ہوں گے۔ ان میں جو فوت ہوگا اللہ اس کی جگہ دوسرا بدل دے گا۔

۳۔ حدیث طبرانی: ان میں ابدال ہوں گے جن کے سبب تمہاری مدد کی جائے گی اور تمہیں رزق دیا جائے گا۔

۴۔ ابدال شام میں ہوتے ہیں اور وہ چالیس مرد ہیں۔ ان کے سبب سے تمہیں بارش دی جاتی ہے اور ان کی وجہ سے دشمنوں پر تمہیں فتح دی جاتی ہے اور ان کے سبب سے اہلِ زمین سے تکالیف اور مصائب دور کیے جاتے ہیں۔

۵۔ ابدال اہلِ شام میں ہوں گے، ان کی وجہ سے تمہیں مدد دی جائے گی اور تمہیں رزق دیا جائے گا۔

۶۔ ابدال شام میں ہیں اور وہ چالیس مرد ہیں، جو ان میں فوت ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دیتا ہے۔ ان کے سبب سے تمہیں بارش دی جاتی ہے اور دشمنوں کے مقابلہ میں امداد دی جاتی ہے اور اہلِ شام سے ان کے سبب سے عذاب دور کیا جاتا ہے۔

۷۔ خلال کی حدیث جو اس نے 'کراماتِ اولیاء' میں بیان کی اور دیلمی نے 'مسندِ فردوس' میں حدیث بیان کی ہے کہ "ابدال چالیس مرد اور عورتیں ہیں۔ جب ان میں سے کوئی مرد مر جاتا ہے تو اللہ اس کی جگہ دوسرا مرد بدل دیتا ہے۔ جب عورت مر جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری عورت بدل دیتا ہے۔" (اس میں مردوں کے ساتھ خواتین کا ذکر بھی ہے)

۸۔ حاکم کی حدیث کہ ابدال موالی میں سے ہیں۔

۹۔ ابن ابی الدنیا کی حدیث میں ہے میری امت کے ابدالوں کی نشانی یہ ہے کہ کسی چیز پر لعن طعن نہیں کرتے۔

۱۰۔ تیس اور اسی مردوں سے زمین خالی نہ رہے گی جو مثل ابراہیم خلیل اللہ کے ہوں گے جن کے سبب سے تمہاری فریادرسی ہوگی۔ ان کے سبب سے تمہیں رزق دیا جائے گا اور بارش برسائی جائے گی۔

۱۱۔ میری امت کے ابدال اپنے اعمال کے سبب سے جنت میں داخل نہ ہوں گے بلکہ اللہ کی رحمت سے، سینوں کی سلامتی سے داخل ہوں گے۔

۱۲۔ ابن عدی۔ ابدال چالیس ہیں، بائیس شام میں ہوتے ہیں اور اٹھارہ عراق میں۔ ان میں سے جو فوت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دیتا ہے اور جب اللہ کا حکم آجائے گا سب فوت ہو جائیں گے اور اس وقت قیامت آجائے گی۔

۱۳۔ حدیثِ طبرانی۔ چالیس مرد جو مثل خلیل اللہ کے ہیں ان سے زمین کبھی خالی نہ ہوگی۔ ان کی وجہ سے تمہیں بارش دی جائے گی اور تمہیں مدد دی جائے گی۔ جب ان میں سے کوئی فوت ہوا اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دے گا۔

۱۴۔ حدیث ابی نعیم میں ہے، میری امت میں چالیس مرد ہمیشہ ایسے رہیں گے جن کے قلوب، قلوبِ ابراہیمؑ کی مانند ہوں گے۔ ان کی وجہ سے اہلِ زمین سے تکالیف دور کی جائیں گی ان کو ابدال کہا جاتا ہے۔

اور قطب کے متعلق جو بیان ہوا جیسا بعض محدثین نے لکھا ہے۔ ابو نعیم نے 'حلیہ' میں بیان کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں اثر

Scanned with CamScanner

کی تائید میں وارد ہو چکی ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے اور وہ بھی جو مذکور نہیں، مثلاً حدیث حکیم ترمذی اور ابو نعیم کہ ہر زمانے میں میری امت میں سابقون ہوں گے اور ہر زمانہ کے لیے سابقون ہوں گے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ان کی وجہ سے لوگوں سے بلائیں دور ہوتی ہیں، مدد کی جاتی ہے، رزق دیا جاتا ہے بارشیں برسائی جاتی ہیں۔

مناصب اولیاء اللہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سب چیزیں دینے والا تو اللہ ہے اور ان چیزوں کو مناصب اولیاء اللہ کے ساتھ جوڑ دینا شرک ہو جائے گا، یا جو آواز ذرا آہستہ رکھتے ہیں وہ بدعت کہہ دیتے ہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ مناصب اولیاء اللہ بالکل اسی طرح ہیں جیسے باقی مخلوق میں سورج، چاند، ستارے ہیں۔ سورج کی دھوپ، تمازت اور گرمی سے ہر چیز میں نمو پیدا ہوتی ہے۔ سورج کی گرمی زمین سے چیزوں کے اگنے کا سبب ہے۔ چاند کی چاندنی پھلوں میں مٹھاس بھرتی ہے۔ جس کا تجربہ ہم نے اپنے باغ میں بھی کیا کہ چاند کی پہلی راتوں میں انجیر میٹھے تھے جبکہ آخری راتوں کے انجیر کم میٹھے تھے۔ تو اس میں کوئی شرک نہیں آتا چونکہ چاند کو مٹھاس کا اور سورج کو اس کی روئیدگی کا سبب اللہ نے بنایا ہے۔ سورج اور چاند اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان کی وجہ سے زمین پر کیا کیا تبدیلیاں آرہی ہیں۔ سویڈن میں بہت سالوں پہلے تجربہ کیا گیا کہ سمندر میں دیوار نما رکاوٹ بنادی جائے کہ اس تک لہریں آئیں، آگے پانی پُرسکون رہے (چونکہ سمندری لہروں کا اثر بندرگاہ تک آتا تھا)، اور ایک طرف سے جہازوں کے آنے جانے کا راستہ رہے، چنانچہ انہوں نے دیوار بنادی۔ جب بن گئی تو سمندر کی طرف اس کے اندر مچھلیاں مرنا شروع ہو گئیں۔ اس پر ریسرچ (Research) ہوئی تو پتہ چلا کہ جب چاند پوری قوت سے چمک رہا ہوتا ہے تو سمندر میں مدوجزر آتا ہے اور پانی میں بڑی بڑی لہریں اٹھتی ہیں جس سے پانی بدلتا رہتا ہے۔ نیچے والا اوپر آجاتا ہے اور اوپر والا نیچے چلا جاتا ہے۔ چونکہ نیچے والے پانی میں سمندری حیات کی وجہ سے آکسیجن کی مقدار کم ہوتی رہتی ہے، پانی بدلتا ہے تو اوپر نیچے آکسیجن پوری ہو جاتی ہے۔ دیوار بنانے سے اس کے آگے لہریں آنا بند ہو گئیں اور پانی تبدیل نہیں ہوا، ساکن ہو گیا جس سے نیچے والے پانی میں آکسیجن کم ہو گئی، اس لیے سمندری حیات نے مرنا شروع کر دیا۔ اب چاند کو تو خبر نہیں کہ میری کرنوں سے یا میرے طلوع ہونے سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسی طرح یہ ضروری بھی نہیں کہ اصحابِ مناصب کو پتہ ہو کہ میرے پاس یہ منصب ہے۔ ایک تو یہ من جانب اللہ ہوتا ہے اور اس دنیا میں بعض حضرات کو علم بھی ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ سب کو اس کا علم ہو۔ دوسرا جس طرح اللہ نے سورج، چاند، ستاروں کے سفر میں برکت رکھ دی ہے اسی طرح ابدال، قطب اور غوث وغیرہ کے وجود میں بھی برکات رکھ دی ہیں اور کسی ولی اللہ کو قطعاً پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے وجود کی برکت سے کہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس میں اس بندے کا کوئی تصرف نہیں ہے۔ یہ برکات من جانب اللہ ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں لہٰذا یہ اعتراض کہ یہ شرک اور بدعت ہے، فضول ہے۔

Scanned with CamScanner

باب (11)

مناصب اولیاء اللہ پر تفصیلی بحث

ابدال، قطب، غوث، قیوم وغیرہ اولیاء اللہ کی خاص اصطلاحات ہیں۔ ان کے متعلق بزرگانِ دین اور صوفیاء کرام کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ یہ کوئی مافوق الفطرت، متصرف، خود مختار، نافع وضار، عالم الغیب، حاضر و ناظر یا مسجود و خلاق ہستیاں ہیں جن کو غائبانہ فریادرسی کے لیے پکارنا جائز ہو۔ بعض اہلِ بدعت نے ان سے غلط مفہوم لیا ہے، خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔ ادھر بعض غالی حضرات نے لفظ غوث پر خواہ مخواہ اعتراض کیے ہیں۔ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

غوث اور قیوم کی اصطلاحات تمام کتبِ نظامیہ میں موجود ہیں اور بڑے بڑے موحدوں نے اپنی ذاتی تحریروں میں یہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ مولانا حسین علی صاحب نے 'فوائد عثمانیہ' میں کئی مقامات پر لفظ غوث استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنی کتاب 'تفسیر مظہری' میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

مناصب اولیاء اللہ پر تفصیلی بحث

ابدال، قطب، غوث، قیوم اولیاء اللہ کے مناصب کے لیے خاص اصطلاحات ہیں۔ ابدال ہیں، پھر ان کے بعد اگلا درجہ قطب کا ہے، قطب سے اعلیٰ غوث ہوتا ہے اور غوث سے آگے صدیوں بعد کوئی ترقی کر کے قیوم بنتا ہے اور اس سے اوپر قطب وحدت کا منصب ہے۔ ان کے متعلق صوفیا کا عقیدہ ہرگز یہ نہیں کہ یہ کوئی مافوق الفطرت ہستیاں، کوئی سپرمین (Superman) ہیں، یا دنیا کے امور میں ان کا کوئی تصرف یا اختیار ہے، یا وہ خود مختار ہیں۔ کسی کو اپنی مرضی سے نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں، یا غیب کی خبریں جانتے ہیں، یا نعوذ باللہ! وہ سجدہ کے لائق ہیں۔ یہ بھی ہرگز کسی صوفی کا عقیدہ نہیں کہ انہیں مصیبت کے وقت دادرسی یا فریادرسی کے لیے پکارنا جائز ہے۔ یہ سب بدعات ہیں جو بے دین لوگوں نے ایجاد کی ہیں۔ بعض اہلِ بدعت نے ان ناموں سے غلط مفہوم جوڑ دیئے اور اپنی مرضی کی صفات ان سے وابستہ کر دیں۔ خود گمراہ ہوئے، اوروں کو بھی گمراہ کیا۔ اس کے برعکس بعض غالی (غل مچانے والے) حضرات نے لفظ غوث پر خواہ مخواہ اعتراض کیے۔ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔

کچھ لوگوں نے ان سے اتنی امیدیں وابستہ کر لیں کہ انہیں وہ مقام دے دیا جو ذاتِ باری کا ہے، اِس طرف غلو کر لیا۔ اور کچھ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگا دیئے، اور اُس طرف زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ غوث، قیوم کی اصطلاحات تمام کتبِ نظامیہ میں موجود ہیں اور بڑے بڑے موحدوں نے اپنی ذاتی تحریروں میں استعمال کی ہیں۔ مولانا حسین علی ضلع میانوالی واں بھچراں کے رہنے والے، بڑے عالم اور بہت سے علماء کے استاد تھے۔ ہمارے ہاں وہ لوگ جو اپنے آپ کو توحیدی کہتے ہیں ان

Scanned with CamScanner

کے ساتھ مولانا کی وابستگی تھی۔ حضرتؒ نے اُن کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب 'فوائد عثمانیہ' میں کئی جگہ لفظ غوث استعمال کیا ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنی تفسیر 'تفسیر مظہری' میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ جو لوگ لفظ غوث پر اعتراض کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غوث کا مطلب 'فریادرس' ہے اور فریادرسی صرف اللہ کی صفت ہے۔ اوّل تو غوث کا یہ مطلب ہی نہیں۔ دوسرے یہ اصطلاحات ہیں، ان کے لغوی معنی پر جانا جہالت ہے۔

غوث اور قطب

صوفیاء کی بعض اصطلاحات کی اصل تو خود قرآن وحدیث میں موجود ہے، جیسے ابرار، اخیار اور نقباء وغیرہ۔ علامہ سیوطیؒ نے ان اصطلاحات پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کر آئے ہیں، اس رسالہ میں غوث اور قطب کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فِي الْخَلْقِ ثَلَاثَ مِائَةٍ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ اٰدَمَ وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ اَرْبَعُوْنَ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ مُوْسٰى وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ سَبْعَةٌ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ اِبْرَاهِيْمَ وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ خَمْسَةٌ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ جِبْرَائِيْلَ. وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ ثَلَاثَةٌ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ مِيْكَائِيْلَ وَلِلّٰهِ فِي الْخَلْقِ وَاحِدًا قَلْبُهٗ عَلٰى قَلْبِ اِسْرَافِيْلَ...

(الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال، ۱۵)

"ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے تین سو بندے مخلوق میں ہیں جن کے قلوب حضرت آدمؑ کے قلب کی مانند ہیں۔ چالیس ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ سات ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کے سے ہیں۔ پانچ ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قلب پر ہیں۔ تین ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت میکائیل علیہ السلام کے قلب پر ہیں اور ایک ایسا بندہ ہے جس کا قلب اسرافیلؑ کے قلب پر ہے۔"

نیز فرمایا:

وَاَخْرَجَ الْخَطِيْبُ مِنْ طَرِيْقِ عَبْدِاللهِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْعَبَسِيِّ (وَهُوَ الْحَافِظُ اَبُوْ بَكْرِ ابْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ) قَالَ سَمِعْتُ الْكِتَانِيَّ ، يَقُوْلُ: اَلنُّقَبَاءُ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَالنُّجَبَاءُ سَبْعُوْنَ وَ الْبُدَلَاءُ اَرْبَعُوْنَ وَالْاَخْيَارُ سَبْعَةٌ وَالْعَمَدُ اَرْبَعَةٌ وَالْغَوْثُ وَاحِدٌ...

(الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال، ۲۳)

"خطیب نے بذریعہ ابوبکر ابن ابی شیبہ حدیث کا اخراج کیا کہ میں نے کنانی سے سنا کہ نقباء تین سو ہیں اور

نجباء ستر ہیں، ابدال چالیس ہیں، اخیار چھ، قطب چار اور غوث ایک ہے۔"

نیز فرمایا:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ تَخْلُوَ الْاَرْضُ مِنْ اَرْبَعِيْنَ رَجُلًا مِثْلَ خَلِيْلِ الرَّحْمٰنِ فِيْهِمْ تُسْقَوْنَ وَبِهِمْ تُنْصَرُوْنَ ...الخ. قَالَ الهيثمی فی مجمع الزوائد اسنادہ حسن...

(الخبر الدال علی وجود القطب والا وتاد والنجباء والابدال:۱۱،۱۲)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ چالیس آدمیوں سے زمین خالی نہ رہے گی جو مثل خلیل اللہ کے ہیں، تو ان کی وجہ سے تم پر بارش برسائی جائے گی اور ان کی وجہ سے تمہاری مدد کی جائے گی اور ان کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جائے گا۔'مجمع الزوائد' میں ہے کہ اس کے اسناد حسن ہیں۔"

فائدہ:

حضرت انسؓ کی حدیث کے شواہد کثیر حدیثوں میں موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تفصیل خطیب کی حدیث نے کر دی۔ ان روایات سے چار قطب اور ایک غوث کے مناصب ثابت ہوئے۔

اقطاب کے فرائض کے متعلق امام ربانیؒ نے تصریح فرما دی ہے۔

غوث اور قطب

صوفیاء کے مناصب کی بہت سی اصطلاحات (وہ مخصوص نام جو کسی چیز، عہدے، شخص وغیرہ کے لیے ہو۔ عموماً اس کی اپنے لغوی معنیٰ سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی) کی اصل قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ مثلاً ابرار، اخیار اور نقباء۔ علامہ سیوطیؒ نے ان اصطلاحات پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ اس رسالے میں حافظ سیوطیؒ نے تقریباً باون (۵۲) احادیثِ مبارکہ کو جمع کیا ہے۔

اصولِ حدیث میں یہ ایک طے شدہ اصول ہے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث مقبول ہے اور فضائلِ رجال میں تو اس سے بھی ضعیف تر مقبول ہے۔ اس اصول کا اطلاق اقطاب و ابدال کے وجود کے اثبات میں کیوں نہ کیا جائے تاکہ اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔

اپنے رسالہ 'الخبر الدال' میں علامہ سیوطیؒ غوث اور قطب کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(ترجمہ) "ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے تین سو بندے مخلوق میں ہیں جن کے قلوب حضرت آدمؑ کی مانند ہیں۔ چالیس ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت موسیٰؑ کے قلب کی مانند ہیں۔ سات ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت ابراہیمؑ کے قلب پر ہیں، تین ایسے ہیں جن کے قلوب حضرت میکائیلؑ کے قلب پر ہیں اور ایک بندہ ایسا ہے جس کا قلب حضرت اسرافیلؑ کے قلب پر ہے۔"

Scanned with CamScanner

نیز فرمایا،

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

چالیس آدمیوں سے زمین خالی نہ رہے گی جو مثل خلیل اللہ کے ہیں۔ ان کی وجہ سے تم پر بارش برسائی جائے گی اور ان کی وجہ سے تمہاری مدد کی جائے گی اور ان کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جائے گا۔

'الزوائد' میں ہے کہ ان کے استاد (امام) حسنؓ ہیں۔ نیز فرمایا،

خطیب نے بذریعہ ابوبکر ابن ابی شیبہ حدیث کا اخراج کیا ہے کہ "میں نے کتانی سے سنا کہ نقباء تین سو ہیں اور نجباء ستر ہیں، ابدال چالیس ہیں، اخیار سات ہیں، قطب چار اور غوث ایک ہے۔"

یہاں جو ایک حدیث مبارکہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ "ان کی وجہ سے تم پر بارش برسائی جائے گی اور ان کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جائے گا۔" یہ صورت وہی ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جس طرح سورج چاند ستاروں کی وجہ سے مختلف چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں جن کا چاند سورج ستاروں کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

اولیاء اللہ کی برکات بھی مخلوق میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ خود انہیں بھی علم ہو۔ کچھ صاحب منصب حضرات کو اپنے منصب کا دنیا ہی میں پتہ ہوتا ہے، ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اپنے عہدے کی آگاہی نہیں ہوتی۔ برزخ میں جاتے ہیں تو سمجھ آ جاتی ہے کیونکہ وہاں تمام چیزیں سامنے آ جاتی ہیں۔

یہاں ایک وضاحت اور بھی کرتا چلوں کہ ابدال کا شام میں یا عراق میں ہونا ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ یہ لوگ وہاں موجود تھے اور اب کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ جس طرح وقت بدلتا رہتا ہے، افراد بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح ملک اور جگہیں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

اقطاب کے فرائض

قطب ابدال واسطه وصولِ فیض است که وجودِ عالم به بقائے آں تعلق دارد۔ و قطب ارشاد واسطۂ فیوض است که بارشاد و ہدایت تعلق دارد۔ پس تخلیق و ترزیق و ازاله بلیات و دفع امراض و حصولِ عافیت و صحت منسوط به فیوض مخصوصه قطب ابدال است و ایمان و ہدایت و توفیق حسنات و انابت از سئیات نتیجه فیوضات قطب ارشاد است۔ (معارف لدنیہ: ۴۴)

"قطب ابدال عالم کے وجود اور اس کی بقا سے تعلق رکھنے والے امور میں وصولِ فیض کا واسطہ ہے اور قطب ارشاد ہدایت و ارشاد سے متعلق امور میں وصولِ فیض کا ایک واسطہ ہے۔ اس لیے پیدائش، رزق،

Scanned with CamScanner

مصائب کے دور ہونے اور صحت وآرام کے حاصل ہونے کا تعلق قطب ابدال کے فیض کے ساتھ مخصوص ہے، اور ایمان، ہدایت، نیک کاموں کی توفیق اور توبہ وغیرہ کا تعلق قطب ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے۔"

اقطاب کے فرائض:

قطب ابدال

فرماتے ہیں قطب ابدال کے واسطہ سے جو فیوض حاصل ہوتے ہیں ان سے وجودِ عالم کی بقا کا تعلق ہے۔ نظام کائنات کا چلنا، چیزوں کا پیدا ہونا، رزق دیا جانا، مصیبتوں اور بیماریوں کا دور ہونا، عافیت وصحت، یہ سب امور قطب ابدال کے وجود سے متعلق ہوتے ہیں۔

قطب ارشاد

قطب ارشاد کے واسطہ سے، برکات کی وجہ سے جو فیوض حاصل ہوتے ہیں ان سے رشد وہدایت کا تعلق ہے۔ فیض وبرکات، ایمان وہدایت، نیکی کی توفیق، برائیوں سے بچنا اور انابت الٰہی، یہ نتیجہ ہوتا ہے فیوضاتِ قطب ارشاد کا۔ یعنی ان مبارک وجودوں کے ساتھ ایسی چیزیں منسلک کردی جاتی ہیں۔

قطب مدار

اور قطب مدار کے متعلق قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ نے حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت خضر ؑ کے واقعہ کے تحت امام ربانی ؒ سے حضرت خضر ؑ کا قول نقل فرمایا ہے:

وَجَعَلَنَا اللّٰهُ تَعَالٰى مُعِيْنًا لِّلْقُطْبِ الْمَدَارِ مِنْ اَوْلِيَآءِ اللّٰهِ تَعَالٰى الَّذِيْ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَدَارًا لِّلْعَالَمِ جَعَلَ بَقَاءَ الْعَالَمِ بِبَرَكَتِهٖ وُجُوْدِهٖ وَاِفَاضَتِهٖ وَقَالَ الْخَضِرُ اَنَّ الْقُطْبَ فِيْ هٰذِهِ الزَّمَانِ فِيْ دِيَارِ الْيَمَنِ مُتَّبِعٌ لِّلشَّافِعِيِّ فِي الْفِقْهِ قَالَ فَنَحْنُ نُصَلِّيْ مَعَ الْقُطْبِ... (تفسیر مظہری،٦:٦٢)

"حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطب مدار کا معاون بنایا ہے جو اولیاء اللہ سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بقا کا سبب بنایا ہے۔ اس کے وجود کی برکت سے بقائے عالم ہے۔ اور فرمایا کہ اس وقت قطب مدار یمن میں ہے اور وہ شافعی فقہ کا متبع ہے اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔"

اور وہ حدیث جس کو علامہ سیوطی ؒ نے کتانی سے روایت کیا، اس کے آخر میں 'والغوث واحد' کے آگے روایت یوں ہے:

فَمَسْكَنُ النُّقَبَآءِ الْمَغْرِبُ وَ مَسْكَنُ النُّجَبَآءِ مِصْرُ وَ مَسْكَنُ الْاَبْدَالِ الشَّامُ...

Scanned with CamScanner

وَالْاَخْيَارُ سَيَّاحُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَالْعَمَدُ فِي زَوَايَا الْاَرْضِ وَ مَسْكَنُ الْغَوْثِ مَكَّةَ فَاِذَا عَرَضَتِ الْحَاجَةُ مِنْ اَمْرِ الْعَامَّةِ اِبْتَهَلَ فِيْهَا النُّقَبَاءُ ثُمَّ النُّجَبَاءُ ثُمَّ الْاَبْدَالُ ثُمَّ الْاَخْيَارُ ثُمَّ الْعَمَدُ فَاِنْ اُجِيْبُوْا وَاِلَّا ابْتَهَلَ الْغَوْثُ فَلَا تَتِمُّ مَسْئَلَتُهُ حَتّٰى تُجَابَ دَعْوَتُهُ... (الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال، ۲۴)

یعنی ''نقباء کا مسکن مغرب، نجباء کا مصر، ابدال کا شام ہے۔ اخیار سیاح ہوتے ہیں، قطب زمین کے گوشوں میں ہوتے ہیں۔ جب مخلوق کو عمومی مصیبت آجائے تو دعا کے لیے نقباء ہاتھ پھیلاتے ہیں، اگر قبول نہ ہو تو نجباء، پھر اخیار، پھر قطب، اگر پھر بھی قبول نہ ہو تو غوث دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے (گو یہ ترتیب ضروری نہیں) حتیٰ کہ اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔''

قطبِ مدار

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ نے حضرت موسیٰؑ و حضرت خضرؑ کے واقعہ کے تحت امام ربانیؒ کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت خضرؑ کا قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے قطبِ مدار کا معاون بنا دیا ہے''۔

حضرت خضرؑ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زندہ ہیں لیکن اعلیٰ حضرتؒ کی تحقیق یہ تھی کہ ان کا وصال ہو چکا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے تھے، ولی اللہ تھے۔ دراصل بعض ارواح جو زندگی میں اس قدر منور ہوتی ہیں کہ ان میں ملکوتیت آجاتی ہے وہ بعد از وفات ملاء اعلیٰ کے مناصب پر فائز کر دی جاتی ہیں اور ان ارواحِ مبارکہ کو فرشتوں کی طرح تکوینی امور پہ لگا دیا جاتا ہے۔ ان میں سے حضرت خضرؑ بھی تھے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے ان سے قول نقل کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطب مدار کا معاون بنا دیا ہے جو اولیاء اللہ میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بقا کا سبب بنا دیا ہے۔ اس کے وجود کی برکت سے بقائے عالم ہے۔'' اور فرمایا، ''اس وقت قطبِ مدار یمن میں ہے، وہ شافعی فقہ کا متبع ہے اور ہم اس کے پیچھے نماز ادا کیا کرتے ہیں۔''

ایک دفعہ ایک مجلس میں حضرتؒ تشریف فرما تھے۔ چند دوستوں کے ہمراہ میں بھی وہیں تھا، قاضی صاحب بھی تھے۔ قاضی صاحب اس بڑھاپے میں بھی بہت مجاہدہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا، ''حضرت کتنے نوافل پڑھتے ہیں؟'' کہنے لگے ''یار! اب بوڑھا ہو گیا ہوں، زیادہ نہیں پڑھے جاتے، صرف پانچ سو رکعت پڑھتا ہوں۔'' قاضی صاحب اکثر سجدے میں رہتے تھے۔ جہاں بکریاں چرانے جاتے تھے وہاں ایک تھڑا بطورِ مسجد بنا رکھا تھا، دن رات نوافل میں لگے رہتے، بہت یکسو تھے اور بہت تیز مشاہدات والے تھے۔ تو اُس محفل میں اعلیٰ حضرتؒ نے مزاقاً پوچھ لیا ''قاضی صاحب کوئی خضرؑ کی خبر بتا دیں، ان سے کوئی گزارش کرنی ہے۔'' قاضی صاحب نے مراقبہ کیا، تھوڑی دیر بعد کہنے لگے ''آسمانوں میں تو کہیں نہیں ہیں، بہت تلاش کیا ہے۔'' حضرتؒ نے فرمایا، ''پہلے زمینوں میں تو تلاش کر لو۔'' پھر مراقبہ کیا اور کہا ''حضرت زمینوں میں بھی کہیں نہیں ہیں۔'' اعلیٰ حضرتؒ بہت ہنسے کہ آسمانوں میں نہیں، زمینوں میں نہیں، تو پھر کہاں ہیں؟

Scanned with CamScanner

"خدا جانے حضرت از مین و آسمان میں نہیں مل رہے۔" حضرتؒ نے جواب دیا" جس کمرے میں بیٹھے ہو اس کا خیال کیا ہے؟" تو فوراً بولے" وہ تو یہ بیٹھے ہیں!" حضرتؒ نے فرمایا" میں نے اسی لیے آپ سے پوچھا تھا کہ یہ ہمیشہ قطب مدار کے ساتھ ہوتے ہیں، تو پھر وہیں ہوں گے جہاں قطب مدار موجود ہوگا۔"

اور وہ حدیث جسے علامہ سیوطیؒ نے کنانی سے روایت کیا ہے، اس کے آخر میں ''والغوث واحد'' کے آگے روایت یوں ہے:

''نقباء کا مسکن مغرب، نجباء کا مصر، ابدال کا شام ہے۔ اخیار سیاح ہوتے ہیں، قطب زمین کے گوشوں میں ہوتے ہیں۔ جب مخلوق کو عمومی مصیبت آجائے تو دعا کے لیے نقباء ہاتھ اٹھاتے ہیں، اگر قبول نہ ہو تو نجباء، پھر اخیار، پھر قطب، اگر پھر بھی قبول نہ ہو تو غوث دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے (یہ ترتیب بھی لازمی نہیں ہے)، حتیٰ کہ اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔''

یہ ترتیب بھی ضروری نہیں اور دعا کا قبول ہو جانا بھی لازمی نہیں۔ دراصل یہ عمومی قاعدہ بیان کیا گیا ہے اور جو یہ فرمایا گیا ہے کہ زمین کے فلاں حصے، فلاں ملک میں، تو یہ اُس وقت کے اعتبار سے تھا۔ اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ وہ ہستیاں ہمیشہ وہیں سے متعلق ہوں گی۔

قیوم

قیوم کے متعلق امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''آں عارفے کہ بہ منصب قیومیت اشیاء مشرف گشتہ است حکم وزیر دارد کہ مہمات مخلوق را باد مرجوع داشتہ اند ہر چند انعامات از سلطان است اما وصول آنہا مربوط بتوسط وزیر است۔'' (مکتوبات، دفتر دوم، حصہ ہفتم، مکتوب نمبر ۷۴: ص، ۲۱۰)

"وہ عارف جو قیوم کے منصب پر فائز ہو، وزیر کا حکم رکھتا ہے کہ مخلوق کے اہم امور کا تعلق اسی سے ہے، گو انعام تو بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں، مگر وہ وزیر کی وساطت سے ملتے ہیں۔"

فرد اور قطب وحدت کا مفہوم بعینہٖ وہ حدیث ہے جو رسول اللہ ﷺ سے بطور دعا غزوۂ بدر میں زبان پر آئی:

اَللّٰھُمَّ اِنْ تَھْلِكْ ھٰذِہِ الْعِصَابَةُ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ فَلَا تُعْبَدُ فِي الْاَرْضِ اَبَدًا...

(مسند احمد، مسند عمر بن الخطابؓ، ۱، ۳۴۵)

''الٰہی! اگر اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو آپ کی عبادت زمین میں کبھی نہ کی جائے گی۔''

معرفتِ توحید، فیضان کا عام اور جلد ہونا، قطب وحدت اور افراد کی خصوصیات میں سے ہے اور معرفتِ ذاتِ باری تعالیٰ اس سے وابستہ ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

قیوم

منصب قیوم کے بارے امام ربانیؒ نے جو ارشاد فرمایا، اس کا مطلب و مفہوم یوں ہے کہ جسے منصب قیومیت عطا ہو جائے تو قیوم وہ عارف باللہ شخص ہے کہ لوگوں میں اشیاء کی تقسیم اور مخلوق کی مشکلات کا حل اس ایک وجود سے وابستہ ہو جاتا ہے جیسے کہ اس کا مرتبہ وزیر کا سا ہو جاتا ہے۔ یعنی انعامات تو بادشاہ دیتا ہے لیکن لوگوں تک وزیر کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔ عطا رب کریم کی ہوتی ہے لیکن اس کے وجود کی برکت سے وہ سب مخلوق تک پہنچتا ہے۔ فرد اور قطب کا مفہوم بعینہ وہ حدیث ہے جو غزوۂ بدر کے موقع پر زبانِ اطہر رسول اللہ ﷺ پر بطور دعا آئی:

اَللّٰهُمَّ اِنْ تَهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ فَلَا تُعْبَدُ فِي الْاَرْضِ اَبَدًا...

"الٰہی! اگر اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو آپ کی عبادت زمین میں کبھی نہ کی جائے گی۔"

معرفتِ توحید، فیضان کا عام اور جلد ہونا، قطبِ وحدت اور 'افراد' کی خصوصیات میں سے ہے اور معرفتِ ذاتِ باری تعالیٰ اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ تو صحابہ کرامؓ میں جو تین سو تیرہ تھے ان کے بارے حضور اکرم ﷺ نے بدر میں دعا کی تھی کہ اے اللہ اگر یہ لوگ یہاں مارے گئے تو پھر قیامت تک کوئی پیشانی تیرے سجدے سے آشنا نہ ہوگی، تیری عبادت کسی کو نصیب نہ ہوگی۔ اس کی وجہ امام ربانیؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ لوگ 'افراد' میں سے تھے۔ وہ صحابہ کرامؓ اس منصب پر فائز تھے اور ان وجودوں سے معرفتِ توحید اور فیضان کا عام ہونا اور جلد ہونا وابستہ تھا کیونکہ یہ قطبِ وحدت اور افراد کی خصوصیات میں سے ہے کہ ان کے طفیل لوگوں کو معرفتِ الٰہی نصیب ہوتی ہے، فیوضِ روحانی تقسیم ہوتے ہیں اور تیزی سے تقسیم ہوتے ہیں۔

وہ تین سو تیرہ خادمانِ رسالت جو میدانِ بدر میں موجود تھے، اُن میں کچھ قطبِ وحدت تھے، کچھ 'افراد' تھے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے دعا فرمائی کہ اگر یہ لوگ یہاں کھیت رہے تو پھر معرفتِ الٰہی اور عباداتِ الٰہی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

انسانِ کامل

امام ربانیؒ فرماتے ہیں:

"معاملۂ انسانِ کامل تا بجائے رسد کہ او را قیوم جمیع اشیاء بحکم خلافت می سازند وہمہ را افاضہ وجود و بقائے و سائر کمالات ظاہری و باطنی بتوسط او می رسانند"۔
(مکتوبات امام ربانی، دفتر دوم، حصہ ہفتم، مکتوب نمبر ۴۷، ص ۲۰۹)

معلوم ہوا کہ قیوم انسانِ کامل ہوتا ہے اور کل احکامِ ظاہری و باطنی قیوم کی ذات سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ بمنزلہ وزیر کے ہے، یہ مفہوم حدیث سے بھی متبادر ہوتا ہے:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي... (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، باب فضیلۃ، ۳۲)

"میں تقسیم کنندہ ہوں، دیتا اللہ تعالیٰ ہے۔"

Scanned with CamScanner

قیوم، اولوالعزم رسول کا نائب ہوتا ہے۔ اس کا مخالف فیض سے محروم رہتا ہے کیونکہ وہ حکومت کے وزیر کا باغی ہوتا ہے اور باغی کو حکومت کی طرف سے انعام نہیں ملا کرتا۔

ہر چیز اچھی یا بری سلطان الملک یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وزیر کے ذریعے مخلوق کی طرف آتی ہے۔ جب مخلوق مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو غوث بارگاہِ رب العزت میں درخواست پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کی دعا قبول فرما کر مصیبت دور کر دیتا ہے۔ خیال رہے کہ غوث کوئی خود مختار ہستی نہیں بلکہ مستجاب الدعوات انسان ہوتا ہے۔ اسی طرح قیوم کل انعامات کا سبب ہوتا ہے، اور قطب ابدال اور قطب ارشاد جزوی انعامات کا ذریعہ ہیں اور خاص خاص ایک ایک انعام پر مقرر ہیں۔ اور قطب وحدت اور مفرد کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری سے ہوتا ہے، اس لیے ان کا مرتبہ غوث اور قیوم سے بہت بلند ہے۔

انسانِ کامل

امام ربانیؒ کے فرمان سے معلوم ہوا کہ قیوم انسانِ کامل ہوتا ہے لیکن اپنی حیثیت کے مطابق۔ الفاظ کی مماثلت سے اسے انبیاء کا مثیل نہ سمجھا جائے۔ نبیؐ کی شان اپنی ہے، صحابیؓ کی اپنی اور ولی کا اپنا مقام ہے۔ وہ اپنی حیثیت سے انسانِ کامل ہوتا ہے اور احکامِ ظاہری و باطنی قیوم کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں کیونکہ یہ بمنزلہ وزیر کے ہے۔

یہ مفہوم حدیث سے بھی متبادر ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ... ''کہ میں تقسیم کرنے والا ہوں، عطا اللہ کرتا ہے۔''

تو اسی طرح نائبِ نبوت قیوم یا فرد ہوتا ہے جس کی ذات سے چیزیں تقسیم ہوتی ہیں جو اللہ عطا فرماتا ہے۔ اس حدیث سے بھی یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے، ''میں تقسیم کنندہ ہوں، دیتا اللہ ہے۔''

قیوم، اولوالعزم رسول کا نائب ہوتا ہے۔ اس کا مخالف فیض سے محروم رہتا ہے۔ یاد رہے کہ قیوم، رسولوں میں سے بھی جو اولوالعزم رسول ہوتے ہیں، ان کا نائب ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس کی مخالفت کرے تو اسے اس کا کم از کم نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ اس ہستی کے ساتھ وابستہ برکات سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ حکومت کے وزیر کا باغی ہوتا ہے اور حکومت کے ایک عام عہدیدار سے بغاوت بھی حکومت سے بغاوت سمجھی جاتی ہے، چہ جائیکہ کوئی وزیر کا باغی ہو جائے اور باغی کو انعام نہیں ملا کرتا۔

ہر چیز اچھی یا بری سلطان الملک یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وزیر کے ذریعے مخلوق تک آتی ہے۔ وزرا یا عہدیدار جن کے ذریعے نظامِ حکومت چلایا جاتا ہے ان کا مقام و مرتبہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ حکم تو حاکم کا ہوتا ہے، خواہ وہ عطا ہے یا سزا، پہنچتی ان کے ذریعے سے ہی ہے۔ جب مخلوق مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے تو غوث بارگاہِ رب العزت میں درخواست پیش کرتا ہے اور اللہ سے عفو و درگزر کا طالب ہوتا ہے۔ اللہ چاہے تو اس کی دعا قبول فرما کر مصیبت دور کر دیتا ہے۔ یاد رہے! غوث کوئی خود مختار ہستی نہیں یعنی مرضی کا مالک نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مستجاب الدعوات ہوتا ہے اور اس کی اکثر دعائیں اللہ کریم قبول فرما لیتے ہیں۔ دعا ایک عاجزانہ درخواست ہوتی ہے۔ کسی بھی ہستی کی دعا حکم کا درجہ نہیں رکھتی کہ جو کچھ کوئی کہہ

Scanned with CamScanner

دے اللہ کریم اس کا پابند ہے کہ وہ ویسا ہی کرے۔ نہیں! ایسا نہیں ہوتا۔ قیوم تمام انعامات اور عنایات کا سبب بنتا ہے
قطب ابدال اور قطب ارشاد جزوی عنایات وانعام کا سبب بنتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، ایک طرح کے انعام پر متعین
ہے۔ یعنی قطب ارشاد سے بھی رشد وہدایت، ایک انعام وابستہ ہے۔ قطب ابدال سے بھی نظامِ عالم کا ایک حصہ وابستہ ہے
اور قطب وحدت اور فرد کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری سے ہوتا ہے، اس لیے ان کا مرتبہ غوث وقیوم سے بہت بلند ہے۔

لفظ غوث کی تشریح

'لسان العرب' میں لفظ غوث کی تشریح یوں کی گئی ہے:

غوث: اجاب اللہ غوثاہ... وغواثہ وغواثہ! (لسان العرب، مادہ غ۔و۔ث، ۲: ۱۷۴)

یعنی غوث اسم مصدر مبنی للفاعل ہے اور اس کے معنی ''پکارنے والا، دعا کرنے والا، فریاد کرنے والا'' ہوں گے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ محاورۂ عرب میں غوث بمعنی دعا اور پکار کے ہیں۔ جیسے لسان العرب میں ہے:

وَلَمْ يَأْتِ فِي الْأَصْوَاتِ شَيْءٌ بِالْفَتْحِ غَيْرَهُ وَإِنَّمَا يَأْتِي بِالضَّمِّ مِثْلَ الْبُكَاءِ وَالدُّعَاءِ وَبِالْكَسْرِ مِثْلَ النِّدَاءِ وَالصِّيَاحِ... (لسان العرب، مادہ غ۔و۔ث، ۲: ۱۷۴)

پس غوث اسم مصدر ہے جس کے معنی آواز دینا، پکارنا اور دعا کرنا ہے، جیسے:

وَغَوَّثَ الرَّجُلُ وَاسْتَغَاثَ صَاحَ وَغَوْثَاهُ... (لسان العرب، مادہ غ۔و۔ث، ۲: ۱۷۴)

اصطلاحِ صوفیاء میں غوث اُس مستجاب الدعوات ہستی کے لیے بولا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے اور دعا کرتا ہے، اور لغتِ عرب اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ اس لفظ کا معنی 'فریادرس' کرنا محض ایک عامیانہ رواج ہے۔

لفظ غوث کی تشریح

یہ جو ہم غوث کے معنی گھڑ لیتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے ''فریاد قبول کرنے والا'' اور پھر اس پر کفر کے فتوے لگتے ہیں، فرمایا کہ اگر 'لسان العرب' (جو کہ لغت کی بہت بڑی کتاب ہے) میں دیکھیں تو اس میں غوث کا معنیٰ دیا گیا ہے اجاب اللہ غوثاہ... ''اللہ اس کی فریاد سنتا ہے''، یعنی وہ خود فریاد سننے والا نہیں۔ بلکہ غوث اسے کہتے ہیں جس کی فریاد اللہ کریم سنتے اور قبول فرماتے ہیں۔ وہ فریاد کرنے والا ہوتا ہے۔ یعنی غوث اسم مصدر مبنی للفاعل ہے اور اس کا معنی پکارنے والا، دعا کرنے والا، فریاد کرنے والا ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ محاورۂ عرب میں غوث بمعنی دعا اور پکار کے ہیں، جیسے ''لسان العرب'' میں ہے:

وَلَمْ يَأْتِ فِي الْأَصْوَاتِ شَيْءٌ بِالْفَتْحِ غَيْرَهُ وَإِنَّمَا يَأْتِي بِالضَّمِّ مِثْلَ الْبُكَاءِ وَالدُّعَاءِ وَبِالْكَسْرِ مِثْلَ النِّدَاءِ وَالصِّيَاحِ...

پس غوث اسم مصدر ہے جس کے معنی آواز دینا، پکارنا اور دعا کرنا ہے، جیسے:
وَغَوَّثَ الرَّجُلُ وَاسْتَغَاثَ... جیسے کسی دعا کی پکار، استغاثہ، جیسے کسی نے پکارا۔
تو غوث دعائیں کرنے والا ہے، دعائیں قبول کرنے والا نہیں۔

اصطلاحِ صوفیاء میں غوث اُس مستجاب الدعوات ہستی کے لیے بولا جاتا ہے جو اللہ سے فریاد کرتا ہے اور دعا کرتا ہے، اور لغتِ عرب اس معنیٰ کی تائید کرتی ہے۔ اس کا معنیٰ 'فریاد رس' لینا ایک عامیانہ رواج ہے۔ جو لفظ 'غوث' پر اعتراض کرتے ہیں وہ اسی لیے کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک غوث کا معنیٰ 'دعائیں سننے والا، یا 'فریاد رس' ہے، 'فریادوں کو پہنچنے والا' ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرتؒ نے عربی لغت یعنی عربی ڈکشنری سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کا معنیٰ دعا کرنے والا، پکارنے والا ہے۔

مستجاب الدعوات ہونے کا مفہوم

عام طور پر یہ خیال ایک عقیدہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ جب کوئی انسان منازلِ سلوک طے کر کے عارف باللہ ہو جاتا ہے تو اس کی ہر دعا قبول ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعا بہرحال ایک درخواست ہے، حکم نہیں۔ دیکھیے! انبیاء علیہم السلام مستجاب الدعوات ہوتے ہیں مگر ان کی بھی ساری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ امام الانبیاء ﷺ کی شان اور مرتبہ سب انبیاءؑ سے ارفع ہے، مگر آپ ﷺ کی بھی وہ دعا جو رفعِ اختلافِ امت کے متعلق تھی منظور نہ ہوئی۔ تو یہ خیال کرنا کہ کسی عارف کی ہر دعا قبول ہو جاتی ہے سراسر زیادتی اور کم فہمی کی دلیل ہے۔

صوفیاء کرام کے نزدیک اولیاء اللہ میں سے صرف غوث، قیوم، فرد، قطب وحدت اور صدیق مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مستجاب الدعوات بنا دے تو ناممکن نہیں ہے۔ ان پانچ مناصب کے حضرات بھی کوئی خود مختار، مافوق الاسباب ہستیاں نہیں ہوتیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں اور اسی کے حضور دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ ان کا دعا کرنا ہی ان کے محتاج ہونے کی دلیل ہے اور یہ حضرات دعا بھی باذن اللہ ہی مانگتے ہیں۔ پس مستجاب الدعوات ہونے سے مراد یہ ہوئی کہ ان حضرات کی اکثر دعائیں قبول ہو جاتی ہیں اور اگر ان کی کوئی دعا قبول نہ ہو تو یہ ان کے منصب کے منافی نہیں۔ ہر کس و ناکس کی بھی تو بعض دعائیں قبول ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ ابلیس کی یہ درخواست اللہ تعالیٰ نے منظور فرمائی کہ رَبِّ أَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ... (الاعراف: ۱۴)۔ تو ایک دعا کے قبول ہونے سے یا بعض دعاؤں کے قبول ہونے سے آدمی مستجاب الدعوات نہیں ہو جاتا۔

مستجاب الدعوات ہونے کا مفہوم

یہ خیال عوام کے عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ اولیاء اللہ کی ہر دعا قبول ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دعا بہرحال ایک درخواست، ایک گزارش ہے، حکم ہرگز نہیں۔ اس مالک الملک کی مرضی ہے، قبول کرے یا نہ کرے۔

Scanned with CamScanner

انبیاءؑ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں مگر ان کی بھی ساری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ امام الانبیاء ﷺ کی شان اور مرتبہ تمام انبیاءؑ سے ارفع ہے۔ آپ ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں نے تین دعائیں کیں، دو منظور ہو گئیں لیکن تیسری منظور نہیں ہوئی۔ اور وہ دعا یہ تھی کہ میری امت میں کبھی اختلاف نہ ہو۔ آپ ﷺ کا فرمانا ہے کہ ''میری وہ دعا قبول نہیں ہوئی۔'' پھر اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھنا کہ عارف کی ہر دعا قبول ہو جاتی ہے، سراسر زیادتی اور کم فہمی ہے۔ صوفیاء کرام کے نزدیک اولیاء اللہ میں سے صرف غوث، قیوم، فرد، قطب وحدت اور صدیق مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اگر اللہ تعالیٰ کسی کو مستجاب الدعوات بنادے تو ناممکن نہیں ہے۔

ان پانچ مناصب کے حامل حضرات بھی کوئی خود مختار، مافوق الفطرت ہستیاں نہیں ہوتیں بلکہ اللہ کے محتاج ہیں۔ اسی کے حضور دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور ان کا دعا کرنا ہی ان کے محتاج ہونے کی دلیل ہے۔ یہ حضرات دعا بھی باذن اللہ ہی مانگتے ہیں۔ یہ ایسے عجیب لوگ ہوتے ہیں کہ ان کی دعا بھی ایک تدبیر ہے، اللہ کا ایک فیصلہ ہے۔ دعا کا معاملہ بھی اس طرح نہیں ہوتا کہ جب کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں دعا کر رہا ہے۔ مدعا کے بتانے سے پہلے ہی وہ بات اللہ کے علم میں ہوتی ہے، حتیٰ کہ دعا بھی علمِ الٰہی میں اور بتوفیقِ الٰہی ہوتی ہے۔ جب اللہ کسی کا بھلا کرنا چاہتا ہے تو ان ہستیوں کے دل میں بات ڈال دیتا ہے۔ یہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اللہ قبول فرما لیتا ہے۔

مستجاب الدعوات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اکثر دعائیں مقبول ہوتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ان کی ہر دعا حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ دعا ایک درخواست ہے، اللہ مالک ہے، قبول کرلے اُس کی مرضی، نہ قبول کرے اُس کی مرضی۔ وہ بہتر جانتا ہے۔ ان اولیائے کرام کی اکثر دعائیں اس لیے قبول ہوتی ہیں کہ یہ بے وقت کی دعائیں نہیں مانگتے۔ ان کے دل اس طرح بارگاہِ الٰہی سے جڑے ہوتے ہیں کہ یہ دعا بھی باذن اللہ مانگتے ہیں۔ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے، وہی اُن کے منہ سے نکلتا ہے۔ اب اُن کی کوئی دعا قبول نہ ہو تو یہ اُن کے منصب کے منافی نہیں۔ حضرت نوحؑ نے دعا کی ''یا اللہ! آپ کا وعدہ تھا، آپ میرے خاندان کو بچائیں گے تو میرا سگا بیٹا غرق ہو رہا ہے۔'' تو فرمایا: اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ... الخ (ہود:۴۶) وہ آپ کا بیٹا نہیں ہے، وہ آپ کی اولاد میں سے نہیں ہے، اس کا کردار خراب ہے، اس کے اعمال برے ہیں۔ اور پھر منع فرمایا کہ جن باتوں کی آپ کو سمجھ نہ آئے، آپ ان کے بارے میں دعا نہ کیا کریں۔ نوحؑ نے معذرت کی کہ یا اللہ! میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی دعا کا نہ قبول ہونا کسی کے منصب کے خلاف نہیں ہے، یہ اللہ کی مرضی ہے۔ ہر کس و ناکس کی دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات کوئی بندہ دعا کرتا ہے، قبول ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ ابلیس کی یہ درخواست اللہ نے منظور فرمائی، اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ... (الاعراف: ۱۴) شیطان کو راندۂ درگاہ کیا گیا، جب مردود ہوا تو اس نے کہا، یا اللہ مجھے قیامت تک مہلت دے دے تاکہ آدم، جس کو میں نے سجدہ نہیں کیا اور جس کی خاطر تُو نے مجھے مردود کیا، اس کی اولاد تجھے نہیں، مجھے سجدے کرے گی، لیکن مجھے مہلت تو دے کہ میں زندہ رہوں اور ان سے مقابلہ کروں۔ اس نے قیامت تک مہلت کی دعا مانگی تھی۔ اللہ نے فرمایا، میں تجھے دنیا کے خاتمے تک مہلت دیتا ہوں۔ ابلیس نے یہ چال چلی تھی کہ قیامت کے بعد تو موت

Scanned with CamScanner

نہیں ہے۔اس طرح وہ موت سے بچ جائے گا۔مگر اللہ کریم نے فرمایا کہ تجھے مہلت دوں گا مگر دنیا کے خاتمے تک، مرنا تجھے بھی پڑے گا۔اس نے دعا میں بھی چکمہ دینے کی کوشش کی مگر اللہ کے ساتھ تو ہیرا پھیری نہیں چلتی۔ اس نے اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ... (یعنی جب دوسرا صور پھونکا جائے گا اور لوگ دوبارہ زندہ ہوں گے) تک مہلت مانگی کیونکہ اس کے بعد موت نہیں ہے لیکن اس کی دعا اس ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی کہ اسے دنیا کے خاتمے تک مہلت مل گئی، لیکن مرنا اسے بھی پڑے گا۔

تو فرمایا کہ وہ چاہے تو شیطان کی دعا بھی منظور کر لے، وہ مالک ہے۔لہٰذا ایک دعا یا زیادہ دعاؤں کے قبول ہونے سے آدمی مستجاب الدعوات نہیں بن جاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ من جانب اللہ ایک فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے کہ آج بارش ہو گی۔میں دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! بارش دے، بارش اسی وقت شروع ہو جاتی ہے۔اب بندے کو یہ زعم نہیں ہونا چاہیے کہ میری دعا کی وجہ سے بارش ہوئی۔ مجھے سمجھنا چاہیے کہ اتفاقاً دعا میں نے اس وقت کی جب بارش ہونا تھی۔

ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب ہوا کرتے تھے۔منارہ گاؤں سے مغرب کی طرف ایک مسجد میں ایک جلسہ میں وعظ کر رہے تھے۔ یہ ۱۹۵۱ء سے بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ میں خاصا کم عمر تھا۔بہت قحط سالی کا دور تھا، بارشیں نہیں ہو رہی تھیں۔بہر حال وہ مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے تو دورانِ وعظ کسی نے کہا "دعا کرو بارش ہو جائے۔" اس نے ہاتھ اٹھا دیے اور سارے مجمع نے بھی۔ اللہ کی شان، کوئی بادل نہیں تھا، تپتی دوپہر تھی۔ایک دم بادل بنے اور بارش شروع ہو گئی۔اب لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ کریں۔ایک بوڑھا سا زمیندار بیٹھا تھا۔اس نے پہلے تو اسے گالی دی (یہ زمیندار لوگ جس سے خوش ہوتے ہیں، پہلے اسے گالی دیتے ہیں، جس طرح پٹھان جسے زبردست یا بڑے غضب کا بندہ کہنا ہو، اسے کافر کہتے ہیں "خدا ڈھیر کافر مولوی دے" یعنی مولوی بڑے غضب کا ہے)۔گالی دے کر کہا کہ "تُو بتاتا کیوں نہیں ہے لوگوں کو کہ تُو نبی ہے۔" یعنی ایک دعا کے پورا ہو جانے سے اس دیہاتی نے سمجھ لیا کہ یہ تو نبی ہے کیونکہ اس نے ہاتھ اٹھائے اور بارش ہو گئی۔

ہوتا یہ ہے کہ کمپیوٹر میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی جگہ ہمارا ہاتھ لگتا ہے اور کوئی چیز کھل جاتی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا کمال ہے حالانکہ وہ تو پہلے سے ہی وہاں فیڈ (feed) ہے۔ہمارا ہاتھ اتفاقاً Key پہ لگ گیا، وہ کھل گئی۔

نظامِ کائنات میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام من جانب اللہ ہونے والا ہے، اُسی وقت ہم بھی ہاتھ اٹھا دیتے ہیں کہ یا اللہ! یہ کام کر دے، وہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا کمال نہیں ہوتا، اتفاق ہے کہ اس Key پہ ہمارا ہاتھ لگ گیا۔اور اکثر اوقات ہم کہتے ہیں یا اللہ! ایسا ہو جائے، وہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے الٹ فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے۔ہم بڑے پریشان ہوتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں چاہا تھا۔لیکن ہم کون ہیں سوچنے والے کہ ہمارا چاہا کیوں نہیں ہوا؟ Who are you تم اپنے وجود میں اللہ کے محتاج انسان، تمہاری زندگی، تمہاری ایک ایک سانس، وجود کا ایک ایک خلیہ، اپنے وجود کو قائم رکھنے میں اللہ کا محتاج، دوسروں کے بارے میں فیصلے کیسے صادر کرے گا۔ یہ صرف ہماری سمجھ کی بات ہے کہ اپنی دانست میں ہم اسے کیسے اور کیا سمجھتے ہیں۔

فرمایا کہ شیطان کی بھی ایک بات اللہ نے قبول کر لی تو ایک یا چند دعاؤں کے قبول ہو جانے سے آدمی مستجاب الدعوات

Scanned with CamScanner

نہیں ہو جاتا۔ یہ اتفاقات ہوتے ہیں کسی نیک ہستی کی دعا قبول نہ ہو تو اس کے منافی نہیں۔ کسی بدکار کی قبول ہو جائے تو یہ اس کے نیک ہونے کی دلیل نہیں۔ یہ اللہ کے فیصلے ہیں۔ انسان کے نیک و بد ہونے کی جانچ اتباعِ رسالت سے ہوگی، جو دل سے جتنا متبع سنت ہے وہ اتنا ہی اچھا ہے۔ جو جتنا سنتِ رسول اللہ ﷺ سے محروم ہے، اُتنا ہی نیکی اور اچھائی سے محروم ہے۔

شرائط وآدابِ دعا

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کرنے کے لیے کچھ آداب ہیں اور دعا کی قبولیت کے لیے چند شرائط ہیں کتاب وسنت میں ان شرائط کو ملحوظ رکھنے کے لیے تاکید فرمائی گئی ہے۔

۱۔ غذا کا حلال اور پاکیزہ ہونا:

قَالَ اللہُ تَعَالٰی: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا... (المؤمنون:۵۱)

قَالَ اللہُ تَعَالٰی: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا... (البقرہ:۱۶۸)

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ تُلِیَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... فَقَامَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ! اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ یَّجْعَلَنِیْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَاتِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، یَا سَعْدُ! اَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ وَ الَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهٖ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَقْذِفُ اللُّقْمَةَ الْحَرَامَ فِیْ جَوْفِهٖ مَا یُتَقَبَّلُ مِنْهُ عَمَلَ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا وَاَیُّمَا عَبْدٍ نَبَتَ لَحْمُهٗ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ اَوْلٰی بِهٖ...

(الترغیب والترھیب، ۲:۵۴۷)

"اے گروہِ انبیاءؑ! پاکیزہ رزق کھایئے اور نیک عمل کیجیے۔ اور اے اہلِ ایمان! زمین کی پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ دو آیات حضور ﷺ کے سامنے پڑھی گئیں تو سعد ابن ابی وقاصؓ کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ میرے حق میں دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے سعد! رزقِ حلال کھاؤ، مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! انسان جب لقمۂ حرام پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا اور جس انسان کا گوشت حرام غذا سے بنا ہو اس کے لیے آگ ہی بہتر ہے۔"

وَقَالَ اللہُ تَعَالٰی: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ. ثُمَّ ذَكَرَ

الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ...

(صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا، ۲:۷۰۳)

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے اہل ایمان! پاکیزہ رزق کھاؤ، جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرتا ہے، سر کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کے اللہ سے دعا کرتا ہے، حالانکہ اس کا کھانا پینا حرام کا ہے، لباس حرام کا ہے، غذا حرام کی ہے پھر اس کی دعا کیونکر قبول کی جائے گی۔"

۲۔ لباس کا پاک ہونا اور حلال کی کمائی سے تیار ہونا:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ... (الاعراف:۲۶)

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ... (المدثر:۴)

وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مَنْ اَصَابَ مَالًا مِّنْ حَرَامٍ فَلَبِسَ مِنْهُ جِلْبَابًا، يَعْنِيْ قَمِيْصًا لَمْ تُقْبَلْ صَلَاتُهُ حَتّٰى يُنَحِّيَ ذٰلِكَ الْجِلْبَابَ عَنْهُ... (الترغیب والترھیب، ۲:۵۴۸)

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا، لباس تقویٰ کا اچھا ہے"، اور فرمایا "اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے لباس کو پاک صاف رکھیں۔" اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے حرام مال پایا اور اس سے قمیص بنائی اور پہنی، اُس کی نماز قبول نہ ہوگی جب تک اس لباس کو اپنے وجود سے جدا نہ کردے۔"

۳۔ بدن کا پاک ہونا حدث کبیر اور صغیر سے:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ... (التوبہ:۱۰۸)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اس (مسجد) میں ایسے مرد ہیں جو پاکیزگی کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

۴۔ سحر کا وقت ہونا:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ... (الذّٰریٰت:۱۸)

"اور (اہل تقویٰ) سحر کے وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔"

۵۔ استقبال قبلہ۔

۶۔ خلوص نیت:

Scanned with CamScanner

قَالَ اللهُ تَعَالیٰ: فَادْعُوا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ... (المؤمن: ۱۴)
وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ...
(صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۱:۲)
"پس اللہ تعالیٰ کو خلوصِ دل سے پکارو۔"
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اعمال کا مدار نیت پر ہے۔"

۷۔ ادب سے دوزانو بیٹھ کر دعا کرنا:

وَ بَسَط يَدَيْهِ وَ رَفَعَهُمَا حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ وَ كَشَفَهُمَا مَعَ التَّأَدُّبِ وَ الْخُشُوْعِ وَ الْمَسْكَنَةِ وَ الْخُضُوْعِ وَ اَنْ يَّسْئَلَ اللهَ تَعَالٰى بِأَسْمَائِهِ الْعِظَامِ الْحُسْنٰى وَ الْاَدْعِيَةِ الْمَاثُوْرَةِ وَ يَتَوَسَّلُ اِلَى اللهِ تَعَالٰى بِاَنْبِيَآئِهٖ وَ الصَّالِحِيْنَ بِخَفْضِ صَوْتٍ... وَيَمْسَحُ وَجْهَهٗ بِيَدِهٖ بَعْدَ فَرَاغِهٖ... (تحفۃ الذاکرین، ۴۱)

"ہاتھوں کو پھیلائے، شانوں تک اٹھائے اور کھول کر رکھے، ادب اور خشوع وخضوع کا خیال رکھے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے ساتھ دعا مانگے اور منقولہ دعائیں پڑھے اور انبیاء اور اولیاء اللہ کے توسل سے اور بڑی دھیمی آواز سے دعا کرے، اور ختم کر کے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر دے۔"

۸۔ قبل از دعا کسی عملِ صالح کا ہونا ضروری ہے۔

۹۔ دعا کسی قطعِ رحمی کے لیے نہ ہو۔

۱۰۔ دعا میں حرام اور گناہ کا مطالبہ نہ ہو۔

۱۱۔ دعا امرِ محال کے لیے نہ ہو۔

۱۲۔ مقبولیتِ دعا میں جلدی نہ کرنا، یعنی یہ خیال نہ کرنا کہ ابھی ابھی دعا قبول ہو جائے اور اگر ایسا نہ ہوا تو دعا ہی ترک کر بیٹھے۔

۱۳۔ مستجاب الدعوات ہونے کے لیے متقی ہونا شرط ہے۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ... (المائدہ: ۲۷)
اور متقی کی تعریف حضور اکرم ﷺ نے یوں فرمائی:
قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهِ الْبَأْسُ...

(الترغیب والترہیب، ۲:۵۵۹؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الورع والتقوی، ۳۲۱)
"حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا، جب تک اس چیز کو ترک نہ کر دے جس میں (بظاہر) حرام کا شبہ نہیں مگر اس اندیشے سے کہ وہ چیز کہیں حرام تک نہ لے جائے۔"

Scanned with CamScanner

فائدہ: متقی کے لیے مشکوک مال، غذا، لباس وغیرہ سے اجتناب لازمی ہے کیونکہ حرام کھانے والا جہنمی ہے، اور جہنمی متقی نہیں ہوسکتا۔

شرائط وآدابِ دعا

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ یہ سارے آداب وشرائط نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعے تعلیم فرمائے ہیں۔ سب سے پہلی شرط غذا کا حلال وطیب ہونا ہے۔ حرام کھانے والوں کی دعائیں اللہ کی بارگاہ میں نہیں پہنچتیں۔ ارشادِ باری ہے (ترجمہ) ''اے (گروہ) انبیاء ورسل! طیب غذا کھاؤ اور نیک کام کرو''۔ رزقِ حلال بھی ہو تو وہ بوجوہ غیر طیب ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی ناپاک چیز مل جائے، ناپاک برتن یا ناپاک ہاتھوں سے پکایا جائے تو ایک چیز جو شرعاً حلال ہے، پاکیزہ یعنی طیب نہیں رہے گی۔ اللہ نے نیک کاموں کے کرنے کو رزقِ طیب سے مشروط کیا ہے، گویا نیک عمل کا مدار غذائے صالح پر ہے، حرام یا ناپاک کھانے والے کو نیکی کی توفیق نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک اور آیۂ کریمہ میں ہے (ترجمہ) ''اے لوگو! زمین میں جو کچھ ہے اس میں سے حلال اور طیب چیزیں کھاؤ'' حلال پر طیب کی قید اس آیۂ مبارکہ میں بھی لگائی گئی ہے۔ ہر حلال چیز ضروری نہیں کہ طیب ہو۔ لیکن ہر طیب چیز ہر صورت حلال ہوتی ہے۔ حضرتؒ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ لنگر مخدوم جاتے ہوئے سواری تاخیر سے ملی تو راستے میں رات کے لیے رکنا پڑا۔ مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی تو گاؤں والوں نے دیکھ لیا کہ مسجد میں مسافر ہے۔ مسافر کو دیکھ کر گاؤں والے کھانے کا بندوبست کر دیا کرتے ہیں۔ لوگوں نے کھانے کی بات کی تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا ''میں کسی بے نمازی خاتون کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' پھر کیا تھا! مصیبت بن گئی۔ پورے گاؤں میں کچھ مرد تو نمازی تھے، عورت ایک بھی نہ ملی۔ بالآخر کسی نمازی مرد کے دوہے ہوئے دودھ کو گرم کر کے آپؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تو اسے کہتے ہیں حَلٰلًا طَیِّبًا... بے نمازی کا ہاتھ کب پاک ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے جو پکے گا، اس میں وہ اثر آئے گا۔ ہمارے ہاں بازار کا کھانا عموماً غیر طیب ہوتا ہے۔ ہوٹلوں کا گوشت عموماً مردہ جانوروں کا کم قیمت پر خریدا ہوا ہوتا ہے۔ ایک مولانا، اچھے پڑھے لکھے، اچھے عالم تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے ''میں نے بڑی مرغابیاں کھائیں۔'' میں نے کہا، مولانا مرغابیاں تو صرف شکاریوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ انہوں نے لاہور کے کسی ہوٹل کا نام لیا۔ میں نے کہا کہ مولانا بات ماننے میں نہیں آتی۔ یہ آبی پرندہ ہے، ہر جگہ یا ہر موسم میں نہیں ملتا۔ ویسے بھی اتنی تعداد میں روز شکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہوٹلوں میں پکے۔ بہرحال چند ہی دنوں بعد اخبار میں خبر آگئی کہ اُس ہوٹل کا مالک گرفتار ہوگیا۔ اُنہوں نے چھت پر پھندے لگا رکھے تھے۔ کوے پکڑ پکڑ کر مرغابیوں کے نام پر پکا رہے تھے۔

حضرتؒ فرماتے تھے (جب ہم لوگ لطائف کیا کرتے تھے) ''یار! بازار سے فروٹ اور مٹھائی جو عام سامنے رکھی

ہوتی ہے، نہ کھایا کرو۔" میں نے عرض کیا کہ حضرت مٹھائی میں تو حلال حرام کی ملاوٹ ہوسکتی ہے، فروٹ وغیرہ میں تو ایسا کوئی
مسئلہ نہیں ہے۔ فرمانے لگے "بے کسوں اور غریبوں کی نگاہیں پڑ پڑ کر اس میں نحوست پیدا ہوجاتی ہے۔ جو لوگ خرید نہیں سکتے، وہ
حسرت سے دیکھتے ہیں تو پھل میں برکت نہیں رہتی۔"

بات دعا کی قبولیت کی ہورہی تھی۔ قبولیتِ دعا کی پہلی شرط غذا کا طیب ہونا ہے جو ظاہر ہے کہ حلال ہوگی۔
حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا...
(البقرہ:۱۶۸) کی تلاوت بارگاہِ نبوی میں کی تو سعد بن ابی وقاصؓ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور عرض کیا، "یا رسول اللہ ﷺ
میرے لیے دعا فرمائیے، اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنادے۔" تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "اے سعد! اپنا کھانا طیب کرلو
تاکہ تم مستجاب الدعوات بن جاؤ۔" آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی
جان ہے! جو شخص لقمۂ حرام کھاتا ہے، چالیس روز تک اس کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔" اور فرمایا، "جس کا گوشت حرام غذا سے
بنتا ہے اس کی جگہ جہنم ہے۔" حرام جنت میں نہیں جائے گا۔ قرآنِ کریم کی ایک آیت کا ترجمہ ہے، "اے گروہِ انبیاءؑ!
پاکیزہ رزق کھائیے اور نیک عمل کیجیے۔" ایک اور جگہ فرمایا "اے اہلِ ایمان! زمین کی پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ۔" ایک اور
جگہ ارشاد ہے، "اے اہلِ ایمان! طیب چیزیں کھاؤ۔" چونکہ حرام تو طیب نہیں ہوسکتا، اس لیے طیب پر حلال کی قید از خود آگئی۔
حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، ایک شخص لمبا سفر کرکے بیت اللہ میں حاضر ہوتا ہے اور اس پر تھکاوٹ کے آثار ہیں، لباس اور
بال وغیرہ گرد آلود ہیں اور اسی طرح تھکا ہارا حرم میں چلا جاتا ہے اور "لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ..." کہتا ہے۔ مگر اسے کوئی
جواب نہیں ملتا کیونکہ اس کا کھانا، پینا، لباس اور غذا تک حرام ہے، اس کی ندا کیسے قبول ہو۔

یہاں یہ عالم ہے کہ غالباً دو سال پہلے کی بات ہے ہمارا ڈاکخانے والا لڑکا ڈاک لینے گیا۔ پوسٹ ماسٹر کے پاس
ایک آدمی بیٹھا تھا کہہ رہا تھا کہ میرے پیسوں پر سود کتنا ہے؟ اس نے ایک لاکھ اسی ہزار روپے کے قریب سود بتایا۔ کہنے لگا،
اصل رہنے دو، سود مجھے دے دو۔ ڈاکخانے والے نے پوچھا کہ اتنے پیسوں کا کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں نے حج کی
درخواست کے لیے پیسے جمع کرانے ہیں۔ تو وہ سود لے کر حج کے لیے اخراجات جمع کرا رہا تھا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں
حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بیت اللہ میں بھی ان کی آواز کی بارگاہِ الٰہی تک رسائی نہیں ہوتی بلکہ رد کر دی جاتی ہے۔

قبولیتِ دعا کی شرائط میں سے

۱۔ پہلی شرط "رزق کا حلال اور طیب ہونا" ہے۔

۲۔ دوسری شرط "لباس کا پاک اور حلال کمائی سے تیار ہونا" ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "تقویٰ بہترین لباس ہے"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے "اپنے لباس کو پاکیزہ رکھو"، حضور اکرم ﷺ
نے فرمایا، "جس نے حرام مال پایا اور اس سے قمیص بنا کر پہنی، اس کی نماز قبول نہ ہوگی جب تک اس لباس کو اپنے
وجود سے جدا نہ کردے۔" جب عبادت ہی مقبول نہیں تو دعا کیسے قبول ہوگی۔

تیسری شرط "بدن کا پاک ہونا" ہے۔ ارشاد باری ہے "وہاں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ

Scanned with CamScanner

پاک رہنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

۴۔ چوتھی شرط "سحر کا وقت ہونا ہے۔" ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اہلِ تقویٰ سحر کے وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔" یعنی اللہ تو ہر وقت سنتا ہے لیکن قبولیت کے لیے اعلیٰ اور اچھا وقت سحری ہے۔

۵۔ پانچویں شرط "استقبالِ قبلہ" ہے، دعا کرتے وقت قبلہ رُخ ہونا بہتر ہے۔

۶۔ چھٹی شرط "خلوصِ نیت" ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اللہ کو خلوصِ دل سے پکارو۔"

اسی طرح حدیث نبوی ﷺ ہے "اعمال کا مدار نیت پر ہے۔"

یعنی نیت خالص ہو اور خلوص سے اللہ کو پکارا جائے۔

۷۔ ساتویں شرط "ادب سے دوزانو بیٹھ کر دعا کرنا ہے۔" ہاتھوں کو پھیلا کر شانوں تک اٹھانا اور ہاتھوں کو کھول کر رکھنا بہتر ہے اور ساتھ ادب، خشوع اور خضوع کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور منقولہ دعائیں جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہیں یا قرآن سے ثابت ہیں، کا دعا میں شامل کرنا بہتر ہے۔ آواز دھیمی رکھے، اہل اللہ اور انبیاءؑ کا توسل اختیار کرے۔ جب دعا کر چکے تو ہاتھوں کو چہرے پر پھیرے۔

۸۔ آٹھویں شرط "قبل از دعا کسی عملِ صالح کا ہونا" ہے۔

یعنی دعا کرنے سے پہلے نفل پڑھنا یا کوئی اور نیکی جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی دعا کی قبولیت میں معاون ہے۔

۹۔ نویں شرط ہے "دعا قطع رحمی کے لیے نہ ہو۔"

کسی حرام فعل یا ایسے امور کے لیے دعا نہ کرے جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

۱۰۔ دسویں شرط ہے "دعا میں حرام اور گناہ کا مطالبہ نہ ہو۔"

۱۱۔ گیارہویں شرط ہے "دعا امرِ محال کے لیے نہ ہو۔" قدرت کے بنائے ہوئے سلیقے طریقے، وسائل اور ذرائع اختیار کیے بغیر دعا کرنا بارگاہِ الوہیت میں گستاخی ہے۔ جیسے ایک بندہ شادی نہیں کرتا اور دعا کرتا ہے، اللہ مجھے اولاد دے۔

مقبولیتِ دعا کے لیے جلدی نہ کرے۔ یہ خیال نہ کرے کہ جیسے دعا کی ہے فوراً قبول ہو جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو دعا کرنا ہی چھوڑ دے۔ دعا کا قبول کرنا، نہ کرنا، یا کب پوری ہوتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، "اللہ اپنے متقی بندوں کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔" اسی طرح حدیث نبوی ہے "کوئی شخص اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس چیز کو ترک نہ کر دے جس میں بظاہر حرام کا شبہ نہیں، مگر اندیشہ ہے کہ کہیں وہ چیز حرام تک نہ لے جائے۔" یعنی خود حرام نہ ہو، مفضی الی الحرام ہو۔ ایک چیز خود حرام یا منع نہیں ہے لیکن اس میں پڑ جانے کے نتیجہ میں انسان کسی حرام تک پہنچ جائے۔ حرام چھوڑنا تو دور کی بات ایسی چیزیں جو مباح ہوتے ہوئے بھی حرام تک لے جانے کا سبب بنیں، ان کو چھوڑ دینے والا متقی ہے۔ متقی کے لیے مشکوک مال، غذا، لباس وغیرہ سے اجتناب لازمی ہے کیونکہ حرام کھانے والا جہنمی ہے اور جہنمی متقی نہیں ہو سکتا۔

Scanned with CamScanner

عدمِ قبولیتِ دعا

وَلَا يُعْتَرَضُ عَلَى ذٰلِكَ بِتَخَلُّفِهِ عَنْ بَعْضِ الدَّاعِيْنَ لِأَنَّ سَبَبَ التَّخَلُّفِ وُقُوْعُ الْخَلَلِ فِيْ شَرْطٍ مِنْ شُرُوْطِ الدُّعَاءِ كَالْاِحْتِرَازِ فِي الْمَطْعَمِ وَالْمَشْرَبِ وَالْمَلْبَسِ أَوْ لِاسْتِعْجَالِ الدَّاعِيْ أَوْ بِأَنْ يَكُوْنَ الدُّعَاءُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ أَوْ تَحْصُلَ الْإِجَابَةُ وَيَتَأَخَّرَ وُجُوْدُ الْمَطْلُوْبِ لِمَصْلَحَةِ الْعَبْدِ أَوْ لِأَمْرٍ يُرِيْدُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى...

(فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب الدعاء والصلوٰۃ من آخر اللیل، ۲:۳۲)

"بعض دعا کرنے والوں کی دعا کے قبول نہ ہونے پر اعتراض نہ کیا جائے کیونکہ دعا کا قبول نہ ہونا کسی شرط میں خلل واقع ہو جانے کے سبب سے ہوتا ہے، جیسا کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں احتیاط نہ کی جائے، یا دعا کرنے والے نے جلدی کی، یا کسی گناہ یا قطعِ رحم کی دعا کی، یا دعا تو قبول ہوگئی مگر مطلوب کے حصول میں اس بندے کی مصلحت کی وجہ سے تاخیر کی گئی، یا کسی ایسے امر کی وجہ سے تاخیر ہوگئی جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔"

فائدہ:

معلوم ہوا کہ بعض اوقات دعا تو قبول ہو جاتی ہے مگر قبولیت کا ظہور مدت کے بعد ہوتا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا تو قبول ہوگئی مگر اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ... (یوسف:۹۸) تو اس کا اثر اٹھارہ سال کے بعد ظاہر ہوا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا تو قبول ہوگئی مگر تیرہ سال بعد بیٹا پیدا ہوا۔

اور دعا کی قبولیت کے متعلق علامہ ابن حجر نے فرمایا:

وَإِنَّمَا يَتَّفِقُ ذٰلِكَ لِمَنْ تَعَوَّدَ الذِّكْرَ وَاسْتَأْنَسَ بِهِ وَغَلَبَ عَلَيْهِ حَتّٰى صَارَ حَدِيْثَ نَفْسِهِ فِيْ نَوْمِهِ وَيَقْظَتِهِ فَأَكْرَمَ مَنِ اتَّصَفَ بِذٰلِكَ بِإِجَابَةِ دَعْوَتِهِ وَقَبُوْلِ صَلَاتِهِ...

(فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب فضل من تعار من اللیل فصلیٰ، ۳:۴۰)

"اس شخص کی دعا کی قبولیت پر اتفاق ہے جو ذکر الٰہی کا عادی ہو اور ذکر سے انس پیدا کر چکا ہو۔ ذکر الٰہی کا اس پر ایسا غلبہ ہو کہ ہر سانس میں، نیند میں، بیداری میں ذکر سے غفلت نہ ہو۔ ایسا شخص مستجاب الدعوات ہوتا ہے اور قبولیتِ صلوٰۃ سے نوازا جاتا ہے۔"

وَمِنْ حُقُوْقِ النَّفْسِ قَطْعُهَا عَمَّا سِوَى اللّٰهِ تَعَالٰى لٰكِنْ ذٰلِكَ يَخْتَصُّ بِالتَّعَلُّقَاتِ الْقَلْبِيَّةِ...

(فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب ان لنفسک حقاً فصم وافطر، ۳:۳۸)

"اور یہ دوام ذکر الٰہی اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کا تعلق قلبی ماسوائے اللہ سے بالکل منقطع ہو چکا ہو

لیکن یہ ذکر مختص ہے ذکرِ قلبی سے۔"

فائدہ: معلوم ہوا کہ مستجاب الدعوات وہ شخص ہوتا ہے، جس کا تعلق قلبی اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ ہو۔ مخلوق سے قلبی انقطاع مکمل ہو، تزکیۂ نفس مکمل ہو چکا ہو، دوام ذکر حاصل ہو۔ یہ اوصاف صرف اولیاء اللہ کاملین میں پائے جاتے ہیں اس لیے مستجاب الدعوات بھی وہی ہوتے ہیں۔

شیخ ابن الھمام نے اپنی کتاب 'سلاح المؤمن فی الذکر و الدعا' میں دعا کا طریقہ یوں بیان فرمایا ہے کہ ابتداً یوں کرے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الْحَیِّ الْقَیُّوْمِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ...وَالرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ الْاَوَّلِ الْقَدِیْمِ الْحَلِیْمِ الْحَکِیْمِ...حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُّبَارَکًا فِیْہِ حَمْدًا یُوَافِیْ نِعَمَہٗ وَیُکَافِیْ مَزِیْدَہٗ وَلَا نُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْہِ کَمَا ھُوَ اَثْنٰی عَلٰی نَفْسِہٖ فَلَکَ الْحَمْدُ حَتّٰی تَرْضٰی...

پھر کہے:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ وَ شَرِّفْ وَ کَرِّمْ وَ عَظِّمْ عَلٰی رَسُوْلِکَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الطَّاھِرِ الزَّکِیِّ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ وَصَحْبِہِ الْمُحَقِّقِیْنَ وَسَلِّمْ عَلَیْھِمْ تَسْلِیْمًا عَدَدَ مَاذَکَرَہُ الذَّاکِرُوْنَ وَغَفَلَ عَنْ ذِکْرِھِمُ الْغَافِلُوْنَ...

پھر اپنا مطلب پیش کرے۔

عدمِ قبولیتِ دعا

یعنی دعا کا قبول نہ ہونا، "فتح الباری" میں ہے کہ بعض دعا کرنے والوں کی دعا قبول نہ ہونے پر اعتراض نہ کیا جائے کیونکہ دعا کا قبول نہ ہونا کسی شرط میں خلل واقع ہونے سے بھی ہوتا ہے، جیسے کھانے پینے، لباس کے معاملے میں احتیاط نہ کی جائے یا دعا کرنے والے نے جلدی کی۔ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا کی، یا دعا قبول تو ہوگئی مگر مطلوب کے حصول میں اس بندے کی مصلحت کی وجہ سے تاخیر کر دی گئی کہ اسی میں اس بندے کی بہتری ہوتی ہے، یا کسی ایسے امر کی وجہ سے تاخیر ہوگئی جسے اللہ ہی جانتا ہے۔ بعض اوقات ویسی ہی چیز بندے کو عطا کر دی جاتی ہے جیسی وہ مانگتا ہے اور بعض اوقات بندہ کوئی نقصان دہ چیز مانگ رہا ہوتا ہے، اللہ کریم دعا قبول فرماتے ہیں اور اپنے کرم سے اس کے بدلے کوئی اور چیز عطا کر دیتے ہیں۔ جیسے ایک بچہ ماں سے چھری کی ضد کر رہا ہو تو ماں اسے چھری نہیں دیتی، کوئی اور چمچہ نما چمکدار چیز پکڑا دیتی ہے کیونکہ چھری سے خود اس کے زخمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ بعض اوقات دعا قبول تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا صدور دیر کے بعد ہوتا ہے۔ اللہ خود بہتر

جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: بعض اوقات دعا اللہ کے ہاں جمع ہو جاتی ہے، رد نہیں ہوتی۔ روزِ قیامت جب اعمال تولے جائیں گے تو ایک شخص کے اعمال ترازو میں رکھ کر فرشتے عرض کریں گے کہ بار الٰہ! اس کی نیکیاں اور گناہ ترازو میں رکھ دیئے گئے، اس کا فیصلہ آپ فرما دیجیے۔ ارشاد ہوگا، اس کے کچھ اعمال تو میرے پاس بھی ہیں جو تمہارے علم میں نہیں ... وہ دعائیں جن کا بدلہ وہ دنیا میں نہ پا سکا، اللہ کریم اس کے نامہ اعمال میں رکھنے کے لیے عطا فرمائیں گے۔ چونکہ فرشتہ ہونٹوں سے نکلی بات لکھتا ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ... (ق:١٨)، الفاظ کے بغیر دل سے نکلی بات اللہ کے پاس ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں اُس وقت بڑے بڑے مستجاب الدعوات رشک کریں گے کہ کاش دنیا میں اُن کی کوئی دعا قبول نہ ہوتی اور آج وہ دعائیں درجات بلند کرنے میں معاون ہوتیں۔

بعض اوقات دعا قبول تو ہو جاتی ہے مگر ظہور مدت کے بعد ہوتا ہے۔ موسیٰؑ نے فرعونیوں سے نجات پانے کی دعا کی۔ دعا تو قبول ہوگئی مگر ظہور مدت بعد ہوا، اس میں مصلحت اللہ جانے۔ اسی طرح حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں سے فرمایا! عنقریب میں تمہارے لیے اللہ سے دعا کروں گا۔ اس کے بعد یوسفؑ کا پتہ چلا، مصر تشریف لے گئے، پھر یوسفؑ نے بھائیوں کی معافی کا اعلان فرمایا۔ یعقوبؑ کے وعدے اور اس معافی میں اٹھارہ سال کا وقفہ تھا۔ اسی طرح حضرت زکریاؑ نے بیٹے کی دعا کی۔ قبول تو ہوگئی مگر تیرہ سال بعد بیٹا پیدا ہوا۔ دعا کی قبولیت کے متعلق علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا، اُس شخص کی دعا کی قبولیت پر اتفاق ہے جو ذکرِ الٰہی کا عادی ہو اور ذکر سے انس پیدا کر چکا ہو، ذکرِ الٰہی کا اس پر ایسا غلبہ ہو کہ ہر سانس میں، نیند میں، بیداری میں غفلت نہ ہو۔ ایسا شخص مستجاب الدعوات ہوتا ہے اور قبولیتِ صلوٰۃ سے نوازا جاتا ہے۔ یہ دوامِ ذکرِ الٰہی اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کا تعلقِ قلبی ماسوائے اللہ بالکل منقطع ہو چکا ہو لیکن یہ ذکر ذکرِ قلبی سے مختص ہے۔

فائدہ:

معلوم ہوا کہ مستجاب الدعوات وہ شخص ہوتا ہے جس کا تعلق قلبی اللہ کے ساتھ پختہ ہو، مخلوق سے مکمل انقطاعِ قلبی ہو، تزکیۂ نفس ہو چکا ہو، دوامِ ذکر حاصل ہو۔ یہ اوصاف اولیاء اللہ کاملین میں پائے جاتے ہیں اس لیے وہ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔

شیخ ابن الہمام نے اپنی کتاب 'سلاح المومنین' میں دعا کا طریقہ اللہ کی حمد بیان کرنے کا طریقہ اور درود شریف پڑھنے کا طریقہ لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اللہ کے اسمائے حسنیٰ جمع کر دیئے ہیں اور حضور ﷺ پر خوبصورت انداز سے درود بھی پیش کیا ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری اور فرض نہیں ہو گیا۔ جیسے جو آتا ہے، پڑھ لے اور اپنے انداز سے دعا مانگ لے۔

Scanned with CamScanner

باب (12)

اولیاء اللہ بزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انسان کی حقیقی قدرو قیمت اور اصلی عظمت و برتری کا اندازہ اُس وقت ہوگا جب اس کی فردِ عمل مالکِ حقیقی کے سامنے پیش ہوگی اور اسے فوزِ عظیم کا مژدہ سنا کر انعام و اکرام کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس لیے حقیقی کامرانی و فلاح اور حقیقی عظمت و شان وہی ہے جسے اخروی کامیابی اور ابدی راحت کہا جاتا ہے۔ اس دنیا کی چند روزہ شان و شوکت فریبِ نظر اور غرورِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ... (آل عمران:۱۸۵)

اولیاء اللہ بزبانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دنیا میں کوئی انسان امیر ہے یا غریب، اسے ہمیشہ اپنی عزت یا آنر (Honour) کی بڑی فکر ہوتی ہے۔ وہ کسی درجے میں بھی ہو، وہ اپنی ایک حیثیت سمجھتا بھی ہے اور اسے دوسروں سے منوانا بھی چاہتا ہے۔ پوری انسانی زندگی اسی بات کے گرد گھومتی ہے لیکن اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ حقیقتاً اس بات کی سمجھ تب آئے گی جب انسان روزِ حشر بارگاہِ الوہیت میں پیش ہوگا۔ کس کو عزت ملتی ہے اور کون اس سے محروم رہتا ہے، اصل فیصلہ وہاں ہوگا۔ جسے اُس دن بہت بڑی کامیابی کی خوشخبری سنائی گئی وہ دراصل کامیاب ہوگا، یعنی حقیقی کامیابی اور بہتری اور حقیقی عظمت و شان وہ ہے جو روزِ حشر کسی کو نصیب ہوگی۔ اس دنیا میں ہر کوئی اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے لیکن حقیقتاً کوئی کچھ بھی نہیں۔ کامیابی کا دارومدار حشر کے فیصلوں پر ہے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ... دنیا کی زندگی کیا ہے؟ ہر بندے میں اپنی شان کا ایک احساس موجود ہے۔ یہ صرف ایک فریبِ نفس اور دھوکا ہے۔ حقیقتاً کچھ نہیں۔

قیامت کے دن اولیاء اللہ کی شان

۱۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ لِلّٰهِ جُلَسَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَنْ يَّمِيْنِ الْعَرْشِ وَكِلْتَا يَدَيِ اللهِ يَمِيْنٌ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ وُجُوْهُهُمْ مِنْ نُّوْرٍ لَيْسُوْا بِاَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ وَلَا صِدِّيْقِيْنَ... قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللهِ مَنْ هُمْ قَالَ هُمُ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِ اللهِ تَعَالٰى... اَلْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى... اَلْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِ اللهِ تَعَالٰى...

(الترغيب والترهيب، ۱۹:۴؛ المعجم الكبير للطبرانی، ۱۳۴:۱۲)

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم اولیاء اللہ بزبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے پاس عرش کے دائیں جانب بیٹھنے والے کچھ لوگ ہوں گے، اور اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں،

Scanned with CamScanner

منبروں پر بیٹھے ہوں گے، منبر نور کے ہوں گے، ان کے چہرے منور ہوں گے، وہ نہ انبیاء ہوں گے نہ شہدا اور نہ صدیقین۔ عرض کیا گیا، یارسول اللہ ﷺ! پھر وہ کون لوگ ہوں گے؟ تین بار فرمایا۔ وہ اللہ کے لیے باہم محبت کرنے والے لوگ ہوں گے۔"

۲۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ؓ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أَنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ عِبَادًا لَيْسُوْا بِأَنْبِيَاءَ يَغْبِطُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ قِيْلَ: مَنْ هُمْ لَعَلَّنَا نُحِبُّهُمْ قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِنُوْرِ اللهِ مِنْ غَيْرِ أَرْحَامٍ وَ لَا انْتِسَابٍ وُجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ لَا يَخَافُوْنَ إِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ ثُمَّ قَرَأَ: أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ...

(الترغيب والترهيب، ۲۰:۴؛ صحيح ابن حبان، باب صحبة والمجالسة ذكر وصف المتحابين في الله في القيامة عند حزن، ۳۳۲:۲)

"حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو انبیاء نہیں مگر قیامت کے دن انبیاء اور شہدا ان پر رشک کریں گے۔ عرض کیا گیا، وہ کون ہیں تا کہ ہم ان سے محبت رکھیں؟ فرمایا، وہ ایسے لوگ ہیں کہ (اللہ نے ان کے دلوں میں نور بھر دیا ہے) اللہ کے نور کی وجہ سے ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں، نہ ان میں خونی رشتہ ہے، نہ نسب کا اشتراک۔ ان کے چہرے نورانی ہوں گے، وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ جب لوگ خوفزدہ ہوں گے، انہیں کوئی خوف نہ ہوگا اور جب لوگ غمگین ہوں گے انہیں کوئی غم نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ... (يونس: ۶۲)

یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے، نہ وہ مغموم ہوتے ہیں۔"

۳۔ وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا يُجْلِسُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ وَيَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النُّوْرُ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْ حِسَابِ الْخَلَائِقِ...

(رواه الطبراني بإسناد جيد؛ الترغيب والترهيب، ۲۰:۴؛ المعجم الكبير للطبراني، ۱۱۲:۸)

۴۔ وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ تَعَالٰى لَأُنَاسًا مَا هُمْ بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَغْبِطُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللهِ تَعَالٰى قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ... قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللهِ عَلٰى غَيْرِ أَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَ لَا أَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا... فَوَاللهِ إِنَّ وُجُوْهَهُمْ لَنُوْرٌ وَ إِنَّهُمْ لَعَلٰى نُوْرٍ وَ لَا يَخَافُوْنَ إِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُوْنَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ...

(الترغيب والترهيب، ۲۱:۴؛ سنن أبي داود، كتاب الإجارة، باب في الرهن، ۲۵۸:۲)

۵۔ وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ۔ لَيَبْعَثَنَّ اللهُ أَقْوَامًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي وُجُوْهِهِمُ النُّوْرُ عَلٰى مَنَابِرِ اللُّؤْلُؤِ يَغْبِطُهُمُ النَّاسُ لَيْسُوْا بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ قَالَ فَجَثٰى أَعْرَابِيٌّ عَلٰى

Scanned with CamScanner

وَ نَجِيِّهِ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ جُلِّهُمْ لَنَا نَعْرِفُهُمْ قَالَ هُمُ الْمُتَحَابُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ قَبَائِلَ شَتّٰى وَبِلَادٍ شَتّٰى يَجْتَمِعُوْنَ عَلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ يَذْكُرُوْنَهُ...

(رواہ الطبرانی باسناد حسن، الترغیب والترہیب، ۴:۲۱)

۱۰- وَعَنْ اَبِيْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اسْمَعُوْا وَاعْقِلُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عِبَادًا لَيْسُوْا بِاَنْبِيَآءَ وَلَا شُهَدَآءَ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عَلٰى مَنَازِلِهِمْ وَقُرْبِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَعْرَابِ مِنْ قَاصِيَةِ النَّاسِ وَاَلْوٰى بِيَدِهٖ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ نَاسٌ مِّنَ النَّاسِ لَيْسُوْا بِاَنْبِيَآءَ وَلَا شُهَدَآءَ يَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالشُّهَدَآءُ عَلٰى مَجَالِسِهِمْ وَقُرْبِهِمْ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى... اِلٰى اَنْ قَالَ... يَضَعُ اللّٰهُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ فَيَجْلِسُوْنَ عَلَيْهَا فَيَجْعَلُ وُجُوْهَهُمْ نُوْرًا وَثِيَابَهُمْ نُوْرًا يَّفْزَعُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَفْزَعُوْنَ وَهُمْ اَوْلِيَآءُ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ...

(رواہ ابویعلی واحمد والحاکم وقال صحیح الاسناد)، (الترغیب والترہیب، ۴:۲۱، ۲۲؛ مسند احمد، مسند الانصار، ۳۷:۵۴۱)

فائدہ:

ان احادیث میں جن اولیائے کرام کا ذکر ہے وہ ایسے ذاکرین، زہاد اور اللہ کے مخلص بندے ہیں جو مجاہدہ اور ریاضت اور زہد و عبادت سے تزکیۂ باطن میں لگے رہے۔ اور انبیاء کرام اور اصحابِ سلاسل بزرگوں کی شان تو ان سے بہت بلند ہے کیونکہ ان حضرات نے اللہ کی مخلوق کو ہدایت کی راہ دکھائی اور اللہ کے بندوں کی اصلاح کی، پھر انبیاء کے غبطہ کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ سے ان کی امتوں کے متعلق سوال ہوگا، اور اصحابِ سلسلہ بزرگوں سے ان کے مریدین کے متعلق سوال ہوگا، مگر یہ لوگ اس ذمہ داری سے آزاد ہوں گے، اس بناء پر انبیاء اور شہداً کو غبطہ ہوگا۔ وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سوال و جواب کی فکر سے آزاد کر دے، اس کی حالت اور اس کی شان کیونکر قابلِ رشک نہ ہوگی؟

قیامت کے دن اولیاء اللہ کی شان

'الترغیب والترہیب' سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کی دائیں جانب بیٹھنے والے کچھ لوگ ہوں گے اور اللہ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں (دایاں ہاتھ طاقتور اور بایاں کمزور ہوتا ہے، مراد ہے کہ اللہ کریم کے دستِ قدرت میں کمزوری نہیں)، منبروں پر بیٹھے ہوں گے اور منبر نور کے ہوں گے، ان کے چہرے منور ہوں گے، وہ نہ انبیاءؑ ہوں گے، نہ شہداً ہوں گے، نہ صدیقین ہوں گے۔"

عرض کیا گیا، "حضور ﷺ! پھر وہ کون لوگ ہوں گے؟"

تین بار فرمایا، "وہ لوگ اللہ کے لیے باہم محبت کرنے والے لوگ ہوں گے۔"

یعنی جنہوں نے دنیا میں محبتِ الٰہی کو سرمایہ جانا اور ان کی ایک دوسرے سے محبت بھی محض اللہ کے لیے تھی۔ عام طور پر محبت کہتے ہیں وہ اصل میں محبت نہیں ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی کو کسی کا غلام بنا دیتا ہے۔ لیکن دنیا میں جسے کاروبار ہے، تجارت ہے، سودے بازی ہے، محبت نہیں ہے۔ سب سے زیادہ پیار ماں باپ کو اولاد سے ہوتا ہے یعنی ماں کی محبت، باپ کی محبت اولاد کے لیے سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے لیے وہ اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں، بھوکے رہ کر ان کو کھلاتے ہیں، خود پھٹا پرانا پہن کر بچوں کو اچھے کپڑے پہناتے ہیں لیکن جب یہی بچے جوان ہوتے ہیں اگر وہ کما کر نہ لائیں تو وہی ماں باپ ان کو بددعائیں دے رہے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ محبت تو نہ تھی۔ ایک امید تھی کہ کبھی یہ میرا سہارا بنے گا اور یہ تو باہمی سودے بازی ہو گئی۔ اسی طرح دنیا کی جتنی محبتیں ہیں، کہیں عہدے کا لالچ ہے، کہیں پیسے کا لالچ ہے، کہیں محض امید ہے، ایک موہوم سی امید ہے کہ مجھ پر مصیبت بنے گی تو یہ میرے کام آئے گا، خواہ وقت پڑنے پر وہ کام نہ ہی آئے لیکن ایک توقع پر رشتہ جوڑا ہوا ہے، یا پھر جنسی خواہشات کے لیے کوئی کسی سے چمٹا ہوا ہے۔ تو یہ سب حقیقت میں محبتیں نہیں ہیں۔ پھر ایک اور بات کہ تمام دنیوی محبتوں میں رقابت ہے۔ آپ ایک شخص سے محبت کرتے ہیں، اس سے کوئی دوسرا بھی کرتا ہے تو دونوں محب، باہم رقیب کہلائیں گے اور ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ محبتِ الٰہی اور محبتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہ کمال ہے کہ اگر واقعی کسی کو اللہ سے محبت ہو تو اسے ہر اس بندے سے محبت ہو جاتی ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے، اور اگر واقعی کسی کو رسول اللہ ﷺ سے محبت ہو تو اسے ہر اس بندے سے محبت ہو جاتی ہے جو حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کرتا ہے۔ یہ واضح اور بہت بڑا فرق ہے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے پاس نور کے منبر ہوں گے اور ان پر نورانی چہروں والے لوگ جلوہ افروز ہوں گے، حالانکہ وہ نہ نبی ہوں گے نہ صدیق نہ شہید ہوں گے۔ یعنی نبی، صدیق اور شہید کا رتبہ اس سے کہیں بلند ہے۔ وہ لوگ ان سے کم تر درجے کے لوگ ہوں گے مگر نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ جب لوگوں کو دارو گیر کی فکر ہو گی، سوا نیزے پر سورج ہو گا اور ہر چہرہ پریشان ہو گا کہ نہ جانے اب میرے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے، وہ لوگ بڑے مطمئن، نور کے منبروں پر نورانی چہرے لیے عرشِ عظیم کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ تو عرض کیا گیا "یا رسول اللہ ﷺ! وہ شہید بھی نہیں ہیں، انبیاءؑ بھی نہیں ہیں، پھر وہ کون لوگ ہوں گے؟"

تو آپ ﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا کہ "وہ اللہ کے لیے باہم محبت کرنے والے لوگ ہوں گے۔"

ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو انبیاءؑ نہیں مگر قیامت کے دن انبیاءؑ اور شہداؑ ان پر رشک کریں گے۔ عرض کیا گیا، "وہ کون ہیں تا کہ ہم ان سے محبت رکھیں۔" فرمایا، وہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں نور بھر دیا ہے۔ اللہ کے نور کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں، نہ ان میں خونی رشتہ ہے نہ نسب کا اشتراک۔ ان کے چہرے نورانی ہوں گے، وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ جب لوگ خوفزدہ ہوں گے، انہیں کوئی خوف نہ ہو گا اور جب لوگ غمگین ہوں گے انہیں کوئی غم نہ ہو گا۔

Scanned with CamScanner

تیسری حدیث مبارکہ کا ترجمہ ہے:

حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ کے کچھ بندے ہوں گے جو قیامت کے دن نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے اور ان کے چہروں پر نور ہوگا، حتیٰ کہ اللہ کریم مخلوق کے حساب و کتاب سے فارغ ہو جائے گا"
یعنی مخلوق کا حساب و کتاب ہو رہا ہوگا اور وہ نور کے منبروں پر آرام سے بیٹھے ہوں گے۔

چوتھی حدیث مبارکہ 'ابوداؤد شریف' کی ہے:

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوں گے جو نبی نہیں ہوں گے لیکن نبیؑ اور شہدا اُن پر رشک کریں گے۔" انبیاءؑ کے رشک کی وجہ یہ ہے کیونکہ انبیاءؑ کو تو پوری امت کے ساتھ کھڑا رہ کر جواب دینا ہوگا۔ اسی طرح وہ لوگ ذمہ دار ہیں جو کسی شعبے کے امام ہیں۔ جتنے لوگ ان کی تقلید کریں گے، انہیں ان لوگوں کے ساتھ کھڑا رہ کر جواب دینا ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ بیعت لیتے ہیں، جتنے لوگوں سے بیعت لی ہو، ان سب کے ساتھ کھڑا رہ کر جواب دینا ہوگا اور ان سب حضرات سے جواب طلبی ہوگی کہ کیا آپ نے انہیں صحیح بات پہنچائی؟ انبیاءؑ کا معاملہ تو ہر شک و شبے سے بالاتر ہے۔ آئمہ نے بھی الحمدللہ! انبیاءؑ کی سنت کے مطابق بے لوث خدمت کی اور مخلوق کی رہنمائی فرمائی۔ معاملہ آ کر پیر صاحبان پر پھنس جائے گا کہ وہ دنیا حاصل کرنے کے لیے مرید بناتے رہے، محض لوگوں کا جمِ غفیر اپنے پیچھے لگانے کے لیے مرید بناتے رہے، یا واقعی ان کا مقصد خلوصِ دل سے مخلوق کی اللہ کی طرف رہنمائی کرنا تھا۔ اگر انہوں نے یہ حق ادا کیا تو الحمدللہ! بڑا درجہ پائیں گے ورنہ ساتھ ہی دھر لیے جائیں گے۔ جبکہ وہ لوگ جو محض اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں، کوئی خونی رشتہ نہیں، کوئی لین دین نہیں، کوئی لالچ نہیں تو فرمایا کہ انہیں تو کسی طرح کی جواب طلبی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اس لیے ان پر رشک کیا جائے کہ یہ اچھے رہے کہ ان سے کسی بھی قسم کی جواب طلبی نہیں ہوئی۔

حضرت ابی الدرداءؓ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ مبعوث فرمائے گا، قیامت کے دن اٹھائے گا، اُن کے چہروں پر نور ہوگا اور موتی جڑے، جواہرات کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ میدانِ حشر میں لوگ انہیں دیکھ کر رشک کریں گے کہ یہ کوئی بڑے خوش نصیب لوگ ہیں حالانکہ نہ وہ نبی ہوں گے نہ شہید۔ تو ایک اعرابی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے عرض کیا:

"یارسول اللہ ﷺ ارشاد فرما دیجیے! وہ لوگ کون ہیں تاکہ ہم انہیں پہچان سکیں۔ ہمیں پتا چل جائے کہ ایسے لوگ کون ہیں؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مختلف قبائل سے ہیں، مختلف ممالک سے ہیں، اکٹھے ہوتے ہیں تو صرف اللہ کے ذکر پر یعنی ان کا کوئی اور رشتہ نہیں ہے۔ لین دین نہیں ہے، کسی کو کسی سے کوئی لالچ نہیں ہے لیکن وہ جمع ہوتے ہیں اللہ کے ذکر کے لیے اور اکٹھے ہو کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

حدیث نمبر ۶، ابویعلیٰ نے، احمد نے اور حاکم نے صحیح اسناد سے بیان کیا ہے کہ

ابی مالک الاشعریؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "لوگو! غور سے سنو! اس بات کو سمجھو اور جان لو کہ

Scanned with CamScanner

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو نبی نہیں ہیں، شہدا نہیں ہیں لیکن انبیاءؑ اور شہیدان کی منازلِ قرب پر رشک فرمائیں گے قربِ الٰہی جو انہیں میدانِ حشر میں نصیب ہوگا۔ ایک اعرابی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہاتھ کھڑا کر کے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یہ لوگ انبیاء بھی نہیں ہیں، شہید بھی نہیں لیکن انبیاءؑ اور شہدا ان پر رشک کریں گے اللہ کے قرب کی بنا پر تو یہ لوگ کون ہیں؟ تو فرمایا کہ قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے نور کے منبر بنائے جائیں گے جن پر وہ بیٹھے ہوں گے ان کے چہرے نورانی ہوں گے، ان کا لباس نورانی ہوگا۔ جب لوگوں کو غش آ رہے ہوں گے، میدانِ حشر میں لوگ خوف کے عالم میں ہوں گے تو ایسے کڑے وقت میں بھی یہ گروہ ہر خوف و ڈر سے بے نیاز ہوگا اور یاد رکھو یہ اللہ کے ولی ہیں جنہیں کوئی خوف، کوئی دکھ نہیں ہوگا۔

ان احادیث میں جن اولیائے کرام کا ذکر ہے وہ ایسے ذاکرین، زہاد اور اللہ کے مخلص بندے ہیں جو مجاہدہ ریاضت اور زہد و عبادت سے تزکیۂ باطن میں لگے رہے، یعنی جنہوں نے بہترین طور پر محنت کی۔ یہاں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ان لوگوں نے صرف مراقبے ہی کیے اور مسجدوں میں بیٹھے رہے۔ نہیں! یہ لوگ بھرپور عملی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ انبیاءؑ کے بعد افضل ترین لوگ ہیں، انبیاءؑ کے صحابہؓ ہیں، انؑ کے تربیت یافتہ ہیں۔ جس طرح حضور نبی کریم ﷺ انبیاءؑ میں سب سے افضل ہیں، اسی طرح آپ ﷺ کے صحابہؓ تمام انبیاءؑ کے صحابہ سے افضل ہیں۔

اب صحابہ کرامؓ کی زندگیاں دیکھیں تو انہوں نے مزدوری بھی کی، روزی بھی کمائی، سیاست و حکومت بھی کی، ریاست و حکومت کے قوانین جو انہوں نے چودہ سو سال پہلے وضع کیے آج بھی ان میں بیشتر قوانین کئی کافر ملکوں میں رائج ہیں کیونکہ نظامِ سلطنت کے لیے وہ قوانین بہترین ہیں۔ ان سب کے ساتھ انہوں نے اللہ کے ذکر کا بھی حق ادا کیا۔ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جن کا مقصدِ حیات رضائے الٰہی ہے، اور اس کے حصول کا طریقہ ذکرِ الٰہی ہوتا ہے۔ دنیا کے سارے کام کرتے ہیں لیکن کسی کام میں اللہ کو نہیں بھولتے۔ کاروبارِ حیات انہیں اللہ کے ذکر سے نہیں روک سکتا۔ جسے پنجابی میں یوں کہا جاتا ہے۔ ”ہتھ کار وَل، دِل یار وَل“ کہ ہاتھ کام میں ہوتے ہیں لیکن دل اللہ کی یاد میں لگا ہوتا ہے۔ زندگی کے سارے امور انجام دینا سنت ہے، نبی کریم ﷺ کا مبارک طریقہ ہے۔ یہی وہ طرزِ حیات ہے جو اللہ نے بندوں کے لیے پسند فرمایا اور اس کا نمونہ حیات النبی ﷺ کی شکل میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اسوۂ حسنہ کے کسی ایک پہلو کو چھوڑ دیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ لوگ صرف ذکر ہی کیا کرتے تھے یا مراقبے ہی کرتے رہتے تھے۔ ان تمام احادیث میں جن اولیائے کرام کا ذکر ہے وہ ایسے ذاکرین، زہاد اور اللہ کے مخلص بندے ہیں جو مجاہدہ و ریاضت سے، زہد و عبادت سے تزکیۂ باطن میں لگے رہے۔ اور انبیاء کرامؑ اور اصحابِ سلاسل بزرگوں کی شان ان سے بہت بلند ہے کیونکہ ان حضرات نے اللہ کی مخلوق کو ہدایت کی راہ دکھائی اور اللہ کے بندوں کی اصلاح کی۔ پھر انبیاءؑ کے غبطہ (رشک) کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یعنی انبیاءؑ ان پر کیوں رشک کریں گے؟ تو فرمایا، ”اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ سے ان کی امتوں کے متعلق

Scanned with CamScanner

سوال ہوگا اور اصحاب سلسلہ سے ان کے مریدین کے متعلق سوال ہوگا مگر مذکورہ بالا لوگ اس ذمہ داری سے آزاد ہوں گے۔" تو وہ اس بات پر رشک کریں گے کہ ان لوگوں پر ذمہ داری بھی نہیں ہے اور آج انہیں اتنی عزت کے ساتھ بے فکری بھی حاصل ہے۔ کوئی شخص جسے اللہ یوم حساب، سوال و جواب کی فکر سے آزاد کردے، اس کی شان قابل رشک کیونکر نہ ہوگی۔

دنیوی زندگی میں اولیاء اللہ کی حالت

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنِ انْقَطَعَ إِلَى اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ كَفَاهُ اللهُ تَعَالَى كُلَّ مُؤْنَةٍ وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ...

(الترغیب والترہیب، ۱۷۸:۴؛ المعجم الاوسط للطبرانی، ۳۴۶:۳)

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ کا ہو رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تمام تکالیف کا خود ذمہ دار ہو جاتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے کہ اسے اس کا گمان تک نہیں ہوتا۔"

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهٗ فَإِذَا أَحْبَبْتُهٗ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِيْ لَأُعْطِيَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ (بِيْ الْعَيْذِهِ) ضَبَطْنَاهُ...

(فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۳۴۱:۱۱)

"حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ (اللہ کا فرمان ہے) جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی رکھی، میری طرف سے اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ میرا بندہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کرتا ہے میرے نزدیک سب سے محبوب وہ عبادت ہے جو میں نے اس پر فرض قرار دی ہے، اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اسے محبوب بنالیتا ہوں۔ اور جب میں اسے محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ گرفت کرتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے، اور جب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور جب میرے پاس پناہ ڈھونڈتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔"

قَالَ الطُّوْفِيُّ هٰذَا الْحَدِيْثُ أَصْلٌ فِي السُّلُوْكِ إِلَى اللهِ وَالْوُصُوْلِ إِلٰى مَعْرِفَتِهٖ وَ مَحَبَّتِهٖ وَ طَرِيْقِهٖ إِذَا الْمُفْتَرَضَاتُ الْبَاطِنَةُ وَ هِيَ الْإِيْمَانُ وَ الظَّاهِرَةُ وَ هِيَ الْإِسْلَامُ وَ الْمُرَكَّبُ مِنْهُمَا وَ هُوَ الْإِحْسَانُ فِيْهِمَا كَمَا تَضَمَّنَهٗ حَدِيْثُ جِبْرِيْلَ

Scanned with CamScanner

وَ الْاِحْسَانُ يَتَضَمَّنُ مَقَامَاتِ السَّالِكِيْنَ مِنَ الزُّهْدِ وَ الْاِخْلَاصِ وَ الْمُرَاقَبَةِ وَغَيْرِهَا۔۔۔(فتح الباری، شرح صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۱۱: ۳۴۵)

"علامہ طوفی نے کہا ہے کہ یہ حدیث سلوک الی اللہ اور اس کی محبت و معرفت کے وصول اور اس کی راہ پر چلنے میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا طریقہ فرائضِ باطنیہ یعنی ایمان، اور ظاہر یعنی اسلام اور ان دونوں سے مرکب یعنی احسان کی بجا آوری ہے جیسا کہ حدیثِ جبرئیلؑ سے ظاہر ہے، اور احسان عبارت ہے مقاماتِ سالکین سے جیسے زہد، اخلاص اور مراقبہ وغیرہ۔"

دُنیوی زندگی میں اولیاء اللہ کی حالت

یعنی اولیائے کرام دنیا میں کس طرح جیتے ہیں؟ عمران بن حصین سے مروی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ کے لیے دنیا کی محبت سے منہ موڑ لیتا ہے تو اللہ اسے کافی ہوتا ہے اور ایسے اسباب پیدا فرما دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اُس کا گمان تک نہیں ہوتا۔ اللہ اسے روزی دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ کام کاج چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح مشقت کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں لیکن اللہ ان کے کاموں میں اس طرح سے برکت ڈالتا ہے کہ انہیں اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں ہونے دیتا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ انہیں رزق کس طرح سے دیا جا رہا ہے۔

حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے ولی سے دشمنی کی، میں اس کے ساتھ اعلانِ جنگ کرتا ہوں، اور میرا بندہ میرا قرب تلاش کرتا ہے فرائض میں جو میں نے اس پر فرض کیے ہیں (یعنی یہ لوگ سب سے پہلے فرائض کی فکر کرتے ہیں)۔ پھر فرائض کے بعد میرا بندہ کثرتِ نوافل سے میری رضا اور میری محبت تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔ پھر اللہ فرماتا ہے کہ جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، اس کی نظر بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، اس کے قدم بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اس کو عطا کرتا ہوں، مدد چاہتا ہے تو میں اس کی مدد کرتا ہوں۔

یعنی اس کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان اس قدر اللہ کی اطاعت میں فنا ہو جاتے ہیں جیسے وہ اس کے اپنے نہیں ہیں، اللہ کے ہیں اور وہ وہی کام کرتے ہیں جو اللہ چاہتا ہے۔ یہ بہت بڑا فرق و فاصلہ ہے، ایک ولی اللہ اور ایک عام دنیادار کی سوچ میں کہ ہم اپنی اس عارضی زندگی میں اعضاء و جوارح، سوچ و فکر کو اپنی ذاتی چیز سمجھتے ہیں اور اسے اس طرح خرچ کرنا چاہتے ہیں جس طرح ہم چاہتے ہیں۔ لیکن جو اللہ کے ولی ہیں، بندے ہیں وہ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس تو یہ طاقتیں امانت ہیں، اصل میں تو یہ اللہ کا مال ہیں۔ لہٰذا وہ انہیں اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح اللہ چاہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

جیسے وہ ہاتھ اللہ کے ہی ہیں، نگاہ اللہ کی ہے، زبان اللہ کی ہے، قدم اللہ کے ہیں، میرے نہیں ہیں۔ جب اللہ کے ہیں تو جہاں اللہ چاہے گا وہیں حرکت کریں گے۔ یہ بہت بڑا اعزاز و مرتبہ ہے کہ اس دارِ دنیا میں کسی کو یہ عظمت نصیب ہو جائے۔ تو فرمایا، ایسے لوگ اگر مجھ سے کچھ مانگتے ہیں تو میں انہیں عطا کرتا ہوں اور مدد چاہتے ہیں تو ان کی مدد کرتا ہوں۔

قَالَ الطُّوْفِيُّ هٰذَا الْحَدِيْثُ اَصْلٌ فِي السُّلُوْكِ اِلَى اللهِ۔۔۔ یعنی یہ حدیث سلوک الی اللہ کی بنیاد ہے۔

وَالْوُصُوْلُ اِلٰى مَعْرِفَتِهٖ۔۔۔ اور اس کی معرفت تک پہنچنے کی بنیاد، اساس اور اصل ہے۔

یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قلبی اور باطنی فرائض کا حاصل ایمان ہے۔ باطنی اور روحانی کمالات کی بنیاد ایمان پر ہے اور ظاہری کمال کی بنیاد اسلام پر ہے۔ اسلام نام ہے احکام کا، اوامر و نواہی کا، جبکہ ایمان نام ہے اس یقین کا جو ایک کیفیتِ قلبی ہے۔ اس لیے باطنی کمالات کا مدار ایمان پر ہے اور ظاہری کمالات کا مدار اسلام پر ہے۔

وَالْمُرَكَّبُ فِيْهِمَا وَهُوَ الْاِحْسَانُ۔۔۔ اور ان دونوں سے جو حاصل ہوتا ہے وہ احسان ہے۔ یعنی اعمال شریعت کے مطابق ہوں، ایمان اور عقیدہ حضور اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے عقیدے کے عین مطابق ہو تو جب یہ دونوں چیزیں ملتی ہیں تو اس پر جو پھل لگتا یا جو اس سے حاصل ہوتا ہے، وہ احسان ہے۔ جیسا کہ حدیثِ جبرئیلؑ سے ظاہر ہے۔

وَالْاِحْسَانُ يَتَضَمَّنُ مُقَامَاتِ السَّالِكِيْنَ مِنَ الزُّهْدِ وَالْاِخْلَاصِ وَالْمُرَاقَبَةِ وَغَيْرِهَا۔۔۔

اور احسان کو سالکین کے مقامات میں شمار کیا گیا ہے جیسے زہد، پارسائی، اخلاص، خلوصِ نیت اور مراقبہ وغیرہ۔

حدیث مبارکہ جس میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "اللہ کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی رکھی، میری طرف سے اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔" یعنی ان لوگوں سے دشمنی بہت بڑی بدبختی ہے۔ مولانا تھانویؒ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں سے دشمنی رکھنے والے کو جو سب سے کم نقصان پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان کے فیض سے محروم ہو جاتا ہے، اور جس بڑے نقصان کا خطرہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ ولی کی ولایت پر ایمان لانا فرض تو نہیں اور اس کا انکار کفر نہیں لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسے لوگ عموماً مرتے کفر پر ہی ہیں یعنی مفضی الی الکفر ہے۔ اولیاء اللہ سے دشمنی آہستہ آہستہ کھینچ کر کفر تک لے ہی جاتی ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اللہ کا اعلانِ جنگ معمولی چیز نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح جنگ کا نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے کہ مقابل کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے جو سب سے بڑی ہلاکت ہے، وہ کفر ہے کہ آدمی ایمان سے خالی ہو جائے۔ ایسا شخص ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گیا۔ آگے فرمایا،

"میرا بندہ میرا قرب حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کرتا ہے، اس میں مجھے سب سے محبوب وہ عبادت ہے جو میں نے اس پر فرض قرار دی ہے۔ اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ گرفت کرتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے، جب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں، میرے پاس پناہ ڈھونڈتا ہے تو اسے پناہ دیتا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

علامہ طوفی نے کہا کہ "یہ حدیث سلوک الی اللہ اور محبت و معرفت کی راہ پر چلنے میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے،
اس کا طریقہ، فرائضِ باطنیہ یعنی ایمان اور ظاہر یعنی اسلام اور ان دونوں سے مرکب یعنی احسان کی بجا آوری ہے، جیسا کہ
حدیثِ جبرئیلؑ سے ظاہر ہے اور احسان عبارت ہے مقاماتِ سالکین سے جیسے زہد، اخلاص اور مراقبہ وغیرہ۔

قربِ الٰہی کے مدارج

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ولایت کے دو رکن ہیں، اوّل اتباعِ شریعت، دوم باطن کا انوارِ حقیقت میں مستغرق ہو جانا
اور ولایت کا مفہوم ہے حصولِ قربِ الٰہی، اور حصولِ قربِ الٰہی کے وسائل دو ہیں، اوّل اطاعتِ الٰہی، دوم اجتناب از معصیت۔

لَمَّا كَانَ وَلِيُّ اللهِ مَنْ تَوَلَّى اللهَ بِالطَّاعَةِ وَالتَّقْوٰى تَوَلَّاهُ اللهُ بِالْحِفْظِ وَالنُّصْرَةِ...

(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۱۱: ۳۴۳)

"انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی دوستی کا ثبوت اس کی اطاعت اور تقویٰ سے ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی
طرف سے دوستی کا اظہار حفاظت اور نصرت سے ہوگا۔"

قربِ الٰہی کے مدارج

ولایت کے دو شعبے ہیں۔ ظاہراً شریعت کا اتباع اور باطناً انوارِ حقیقت میں مستغرق ہو جانا۔ ولایت کا مفہوم ہے
حصولِ قربِ الٰہی یعنی اس کا ماحصل جسے انگریزی میں **Ultimate Result** کہتے ہیں (جو اس سے وصول ہوتا ہے)
وہ ہے قربِ الٰہی۔ اور اس کے دو وسائل ہیں، اطاعتِ الٰہی اور اجتناب از معصیت یعنی اللہ کی اطاعت کرنا اور اس کی نافرمانی
سے بچنا۔ پورے خلوص کے ساتھ انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی دوستی کا ثبوت اس کی اطاعت اور تقویٰ ہوتا ہے اور اللہ کی
طرف سے دوستی کا اظہار حفاظت و نصرت ہوتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ولایت کے بغیر اسلام کا تصور نہیں۔ جسے اللہ کی
اطاعت اور ایمان میں خلوص نصیب نہیں اس کے مسلمان ہونے کا اعتبار نہیں۔ اسی کو ولایت کہتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... (البقرہ: ۲۵۷)

ہم اپنی رائے کے مطابق کسی کو ولی کہتے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی سند نہیں آئی، کوئی چٹھی نہیں آئی کہ
فلاں کا بیٹا فلاں میرا ولی ہے۔ صرف انبیاءؑ ہیں جن کی تصدیق اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ میرا نبیؐ ہے، اس کے بعد صحابہ کرامؓ
خوش نصیب ہستیاں ہیں جن کے بارے میں اللہ نے قرآن میں سند نازل فرمائی ہے۔ ہمارا فیصلہ قیامت کو ہوگا، صحابہؓ کے
بارے میں فیصلہ تو قرآن میں کر دیا گیا، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ... (المائدہ: ۱۱۹؛ التوبہ: ۱۰۰؛ المجادلہ: ۲۲؛ البینہ: ۸)
ان سب سے میں راضی ہوں اور میں انہیں اتنا عطا کر دوں گا کہ یہ مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔ انبیاءؑ اور صحابہؓ کا فیصلہ تو ہو گیا،

Scanned with CamScanner

اس کے بعد کسی کو رسید نہیں ملی کہ یہ ولی اللہ ہے۔ ہاں! فقط ایک رسید ہے قرآن میں اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ... اللہ ہر مومن کا ولی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شرطِ ایمان یہ ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہوگا، اور شرطِ ولایت یہ ہے کہ وہ ظاہراً شریعت کا پابند ہوگا اور باطناً خلوص سے اللہ کی رضا کا طالب ہوگا۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ بندۂ مسلمان یا تو اللہ کا ولی ہوگا، اگر نہیں ہے تو اس کا ایمان خطرے میں ہے، اس کی مسلمانی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اللہ کا ولی ہونے سے یہ مراد نہیں کہ ہر ایک کے منازل بہت بلند ہوں مگر لیکن دو بنیادی باتیں اس میں ضرور ہوں گی۔ اول ظاہری احوال کہ اس کی پوری کوشش ہوگی کہ میں شریعت کا اتباع کروں۔ اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ کہیں غلطی ہوتی ہے تو روئے گا، اللہ سے معافی مانگے گا اور غلط بات ترک کر دے گا۔ باطناً اور قلبی طور پر اس کی محبت کا مرکز اللہ، رسول اللہ ﷺ اور آخرت ہوگی۔ دنیا کو اس طرح استعمال کرے گا جس طرح کوئی مہمان آ کر مہمان خانے میں ٹھہرتا ہے۔ خوبصورت برتن بستر اور خوبصورت فرنیچر وہ باندھ کر اٹھانے کی تیاری نہیں کرتا۔ مہمان کو جتنا خوبصورت سامان فراہم کیا جائے وہ اتنی ہی تمیز سے استعمال کرتا ہے، جتنا اچھا کھانا دیا جائے اسی قدر سلیقے سے کھاتا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ مجھے رات دو راتیں ٹھہرنا ہے پھر چلے جانا ہے۔ جتنا اس کا Status بلند ہوگا، جس قدر اعلیٰ اس کا شعور ہوگا وہ اتنی ہی احتیاط سے صاحبِ خانہ کی چیزیں استعمال کرے گا۔ دنیا میں بندۂ مومن اسی طرح رہتا ہے۔ جو دولت اسے نصیب ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ اللہ کی ہے، وہ اس کا امین ہوتا ہے، اسے جائز امور پر خرچ کرتا ہے، ناجائز سے بچاتا ہے۔ جو مال، مکان، گاڑیاں اس کے پاس ہوتی ہیں وہ اللہ کا انعام ہوتا ہے، وہ انہیں امانت سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ اس پر تکبر نہیں کرتا، اتراتا نہیں، ہمیشہ کے لیے اس میں دل نہیں لگاتا۔

ولایت ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ چھوٹا اور کم درجہ ہی سہی لیکن ہے تو سہی کیونکہ اللہ نے فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرہ: ۲۵۷) "اللہ ہر مومن کا ولی ہے۔"

اب اس کا دوسرا رخ دیکھیں۔ اگر کسی کو ولایت حاصل نہیں ہے تو پھر اس کے مومن ہونے کا یقین نہیں۔ اگر مومن ہے تو ولی اللہ ہوگا۔ ولایت کی علامت ہے کہ متبعِ شریعت ہوگا اور اندرونی (باطنی) طور پر اس کا مقصد حصولِ رضائے الٰہی ہوگا۔

قربِ فرائض

بخاری کی مندرجہ بالا حدیثِ قدسی سے قربِ الٰہی کے تین مدارج ثابت ہوئے، قربِ فرائض، قربِ نوافل اور درجہ محبوبیت۔ قربِ فرائض یہ ہے کہ بندہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے، جس کو صوفیا فنائے ذات سے تعبیر کرتے ہیں یعنی انسان اپنا ارادہ مٹا دے، خود محض آلہ بن جائے۔

کما قال تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ... (التوبہ: ۱۱۱)

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔"

Scanned with CamScanner

قربِ فرائض

قربِ فرائض یہ ہے کہ بندہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے جس کو صوفیا فنائے ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہستی کو مٹانے سے مراد یہ ہے کہ جو چیز فرض ہے جہاں تک اُس سے ممکن ہو کرے لیکن ہر حال میں کرے۔ بہانے نہ کرے کہ آج یہ ہے، آج وہ ہے، طبیعت خراب ہے۔ عجیب بات ہے! حالات کچھ بھی ہوں، دنیا کا کوئی کام نہیں چھٹتا۔ دفتر، دکان، کاروبار سب کچھ کیا جاتا ہے مگر ذرا سی چھینک بھی آجائے تو نماز نہیں پڑھی جاتی، فرائض چھوٹ جاتے ہیں۔ تو قربِ فرائض یہ ہے کہ بندہ فرائض کو لازمی اختیار کرے، جب تک اور جہاں تک اس کا بس چلتا ہے، لیکن جہاں بس نہیں چلتا،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا... (البقرہ:۲۸۶) جہاں انسان بے بس ہے وہاں وہ مکلف ہے ہی نہیں۔ اب صلوٰۃ میں کھڑا ہونا، قیام کرنا فرض ہے لیکن ایک شخص کھڑا نہیں ہو سکتا تو اس پر سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے، وہ بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔ جہاں کسی کا بس نہیں چلتا، وہاں فرائض ساقط ہو جاتے ہیں لیکن جہاں کسی کا بس چلتا ہے وہاں کوئی بہانہ تلاش نہ کرے، فرائض کو پورا کرے۔ اپنے آپ کو محض ایک آلہ سمجھے کہ میں تو ایک آلہ ہوں تعمیلِ ارشاد کا۔ حکمِ الٰہی ہر حال میں بجالاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ 'فاعل' یعنی کام اللہ نے کرنا ہے، میں تو محض ایک آلہ ہوں۔

كَمَا قَالَ تَعَالٰى: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ... (التوبہ:۱۱۱)
جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مومنین اپنی جان، اپنا مال بیچ چکے۔ اُس ربِ کریم نے مال بھی دیا، جان بھی اسی نے دی۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے جنت دے کر جان و مال ان سے خریدا ہے یعنی میں نے مفت دیا تھا، اپنی عطا سے دیا تھا، جان، مال، آبرو، اولاد، بے شمار نعمتیں میں نے دیں، پھر مفت میں واپس نہیں لیں، میں نے اپنی جنت دے کر بس اپنے نام کروائی ہیں۔ اب جبکہ سب کچھ ہے ہی اللہ کا تو بندۂ مومن اس میں حرام ملا کر زیادتی کیوں کرے گا؟ جب سب کچھ اس کا ہے ہی نہیں، اللہ کا ہے تو جس طریقے سے اللہ نے منع فرمایا ہے اس طریقے سے حاصل نہ کرے۔ اگر اس کا ایمان ہے تو وہ کیوں ایسا کرے گا؟ کیونکہ مومن کی یہ صفت ہے کہ وہ حکمِ الٰہی سے باہر کچھ نہیں کرے گا۔

قربِ نوافل

قربِ نوافل سے وہ ترقی حاصل ہوتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

كَمَا قَالَ الرَّازِيُّ... وَلَمَّا كَانَ لَا نِهَايَةَ لِتَزَايُدِ اَنْوَارِ الْمَرَاتِبِ لَا جَرَمَ لَا نِهَايَةَ لِسَفَرِ الْعَارِفِيْنَ فِيْ هٰذِهِ الْمَقَامَاتِ الْعَالِيَةِ الْقُدْسِيَّةِ وَذٰلِكَ بَحْرٌ لَا سَاحِلَ لَهٗ وَمَطْلُوْبٌ لَا نِهَايَةَ لَهٗ... (سُبْحَانَ مَنْ اَعْطٰى تِلْكَ الْقُرُبَاتِ لِاَوْلِيَائِهٖ)... (تفسیر الکبیر، ۳۲۵:۴)

"جب تزائد انوار مراتب کی انتہا نہیں تو عارفین کے سفر کی بھی مراتبِ عالیہ میں انتہا نہیں۔ یہ ایسا سمندر

ہے جس کا کنارہ نہیں اور یہ ایسا مطلوب ہے جس کی انتہا نہیں۔ (پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے اولیاء کو یہ قرب عطا فرمائے)۔"

فائدہ:

روح ان اجسام سے نہیں جو متفرق اور متمزق ہو جاتے ہیں بلکہ یہ ایسے جوہر سے ہے جو ملائکہ سے بھی الطف ہے اور اس کا مسکن مافوق العرش عالم امر ہے مگر تعلق بدن سے، یہ اپنے اصلی وطن کو بھول جاتا ہے اور اس کی قوت پرواز یا تو بالکل ختم ہو جاتی ہے یا نہایت کمزور ہو جاتی ہے۔ جب کسی عارف کامل نے اسے اپنے وطن سے مانوس کرایا، ذکر الٰہی کی کثرت ہوئی اور اسم الظاہر والباطن اس کے پَر بن گئے تو قوت پرواز لوٹ آئی اور روح انوار معرفت سے منور ہو گئی۔

وَاَشْرَقَتْ عَلَيْهَا اَنْوَارُ الْاَرْوَاحِ السَّمَاوِيَّةِ الْعَرْشِيَّةِ الْمُقَدَّسَةِ وَ فَاضَتْ عَلَيْهَا مِنْ تِلْكَ الْاَنْوَارِ قُوِيَتْ...طَيَرَانِهَا... (تفسیر الکبیر، ۵:۴۶۷)

"اور جب روح پر انوار ارواح سمائیہ عرشیہ مقدسہ پرتو فگن ہوتے ہیں تو ان کے فیضان سے اس کی قوت پرواز ترقی کرتی ہے (اور وہ اپنے وطن اصلی کی طرف مشتاقانہ پرواز کرنے لگتی ہے)۔

قرب نوافل

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ انوارات و مراتب میں زیادتی کی کوئی انتہا، کوئی حد نہیں یعنی نوافل سے، ذکر و اذکار سے، مراقبات سے بقدر محنت ترقی ہوتی چلی جاتی ہے، کوئی آخری حد نہیں ہے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ صلوٰۃ میں جو نوافل پڑھے جاتے ہیں، مراقبات ان سے افضل ہیں چونکہ یہ بھی نوافل ہیں۔ ذکر بھی نوافل میں شامل ہے، تسبیحات و تلاوت جو ہم کرتے ہیں یہ بھی نوافل ہیں۔ نفل اس آمدنی کو کہتے ہیں جو زائد ہوتی ہے مثلاً اگر ہم نے پانچ سو روپیہ خرچ کیا اور آمدن ہو گئی چھ سو تو وہ ایک سو جو منافع ہے، اسے نفل کہتے ہیں۔ قرآنِ پاک کی سورۂ انفال میں اس کے نام کی مناسبت سے مالِ غنائم کا ذکر ہے جو جنگ کے بغیر، بطورِ نفع حاصل ہوا۔ جہاں اسلامی لشکر پہنچا اور فریق مقابل نے Surrender کر دیا، جنگ نہیں کی اور تاوان ادا کر دیا، یا غنیمت کا مال حاصل ہوا، اسے نفل کہا گیا۔ فرائض رأس المال ہیں، جیسے کوئی کاروبار میں پانچ سو خرچ کرتا ہے تو اب پانچ سو تو واپس آنا چاہیے یہ تو رأس المال ہے۔ اگر پانچ سو سے کم آتا ہے، ایک دفعہ چار سو آ گیا، پھر تین سو، پھر دو سو، اگلی دفعہ تو چھٹی ہو جائے گی، لہٰذا رأس المال کی واپسی تو ضروری ہے۔ اب اس کے ساتھ جو زائد آتا ہے وہ نفع ہے، تو فرائض رأس المال اور نفل نفع ہے۔ اور امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ "اس کی زیادتی میں انوارات، مراتب اور مقامات کی کوئی انتہا نہیں تو عارفین کے سفر کی بھی مراتبِ عالیہ میں انتہا نہیں۔ یہ ایسا سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں اور ایسا مطلوب ہے جس کی انتہا نہیں۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے اولیا کو یہ قرب عطا فرمایا۔"

Scanned with CamScanner

آگے روح کے متعلق ذکر ہے، "روح ان اجسام سے نہیں جو متفرق و متمزق (ٹکڑے ٹکڑے) ہو جاتے ہیں بلکہ ایسے جوہر سے ہے جو ملائکہ سے بھی الطف ہے"۔ یعنی روح فرشتوں سے بھی لطیف تر ہے "اور اس کا مسکن ما فوق العرش عالمِ امر ہے" یعنی روح کا اصل گھر اور اصل وطن عالمِ امر ہے لیکن اس کا رشتہ اللہ نے بدن سے ایسا کر دیا ہے کہ بدن کی خواہشات کی تکمیل میں لگ کر بدن کی جانب زیادہ توجہ ہو جانے سے روح اپنا اصلی کام بھول جاتی ہے۔ "اور اس کی قوتِ پرواز یا تو بالکل ختم ہو جاتی ہے یا نہایت کمزور ہو جاتی ہے۔ جب کسی عارفِ کامل نے اسے اپنے وطن سے مانوس کرایا، ذکرِ الٰہی کی کثرت ہوئی اور اسم الظاہر والباطن اس کے پَر بن گئے تو قوتِ پرواز لوٹ آئی اور روح انوارِ معرفت سے منور ہو گئی"۔ جب بندہ کسی عارفِ کامل کے پاس پہنچتا ہے تو اسے ذکر کے ذریعے انواراتِ الٰہی نصیب ہوتے ہیں۔ انوارات بھی عالمِ بالا سے آتے ہیں۔ بدن کے مقابلے میں جب روح زیادہ قوی ہو جاتی ہے تو پھر اسے اپنا گھر یاد آتا ہے، پھر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے کام نہ کیے جائیں جو اس کے اپنے وطن سے تعلق میں کمزوری پیدا کرتے ہیں یعنی خلافِ شریعت کچھ نہ کیا جائے اور دل میں دنیا کی محبت کی بجائے اپنے گھر کی، اصل وطن کی، عالمِ امر کی محبت رکھی جائے۔ عارفین اور کاملین اور پیر کی ضرورت اسی لیے ہے۔ یہ جو ہم محض خانہ پُری کے لیے ایک پیر بنا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں اولاد، روزی، نوکری سب کچھ پیر دیتا ہے۔ یہ سب فضولیات تو ہندوؤں کے عقیدے ہیں، یہ شرک و بت پرستی ہے۔ پیر کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ خود کامل ہو، عارف باللہ ہو، تاکہ ہماری ارواح کو منور کر کے انہیں اپنے وطن سے آشنا کرائے۔

یہ جو مراقبۂ اسمِ ظاہر و باطن کرایا جاتا ہے، میں نے کئی دفعہ دورانِ مراقبہ بھی بتایا ہے کہ یہ مراقبہ قوتِ پرواز کی اصل بنتا ہے جیسے طیارے میں انجن لگایا جاتا ہے یا پرندے کے پر ہوتے ہیں۔ آخری منازل تک یہی قوتِ پرواز کام آتی ہے جو اس مراقبہ سے حاصل ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں، "جب روح پر انوارِ ارواحِ سمائیہ، عرشیہ مقدسہ پرتو فگن ہوتے ہیں تو ان کے فیضان سے اس کی قوتِ پرواز ترقی کرتی ہے اور وہ اپنے وطن کی طرف مشتاقانہ پرواز کرنے لگتی ہے۔"

درجہ محبوبیت

عارف کو محبوبیت کا درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی آنکھوں میں، اس کے کانوں میں، اس کے ہاتھ پاؤں میں بلکہ تمام اعضاء و جوارح میں غیر اللہ کا کچھ حصہ نہ رہے۔ اسی حدیث سے ابن قیم نے 'کتاب الروح' میں یہ ثابت کیا ہے کہ اولیاء اللہ کا قلب صاف آئینہ بن جاتا ہے، اور اس سے تمام چیزوں کو اپنی حقیقت پر دیکھتے ہیں:

فَصَارَ قَلْبُهٗ كَالْمِرْاٰةِ الصَّافِيَةِ تَبْدُوْا فِيْهَا صُوَرُ الْحَقَآئِقِ عَلٰى مَا هِيَ عَلَيْهِ فَلَا تَكَادُ تُخْطِئُ لَهٗ فَرَاسَتُهٗ فَاِنَّ الْعَبْدَ اِذَا بَصَرَ بِاللّٰهِ اَبْصَرَ الْاَمْرَ عَلٰى مَا هُوَ عَلَيْهِ فَاِذَا سَمِعَ بِاللّٰهِ سَمِعَهٗ عَلٰى مَا هُوَ عَلَيْهِ... (کتاب الروح، ۲۹۰)

پس اس کا دل صاف آئینہ ہو جاتا ہے اور اس آئینۂ صافی میں اشیاء کی حقیقی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔
اس کی فراست خطا نہیں کرتی کیونکہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیکھتا ہے تو اس چیز کو اپنی اصلی صورت پر دیکھتا ہے، اور جب سنتا ہے اسے اپنی اصل پر سنتا ہے۔"

فائدہ:

اس سے کشفِ حقیقی کے علاوہ رویت اشکال کا مراقبہ بھی ثابت ہوا۔ مگر اس قدر ترقی کر جانے کے باوجود طالب صادق اور عارف حقیقی مزید ترقی کا طالب ہی رہتا ہے۔

وَفِي هٰذَا الْحَدِيْثِ... اَنَّ الْعَبْدَ وَلَوْ بَلَغَ اَعْلَى الدَّرَجَاتِ حَتّٰى يَكُوْنَ مَحْبُوْبًا لِلّٰهِ تَعَالٰى عَزَّ وَ جَلَّ لَا يَنْقَطِعُ عَنِ الطَّالِبِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى لِمَا فِيْهِ مِنَ الْخُضُوْعِ لَهٗ وَ اِظْهَارِ الْعُبُوْدِيَّةِ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الرقاق باب التواضع، ۱۱: ۳۴۵)

"اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بندہ خواہ کتنے بلند درجات تک پہنچ جائے حتیٰ کہ محبوب خدا بن جائے، پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ترقی کا طالب ہی رہے گا کیونکہ اس میں خشوع وخضوع اور اظہار عبودیت ہے۔ (اور بندہ کے لیے انتہائی مقامِ عبودیت ہے)۔"

فائدہ:

حدیثِ بخاری سے یہ امور ثابت ہوئے:

۱۔ فرائض رأس المال ہیں اور نوافل بمنزلہ منافع ہیں۔
۲۔ جب تک قربِ فرائض حاصل نہ ہو قربِ نوافل حاصل نہیں ہوتا کیونکہ فرائض بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔
۳۔ قربِ الٰہی ادائے فرائض ونوافل پر موقوف ہے۔
۴۔ اولیاء اللہ کو جو مناصب ملتے ہیں وہ قربِ الٰہی پر موقوف ہیں۔
۵۔ قربِ الٰہی کسی منصب پر موقوف نہیں۔
۶۔ جو ولی اللہ منصبِ محبوبیت پر فائز ہوتا ہے وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔
۷۔ ولی اللہ سے دشمنی اور بغض رکھنے میں سوء خاتمہ کا خطرہ ہے۔
۸۔ الہام صرف صاحبِ الہام کے لیے حجت ہے بشرطیکہ کسی منصوص شرعی حکم کے مخالف نہ ہو۔

درجۂ محبوبیت

قربِ فرائض اور قربِ نوافل کے بعد تیسرا درجہ، درجۂ محبوبیت ہے کہ اللہ کریم فرماتے ہیں (حدیث قدسی میں) "میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

عارف کو محبوبیت کا درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی آنکھوں، اس کے کانوں، اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء و جوارح میں غیر اللہ کا کچھ حصہ نہ رہے، یعنی اللہ کریم کا حدیث قدسی میں یہ ارشاد کہ میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں، سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ آ کر اس کی آنکھ کی جگہ بیٹھ جاتا ہے۔ ارشاد سے مراد ہے کہ اس کی بینائی میں غیر اللہ کا حصہ نہیں رہتا، وہ صرف اللہ کا طالب بن جاتا ہے اور اس کے اعضاء و جوارح میں، دل میں، خواہش و آرزو میں ایک ہی طلب رہ جاتی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو، مجھے قربِ الٰہی نصیب ہو۔ غیر اللہ کی طلب مٹ جاتی ہے اور یاد رکھیے! غیر اللہ سے مراد ہر وہ کام ہے جو شریعت کے خلاف ہو۔ یہاں لوگوں کو یہ دھوکا لگتا ہے کہ کسی نے صاف کپڑے پہن لیے تو وہ دنیادار ہو گیا۔ بات یہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ

چیست دنیا از خدا غافل بدن

نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کیا ہے؟ اللہ سے غافل ہو جانا۔ خواہ کوئی غریب ہے، بھوکا ہے لیکن اللہ کو بھولا ہوا ہے تو وہ دنیادار ہے۔ کوئی رئیس ہے لیکن اللہ کی یاد میں ہے اور ناجائز کام نہیں کرتا تو وہ دنیادار نہیں ہے۔ گھر بار ہونا، بیوی بچے ہونا، یا مال و زر ہونا دنیا نہیں ہے۔ یہ سب اللہ کے بندے کے پاس ہوگا تو حلال وسائل، حلال ذرائع سے ہوگا اور جائز جگہ پر ہوگا۔ تو فرمایا، "عارف کو محبوبیت کا درجہ اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی آنکھوں میں، اس کے کانوں میں، اس کے ہاتھ پاؤں، تمام اعضاء و جوارح میں غیر اللہ کا کچھ حصہ نہ رہے"۔ یہ اس حدیث قدسی کی وضاحت ہو گئی کہ اللہ نے فرمایا "میں اس کے کان بن جاتا ہوں، آنکھ بن جاتا ہوں، ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں"۔ ایسے شخص کو غیر اللہ سے کوئی امید ہوتی ہے نہ نفرت کہ خواہ مخواہ اسے برا بھلا کہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ جو کام جائز ہے، فرض ہے، اسے فرض سمجھ کر کرتا ہے، جو غیر ضروری ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

ابن قیمؒ نے 'کتاب الروح' میں یہ ثابت کیا ہے کہ اولیاء اللہ کا قلب صاف آئینہ بن جاتا ہے اور اس سے وہ تمام چیزوں کو اپنی حقیقت پر دیکھتے ہیں۔ چیزوں کی حقیقت کو دیکھنا رب کریم کا بہت بڑا احسان ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک دن دولت کدے پر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے پوچھا "گھر میں کچھ کھانے کو ہے؟" آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ایک روایت ملتی ہے بلکہ متعدد روایات ملتی ہیں۔ فرماتی ہیں کہ ایک چاند طلوع ہوتا اور گزر جاتا، اگلا چاند طلوع ہوتا وہ بھی گزر جاتا اور تیسرا چاند طلوع ہو جاتا مگر اس عرصے میں کاشانۂ نبوی ﷺ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی جسے آگ پر پکایا جاتا۔ تو عرض کیا گیا کہ اماں جان پھر گزارا کس طرح ہوتا تھا؟ فرمایا، "کبھی مدینہ دودھ آ جاتا، اسی سے سب گزارا کر لیتے، کبھی کھجوریں آ جاتیں، ان پر گزارا ہو جاتا"۔ حضور اکرم ﷺ کی زندگی حضور ﷺ کی زندگی تھی! آپ ﷺ جانیں اور اللہ جانے، ہم ان مقامات کو نہیں سمجھ سکتے، ہماری عقل وہاں تک کام نہیں کرتی۔

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ تشریف لائے۔ پوچھا، "کچھ کھانے کو ہے؟" تو عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! کوئی شخص بکرے کا جگر ہدیہ دے گیا تھا، وہ رکھا ہے۔ فرمایا، "لے آئیں"۔ جب وہ لایا گیا تو وہ پتھر بن چکا تھا۔ آپ ﷺ کے استفسار پر وضاحت کی گئی کہ رکھا تو جگر ہی تھا، فرمایا، "کوئی سائل تو نہیں آیا تھا؟" عرض کیا گیا، "ایک سائل آیا تھا اور ہم نے اسے کہا تھا کہ گھر میں کچھ نہیں۔" حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "جب یہ تھا تو آپ نے کیوں کہا کہ کچھ نہیں ہے؟" عرض کیا گیا، "یہ تو آپ ﷺ کے لیے رکھا تھا۔" فرمایا، "جب یہ گھر میں تھا، سائل آیا تو اسے دے دینا تھا، میرا انتظام اللہ خود کر دیتا۔ آپ نے اللہ کی راہ میں نہیں دیا تو اس کی حقیقت اللہ نے ظاہر کر دی کہ اب یہ پتھر ہے۔"

حضور اکرم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَآءَ کَمَا ھِیَ ... (تفسیر الکبیر، ۱۳: ۳۷) "یا اللہ ہمیں چیزوں کی حقیقت دکھا دیا کیجیے۔"

یہ آپ ﷺ کی دعا تھی کہ اللہ کی راہ میں نہ دیئے جانے کے سبب جب جگر پتھر بن گیا تو اس کی حقیقت حضور ﷺ کو دکھا دی گئی۔ تو ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے 'کتاب الروح' میں یہ ثابت کیا ہے کہ "اولیاء اللہ کا قلب صاف آئینہ بن جاتا ہے۔ اس سے وہ تمام چیزوں کو اپنی حقیقت پر دیکھتے ہیں" یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے جگر کے پتھر بننے کی حقیقت آپ ﷺ کو دکھا دی گئی۔ یہ معاملہ کسی عام آدمی کے ساتھ ہوتا تو اسے وہ بہر طور جگر ہی نظر آتا گو کہ اس کا کھانا پتھر کھانے کے برابر ہی تھا۔ ہمارے گھروں میں آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہیں لیکن کچھ نظر نہیں آتا۔ ہمیں تو یہ حقیقتیں قیامت کے دن دکھائی جائیں گی۔

بظاہر چیزیں کچھ ہوتی ہیں ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور اولیاء اللہ کے قلوب اس حقیقت کو دیکھ لیتے ہیں۔ فَصَارَ قَلْبُهٗ كَالْمِرْآةِ الصَّافِيَةِ ... ابن قیم کے الفاظ ہیں، "ان کے دل شفاف آئینے کی طرح ہو جاتے ہیں۔" تَبْدُوْا فِيْهَا صُوَرُ الْحَقَائِقِ عَلٰى مَا هِيَ عَلَيْهِ ... "کہ چیزیں جو اصل میں ہوتی ہیں وہ اس صورت پر چیزوں کو دیکھتے ہیں۔" فَلَا تَكَادُ تُخْطِئُ لَهٗ فَرَاسَتُهٗ ... "اور ان کی فراست انہیں دھوکہ نہیں دیتی۔" فَإِنَّ الْعَبْدَ اِذَا بَصَرَ بِاللّٰهِ اَبْصَرَ عَلٰى مَا هُوَ عَلَيْهِ فَاِذَا سَمِعَ بِاللّٰهِ سَمِعَهٗ عَلٰى مَا هُوَ عَلَيْهِ ... "جب بندہ اللہ کے ساتھ دیکھتا ہے تو چیز کی حقیقت کو دیکھتا ہے اور جب سنتا ہے تو اس بات کے پیچھے جو حقیقت ہوتی ہے اسے پا لیتا ہے۔" پس اس کا دل صاف آئینہ ہو جاتا ہے۔ آئینہ صافی میں اشیاء کی حقیقی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں، اس کی فراست خطا نہیں کرتی۔

اس سے کشفِ حقیقی کے علاوہ رویتِ اشکال کا مراقبہ بھی ثابت ہوا، یعنی ایک تو کشفِ حقیقی ہے انوارات کا مشاہدہ، مراقبات کا مقامات کا مشاہدہ وغیرہ۔ ایک 'مراقبہ رویتِ اشکال' بھی ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ شروع شروع میں جب ہم یہی کوئی چار پانچ ساتھی ہوا کرتے تھے، یہ مراقبہ کرایا کرتے تھے۔ بعد میں آپؒ نے روک دیا کہ لوگوں میں اہلیت و استعداد نہیں رہی۔ رویتِ اشکال کا مراقبہ اگر کروایا جائے تو کسی شہر، کسی مجلس میں لوگوں کو دیکھیں تو ان کی حقیقی روحانی شکلیں نظر آتی تھیں۔ ظاہری بدن تو انسان کا رہتا ہے لیکن اس کے کردار کی مناسبت سے اس کی روح کی شکل کسی جانور جیسی ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

شراب خور عموماً خنزیر کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ دوسروں کے نقصان کے ہمہ وقت درپے انسان روحانی طور پر سانپ کی شکل کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف برائیوں کے حامل افراد ملتی جلتی خصلتوں والے جانور کی شکل پر ہوتے تھے۔ جب حضرت یہ مراقبہ کرایا کرتے تھے، بڑے بڑے شہروں میں بھی گنتی کے چند افراد انسانی شکل پہ نظر آتے تھے۔ کچھ لوگ حلال جانوروں کی شکل میں جیسے بیل، گائے، اونٹ، بھیڑ، یا بکری کی شکل میں نظر آتے۔ آپؒ فرماتے تھے کہ جن کی شکلیں حلال جانوروں پر ہیں ان کا ایمان باقی ہے۔ ایمان بھی جاتا رہے تو پھر کوئی بھیڑیا، کوئی خنزیر، شیر، چیتا یعنی جس جانور سے کردار ملتا ہے روح کی شکل و ہیئت ویسی ہو جاتی ہے۔

تو یہاں فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے کشفِ حقیقی کے علاوہ رویتِ اشکال کا مراقبہ بھی ثابت ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جب حقیقتِ اشیاء نظر آتی ہے تو وہ بھی رویتِ اشکال ہی ہے کہ اشیاء کی طرح انسانوں کی حقیقت یعنی اصل شکلیں نظر آ گئیں۔

"مگر اس قدر ترقی کر جانے کے باوجود طالبِ صادق اور عارفِ حقیقی مزید ترقی کا طالب ہی رہتا ہے۔"

'فتح الباری' میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے صاحبِ کتاب لکھتے ہیں، "اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بندہ خواہ کتنے بلند درجات تک پہنچ جائے حتیٰ کہ محبوبِ خدا بن جائے پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ترقی کا طالب ہی رہے گا کیونکہ اس میں خشوع وخضوع اور اظہارِ عبودیت ہے اور بندے کے لیے انتہائی مقام عبودیت ہے۔"

فائدہ:

حدیثِ بخاری شریف سے یہ امور ثابت ہوئے:

1۔ فرائض رأس المال ہیں اور نوافل بمنزلہ منافع کے ہیں، یہ بات پہلے تفصیلاً زیرِ بحث آ چکی ہے۔

2۔ "جب تک قربِ فرائض نہ ہو، قربِ نوافل حاصل نہیں ہوتا کیونکہ فرائض بمنزلہ بنیاد کے ہیں" جیسا کہ پہلے بھی مثال دی گئی ہے، کسی نے پانچ سو خرچ کیا اور اسے ایک سو واپس آیا اور وہ یہ کہے کہ پانچ سو تو ضائع ہو گئے اور ایک سو میرا منافع ہے تو یہ اس کی بیوقوفی ہے۔ وہ ایک سو اس کا منافع نہیں ہے بلکہ رأس المال میں چار سو کا نقصان ہوا اور ایک سو واپس ملا۔ منافع تب ہے کہ جو پانچ سو خرچ کیا تھا وہ بھی واپس آئے اور زائد بھی ملے۔ فرماتے ہیں کہ فرائض اصل ہیں، اگر فرائض ضائع ہو جائیں تو نوافل سے کیا ہوگا؟ فرائض مکمل ہوں گے تو اس کے بعد نوافل کی باری آئے گی۔ اگر قربِ فرائض حاصل ہو تو پھر قربِ نوافل کی بات کی جا سکتی ہے۔

3۔ "قربِ الٰہی ادائے فرائض و نوافل پر موقوف ہے۔"

فرائض میں صرف یہ صلوٰۃ ہی نہیں ہے، زندگی کے سارے فرائض، فرائض میں داخل ہیں۔ طلبِ رزقِ حلال اور کسبِ رزقِ حلال بھی فرضِ عین ہے۔ حج فرض ہو گیا تو وہ بھی فرض ہے۔ رمضان شریف آ گیا روزہ فرض ہے، مال پاس ہے تو زکوٰۃ دینا بھی فرض ہے، والدین کی خدمت، اولاد کی صحیح تربیت، یہ سارے فرائض اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ ہے کوئی اس سے حیثیت یا درجے میں کم ہے لیکن فرض ہونے میں سب برابر ہیں۔ تو فرائض

Scanned with CamScanner

راس المال ہیں۔ جب تک قرب فرائض نہ ہو، قرب نوافل حاصل نہیں ہوتا کیونکہ فرائض بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ قرب الٰہی ادائے فرائض ونوافل پر موقوف ہے۔

4۔ اولیاء اللہ کے جو مناصب ملتے ہیں ان کی بنیاد قرب الٰہی ہے اور قرب الٰہی کی بنیاد قرب فرائض اور قرب نوافل پر ہے اور جو مناصب اولیاء اللہ کو ملتے ہیں قطب، غوث وغیرہ ان کی بنیاد قرب الٰہی ہے۔

5۔ لیکن "قرب الٰہی کسی منصب پر موقوف نہیں۔" یہ ضروری نہیں کہ منصب ہے تو قرب الٰہی ہوگا۔ اللہ کی مرضی اللہ کے بہت مقرب بندے ایسے بھی ہیں جن کے پاس منصب نہیں ہے لیکن انہیں بھی قرب الٰہی نصیب ہے۔

6۔ جو ولی اللہ منصب محبوبیت پر فائز ہوتا ہے وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔ جب وہ منصب محبوبیت پر جاتا ہے تو اس کے منہ سے دعائیں بھی وہی نکلتی ہیں جو اللہ کو منظور ہوتی ہیں اس لیے مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔

7۔ ساتویں بات یہ حاصل ہوئی کہ "ولی اللہ سے دشمنی اور بغض رکھنے میں سوء خاتمہ کا خطرہ ہے۔" اولیاء اللہ سے اگر کوئی عقیدت نہ رکھتا ہو اور ان سے کچھ حاصل نہ کرے تو ان سے دشمنی اور سوء ظن بھی نہ رکھے۔

8۔ "الہام صاحب الہام کے لیے حجت ہے بشرطیکہ کسی منصوص شرعی حکم کے مخالف نہ ہو۔"

کسی کو کشف یا الہام ہوتا ہے تو وہ نبی نہیں ہے، ولی ہے۔ ولی کا کشف، اس کا الہام اس کے اپنے لیے حجت ہے اور وہ بھی تب حجت ہے جب شریعت کے مخالف نہ ہو۔ اگر شریعت کے خلاف ہے تو وہ غلط ہے یا اسے سمجھنے میں غلطی لگی۔ شریعت کے مطابق ہے تو اُسے خود اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر نہیں کرے گا تو دنیا کا (دنیوی) نقصان ہو گا، گناہ یا آخرت کا عذاب نہیں ہوگا۔

نبی کا کشف والہام اور وحی ساری امت کے لیے حجت ہے جو اظہار نبیؐ پہ ہوگا اس کا اتباع پوری امت کرے گی۔

اولیاء اللہ کی پہچان

ولایت کے دو ارکان ہیں۔ جس میں یہ دونوں ارکان متحقق ہو گئے وہ ولی اللہ ہے۔

كَمَا قَالَ الرَّازِيُّ. قَدْ يَعْرِفُ كَوْنَهُ وَلِيًّا فَقِيلَ احْتَجُّوْا عَلٰى صِحَّةِ قَوْلِهِمْ بِأَنَّ الْوِلَايَةَ لَهَا رُكْنَانِ... (أَحَدُهُمَا): كَوْنُهُ فِي الظَّاهِرِ مُنْقَادًا لِلشَّرِيْعَةِ... (الثَّانِيْ): كَوْنُهُ فِي الْبَاطِنِ مُسْتَغْرَقًا فِيْ نُوْرِ الْحَقِيْقَةِ فَإِذَا حَصَلَ الْأَمْرَانِ وَ عَرَفَ الْإِنْسَانُ حُصُوْلَهُمَا عَرَفَ لَا مَحَالَةَ كَوْنَهُ وَلِيًّا... (تفسیر الکبیر، ۵:۴۷۱)

"ولی کی پہچان یہ ہے اور اپنے قول کی صحت پر انہوں نے دلیل پیش کی ہے کہ ولایت کے دو رکن ہیں ایک یہ کہ ظاہر میں شریعت کا متبع ہو، دوسرا یہ کہ اس کا باطن نور حقیقت میں مستغرق ہو۔ جب یہ دونوں باتیں پائی جائیں، انسان کو ان کے حصول کی معرفت ہو جائے تو لازماً وہ اللہ کا دوست ہوگا۔"

Scanned with CamScanner

بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ عارف باللہ، زاہد و عابد، ملہم و مکاشف تو کہا جا سکتا ہے مگر ولی اللہ کہنا مشکل ہے کیونکہ یہ معلوم ہونا مشکل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اسے دوست قرار دیا ہے یا نہیں؟

مشکوٰۃ میں اولیا کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ...

(مشکٰوۃ، باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم، ۴۱۵)

''خدا کے اچھے بندے وہ ہیں کہ جب انہیں دیکھا جائے تو خدا یاد آجائے۔''

یہ علامت کچھ اس قسم کی نہیں کہ جو چاہے جس کے متعلق چاہے کہہ دے کہ ''حضرت کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے'' اور ہر سننے والا اس پر یقین کرلے، بلکہ اس سلسلے میں حضرت مجددؒ فرماتے ہیں:

''اولیا شریعت کے ظاہر اور باطن کے موافق دعوت کرتے ہیں۔ اول مریدوں اور طالبوں کو توبہ اور انابت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، احکامِ شرعیہ کے بجالانے کی ترغیب دیتے ہیں پھر ذکر الٰہی بتاتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر وقت ذکر میں مشغول رہیں۔''

ظاہر ہے کہ ولی کو اس دعوت کے لیے جو شریعت کے ظاہر و باطن سے تعلق رکھتی ہے، خوارق کی کیا ضرورت ہے؟ پیری و مریدی اس دعوت سے مراد ہے جس کا خوارق و کرامات سے تعلق اور واسطہ نہیں۔ وہ علامت جس سے اس گروہ کا سچا اور جھوٹا جدا ہو سکے، یہ ہے کہ جو شخص شریعت پر استقامت رکھتا ہو، اس کی مجلس میں دل کو حق تعالیٰ کی طرف رغبت و توجہ پیدا ہو جائے اور ماسوا کی طرف سے دل سرد ہو جائے، وہ شخص سچا ہے۔ (مکتوبات، دفتر دوم، مکتوب نمبر ۹۲)

اولیاء اللہ کی پہچان

''ولایت کے دو ارکان ہیں جس میں یہ دونوں ارکان متحقق ہو گئے، وہ ولی اللہ ہے۔'' یعنی ولایت کے دو ارکان ہیں، دونوں رکن جس میں پائے گئے وہ ولی اللہ ہے۔ جیسے امام رازیؒ فرماتے ہیں، (ترجمہ) ''ولی کی پہچان یہ ہے اور اپنے قول کی صحت پر انہوں نے دلیل پیش کی ہے کہ ولایت کے دو رکن ہیں۔ ایک یہ کہ ظاہر میں شریعت کا متبع ہو۔ دوسرا رکن ہے کہ باطن میں نورِ حقیقت میں مستغرق ہو۔ جب یہ دونوں باتیں پائی جائیں انسان کو ان کے حصول کی معرفت ہو جائے تو لازماً وہ اللہ کا دوست ہے۔''

یعنی ولایت کے دو ارکان ہیں۔ اور یہ جو لوگ نئی ولایت لیے پھرتے ہیں کہ ''ہم پر نماز معاف ہو گئی۔'' یا ''شریعت اور شے ہے، طریقت اور شے ہے۔'' یہ سب انتہائی لغو ہے۔ شریعت اور طریقت کیا ہیں؟ شریعت ظاہری عمل کا نام ہے اور طریقت اس عمل کے اندر خلوصِ نیت کا نام ہے۔ پھر یہ دو الگ الگ ارکان کیسے ہو گئے؟ یہ تو ایک ہی چیز کے دو حصے ہیں۔ ایک ظاہر جو نظر آتا ہے، دوسرا جو باطن میں ہے جس کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے۔ احکامِ الٰہی پر ظاہری عمل شریعت ہے

اور باطنی طور پر پورے خلوص سے عمل کرنا یہ طریقت ہے۔ یہ الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟

''بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ عارف باللہ، زاہد و عابد، ملہم و مکاشف تو کہا جا سکتا ہے مگر ولی اللہ کہنا مشکل ہے کیونکہ یہ معلوم ہونا مشکل ہے کہ اللہ نے بھی اسے دوست قرار دیا ہے یا نہیں۔''

یعنی بعض لوگوں نے امام رازیؒ سے اختلاف کیا ہے کہ یہاں تک تو درست ہے کہ جو بندہ ظاہراً شریعت کا تابع ہو باطناً اسے کیفیات بھی حاصل ہوں تو اسے آپ عارف باللہ کہہ لیں، زاہد و عابد کہہ لیں، ملہم و مکاشف کہہ دیں یعنی اس پر الہام ہوتا ہے، اسے کشف ہوتا ہے، مگر ولی اللہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیونکہ یہ معلوم ہونا مشکل ہے کہ اللہ نے اسے دوست قرار دیا ہے یا نہیں۔ لیکن اس اعتراض کا جواب قرآن کریم کی اس آیت میں موجود ہے جس میں اللہ نے فرمایا:

''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... (البقرہ:۲۵۷)'' اللہ ہر مومن کا ولی ہے۔''

بندے کا ولی ہونا تو بندے کی حیثیت کے مطابق ہے۔ جب اللہ کہتا ہے ''میں اس کا ولی ہوں'' تو وہ اللہ کی شان کے مطابق ہے۔ تو جب بندے میں اتباع شریعت بھی ہو، اس کا عقیدہ بھی درست ہو اور عمل خلوص کے ساتھ کرے اور دل میں نور معرفت بھی ہو، مراقبات بھی نصیب ہوں تو پھر اس کی ولایت میں کیا شک ہے؟ اور یہ تو اللہ نے بتا دیا کہ میں بندۂ مومن کا دوست ہوں...... اب کسی کو ولی اللہ کہا جائے تو دوستی کی یہ نسبت بندے سے اللہ کی طرف ہوگی اور بندے کی حیثیت کے مطابق ہوگی۔ اللہ نے جیسا کہ قرآن میں فرمایا ہے کہ ''میں ایمان والوں کا دوست ہوں''، تو جب نسبتِ دوستی اللہ کی طرف سے ہوگی تو اُس کی دوستی اُس کی شان کے مطابق ہوگی۔ لہٰذا میرے نزدیک امام رازیؒ کا قول درست ہے اور یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

'مشکوۃ شریف' میں اولیاء اللہ کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ اِذَا رُأُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ...

''اللہ کے اچھے بندے وہ ہیں کہ جب انہیں دیکھا جائے تو اللہ یاد آ جائے۔''

اور ان کے پاس بیٹھا جائے تو اللہ کی یاد نصیب ہو۔ ان کے پاس بیٹھیں تو ایمان میں تازگی آئے۔ ان کے پاس بیٹھیں تو اللہ کے حکم کا اتباع کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ لوگ ولی اللہ ہیں۔

یہ علامت کچھ اس قسم کی نہیں کہ جو چاہے، جس کے متعلق چاہے کہہ دے کہ حضرت کو دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے اور ہر سننے والا اس پر یقین کر لے بلکہ اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں ''اولیاء شریعت کے ظاہر اور باطن کے موافق دعوت فرماتے ہیں۔ اول مریدوں اور طالبوں کی توبہ اور انابت کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔'' یعنی یہ محض کہنے کی باتیں نہیں ہیں، یہ عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر کوئی واقعی ولی اللہ ہے، اس کے پاس کوئی جائے گا تو وہ سب سے پہلی بات جو اسے سمجھائے گا وہ یہ ہوگی کہ جو غلطیاں ہو چکی ہیں ان سے توبہ کرو اور انابت پیدا کرو۔ انابت ہے اللہ کی طرف بڑھنے کی تمنا اور آرزو جو دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ جذبہ کہ مجھے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ پھر ''احکام شرعیہ بجالانے کی ترغیب دیتے ہیں، پھر ذکر الٰہی بتاتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر وقت ذکر میں مشغول رہیں۔''

Scanned with CamScanner

یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی اپنی عقیدت میں کہہ دے کہ ''جی میں جب (فلاں) حضرت کو دیکھتا ہوں تو اللہ یاد آ جاتا ہے۔'' فرمایا کہ یہ محض ایک کہنے کی بات ہے۔ حضرت مجددؒ فرماتے ہیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسے بندوں کے پاس کوئی جائے وہ اسے گناہ سے توبہ کراتے ہیں، نیکی کی تربیت دیتے ہیں، پھر ذکر کی تلقین کرتے ہیں۔

''ظاہر ہے کہ ولی کو اس دعوت کے لیے جو شریعت کے ظاہر و باطن سے تعلق رکھتی ہے، خوارق کی کیا ضرورت ہے''۔ فرماتے ہیں کہ اس میں کرامت کی کیا ضرورت ہے؟ ''پیری مریدی مطلق اس دعوت سے مراد ہے جس کا خوارق و کرامات سے تعلق اور واسطہ نہیں۔'' یعنی استادی شاگردی یا پیری مریدی میں کرامات شرط نہیں ہیں۔ شرط یہ ہے کہ مرید یا سالک سے گناہ چھوٹ جائے، اس کے دل میں اللہ کی طلب پیدا ہو جائے اور اس کا دل ذاکر ہو جائے، اسے دوام ذکر نصیب ہو جائے۔ ''اور وہ علامت جس سے اس گروہ کا سچا اور جھوٹا جدا ہو سکے، یہ ہے کہ جو شخص شریعت پر استقامت رکھتا ہو اس کی مجلس میں دل کو حق تعالیٰ کی طرف رغبت و توجہ پیدا ہو جائے اور ماسوا کی طرف سے دل سرد ہو جائے، وہ سچا ہے۔''

اب رہا یہ سوال کہ کوئی کرامت تو ہے نہیں، سچے جھوٹے کی پہچان کیا ہے؟ تو مجددؒ فرماتے ہیں کہ کرامت، معجزہ کی فرع ہوتی ہے۔ معجزہ نبیؑ کو عطا ہوتا ہے کہ نبیؑ تن تنہا دارالکفر میں مبعوث ہوتا ہے اور اس کے پاس معجزات اس کی نبوت کے اثبات کے لیے ہوتے ہیں۔ یہی معجزہ جو کہ فعل اللہ کا ہوتا ہے، جب نبیؑ کے ہاتھ سے صادر ہوتا ہے تو اس کی نبوت کا ثبوت ہو ہے کہ یہ اللہ کا نبیؑ ہے۔ معجزہ وہ ہوتا ہے کہ جو عقل کو عاجز کر دے۔ ایسا واقعہ کہ فطرت کے مروّجہ اصول اس کی توجیہہ نہ کر سکیں۔ جس کا ہونا انسانی دماغ سوچ بھی نہ سکے کہ ایسے ہو سکتا ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا، آسمان پر چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اب انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یا اسی طرح آپ ﷺ کے بے شمار معجزات ہیں۔ قرآن خود سب سے بڑا معجزہ ہے جو تا قیامت رہے گا۔ تو نبیؑ کے معجزات اس کی نبوت کے ثبوت کے لیے ہوتے ہیں جو کفار کے سامنے بطور دلیلِ نبوت پیش کیے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ خرقِ عادت یعنی عادت کے خلاف ہوتے ہیں۔ ولی سے باتباعِ نبوت کرامت کا ظہور ہوتا ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ ولی سے کرامت کا صدور بھی تب ہوتا ہے جہاں کفر و اسلام کا مقابلہ ہو اور مسلمان کے دلائل محض عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر رد کر دیئے جائیں تو کوئی ولی اللہ موجود ہو تو اس سے کرامت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کو غالب کر دیتی ہے۔ یہ سب کسی فرد کی عظمت تسلیم کروانے کے لیے نہیں ہوتا۔

اور پیری مریدی میں یہ شرط نہیں ہے کہ پیر سے کرامت کا صدور ہو۔ پیری مریدی میں شرط یہ ہے کہ مرید کے پاس جائے تو اسے گناہ سے توبہ نصیب ہو اور اس کے بعد اس کا دل روشن ہو جائے، ذاکر ہو جائے اور دوام ذکر نصیب ہو جائے۔ تو فرماتے ہیں کہ ''اگر سوال پیدا ہو کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟'' تو مجددؒ فرماتے ہیں:

''جو شریعت پر استقامت رکھتا ہو، اس کی مجلس میں دل کو حق تعالیٰ کی طرف رغبت ہو اور توجہ پیدا ہو جائے اور ماسوا کی طرف سے دل سرد ہو جائے، وہ شخص سچا ہے۔''

Scanned with CamScanner

اولیاء اللہ کی امتیازی شان

صاحب تفسیر مظہری نے "سورۂ سبا" کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا:

وَ قَدْ یَاْتِیْ عَلٰی بَعْضِ الْاَکَابِرِ حَالَۃٌ یَخْرُجُ فِیْهِ مِنْ حَیِّزِ الزَّمَانِ فَیَرَی الْمَاضِیَ وَالْمُسْتَقْبِلَ مَوْجُوْدًا عِنْدَہٗ وَ یَشْهَدُ عَلَیْهِ مَا رَوَاہُ الشَّیْخَانِ فِی الصَّحِیْحَیْنِ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنْخَسَفَ الشَّمْسُ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَصَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَ النَّاسُ فَقَامَ قِیَامًا طَوِیْلًا ... اِلٰی اَنْ قَالَ ... قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِنَّا رَاَیْنَاکَ تَنَاوَلْتَ شَیْئًا فِیْ مَقَامِكَ هٰذَا ثُمَّ رَاَیْنَاکَ تَکَعْکَعْتَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْجَنَّۃَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَ لَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَکَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا ... اِلٰی اَنْ قَالَ ... لَا یُقَالُ لَعَلَّ النَّبِیَّ ﷺ رَاٰی صُوْرَۃَ النَّارِ وَ الْجَنَّۃِ فِیْ عَالَمِ الْمِثَالِ مِثْلَ مَا یَرَی النَّائِمُ فِی الْمَنَامِ لِاَنَّ قَوْلَهٗ ﷺ لَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَکَلْتُمْ مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا صَرِیْحٌ فِیْ اَنَّهٗ ﷺ رَاٰی حَقِیْقَۃَ الْجَنَّۃِ وَ النَّارِ دُوْنَ مِثَالِهَا ... (تفسیر مظہری، ۸:۵،۶)

"بعض اکابر پر کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ قیدِ زمان سے آزاد ہو جاتے ہیں اور ماضی و مستقبل کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔ اس پر صحیحین کی یہ حدیث شاہد ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے عہد میں سورج گرہن لگا تو حضور ﷺ نے اور دوسرے لوگوں نے نمازِ خسوف پڑھی اور طویل قیام کیا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ ہم نے دیکھا کہ آپ کسی چیز کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے، پھر پیچھے ہٹے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، "میں نے جنت دیکھی، جنت کے میوے سے ایک خوشہ پکڑنا چاہا۔ اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک اسے کھاتے رہتے۔" یہاں یہ نہ کہا جائے کہ حضور ﷺ نے جنت کی مثالی صورت دیکھی، جیسے آدمی خواب میں دیکھتا ہے کیونکہ حضور کا یہ فرمانا کہ اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک اسے کھاتے رہتے، صاف ظاہر کرتا ہے کہ حضور ﷺ نے حقیقی جنت و دوزخ کا مشاہدہ کیا، صرف مثالی صورت نہیں دیکھی۔"

فوائد:

(۱) عارف قلب کی آنکھ سے ساری چیزیں دیکھتا ہے، مثلاً منازلِ سلوک، بیت المعمور، بیت العزۃ، سدرۃ المنتہیٰ، جنت، دوزخ، عرش، کرسی، لوحِ محفوظ، جنت کے ثمرات اور اس کی نہریں، ملائکہ، ارواح اور جنات وغیرہ اور ان کا دیکھنا حقیقت پر محمول ہوتا ہے۔ ان اشیاء کی مثالی صورتیں نہیں ہوتیں۔

(۲) اولیاء اللہ زمین پر ہوتے ہیں مگر ان کی روح قیدِ زمان و مکاں سے آزاد ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

اولیاء اللہ کی امتیازی شان

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیرِ مظہری میں سورۂ سبا کی تفسیر کے سلسلے میں بیان فرماتے ہیں کہ بعض اکابر پر ایسی حالت وارد ہوتی ہے کہ وہ زمانے کی قید سے بالاتر ہو جاتے ہیں اور ماضی اور مستقبل کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔ جو گزر چکا وہ بھی ان کی نظر میں ہوتا ہے، جو آنے والا ہے اس پر بھی ان کی نظر ہوتی ہے۔ اس پر دلیل شیخین کی وہ حدیث ہے صحیحین میں یعنی صحاح ستہ میں موجود ہے (صحیحین، بخاری و مسلم کو کہتے ہیں)۔ اس کے بعد انہوں نے وہ حدیث نقل کی اور اس سے وہ دلائل اخذ کرتے ہیں۔ ''بعض اکابر پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ قیدِ زمان سے آزاد ہو جاتے ہیں اور ماضی و مستقبل کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں، اس پر صحیحین کی یہ حدیث شاہد ہے۔ عبداللہ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں سورج گرہن ہوا تو حضور اکرم ﷺ نے اور دوسرے لوگوں نے نمازِ خسوف پڑھی۔ آپ ﷺ نے قیام بہت طویل کیا، بعد میں لوگوں نے دریافت کیا کہ ہم نے دیکھا کہ آپ کسی چیز کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے، پھر پیچھے ہٹے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''میں نے جنت دیکھی، جنت کے میووں سے ایک خوشہ پکڑنا چاہا، اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک اسے کھاتے رہتے۔''

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جنت کو دیکھا اور میں نے اس کے پھلوں میں سے ایک خوشہ توڑنا چاہا لیکن پھر چھوڑ دیا (کیونکہ پھر آپ پیچھے ہٹ گئے)۔ اگر میں وہ خوشہ توڑ لیتا تو جب تک دنیا قائم رہے گی، لوگ اس میں سے کھاتے رہتے۔

''یہاں یہ نہ کہا جائے کہ حضور اکرم ﷺ نے جنت کی مثالی صورت دیکھی۔''

بعض علماء نے اس حدیث کی وضاحت یوں کی کہ حضور اکرم ﷺ نے جنت کی صورتِ مثالی دیکھی۔ تو فرماتے ہیں کہ یہ نہ کہا جائے کہ جیسے انسان خواب میں دیکھتا ہے، یا مثالی صورت دیکھی کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک اس میں سے کھاتے رہتے'' صاف ظاہر کرتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حقیقی جنت کا مشاہدہ کیا۔ صورتِ مثالی نہیں تھی، یقیناً جنت حقیقی تھی تو آپ ﷺ نے پھل توڑنے کا ارادہ کیا۔ خواب میں جو چیز نظر آتی ہے، اس کا تو کوئی وجود نہیں ہوتا، یہی حال صورتِ مثالی (تصویر) کا ہے۔ تو فرمایا:

۱) ''عارف قلب کی آنکھ سے ساری چیزیں دیکھتا ہے، منازلِ سلوک مثلاً بیت المعمور، بیت العزۃ، سدرۃ المنتہیٰ، جنت و دوزخ، عرش، کرسی، لوحِ محفوظ، جنت کے ثمرات اور اس کی نہریں، ملائکہ، ارواح اور جنات وغیرہ۔ اور ان کا دیکھنا حقیقت میں ہوتا ہے۔ وہ حقیقی چیزیں دیکھتے ہیں، عکس نہیں چونکہ یہ سب نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔

۲) اولیاء اللہ زمین پر ہوتے ہیں مگر ان کی ارواح قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہوتی ہیں۔ یعنی ان کا وجود زمین پر ہوتا ہے لیکن ان کی ارواح بے پناہ منازل پہ پھر رہی ہوتی ہیں اور وہ قیدِ زمان و مکان سے آزاد ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

اولیاءاللہ سے دشمنی، اللہ سے دشمنی ہے

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ علم تابع معلوم کے ہوتا ہے۔ اگر معلوم اعلیٰ اور عظیم ہے تو علم بھی عظیم ہوگا۔ اس قاعدہ کی روشنی میں اس حقیقت پر غور کریں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ...(اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں (یعنی میری معرفت حاصل کریں)۔"

جب معرفتِ الٰہی حاصل ہوگئی تو مقصدِ تخلیق پورا ہوگیا۔ پس ایسے مقبولینِ خدا جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں ان سے دشمنی رکھنا کور باطنی کی دلیل ہے۔

وَيَكْفِيْ فِيْ عُقُوْبَةِ الْمُنْكَرِ عَلَى الْاَوْلِيَاءِ قَوْلُهُ ﷺ فِي الْحَدِيْثِ الصَّحِيْحِ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ...اَيْ اَعْلَمْتُهٗ اَنِّيْ مُحَارِبٌ لَّهٗ وَمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ لَا يُفْلِحُ اَبَدًا وَقَدْ قَالَ الْعُلَمَاءُ لَمْ يُحَارِبِ اللّٰهُ عَاصِيًا اِلَّا الْمُنْكِرَ عَلٰى اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ وَاٰكِلَ الرِّبٰوا وَكُلٌّ مِّنْهُمَا يُخْشٰى عَلَيْهِ خَشْيَةً قَرِيْبَةً جِدًّا مِّنْ سُوْءِ الْخَاتِمَةِ وَلَا يُحَارِبُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا كَافِرًا...اَقَلُّ عُقُوْبَةِ الْمُنْكِرِ عَلَى الصَّالِحِيْنَ اَنْ يُّحْرَمَ بَرَكَتَهُمْ قَالُوْا وَيُخْشٰى عَلَيْهِ سُوْءُ الْخَاتِمَةِ...وَقَالَ بَعْضُ الْعَارِفِيْنَ مَنْ رَاَيْتُمُوْهُ يُؤْذِي الْاَوْلِيَاءَ وَيُنْكِرُ مَوَاهِبَ الْاَصْفِيَاءِ فَاعْلَمُوْا اَنَّهٗ مُحَارِبٌ لِّلّٰهِ تَعَالٰى مُبْعَدٌ مَطْرُوْدٌ عَنْ حَقِيْقَةِ قُرْبِ اللّٰهِ تَعَالٰى...(فتاویٰ الحدیثیہ، ۲: ۲۸۴، ۲۸۵)

"منکرین اولیا کے لیے وہی عذاب کافی ہے جو صحیح حدیثِ قدسی میں حضور ﷺ سے مروی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے ولی سے دشمنی کی، اس سے میں اعلانِ جنگ کرتا ہوں" یعنی میں نے اسے بتادیا کہ میں اس سے جنگ کروں گا۔ جس نے خدا سے جنگ کی وہ کبھی نجات نہ پائے گا۔ اور علمائے امت نے کہا ہے کہ محاربِ خدائے تعالیٰ صرف دو ہیں: ایک منکر اولیا اور دوسرا سود خور۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق خطرہ ہے کہ ایمان ضائع کر کے مرے گا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے جنگ تو کافر ہی کرتا ہے۔ اور بہت کم عذاب منکرین اولیا کے لیے یہ ہے کہ ان کی برکت سے محروم ہیں اور سوء خاتمہ کا خوف ہے۔ بعض عارفین کا فرمان ہے کہ جب دیکھو کہ کوئی شخص ولی اللہ کو ایذا دیتا ہے اور برکاتِ اصفیاء کا منکر ہے تو سمجھ لو کہ وہ خدا سے جنگ کرنے والا ہے اور قربِ الٰہی سے دور اور مردود ہے۔"

وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عُمَرَ خَرَجَ اِلَى الْمَسْجِدِ فَوَجَدَ مُعَاذًا عِنْدَ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَبْكِيْ... اِلٰى اَنْ قَالَ...وَمَنْ عَادٰى لِاَوْلِيَاءِ اللّٰهِ فَقَدْ بَارَزَ اللّٰهَ

Scanned with CamScanner

بِالْمُحَارَبَةِ... إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْأَبْرَارَ الْأَتْقِيَاءَ الْأَخْفِيَاءَ الَّذِيْنَ إِنْ غَابُوْا لَمْ يُفْتَقَدُوْا وَإِنْ حَضَرُوْا لَمْ يُعْرَفُوْا... قُلُوْبُهُمْ مَصَابِيْحُ الدُّجٰى يَخْرُجُوْنَ مِنْ كُلِّ غَبْرَاءَ مُظْلِمَةٍ... (أَيْ مِنْ كُلِّ فِتْنَةٍ جَهَالَةٍ)

(فتاویٰ الحدیثیہ، ۲:۲۷، ۲۸؛ الترغیب والترھیب، ۳: ۴۴۳۔ ۴۴۴)

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد کی طرف گئے اور حضرت معاذؓ کو حضور ﷺ کی قبر شریف کے پاس روتے ہوئے پایا۔۔۔ تو کہا "جس نے اولیاء اللہ سے دشمنی رکھی اس نے اللہ سے مقابلہ کیا۔" اللہ تعالیٰ ایسے نیک متقی اور پوشیدہ رہنے والے لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اگر موجود نہ ہوں تو ان کی تلاش نہیں کی جاتی اور اگر موجود ہوں تو انہیں پہچانا نہیں جاتا، ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں، وہ ہر اندھیرے سے باہر نکل چکے ہیں (یعنی ہر قسم کی جہالت اور اس کے فتنوں سے محفوظ ہیں)۔"

فائدہ:

اولیاء اللہ سے دشمنی رکھنے کے دو عظیم نقصان ہیں۔ اوّل دنیا میں ان کی برکت سے محرومی، دوم سوء خاتمہ کا خطرہ۔ یہ دونوں امور حدیثِ قدسی سے ثابت ہو گئے۔

اولیاء اللہ سے دشمنی، اللہ سے دشمنی ہے

اصول یہ ہے کہ علم معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہمیں معلوم ہے کہ یہاں یہ ایک میز ہے تو علم یہ نہیں کہے گا کہ ایک میز اور کرسی ہے۔ جو چیز ہمیں معلوم ہے (ہمارا) علم وہیں تک محدود رہے گا، اور اگر معلوم عظیم اور اعلیٰ ہے تو علم بھی عظیم اور اعلیٰ ہوگا۔ اس قاعدہ کی روشنی میں اس حقیقت پر غور کریں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ... (الذاریٰت: ۵۶)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔" یعنی میری معرفت حاصل کریں۔
اب اگر اللہ کی معرفت، معرفتِ الٰہی نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ علم بھی اُتنا ہی عظیم ہوگا جتنی اُس کی ذات عظیم ہے۔
"جب معرفتِ الٰہی حاصل ہو گئی تو مقصدِ تخلیق پورا ہو گیا تو پس ایسے مقبولینِ الٰہی جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں ان سے دشمنی رکھنا ہی کورباطنی ہے۔" یعنی اللہ کے وہ بندے جو عارف باللہ ہیں وہ تو مقصودِ تخلیق ہیں، اللہ نے انسانوں کو بنایا ہی اس مقصد کے لیے ہے اور اگر کسی کو یہ منزل نصیب ہوتی ہے تو وہ غایتِ تخلیق ہے یعنی تخلیق کا مقصد ہے۔ اللہ نے جس مقصد و غرض سے لوگوں کو بنایا، اس شخص نے وہ مقصد و غرض پوری کر دی اور اپنا مقصدِ حیات پا لیا۔
'فتاویٰ الحدیثیہ' میں ہے (ترجمہ) 'منکرینِ اولیاء کے لیے یہی عذاب کافی ہے جو صحیح حدیثِ قدسی میں

Scanned with CamScanner

حضور ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے ولی سے دشمنی کی، میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں اس سے جنگ کروں گا۔ جس سے اللہ نے جنگ کی، وہ کبھی نجات نہیں پائے گا۔ اور علمائے امت نے کہا ہے کہ محاربُ اللہ تعالیٰ صرف دو ہیں، یعنی اللہ نے جن کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے، ایک منکرِ اولیاء، دوسرا سود خور (قرآن میں سود خور کے متعلق بھی ہے کہ اگر سود نہیں چھوڑے گا تو اللہ کا اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے)۔ ان ہر دو کے متعلق خطرہ ہے کہ یہ ایمان ضائع کرکے مریں گے کیونکہ اللہ سے جنگ کا فر ہی کرتا ہے، اور کم سے کم عذاب منکرینِ اولیاء کے لیے یہ ہے کہ وہ ان کی برکات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بعض عارفین کا قول ہے کہ "جب دیکھیں کہ کوئی شخص ولی اللہ کو ایذا دیتا ہے اور برکاتِ اصفیاء کا منکر ہے تو سمجھو کہ وہ اللہ سے جنگ کرنے والا ہے اور قربِ الٰہی سے دُور اور مردود ہے۔"

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی کی طرف گئے اور معاذؓ کو حضور ﷺ کی قبر شریف کے پاس روتے ہوئے پایا۔۔۔۔اور فرمایا" جس نے اولیاء اللہ سے دشمنی رکھی اس نے اللہ سے مقابلہ کیا۔ اللہ ایسے نیک، متقی اور پوشیدہ رہنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اگر موجود نہ ہوں تو ان کی تلاش نہیں کی جاتی، موجود ہوں تو انہیں پہچانا نہیں جاتا۔ ان کے دل ہدایت کے چراغ ہیں۔ وہ ہر اندھیرے سے باہر نکل چکے ہیں یعنی ہر قسم کی جہالت اور فتنوں سے محفوظ ہیں۔"

یعنی اللہ کا ولی کسی بھی قسم کی نمود و نمائش سے لوگوں کو یہ باور نہیں کراتا کہ وہ کوئی خاص ہستی ہے۔ یہ جو آج کل ریاکاروں کا وتیرہ ہے کہ ایک لمبا سا چوغہ پہن لیا، خاص قسم کی ٹوپی پہن لی، اوپر سے ایک اور برقعہ اوڑھ لیا۔ اللہ کے ولی کو دکھلاوے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ لوگ اسے عام آدمی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی زندگی ایسی ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص شمار و قطار میں نہیں ہوتا، عام سی انسانی زندگی جیتا ہے۔ اس کا دل روشن ہوتا ہے۔ اسے اس بات کی حاجت یا خواہش نہیں ہوتی کہ لوگ اسے بڑا ولی اللہ سمجھیں، اس کے لیے کوئی خاص اہتمام کریں۔ ان کا مقصود صرف ذاتِ الٰہی ہوتی ہے۔

فائدہ:

اولیاء اللہ سے دشمنی رکھنے کے دو عظیم نقصان ہیں:

اول۔ دنیا میں ان کی برکت سے محرومی

دوم۔ سوءِ خاتمہ کا خطرہ

اولیاء اللہ سے دشمنی رکھنے والا ساری زندگی خود کو ان کے وجود سے پہنچنے والی تمام برکات سے محروم رکھتا ہے اور اس سے بھی بڑا نقصان جو اس کی آخرت یعنی ہمیشہ کی زندگی کو برباد کر دیتا ہے، سوءِ خاتمہ کا خطرہ یعنی اندیشہ ہے کہ جاتے جاتے ایمان بھی ضائع نہ کر جائے۔ اور یہ دونوں امور حدیث قدسی سے ثابت ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

باب (13)

ذکرِ الٰہی

ذکرِ مطلق منصوص ہے

نصوصِ قرآنی سے ذکرِ الٰہی کا مامور بہ ہونا ثابت ہے، بیسیوں آیتیں موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم پایا جاتا ہے اور یہ حکم کثرت کی قید کے ساتھ ثابت ہے، البتہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے مطلق ہے۔ کمیت کے اعتبار سے مطلق ہونے سے مراد یہ ہے کہ ذکر کی کوئی مقدار یا حد مقرر نہیں، یعنی اتنی مقدار میں ذکر کیا جائے یا اتنا وقت ذکر کیا جائے اور کیفیت کے اعتبار سے مطلق ہونے سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص حالت کی قید نہیں یعنی انفرادی ہو یا اجتماعی، قیام ہو یا قعود یا اضطجاع۔ پس جس نوعیت کا ہو اور جس کیفیت سے ہو، سب عمومِ نص میں داخل ہے۔ لہٰذا کسی خاص حالت یا نوعیت پر اصرار کرنا یا اعتراض کرنا کہ یہ طریقہ بدعت ہے، بے جا اعتراض ہے۔ ایسا اعتراض ذکرِ الٰہی سے مانع ہونے کے مترادف ہے، ایسے شخص کے لیے وعید موجود ہے:

اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا... (الاعراف: ۴۵:۷؛ ہود: ۱۹)

اَیْ اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ السَّالِكِيْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَيِ الطَّرِيْقِ الْمُوْصِلَةِ اِلَيْهِ تَعَالٰى سُبْحَانَهٗ...وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا بِاَنْ يَّصِفُوْنَهَا بِمَا يَنْفِرُ السَّالِكُ مِنْهَا مِنَ الزَّيْغِ وَ الْمَيْلِ عَنِ الْحَقِّ كَاَهْلِ الْبِدْعَةِ وَ الرِّيَآءِ... (روح المعانی، ۱۷۸:۸)

صاحبِ 'روح المعانی' نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے کہ "جو لوگ سالکین کو اس طریق سے روکتے ہیں جو موصل الی الحق ہے اور اس میں کجی کا قصد کرتے ہیں اس طرح کہ اس طریق کو اس رنگ میں بیان کرتے ہیں کہ سالک کو اس سے نفرت پیدا ہو جائے اور وہ طریقِ حق سے ہٹ جائے جس طرح بدعتی اور ریاکار کرتے ہیں۔"

ذکرِ الٰہی کے مطلق ثابت ہونے کے بعد یہ اعتراض بھی بے جا ہوگا کہ ذکر سے مراد صرف فرض نماز، تلاوتِ قرآن، تسبیح و تہلیل اور نوافل ہی ہیں اور صوفیاء کا طریقۂ ذکر جو مروّجہ ضربات وغیرہ سے کیا جاتا ہے، اس سے خارج ہے۔ چونکہ ذکر مطلق ہے، اس لیے تمام اذکار اور اذکار کی تمام صورتیں اسی کے افراد ہوں گے۔ نماز اور نوافل، تلاوتِ قرآن، استغفار، لاالٰہ الا اللہ، اللہ موجود، یا صرف اللہ، یا درود شریف، اسی مطلق ذکر کے افراد ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

ذکرِ مطلق منصوص ہے

جس چیز کے متعلق قرآن کی آیات میں حکم موجود ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس پر نصِ قرآنی ہے یعنی قرآن میں اس کے متعلق یہ حکم آیا ہے، اور جو حکم قرآن کی آیات سے ثابت ہوا سے منصوص کہتے ہیں۔ مطلق اُسے کہتے ہیں کہ کسی چیز کا حکم دیا جائے مگر اس کے لیے کوئی خاص طریقہ یا انداز مقرر نہ کیا جائے۔ ''ذکر مطلق، منصوص ہے'' یعنی ذکرِ مطلق کا حکم قرآنی آیات میں موجود ہے۔ نصوصِ قرآنی سے ذکرِ الٰہی کا مامور بہ ہونا بھی ثابت ہے یعنی اس کا حکم دیا گیا ہے کہ ذکر کرو۔

''بیسیوں آیات موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا حکم پایا جاتا ہے۔ یہ حکم کثرت کی قید کے ساتھ ثابت ہے۔'' قرآن میں یہ حکم بھی ہے کہ ذکرِ الٰہی کثرت سے کیا جائے۔ ہاں! البتہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مطلق ہے، یعنی کس طریقے سے کیا جائے، کتنی دیر کیا جائے۔ جیسے نماز کے سلیقے مقرر ہیں، قواعد و ضوابط ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے معیّن فرما دیا کہ قیام ہے، رکوع ہے، سجود ہیں۔ پھر اوقات بھی مقرر ہیں۔ روزے کے اصول و حدود خود قرآن میں مقرر کیے گئے ہیں کہ طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک روزہ رکھو۔ اس کے برعکس ذکر کی حدود و قیود، کمیت و کیفیت مقرر نہیں۔ ہاں! کثرت کی شرط ہے یعنی کثرت سے ذکر کرنے کا حکم ہے۔ کمیت کے اعتبار سے مطلق ہونے سے مراد یہ ہے کہ ذکر کی کوئی مقدار یا حد مقرر نہیں ہے کہ کتنی مقدار میں کیا جائے، کتنی دیر تک کیا جائے۔ اور کیفیت کے اعتبار سے مطلق ہونے سے مراد ہے کہ کسی حالت کی قید نہیں، جیسے صلوٰۃ کے لیے وضو کی قید یا قبلہ رُو ہونے کی شرط ہے، اس طرح کی کوئی شرط ذکرِ الٰہی کے لیے عائد نہیں کی گئی۔ انفرادی ہو، اجتماعی ہو، کھڑے ہو کر کریں یا بیٹھ کر یا پھر لیٹ کر۔ ''پس جس نوعیت کا ہو، جس کیفیت سے ہو، سب عمومِ نص میں داخل ہے۔'' آیت کا حکم عمومی ہے (کوئی مخصوص نہیں)، اس لیے یہ سب طریقے اس میں داخل ہیں۔ لہٰذا کسی خاص حالت یا نوعیت پر اصرار کرنا یا اعتراض کرنا بدعت اور بے جا ہے۔ کسی کے طریقۂ ذکر کو غلط قرار دینا یا کسی خاص طریقۂ ذکر کو ہی صحیح قرار دینا جبکہ اللہ کی طرف سے کوئی معیّن حد یا طریقہ نہیں ہے، ''ایسا اعتراض ذکرِ الٰہی سے مانع ہونے کے مترادف ہے اور ایسے شخص کے لیے وعید موجود ہے۔'' یعنی ایسا اعتراض کرنے کا مقصد و حاصل بندوں کو اللہ کی یاد سے محروم کرنا ہی ہوسکتا ہے اور ذکر سے روکنے والوں کے لیے وعید (سزا کا وعدہ) ہے۔

قرآن کی آیت ہے: الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا... (الاعراف: ۴۵؛ ہود: ۱۹)

''جو لوگ اللہ کی راہ (پر چلنے) سے روکتے ہیں اور اس میں کجی کا قصد کرتے ہیں۔'' روح المعانی میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ وہ لوگ جو سالکین کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور ان طریقوں سے بھی روکتے ہیں جو اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا... سے مراد لی گئی ہے کہ وہ ایسے حیلے تراشتے ہیں کہ سالک گمراہی میں چلا جاتا ہے اور بھٹک کر وصول حق سے محروم ہو جاتا ہے مثلاً بدعات وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

''ذکرِ الٰہی کے مطلق ثابت ہونے کے بعد یہ اعتراض بھی بے جا ہو گا کہ ذکر سے مراد صرف فرض نماز، تلاوتِ قرآن، تسبیح و تہلیل اور نوافل ہی ہیں، اور صوفیاء کا طریقۂ ذکر جو مروّجہ ضربات وغیرہ سے کیا جاتا ہے اس سے خارج ہے۔'' یعنی بعض لوگ صرف نماز، تلاوتِ قرآن، تسبیحات و نوافل ہی کو ذکر سمجھتے ہیں۔ وہ صوفیا کے طریقۂ ذکر کو جو ضربات

Scanned with CamScanner

وغیرہ لگا کر کیا جاتا ہے سرے سے ذکرِ الٰہی مانتے ہی نہیں۔ لیکن جب ذکر مطلق ہے تو تمام اذکار اور اذکار کی صورتیں اس کے افراد ہوں گے۔ جب مطلق ذکر کا، صرف ذکر کا حکم ہے تو پھر کسی بھی صورت میں کیا جائے اس حکم میں شامل ہوگا۔ کوئی سلام کرتا ہے، نوافل پڑھتا ہے، تلاوت و استغفار کرتا ہے، لا الٰہ الا اللہ، اللہ موجود، یا پھر صرف اللہ کا وظیفہ کرتا ہے، یا درود شریف پڑھتا ہے تو یہ سب ذکرِ مطلق میں شامل ہوں گے، سب ذکر کے افراد ہوں گے۔

تلاوتِ قرآن کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے؟

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: عَلَيْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَ ذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ فَإِنَّهُ ذِكْرٌ لَكَ فِي السَّمَاءِ وَ نُوْرٌ لَكَ فِي الْأَرْضِ۔۔۔ (الترغیب والترھیب، ۳:۵۳ ۰؛ شعب الایمان، باب حفظ اللسان، فصل فی فضل السکوت عن کل ما لا یعنیہ و ترک الخوض فیہ، ۷:۲۱۰)

"حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تلاوتِ قرآن کو لازم پکڑ اور ذکرِ الٰہی کیا کر، کیونکہ اس سے آسمان میں تیرا ذکر ہوگا، زمین میں تیرے لیے نور ہوگا۔"

یہ حدیث حضور ﷺ کی وصیت ہے جو آپ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری ؓ کو فرمائی۔ اس سے ثابت ہوا کہ:

۱۔ تلاوتِ قرآن اور ذکرِ الٰہی میں عطف ہے جس سے تغایر ثابت ہوا، پس ذکر سے مراد تلاوتِ قرآن نہیں کیونکہ قرآنِ کریم کا پڑھنا لفظ تلاوت یا قرأت کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ ہاں ذاتِ قرآن پر لفظ ذکر بولا جاتا ہے مگر تلاوتِ قرآن پر نہیں۔

۲۔ قرآنِ مجید تو ہر آدمی کو یاد نہیں ہوتا اور قرآن کریم کا یاد کرنا یا پورا پڑھنا فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں اور ذکر سب مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ ماموربہ ہے۔

۳۔ ذکر مقید ہے کثرت سے، جسے قرآن مجید نے تمام حالات میں لازمی قرار دیا ہے، اور تلاوتِ قرآن ہر حالت میں اور ہر وقت ممکن نہیں جیسے نیند، کاروبار، جنب و بول و براز کی حالت میں۔

۴۔ ذکر کی غرض و غایت وصالِ مسمّٰی ہے کہ ذکرِ اسم درمیان سے اٹھ جائے اور مسمّٰی دل میں رہ جائے، مگر قرآن میں قصص، امثال، احکام، عبادات و معاملات کا ذکر ہے اور قرآن کی تلاوت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ احکام سمجھے جائیں، یہ نہیں کہ مسمّٰی ہی دل میں رہ جائے اور احکام اٹھ جائیں۔

مذکورہ بالا نمبر ۴ کے سلسلے میں یہ آیت قابلِ غور ہے:

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ۔۔۔ (أَيْ فِي قَلْبِكَ)۔۔۔ (البحر المدید فی تفسیر القرآن المجید، ۲:۴۴۶)

پس جب ذکر سے مراد ذکرِ قلبی روحی لیا گیا تو اس سے مراد قرآن نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآنی احکام کی تلاوت کا تعلق زبان سے قرأت کرنے سے ہے، خواہ نماز میں کی جائے یا نماز سے خارج۔ اور صرف قلب سے قرآن کی تلاوت کرنے سے نماز ادا نہ ہوگی۔

Scanned with CamScanner

سوال: جب آپ ذکر کو مطلق پر محمول کرتے ہیں تو یہاں ذکرِ قلبی سے کیوں مقید کرتے ہیں؟

جواب: ہم نے محض ارخائے عنان کے طور پر کہا تھا کہ لوگ ذکر کو کثرتِ نوافل اور نمازوں پر ہی محمول کرتے ہیں تو باقی اذکار کو بدعت کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ تمام اذکار عمومِ نص میں داخل ہیں۔ پھر ہم نے تخصیص بھی قرآن سے بتادی کہ اس سے مراد صرف نماز نہیں گو نماز افضل اور اعلیٰ ذکر ہے۔ پھر ذکرِ قلبی قرآن کی نص سے ثابت کیا اور یہ کہ ہر حال میں صرف ذکرِ قلبی ہی ممکن ہے۔ تلاوتِ قرآن اور نماز ممکن نہیں۔

تلاوتِ قرآن کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے؟

یعنی تلاوتِ قرآن بذاتِ خود ذکرِ الٰہی ہے۔ لیکن کیا اس کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا، ''تلاوتِ قرآن کو لازم پکڑ اور ذکرِ الٰہی کیا کر کیونکہ اس سے آسمان میں تیرا ذکر ہوگا اور زمین میں تیرے لیے نور ہوگا۔''

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تلاوت بھی ضروری ہے یعنی تلاوت بھی لازماً کرنی چاہیے کہ روزانہ تھوڑی ہو یا زیادہ لیکن قرآن کریم کو روزانہ کھولے، روزانہ پڑھے۔ کچھ لوگوں نے طریقہ بنالیا ہے کہ ایک ہی سورۃ یا آیت روزانہ پڑھے جاتے ہیں، یہ غلط طریقہ ہے۔ اگر کوئی کسی خاص سورۃ کا وظیفہ کرتا ہے تو کرتا رہے، لیکن اس کے ساتھ قرآن کو سورۃ فاتحہ سے شروع کر کے سورۃ الناس تک تسلسل سے پڑھنا ضروری ہے۔ ویسے بھی قرآن سارے کا سارا پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے ہے، دنیوی مقاصد کے لیے، وظیفے کرنے کے لیے نہیں کہ فلاں سورۃ پڑھو تو دولت ملے گی، فلاں آیت پڑھو، رشتہ طے ہو جائے گا۔ بہرحال تلاوتِ قرآن مجید لازم ہے۔ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو دن کی ابتداً قرآن سے کرتے ہیں اور رات کی ابتداً بھی قرآن سے کرتے ہیں یعنی ان کے دن کے اول و آخر میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ ایک اور غلط رسم سی بن گئی ہے کہ ''جی! میں نے اتنے سپارے پڑھ لیے'' بلکہ ہونا یوں چاہیے کہ خواہ کوئی ایک آیت ہی پڑھے لیکن اسے سمجھ لے تو شاید وہ بہت سارا پڑھنے کی نسبت اسے زیادہ نفع دے جائے کہ قرآن پڑھنے، سمجھنے اور سمجھ کر عمل کرنے کے لیے ہے۔

پھر آنحضور ﷺ کا فرمانا،

''قرآن کو لازم پکڑ اور ذکرِ الٰہی کیا کر۔''

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں ''تلاوتِ قرآن اور ذکرِ الٰہی میں عطف ('اور') ہے جس سے تغایر ثابت ہوا۔''

یعنی لفظ 'اور' درمیان میں آنے کا مطلب ہے کہ دو الگ الگ چیزیں ہیں (عطف اور معطوف گرامر کی اصطلاح ہے۔ عربی میں 'و' اور اردو میں 'اور' حرفِ عطف کہلاتے ہیں۔) اگر کلام میں کسی چیز کی نسبت دو اسموں کی طرف ہو، دونوں مقصود بالذات ہوں اور ان کے درمیان حرفِ عطف (و) ہو تو پہلے آنے والے اسم کو معطوف الیہ اور دوسرے کو معطوف کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ دونوں کا الگ الگ ذکر آیا ہے لہٰذا یہ (ذکرِ الٰہی کی) دو الگ الگ صورتیں ہیں۔ ذکر سے مراد تلاوتِ قرآن نہیں کیونکہ قرآن کریم پڑھنا، لفظ تلاوت یا قرأت کے ساتھ بولا جاتا ہے ''ہاں اذاتِ قرآن پر لفظ ذکر بولا جاتا ہے مگر تلاوتِ قرآن پر نہیں۔'' یعنی قرآن کریم کو اللہ نے ذکر کہا ہے لیکن قرآن پڑھنے کو ذکر نہیں کہا۔ ''قرآنِ مجید تو ہر آدمی کو سارا یاد نہیں ہوتا، قرآنِ کریم کا یاد کرنا، یا پورا پڑھنا فرضِ کفایہ ہے، فرضِ عین نہیں ہے'' یعنی قرآن کریم کو پورا پڑھنا یا حفظ کرنا فرضِ کفایہ ہے یعنی بستی یا آبادی میں صرف ایک بندہ بھی کرلے یا چند لوگ کرلیں تو باقی سب کی طرف سے حق ادا ہو گیا۔ ''اور ذکر سب مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ مامور بہ ہے۔'' اور ذکر فرضِ عین ہے تمام مسلمان مرد اور عورتوں پر فرض ہے کیونکہ قرآن کی آیات میں اس کا حکم آیا ہے۔ اس کا کوئی خاص طریقہ، خاص اوقات، کوئی مقدار معین نہیں لیکن مطلقاً ذکرِ الٰہی کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے۔ قرآن کی آیت سے جو حکم ثابت ہوتا ہے، فرضِ عین ہوتا ہے۔ ''ذکر مقید ہے کثرت سے، جسے قرآن مجید نے تمام حالات میں لازمی قرار دیا ہے۔'' ذکر کے ساتھ دو قاعدے قرآنِ کریم میں بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ذکر کثرت سے کیا جائے۔ اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا... (الاحزاب: ۴۱) دوسرا قاعدہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں کیا جائے، قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ... (النساء: ۱۰۳)۔ اور تلاوتِ قرآن تو ہر حالت میں ممکن نہیں جیسے نیند، کاروبار، جنب، بول و براز۔ تلاوتِ قرآن کے اپنے ضابطے اور آداب ہیں اس لیے بہت سی ایسی حالتیں یا جگہیں ہیں جہاں تلاوتِ قرآن ممنوع ہے۔ کوئی غسل خانے میں ہو، کاروبار میں مشغول ہو، نہار ہا ہو یا سو جائے تو تلاوتِ قرآن ممکن نہیں مگر ذکر تو ہر حال میں کثرت سے کرنا ضروری ہے۔

''اور ذکر کی غرض و غایت وصالِ مسمّیٰ ہے۔'' ذکر کا جو حاصل اور نتیجہ ہے یعنی جس مقصد کے لیے ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جس ہستی کے نام کا ہم ذکر کرتے ہیں اس کا وصال نصیب ہو، یعنی اسمِ ذات کا ذکر کرتے کرتے ذکرِ اسم درمیان سے اٹھ جائے اور مسمّیٰ دل میں رہ جائے۔ یعنی اگر کوئی ساری عمر ذکر کرتا رہے تو حاصل صرف ذکر نہیں ہوگا بلکہ حاصل وہ ہوگا جس کے نام کا ذکر کرتا رہا۔ اللہ کے نام کا ذکر کرتا ہے تو تجلیاتِ باری دل میں جاگزیں ہو جائیں۔ جبکہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے، اس میں صرف اللہ کی عظمت کا ہی ذکر نہیں بلکہ قصص و امثال یعنی گذشتہ امتوں کے قصے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اوامر و نواہی ہیں، احکام ہیں، عبادات و فرائض، معاملات کا ذکر ہے، لین دین، صلح و جنگ، خاندانی معاملات، نکاح، طلاق وغیرہ قرآن حکیم کی تلاوت سے مقصد ہوتا ہے کہ احکام سمجھے جائیں، ارشاداتِ باری کو سمجھا جائے تا کہ اُن پر عمل کیا جا سکے جبکہ ذکر کا مقصد ہے کہ (بالآخر) ذکر درمیان سے اٹھ جائے اور مذکور دل میں رہ جائے۔

اس سلسلے میں یہ آیت قابلِ غور ہے، وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ... (الاعراف: ۲۰۵)۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جہاں وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ... ہے صاحب 'روح المعانی' نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے، اَیْ فِیْ قَلْبِكَ... یعنی نفس سے مراد ہے کہ قلب میں ذکر کرو۔ جب ذکر کو قلب کے ساتھ روحی طور پر منسلک کیا گیا تو اس سے قرآن مراد نہ ہوگا

چونکہ قرآن کی تلاوت جب تک زبان سے الفاظ ادا نہ ہوں، نہیں ہوتی۔ اگر نماز میں دل ہی دل میں قرآن پڑھا جائے تو نماز ادا نہیں ہوگی کیونکہ تلاوت کا مطلب ہے الفاظ کا زبان سے نکلنا۔ جبکہ ذکر تو جیسا کہ صاحب 'روح المعانی' کہتے ہیں کہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ... سے مراد ہے کہ اپنے دل میں، قلب میں یاد کر، تو پھر ذکر تلاوت سے الگ چیز ہوئی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جب آپ ذکر کو مطلق پر محمول کرتے ہیں یعنی مطلق ذکر فرض ہے تو پھر یہاں ذکر کو ذکرِ قلبی سے مقید کیوں کیا جاتا ہے؟" جب مطلق ذکر کا حکم ہے تو پھر کوئی ذکر بھی ہو، یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد صرف ذکرِ قلبی ہی ہے؟ فرمایا، "ہم نے محض ارخائے عنان کے طور پر کہا تھا" کیونکہ اب اکثریت کی رائے یہی ہوتی جا رہی ہے کہ کثرتِ نوافل، نماز، تلاوت و تسبیحات ہی ذکر ہے اور باقی اذکار کو بدعت خیال کرتے ہیں۔ فرمایا کہ اس لیے ہم نے ثابت کیا ہے کہ ذکر سے مراد ذکرِ قلبی ہے۔ ہم مطلق ذکر کو ذکرِ قلبی کے ساتھ مقید نہیں کرتے۔" حالانکہ تمام اذکار عمومِ نص میں داخل ہیں" ہر طرح کا ذکر آیتِ قرآنی کے حکم میں داخل ہے۔ اگر کوئی شخص شریعت کے مطابق کام کرتا ہے تو وہ کام بھی ذکرِ الٰہی (ذکرِ فعلی) ہے کیونکہ اس میں اللہ کی یاد موجود ہے کیونکہ اس نے وہ کام یہ سوچ کر کیا کہ اللہ کا حکم ہے، یہ عملی ذکر ہے یعنی جتنا کام ہم دن بھر کرتے ہیں وہ یا تو ذکر ہے یا پھر غفلت ہے۔ اگر اس کام کے پیچھے اللہ کی یاد کارفرما ہے، اللہ کے حکم کی تابعداری اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی پاسداری کا احساس ہے تو وہ عملی ذکر ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی کام دین کے خلاف کیا جاتا ہے تو وہ غفلت ہے۔

عبادات میں وہ فرائض ہوں یا نوافل، تلاوت ہو یا تسبیحات، یہ سب بجائے خود اللہ کا ذکر ہیں، لیکن یہ سارا ذکر ذکرِ لسانی ہے۔ اور جب قرآن میں ذکرِ کثیر کا حکم دیا جاتا ہے تو فرماتے ہیں کہ یہ ذکرِ قلبی ہے کیونکہ زبان سے آپ ذکرِ کثیر کر ہی نہیں سکتے۔ زبان کو سارا دن کاروبار میں استعمال کرنا ہے، بات چیت کرنی ہے تو زبان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ جتنی باتیں کرتی ہے اس سے زیادہ ذکر کرے۔" حالانکہ سارے ذکر عمومِ نص میں داخل ہیں، پھر بھی ہم نے قرآن کی رُو سے تخصیص جاری کہ ذکر سے مراد صرف نماز ہی نہیں ہے، گو نماز افضل اور اعلیٰ ذکر ہے۔" تلاوتِ قرآن بھی ایک افضل ذکر ہے لیکن ذکرِ قلبی کی تخصیص خود قرآن و حدیث سے ثابت کر دی گئی ہے۔ اور یہ کہ ہر حال میں صرف اور صرف ذکرِ قلبی ہی ممکن ہے، تلاوت و نماز ممکن نہیں۔

اس کے حکم کی تعمیل نماز میں اس لیے ممکن نہیں کہ نماز ایک حد تک پڑھی جا سکتی ہے۔ کثیر کے حکم میں تو تب ہی آئے کہ جب کیے جانے والے ہر کام سے زیادہ ہوگی۔ اسی طرح تمام زبانی اذکار کی مقدار اور حد ہوتی ہے۔ یہی حال عملی ذکر کا ہے۔ قلب ذاکر ہو جائے تو وہ ذکرِ کثیر کا حق ادا کرتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ نہ کوئی وقت کی قید ہے نہ حالت کی مجبوری۔ آدمی بے ہوش ہو جائے قلب چل رہا ہے، آدمی سو جائے قلب چل رہا ہے۔ مخصوص جگہوں (غسل خانہ) میں جائیں تو زبان پہ درود شریف لائیں گے نہ کلمہ۔ زبان تو رک گئی لیکن دل کی دھڑکن تو نہیں رکے گی۔ دل تو چل رہا ہے اور 'اللہ اللہ' کر رہا ہے۔

نماز کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے؟

نصوصِ قرآنی سے نہایت وضاحت سے ثابت ہے کہ فرائض اور نوافل کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے
کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

(۱) فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا... (الجمعہ:۱۰)

"پس جب نماز پوری ہو چکے تو تم زمین میں چلو پھرو اور خدا سے روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو"

(۲) رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ... (النور:۳۷)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تجارت بیع وشریٰ اللہ کی یاد اور نماز سے غافل نہیں کرتی۔"

(۳) فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا... (النساء:۱۰۳)

"پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کی یاد میں لگ جاؤ، کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی اور جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قاعدے کے موافق پڑھنے لگو، یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔"

پہلی آیت سے یہ ثابت ہے کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کاروبارِ دنیا میں مشغول ہو جاؤ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کاروبار نماز سے جدا شے ہے۔ دوسری آیت میں ذکرِ الٰہی کے بعد نماز کا ذکر ہوا اور ان دونوں کو عطف اور معطوف کی صورت میں پیش کیا گیا۔ تیسری آیت میں اوّل اور آخر نماز کا بیان ہے، درمیان میں ذکرِ الٰہی کا بیان ہوا اور ہر حالت میں ذکر کرنے کا حکم ہوا ہے جو نماز سے الگ ہے، اور نماز اوقات سے مقید ہے۔ اور ذکرِ الٰہی کے ساتھ کثرت کی قید منافیٔ اوقات ہے کیونکہ اوقات کی ایک حد متعین ہے۔ پس نماز کے علاوہ بھی ذکرِ الٰہی کی صورتیں ثابت ہو گئیں۔

نماز کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے؟

قرآنی نصوص (وہ آیات جن میں کسی بات کا براہِ راست حکم دیا گیا ہو) اور بہت سی دیگر آیات سے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے کہ فرائض اور نوافل کے علاوہ بھی ذکر کی کوئی صورت ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ... الخ (الجمعہ:۱۰) سورۂ جمعہ میں ہے کہ جب صلوٰۃ (جمعہ) پوری ہو جائے۔
فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ... تو روئے زمین پر پھیل جاؤ۔ جب صلوٰۃ مکمل ہو گئی، جمعہ مکمل ہو گیا تو
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ... جاؤ اپنی روزی تلاش کرو، کاروبار کرو۔
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا... اور (اس کے ساتھ ساتھ) اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔

Scanned with CamScanner

اعلیٰ حضرت" فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ تو مکمل ہو گئی اور ذکرِ الٰہی کا حکم اس کے علاوہ ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ... (النور: ۳۷) اس آیۂ کریمہ میں ارشاد ہے کہ "وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں کاروبار یا تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے سے نہیں روکتی"

یہاں نماز کا ذکر الگ اور ذکر کی بات الگ سے کی گئی ہے۔ ان دونوں کو عطف اور معطوف کی صورت پیش کیا ہے۔ گرامر کی رو سے جب دو چیزوں یا لوگوں کی اپنی اپنی الگ حیثیت ہو اور وہ دونوں (دو سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں) مقصود بالذات ہوں تو ان کو حرف عطف درمیان میں لگا کر لکھا جاتا ہے جو ان کی الگ الگ حیثیت سے ظاہر کرتا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا... (النساء: ۱۰۳)

"پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کی یاد میں لگ جاؤ، کھڑے ہو (تب بھی)، بیٹھے ہو (تب بھی) اور لیٹے ہو (تو بھی)۔ اور جب مطمئن ہو جاؤ (زمانہ امن آجائے) تو نماز قاعدے کے مطابق پڑھنے لگو۔ یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔"

صلوٰۃ الخوف یعنی میدانِ جنگ میں پڑھی جانے والی نماز کے بارے میں حکم ہے۔ کفر سے ہمہ وقت مقابلہ اور جان کا خوف آسان کام نہیں لیکن اس کے لیے ایک نسخہ ہے کہ نماز تو ادا ہو گئی مگر اللہ کا ذکر نہیں، اللہ کا ذکر اس شدت سے کرو کہ کوئی حال اس کے نام کے بغیر نہ ہو۔ یہاں جو لوگ نماز کو ذکر کا بدل قرار دیتے ہیں، سوچیں ذرا کہ یک وقت نماز بلکہ صلوٰۃ الخوف کا بیان ہو رہا ہے پھر بھی حکم ہے کہ نماز ختم ہو گئی، ذکرِ الٰہی ختم نہیں ہوا۔ لڑائی ہو رہی ہے، زخمی ہو، روح پرواز کے لیے پر تول رہی ہے مگر ذکرِ الٰہی جاری رہے کسی حال میں نہ رکے۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ نماز ذکر ہے مگر صرف نماز ہی ذکر نہیں ہے۔ نماز اپنے وقت پر فرض ہے لیکن نماز کے علاوہ بھی ذکر کا حکم ہے۔ نمازِ جمعہ کے حکم کے بعد حکم ہے کہ کاروبارِ دنیا کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کاروبار نماز سے جدا شے ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ... الخ، میں ذکرِ الٰہی کے بعد نماز کا ذکر ہوا (کیونکہ دونوں ہی مقصود بالذات ہیں)۔ ان دونوں کو عطف اور معطوف کی صورت میں پیش کیا گیا۔ سورۃ النساء کی جس آیت میں صلوٰۃ الخوف کا حکم ہے اس میں بھی اول آخر نماز کا بیان ہے، درمیان میں ذکرِ الٰہی، اور ہر وقت اور حالت میں ذکر کرنے کا حکم ہوا جو نماز کے علاوہ اور نماز سے الگ ہے۔ نماز کو اوقات سے مقید کیا گیا ہے جبکہ ذکرِ الٰہی کے ساتھ کثرت کی قید ہے، وقت کی قید نہیں۔ ذکر اوقات کی قید سے مبرا ہے کیونکہ اوقات کی ایک حد متعین ہے اور ذکر کی کوئی حد و حساب نہیں بلکہ یہ ہمہ وقت کا کام ہے۔

پس نماز کے علاوہ بھی ذکرِ الٰہی کی صورتیں ثابت ہو گئیں۔ ان آیاتِ کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز بھی ذکرِ الٰہی ہے لیکن جس ذکر کا حکم کثرت (کی شرط یا قید) سے دیا جا رہا ہے وہ نماز کے علاوہ کوئی اور ذکر ہے۔

Scanned with CamScanner

ذکرِ کثیر مامور بہ ہے

قرآن مجید میں جہاں ذکر الٰہی کا حکم دیا گیا ہے، اکثر مقامات پر اس کے ساتھ کثیر کی صفت موجود ہے۔ مثلاً:

(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا... (الاحزاب:۴۱)

(۲) وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا... (الاحزاب:۳۵)

(۳) لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا... (الاحزاب:۲۱)

(۴) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ... (الانفال:۴۵)

(۱) اے اہل ایمان تم اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

(۲) اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد۔ وَالذّٰكِرٰتِ اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں۔

(۳) (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمدہ نمونہ اس شخص کے لیے) جو اللہ اور روزِ آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو۔

(۴) اے اہلِ ایمان جب تم کو کسی جماعت سے مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

ابن کثیر نے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا... کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا... اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَمْ یَفْرِضْ عَلٰی عِبَادِهٖ فَرِیْضَةً اِلَّا جَعَلَ لَهَا حَدًّا مَّعْلُوْمًا ثُمَّ عَذَّرَ اَهْلَهَا فِیْ حَالِ الْعُذْرِ غَیْرَ الذِّكْرِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَمْ یَجْعَلْ لَهٗ حَدًّا یَّنْتَهِیْ اِلَیْهِ وَلَمْ یَعْذِرْ اَحَدًا فِیْ تَرْكِهٖ اِلَّا مَغْلُوْبًا عَلٰی تَرْكِهٖ فَقَالَ (اُذْكُرُوا اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِكُمْ) بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَفِی السَّفَرِ وَالْحَضَرِ وَالْغِنٰی وَالْفَقْرِ وَالسَّقْمِ وَالصِّحَّةِ وَالسِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ وَعَلٰی كُلِّ حَالٍ... (تفسیر ابن کثیر، ۳:۴۹۵)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس مذکورہ آیت کی تفسیر فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کوئی ایسی عبادت فرض نہیں فرمائی جس کی حد مقرر نہ ہو اور اس میں ایک معذور آدمی کا عذر قبول نہ فرمایا ہو، مگر ذکر الٰہی ایسی عبادت ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی اور نہ کسی کو ترکِ ذکر پر معذور فرمایا۔ ہاں! جو مغلوب الحال ہو اس کا معاملہ جدا ہے۔ اور فرمایا (اللہ کا ذکر کرو، کھڑے ہو، بیٹھے ہو یا لیٹے ہو) رات ہو یا دن، خشکی پر ہو یا سمندر میں، اور سفر میں ہو یا حضر میں، خوشحال ہو یا عسیر الحال، تندرست ہو یا بیمار، دل سے ہو یا زبان سے، ہر حال میں ذکر کرو (اکل وشرب، جنب وطہر، بیع وشریٰ، خواب وبیداری میں)۔"

Scanned with CamScanner

ذکرِ کثیر مامور بہ ہے

قرآن مجید میں ذکرِ الٰہی کے حکم کے ساتھ اکثر مقامات پر کثیر کی شرط بھی آئی ہے۔ مثلاً سورۂ احزاب میں یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا... "اے ایمان والو اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔"

سورۂ احزاب ہی میں ہے وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا... اور "جو لوگ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں"

لِمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا... (نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے وہی شخص مستفید ہو سکتا ہے) جو اللہ سے ملنے کی اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔

سورۂ انفال میں ہے

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا وَ اذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ...

(انفال:۴۵) اے ایمان والو! اگر تم میدانِ جنگ میں کسی (دشمن) گروہ سے مقابلہ کرو تو فَاثْبُتُوْا... جم کر لڑو، وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا... (دورانِ جنگ) اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ... تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

تو ذکرِ کثیر کا حکم ہر وقت، ہر حالت کے لیے ہے، یہاں تک کہ میدانِ جنگ میں بھی کہیں حکم ہے کہ اے اہلِ ایمان! اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ کہیں سیرتِ طیبہ رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کی شرط ذکرِ کثیر ٹھہرائی گئی ہے اور کہیں مقصد میں کامیابی کا نسخہ ذکرِ کثیر بتایا گیا ہے۔

ابنِ کثیر نے وَاذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا... کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے (ترجمہ) حضرت ابنِ عباسؓ نے اس مذکورہ آیت کی تفسیر فرمائی کہ "اللہ نے اپنے بندوں پر کوئی ایسی عبادت فرض نہیں کی جس کی حد مقرر نہ ہو (یعنی ہر عبادت، نماز، روزہ، حج سب کی حدود و قیود، اوقات، تعداد مقرر ہے)۔" "اور اس میں ایک معذور آدمی کا عذر قبول نہ فرمایا ہو۔" یعنی تمام عبادات میں معذور کا عذر بھی قبول کیا ہے جیسے احرام کھولنے کے لیے سر منڈانا پڑتا ہے لیکن رعایت ہے کہ اگر کسی کے سر میں ایسی بیماری ہو تو وہ قربانی دے دے، بے شک سر نہ منڈائے۔ اسی طرح نماز میں قیام فرض ہے مگر کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا تو اس کا عذر قابلِ قبول ٹھہرا، وہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ روزہ قضا کرنے کی بھی اجازت اسی طرح ہے وغیرہ وغیرہ۔ گویا اللہ نے ہر عبادت کی حدود و قیود مقرر کر دی ہیں اور بصورتِ مجبوری عذر بھی قبول فرمایا ہے لیکن سوائے ذکر کے۔ "مگر ذکرِ الٰہی ایسی عبادت ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی اور نہ کسی کو ترکِ ذکر پر معذور فرمایا، ہاں جو مغلوب الحال ہو"۔ یعنی جب تک کسی کا دماغ اور عقل سلامت ہے ذکر سے اس کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں، وہ کسی بھی حال میں ہے ذکر بہر طور کرے، اِلّا یہ کہ وہ شریعت کا مکلف ہی نہ رہے، فاتر العقل ہو جائے۔ ورنہ کوئی حالت بیماری کی ہو، سفر ہو یا کہیں قیام ہو، خشکی پر ہو یا سمندر میں ہو، خوشحال ہو یا تنگدست، کھا رہا ہے یا پی رہا ہے، پاک ہے یا کسی طرح کی ناپاکی کی حالت میں ہے، کاروبار میں مصروف ہے حتیٰ کہ اگر سو بھی رہا ہے تو بھی قلب کو زندگی میں ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنا ہے۔

Scanned with CamScanner

ذکر کی مختلف صورتیں

ذکرِ الٰہی کی تین صورتیں ہیں: اول لسانی جہری بلند آوازی، دوم ذکرِ لسانی سرّی، سوم ذکرِ قلبی روحانی۔ قسمِ اول باتفاقِ علماء بدعت ہے۔ ہاں! ضرورت کے مقامات خارج ہیں جیسے اذان، تکبیر، خطبہ وغیرہ۔

اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى اَنَّ الذِّكْرَ سِرًّا هُوَالْاَفْضَلُ وَ الْجَهْرَ بِدْعَةٌ اِلَّا فِيْ مَوَاضِعِ الْمَخْصُوْصَةِ مَسَّتِ الْحَاجَةُ فِيْهَا... (تفسیر ابن کثیر، ۳:۴۹۵)

ذکر کی مختلف صورتیں

ذکر کی تین صورتیں ہیں۔ اول لسانی جہری، ایسا زبانی ذکر جو آواز سے کیا جائے۔ اس کی حد مقرر ہے۔ اس کی آواز اتنی نہ ہو کہ پاس بیٹھے ہوئے شخص تک جائے اور اس کی عبادت میں خلل ڈالے۔ بلند آواز سے ذکر باتفاق علماء بدعت ہے۔ ہاں! ضرورت کے مقامات خارج ہیں جیسے اذان، تکبیر، خطبہ وغیرہ۔ دوسری قسم ذکرِ لسانی سرّی (زیرِ لب تسبیحات کرنا) جائز و پسندیدہ ہے، لیکن سب سے افضل تیسری قسم کا ذکر ذکرِ قلبی ہے اور اس پر تمام علمائے امت متفق ہیں یعنی اجماعِ امت ہے کہ ذکرِ سرّی (پوشیدہ ذکر) افضل ہے۔

ذکرِ قلبی افضل ہے

اَلثَّالِثُ الذِّكْرُ الْخَفِيُّ بِالْقَلْبِ وَ الرُّوْحِ وَ النَّفْسِ وَ غَيْرِهَا الَّذِيْ لَا مَدْخَلَ فِيْهِ لِلِّسَانِ وَ هُوَ الذِّكْرُ الْخَفِيُّ الَّذِيْ لَا يَسْمَعُهُ الْحَفَظَةُ اَخْرَجَ اَبُوْ يَعْلٰى عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَفَضْلُ الذِّكْرِ الْخَفِيِّ الَّذِيْ لَا يَسْمَعُهُ الْحَفَظَةُ سَبْعُوْنَ ضِعْفًا اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَجَمَعَ اللهُ الْخَلْقَ لِحِسَابِهِمْ وَ جَآئَتِ الْحَفَظَةُ بِمَا حَفِظُوْا وَ كَتَبُوْا قَالَ لَهُمْ اُنْظُرُوْا هَلْ بَقِيَ لَهٗ مِنْ شَيْءٍ فَيَقُوْلُوْنَ مَا تَرَكْنَا شَيْئًا مِّمَّا عَلِمْنَاهُ وَ حَفِظْنَاهُ اِلَّا وَ قَدْ اَحْصَيْنٰهُ وَ كَتَبْنَاهُ فَيَقُوْلُ تَعَالٰى: اِنَّ لَهٗ حَسَنَةً لَا تَعْلَمُهٗ وَ اُخْبِرُكَ بِهٖ هُوَ الذِّكْرُ الْخَفِيُّ. قُلْتُ وَ هٰذَا الذِّكْرُ هُوَ الَّذِيْ لَا انْقِطَاعَ لَهَا وَ لَا فُتُوْرَ لَهَا... (تفسیر مظہری، ۳:۴۱۰)

"سوم، قلب اور روح کے ساتھ ذکرِ خفی ہے۔ یہ وہ ذکر ہے جس میں زبان کو کوئی دخل نہیں اور جسے کاتبین بھی نہیں سن سکتے۔ امام ابو یعلی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "جس ذکرِ خفی کو ملائکہ کاتبین سن نہیں سکتے اسے غیر ذکرِ خفی پر ستر گنا زیادہ فضیلت ہے۔"

Scanned with CamScanner

قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو حساب کے لیے جمع کرے گا اور کاتبین اپنی تحریریں پیش کریں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو اس کی کوئی نیکی رہ تو نہیں گئی؟ وہ عرض کریں گے ہمیں جو معلوم ہوا سب لکھ لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس کی ایک نیکی ایسی ہے جو تم نہیں جانتے، وہ ذکرِ خفی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذکرِ خفی نہ منقطع ہوتا ہے، نہ اس میں فتور آتا ہے۔"

ذکرِ قلبی افضل ہے

فرمایا کہ تیسری قسم کا ذکر قلب اور روح کے ساتھ ذکرِ خفی ہے۔ پہلی قسم کا ذکر ذکرِ جہر ہے جسے علماء نے بدعت کہا ہے جس میں شور شرابا ہے۔ دوسری قسم کا ذکر لسانی سرّی ہے۔ زبان سے تسبیح پڑھی جا رہی ہے، یا 'اللہ اللہ' ہو رہا ہے لیکن آواز نہیں آرہی، دوسرے پریشان نہیں ہو رہے، یہ جائز ہے۔ ذکر کی تیسری قسم ذکرِ قلبی یا خفی ہے یعنی قلب اور روح کے ساتھ ذکر کرنا۔ یہ وہ ذکر ہے جس میں زبان کو کوئی دخل نہیں۔ زبان خاموش ہوتی ہے اور تالو سے لگی ہوتی ہے، حرکت تک نہیں کرتی۔ "اور جسے کراماً کاتبین نہیں سن سکتے۔" یعنی کراماً کاتبین اس سے لاعلم رہتے ہیں کیونکہ وہ اسے نہیں سن سکتے۔ چونکہ یہ ان کی ذمہ داری ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ... (قٓ:١٨) زبان سے نکلا ہر حرف انہوں نے لکھنا ہے، وہ اچھا ہے یا برا۔ ذکر ہے تو اللہ کی تعریف ہے، لیکن اگر زبان ہی خاموش رہے تو اسے لکھنا ان کی ذمہ داری نہیں۔ امام ابو یعلیٰؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس ذکرِ خفی کو کراماً کاتبین نہیں سن سکتے اسے غیرِ ذکرِ خفی پر ستر گنا فضیلت حاصل ہے۔ ستر گنا عربی میں محاورۃً استعمال ہوتا ہے۔ جب کسی چیز کو بہت بڑھا کر بتانا مقصود ہو تو اسے ستر گنا کہتے ہیں۔

قیامت کے دن حساب ہوگا تو کراماً کاتبین اپنی تحریریں پیش کریں گے۔ اللہ کسی شخص کے بارے میں سوال کرے گا کہ اس کی کوئی نیکی رہ تو نہیں گئی؟ وہ عرض کریں گے کہ جو ہمیں معلوم ہوا سب لکھ لیا، پھر اللہ فرمائے گا کہ اس کی ایک نیکی ایسی ہے جو تم نہیں جانتے اور وہ ذکرِ خفی ہے۔ (امام ابو یعلیٰؒ فرماتے ہیں) "میں کہتا ہوں کہ ذکرِ خفی نہ منقطع ہوتا ہے، نہ اس میں فتور آتا ہے۔" یعنی ذکرِ خفی ایسی نعمت ہے کہ جب قلب ذاکر ہو جاتا ہے تو پھر بے ہوشی اسے روک سکتی ہے نہ نیند، حتیٰ کہ بندہ مر جائے، جسم مٹی ہو جائے، تب بھی لطیفۂ قلب ذکر کرتا ہی رہتا ہے، اس کی قبر کے ذرات سے بھی ذکرِ الٰہی جاری رہتا ہے۔

ذکرِ خفی کی فضیلت قرآن میں

قَالَ اللّٰهُ تعالیٰ: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا... (مریم:٢)،

وَفِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ ذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَبْدَهٗ صَالِحًا وَّرَضِيَ عَنْهُ... (تفسیر مظہری، ٦:٨٢)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نیک بندے کو یاد فرمایا اور اس کے اس فعل یعنی مخفی یاد کرنے کو پسند فرمایا:

وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً... الخ (الاعراف:٢٠٥)

Scanned with CamScanner

اسی آیت کی تفسیر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تبلیغ وحی کا حکم دینے کے متصل ہی اس آیت میں حکم دیا:

بِاَنْ یَّذْکُرَ رَبَّهٗ فِیْ نَفْسِهٖ وَالْفَائِدَةُ فِیْهِ: اَنَّ انْتِفَاعَ الْاِنْسَانِ بِالذِّکْرِ اِنَّمَا یَکْمُلُ اِذَا وَقَعَ الذِّکْرُ بِهٰذِهِ الصِّفَةِ لِاَنَّهٗ بِهٰذَا الشَّرْطِ اَقْرَبُ اِلَی الْاِخْلَاصِ وَالتَّضَرُّعِ...

(تفسیر الکبیر، ۴: ۳۴۳)

"آپ ﷺ اپنے پروردگار کو دل میں یاد کریں، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی ذکر سے مکمل طور پر مستفید اس صورت میں ہو سکتا ہے جب ذکر میں یہ صفت پیدا ہو جائے کیونکہ اس شرط (یعنی ذکرِ قلبی) سے ذکر کرنا اخلاص اور تضرع سے زیادہ قریب ہے۔"

فائدہ:

ذکرِ خفی مبتدی کو ریا وسمعہ سے محفوظ رکھتا ہے اور منتہی کے لیے ماسوائے اللہ کی محبت سے۔ اِنْقِطَاعِ کُلّ اور فَنَا فِی الْمَذْکُوْر... کا فائدہ دیتا ہے، جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ عَرَفَ اللهَ کَلَّ لِسَانُهٗ...(مرقاة المفاتیح، شرح مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، ۱:۱۰۷)

اور تفسیر ابی السعود میں ہے کہ:

وَهُوَ عَامٌّ فِی الْاَذْکَارِ کَافَّةً فَاِنَّ الْاِخْفَاءَ اَدْخَلُ فِی الْاِخْلَاصِ وَاَقْرَبُ مِنَ الْاِجَابَةِ...

(تفسیر ابی السعود حاشیہ تفسیر الکبیر، ۴: ۵۶۳)

"اخفاء تمام اذکار کے لیے عام ہے، کیونکہ اخفاء (ذکرِ خفی) میں اخلاص کا عنصر سب سے زیادہ ہے اور قبولیت کے اعتبار سے اقرب ہے۔"

فائدہ:

(۱) عبادت کی قبولیت کا انحصار اخلاص پر ہے اور ذکرِ خفی میں سب سے زیادہ اخلاص پایا جاتا ہے۔

(۲) عبادت کا مقصود قبولیت ہے اور اخفاء اقرب الی المقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کی اکثرت نے ذکرِ خفی پر مواظبت کی ہے اور جن سلسلوں میں سالک کی تربیت کے لیے ذکرِ جہر لسانی کرایا جاتا ہے وہ صرف مبتدی کے لیے ہے اور منتہی کے لیے ان کے ہاں بھی ذکرِ خفی پر ہی زور دیا جاتا ہے۔

ذکرِ الٰہی اور ذکرِ کثیر کے لیے قرآنِ مجید میں متعدد آیات ملتی ہیں، کہیں ذکرِ اسمِ ذات کی تاکید ہے، کہیں ذکرِ قلبی کی تلقین کی گئی ہے جو ذکرِ کثیر اور ذکرِ دائمی کی واحد صورت ہے۔ بالخصوص ایک آیت جامع خصوصیات کی حامل ہے:

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَ لَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ... (الاعراف، ۲۰۵)

اس آیت کی تفسیر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے حضرت انور شاہ صاحبؒ سے نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ انور

Scanned with CamScanner

میں یوں فرمائی ہے:

قَالَ شَیْخٌ اَنْوَرُ رَحِمَہُ اللہُ لَا تُخْرَجُ فِیْہِ عَنِ اللَّفْظِ وَ عُنْوَانِہٖ اِلٰی غَیْرِہٖ فَھُوَ فِی الذِّکْرِ لَا الصَّلٰوۃِ وَاِنْ کَانَتْ ذِکْرًا قَوْلُہٗ وَاذْکُرْ رَّبَّکَ اَلظَّاھِرُ اَنَّ الْمُرَادَ بِہٖ ذِکْرُہٗ فِی الْقَلْبِ وَلَعَلَّہٗ لِذَا لَمْ یَقُلْ وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَقَالَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَۃً وَّلَمْ یَقُلْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً. فَالْخِیْفَۃُ مِنْ عِقَابِہٖ اَمْرٌ فِی الْقَلْبِ کَمَا قَالَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ عِنْدَ التِّرْمِذِیِّ مِنْ اَبْوَابِ صِفَۃِ جَھَنَّمَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ یَقُوْلُ اللہُ اَخْرِجُوْا مَنْ فِی النَّارِ مَنْ ذَکَرَنِیْ یَوْمًا اَوْ خَافَنِیْ فِیْ مَقَامٍ ھٰذَا... حَدِیْثٌ حَسَنٌ... (فیض الباری، ۱۳۵، ۱۳۶-۱۳۶)

شیخ انور رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہم قرآن کی اس آیت کے اس لفظ سے باہر نہیں جاتے ہیں۔ پس اس سے مراد ذکر ہے نہ کہ نماز، اگرچہ نماز بھی ذکر ہے۔ اور وَاذْکُرْ رَّبَّکَ سے ظاہر مراد ذکرِ قلبی ہے، لسانی نہیں۔ نماز تو ذکرِ لسانی ہے، شاید اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ... نہیں فرمایا۔ اور فرمایا، تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَۃً... اور 'خفیہ' نہیں فرمایا۔ خوف دل کا فعل ہے اور از قبیلِ عقاب ہے یعنی خوف، جیسے فرمایا مومن وہ ہیں جن کے سامنے خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔ اور ترمذی شریف کی حدیث صفتِ ابواب جہنم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرمائے گا اُس شخص کو آگ سے نکال دو جس نے صرف ایک دن مجھے یاد کیا، یا وہ میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا۔"

اس آیت اور اس کی تفسیر سے ظاہر ہوا کہ:

(۱) ذکر سے مراد ذکرِ قلبی ہے۔

(۲) ذکر جہری لسانی کے مقابلہ میں ذکرِ قلبی کو فضیلت حاصل ہے۔

(۳) ترمذی کی حدیث سے ظاہر ہے کہ دوزخ کی آگ سے نجات دلانے والا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے صبح شام ذکر کرنے کا حکم دیا۔

(۵) صبح شام ذکر نہ کرنے والا خدا سے غافل ثابت ہوا۔

(۶) ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں جو ذکر کرایا جاتا ہے وہ ذکرِ قلبی ہے۔

ذکرِ خفی کی فضیلت قرآن میں

قَالَ تَعَالٰی: اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا... "جب اس نے اپنی خفیہ پوشیدہ آواز میں اپنے رب کو پکارا۔" اس کی تفسیر کرتے ہوئے صاحبِ 'تفسیر مظہری' لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نیک بندے کو یاد فرمایا اور اس کے اس فعل یعنی مخفی یاد کرنے کو پسند فرمایا، یعنی اللہ نے اس کے ذکرِ خفی کو پسند فرمایا ہے۔ پھر اللہ کا حکم ہے:

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً... الخ (الاعراف: ۲۰۵) اللہ کا حکم ہے کہ "اپنے رب کو اپنے

Scanned with CamScanner

دل میں یاد کر، نہایت تضرع اور عاجزی کے ساتھ اور اس کی عظمت سے ڈرتے ہوئے۔" امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تبلیغ وحی کا حکم دینے کے بعد متصل ہی آیت میں یہ حکم دیا۔ سارے کا سارا قرآن احکام الٰہی ہیں جن کی تبلیغ ضروری ہے، وہ ہیں ہی خلق تک پہنچانے کے لیے لیکن ذکر میرا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہو اور میری عظمت کے احساس کے ساتھ ہو۔ 'تفسیر کبیر' میں اس کی وجہ کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے (ترجمہ) "کہ آپ اپنے پروردگار کو دل میں یاد کریں" اور اس کا فائدہ ہے کہ آدمی ذکر سے مکمل طور پر مستفید اس صورت میں ہوسکتا ہے جب ذکر میں یہ صفت پیدا ہوجائے کیونکہ "اس شرط (یعنی ذکرِ قلبی) سے ذکر کرنا اخلاص اور تضرع کے زیادہ قریب ہے"۔

یعنی ذکرِ قلبی وہ طریقۂ ذکر ہے جس میں صرف اللہ ہی کو پتا ہوتا ہے کہ میرا بندہ میرا ذکر کر رہا ہے اور بندہ خود جانتا ہے کہ میں اللہ کا ذکر کر رہا ہوں، اسے یاد کر رہا ہوں۔ یہ اخلاص اور احساس عظمتِ الٰہی کے زیادہ قریب ہے۔ یہ مبتدی یعنی ابتدا کرنے والے، نئے سیکھنے والے کو دکھاوے اور نمائش سے بچاتا ہے کیونکہ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ ذکر کر رہا ہے، کوئی ریاکاری نہیں ہوسکتی۔ اور جو منتہی ہو یعنی اعلیٰ منازل پر ہو، اسے مخلوق سے کٹ کر اللہ سے واصل ہونے کی توفیق عطا کرتا ہے جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا، "جسے اللہ کی معرفت نصیب ہوگئی اس کی زبان گنگ ہوگئی۔" جسے معرفتِ الٰہی نصیب ہوجائے پھر اس سے ادھر اُدھر کے فسانے کہے نہیں جاتے۔

"اخفاء تمام اذکار کے لیے عام ہے......" فرمایا، عبادت کی قبولیت کا انحصار اخلاص پر ہے اور ذکرِ خفی میں سب سے زیادہ اخلاص پایا جاتا ہے۔ عبادت کی ہی اس لیے جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ذکرِ خفی اس مقصد کے حصول کے زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام نے ساری عمر ذکرِ خفی کیا ہے۔ بعض سلاسل میں زبانی ذکر بھی کرایا جاتا ہے، نئے آنے والے کو پہلے آرام آرام سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ... پھر کچھ دیر بعد اِلَّا اللہ... اور پھر اس کے بعد صرف اللہ اللہ... پھر کچھ عرصہ بعد کہا جاتا ہے کہ اب دل پہ خیال کرو، دل اللہ اللہ... کہے۔ یعنی جن سلاسل میں ذکرِ لسانی کرایا جاتا ہے وہ بھی نئے آنے والے کو سکھانے کے لیے ہے یا متوجہ کرنے کے لیے ہے بالآخر وہ بھی ذکرِ خفی پر ہی لے آتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا طریقۂ تربیت ہے۔

ذکرِ الٰہی اور ذکرِ کثیر کے لیے قرآن میں متعدد آیات ملتی ہیں۔ کہیں ذکر اسمِ ذات کی تاکید ہے، کہیں ذکرِ قلبی کی تلقین کی گئی ہے جو کہ ذکرِ کثیر اور ذکرِ دائمی کی واحد صورت ہے۔ دل ذاکر ہوجائے تو انسان خواہ کچھ بھی کر رہا ہو، دل ذکر میں مصروف رہتا ہے۔ قلبی ذکر کے سوا ذکرِ دائمی کی کوئی اور صورت ناممکن ہے۔

ذکرِ الٰہی سے متعلق آیاتِ قرآنی میں ایک آیت وَاذْكُر رَّبَّكَ.....مِنَ الْغَافِلِيْنَ (الاعراف، ۲۰۵) جامع خصوصیات کی حامل ہے۔ اس آیت کی تفسیر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے حضرت انور شاہؒ کے حوالے سے نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ انورؒ کے صفحہ ۱۳۵۔ ۱۳۶ پر یوں فرمائی ہے:

شیخ انورؒ نے فرمایا: ہم قرآن کی اس آیت کے موضوع اور اس لفظ (ذکر) سے باہر نہیں جاتے۔ پس اس سے مراد ذکر ہے نہ کہ نماز، اگرچہ نماز بھی ذکر ہے۔ اور وَاذْكُر رَّبَّكَ سے واضح مراد ذکرِ قلبی ہے، لسانی نہیں۔ نماز تو ذکرِ لسانی ہے۔

Scanned with CamScanner

شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے وَاذْكُرْ رَبَّكَ... فرمایا ہے، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ... نہیں فرمایا۔ نیز یہ کہ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً...
فرمایا ہے، یعنی عاجزی سے اور اس کی عظمت سے لرزاں و ترساں ہو کر۔ خوف دل کا فعل ہے۔ جیسے فرمایا، مومن وہ ہیں
جن کے سامنے خدا کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ...وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ)
اور ترمذی کی حدیث 'صفت ابواب جہنم' میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اس شخص کو آگ سے نکال دو جس نے صرف ایک دن مجھے یاد کیا، یا وہ میرے سامنے کھڑا
(بغرض حساب) ہونے سے ڈرا۔ اس آیت اور اس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ:

1) ذکر سے مراد ذکرِ قلبی ہے۔

2) ذکرِ جہری لسانی (زبانی) کے مقابلہ میں ذکرِ قلبی کو فضیلت حاصل ہے۔

3) ترمذی کی حدیثِ مبارکہ سے ظاہر ہے کہ ذکر دوزخ کی آگ سے نجات دلانے والا ہے۔

4) اللہ تعالیٰ نے صبح شام (ذکرِ دوام، Round the clock) ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔

5) صبح شام ذکر نہ کرنے والا اللہ سے غافل ثابت ہوا۔

6) ہمارے سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ میں جو ذکر کرایا جاتا ہے، ذکرِ قلبی ہے۔

ذکرِ خفی کی فضیلت حدیث میں

وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ...

(الترغیب والترہیب، ۴:۱۶۰؛ صحیح ابن حبان، باب الأذکار ذکر البیان بأن ذکر العبد ربه رجل، ۳:۹۱)

"حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بہترین ذکر، ذکرِ خفی ہے۔"

گو ذکرِ مطلق مامور بہ ہے مگر ہم نے قرآن و حدیث سے متوارث اور متعامل ذکر کو لیا ہے جو بطور میراث ہمیں سلف صالحین اور صوفیاء عارفین سے ملا ہے اور جس کے افضل ہونے پر قرآن و سنت سے واضح دلائل ملتے ہیں۔ ہم حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ فرائض کو راس المال سمجھتے ہیں اور نوافل کو بمنزلہ منافع جانتے ہیں، اور اذکار میں سب سے افضل ذکرِ قلبی کو سمجھتے ہیں اور یہ قرآن و سنت کے عین مطابق ہے۔ تزکیۂ قلب اسی سے حاصل ہوتا ہے اور تزکیۂ قلب ہی حقیقی کامیابی کا ضامن ہے۔

كَمَا قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَىٰ: إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ... (الاعراف:۲۰۱) أَيْ إِذَا مَسَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِالْوَسْوَسَةِ

Scanned with CamScanner

وَ التَّشْوِيْشِ وَ إِرْسَالِ السُّتُوْرِ وَ إِرْخَاءِ الْحِجَابِ عَلَى الْقَلْبِ تَذَكَّرُوا اللهَ تَعَالٰى وَذَكَرُوْا اِسْمَهٗ ثُمَّ اِذَا تَذَكَّرُوْا يَرُدُّ اللهُ عَنْهُمْ وَيَرْفَعُ حَجْبَهٗ وَيَبْصُرُ قَلْبُ الذَّاكِرِ...

"یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو یاد میں لگ جاتے ہیں، سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔۔۔ یعنی جب متقی لوگوں کو شیطان کی طرف سے وسوسہ اور پریشانی ہوتی ہے اور وہ ان کے دل پر پردے ڈال دیتا ہے تو اس وقت وہ لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اللہ کے نام کو یاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دل پر سے پردے اٹھا دیتا ہے اور ذاکر کا دل دیکھنے لگتا ہے۔"

فائدہ:

(۱) معلوم ہوا کہ ذکر الٰہی موقوف ہے تقویٰ پر اور تقویٰ باب ہے ذکر الٰہی کا، اور ذکر الٰہی باب ہے کشف کا اور کشف باب ہے فوز کبیر کا جو معرفت الٰہی ہے۔ شیطان تو اپنے داؤ استعمال کرتا ہے مگر اس کی تدبیریں کمزور ہیں بشرطیکہ مقابل میں بندۂ خدا ہو، بندۂ ہویٰ نہ ہو۔

كَمَا قَالَ تَعَالٰى: اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا... (النساء:۷۶)

(۲) شیطان کا فسوں ذکر الٰہی سے فوراً دفع ہو جاتا ہے اور اللہ والوں پر اس کا تسلط نہیں ہوتا۔

كَمَا قَالَ تَعَالٰى: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ... (الاسراء:۶۵؛ الحجر:۴۲)

ہاں! شیطان کا تسلط اپنے دوستوں پر ضرور ہوتا ہے۔

كَمَا قَالَ تَعَالٰى: اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ... (النحل:۱۰۰)

(۳) جب شیطان غالب آگیا تو ذکرِ الٰہی دل سے نکل گیا اور خواہشِ نفس نے دل میں ڈیرے جما دیئے۔

كَمَا قَالَ تَعَالٰى: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ... (المجادلہ:۱۹)

"ان پر شیطان نے تسلط کر لیا ہے، پھر ان کو اللہ کی یاد بھلا دی۔ یہی شیطان کا گروہ ہے۔ خوب سن لو! کہ بے شک شیطان کا گروہ ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔"

ذکرِ خفی کی فضیلت حدیث میں

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "بہترین ذکر ذکرِ خفی ہے۔"

شیخ کے پاس تربیت کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ جو عام ہے وہ اس طرح ہے کہ طالب کو ذکر کی سورت پہ لگایا، اسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ... پڑھنے پر لگا دیا اور اس پر متوجہ رہنے کی ہدایت کی۔ پڑھتے رہنے سے طالب کی

Scanned with CamScanner

تھوڑی بہت توجہ بن گئی۔ پھر کہہ دیا کہ صرف اِلَّا اللہ۔۔۔ ہی پڑھے۔ جب اس طرح اس کی تھوڑی توجہ اور بن گئی تو کہا کہ اب صرف اللہ اللہ کرے۔ جب اس میں کچھ توجہ بنی تو پھر کہا کہ اب قلب پر خیال کر کے زبان بند کر کے دل سے "اللہ اللہ" کہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ کچھ توجہ طالب کی بنتی ہے کچھ توجہ شیخ دیتا ہے تو طالب کا قلب ذاکر ہو جاتا ہے پھر اسے ذکر خفی پر لگا دیا جاتا ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ میں اور نسبتِ اویسیہ میں یہ طریقہ کار نہیں ہے۔ نسبتِ اویسیہ میں اللہ نے شیخ کو اتنی قوت دی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ ان حیلوں حوالوں کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہر آنے والے کو قلب پر خیال کروا کے توجہ دیتا ہے اور طالب کا قلب ذاکر ہو جاتا ہے۔

"گو ذکر مطلق ماموربہ ہے مگر ہم نے قرآن و حدیث سے متوارث اور متعامل ذکر کو لیا ہے۔" دین متوارث ہے یعنی دین ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ جو باپ دادا کی چیز ہو، وہ میراث ہوتی ہے۔ دین میں بھی توارث ہے۔ نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرامؓ نے حاصل کیا۔ صحابہؓ سے تابعینؒ نے، تابعینؒ سے تبع تابعینؒ نے، متقدمین نے اسی طرح وراثت میں ہم تک پہنچایا۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو دین میں سے کوئی چیز کم یا زیادہ کر سکے۔ لہٰذا دین جیسا صحابہؓ کو، تابعینؒ کو، تبع تابعینؒ کو، متقدمین و سلف صالحین کو ملا ویسا ہی انہوں نے ہم تک پہنچایا۔ جو نئی چیز اس میں شامل کی جائے گی اسے بدعت کہیں گے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا، "ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی کا انجام دوزخ ہے۔"

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ ۔۔۔ اوکما قال رسول اللہ ﷺ۔

(سنن نسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب کیف الخطبہ، ۱:۲۳۴)

تو فرمایا کہ "ہم نے قرآن و حدیث سے متوارث اور متعامل ذکر کو لیا ہے۔" یعنی ذکر بھی اسی توارث سے ہمیں ملا ہے جس طرح باقی سارا دین ملا ہے کیونکہ اس کا حکم "بطور میراث ہمیں سلف صالحین و صوفیاء عارفین سے ملا ہے۔" اور جس کے افضل ہونے پر قرآن و سنت سے واضح دلائل ملتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ "ہم اس سلسلے میں کہیں غلطی نہیں کرتے، ہر حکم کے درجے کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم بھی فرائض کو راس المال یعنی اصل سرمایہ ہی سمجھتے ہیں اور نوافل کو منافع کے طور پر لیتے ہیں، اور اذکار میں ہم سب سے افضل ذکر قلبی کو سمجھتے ہیں کہ قرآن اور سنت کی تعلیم کے عین مطابق ہے اور تزکیۂ قلب اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

اور تزکیۂ قلب یعنی قلب کی ماسوی اللہ سے پاکیزگی حقیقی کامیابی کی ضامن ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد باری ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ۔۔۔

(الاعراف:۲۰۱)

"یقیناً جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آتا ہے تو اللہ کی یاد میں لگ جاتے ہیں۔ سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔"

یعنی جب متقی لوگوں کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اور پریشانی ہوتی ہے، ان کے دل پر شیطان پردے ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس وقت وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اللہ کے نام کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ ان کے دل سے پردے اٹھا دیتا ہے اور ذاکر کا دل دیکھنے لگتا ہے، اسے حقیقت نظر آجاتی ہے اور وہ شیطان کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

''معلوم ہوا کہ ذکر موقوف ہے تقویٰ پر اور تقویٰ باب ہے ذکر الٰہی کا۔'' یعنی ذکر کا فائدہ تب ہے کہ جب آدمی متقی ہو، اللہ کے ساتھ اس کا تعلق درست ہو، اور جس کا اللہ کے ساتھ تعلق صحیح ہو اُسے ذکر نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ متقی ہوگا تو ذاکر ہوگا، ذاکر ہوگا تو تقویٰ نصیب ہو جائے گا۔ ''اور ذکر الٰہی باب ہے کشف کا۔'' ذکرِ الٰہی سے مشاہدات نصیب ہوتے ہیں اور ''کشف باب ہے فوزِ کبیر کا جو معرفتِ الٰہی ہے۔'' اور مشاہدات اللہ کی عظمت کو جاننے کا سبب بنتے ہیں جو حقیقی کامیابی ہے۔ ''شیطان اپنے داؤ استعمال کرتا ہے مگر اس کی تدبیریں کمزور ہیں بشرطیکہ مقابل اللہ کا بندہ ہو۔'' شیطان اپنی کوشش تو کرتا ہے لیکن اللہ کے بندوں پر اس کی تدبیر نہیں چلتی اس لیے کہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اگر بندہ ہی اللہ کا نہ ہو، دنیا کا ہو، ذکر اذکار سے بھی دنیا کمانا ہی مراد ہو، لوگوں میں اپنا نام و مقام بنانا، دولت جمع کرنا ہو تو وہ شیطان کے قابو میں لازماً آئے گا لیکن جو اللہ کے بندے ہیں جن کا مقصد رضائے باری حاصل کرنا ہو، ان پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا... ''بے شک شیطان کا داؤ کمزور ہوتا ہے۔''

لیکن ان لوگوں کے لیے جن کا اللہ سے تعلق مضبوط ہو اور جو اللہ کے طالب ہوں۔ شیطان کا فسوں ذکرِ الٰہی سے رفع ہو جاتا ہے اور اللہ والوں پر اس کا تسلط نہیں ہوتا۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ... اللہ کے بندے جو اس کی رضا کے لیے ہمہ وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں ان پر شیطان مسلط نہیں ہو سکتا۔ ذکرِ الٰہی بندے کو شیطان سے حفاظتِ الٰہیہ فراہم کرتا ہے۔ اللہ کا فرمانا ہے (شیطان سے مخاطب ہو کر) ''میرے بندوں پر تیرا داؤ نہیں چلے گا۔'' ہاں! شیطان کا تسلط اپنے بندوں پر ضرور ہوتا ہے۔

إِنَّمَا سُلْطٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ... شیطان کا زور ان لوگوں پر ضرور چلتا ہے جو اس کے دوست بن جاتے ہیں جو اس کی بات مان لیتے ہیں جن کا عقیدہ یا کردار ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا شیطان چاہتا ہے، وہ اس کا ہر مشورہ مانتے ہیں۔ وہ انہیں لگام ڈال کر جدھر چاہتا ہے چلاتا ہے۔ جب اس طرح سے شیطان غالب آ گیا تو ذکرِ الٰہی دل سے نکل گیا، خواہشِ نفس نے ڈیرے ڈال لیے۔ ذکرِ الٰہی سے محرومی نفس اور شیطان کو انسان کا حاکم بنا دیتی ہے۔ دل خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ اللہ کے نام کی جگہ خواہشات دل میں جگہ بنا لیتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَأَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۚ أُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۚ أَلَآ إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُونَ... جب شیطان نے ان پر قابو پا لیا تو ان سے اللہ کی یاد کو بھلا دیا۔ ان کے دل سے اللہ کا نام بھلا دیا، ایسے لوگ شیطان کے لشکری (فوجی) ہیں۔ وہ پھر شیطان کے ساتھ مل کر اللہ کے حکموں کے خلاف چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ چلاتے ہیں۔ وہ شیطان کے مددگار (اللہ کے خلاف) بن جاتے ہیں۔ اور یاد رکھو! جو شیطان کی جماعت میں شامل ہو گیا وہ بہت زیادہ نقصان میں ہے، پھر اس کا کچھ نہیں بچتا۔

Scanned with CamScanner

باب (14)

حلقۂ ذکر

گزشتہ باب میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ ذکرِ الٰہی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے مطلق ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر صوفیائے کرام نے ضرورت، مناسبت، موزونیت اور افادیت کے اعتبار سے جو صورت بہتر سمجھی اسے اختیار کر لیا۔ کہیں انفرادی طور پر ذکر کرنے کی تلقین کی، کہیں اجتماعی ذکر کی صورت اختیار کی۔ مگر بعض نادان لوگ اجتماعی ذکر اور حلقۂ ذکر کو بدعت کہہ دیتے ہیں حالانکہ مذکورۃ الصدر اصول کی بناء پر اسے بدعت کہنا غلطی ہی نہیں بلکہ خود ایک بدعت ہے۔

حلقۂ ذکر

اس بات پر بڑا اعتراض کیا جاتا ہے کہ ذکر کا حکم تو ہے لیکن لوگوں کا مل کر ایک طریقے سے ذکر کرنا اور اکٹھا بٹھا کر ذکر کرانا، یا سیدھے سادے لفظوں میں حلقۂ ذکر بدعت ہے۔ گزشتہ باب میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ "ذکرِ الٰہی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مطلق ہے۔" یعنی یہ بات تو ہوگئی کہ ذکرِ الٰہی میں کسی مخصوص طریقے، سلیقے اور وقت (مقدارِ وقت یا خاص وقت) کی کوئی قید نہیں۔ کمیت اور کیفیت سے مراد یہ ہے کہ کتنا ذکر کیا جائے اور کس طریقے سے اور کس وقت کیا جائے۔ ایسی کوئی قدغن یا پابندی نہیں۔ بس ذکر کرنے کا حکم ہے۔ "اس اصول کے پیشِ نظر صوفیائے کرام نے ضرورت و مناسبت، موزونیت اور افادیت کے پیشِ نظر جو صورت بہتر سمجھی، اسے اختیار کر لیا۔" یعنی جب مطلق ذکر کا حکم ہے تو اب ہر وہ طریقہ جو خلافِ شریعت نہ ہو، جائز ہے۔ ذکر کے بہانے سے اگر کوئی ایسا طریقہ یا انداز اپنائے جو شریعت کے خلاف ہو تو وہ جائز نہ ہوگا۔ احکامِ شریعت کے دائرے میں جتنے طریقے ہیں، کوئی اکیلا بیٹھ کر ذکر کرتا ہے یا دس لوگ مل کر کرتے ہیں، پچاس مل کر کرتے ہیں، کس طریقے سے کرتے ہیں، کتنی دیر کرتے ہیں، یہ سب جائز ہوگا کیونکہ کوئی ایک طریقہ متعین نہیں کیا گیا۔ بعض لوگ نادانی کی بنا پر حلقۂ ذکر کو بدعت کہہ دیتے ہیں۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اجتماعی ذکر کو بدعت کہنا غلطی نہیں بلکہ بجائے خود ایک بدعت ہے کیونکہ اجتماعی ذکر کا قرآن و حدیث دونوں کی رُو سے ثبوت موجود ہے۔ اسی کی روشنی میں صوفیا نے جو صورت موزوں سمجھی اسے اختیار کیا۔ انفرادی ذکر بھی کیا اور اجتماعی ذکر بھی کرایا۔

اجتماعی ذکر کا ثبوت

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ... (الکہف:۲۸)

"اور آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجیے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی

رضاجوئی کے لیے کرتے ہیں۔"
اس آیت کے حصہ مَعَ الَّذِیْنَ سے اجتماعی ذکر اور حلقۂ ذکر کا ثبوت ملتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو بھی ان لوگوں کی معیت کا حکم ملا ہے۔ اس سے ذکرِ اجتماعی کی فضیلت بھی ظاہر ہوگئی۔

اجتماعی ذکر کا ثبوت

سورۂ کہف میں نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ...

"آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجیے جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضاجوئی کے لیے کرتے ہیں"۔ مَعَ الَّذِيْنَ... سے اجتماعی ذکر اور حلقۂ ذکر کا ثبوت ملتا ہے۔ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ... میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے کہ بہت سے لوگ جو اللہ کا ذکر صبح وشام، رات دن، ہر وقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کے لیے حکم ہے کہ آپ ﷺ ان لوگوں کے ساتھ رہا کیجیے۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تو دو طرح کے لوگ اس وقت مسجدِ نبوی میں حاضر تھے۔ صحابہ کرام ؓ کا ایک گروہ بیٹھا آپس میں احکام ومسائل اور قرآن وسنت پہ گفتگو کر رہا تھا، دوسری طرف کچھ لوگ حلقہ بنائے ذکرِ الٰہی کر رہے تھے۔ آپ ذکر کرنے والوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوگئے اور فرمایا کہ "اللہ کا شکر ہے! مجھے جن لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ نے وہ لوگ مجھے مہیا بھی کر دیئے ہیں۔"

اس آیۂ مبارکہ میں مَعَ الَّذِيْنَ سے اجتماعی ذکر ثابت ہوا اور حلقۂ ذکر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ "خود حضور اکرم ﷺ کو ان لوگوں کی معیت اختیار کرنے کا حکم ملا ہے۔ اس سے اجتماعی ذکر کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے"۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ جو لوگ مل کر میرا ذکر کر رہے ہیں، آپ ﷺ بھی ان میں رونق افروز ہوں، تو مل کر ذکر کرنے والوں کی فضیلت ثابت ہوگئی۔ حدیث مبارکہ میں بھی اس امر کی تائید موجود ہے۔

حدیث سے اجتماعی ذکر کی تائید

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً يَّطُوْفُوْنَ فِي الطُّرُقِ يَلْتَمِسُوْنَ اَهْلَ الذِّكْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا قَوْمًا يَّذْكُرُوْنَ اللهَ تَنَادَوْا: هَلُمُّوْا اِلٰى حَاجَتِكُمْ قَالَ: فَيَحُفُّوْنَهُمْ بِاَجْنِحَتِهِمْ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا... قَالَ فَيَقُوْلُ فَاِنِّيْ اُشْهِدُكُمْ اَنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ: يَقُوْلُ مَلَكٌ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ: فِيْهِمْ فُلَانٌ

Scanned with CamScanner

لَيْسَ مِنْهُمْ اِنَّمَا جَآءَ لِحَاجَةٍ قَالَ: هُمُ الْجُلَسَآءُ لَا يَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ...

(صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب فضل ذکر اللہ عزوجل، ۲:۹۴۸)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ملائکہ اہلِ ذکر کو تلاش کرتے پھرتے ہیں، جہاں کہیں انہیں ذاکرین کی کوئی جماعت مل جاتی ہے اپنے ساتھیوں کو بلاتے ہیں کہ یہ ہے وہ چیز جس کی تمہیں تلاش ہے۔ چنانچہ وہ ملائکہ ذاکرین کو آسمانِ دنیا تک اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان لوگوں کو بخش دیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے کہ فلاں آدمی تو اہلِ ذکر میں سے نہیں، وہ تو اپنے کام کے لیے آیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایسی مجلس ہے کہ جس میں بیٹھنے والا بھی بدبخت نہیں رہ سکتا۔"

فوائد:

(۱) اس روایت سے ثابت ہوا کہ مجالسِ ذکر قائم کرنا ایسا محمود عمل ہے کہ ملائکہ کرام مجالسِ ذکر کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں کیونکہ ملائکہ اور ذاکرین میں مناسبت ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

(۲) ذکرِ الٰہی ایسی عبادت ہے جس پر مغفرت کا اعلان کیا جاتا ہے، کسی اور عبادت پر نہیں۔

(۳) وسیلۂ صلحاء اور صحبتِ مشائخ کا محمود ہونا ثابت ہوا۔ ذاکرین کی جماعت میں شمولیت سے بدکار بھی نجات حاصل کر لیتا ہے۔

(۴) اولیاء کی ذرا سی صحبت ایماندار آدمی کو جنتی بنا دیتی ہے۔

حدیث سے اجتماعی ذکر کی تائید

ابوہریرہؓ سے مروی ہے (ترجمہ) اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں جو زمین پر اہلِ ذکر کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں کہیں انہیں ذاکرین کی جماعت مل جاتی ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کو بلاتے ہیں کہ یہ ہے وہ چیز جس کی تمہیں تلاش ہے۔ چنانچہ وہ ملائکہ ذاکرین کو آسمانِ دنیا تک اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں...... یہاں تک کہ فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان لوگوں کو بخش دیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے کہ فلاں آدمی تو اہلِ ذکر سے نہیں وہ تو اپنے کام سے آیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایسی مجلس ہے جس میں بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا۔"

یعنی اللہ کے فرشتوں کی ایک جماعت ایسی ہے جو روئے زمین پر ذاکرین کو تلاش کرتے پھرتے ہیں، جب کہیں ان کو کچھ لوگ ذکرِ الٰہی کرتے ہوئے مل جاتے ہیں اِذَا وَجَدُوْا قَوْمًا يَّذْكُرُوْنَ اللّٰهَ... (متفق علیہ) سے صاف ظاہر ہے کہ جب پوری ایک جماعت یا گروہ کو ذکر کرتا پاتے ہیں تو وہ اجتماعی ذکر ہی ہوتا ہے، تو تَنَادَوْا... آواز دیتے ہیں۔ هَلُمُّوْا... یہاں آجاؤ۔ وہ اپنے گروہ و قبیل کے باقی فرشتوں کو بلاتے ہیں کہ یہاں چلے آؤ۔ اِلٰى حَاجَتِكُمْ... یہاں تمہارے لیے وہ موجود ہے جس کی تمہیں ضرورت و تلاش ہے۔ یہاں گروہ ذاکرین ذکر میں مشغول ہے۔ پھر فرشتے ان

Scanned with CamScanner

لوگوں کے گرد حلقہ بنا لیتے ہیں، اپنے پروں سے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ پیچھے سے آنے والے فرشتے ان سے اوپر ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ حلقہ بلند ہوتے ہوتے آسمانِ دنیا (سب سے پہلا آسمان، نچلا آسمان) تک پہنچ جاتا ہیں۔ یہ حدیث مبارکہ آگے خاصی طویل ہے، لیکن اعلیٰ حضرتؒ نے اس کا آخری حصہ کتاب میں تحریر کیا ہے۔ فرمایا حتیٰ کہ جب وہ بارگاہِ الٰہی میں حاضری دیتے ہیں تو آخر میں اللہ کریم ان سے پوچھتے ہیں اور پھر ارشاد فرماتے ہیں۔ تم گواہ رہنا اَنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ... میں نے ان سب کو بخش دیا ہے جو میرا ذکر کر رہے تھے، مجھے یاد کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ یا اللہ! ان لوگوں میں جو فلاں نام کا شخص بیٹھا تھا وہ ذکر کے لیے نہیں، اپنے کسی کام سے آیا تھا جس سے اسے کام تھا وہ ذکر میں مصروف تھا۔ وہ مجلس میں محض اس لیے بیٹھ گیا کہ یہ فارغ ہو تو اس سے بات کروں تو اے اللہ پاک! آپ فرما رہے ہیں کہ آپ نے سب کو بخش دیا، سب میں تو وہ غیر متعلق شخص بھی شامل ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے:

هُمُ الْجُلَسَآءُ لَا يَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ... یعنی یہ (ذاکرین) وہ لوگ ہیں کہ جن کی مجلس میں آ کر بیٹھنے والا بھی بدبخت نہیں رہتا۔ میں نے (اس محفلِ مذکور کے صدقے) اسے بھی بخش دیا۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ مجالسِ ذکر قائم کرنا ایسا محمود عمل ہے کہ "ملائکہ کرام مجالسِ ذکر کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں کیونکہ ملائکہ اور ذاکرین میں مناسبت ہے۔" اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں یہ اتنا اچھا عمل ہے کہ اللہ نے ایسے فرشتے بنا دیئے ہیں جو ذکر کے حلقے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جہاں ذاکرین ذکر کرتے ہوئے مل گئے، وہیں وہ بھی جا شامل ہوتے ہیں، پھر اس کی خبر بارگاہِ الوہیت میں جا کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ذکرِ الٰہی ایسی عبادت ہے جس پر مغفرت کا اعلان کیا گیا ہے، ایسا کسی اور عبادت پر نہیں ہوا۔ کمال یہ ہے کہ حلقۂ ذکر میں کوئی ویسے بھی یعنی ذکر کے علاوہ کسی اور مقصد سے بھی آ کر بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی بخشش کا وعدہ ہے۔ باقی کسی عبادت پر یہ اعلان، یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ روزہ داروں میں آ کر بیٹھا تو بخشا گیا یا نمازیوں یا حاجیوں کے ساتھ بیٹھا تو بخشا گیا۔ وہ سب کو بخش دے، وہ قادر ہے لیکن یہ حلقۂ ذکر ہے جس کو یہ فضیلت دی گئی ہے۔

"اور اس سے وسیلۂ صلحاء اور صحبتِ مشائخ کا محمود ہونا ثابت ہوا" کہ ذاکرین کی جماعت میں شمولیت سے بدکار بھی نجات حاصل کر لیتا ہے تو اس سے اہل اللہ کا وسیلۂ نجات ہونا ثابت ہوا۔ ہمارے ہاں وسیلے پر بڑی بحث ہوتی ہے اس لیے کہ ہم 'وسیلے' کو بھی کھینچ کھانچ کر دنیا کی طرف لے آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فلاں کے وسیلے سے اولاد ملتی ہے، روزی ملتی ہے یا نوکری ملتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری چیزیں اللہ کی طرف سے طے شدہ ہیں، ہر ایک کو مل رہی ہیں۔ یہاں تک کہ جو اللہ کو مانتے تک نہیں وہ انہیں بھی یہ سب دے رہا ہے، تو پھر کسی دوسرے کے وسیلے کی کیا ضرورت ہے؟ دراصل وسیلے سے مراد ہے کہ اس کے طفیل اللہ کی رضا حاصل ہو۔ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں وسیلہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے رضائے باری کے حصول کے لیے ہے وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ... (المائدہ:۳۵)۔ اور فرمایا کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ نیک لوگوں یا مشائخ کی صحبت بھی وسیلۂ وصولِ حق بن جاتی ہے یعنی اللہ تک پہنچنے اور نجات کا سبب بن جاتی ہے اور بدکار تک

بھی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ ایک بندہ زندہ ہے، ابھی دارِ دنیا میں ہے، اسے نجات مل گئی یا اس کا ذکر قبول ہو گیا تو اسے کیسے پتا چلے گا؟ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بدر میں شامل تھے اب آئندہ کچھ عمل بھی کریں اللہ نے جنت ان کے لیے مقرر کر دی۔ یہ بہر طور جنت میں جائیں گے۔ کسی نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! چاہے وہ شرک کریں، زنا کریں، چوری کریں؟ فرمایا "چاہے کچھ بھی کریں۔" محدثین اس بات کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ بدر میں شمولیت سے اللہ نے انہیں ایک خاص حفاظت عطا فرمائی، اب انہیں ہر اُس کام کی توفیق ملے گی جو جنت کے لیے سزاوار ہے۔ اسی طرح ذکر کی مجلس میں بیٹھنے سے نجات تو ہو گئی مگر بندے کے پاس کیا معیار، کیا پیمانہ ہے جو یہ بتا سکے کہ نجات ہو گئی......؟ اگر اس کے کردار کی اصلاح ہو گئی، برائی چھوٹ گئی، نیکی کی توفیق مل گئی تو اس کا مطلب ہے کہ مجلسِ ذکر میں اس کا بیٹھنا قبول ہو گیا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جیسے شیطان چکر لگا تا رہتا ہے کہ کسی طرح ذکر سے روک دوں، اسی طرح یہ شخص بھی تھا کہ ذکر میں محض خلل ڈالنے کے لیے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ یعنی بندے کا کردار یا کردار میں آنے والی تبدیلی اس بات کا ثبوت ہو گی کہ محفلِ ذکر میں اس کا شامل ہونا قبول ہوا، یا نہیں۔

مجالس ذکر قائم کرنے کا حکم

عَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ اَنَّهٗ قَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی مِلَاكِ هٰذَا الْاَمْرِ الَّذِیْ تُصِیْبُ بِهٖ خَیْرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ عَلَیْكَ بِمَجَالِسِ اَهْلِ الذِّکْرِ۔۔۔

(مشکوۃ، باب الحب فی اللہ ومن اللہ، ۴۲۷)

"حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں ایسے بہترین عمل کی خبر نہ دوں جس سے تم دنیا و آخرت کی بھلائی سمیٹ لو۔ سنو! مجالس ذکر لازم پکڑو۔"

فوائد:

(۱) مجالسِ ذکر کی تلاش اور ان میں شامل ہونا مؤکد بہ تاکید ہے۔

(۲) مجالسِ ذکر دین و دنیا کی کامیابی کا ذریعہ ہیں۔

(۳) ذکر الٰہی سے رحمتِ الٰہی کا نزول اور اطمینانِ قلبی حاصل ہوتا ہے۔

اَنَا مِنَ الرِّجَالِ لَا یَخَافُ جَلِیْسُهُمْ
رَیْبَ الزَّمَانِ وَ لَا یَرٰی مَا یَرْهَبُ

Scanned with CamScanner

مجالسِ ذکر قائم کرنے کا حکم

لوگ محض جہالت اور لاعلمی کی بنا پر حلقۂ ذکر یا اجتماعی ذکر کو بدعت کہہ دیتے ہیں۔ اعلیٰ حضرتؒ نے نہ صرف مجلسِ ذکر کے جواز میں دلائل دیئے ہیں (جن پر تفصیلاً بحث ہو چکی ہے)، بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ شریعت میں مجالسِ ذکر قائم کرنے کا باقاعدہ حکم ہے۔ ابی رزینؓ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ میں تجھے ایسی بات نہ بتاؤں جس سے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی بھلائی وابستہ ہے۔" میں نے عرض کیا فرمائیے، فرمایا، "اہلِ ذکر کی مجالس میں لازماً بیٹھا کرو۔ اس سے دونوں جہانوں کی بھلائی نصیب ہوتی ہے۔"

اس حدیث مبارکہ سے جن فوائد کا استخراج کیا گیا ہے، ان کی تفصیل یہ ہے کہ مجالسِ ذکر کی تلاش اور ان میں شمولیت کی تاکید خود نبی اکرم ﷺ نے فرمائی ہے اور اسے دنیا و آخرت کی بھلائی کا سبب بھی قرار دیا ہے۔ مجالسِ ذکر دین و دنیا کی کامیابی کا ذریعہ ہیں، نیز یہ کہ ذکرِ الٰہی سے رحمتِ الٰہی کا نزول اور اطمینانِ قلبی حاصل ہوتا ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے، **ولنعم ما قیل:**

أَنَا مِنَ الرِّجَالِ لَا يَخَافُ جَلِيسُهُمْ
رَيْبَ الزَّمَانِ وَ لَا يَرَى مَا يَرْهَبُ

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے پاس بیٹھنے والے نہ زمانے کی گردش سے ڈرتے ہیں اور نہ آنے والے حادثات انہیں خوفزدہ کر سکتے ہیں بلکہ انہیں قربِ الٰہی، وصالِ الٰہی نصیب ہو جاتا ہے۔ مخلوق کا ڈر ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔"

حلقۂ اجتماعی ذکر:

"فیض الباری" میں درج ہے کہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے مصر میں مجلسِ ذکر قائم کی تھی۔

ثُمَّ انْدَرَسَتْ ثُمَّ انْدَسَّتْ ذَالِكَ الْمَجَالِسُ بَعْدَهٗ حَتّٰى جَاءَ السُّيُوطِيُّ رحمه الله وَشَرَعَ فِيْ عَهْدِهٖ ثُمَّ انْقَطَعَتْ بَعْدَهٗ بِالْكُلِّيَّةِ...

(فیض الباری، کتاب الصلوۃ، من لم یرد السلام علی الامام... الخ، ۲: ۳۱۴-۳۱۵)

"پھر یہ مجلسِ ذکر نابود ہو گئی، پھر امام سیوطیؒ نے اپنے زمانے میں قائم کی۔ پھر اُن کے بعد منقطع ہو گئی۔"

معلوم ہوا کہ متقدمین محدثین مجالس ذکر قائم کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

اور "فیض الباری" میں ہے کہ:

نمازوں کے بعد سلف صالحین میں یہ دستور تھا کہ مجلسِ ذکر قائم کرتے تھے۔

فَالسُّنَّةُ الْخَاصَّةُ فِيْ ذَالِكَ قَاضِيَةٌ عَلٰى عُمُوْمِ الْاَحَادِيْثِ فِي الْاَذْكَارِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ وَفِي الْمَدْخَلِ

لِابْنِ الْحَاجِ الْمَالِكِيِّ اَنَّ السَّلَفَ الصَّالِحِيْنَ كَانُوْا يَجْلِسُوْنَ بَعْدَ الصُّبْحِ وَ الْعَصْرِ فِي الْمَسْجِدِ لَهُمْ زَمْزَمَةٌ وَّدَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ۔۔۔(فیض الباری، کتاب العیدین، باب التکبیر ایام منی، ۲:۳۶۲)

"اس ذکر میں جو خاص سنت ہے، وہ اس امر کی متقاضی ہے وہ نمازوں کے بعد عام حدیثوں سے ثابت ہے اور "مدخل بن حاج مالکی" میں ہے کہ سلف صالحین یعنی صحابہ، تابعین، تبع تابعین نماز فجر اور عصر کے بعد مسجد میں حلقۂ ذکر کرتے تھے۔ ان کے ذکر کی آواز شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوتی تھی۔"

ذکر کی یہ صورت ذکرِ خفی ہے، یا پاسِ انفاس جس کا نقشبندیہ اویسیہ کے ہاں خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

حلقۂ اجتماعی ذکر:

'فیض الباری' میں لکھا ہے کہ علامہ حجر عسقلانی نے مصر میں مجلسِ ذکر قائم کی تھی۔ پھر یہ مجلسِ ذکر نابود (ختم) ہوگئی۔

پھر امام سیوطیؒ نے اپنے زمانے میں قائم کی۔ ان کے بعد پھر منقطع ہوگئی۔

معلوم ہوا کہ متقدمین محدثین مجالسِ ذکر قائم کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

اور 'فیض الباری' میں ہی ہے کہ نمازوں کے بعد مجلسِ ذکر قائم کرنے کا دستور سلفِ صالحین کے ہاں موجود تھا۔

"اس ذکر میں جو خاص سنت ہے وہ نمازوں کے بعد (ذکر کی مجالس) عام حدیثوں سے ثابت ہے اور 'مدخل بن حاج مالکی' میں ہے کہ سلف صالحین یعنی صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین نمازِ فجر اور عصر کے بعد مسجد میں حلقۂ ذکر منعقد کرتے تھے۔ ان کے ذکر کی آواز شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوتی تھی۔"

ذکر کی یہ صورت ذکرِ خفی ہے یا پاسِ انفاس جس کا نقشبندیہ اویسیہ میں خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

صوفیاء کا معمول قرآن وسنت پر مبنی ہے

وَ اَوْرَادُ الصُّوْفِيَةِ يَقْرَئُوْنَهَا بَعْدَ صَلٰوةٍ عَلٰى حَسَبِ عَادَاتِهِمْ فِيْ سُلُوْكِهِمْ لَهَا اَصْلٌ اَصِيْلٌ۔۔(شعب الایمان، باب محبۃ اللہ عزوجل، فصل فی ادامۃ ذکر اللہ عزوجل، ۲:۸۶)

"صوفیاء کرام جو اوراد و وظائف اپنے معمول کے مطابق نمازوں کے بعد پڑھتے ہیں ان کی اصل صحیح موجود ہے۔"

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَاَنْ اَذْكُرَ اللّٰهَ مَعَ قَوْمٍ بَعْدَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ اِلٰى طُلُوْعِ الشَّمْسِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا وَ لَاَنْ اَذْكُرَ اللّٰهَ تَعَالٰى مَعَ قَوْمٍ بَعْدَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ اِلٰى اَنْ تَغِيْبَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيْهَا۔۔۔

(شعب الایمان، باب محبۃ اللہ عزوجل، فصل فی ادامۃ ذکر اللہ عزوجل، ۲:۸۶)

Scanned with CamScanner

"بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ چیز مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے کہ ذاکرین کے ساتھ صبح کی نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور عصر کی نماز کے بعد غروبِ آفتاب تک ذکرِ الٰہی کیا کروں۔"

وَرَوٰى اَبُوْ دَاوٗدَ عَنْهُ اَنَّهٗ ﷺ قَالَ لَاَنْ اَقْعُدَ مَعَ قَوْمٍ يَّذْكُرُوْنَ اللهَ تَعَالٰى مِنْ صَلٰوةِ الْغَدَاةِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اُعْتِقَ اَرْبَعَةً مِّنْ وُلْدِ اِسْمٰعِيْلَ وَلَاَنْ اَقْعُدَ مَعَ قَوْمٍ يَّذْكُرُوْنَ اللهَ مِنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ اِلٰى اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اُعْتِقَ اَرْبَعَةً... (سنن ابی داود، کتاب العلم، باب فی القصص، ۲:۲۹۰)

"اور ابوداود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ذاکرین کے ساتھ مل کر صبح کی نماز کے بعد طلوعِ آفتاب تک ذکر کرنا مجھے اولادِ اسمٰعیلؑ سے چار غلام آزاد کرنے سے زیادہ پسند ہے، اور نمازِ عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک ان کے ساتھ ذکر کرنا چار غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔"

وَرَوٰى اَبُوْ نُعَيْمٍ، اَنَّهٗ ﷺ قَالَ: مَجَالِسُ الذِّكْرِ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَتَحُفُّ بِهِمُ الْمَلَائِكَةُ وَتَغْشَاهُمُ الرَّحْمَةُ وَيَذْكُرُهُمُ اللهُ عَلٰى عَرْشِهٖ...

(حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ۵:۱۱۸)

"اور ابونعیم نے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجالسِ ذکر پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے، وہ انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر نزولِ سکینہ ہوتا ہے اور ان پر اللہ کی رحمت سایہ کر لیتی ہے اور اللہ انہیں یاد کرتا ہے۔"

وَرَوٰى اَحْمَدُ وَمُسْلِمٌ اَنَّهٗ ﷺ قَالَ لَا يَقْعُدُ قَوْمًا يَّذْكُرُوْنَ اللهَ تَعَالٰى اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللهُ تَعَالٰى فِيْمَنْ عِنْدَهٗ...(الصحیح المسلم مع شرح کامل النووی، کتاب الذکر، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر، ۲:۳۴۵)

"اور امام احمد اور مسلم نے بیان کیا کہ جب کچھ لوگ ذکرِ الٰہی کے لیے بیٹھتے ہیں فوراً ہی ملائکہ انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر نزولِ سکینہ ہوتا ہے اور اللہ کی رحمت برستی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر اپنے مقربین میں فرماتا ہے۔"

وَاِذَا ثَبَتَ اَنَّ لِمَا يَعْتَادُهُ الصُّوْفِيَّةُ مِنْ اِجْتِمَاعِهِمْ عَلَى الْاَذْكَارِ وَالْاَوْرَادِ بَعْدَ الصُّبْحِ وَغَيْرِهٖ، اَصْلًا صَحِيْحًا مِّنَ السُّنَّةِ وَهُوَ مَا ذَكَرْنَاهُ فَلَا اِعْتِرَاضَ عَلَيْهِمْ فِيْ ذٰلِكَ... (فتاویٰ الحدیثیہ، ۱:۶۵)

"جب یہ ثابت ہو گیا کہ صوفیاء کرام کے صبح وشام کے معتاد اجتماع اور اذکار و اوراد کی اصل سنت صحیح سے ثابت ہے اور اس کا ہم نے ذکر کر دیا ہے تو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

اس باب کی ابتدا میں جو آیت ہم نے پیش کی تھی، اس کی جامع اور مکمل تفسیر 'فتاویٰ الحدیثیہ' کی مذکورہ بالا عبارت سے ہو گئی اور حلقۂ ذکر کی اصل قرآن وحدیث سے ثابت ہو گئی۔

صوفیاء کا معمول قرآن وسنت پر مبنی ہے

فرمایا، صوفی لوگ جو طریقۂ ذکر، وظیفے اور وِرد کرتے ہیں، عین شریعت کے مطابق کرتے ہیں کیونکہ ان سب کی اصل شریعت میں موجود ہے۔ ان کے ذکر اذکار قرآن وسنت کے ارشادات ومعمولات پر مبنی ہیں۔ بیہقی نے حضرت انس ؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ "یہ چیز مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان ذکر کرنے والوں کے ساتھ بیٹھوں جو فجر کی نماز ادا کر کے ذکر (شروع) کریں حتیٰ کہ سورج طلوع ہو جائے، اور میں ذکر کرنے والوں کے ساتھ بیٹھوں عصر کی نماز ادا کرکے حتیٰ کہ سورج غروب ہو جائے۔" (یعنی مغرب کی نماز کا وقت ہو جائے) یعنی نبی اکرم ﷺ فجر سے طلوع آفتاب اور عصر سے مغرب تک حلقۂ ذکر میں بیٹھ کر ذاکرین کے ساتھ مل کر ذکرِ الٰہی کرنے کو دنیا میں سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیثِ مبارکہ کو 'ابوداوٗد' نے روایت کیا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا، "میں ذکر کرنے والوں کے ساتھ بیٹھوں عصر سے مغرب ہو جائے یا فجر کے بعد بیٹھوں تو سورج طلوع ہو جائے اور ان کے ساتھ اللہ کا ذکر کروں، یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اولادِ اسماعیل سے چار غلام آزاد کروں۔" آپ ﷺ نے دونوں اوقات کے اجتماعی اذکار کو چار غلام آزاد کرنے سے افضل قرار دیا۔

اور ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجالسِ ذکر پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ وہ انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر نزولِ سکینہ ہوتا ہے اور اللہ کی رحمت ان پر سایہ کر لیتی ہے اور اللہ انہیں یاد کرتا ہے۔.....

اور امام احمد اور مسلم نے بیان کیا کہ جب کچھ لوگ ذکرِ الٰہی کے لیے بیٹھتے ہیں، فوراً ہی ملائکہ انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور ان پر اللہ کی رحمت برستی ہے اور نزولِ سکینہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ذکر اپنے مقربین میں فرماتا ہے۔

ابونعیم نے روایت کیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ذاکرین کے متعلق فرمایا کہ "ان پر سکون واطمینان نازل ہوتا ہے، دلوں کو قرار آتا ہے اور فرشتے ان کو اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں، اللہ کی رحمت ان پر سایہ فگن ہو جاتی ہے اور اللہ انہیں یاد کرتا ہے۔" قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ... (البقرہ:۱۵۲) تم مجھے یاد کرو، تم میرا ذکر کرو، میں تمہاری بات کروں گا اور تم سے اعلیٰ مخلوق سے کروں گا۔ اللہ انہیں یاد فرماتا ہے، ان پر اپنا کرم فرماتا ہے۔

اسی ضمن میں احمد ومسلم نے روایت کیا ہے کہ "جو لوگ اللہ کے ذکر کے لیے جمع ہوتے ہیں، مجلسِ ذکر قائم کرتے ہیں، فرشتے انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں، اللہ کی رحمت ان پر چھا جاتی ہے اور ان پر سکینہ یعنی اطمینانِ قلب کا

نزول ہوتا ہے اور اللہ ان سے اعلیٰ مجلس میں ان کا ذکر کرتا ہے۔"

وَاِذَا ثَبَتَ اَنَّ لِمَا يَعْتَقِدُهُ الصُّوْفِيَةُ... یعنی جب یہ ثابت ہوگیا کہ صوفیاء جو ذکر بوقتِ سحر اور بوقتِ شام کرتے ہیں یا فجر سے طلوع آفتاب تک یا عصر سے مغرب یا مغرب سے عشاء تک جن جن اوقات میں جو جو اذکار و اوراد کرتے ہیں، سنتِ کریمہ سے ثابت ہیں۔ پھر اعتراض کا مطلب اور فائدہ کہ جب ایک کام خود نبی کریم ﷺ نے کیا اور حکم دیا اور شریعت میں اس کے لیے باقاعدہ احکام موجود ہیں۔ آپ ﷺ نے اس کام کی فضیلتیں بیان کی ہیں تو اس پر اعتراض سوائے جہالت ولاعلمی کے کیا ہوسکتا ہے۔ اس باب کی ابتدا میں جو آیۂ کریمہ (وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ... الخ (الکہف:۲۸) حلقۂ ذکر کے جائز و برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی تھی، اس کی جامع تفسیر 'فتاوی الحدیثیہ' کی مذکورہ بالا عبارت سے ہوگئی اور حلقۂ ذکر کی اصل قرآن وحدیث سے ثابت ہوگئی۔

قرآن کریم سے حلقۂ ذکر کا ثبوت

تفسیر کلام الملوک ملوک الکلام میں زیر آیت:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً... (ص:۱۸)

بَعْدَ مَا يُحْمَلُ عَلَى التَّسْبِيْحِ الْقَالِيِّ كَمَا هُوَ ظَاهِرُ الْقُرْاٰنِ وَمُؤَيَّدٌ بِكَشْفٍ كَثِيْرٍ مِّنْ اَهْلِ اللهِ تَعَالٰى يُؤْخَذُ مِنْهُ اَمْرَانِ الْاَوَّلُ الْاِجْتِمَاعُ عَلَى الذِّكْرِ تَنْشِيْطًا لِّلنَّفْسِ وَتَقْوِيَةً لِّلْهِمَّةِ وَتَعَاكُسِ بَرَكَاتِ الْجَمَاعَةِ مِنْ بَعْضٍ عَلٰى بَعْضٍ وَالثَّانِيْ صِحَّةُ مَا يَتَخَيَّلُ فِيْ بَعْضِ الْاَشْغَالِ مِنْ اِشْتِغَالِ كُلِّ مَا فِي الْعَالَمِ بِالذِّكْرِ وَلَهٗ تَاْثِيْرٌ عَجِيْبٌ فِيْ جَمْعِ الْهِمَّةِ وَقَطْعِ الْخَطَرَاتِ... (کلام الملوک ملوک الکلام)

"آیتِ قرآنی کی تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حلقۂ ذکر یعنی اجتماعی صورت میں ذکر کرنا مؤید بالقرآن ہے اور صاحبِ تفسیر نے حلقۂ ذکر کے فوائد کی بھی نشاندہی کردی۔ ان میں سے نشاط اور تقویت کا احساس تو عام ہے مگر تعاکس برکات کا مشاہدہ صرف اہل نظر کو ہی ہوسکتا ہے، اور مجموعی طور پر اس کی 'عجیب تاثیر' کی کیفیت الفاظ کے ذریعے بیان نہیں ہوسکتی۔ اور جو لوگ صرف الفاظ سے کھیلتے ہیں انہیں ان کیفیات کا علم ہو تو کیونکر۔ لہٰذا اپنی محرومی کو چھپانے کے لیے انکار کا سہارا لیتے ہیں۔"

قاصر گر کند بر این طائفه طعن قصور
حاشا للّٰہ که بر آرم بزبان این گله را
همه شیرانِ جهاں بسته این سلسله اند
روباه از حیله چساں بگلسد این سلسله را

Scanned with CamScanner

قرآنِ کریم سے حلقۂ ذکر کا ثبوت

تفسیر 'کلام الملوک ملوک الکلام' میں صاحبِ تفسیر، آیت إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ... وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً... کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ''آیتِ قرآنی کی تفسیر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حلقۂ ذکر یعنی اجتماعی صورت میں ذکر کرنا قرآن سے ثابت ہے۔ اس کی تائید خود قرآن کرتا ہے۔ صاحبِ تفسیر نے حلقۂ ذکر کے فوائد کی بھی نشاندہی کر دی کہ ذکر کی بدولت انسان کو ایک سکون و فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ روح و قلب کو تقویت ملتی ہے۔ ذاکر کی شخصیت میں مضبوطی، ٹھہراؤ اور عزم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ فوائد تو وہ ہیں جن کا تجربہ ایک عام انسان کو بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ذکرِ قلبی کے نتیجے میں جو انوارات و برکات منعکس ہو کر قلب تک آتی ہیں، ان کا مشاہدہ صرف اہلِ نظر ہی کو ہو سکتا ہے (مسلسل ذکر یہ نظر بھی عطا کر دیتا ہے بشرطیکہ شیخِ کامل کا ساتھ ہو)۔ اس کی 'عجیب تاثیر' کی کیفیت لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ تجربہ سے حاصل اور محسوس کرنے کی چیز ہے۔ جو لوگ محض الفاظ کی بازی گری کرتے ہیں، انہیں ان کیفیات کا علم ہو تو کیونکر۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی اس محرومی کو چھپانے کے لیے انکار کا سہارا لیتے ہیں۔''

قاصر گر کند بر این طائفه طعن قصور
حاشا للّٰه که بر آرم بزبان این گله را
همه شیرانِ جهاں بسته این سلسله اند
روباه از حیله چساں بگلسد این سلسله را

ترجمہ: اگر ایک ناسمجھ اس گروہ پہ خوامخواہ طعن و تشنیع کرے تو اللہ کی قسم میں وہ الفاظ اپنی زبان پر نہیں لاتا دنیا کے سارے شیر (اولوالعزم، بہادر لوگ) اس سلسلے کے ساتھ منسلک ہیں لومڑی کس طرح اس سارے سلسلے کو اپنی مکاری سے ضائع کر سکتی ہے۔

شاعر نے بزبانِ فارسی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''محروم رہنے والا اگر اس جماعت (جماعتِ صوفیاء) پر طعن کرتا ہے، انہیں قصوروار و موردِ الزام ٹھہراتا ہے تو اللہ کی پناہ! میں اس قسم کی بات زبان پر نہیں لا سکتا۔ یہ سلاسلِ اولیاء، یہ ذکر و اذکار کے حلقے، دنیا کے سارے شیر انہی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ محبتِ الٰہی کا حوصلہ شیر دلوں کا کام ہے، لومڑی اپنے حیلوں سے اس زنجیر کو کیسے پگھلا سکتی ہے؟ یعنی عہدِ مبارکِ نبوی ﷺ سے لے کر آج تک جتنے جلیل القدر علماء و اولیاء، اعلیٰ درجات کے حامل لوگ گزرے ہیں، سارے انہی سلاسل میں ہیں، اب کوئی کم فہم لومڑی کی طرح حیلے کر کے اس زنجیر کو کیسے پگھلا سکتا ہے؟

Scanned with CamScanner

باب (15)

فضیلت ذکرِ الٰہی

ذکرِ الٰہی تمام عبادات سے افضل ہے

قرآن مجید میں ذکرِ الٰہی کے صلہ میں ایک ایسی نعمت کا وعدہ دیا گیا ہے جس سے بڑی نعمت مومن کے سوا کوئی نہیں ہوسکتی۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ... (البقرہ:۱۵۲)

یہ وعدہ صرف ذکرِ الٰہی کے ساتھ مختص ہے، اور ظاہر ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ یاد کرے اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ... (العنکبوت:۴۵)۔ واقعی اگر ذکرِ الٰہی سب سے بڑی نعمت نہ ہوتی تو اس کے صلے میں اَذْکُرْکُمْ کی نعمتِ غیر مترقبہ کیونکر مل سکتی تھی؟

ذکرِ الٰہی تمام عبادات سے افضل ہے

"قرآن مجید میں ذکرِ الٰہی کے صلہ میں ایک ایسی نعمت کا وعدہ کیا گیا ہے جس سے بڑی نعمت مومن کے لیے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔" یعنی ذکرِ الٰہی کا صلہ، معاوضہ یا اجر۔ اللہ نے وہ چیز مقرر فرمائی ہے جو کسی بھی اور عبادت کے صلے میں نہیں ملتی۔ وہ نعمت نعمتوں میں سب سے بڑی ہے، فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ... "تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔" اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ "میں تمہیں یاد کروں گا" صرف ذکرِ الٰہی ہی کا صلہ ہے۔ یہ وعدہ صرف ذکرِ الٰہی کے ساتھ ہے، اور ظاہر ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ یاد کرے اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہوسکتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہے، وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ... اور یقیناً اللہ کا ذکر بہت ہی بڑا ہے۔ اللہ کی ذات بڑی عظمت والی ہے اور اُس ذات کا ذکر بہت عظیم ہے۔ "اگر ذکرِ الٰہی سب سے بڑی عبادت نہ ہوتی تو اس کے صلے میں اَذْکُرْکُمْ... کی نعمتِ غیر مترقبہ کیونکر مل سکتی تھی۔" یعنی اگر ذکرِ الٰہی سب عبادتوں سے افضل نہ ہوتا تو اس کے اجر میں یہ انعام کیسے ملتا کہ "میں تمہارا ذکر کروں گا۔" اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ذکرِ الٰہی کر لیا تو پھر باقی عبادتوں کی ضرورت نہیں۔ ہر عبادت اپنے وقت پر ضروری ہے۔ فرض، فرض ہے؛ سنت، سنت ہے؛ اور نفل، نفل ہے۔ ہر عبادت کا اپنا ایک مقام ہے اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اگر کوئی دسویں منزل بنا لے تو نچلی نو منزلوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ بنیاد سمیت نچلی نو منزلیں قائم ہوں گی تو دسویں منزل بھی قائم رہے گی۔ فرائض، سنن و نوافل کے بعد جو وقت بچتا ہے، وہ سارا ذکرِ الٰہی میں صرف ہو تو یہ سب سے اعلیٰ عبادت ہے۔ بعض نادان جاہل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو ذکر کرتا ہے اسے نماز روزے کی ضرورت نہیں رہتی، اور وہ ایسے لوگوں کو ولی مانتے ہیں جو نماز روزہ چھوڑے بیٹھے ہیں۔

Scanned with CamScanner

حضوراکرم ﷺ ہروقت ذکرالٰہی میں مشغول رہتے تھے

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ...

(الصحيح المسلم مع شرح كامل النووي، كتاب الحيض، باب ذكر الله تعالى في حال الجنابة وغيرها، ۱:۱۶۲)

"حضور مقبول ﷺ ہروقت ذکرالٰہی میں مشغول رہتے تھے۔"

فائدہ: لفظ "احیان" جمع ہے، اور قاعدہ ہے کہ اضافت جمع کی اپنے مابعد کی طرف استغراق حقیقی کا فائدہ دیتی ہے۔ پھر اس پر بجائے افراد لفظ 'کل' بھی داخل ہے۔ لہٰذا تمام اوقات میں آپ ذکرالٰہی کرتے تھے۔ اور تمام اوقات میں بول و براز، جماع، اکل و شرب، نیند اور دوسرے مشاغل بھی شامل ہیں۔

كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالَى: إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا... (المزمل: ۷)

كُلِّ أَحْيَانِ... میں ذکر کرنے سے مراد ذکرِ قلبی ہی ہوسکتا ہے، اور استغراق حقیقی کی وجہ سے اپنے اوقات میں ذکرِ لسانی کو بھی شامل ہوگا۔ خیال رہے کہ یہاں استغراق عرفی یا اضافی نہیں کیونکہ قرینہ مخالطہ الجنب موجود ہے چونکہ ایسی حالت میں ذکرِ لسانی ناجائز ہے، اس لیے لازماً ذکرِ قلبی مراد ہوگا۔

حضوراکرم ﷺ ہروقت ذکرالٰہی میں مشغول رہتے تھے

سیدہ عائشہ صدیقہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ حضوراکرم ﷺ ہمہ وقت ذکرالٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ لفظ احیان (ہر وقت) جمع ہے حین (ایک وقت) کی۔ قاعدہ ہے کہ اگر جمع کا صیغہ اپنے مابعد (ہ) کی طرف مضاف ہوتو وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے جسے استغراق کہتے ہیں۔ یہ نکرہ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جس طرح نکرہ میں تعیین نہیں ہوتی، اسی طرح استغراق میں بھی تعیین نہیں ہوتی اس لیے أَحْيَانِهِ... میں سارے کا سارا وقت آگیا۔ پھر اس پر لفظ "كُلِّ" بھی داخل ہوگیا جو ہر چیز کو شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ تمام اوقات میں ذکرالٰہی کرتے تھے۔ کوئی ایک لمحہ بھی كُلِّ أَحْيَانِهِ... سے باہر نہیں جاتا تھا۔ تو جب كُلِّ (تمام اوقات میں) کہے تو زندگی کے جتنے کام ہیں وہ سب شامل ہیں، کھانا پینا، نیند اور تمام دوسرے مشاغل شامل ہیں۔

جیسے اللہ کریم نے سورۂ مزمل میں ارشاد فرمایا: إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا... "بے شک آپ کے لیے دن میں بے پناہ مصروفیات ہوتی ہیں۔" جب خود قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ کا دن بہت مصروف گزرتا تھا۔ تعلیم و تبلیغ دین، لوگوں کے ساتھ بات چیت اور عبادات۔ لہٰذا ہر حال میں تو ذکرِ قلبی ہی ہوسکتا ہے کیونکہ زبان دوسرے کاموں

میں مصروف ہے، ہاتھ پاؤں دوسرے امور میں مصروف ہیں۔ ایسے حال میں دل ہی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوسکتا ہے۔
”اور استغراقِ حقیقی کی وجہ سے ذکرِ لسانی بھی (اپنے اوقات میں) شامل ہوگا۔“ لفظ 'احیانٌ' پر عموم مجازی نہیں، حقیقی ہے۔ یعنی حقیقتاً سارے کا سارا وقت، ساری زندگی کا ہر لمحہ اس میں آجاتا ہے۔ تو اس میں ذکرِ لسانی بھی آجائے گا یعنی نماز، تلاوتِ آیات اور تبلیغِ دینِ حق وغیرہ۔ یعنی آپ ﷺ لسانی یا قلبی طور پر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے اور آپ ﷺ کا قلبِ اطہر پوری حیاتِ طیبہ میں ہمہ وقت متوجہ الی اللہ رہا۔ ”خیال رہے کہ یہاں استغراق عرفی یا مجازی اضافی نہیں کیونکہ قرینہ مخالطۃ الجنب موجود ہے، چونکہ ایسی حالت میں ذکرِ لسانی ناجائز ہے، اس لیے لازماً ذکرِ قلبی مراد ہوگا۔“ یعنی لفظ 'کُلِّ اَحْیَانِہٖ...' میں جب وقت کی جمع کثیر کی اضافت، ضمیر متصل واحد غائب 'ہٖ' کی طرف کی گئی ہے تو 'سارا وقت' اپنے مجازی یا عرفی معنوں (جیسا کہ ہم محاورۃً کسی چیز کی زیادہ مقدار بتانے کے لیے کہہ دیتے ہیں)، میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی 'سارا وقت' سے مراد ساری زندگی کا کل وقت ہے جس میں کھانا پینا، رفع حاجت، سونا اور میاں بیوی کے انتہائی تعلق کے اوقات بھی شامل ہیں۔ ان سب میں ذکرِ لسانی تو ممکن نہیں، بلکہ بعض حالات میں ناجائز ہے۔ یقیناً یہ ذکرِ قلبی ہے جسے کسی حال میں روکا نہیں جاتا۔

حضور ﷺ نے ذکرِ الٰہی کو سب سے افضل عبادت فرمایا

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ: اَیُّ الْعِبَادَۃِ اَفْضَلُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ؟ قَالَ الذَّاکِرُوْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا، قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ! وَ مِنَ الْغَازِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ قَالَ لَوْ ضَرَبَ بِسَیْفِہٖ فِی الْکُفَّارِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ حَتّٰی یَنْکَسِرَ وَ یَخْتَضِبَ دَمًا لَکَانَ الذَّاکِرُوْنَ اللّٰہَ اَفْضَلَ مِنْہُ...

(کتاب الاذکار، باب مختصر فی احرف مما جاء فی فضل الذکر غیر مقید بوقت، ۲۳)

”حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سی عبادت اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے افضل ہوگی؟ فرمایا، اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والوں کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ کیا مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی؟ فرمایا اگر مجاہد فی سبیل اللہ کفار اور مشرکین پر تلوار چلائے، حتیٰ کہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون سے لتھڑ جائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والے افضل ہیں۔“

حضور اکرم ﷺ نے ذکرِ الٰہی کو سب سے افضل عبادت فرمایا

ترمذی کی روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ سے عرض کیا گیا کہ قیامت کے دن کون سی عبادت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل ہوگی؟ روزِ حشر کس عبادت پر سب سے زیادہ انعام واکرام ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کو یاد

کرنے والوں کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔ عرض کیا گیا کہ کیا مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ؟ کیونکہ مجاہد جب جہاد کرتا ہے، وہ زخم کھاتا ہے یا شہید ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجاہد فی سبیل اللہ کفار اور مشرکین پر تلوار چلائے، یہاں تک کہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون سے لتھڑ جائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والے افضل ہیں۔

ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث مبارکہ میں قیامت کے دن سب سے افضل قرار دی جانے والی عبادت و عمل ذکر الٰہی قرار پایا تو ظاہر ہے کہ اجر و انعام کے لحاظ سے ذکر الٰہی تمام اعمال سے سبقت لے جانے والا ہوگا۔

ذکر الٰہی جانی اور مالی عبادتوں سے افضل ہے

عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ اَعْمَالِكُمْ وَ اَزْكٰهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَ اَرْفَعِهَا فِيْ دَرَجَاتِكُمْ وَ خَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَ الْوَرِقِ وَ خَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَهُمْ قَالُوْا: بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! قَالَ: ذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى...(كتاب الاذكار، باب مختصر في احرف مما جاء في فضل الذكر غير مقيد بوقت: ۲۴)

قَالَ الْحَاكِمُ فِيْ كِتَابِهِ الْمُسْتَدْرِكِ عَلَى الصَّحِيْحَيْنِ هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْاَسْنَادِ...

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو سب سے افضل ہو، جس کا ثواب اللہ کے ہاں سب سے زیادہ ہو، جو تمہارا درجہ سب سے بلند کردے اور وہ عمل کرنا سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ پسندیدہ ہو، اور جو دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے سے بھی افضل ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور ضرور فرمائیے۔ فرمایا، اللہ کا ذکر سب سے افضل ہے۔"

ذکر الٰہی جانی اور مالی عبادتوں سے افضل ہے

حضرت ابی الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو سب سے افضل ہے، جس کا ثواب اللہ کے ہاں سب سے زیادہ ہو، جو تمہارا درجہ سب سے بلند کر دے، وہ عمل سونا چاندی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے اور دشمنانِ دین سے جنگ اور ان کو قتل کرنے سے بھی افضل ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عرض کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ کا ذکر سب سے افضل ہے۔" کیونکہ ذاکر یہ سارے کام بھی کرتا ہے، یعنی یہاں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ذاکر عملی زندگی سے الگ ہو جاتا ہے۔ اصل غلط فہمی یہیں سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ تصوف یا سلوک گوشہ نشینی کا نام ہے۔ صوفی یا ذاکر کوئی کام نہیں کرتا۔ کسی سے بات نہیں کرتا۔ بلکہ جہلاء کے نزدیک تو یہ ہے کہ اہل اللہ یا اولیاء اللہ تو بس جنگلوں میں رہتے ہیں،

Scanned with CamScanner

کھاتے پیتے نہیں، لباس سے بے نیاز، کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ ایسی ہی خرافات صوفیاء سے منسوب کی جاتی ہیں۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ذکرِ الٰہی، ذاکر کو جو کام بھی وہ کرتا ہے، اس کے کرنے کی زیادہ قوت واستعداد عطا کرتا ہے۔ میدانِ جہاد میں ذاکر بہترین جنگجو، مجاہد ثابت ہوتا ہے۔ کاروبار کرتا ہے تو دوسروں سے کہیں بہتر کاروباری ہوتا ہے۔ مزدوری کرے، ملازمت کرے، خانگی معاملات ہوں، اس کی کارکردگی سب سے عمدہ ہوتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ تائیدِ باری ہوتی ہے، اللہ کی عطا کردہ قوت ہوتی ہے۔ اس سب کے ساتھ ہمہ وقت اس کا ذکر بھی جاری رہتا ہے۔ تو از خود سمجھ آتی ہے کہ ایک شخص جہاد کرتا ہے لیکن اسے ذکرِ قلبی نصیب نہیں، اس کے ساتھ ایک دوسرا مجاہد ہے جس کا قلب ذاکر ہے تو ظاہر ہے کہ وہ پہلے کے مقابلے میں درجہ میں افضل ہوگا۔

ذکرِ الٰہی مومن کے لیے ایک قلعہ ہے

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَمُرُكُمْ بِذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ كَثِيرًا وَإِنَّ مَثَلَ ذٰلِكَ كَمَثَلِ رَجُلٍ طَلَبَهُ الْعَدُوُّ سِرَاعًا فِي أَثَرِهِ فَأَتَى حِصْنًا حَصِينًا فَتَحَصَّنَ فِيهِ، وَإِنَّ الْعَبْدَ أَحْصَنُ مَا يَكُونُ مِنَ الشَّيْطَانِ إِذَا كَانَ فِي ذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ... (مسند احمد، مسند الشامیین، ۲۸:۲۰۵)

"حضور ﷺ نے فرمایا، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو، اس کی مثال ایسی ہے کہ آدمی کے تعاقب میں دشمن تیزی سے آرہا ہو اور وہ آدمی اس سے بچنے کے لیے قلعہ میں پناہ گزین ہو جائے، اسی طرح شیطان کے حملے سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ اللہ کا ذکر ہے۔"

ذکرِ الٰہی مومن کے لیے ایک قلعہ ہے

یعنی نبی کریم ﷺ نے خود کثرتِ ذکر کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ جس طرح دشمن سے بچنے کے لیے کوئی قلعہ میں پناہ لیتا ہے، اپنے آپ کو قلعہ بند کر لیتا ہے اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شیطان سے بچنے کے لیے اللہ کا ذکر قلعہ کا کام دیتا ہے۔ ذاکر قلب شیطان کی بات اتنی آسانی سے نہیں مانتا۔ ذکرِ الٰہی شیطان کے حملوں سے انسان کی حفاظت بالکل ایسے ہی کرتا ہے جیسے قلعے کی فصیل دشمن کو اندر آنے سے روکتی ہے۔

ذکرِ الٰہی سے غفلت شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے مترادف ہے

قَالَ تَعَالٰی: وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ... (الزخرف:۳۶)

"جو شخص ذکرِ الٰہی سے آنکھ چرا لے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں سو وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی:

اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِکْرَ اللّٰهِؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ... (المجادلہ:۱۹)

''ان پر شیطان نے پورا تسلط کرلیا ہے سو اس نے ان کو خدا کی یاد بھلا دی۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔''

ان دونوں آیتوں سے واضح ہوگیا کہ اللہ کی یاد سے غافل ہونا شیطان سے تعلقات استوار کرنا ہے، اور اللہ سے تعلق توڑنا اور شیطان سے رشتہ جوڑنا ہے۔ جو ذکر سے غافل ہوا، حزب اللہ سے نکل گیا اور حزب الشیطان میں داخل ہوگیا۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا...

ذکرِ الٰہی سے غفلت شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے مترادف ہے:

سورۂ زخرف میں ارشادِ باری ہے ''جو شخص یادِ الٰہی سے آنکھ چرالے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں سو وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔'' یعنی جو ذکرِ الٰہی سے اعراض کرے اور اسے غیر ضروری سمجھے تو ذکرِ الٰہی نہ کرنے کی وجہ سے اللہ اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو عمر بھر کے لیے اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ دوسرا ارشاد سورۂ مجادلہ میں ہے کہ ''ان پر شیطان نے تسلط جما لیا اور انہیں اللہ کی یاد بھلا دی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔'' یعنی ان پر شیطان نے غلبہ حاصل کرلیا اور اس کے غلبے کی جو سب سے زیادہ نقصان دہ صورت ہے کہ دشمن کسی پر قبضہ کرتے ہی، فتح حاصل کرتے ہی سب سے پہلے اس کی قوت ختم کرتا ہے۔ اس کی طاقت کا اصل منبع ختم کرتا ہے، اسی لیے شیطان انسان کی طاقت کے سرچشمہ یعنی ذکرِ الٰہی کو، اسے بھلا دیتا ہے۔ اللہ سے تعلق ٹوٹتا ہے تو شیطان سے جڑ جاتا ہے۔ ذکر کے ختم ہوتے ہی انسان کی وابستگی شیطان سے ہو جاتی ہے، وہ اس کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهَا...

Scanned with CamScanner

باب(16)

توجہ اور تصرف شیخ

گزشتہ کسی باب میں ذکر ہو چکا ہے کہ تصوف وسلوک القائی اور انعکاسی عمل ہے، اس لیے اس راہ پر چلنے اور اس میں ترقی کرنے کے لیے صحبتِ شیخ ضروری ہے، اور شیخ سے اخذِ فیض اور حصولِ توجہ کے لیے اعتماد علی الشیخ نہایت ضروری ہے۔ توجہ، تصرف، ہمت اور جمع خاطر، اس سلسلے کی خاص اصطلاحات ہیں، مگر ان کا ماخذ کتابِ الٰہی ہے۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ... (البقرہ:۸۷)

اَیْ تَغْلِیْبَ مَلَکِیَّتِهٖ عَلٰی بَشَرِیَّتِهٖ... (تفسیر تمہیر الرحمٰن، ۵:۱۱۰، بحوالہ دلائل السلوک، ۱۱۰)

"ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید روح پاک سے کی، یعنی وصفِ ملکیت کو بشریت پر غالب کر دیا۔"

حدیثِ نبوی ﷺ سے اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے:

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَللّٰهُمَّ اَیِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ...

(صحیح المسلم مع شرح کامل النووی، کتاب الفضائل، باب فضائل حسان بن ثابت، ۲:۳۰۰)

"حضور ﷺ نے (حسان بن ثابت کے حق میں) دعا کی کہ یا اللہ! اس کی امداد روحِ پاک یعنی جبرائیلؑ سے فرما۔"

فائدہ:

اس آیت اور حدیث مذکورہ بالا سے تائید و تاثیر باطنی ثابت ہوئی۔ حضرت عیسیٰؑ میں تائیدِ باطنی یوں ظاہر ہوئی کہ اوصافِ ملکیہ سے متصف ہوئے اور ملائکہ کی دنیا میں جا آباد ہوئے، اور وحی کی تفسیر وحی سے کی گئی کہ حضرت حسانؓ بن ثابت کی تائید سے یقیناً تائید باطنی مراد ہے۔ حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ الٰہی! حسانؓ کے دل میں جبرائیلؑ کے القاء و الہام سے کفار کی توہین کرنے کی قوت پیدا کر دے تاکہ وہ ایسے اشعار کہنے پر قادر ہو جائیں۔

توجہ اور تصرفِ شیخ

راہِ سلوک میں شیخ کا کیا کردار وعمل ہے، شیخ سے سالک کو کیا حاصل ہوتا ہے، اس کی توجہ کی کیا حیثیت ہے؟ کیا حقیقت ہے؟ اور یہ کہ اللہ نے شیخ کو کس طرح کا اختیار دیا ہے، کیا تصرف دیا ہے؟ یعنی کیا بناؤ اور بگاڑ اس کے اختیار میں ہے، اس کو تصرف کہتے ہیں۔ "تصوف وسلوک القائی اور انعکاسی عمل ہے۔" یہ بات پہلے بھی واضح کی گئی ہے کہ سلوک از خود طے نہیں ہو سکتا، یہ دل سے دلوں میں القا اور منعکس ہوتا ہے۔ جیسے سورج کے سامنے ایک آئینہ رکھیں، پھر اس کے آگے دوسرا، دوسرے کے آگے تیسرا۔ اسی طرح آئینہ در آئینہ یہ دلوں سے دلوں تک پہنچتا ہے، دیئے سے دیا جلتا چلا جاتا ہے۔ "اس راہ پر چلنے اور اس میں ترقی کرنے کے لیے صحبتِ شیخ ضروری ہے، شیخ سے اخذِ فیض اور حصولِ توجہ کے لیے اعتماد علی الشیخ نہایت

Scanned with CamScanner

۳۔کسی شیخ سے برکات حاصل کرنے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ مرید کو اس کی ذات پر اعتماد ہونا چاہیے۔ یہ اطمینان ضروری ہے۔ ہونا چاہیے کہ اس شخص میں یہ اہلیت ہے کہ مجھے فیض یاب کر سکے۔ اگر یہ اعتماد و اعتبار شیخ کی ذات پر نہیں ہے تو یہ مانع فیض ہے۔ دل ہی طرف متوجہ ہی نہیں تو حاصل کیا کرے گا؟

"توجہ، تصرف، ہمت اور جمع خاطر، اس سلسلے کی خاص اصطلاحات ہیں۔" جب شیخ اپنے قلب سے طالب کے قلب پر کیفیات القا کرتا ہے تو اسے توجہ دینا کہتے ہیں۔ طالب میں اگر استعداد کم بھی ہو تو اگر شیخ اپنی قوت سے اسے مراقبات کروا دے تو اسے طالب پر تصرف کرنا کہتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کی ایک اور اصطلاح 'ہمت' ہے۔ اگر لفظ 'ہمت' شیخ کے لیے استعمال کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ طالب کو کہاں تک مراقبات کرا سکتا ہے۔ لیکن اگر 'ہمت' کا لفظ طالب کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ کہاں تک مراقبات کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ جبکہ چوتھی اصطلاح 'جمع خاطر' اس اطمینان کو کہتے ہیں جو کیفیات حاصل ہونے کے بعد دل کو یقین کی قوت سے بھر دے۔

تصوف کی یہ ساری اصطلاحات قرآنِ کریم سے اخذ کی گئی ہیں۔ جیسے قال تعالیٰ: وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ... (البقرہ: ۲۵۳)، اَیْ تَغْلِیْبَ مَلَکِیَّتِهٖ عَلٰی بَشَرِیَّتِهٖ... یعنی "ہم نے عیسیٰؑ کی تائید روح پاک (جبرائیلؑ) سے کی، یعنی انؑ کے وصفِ بشریت پر وصفِ ملکیہ کو غالب کر دیا۔" انسان میں اغلب تو اس کی بشریت ہوتی ہے اور بشریت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب اللہ کرم فرماتا ہے، یا شیخ توجہ کرتا ہے تو اللہ کا یہ احسان ہوتا ہے کہ جو فرشتے کے سے اوصاف ہیں وہ جلا پاتے ہیں اور بشری خصوصیات مغلوب ہو جاتی ہیں، اوصافِ ملکوتی غالب آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے کہ ہم نے روح القدس سے ان کی مدد فرمائی اور اس طرح ان کی بشریت پر ان کی ملکیت کو غالب کر دیا۔ ہر انسان میں دو خصوصیات ہوتی ہیں، بشری اور ملکوتی۔ روح عالمِ امر سے ہے، اس میں ملکوتی اوصاف ہوتے ہیں، فرشتوں جیسے اوصاف۔ جس طرح رمضان شریف کی بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ بندہ سحری سے مغرب تک کھانا پینا موقوف کر دیتا ہے اور یہ خصوصیت فرشتے کی ہے کہ کھاتا پیتا نہیں، تو گویا روزے سے بندے کی بشریت کو کمزور کرنا اور روح کے ساتھ وابستہ ملکوتی اوصاف کو غالب کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تو اس طرح اللہ جو خصوصی کرم فرماتا ہے اس کی سند قرآن سے حضرت عیسیٰؑ کے قصے میں ملتی ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ "ہم نے روح القدس سے انؑ کی مدد کی۔" اس سے مراد ہے کہ ان کی بشریت ملکیت سے مغلوب کر دی۔

اس آیت اور مذکورہ بالا حدیث سے قلبی تاثیر اور باطنی تائید و امداد ثابت ہوتی ہے۔ "حضرت عیسیٰؑ میں امدادِ باطنی یوں ظاہر ہوئی کہ اوصافِ ملکیہ سے متصف ہوئے اور ملائکہ کی دنیا میں جا آباد ہوئے۔ اور وحی کی تائید وحی سے کی گئی کہ حضرت حسانؓ کی تائید باطنی کی گئی۔" اسی طرح حسان بن ثابتؓ شاعر تھے۔ بدر کی شکست کھانے کے بعد مشرکینِ مکہ مزید اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے اور انہوں نے (نعوذ باللہ!) آپ ﷺ کی ہجو لکھی۔ آپ ﷺ نے حسانؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ کفار کی ہجو کا جواب لکھیں اور دعا فرمائی کہ "اے اللہ! حسان کو جبرائیلؑ کے ذریعے مدد دے۔" شاعری القا و الہام ہے۔ جبرئیلؑ کے القا و الہام سے آپؓ کے کلام میں کفار کی ہجو و توہین کی زبردست قوت پیدا ہو جائے اور کفار کی توہین کرنے والے اشعار کہنے پر

Scanned with CamScanner

قادر ہو جائیں۔ یہ دعائے رسول ﷺ تھی جو یقیناً پوری ہوئی اور حسان بن ثابتؓ نے کفار کی ہجو کا منہ توڑ جواب دیا۔

قرآن مجید سے القا اور تصرفِ باطنی کی چند مثالیں

قَالَ اللهُ تَعَالىٰ: اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ (آل عمران:۱۰۳)

"جب تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی۔ سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔"

وَقَوْلُهٗ تَعَالىٰ: اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ (الانفال:۱۲)

"اُس وقت کو یاد کرو جبکہ آپ کا رب فرشتوں کو حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں، سو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ۔" ایمان والوں کی ہمت بڑھانے اور انہیں ثابت قدم رکھنے کی صورت کیا ہے جس پر فرشتوں کو مقرر کیا گیا؟ یہی کہ ان کے دلوں میں ایسی قوت کا القا کریں کہ ان کے دل قوی ہو جائیں اور کفار کا مقابلہ پوری دلجمعی سے کریں۔

قرآنِ مجید سے القا اور تصرفِ باطنی کی چند مثالیں

سورۂ آلِ عمران میں اللہ مومنین سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے "(یاد کرو اُس وقت کو) جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے۔ پس اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی سو تم اللہ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔" یعنی یہ تصرفِ باطنی ہی ہے کہ دلوں کو بدل دیا۔ دلوں کے ارادوں، سوچ اور پسند و ناپسند کو بدل دیا۔ دل جن کو دشمن سمجھتے تھے، اُن سے محبت کرنے لگے، آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے لگے۔

دوسری آیۂ کریمہ ہے،

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...

"اُس وقت کو یاد کرو جب آپ کا رب فرشتوں کو حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں، سو تم ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ۔" غزوۂ بدر میں فرشتے نازل ہوئے اور فرشتوں کو یہ حکم ہوا تھا کہ ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ اور انہیں ثابت قدم رکھو، میری تائید تمہارے ساتھ ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ فرشتے ایسا القا کرتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کے جانثار خدام کی یعنی مجاہدین کی ہمت جواں ہو جاتی اور ارادے مزید مضبوط ہو جاتے تھے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ثابت قدمی اور بے جگری سے کفار کے ساتھ جنگ کرنے لگتے تھے۔ اس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے کفار کے لشکر کا مقابلہ کر کے فتح حاصل کی۔

اسی طرح شیخ طالب کے دل میں توجہ کے ذریعے کیفیات و انوارات القا کرتا ہے۔ اس کا ثبوت قرآن کی مندرجہ بالا دو آیات میں موجود ہے۔

Scanned with CamScanner

حدیث فعلی میں توجہ اور تصرفِ فعلی کی مثال

حضور اکرم ﷺ جب حرا میں تھے تو حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے اور تین بار فرمایا، اِقْرَأْ، دو دفعہ حضور ﷺ نے جواب دیا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ... مگر تیسری بار حضرت جبرائیلؑ نے سینہ سے لگا کر چھوڑا تو حضور ﷺ نے پڑھنا شروع کر دیا۔ بخاری کی اس حدیث کی شرح میں عارف کامل محدثِ اجل عبداللہ ابن جمرہؒ نے فرمایا ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَاَخَذَنِیْ فَغَطَّنِیْ...الخ ... وَفِیْهِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ اِتِّصَالَ جَرْمِ الْغَطِّ بِالْمَغَطِّ وَضَمَّهٗ اِلَیْهِ (وَهُوَ اِحْدَی الطُّرُقِ الْاِفَاضَةِ) یَحْدُثُ بِهٖ فِی الْبَاطِنِ قُوَّةٌ نُوْرَانِیَّةٌ مُشَعْشَعَةٌ تَكُوْنُ عَوْنًا عَلٰی حَمْلِ مَا یُلْقِیْ اِلَیْهِ لِاَنَّ جِبْرِیْلَ ؑ لَمَّا اِتَّصَلَ جَرْمُهٗ بِذَاتِ مُحَمَّدٍ ﷺ سَیِّدِنَا حَدَثَ لَهٗ مَا ذَكَرْنَاهُ هُوَ مَا اُلْقِیَ اِلَیْهِ وَفَوْقَهٗ لِسَمْعِ خِطَابِ الْمَلَكِ وَلَمْ یَكُنْ قَبْلَ لَهٗ ذٰلِكَ وَقَدْ وَجَدَ اَهْلُ الْمِیْرَاثِ مِنْ اَهْلِ الصُّوْفِیَّةِ الْمُتَّبِعِیْنَ الْمُحَقِّقِیْنَ... (بهجة النفوس، ۱: ۱۵، ۱۶)

"اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دبانے والے کا اتصال اس کے جسم سے ہوا جسے بھینچا گیا، جو ایک طریقہ حصولِ فیض کا ہے تو اس جسم کے اتصال سے باطن میں ایک قوتِ نورانیہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس قوت سے دوسرا شخص اس بوجھ کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب جسمِ جبرائیلؑ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے متصل ہوا تو اس میں وہ کیفیتِ نورانیہ پیدا کر دی جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ مزید یہ کہ فرشتہ کی آواز سنی جو اس سے پہلے نہ سنی تھی اور اہلِ میراثِ متبعینِ سنت محققین صوفیاء نے یہی طریقہ حاصل کیا ہے۔"

فائدہ:

ہمارے سلسلہ میں اس حدیثِ فعلی کی روشنی میں سالک پر ابتدا میں تین بار توجہ کی جاتی ہے اور یہی طریقہ ہمارے ہاں متوارث چلا آتا ہے۔

حدیثِ فعلی میں توجہ اور تصرفِ فعلی کی مثال

حدیثِ فعلی رسول اللہ ﷺ کے عمل کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کے فرمانِ مبارک کو حدیثِ قولی کہا جاتا ہے۔ جو کام آپ نے کیا وہ حدیثِ فعلی ہے۔ حضور اکرم ﷺ جب غارِ حرا میں تھے اور جبرائیلؑ تشریف لائے اور تین بار فرمایا اقرأ... دو دفعہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ... مگر تیسری بار جبرائیلؑ نے آپ ﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا۔ پھر فرمایا "پڑھیے!" تو آپ ﷺ نے پڑھنا شروع کر دیا۔ بخاری شریف میں اس حدیث کی شرح میں عبداللہ ابن جمرہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل امینؑ نے مجھے پکڑا اور سینے کے ساتھ بھینچا۔

Scanned with CamScanner

شیخ کی توجہ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے جبرائیل امینؑ نے حضور اکرم ﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا تو حضور ﷺ کی وحی قبول کرنے کی استعداد جو آپ ﷺ میں تھی، اور ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی، وہ ظاہر ہوگئی۔ سارے کمالات نبوی ظاہر ہونے لگے اور وہ نورانیت جو حضورِ اقدس ﷺ کے وجودِ اطہر میں تھی، اسے جلا مل گئی۔

اسی طرح ہمارے سلسلہ میں آنے والے سالک پر ابتداً تین دفعہ توجہ کی جاتی ہے۔

حدیث ابی بن کعبؓ

مشکوٰۃ میں حضرت ابی بن کعبؓ کا واقعہ ان کی زبانی مذکور ہے:

فَسُقِطَ فِیْ نَفْسِیْ مِنَ التَّکْذِیْبِ وَلَا اِذْ کُنْتُ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ فَلَمَّا رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَا قَدْ غَشِیَنِیْ ضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ فَفِضْتُ عَرَقًا وَ کَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلَی اللّٰہِ...

(مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن، الفصل الاول، ۵:۱۸، ۱۹)

"ابی ابن کعب فرماتے ہیں کہ اسلام کی تکذیب زمانہ جاہلیت سے بھی زیادہ میرے دل میں واقع ہوگئی۔ جب رسول اکرم ﷺ نے مجھے دیکھا تو میرے سینے پر ہاتھ مارا۔ میں پسینہ پسینہ ہوگیا، حالت یہ ہوگئی کہ گویا میں اپنے رب کو دیکھ رہا ہوں۔"

قَالَ صَاحِبُ الْمِرْقَاۃِ: فَلَمَّا نَالَہٗ بَرَکَۃُ یَدِ النَّبِیِّ ﷺ زَالَ عَنْہُ الْغَفْلَۃِ وَ الْاِنْکَارِ وَ صَارَ فِیْ مَقَامِ الْحُضُوْرِ وَ الْمُشَاھَدَۃِ... (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کتاب فضائل القرآن، باب (الفصل الاول) بیان قول ابی کعب---فی الجاھلیۃ، ۵:۱۸)

"صاحب مرقاۃ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے دستِ مبارک کی برکت سے غفلت زائل ہوگئی اور فوراً ہی مقامِ حضور و مشاہدہ حاصل ہوگیا۔"

فائدہ:

(۱) توجہ کی غرض غفلت کو دور کرنا اور نورِ ایمان کو تیز کرنا ہوتا ہے۔

(۲) ابی بن کعبؓ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ توجہ سے انکشاف ہوجاتا ہے۔

(۳) مجاہدات اور ریاضت کے ذریعے سالہا سال اتنا فائدہ نہیں ہوتا جو شیخ کی تھوڑی سی توجہ سے حاصل ہوجاتا ہے۔

(۴) شیخ کی توجہ کے بغیر محض مجاہدات سے منازلِ سلوک طے نہیں ہوسکتے کیونکہ سلوک اور تصوف القائی اور انعکاسی عمل ہے۔

(۵) توجہ کے لیے قلب میں قبولیت کی استعداد کا ہونا ضروری ہے، اس لیے اس اعتراض کی گنجائش نہیں کہ ابو طالب پر رسولِ اکرم ﷺ نے تصرف کیوں نہ کیا؟

Scanned with CamScanner

حدیثِ ابی بن کعبؓ

مشکوٰۃ میں حضرت ابی بن کعبؓ کا واقعہ ان کی زبانی مذکور ہے۔ فرماتے ہیں کہ اچانک میرے دل میں اسلام کا انکار آ گیا۔ تکذیب نے دل میں جڑ پکڑ لی کہ یہ سب کچھ نہیں، بس ایک ڈھونگ ہے۔ اور یہ تکذیب اتنی سخت تھی کہ میں زمانہ جاہلیت میں بھی اس درجہ کا منکر نہ تھا۔ یہ ایک کیفیت تھی جو دل پر وارد ہو گئی۔ نبی اکرم ﷺ نے مجھے دیکھا تو میرے سینے پر اپنا دستِ اقدس رکھا، پھر پھیرا۔ دستِ اقدس رسول ﷺ میرے سینے پر پھرنے کی دیر تھی کہ میں ایک دم پسینہ پسینہ ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ سارا انکار ایک لمحہ میں رفع ہو گیا۔ انکار کی جگہ صرف اقرار نے ہی نہیں لے لی بلکہ مجھے تو حضورِ حق حاصل ہو گیا۔ یہ حالت ہو گئی کہ میں اللہ کریم کو جیسے روبرو دیکھ رہا ہوں۔

یہی اصل ہے مشائخ کی توجہ کی کہ جب وہ اپنے دل کا نور القا کرتے ہیں تو طالب کے دل سے غفلت اٹھتی جاتی ہے اور حضورِ حق، مشاہدۂ حق اور اقرارِ حق آ جاتا ہے۔ اور اس بات کا تجربہ تو ہمارے ہاں تقریباً ہر طالب کو ہوتا ہے کہ جب ماہانہ یا سالانہ اجتماع، ذکر کی مجالس میں لوگ ذکر کرتے ہیں، یا بعض اوقات محض دارالعرفان آ جانے سے ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ دل کی کیفیت بدل جاتی ہے لیکن جب واپس جا کر گھر بار یا کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں تو قلبی کیفیات کچھ اور طرح کی ہو جاتی ہیں۔ اس فرق کی ہر صوفی کو (خواہ وہ ادنیٰ ہے یا اعلیٰ، مبتدی ہے یا منتہی) سمجھ آتی ہے۔

یہ انوارات و برکات سینۂ شیخ سے طالب کے سینے میں منتقل ہوتی ہیں (جیسا کہ حدیثِ ابی کعبؓ سے ظاہر ہے)، یعنی بندہ صرف مجاہدہ کرتا رہے تو ظاہر ہے کہ عبادت کا ثواب تو ملے گا لیکن منازلِ سلوک یا یہ کہ روح اپنے سفر پہ روانہ ہو، اس کے لیے کوئی شیخ چاہیے جو اس راہ سے آشنا ہو، جس میں توجہ دینے کی قوت ہو، تصرف کرنے کی استعداد ہو اور وہ روح کو ساتھ پکڑ کر لے جائے، تب مقامات نصیب ہوں گے ورنہ نہیں۔

یہاں ایک اعتراض اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ ابوطالب جو حضور ﷺ کے چچا تھے اور جنہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی بڑی خدمت و اعانت کی تھی، آخری دم تک حضور ﷺ کے ساتھ ڈٹے رہے لیکن انہیں کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کے نصیب میں تو ایسا حسین لمحہ بھی آیا کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ آپ میرے کان میں کلمہ پڑھ لیں، کسی کو پتا بھی نہیں چل پائے گا اور اللہ کے حضور میں خود آپ کا گواہ رہوں گا اور آپ کو عذاب سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ابوطالب دمِ واپسیں تک نہیں مانے، کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ قریش کی عورتیں مجھے طعنہ دیں گی کہ ابوطالب ڈر گیا اور اس نے توبہ کر لی، سو انکار پر ہی ان کا خاتمہ ہو گیا۔

اب اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اوروں کی غفلت تو حضور ﷺ نے محض دستِ اقدس پھیر کر ہی سینے سے ہٹا دی، ابوطالب کا دل کیوں نہ بدلا؟ تو اعلیٰ حضرتؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کے لیے شرط ہے کہ دل میں قبولیت کی استعداد بھی ہو۔ ابی بن کعبؓ کے دل میں غفلت آئی تو وہ اس کے لیے پریشان اور دکھی تھے کہ میں تو اللہ کی رضا کا طالب ہوں، یہ انکار کی کیفیت کہاں سے آ گئی؟ یعنی محبت و طلبِ الٰہی تو موجود تھی، لہٰذا حضور ﷺ نے دستِ اقدس پھیرا تو حضورِ حق ظاہر

Scanned with CamScanner

ہو گیا، غفلت دور ہو گئی۔ جبکہ ابو طالب کے پاس طلب ہی نہیں تھی، ہدایت کیونکر ملتی؟ اس لیے اس سلسلے میں اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک تو لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ:۲۵۶)، دین میں جبر نہیں۔ ہدایت صرف مانگنے پر ملتی ہے جبکہ دنیا کی باقی چیزیں اولاد، رزق وغیرہ اللہ بن مانگے بھی دے دیتا ہے۔ ہدایت کے لیے طلب شرطِ اول ہے۔

توجہ شیخ

تصوف و سلوک کی خصوصیت منازلِ سلوک اور مقاماتِ سلوک طے کرنا ہے۔ جیسا کہ شامی میں ہے:

اَلطَّرِيْقَةُ هِيَ السِّيْرَةُ الْمُخْتَصَّةُ بِالسَّالِكِيْنَ اِلَى اللهِ تَعَالٰى. مَنْ قَطَعَ الْمَنَازِلَ وَ التَّرَقِّيْ فِي الْمَقَامَاتِ۔۔۔(ردالمختار علی الدر مختار، ۴: ۲۳۹)

اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ شیخ کامل کی توجہ ہے اور یہ ذریعہ محض ایجادِ بندہ نہیں، بلکہ اس کی اصل حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ "فتح الباری شرح بخاری" میں ہے:

قَالَ: هٰذَا الْقَدْرُ مِنَ الْحَدِيْثِ اَصْلٌ عَظِيْمٌ مِّنْ اُصُوْلِ الدِّيْنِ، وَ قَاعِدَةٌ مُّهِمَّةٌ مِّنْ قَوَاعِدِ الْمُسْلِمِيْنَ، وَ هُوَ عُمْدَةُ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ بُغْيَةُ السَّالِكِيْنَ وَ كَنْزُ الْعَارِفِيْنَ وَ اٰدَابُ الصَّالِحِيْنَ۔۔۔ وَقَدْ نَدَبَ اَهْلَ التَّحْقِيْقِ اِلٰى مُجَالَسَةِ الصَّالِحِيْنَ لِيَكُوْنَ ذٰلِكَ مَانِعًا مِّنَ التَّلَبُّسِ بِشَيْءٍ مِّنَ النَّقَائِصِ اِحْتِرَامًا لَّهُمْ وَ اِسْتِحْيَاءً مِّنْهُمْ۔۔۔(فتح الباری، شرح صحیح بخاری، باب: سوال جبرئیل النبی ﷺ عن الایمان ـــــ الخ، ۱: ۱۲۰)

"فرمایا، یہ حدیث (جبرئیلؑ، حدیثِ احسان) اصولِ دین میں سے عظیم اصل ہے اور قواعدِ مسلمین میں سے ایک اہم قاعدہ ہے۔ اور یہ حدیث صدیقین کی معتمد علیہ اور سالکوں کی مطلوبہ چیز ہے، اور عارفوں کا خزانہ اور صلحاء کے آداب میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء محققین نے صلحاء کی مجالس کی ترغیب دلائی ہے تاکہ ان اولیاء اللہ و صلحاء کی مجالس عیوب و نقائص پیدا ہونے میں رکاوٹ بن جائیں، جس کی وجہ ان صلحاء کا احترام یا اُن سے حیا کرنا ہوگا۔"

اور "تحفۃ القاری" میں توجہ صوفیاء کا واضح ثبوت بیان ہوا ہے:

فَاَخَذَنِيْ وَ فَغَطَّنِيْ اَيْ ضَمَّنِيْ وَ عَصَرَنِيْ قَالَ عُلَمَاءُ الشَّرِيْعَةِ كَانَ هٰذَا الْغَطُّ ضَرْبًا مِّنَ التَّنْبِيْهِ لِاِحْضَارِ الْقَلْبِ لِيُقْبِلَ بِكُلِّيَّتِهٖ فِيْ مَا يُلْقٰى عَلَيْهِ وَ اِلَيْهِ وَ قَالَ عُلَمَاءُ الطَّرِيْقَةِ كَانَ هٰذَا الْغَطُّ تَوَجُّهًا بَاطِنِيًّا لِاِيْصَالِ الْفَيْضِ الرُّوْحَانِيْ وَ تَغْلِيْبِ الْمَلَكِيَّةِ عَنِ الْبَشَرِيَّةِ۔۔۔

(تحفۃ القاری شرح صحیح بخاری، باب: سوال جبرئیل النبی ﷺ عن الایمان۔۔۔ الخ، ۱: ۲۱)

"پس جبرئیلؑ نے مجھے پکڑا اور سینہ سے لگایا اور بھینچا۔ علمائے ظواہر کہتے ہیں کہ یہ بھینچنا دل کو متوجہ کرنے کے لیے ایک قسم کی تنبیہ تھی کہ جو قلب پر القا ہو، وہ اسے قبول کر لے۔ اور علمائے طریقت کہتے ہیں کہ یہ سینے سے لگانا حصولِ فیض کے لیے

Scanned with CamScanner

باتمام توجہ جہتی اور بشریت پر ملکیت کو غالب کرنا مقصود تھا۔"

الغطة الاولى فيتخلى عن الدنيا والفانية ليتفرغ لما يوحى اليه الثالثة للمؤانسة ومثل هذا القبيل التصرف الباطني ثابت بالكتاب والسنة وعليه السادة الصوفية قال الله عز وجل اذ يوحي ربك الى الملائكة اني معكم فثبتوا الذين امنوا اي بالالقاء الخفية والتوجهات الباطنية۔ (ایضا،۱:۲۱)

پہلی مرتبہ بھینچنے سے مقصد دل کو دنیا سے خالی کرنا تھا، دوسری مرتبہ وحی کے لیے دل کو فارغ کرنا تھا اور تیسری مرتبہ انس پیدا کرنے کے لیے تھا۔ اسی طرح تصرفِ باطنی قرآن وسنت سے ثابت ہے اور اسی پر صوفیائے کرام کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جب تیرے رب نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایمانداروں کو ثابت قدم رکھو۔" یعنی القاء اور توجہِ باطنی سے ثابت قدم رکھو۔"

ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں اسی حدیث کے مطابق مبتدی سالک کو تین مرتبہ توجہ دی جاتی ہے۔ پہلی توجہ سے مقصد روحانی شکل کی درستی ہوتی ہے، دوسری دفعہ رفعِ نحوست کے لیے اور تیسری بار تنویرِ قلب کے لیے۔ اسی سے سالک میں مقامات ومنازلِ سلوک طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے توجہ شیخِ کامل کے بغیر یہ منازل طے نہیں ہو سکتے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں موجود ہے:

عَنْ يَعْلَى فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسُتِرَ بِثَوْبٍ فَقُلْتُ لِعُمَرَ وَدِدْتُ أَنِّي قَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَقَدْ أَنْزَلَ اللهُ عَلَيْهِ الْوَحْيَ... فَقَالَ عُمَرُ: تَعَالَ أَيَسُرُّكَ أَنْ تَنْظُرَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ أَنْزَلَ اللهُ عَلَيْهِ الْوَحْيَ؛ قُلْتُ نَعَمْ... فَرَفَعَ طَرَفَ الثَّوْبِ، فَنَظَرْتُ إِلَيْهِ لَهُ غَطِيطٌ وَأَحْسِبُهُ قَالَ غَطِيطُ الْبَكْرِ...

(صحيح البخاري، ابواب العمرة، باب يفعل بالعمرة ما يفعل بالحج، ۱:۲۴۱)

"پس اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر وحی نازل کی اور آپ نے کپڑا لپیٹ لیا۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کو اس حالت میں دیکھوں جب آپ پر وحی نازل ہو رہی ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ادھر آ۔ کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ تُو نبی کریم ﷺ کو اس حالت میں دیکھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر وحی نازل کر رہا ہو؟ میں نے کہا، ہاں۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کپڑے کو ایک جانب سے اُٹھایا۔ پس میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ غطیط کی حالت میں تھے، اور میرا خیال ہے کہ نوجوان اونٹ کی غطیط کی سی کیفیت تھی۔"

غطیط کے معنی حبسِ دم ہے۔ معلوم ہوا کہ وحی کی حالت میں حضور ﷺ پر حبسِ دم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ حبسِ دم سے ذکر کرنے اور چادر لپیٹ کر ذکر کرنے کی اصل اس حدیث میں موجود ہے۔ صوفیاء جو مراقبہ کراتے ہیں جس کا مطلب فیضِ الٰہی کا انتظار ہے، وہی کیفیت ہے جو نبی ﷺ کو اُس وقت ہوتی ہے جب نزولِ وحی کے وقت احکامِ الٰہی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ اسی حدیث سے مراقبہ کی اصل بھی ثابت ہے۔

توجہ شیخ

تصوف وسلوک چونکہ سینۂ اقدسِ رسول ﷺ سے برکات، فیوضات اور انوارات نبوت کے حصول کا نام ہے انہی انوارات وبرکاتِ نبوت کے بل پر قربِ الٰہی کی منازل طے کی جاتی ہیں۔ اس لیے تصوف وسلوک کی خصوصیت منازلِ سلوک اور مقاماتِ سلوک طے کرنا ہے۔ جیسا کہ 'شامی' کی جلد چہارم، صفحہ ۲۳۹ پر ہے: "اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ شیخ کامل کی توجہ اور منصب شیخ کوئی بعد کی اختراع وایجاد نہیں بلکہ اس کی اصل حدیث میں موجود ہے۔"

چنانچہ 'فتح الباری شرح صحیح بخاری' میں ہے:

فرمایا، یہ حدیث (جبرئیل، حدیثِ احسان) اصولِ دین میں سے عظیم اصل ہے (یعنی جن بنیادوں پر دین کھڑا ہے، ان میں سے ایک بہت اہم حصہ بُنیاد ہے)۔ اور قواعدِ مسلمین میں سے ایک اہم قاعدہ ہے (اصل اور قاعدہ دونوں بنیاد کے معنیٰ میں آتے ہیں)۔ یہ وہ حدیثِ مبارکہ ہے جس پر صدیقین (جو قربِ الٰہی کی اعلیٰ منازل پر ہیں) کے اعتبار واعتماد کا انحصار ہے۔ اور سالکوں کی مطلوبہ چیز ہے (جو قربِ الٰہی کی منازل طے کرنے کے لیے راہ اور رہبر کا متلاشی ہے، اس کا گوہرِ مراد اسی حدیث پاک میں موجود ہے)۔ اور (یہ حدیث) عارفوں کا خزانہ اور صلحاء کے آداب میں سے ہے (یعنی جو تصوف وسلوک کی قدرومنزلت سے واقف ہیں، اس نایاب چیز کی پہچان اور معرفت رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ حدیثِ مبارکہ ایک خزانے سے کم نہیں کیونکہ اُنہیں معلوم ہے کہ یہ گوہرِ نایاب اہلِ دل کے ہاں کیا قیمت رکھتا ہے۔ صالحین کے اطوار وآداب اس میں پائے جاتے ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء محققین نے صلحاء کی مجالس کی ترغیب دلائی ہے تاکہ ان اولیاء اللہ اور صلحاء کی مجالس عیوب ونقائص پیدا ہونے میں رکاوٹ بن جائیں، جس کی وجہ ان صلحاء کا احترام یا ان سے حیا کرنا ہوگا۔

محقق علمائے کرام نے اولیاء اللہ کی مجالس میں بیٹھنے، ان کی ہم نشینی اختیار کرنے پر بہت زور دیا ہے کیونکہ ان کی توجہ قلوب کے عیب ونقائص دور کر دیتی ہے۔ محبتِ الٰہی کی کیفیت حسب توفیق حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا عقیدہ وعمل درستی کی جانب سفر کرتا ہے۔ یہ سب حاصل کرنے کے لیے اولیاء کا احترام وادب بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر یہ خوش نصیبی حاصل نہیں ہوتی۔

یک زمانہ صحبتِ با اولیا　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا　　(مولانا رومؒ)

اور 'تحفۃ القاری' میں توجہ صوفیاء کا واضح ثبوت بیان ہوا:

فرمایا، پس جبرئیلؑ نے مجھے پکڑا اور سینہ سے لگایا اور بھینچا۔ علمائے ظواہر کہتے ہیں کہ بھینچنا دل کو متوجہ کرنے کے لیے ایک قسم کی تنبیہ تھی کہ جو قلب پر القا ہو، وہ اسے قبول کرلے۔ اس کے برعکس علمائے طریقت کہتے ہیں کہ یہ سینے سے لگانا حصولِ فیض کے لیے باطنی توجہ تھی اور بشریت پر ملکیت کو غالب کرنا مقصود تھا۔ مزید فرماتے ہیں:

(جبرئیلؑ نے نبی کریم ﷺ کو تین بار اپنے سینے سے لگا بھینچا) پہلی مرتبہ بھینچنے سے مقصد دل کو دنیا سے خالی کرنا تھا، دوسری مرتبہ وحی کے لیے دل کو فارغ کرنا تھا اور تیسری مرتبہ اُنس پیدا کرنے کے لیے تھا۔ اس طرح تصرف باطنی

Scanned with CamScanner

قرآن و سنت سے ثابت ہے اور اسی پر صوفیائے کرام کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "جب تیرے رب نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ایمانداروں کو ثابت قدم رکھو۔" یعنی القاء اور توجۂ باطنی سے ثابت قدم رکھو۔

ہمارے سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ میں اسی حدیث کے مطابق مبتدی سالک (وہ سالک جس نے راہِ سلوک پر ابتدائی قدم رکھا ہو) کو تین بار توجہ دی جاتی ہے۔ توجہ ایک اصطلاحِ تصوف ہے جس سے مراد شیخ کا سالک کے قلب پر انوارات منعکس کرنا ہے۔ پہلی توجہ سے سالک کی روحانی شکل کی درستی ہوتی ہے۔ دوسری دفعہ نحوست دور کرنے کے لیے اور تیسری مرتبہ قلب کو روشن کرنے کے لیے۔ گویا یہ انوارات پہلے دوا، پھر شفا اور اس کے بعد غذائے روح بنتے ہیں۔ اسی سے سالک میں مقامات و منازلِ سلوک طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخِ کامل کی توجہ کے بغیر یہ منازل طے نہیں کیے جاسکتے۔

چنانچہ صحیح بخاری میں حدیث پاک موجود ہے کہ:

ترجمہ: پس اللہ کریم نے نبی اکرم ﷺ پر وحی نازل کی اور آپ ﷺ نے کپڑا لپیٹ لیا۔ میں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کو اس حالت میں دیکھوں جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، "ادھر آ، کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ تو نبی کریم ﷺ کو اس حالت میں دیکھے کہ جب اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر وحی کر رہا ہو؟" میں نے کہا، ہاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کپڑے کو (جو آپ ﷺ اوڑھے ہوئے تھے) ایک جانب سے اٹھایا۔ پس میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ غطیط کی حالت میں تھے، اور میرا خیال ہے کہ نوجوان اونٹ کی غطیط کی سی کیفیت تھی۔"

غطیط کے معنی حبسِ دم ہے (دم گھٹنے کی کیفیت)۔ معلوم ہوا کہ وحی کے نزول کے وقت حضور ﷺ پر حبسِ دم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حبسِ دم سے ذکر کرنے اور چادر لپیٹ کر ذکر کرنے کی اصل اس حدیث میں موجود ہے۔ صوفیاء جو مراقبہ کرتے ہیں جس کا مطلب 'فیضِ الٰہی کا انتظار' ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو نبی کریم ﷺ پر اُس وقت طاری ہوتی جب نزولِ وحی کے وقت آپ ﷺ کو احکامِ الٰہی کا انتظار رہتا۔ اسی حدیث مبارکہ سے مراقبہ کی اصل بھی ثابت ہے۔

Scanned with CamScanner

باب (17)

الکشف والالہام

حصولِ علم کے ذرائع

انسان کے لیے حصولِ علم کے ذرائع تین ہیں: حواسِ ظاہری، وہم وعقل اور نورِ بصیرت۔ حواسِ ظاہری سے جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس کی بنیاد احساس اور مشاہدہ پر ہے۔ عقل و وہم سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ 'انتقال من المعلوم الی المجہول' کے طریقہ پر ہوتا ہے اور نورِ بصیرت سے جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کا ذریعہ 'تلقی روحانی عن الغیب' ہے۔ وحی، تحدیث، تفہیم، ذوق، معرفت، علمِ لدنی، مشاہدہ، کشف، الہام اور وجدان تلقی روحانی کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔

وَقَدْ یُسَمّٰی جَمِیْعُ اَنْوَاعِ التَّلَقِّیْ عَنِ الْغَیْبِ مَا عَدَا الْوَحْیِ الْکَشْفَ وَ الْاِلْھَامَ...
وَلَمَّا انْقَطَعَ الْوَحْیُ بِخَاتَمِ الْاَنْبِیَاۗءِ صَلَوَاتُ اللّٰہِ عَلَیْہِ لَمْ یَبْقَ مِنْ اَقْسَامِ التَّلَقِّیْ
مِنَ الْغَیْبِ اِلَّا الْکَشْفُ (وَالْاِلْھَامُ)... (عبقات: ۴، ۵)

"وحیِ جلی کے سوا تلقی عن الغیب کی تمام اقسام کا نام کشف والہام رکھا گیا ہے، اور جب وحیِ جلی خاتم الانبیاء ﷺ کے ساتھ منقطع ہوگئی تو اب 'تلقی عن الغیب' کی صرف ایک شکل کشف والہام باقی رہ گئی۔"

علمِ نقلی بھی اسی 'تلقی عن الغیب' سے ہے اور اس کا حصول خبرِ معصوم پر موقوف ہے، اور ہر خبر احتمال جانبین کا رکھتی ہے یعنی صدق کا بھی اور کذب کا بھی۔ یہاں یہ اعتراض بے جا ہے کہ علامہ خیالی نے 'اخبار' میں اصل صدق کو بتایا ہے اور کذب کو ایک احتمالِ عقلی قرار دیا ہے کیونکہ عقل بھی ایک مضبوط دلیل ہے اور احتمال جو ناشی از دلیل ہو، وہ بھی قوت رکھتا ہے اور دلیل کو باطل کر دیتا ہے۔

جس طرح شریعتِ ظاہری میں اخبارِ معصوم کے متعلق صحیح تمیز رکھنے والے علماء موجود ہیں جو صحیح سے سقیم کو الگ کر دیتے ہیں، اسی طرح کشف والہام میں بھی مہارت رکھنے والے صوفیاء عارفین موجود ہیں جو صحیح اور سقیم میں تمیز کر لیتے ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ علومِ ظاہریہ کے پرکھنے والے ماہرین بہت ہیں، مگر کشف والہام کے ماہرین کمیاب ہیں۔ لیکن عدمِ وجدان سے عدمِ وجود لازم نہیں آتا۔ اور اس میں شک نہیں کہ علومِ کشفیہ اور الہامیہ بھی خزانۂ غیب کے علوم سے ہیں جیسے علومِ شرعیہ خزانۂ غیب سے ہیں۔ دونوں میں فرق قطعی اور ظنی کا ہے۔

حصولِ علم کے ذرائع

انسان کے پاس علم حاصل کرنے کے تین ذریعے ہیں۔ حواسِ ظاہری یعنی حواسِ خمسہ، سننے کی حس، دیکھنے، چکھنے، سونگھنے اور محسوس کرنے کی حس۔ یہ حواسِ ظاہری ہیں اور علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جہاں حواسِ ظاہری کام نہ آئیں تو اللہ

Scanned with CamScanner

نے ایک قوت انسان کو اور بھی دے رکھی ہے جسے عقل کہتے ہیں، جس کا ایک درجہ 'وہم' ہے۔ وہم سے مراد ایک خیال ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ پھر عقل اسے حواس کی کسوٹی پر اور بعد میں اپنے اندازے اور طریقے سے پرکھتی ہے اور اس طرح علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ تیسرا اور سب سے معتبر ذریعہ حصولِ علم 'نورِ بصیرت' ہے۔ یہ وہ نور ہے جو اللہ 'نورِ بصیرت' انسان کے قلب میں القا کر دیتا ہے۔ ظاہری آنکھ کا دیکھنا بصارت کہلاتا ہے، دل کی آنکھ سے دیکھنے کو بصیرت کہتے ہیں۔ دل کی آنکھ ظاہری آنکھ سے زیادہ دور تک، زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھتی ہے۔ ظاہری آنکھ کی ایک حد ہے اور وہ صورتِ اشیاء (چیزوں کا ظاہر) دیکھتی ہے۔ دل کی آنکھ کی کوئی آخری حد نہیں اور وہ ان حقائق کو دیکھتی ہے جو ظاہری آنکھ اور عقل کے تصور میں بھی نہیں آسکتے کیونکہ حواسِ خمسہ یا حواسِ ظاہری کی بنیاد احساس اور مشاہدہ پر ہے۔

پانچوں حواس کسی چیز کو اپنے اپنے انداز میں پرکھیں گے۔ آنکھ دیکھ کر، زبان چکھ کر، کان سن کر، ناک سونگھ کر اور ہاتھ محسوس کر کے کسی چیز کی بابت علم حاصل کرے گا۔ عقل اور وہم سے علم حاصل کرنے کا طریقہ یوں ہے کہ ایک چیز کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا ہے، اسی کو بنیاد بنا کر غور و فکر اور تجسس سے اس کی ان خصوصیات کی طرف جایا جاتا ہے جو معلوم نہیں ہوتیں۔ یعنی معلوم سے نامعلوم کی طرف، یا معلوم سے مجہول (جس کے بارے میں کوئی دھندلا سا اندازہ ہو) کی طرف۔ کہیں تخمینہ، کہیں ظن والا معاملہ ہوتا ہے۔ خود ہی اندازہ لگا کر عقل خود ہی اسے ثابت یا رد کر دیتی ہے۔ اپنے مفروضے کو خود ہی پرکھنا یعنی معلوم سے نامعلوم کی طرف چلنا عقل و وہم کا طریقہ تحصیلِ علم ہے۔

''اور نورِ بصیرت سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کا ذریعہ 'تلقی روحانی عن الغیب' ہے۔'' یعنی نورِ بصیرت سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے روحانی طور پر القا کیا جاتا ہے، اور 'تلقی روحانی عن الغیب' وہ علم ہے جو عالمِ غیب سے انسان پر القا ہوتا ہے اور اللہ کریم کی طرف سے القا ہوتا ہے۔ اس کے مختلف انداز ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نظر آنے لگتی ہے، اس کے دل میں کوئی بات مستقل جم جاتی ہے۔

جو علم روحانی طور پر القا کیا جاتا ہے اس کے مختلف انداز ہیں۔ 'وحی' بھی تلقی روحانی (روح پر القا کی گئی) ہے لیکن یہ خاص ہے انبیاءؑ کے ساتھ۔ وحی صرف نبی پر ہوتی ہے۔ اس کے بعد 'تحدیث' ہے، یعنی کسی بات کا بتا دینا۔ جیسے کوئی غائبانہ آواز آگئی، اللہ کریم نے کسی انداز سے بتا دیا، فرشتے نے آکر بتا دیا۔ جس طرح حضرت مریمؑ کے پاس فرشتہ حاضر ہوا کہ اللہ آپ کو بیٹا دے گا، اسے 'تحدیث' کہتے ہیں کہ کوئی بات اللہ نے کسی طریقے سے بتا دی۔ جبکہ 'تفہیم' یعنی اللہ نے کسی چیز کی سمجھ عطا کر دی۔ بندہ کسی چیز پر غور کرے اور من جانب اللہ اسے اس کی سمجھ آجائے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح 'معرفت' ہے یعنی کسی چیز کی خوبیوں، خامیوں سے آگاہ ہو جانا۔ ایک اور طریقہ 'علمِ لدنی' ہے۔ اللہ کی طرف سے علوم کا خزانہ کسی کے قلب میں انڈیل دینا۔ جیسے خضرؑ کے بارے اللہ نے ارشاد فرمایا، عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا... (الکہف:٦٥)۔ موسیٰؑ کو اللہ نے بتایا کہ یہ میرا ایسا بندہ ہے کہ میں نے اپنی طرف سے اس کے دل میں علوم کے خزانے انڈیل دیئے ہیں۔ اور یہ 'علمِ لدنی' ہے۔ 'مشاہدہ' وہ چیز ہے جو (ظاہری آنکھ سے) بظاہر نظر نہیں آرہی ہوتی، اسے نورِ بصیرت سے دیکھ لینا، مشاہدہ کر لینا ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک اور طریقہ 'کشف' ہے۔ کشف اور مشاہدے میں فرق ہوتا ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی چیز اچانک سامنے آجائے جبکہ 'کشف' یہ ہے کہ اس چیز پر سے پردہ ہٹادیا جائے۔ اگر پردہ ہٹا کر دکھائی جائے گی تو اسے کشف کہا جائے گا اور اگر از خود سامنے آئے گی تو 'مشاہدہ' کہلائے گا۔ 'الہام' اللہ کی طرف سے کوئی بات القائی طور پر دل میں آجانا ہے۔ اور 'وجدان' یہ ہے کہ دل میں کوئی بات جم جاتی ہے اور دل کو یقین ہوتا ہے کہ یہ بات یقیناً صحیح ہے۔ 'تعلق عن الغیب' کی یا نورِ بصیرت کی آٹھ دس صورتیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سب سے مضبوط تر صورت 'وجدان' ہے۔ جبکہ 'ذوق' ایک کیفیت ہوتی ہے مثلاً ایک چیز بظاہر بڑی خوبصورت ہے لیکن اس میں مکروہ، ممنوع اور حرام کی آمیزش ہے۔ ہم اسے کسی صاحبِ بصیرت، صاحبِ دل کے سامنے رکھیں گے تو وہ کہے گا کہ کھانا مزیدار تو ہے لیکن میرا دل اسے کھانے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ 'ذوق' ہے کہ بظاہر کوئی دلیل نہیں ہوتی لیکن انسان کو حقیقت کا ادراک ہوجاتا ہے۔

اب یہ جتنی بھی صورتیں ہیں ان کو جمع کرلیں، ان میں دو ہی حالتیں ہیں، کشف ہے یا الہام ہے۔ وحیِ جلی کے علاوہ 'تعلق عن الغیب' کی تمام اقسام کا نام کشف والہام رکھا گیا ہے۔ وحیِ جلی نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاءؑ کے ساتھ منقطع ہوگئی۔ اب قیامت تک کسی پر وحی نہیں آئے گی۔ پھر کشف والہام ہی باقی رہ گیا۔ عیسیٰؑ آسمان سے تشریف لائیں گے، زمین پر باقی زندگی گزاریں گے، شادی کریں گے، اولاد ہوگی، فوت ہوکر روضۂ اطہر میں دفن ہوں گے، یہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے۔ پندرھویں صدی کا چوتھائی حصہ گزر گیا، روضۂ اطہر کے حجرہ میں تین مقدس مزارات ہیں۔ ایک قبر کی جگہ ابھی خالی ہے، عیسیٰؑ وہاں دفن ہوں گے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کو ابوبکرؓ وعمرؓ میرے اور عیسیٰؑ کے درمیان اٹھیں گے۔ تو حضرت عیسیٰؑ جو نبی گزرے ہیں وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے تو انؑ پر وحی نہیں آئے گی۔ کسی بات کی تفصیل کی ضرورت ہوگی، وہ نبی کریم ﷺ سے پوچھیں گے۔ حضور ﷺ پر جو وحی آچکی، اس کا ہی اتباع کریں گے، نئی وحی نہیں آئے گی۔

''اور 'علمِ نقلی' بھی اسی 'تعلق عن الغیب' سے ہے۔'' علمِ نقلی (کتابی علم) وہ علم ہے جو ہمیں نقل ہوکر ملا ہو۔ جیسے کتاب اللہ 'علمِ نقلی' ہیں۔ اللہ کا قرآن حضور ﷺ نے بتایا، صحابہؓ نے لکھا اور وہ نقل ہوکر ہم تک پہنچا۔ اسی طرح حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ بھی 'علمِ نقلی' ہے۔ یہ سب 'تعلق عن الغیب' کی صورتیں ہیں کہ آپ ﷺ کے ارشادات بھی تو وحیِ خفی ہی ہے۔ وحیِ جلی قرآن اور وحیِ خفی حدیث ہے۔ ان کی بنیاد ایک ہی ہے۔

''اور اس کا حصول خبرِ معصوم پر موقوف ہے۔'' یعنی 'علمِ نقلی' کی بنیاد خبرِ معصوم ہے۔ نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی دی ہوئی خبر قرآن ہے، آپ کا فرمایا ہوا حدیث ہے، اور یہ خبرِ معصوم ہے۔ ''اور ہر خبر احتمال جانبین کا رکھتی ہے۔'' کسی بھی خبر میں دونوں طرح کا احتمال ہوتا ہے۔ وہ سچی بھی ہوسکتی ہے، غلط بھی ہوسکتی ہے۔ جبکہ علامہ خیالی کہتے ہیں کہ ہر خبر کی اصل سچائی ہے۔ اس میں جھوٹ بھی ہوسکتا ہے، یہ ایک احتمال (Probabitity) ہے۔ ایسا سوچا جاسکتا ہے لیکن اصل سچ ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ہر خبر میں سچ بھی ہوسکتا ہے، جھوٹ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر احتمال عقلی بھی ہو تو پھر عقل بھی تو ایک مضبوط دلیل ہے اور جس بات کی بنیاد مضبوط دلیل پر ہو اُسے ردّ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا جو

Scanned with CamScanner

خبرِ معصوم حضور ﷺ کے نام سے آئی، جو خبر حضور ﷺ کے ذریعے پہنچی وہ تو سچ تھی لیکن راستے میں لوگوں نے کوشش کی کہ اس میں جھوٹ ملا دیا جائے۔ اس میں سچائی کا بھی احتمال تھا، جھوٹ کا بھی۔ لوگوں نے قرآنِ کریم میں بھی کمی بیشی کرنے کی کوشش کی، اور حدیث شریف میں تو بے شمار موضوع (خود سے گھڑی ہوئی) حدیثیں گھڑ کر حدیث میں شامل کر دی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو بھی محفوظ رکھا اور حدیث کو بھی، اور یہ کام خبرِ معصوم کے متعلق صحیح تمیز رکھنے والے علمائے حق سے لیا گیا جو غلط کو صحیح سے الگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اللہ نے انہیں توفیق دی کہ جب بھی کسی نے خبرِ معصوم میں جھوٹ ملانے کی کوشش کی اُنہوں نے اسے تحقیق کر کے ردّ کر دیا۔

اسی طرح کشف والہام تو باقی ہے۔ اگر کسی کو کشف ہوتا ہے یا اس پر کوئی القا ہوتا ہے یا اسے الہام ہوتا ہے، تو وہ صحیح ہے یا غلط؟ یا اس میں کس حد تک صحت ہے، اس نے کہاں تک صحیح سمجھا، کتنی شیطان نے دخل اندازی کی؟ فرمایا یہ فن صوفیا اور علمائے ربانی کا ہے، یہ اُن کا شعبہ ہے۔ جس طرح علومِ ظاہری میں سچ اور جھوٹ کو الگ کرنے والے علمائے حق موجود ہیں، اسی طرح صوفیاء کا طبقہ بھی رہے گا جو سقیم و صحیح میں تمیز کر سکے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ علومِ ظاہری کو پرکھنے والے علماء زیادہ ہیں جبکہ علومِ باطنی و روحانی کو پرکھنے والے اور اس میں تمیز کرنے والے کمیاب ہیں، خال خال ملتے ہیں لیکن کم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ سوچ لیا جائے کہ یہ لوگ ہیں ہی نہیں۔ 'عدمِ وجدان' سے مراد یہ ہے کہ اگر آپ کو کوئی مطلوبہ شخص مل نہ سکے تو یہ سمجھنا کہ وہ ہے ہی نہیں، غلط ہے۔ وہ کہیں اور ہو سکتا ہے، جہاں ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔

"اور اس میں شک نہیں کہ علومِ کشفیہ اور الہامیہ بھی خزانۂ غیب کے علوم سے ہیں...... دونوں میں فرق قطعی اور ظنی کا ہے۔" علومِ کشفیہ اور الہامیہ بھی اسی خزانۂ غیب سے ہیں جس میں سے علومِ شرعیہ ہیں کیونکہ علومِ شرعیہ بھی تو اللہ نے خزانۂ غیب سے حضور ﷺ کو عطا فرمائے۔ خزانۂ غیب سے قرآنِ کریم نازل ہوا، حدیث مبارکہ آئی، تمام اوامر و نواہی آئے۔ اسی خزانۂ غیب سے صوفی کو کشف والہام عطا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو نبیؑ پر آتا ہے، وہ قطعی ہوتا ہے، جو ولی پر آتا ہے وہ ظنی ہوتا ہے۔ اگر وہ نبیؑ کے حکم کے مطابق ہے تو صحیح ہے، اگر نبیؑ کے بتائے ہوئے طریقے سے ٹکراتا ہے تو جو صوفی نے سمجھا ہے باطل ہو جائے گا۔ اور پھر یہ علم نبیؑ کو براہ راست ملتا ہے، صوفی کو نبیؑ کے اتباع سے ملتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے نبیؑ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا لیکن صوفی، یا نورِ بصیرت رکھنے والے کے درمیان نبیؑ کا اتباع، واسطہ ہوتا ہے۔ صوفی یہ سب نبیؑ کے وسیلے سے حاصل کرتا ہے۔

عدمِ کشف بڑا حجاب ہے:

عدمِ کشف خالق اور مخلوق کے درمیان بڑا حجاب ہے۔

كَمَا قَالَ تَعَالَىٰ: كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ... (المطففین:۱۵)

"کیوں ہرگز نہیں! تحقیق وہ لوگ اپنے رب سے اُس دن روک دیئے جائیں گے۔"

Scanned with CamScanner

قَالَ الرَّازِيُّ: قَدْ ثَبَتَ بِالدَّلَائِلِ الْعَقْلِيَّةِ أَنَّ عَذَابَ الْحِجَابِ أَشَدُّ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَ لِذٰلِكَ قَالَ: كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ... ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ... فَقَدَّمَ الْحِجَابَ عَلَى الْجَحِيْمِ... ثُمَّ إِنَّهُمْ كَانُوْا مَحْجُوْبِيْنَ فِي الْحَالِ فَكَانَ سَبَبُ الْعَذَابِ بِكَمَالِهٖ حَاصِلًا إِلَّا أَنَّ الْاِشْتِغَالَ بِالدُّنْيَا وَ لَذَّاتِهَا كَالْعَائِقِ عَنْ إِدْرَاكِ ذٰلِكَ الْأَلَمِ كَمَا أَنَّ الْعُضْوَ الْخَدِرَ إِذَا مَسَّتْهُ النَّارُ فَإِنَّ سَبَبَ الْأَلَمِ حَاصِلٌ فِي الْحَالِ لٰكِنَّهُ لَا يَحْصُلُ الشُّعُوْرُ بِذٰلِكَ الْأَلَمِ لِقِيَامِ الْعَائِقِ فَإِذَا زَالَ الْعَائِقُ عَظُمَ الْبَلَاءُ فَكَذَا هٰهُنَا إِذَا زَالَ الْبَدَنُ عَظُمَ عَذَابُ الْحِجَابِ... (تفسیر الکبیر، ۶:۳۱۹)

"امام رازیؒ نے فرمایا کہ یہ بات دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے کہ عذابِ حجاب، عذابِ نار سے شدید تر ہے۔ اسی واسطے باری تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا إِنَّهُمْ ...الخ۔ پھر وہ کافر دوزخ میں داخل ہوں گے۔ حجاب کو جحیم سے پہلے بیان فرمایا۔ پھر وہ کافر فی الحال بھی حجاب میں تھے پس سببِ عذاب تو بکمالہٖ موجود ہے، مگر کفار کا دنیا میں مشغول ہونا اور اس کی لذّات میں غرق ہونا فہمِ عذاب میں مانع ہے۔ جیسے ایک عضو مخدر ہو تو اسے آگ کے چھونے سے درد کا احساس نہ ہوگا حالانکہ سببِ عذابِ درد تو موجود ہے لیکن عدمِ شعور بوجہ مخدر ہونے کے ہے اور جب یہ مانع زائل ہو جائے تو عذاب کی شدت کا احساس بڑھ جائے گا۔ کفار کے معاملہ میں بھی حالت یہی ہے کہ جب بدن روح سے الگ ہو جائے گا تو حجاب کا عذاب شدید تر ہو جائے گا۔"

عدمِ کشف بڑا حجاب ہے

قرآنِ کریم میں ہے کہ کشف کا نہ ہونا یا علومِ غیبیہ کا نہ ملنا یا حقائق کا دل پر مترشح نہ ہونا بہت بڑا حجاب ہے۔ یہاں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ صرف جن لوگوں کو مشاہدہ ہوتا ہے وہی کشف والے ہیں بلکہ کشف والوں میں ہر وہ شخص شامل ہے جس کو گناہ کرتے وقت اللہ سے ڈر آجاتا ہے۔ اسے بھی ایک درجے کا حضور حاصل ہے اور وہ جو کہتا ہے "دیکھا جائے گا"۔ اس کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہر وہ بندہ جسے کشف ہوتا ہے یا نہیں، مشاہدہ ہوتا ہے یا نہیں، لیکن جب وہ گناہ کرنے لگتا ہے تو اس پر خوفِ خدا غالب آجاتا ہے اور وہ گناہ کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ بھی اسے ایک طرح کا کشف نصیب ہے، ایک تعلق روحانی ہے، ایک کیفیت اس کے دل پر خزانۂ غیب سے آرہی ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔ سو جن کے درمیان حجاب ہے، جن کو گناہ کرتے ہوئے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ حلال حرام کھائے جا رہے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، لوٹ مار، قتل و غارت کرتے ہیں لیکن کوئی کیفیت دل پر وارد نہیں ہوتی۔ فرمایا، یہ بہت بڑا عذاب ہے، یہ عدمِ کشف، خالق اور مخلوق کے درمیان بہت بڑا حجاب ہے۔ حجاب پردے کو کہتے ہیں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا "قیامت کے دن کفار کو اللہ جل شانہٗ سے حجاب کرا دیا جائے گا۔" کفار کے سامنے پردہ آجائے گا۔

Scanned with CamScanner

امام رازیؒ فرماتے ہیں ''یہ عقلی دلائل سے ثابت ہے کہ یہ حجاب دوزخ کے عذاب سے بڑا عذاب اور دکھ ہوگا، اسی لیے قرآن فرماتا ہے کہ یادرکھو! انہیں اتنا بڑا عذاب دیا جائے گا کہ ان کے سامنے اللہ کی ذات کی طرف سے پردہ حائل ہو جائے گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ انہیں دوزخ میں جھونک دیا جائے گا، تو یہاں امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ دوزخ میں جھونکنے سے پہلے حجاب کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دوزخ میں جھونکنے سے بڑا عذاب حجاب ہے۔ کیونکہ یہ حجاب ہی ہے جو جہنم کے عذاب کا سبب بنتا ہے یعنی دنیا میں جس کے دل پہ حجاب آ گیا، جسے کبھی عظمتِ الٰہی کا احساس ہی نہ ہوا اور وہ ہر گناہ دلیری سے کیے جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دوزخ کی گہرائی میں نیچے سے نیچے اترتا چلا جا رہا ہے۔ تو فرمایا، اللہ کریم نے اسے دوزخ میں جھونکنے سے پہلے ذکر فرمایا ہے:

ثُمَّ اِنَّهُمْ كَانُوْا مَحْجُوْبِيْنَ فِي الْحَالِ فَكَانَ...الخ

سبحان اللہ! وہی بات پھر آگئی، صاحبِ 'تفسیر کبیر' فرماتے ہیں کہ جو گناہ کرتا ہے، اس وقت دوزخ ہی میں ہوتا ہے مگر یہ حجاب ہے جو اسے بے خبر رکھے ہوئے ہے۔ اللہ نے اس کے دل پر پردہ ڈال دیا، حجاب کر دیا۔ مزید فرماتے ہیں، جس طرح کوئی عضو سُن ہو جائے، مثلاً کسی کا انگوٹھا ہی سن ہو جائے پھر اسے دیا سلائی لگائیں، اس پر انگارہ رکھیں، وہ جل جائے گا لیکن درد محسوس نہیں کرے گا۔ تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ درد کا محسوس نہ ہونا اس عارضی سبب کی بنا پر ہے کہ انگوٹھا سن ہو گیا تھا، جب اس کی یہ کیفیت نہ رہے گی تو اسے پتا چلے گا کہ کس طرح کا زخم ہے اور اس میں کتنا درد ہے۔ اسی طرح اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس حجاب کی وجہ سے جو اللہ نے اس کے دل پر ڈال دیا ہے اسے گناہ کا احساس یا گناہ پر پشیمانی نہیں ہوتی۔ جب روزِ قیامت یہ حجاب ہٹے گا اور سیدھا جہنم میں جائے گا تو اسے پتا چلے گا کہ یہ سب کیا ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا کہ یہ بات دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے کہ عذابِ حجاب، عذابِ نار سے شدید تر ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے فرمایا، كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ... پھر اس کے بعد فرمایا، ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ... (المطففین:16) وہ کافر تو فی الحال بھی حجاب میں تھے یعنی دنیا میں بھی اسی حجاب کی وجہ سے وہ کفر پر جمے ہوئے تھے۔ سببِ عذاب تو بکمالہٖ (اپنی انتہا پر) موجود ہے یعنی کفر، اللہ کی نافرمانی، یہ عذاب کا سبب تو موجود ہے۔ ان کے عقائد ان کا کردار ایسا ہے کہ وہ دوزخ ہی میں جل رہے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہر بدکار کا دل بے چین رہتا ہے، بے سکون رہتا ہے۔ ہم جسے Depression کہہ دیتے ہیں، ان کیفیات کا شکار ہو کر بدکار دنیا میں بھی جہنم ہی میں جلتا ہے۔ یہ کیفیات اس عذاب کی علامتیں ہیں جو وہ دنیا میں رہتے ہوئے جھیل رہا ہوتا ہے۔ صرف اس کا دنیا میں مشغول ہونا اور اس کی لذات میں غرق ہونا فہمِ عذاب میں مانع ہے۔ اللہ نے حجاب طاری کر دیا، پردے کے اس طرف کی سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ دنیوی لذات میں غرق ہو گئے، دولت جمع کرتے رہے، شراب و کباب میں وقت بسر ہوتا رہا اور یہ چیزیں کافر کو عذاب کی سمجھ آنے نہیں دیتیں۔ وہ عذاب کو مختلف نام اور وجوہات دیے جاتا ہے، اسی کو حجاب کہتے ہیں۔ جیسے بدن کا کوئی حصہ سُن ہو جائے تو اسے جلنے کا احساس نہ ہو گا حالانکہ وہ تکلیف اپنی جگہ موجود ہے۔ ڈاکٹر جسم کے حصے سُن کر کے چیر پھاڑ کرتے ہیں، زخم سیتے ہیں لیکن جب سُن ہونے کی کیفیت جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ کہاں زخم ہے پھر درد بھی ہوتا ہے۔ ''اسی طرح کافر پر عدمِ معرفت (نہ پہچاننے) کا حجاب آ گیا۔'' یہ جہنم سے بڑا عذاب ہے

Scanned with CamScanner

کیونکہ یہی جہنم میں لے جائے گا۔ جب یہ مانع زائل ہو جائے گا تو عذاب کی شدت کا احساس بڑھ جائے گا۔
کفار کا معاملہ بھی ہے کہ جب بدن روح سے الگ ہو گا تو حجاب کا عذاب شدید تر ہو جائے گا۔ پھر احساس ہوگا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا، پھر اپنے دنیا میں کیے ہوئے اعمال، اپنا کردار یاد آئیں گے اور انتہا کا پچھتاوا ایک بڑے عذاب کی صورت بنے گا۔

حدیثِ نفس اور القائے شیطانی

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِھِمْ... (الانعام:۱۲۱)

اور اس قسم کی متعدد دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کی طرف سے بھی القا و الہام کا سلسلہ برابر جاری ہے مگر اس کے لیے بھی ایک خاص معیار اور شرط ہے۔

کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ھَلْ اُنَبِّئُکُمْ عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ ۝

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ... (الشعرأ:۲۲۱،۲۲۲)

"کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اُترا کرتے ہیں؟

ایسے شخصوں پر اُترا کرتے ہیں جو دروغ گفتار، بدکردار ہوں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ القائے شیطانی بھی اس شخص پر ہوتا ہے جو کفر و شرک و بدعت میں کمال پیدا کر لے۔ جوگیوں پنڈتوں اور دوسرے بے دینوں کی خرافات اسی قبیل سے ہیں۔

کشف کے لیے بنیادی شرائط

(۱) کشف و الہام اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قلبِ سلیم عطا فرمایا ہو کیونکہ قلب سلیم کے باطنی حواس بیدار ہوتے ہیں اور قلب ان کے ذریعے علومِ باطنی کا ادراک کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے انسان ظاہری حواس سے ظاہری علوم کا اکتساب کرتا ہے۔

(۲) شریعتِ حقہ کا کامل اتباع۔

گویا کشف و الہام کے لیے دو شرائط ہیں، ایک وہبی یعنی قلبِ سلیم کا ہونا، ایک کسبی یعنی اتباع شریعت۔ جس شخص میں یہ دونوں شرائط پائی جائیں گی اسے الہامِ خیر اور القائے رحمانی سے نوازا جائے گا۔ جس کا عقیدہ خراب، عمل ناقص اور اخلاص نایاب ہو، اسے کیسے اتنی بڑی نعمت کا مستحق قرار دیا جائے گا؟

حدیثِ نفس اور القائے شیطانی

قرآن کریم میں ارشاد ہے "شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں باتیں ڈالتا ہے، لَیُوْحُوْنَ۔ یہاں بھی لفظ 'وحی' کہا گیا (لغوی معنوں میں) یعنی القائی طور پر بات کرنا، انعکاسی طور پر دل میں ڈالنا۔ شیطان کی طرف سے بھی القا و الہام کا

Scanned with CamScanner

سلسلہ برابر چل رہا ہے لیکن اس نے بھی اس کے لیے اپنا معیار رکھا ہے کہ کوئی شخص برائی و بدکاری کے کس درجے پر ہوتا ہے۔ قرآن نے بھی فرمایا ہے کہ "کیا میں تمہیں بتاؤں کن لوگوں پر شیطان اترتا ہے؟" هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ... شیطان کا نزول کیسے لوگوں پر ہوتا ہے؟ وہ کن لوگوں کے دلوں میں باتیں ڈالتا ہے؟ وہ دو خصوصیات والے ہوتے ہیں۔ وہ بے حد جھوٹ بولنے والے اور بدکردار ہوتے ہیں۔ یعنی القائے شیطانی بھی اس شخص پر ہوتا ہے جو کفر و شرک و بدعت میں کمال پیدا کر لے۔ جوگی، پنڈت یا کوئی عامل بھی اگر محنت و مجاہدہ کرے، کوئی بے دین بدکار بھی تنہائی میں بیٹھے، بھوک پیاس کاٹے تو وہ دور نزدیک کی بات جو دنیا میں ہے، جسے مختلف آلات سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، وہ اس کے قلب پر بھی القا ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ جو ماضی یا مستقبل کی بات بتا دیتے ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جو شیطان انہیں بتاتا ہے۔ جہاں تک شیطان کی رسائی ہے، وہاں تک کا علم انہیں بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے کشفِ الٰہیات کسی بے دین کو نہیں ہو سکتا۔ کشفِ الٰہیات، فرشتے کو دیکھنا، روح کو دیکھنا، برزخ کو دیکھنا یا بالائے آسمان رسائی، یہ ان کے لیے ممکن نہیں۔

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ... الخ (الاعراف: ۴۰)

اللہ نے قانون بنا دیا ہے کہ کافروں کے لیے، بے دینوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔

کشف کے لیے بنیادی شرائط:

کشف کے لیے بنیادی بات اللہ کی عطا ہے۔ اللہ نے ایسا دل دیا ہو جو سلامت ہو، جو دنیا کے علائق (بکھیڑوں) سے محفوظ رہ کر اللہ کی یاد میں رہنے والا ہو یعنی قلبِ سلیم ہو۔ قلبِ سلیم کے حواس بیدار ہوتے ہیں یعنی دیکھنا، سننا، محسوس کرنا، یہاں تک کہ بات کرنا، اس کے اپنے حواس جن سے وہ ادراکِ علومِ باطنی کرتا ہے۔ لیکن قلبِ سلیم تب تک سلامت رہتا ہے جب تک شریعتِ مطہرہ پر پوری کوشش، پوری محنت سے عمل کرنے کی کوشش کرے۔

یعنی کشف والہام کے لیے اللہ کریم نے دو شرطیں رکھی ہیں۔ ایک تو وہبی ہے جو اللہ کریم جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، دوسری کسبی ہے جو محنت کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ وہبی شرط قلبِ سلیم کا ہونا ہے۔ ہر وہ قلب جس میں سلامتی کی استعداد موجود ہے، جس میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے ہر دم ذکرِ الٰہی کرنا چاہیے، مجھے قربِ الٰہی کا وسیلہ تلاش کرنا چاہیے، اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نیکی کرنا اور برائی سے بچنا چاہیے۔ اگر کوئی قلب ایسا سوچتا اور چاہتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں سلامت رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اب اس کے ساتھ دوسری شرط والی صفت شامل ہو جائے جو بندے کی محنت سے تعلق رکھتی ہے یعنی شریعت کا کامل اتباع۔ انسان کے دونوں شرائط پر پورا اترنے کا مطلب ہے کہ بات بن گئی۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا... (العنکبوت: ۶۹) "جو میری ذات کو پانے کے لیے مجاہدہ و محنت کرتا ہے، میں اس کے لیے راستے کھول دیتا ہوں"۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ اللہ ایسے لوگوں کے لیے ہدایت کے راستے اس طرح کھولتا ہے کہ انہیں ایسے بندوں کی صحبت میں پہنچا دیتا ہے جو 'اللہ اللہ' کرتے ہیں، اُسے وہاں وہ کیفیات نصیب ہو جاتی ہیں۔ تو محنت و مجاہدہ سب کو کرنا چاہیے، اس میں کسی بہانہ سازی کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ کا احسانِ عظیم ہے کہ مسلمان گھروں میں پیدا کیا،

Scanned with CamScanner

ورنہ شاید سچ کو تلاش کرنے کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ ہم تو پیدا ہونے کے بعد پہلی بات 'اللہ اکبر' سنتے ہیں۔ دل بالکل ہی سیاہ نہ ہو جائے ورنہ یہ پہلی اذان ساری زندگی اللہ کی اطاعت کی طرف بلاتی رہتی ہے۔ نیکی اور سیدھے راستے پر پیدا ہونا ہی اللہ کی عطا ہے۔ مجاہدہ انسان کی اپنی محنت ہے، پھر ایسے بندے کو کشف والہام خبر اور القائے ربانی نصیب ہوگا۔ لیکن اگر عقیدہ ہی خراب ہو، عمل بھی ناقص ہو، تو جب عقیدہ وعمل گئے تو اخلاص کہاں رہا۔ جب اخلاص بھی گیا تو اتنا بڑا انعام کیسے مل سکتا ہے؟

کشف والہام کی صحت کا معیار

۱۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ کشف کے لیے ایک وہبی چیز یعنی قلب سلیم کا ہونا پہلی شرط ہے، اسی طرح کشف کی صحت کا ایک وہبی معیار، وجدانِ صحیح ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ معدۂ انسانی مکھی کا وجود قبول نہیں کرتا، اور جیسے معدۂ انسانی مکھی کو باہر پھینک دیتا ہے، اسی طرح قلب سلیم القائے شیطانی سے بے چینی محسوس کرتا ہے اور اسے رد کر دیتا ہے۔

۲۔ ہر کشف والہام کو کتاب وسنت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ وحیٔ قطعی سے متصادم ہے تو مردود ہے، اور اگر کتاب وسنت کے مطابق ہے تو صاحب کشف کو یقین رکھنا چاہیے کہ یہ مِن جانب اللہ ہے۔

۳۔ شریعت نے یہ انتظام نہیں کیا کہ ہر امرِ واقعی کی تفصیل بیان کردے۔ ہاں! جس امر کی شریعت نے نفی کر دی وہ منفی ہے اور جس کا اثبات کر دیا وہ مثبت ہے، اور جس امر سے شریعت نے سکوت کیا، وہ نفی اور اثبات دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ پس کشف والہام سے ان دونوں امور میں سے جو چیز ثابت ہوگی وہ حق ہوگی۔ البتہ وہ کشف والہام مردود ہوگا جو شریعت کے منفی کو مثبت بنادے یا مثبت شریعت کو منفی قرار دے۔

پس حصولِ علم کے سلسلے میں کشفِ صحیح اور الہام والقائے ربانی کا انکار دین کے متواترات کا انکار ہے۔

کشف والہام کی صحت کا معیار

۱۔ اللہ نے کشف والہام کے لیے قلب سلیم کو شرط قرار دیا ہے جو اس کی وہبی خصوصیت ہے۔ اسی طرح کشف والہام کے صحیح یا غلط ہونے کو پرکھنے کے لیے اللہ نے قلب کو ایک معیار عطا فرمایا ہے جسے وجدانِ صحیح کہتے ہیں۔ یہ معیار بھی وہبی ہے یعنی ایک معیار تو اللہ نے عطا کر دیا۔ کشف یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جائے، وہ نظر آنے لگے۔ وجدان اس بات کو کہتے ہیں کہ جو اللہ کی طرف سے دل میں راسخ ہو جائے۔ اگر کشف میں کوئی چیز غلط نظر آئے تو صوفی کا دل، اس کا وجدان اس کو رد کر دیتا ہے کہ نہیں! مجھے صحیح چیز نظر نہیں آ رہی۔ یہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ کوئی اگر مکھی نگل جائے تو فوراً ابکائی آ کر قے ہو جاتی ہے۔ انسانی معدہ مکھی کو قبول ہی نہیں کرتا۔ اسی طرح قلب سلیم القائے شیطانی کو قبول نہیں کرتا۔ اگر شیطان اپنی طرف سے کشف،

Scanned with CamScanner

مشاہدے یا القا میں کسی بات کی آمیزش کردے تو قلب سلیم بے چینی محسوس کرتا اور اسے رد کر دیتا ہے کہ نہیں! یہ درست نہیں ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔

۱۔ کشف والہام کی صحت کے لیے دوسرا معیار یا شرط یہ ہے کہ بڑے سے بڑے ولی کو بھی کشف ہو تو وہ اپنے کشف کو قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے سامنے پیش کرے گا۔ اگر وہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے تو پھر اللہ کا انعام ہے، پھر اسے یقین ہونا چاہیے کہ یہ درست ہے۔

۲۔ شریعت میں تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی چیز کے کرنے کا حکم دیا، وہ ایک یقینی بات ہو گئی۔ دوسری یہ ہے کہ کسی چیز سے منع کر دیا، وہ بھی یقینی ہو گئی۔ تیسری چیز وہ ہے جس سے شریعت نے خاموشی اختیار کی، انہیں 'مباحات' کہا جاتا ہے۔ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کا کرنا منع نہیں ہے، اور کرنا کوئی باعث ثواب بھی نہیں، نہ کرنا باعث عذاب بھی نہیں بنتا۔ جس چیز سے شریعت نے سکوت اختیار کیا، اس میں دونوں احتمال موجود ہیں۔ وہ غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی۔ لہٰذا جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے گا جس پر شریعت نے سکوت اختیار کیا تو اسے پہلے ان امور کے سامنے پیش کیا جائے گا جن کے کرنے کی شریعت نے اجازت دی۔ اگر وہ ان کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے، یا پھر جن امور سے شریعت نے منع کیا ہے ان سے مطابقت رکھتا ہے تو غلط ہے۔ اجتہاد اسی کو کہتے ہیں۔ مجتہدین نے یہ بھی کیا کہ جہاں شریعت نے سکوت اختیار کیا تھا ان کی مثال ڈھونڈ کر ان کے لیے احکام حاصل کیے۔ کشف والہام کو بھی قرآن وحدیث پر پیش کیا جائے گا، اگر ان کے مطابق ہے تو صحیح ہے اور اگر اس سے ٹکراتا ہے تو وہ کشف والہام مردود ہو گا کیونکہ ایسا کشف جو حلال کو حرام، حرام کو حلال کر دے، مردود ہو گا۔ صوفی کا کشف شریعت کے تابع ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

دلائل کشف قرآن حکیم سے

۱۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰہُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا... (الکہف:۶۵)

"سو انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جسے ہم نے اپنی خاص رحمت دی تھی اور ہم نے اسے اپنے پاس سے خاص طور کا علم سکھایا تھا۔"

۲۔ فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا... (مریم:۱۷)

"پس ہم نے ان کے پاس اپنے فرشتہ کو بھیجا، اور وہ ان کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔"

۳۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ... (آل عمران:۴۲)

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہان بھر کی

Scanned with CamScanner

عورتوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔"

۴۔ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ... (آلِ عمران:۴۳)

"اے مریم! اپنے پروردگار کی اطاعت کرتی رہو اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔"

۵۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ... (آلِ عمران:۴۵)

"جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا۔"

۶۔ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ... (المائدہ:۱۱۱)

"اور جب میں نے حواریوں کو حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول ﷺ پر ایمان لاؤ۔"

۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ... (لقمان:۱۲)

"اور ہم نے لقمان کو دانشمندی عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو۔"

(اَيْ قُلْنَا اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ... یعنی ہم نے کہا کہ اللہ کا شکر کرتے رہو۔)

۸۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ... الخ (القصص:۷)

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاؤ... الخ۔"

۹۔ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا... (الکہف:۸۶)

"اور ہم نے یہ کہا اے ذوالقرنین! خواہ سزا دو، خواہ ان کے معاملہ میں نرمی کا سلوک اختیار کرو۔"

۱۰۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ... (البقرہ:۲۴۹)

"اور جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر سے۔"

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ...

فائدہ:

نصوصِ قرآنیہ سے علومِ کشفیہ اور الہامیہ ثابت ہوگئے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ یہ علومِ قطعیہ ہوتے ہیں یا ظنیہ نفسِ علمِ الہام وکشف ثابت ہوگیا۔ اس کا منکر نصوصِ قرآنیہ کا منکر ہوگا۔

سوال: کیا یہ علمِ غیب نہیں کہ کشف سے کسی کے دل کی بات معلوم کر لی جائے؟

جواب: اس کو کشفِ قلوب کہا جاتا ہے اور یہ علمِ غیب نہیں کیونکہ علمِ غیب کی تعریف یہ ہے کہ اس کی ابتدا اور انتہا نہ ہو اور کسی واسطہ سے حاصل نہ ہو۔ مگر اولیاء اللہ کا علم ذاتی نہیں بلکہ کشف والہام کے واسطے سے ہوتا ہے، قدیم نہیں حادث ہے، حضوری نہیں حصولی ہے۔ ابن قیمؒ نے کشف والہام پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

لَيْسَ هٰذَا مِنْ عِلْمِ الْغَيْبِ بَلْ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ قَذَفَ الْحَقَّ فِيْ قَلْبٍ قَرِيْبٍ

Scanned with CamScanner

مُسْتَنِيْرٍ بِنُوْرِهٖ غَيْرِ مَشْغُوْلٍ بِنُقُوْشِ الْاَبَاطِيْلِ وَ الْخَيَالَاتِ وَ الْوَسَاوِسِ الَّتِيْ تَمْنَعُهٗ مِنْ حُصُوْلِ صُوَرِ الْحَقَائِقِ فِيْهِ... (کتاب الروح، ۲۹۰-۲۹۱)

"یہ علم غیب نہیں بلکہ علام الغیوب نے اس قلب میں ڈالا ہے جو نور سے بشارت دیا ہوا ہے، اور نقوشِ باطلہ، خیالاتِ فاسدہ اور وساوس میں مشغول نہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو حصولِ حقائق میں مانع ہوتی ہیں۔"

فائدہ:

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ علمِ غیب نہیں اور کشف اللہ کے خاص بندوں کو ہوتا ہے جن کے قلوب صاف اور محبت الٰہی میں غرق ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جوگیوں اور بے دینوں پر حقائقِ اشیاء منکشف نہیں ہوتے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ "تفسیر کبیر" میں فرماتے ہیں:

فَاَحْسَنُ اَحْوَالِ الْعَبْدِ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا اَنْ يَّكُوْنَ مُوَاظِبًا عَلَى الْعِبَادَاتِ وَ هٰذِهٖ اَوَّلُ دَرَجَاتِ سَعَادَةِ الْاِنْسَانِ، وَهُوَ الْمُرَادُ بِقَوْلِهٖ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ فَاِذَا وَاظَبَ عَلٰى هٰذِهِ الدَّرَجَةِ مُدَّةً فَعِنْدَ هٰذَا يَظْهَرُ لَهٗ شَيْءٌ مِّنْ اَنْوَارِ عَالَمِ الْغَيْبِ، وَ هُوَ اَنَّهٗ وَحْدَهٗ لَا يَسْتَقِلُّ بِالْاِتْيَانِ بِهٰذَا الْعِبَادَاتِ وَ الطَّاعَاتِ بَلْ مَا لَمْ يَحْصُلْ لَهٗ تَوْفِيْقُ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ اِعَانَتُهٗ عِصْمَتُهٗ فَاِنَّهٗ لَا يُمْكِنُهُ الْاِتْيَانُ بِشَيْءٍ مِّنَ الْعِبَادَاتِ وَ الطَّاعَاتِ، وَ هٰذَا الْمَقَامُ هُوَ الدَّرَجَةُ الْوُسْطٰى فِي الْكَمَالَاتِ وَ هُوَ الْمُرَادُ مِنْ قَوْلِهٖ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ثُمَّ اِذَا تَجَاوَزَ عَنْ هٰذَا الْمَقَامِ لَاحَ لَهٗ اَنَّ الْهِدَايَةَ لَا تَحْصُلُ اِلَّا مِنَ اللّٰهِ وَ اَنْوَارُ الْمُكَاشَفَاتِ وَ التَّجَلِّيْ لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِهِدَايَةِ اللّٰهِ وَهُوَ الْمُرَادُ مِنْ قَوْلِهٖ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ... قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ لَمَّا قَالَ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ لَمْ يَقْتَصِرْ عَلَيْهِ بَلْ قَالَ: (صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ) وَهٰذَا يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْمُرِيْدَ لَا سَبِيْلَ لَهٗ اِلَى الْوُصُوْلِ اِلٰى مَقَامَاتِ الْهِدَايَةِ وَ الْمُكَاشَفَةِ اِلَّا اِذَا اقْتَدٰى بِشَيْخٍ يَهْدِيْهِ اِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ وَ يُجَنِّبُهٗ مِنْ مَّوَاقِعِ الْاَغَالِيْطِ وَ الْاَضَالِيْلِ... (تفسیر کبیر، ۱: ۹۴)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ مکاشفات کا دروازہ اللہ کے اُن خاص بندوں پر کھلتا ہے جن کو شیخ کامل میسر آجائے، طلب صادق اور عزم استعداد ہو تو اللہ تعالیٰ انہیں اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

اَلْحَذَرُ اَنَّ اَبْصَارَ الْقَلْبِ وَ جَلَاءَهٗ يَحْصُلُ بِالذِّكْرِ وَ اَنَّهٗ يَتَمَكَّنُ مِنَ الذِّكْرِ بِالتَّقْوٰى فَالتَّقْوٰى بَابُ الذِّكْرِ وَ الذِّكْرُ بَابُ الْكَشْفِ... (مختصر احیاء علوم الدین المسمٰی المرشد الامین، ۳: ۱۳۷)

یعنی کشف کا دروازہ اس کے لیے کھلتا ہے جو تقویٰ کے وصف کے ساتھ ذکر الٰہی پر مواظبت کرے۔

Scanned with CamScanner

غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

جس شخص کا ایمان قوی ہو جاتا ہے اور یقین جم جاتا ہے، وہ قیامت کے معاملات جن کی حق تعالیٰ نے خبر دی ہے، [illegible] آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے جنت اور دوزخ کو۔ وہ دیکھتا ہے صور کو اور اس فرشتہ کو جو اس پر تعینات ہے، اور دیکھتا ہے تمام چیزوں کو جیسی کہ وہ حقیقت میں ہیں۔ (فتح الربانی، وعظ ۱۹، ذیقعد، ۵۴۵ھ)

غوثِ اعظم نے صرف ایمان کو نہیں بلکہ ایمان کے قوی ہو جانے اور یقین جم جانے کو کشف کا ذریعہ قرار دیا ہے اور بندے پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت نہ ہو تو ایمان قوی کیونکر ہو سکتا ہے؟

شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

آثارِ ذکر خواہ انوار ہوں یا الہامات و کشف و کرامات وغیرہ خود بخود ظاہر ہوں تو بے شک معین و مددگار ہیں۔ (مکتوبات شیخ الاسلام، جلد: ۳، مکتوب، ۲۳)

شیخ الاسلام نے کشف کو آثارِ ذکر میں شامل کیا ہے، اور ذاکر اللہ کے خاص بندے ہی ہوتے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

وَمَا قَبْلَ ذٰلِكَ كَالدِّهْلِيْزِ لِلسَّالِكِ إِلَيْهِ وَمِنْ أَوَّلِ الطَّرِيْقَةِ تَبْتَدِئُ الْمُشَاهِدَاتُ وَ الْمُكَاشِفَاتُ حَتّٰى أَنَّهُمْ يَقْظَتِهِمْ يُشَاهِدُوْنَ الْمَلَائِكَةَ وَ أَرْوَاحَ الْأَنْبِيَاءِ وَ يَسْمَعُوْنَ مِنْهُمْ فَوَائِدَ... (المنقذ من الضلال، ۵۰)

"طریق السلوک کی ابتدا ہی سے مشاہدات اور مکاشفات شروع ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ سالکین بیداری میں انبیاء کے ارواح اور ملائکہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کا کلام سنتے ہیں، ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔"

دلائل کشف قرآن حکیم سے

انبیاءؑ کو ہونے والے کشف و الہام اور ان کے اتباع کے صدقے صوفیاء و صلحاء کو ہونے والے کشف کی قرآن میں جگہ جگہ دلیلیں اور مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً قال اللہ تعالیٰ، فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا... موسیٰؑ نے خضرؑ کو پایا، حالانکہ خضرؑ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ پھر وہ زیرِ آب سمندر میں کہیں بیٹھے ہوئے تھے، تو یہ سب ظاہری آنکھ تو نہیں دیکھ رہی تھی ظاہر ہے کہ نورِ بصیرت سے یہ دیکھنا، سننا ممکن ہوا تھا۔

فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا...

حضرت مریمؑ کے پاس ہم نے فرشتے کو بھیجا اور وہ انسانی صورت میں انؑ کے پاس آیا۔ کشف کی دوسری صورت کہ فرشتہ انسان بن کر مجسم ہو کر ان کے سامنے آیا۔ پھر جب فرشتوں نے کہا،

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ...

Scanned with CamScanner

تو یہ بھی کشف کی صورت تھی۔ جب فرشتوں نے حضرت مریمؑ سے کہا! اللہ نے آپ کو چن لیا ہے، آپ کو پاک بنایا ہے اور اپنے زمانے کی عورتوں پر منتخب فرمالیا ہے۔ تو فرشتوں کی یہ بات ہر آدمی تو نہیں سن رہا تھا، نہ فرشتے کسی کو نظر آرہے تھے، صرف حضرت مریمؑ ان کی بات سن رہی تھیں۔ یہ سب کشف والہام ہی تو تھا۔ پھر سورۂ آلِ عمران میں ہی ہے کہ حضرت مریمؑ کو یہ کشف یا مشاہدہ یا القا ہوا کہ ”اے مریمؑ! اپنے رب کی اطاعت کرتی رہو اور سجدہ کرو اور رکوع کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔“ تو بھی کشف والہام تھا۔ پھر آلِ عمران ہی میں وہ آیات ہیں جن میں حضرت مریمؑ کو فرشتے نے معجزانہ طور پر اولاد ہونے کی خوشخبری سنائی۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ...
جب فرشتے نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی اولاد کی خوشخبری دیں گے، وہ اللہ کی طرف سے کلمہ ہوگا یعنی وہ قدرتِ الٰہی سے پیدا ہوگا۔ اللہ اس میں روح پیدا کریں گے، اس کا باپ نہیں ہوگا۔ تو یہ سب بھی مریمؑ کو الہاماً بتایا گیا۔ چھٹی آیت سورۂ مائدہ کی ہے ”جب ہم نے حواریوں کو حکم دیا کہ مجھ پر اور میرے رسولؑ پر ایمان لاؤ۔“ حواریانِ عیسیٰ کو من جانب اللہ الہام والقا کے ذریعے یہ حکم دیا جارہا ہے۔ ساتویں آیت جو اسی دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کی گئی ہے، سورۂ لقمان سے ہے
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ... یعنی حضرت لقمان کو جب اللہ نے دانشمندی عطا فرمائی تو حکم دیا کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہو۔ یہ حکم جو حضرت لقمان کو دیا گیا کشف والہام کی ایک صورت تھی۔ سورۂ قصص میں ہے:
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ... الخ
ہم نے موسیٰؑ کی ماں پر القا کیا، الہام کیا کہ انہیں دودھ پلایئے، سنبھالئے اور دریا میں ڈال دیجیے۔ خاصی لمبی آیت ہے جس میں کشفاً، الہاماً، یا القائی طور پر امِ موسیٰؑ کو بتایا گیا۔ اس پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے موسیٰؑ کو دریا میں ڈال دیا۔ نویں دلیل سورۂ کہف سے ہے، قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا...
حضرت ذوالقرنین جو بہت بڑے حکمران ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنے دور کی معلوم ساری دنیا کو فتح کیا۔ انہوں نے ہی مشہور دیوار 'سدِ سکندری' بنوائی۔ انہیں سکندرِ ذوالقرنین بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ نبی نہیں تھے، ولی اللہ تھے، پھر بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ہم نے ذوالقرنین سے بات کی کہ تُو چاہے تو ان لوگوں کو سزا دے اور چاہے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کر۔“ یہ بھی کشف والہام تھا۔ دسویں آیت سورۂ البقرہ سے ہے، فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ... ”جب طالوتؑ لشکر لے کر نکلے تو انہوں نے (اہلِ لشکر سے مخاطب ہو کر) کہا کہ مجھے اللہ نے بتایا ہے کہ راستے میں ایک دریا آئے گا اور وہ تمہارے لیے امتحان کا سبب ہوگا۔“
قرآن میں بے شمار جگہوں پر اس طرح کی آیات ہیں جن میں سے فقط دس آیات بطورِ دلیل و نمونہ جمع کی گئی ہیں۔ ان آیات سے علومِ کشفیہ اور الہامیہ ثابت ہو گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ علوم قطعی تھے یا ظنی، لیکن یہ تو ثابت ہو گیا کہ غیر نبی پر بھی الہام ہوتا ہے، کشف ہوتا ہے۔ اسے بھی اللہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے۔ جب کشف والہام قرآن کی رُو سے ثابت

Scanned with CamScanner

ہو گیا تو اب جو شخص کشف والہام کا انکار کرے گا، ظاہر ہے کہ وہ قرآن کا انکار کر رہا ہے۔

سوال: کیا یہ علمِ غیب نہیں کہ کشف سے کسی کے دل کی بات معلوم کر لی جائے؟

جواب: معترضین بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ کشف نہیں علمِ غیب ہے کہ آپ نے دور کی، غیب کی بات معلوم کر لی۔ کسی کے دل کی بات معلوم کر لی، آنے والے کل کے بارے میں پتا چل گیا تو یہ تو علمِ غیب ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں، "اس کو کشفِ قلوب کہا جاتا ہے۔ یہ علمِ غیب نہیں۔" کسی کے دل کی بات کا معلوم کر لینا یہ کشف ہے، کشفِ قلوب ہے، اور کشف، الہام اور القا علمِ غیب نہیں ہوتے۔ علمِ غیب خاصۂ خداوندی ہے جس میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ علمِ غیب حادث نہیں ہوتا (حادث اس چیز کو کہتے ہیں جس کا باقاعدہ آغاز و انجام ہو)۔ اللہ کے علوم ازلی و ابدی ہیں۔ دوسری صفت جو علمِ غیب کی ہے وہ یہ کہ اس علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی اور سے معلوم نہیں ہوتا، وہ اُس ہستی کا ذاتی علم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی ذریعے کا محتاج نہیں، ذاتی طور پر ہر شے کو جانتا ہے جبکہ کشف والہام تو بندے کا ذاتی علم نہیں ہوتا بلکہ اللہ اسے بتاتا ہے، اس کے علم کا ذریعہ اللہ ہوتا ہے۔ جب ذریعہ درمیان میں آ گیا تو علمِ غیب کیسے ہوا؟ مثال کے طور پر ہم میں سے کسی کو گھر سے ٹیلی فون آتا ہے کہ "ہم نے اپنا دنبہ ذبح کر دیا ہے۔" ہم یہ بات دوسروں کو بتاتے ہیں کہ ہمارے گھر میں جو دنبہ تھا اُسے ذبح کر لیا گیا ہے، تو کیا یہ علمِ غیب ہے؟ ہمارے پاس ایک ذریعہ تھا، اس کے واسطے سے ہمیں دور کی بات کا پتا چلا۔ فرض کریں کہ گھر والوں نے فون نہیں کیا لیکن اللہ نے بات دل میں القا کر دی، کشف کرا دیا، پردہ ہٹا دیا تو وہ بھی بات کا علم ہونے کا ذریعہ ہو گیا۔ پھر یہ علمِ غیب کیسے رہا؟ کیونکہ علمِ غیب تو بغیر کسی وسیلے، واسطے کے ہوتا ہے۔ علمِ غیب تو اُس ہستی کا ذاتی علم ہے، اُسے از خود معلوم ہوتا ہے، اور وہ ہستی صرف اللہ کی ہی ہو سکتی ہے۔

جتنے غیب انبیاءؑ کو عطا ہوتے ہیں۔ اللہ نے قرآن میں اس کے متعلق فرمایا: لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ... الخ۔ "تاکہ آپ کو (انبیاءؑ سے خطاب ہے) غیب پر اطلاع دی جائے۔" اسے غیب پر اطلاع دینا کہتے ہیں۔ جب اللہ نے اطلاع دی تو وہ علمِ غیب نہ رہا۔ 'اطلاع عن الغیب' ہو گئی کہ غیب کی اطلاع دے دی گئی۔

علمِ غیب کی تعریف یہ ہے کہ اس کا کوئی اول آخر، ابتدا انتہا نہ ہو، اور وہ اُس ہستی کا ذاتی علم ہو، کسی اور کا دیا ہوا نہ ہو، کسی واسطے سے نہ ہو۔ اللہ کا علم حضوری ہے، وہ کوئی نیا علم حاصل نہیں کرتا، کوئی علم اس کے لیے نیا نہیں ہوتا اور وہ ہر وقت ہر چیز کو جانتا ہے۔ بندے کا علم حصولی ہوتا ہے، یعنی پہلے نہیں جانتا پھر اسے حاصل کرتا ہے۔

'کتاب الروح' میں علامہ ابن قیم کشف والہام پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ علمِ غیب نہیں بلکہ علام الغیوب (اللہ تعالیٰ) نے اسے قلب میں ڈالا ہے۔ اللہ الہام والقا کو ایسے دلوں میں ڈالتا ہے جو اللہ کے نور سے منور ہوتے ہیں۔ ان دلوں میں باطل نقوش یعنی غلط عقائد اور فاسد خیالات و وساوس نہیں ہوتے۔ وہ قلوب بحفاظتِ الٰہی ان چیزوں سے مبرا ہوتے ہیں کیونکہ یہ باطل یعنی برے خیالات و تصورات یا وساوس چیزوں کی حقیقی صورت دیکھنے سے مانع ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس عبارت سے معلوم ہوا ہے کہ کشف علمِ غیب نہیں اور یہ اللہ کے خاص بندوں کو ہوتا ہے جن کے قلوب صاف اور محبتِ الٰہی میں غرق ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کافر، بے دین پر، بدکار پر کشف والہام کا انعام نہیں ہوتا، دوا سے حاصل نہیں کرسکتا۔

امام رازیؒ "تفسیرِ کبیر" میں فرماتے ہیں کہ مکاشفات کا دروازہ اللہ کے اُن خاص بندوں پر کھلتا ہے جن کو شیخِ کامل میسر آجائے۔ طلب صادق ہو، عزم ہو اور استعداد ہو، تو اللہ تعالیٰ انہیں اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیتا ہے۔

امام غزالیؒ "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں:

"کشف کا دروازہ اس کے لیے کھلتا ہے جو تقویٰ کے وصف کے ساتھ ذکرِ الٰہی پر مواظبت کرے۔"

یعنی ذکرِ الٰہی باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ مستقل اور مسلسل کرے۔

غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ "فتح الربانی" میں فرماتے ہیں:

جس شخص کا ایمان قوی ہوجاتا ہے اور یقین جم جاتا ہے (جس کا ایمان درجۂ احسان تک پہنچ جاتا ہے) وہ قیامت کے معاملات جن کی حق تعالیٰ نے خبر دی ہے، قلب کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جنت اور دوزخ کو دیکھتا ہے۔ صور اور اس فرشتہ کو دیکھتا ہے جو اس پر تعینات ہے (قیامت کے دن وہ فرشتہ صور پھونکے گا)۔ وہ تمام چیزوں کو بالکل ویسے ہی دیکھتا ہے جیسی وہ حقیقت میں ہیں یعنی اسے حقیقتِ اشیاء کا ادراک ہوجاتا ہے۔

یہاں غوثِ اعظمؒ نے صرف ایمان کو نہیں بلکہ ایمان کے قوی ہوجانے اور یقین کے جم جانے کو کشف کا ذریعہ قرار دیا ہے اور بندے پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت نہ ہو تو ایمان کیونکر قوی ہوسکتا ہے؟

شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

"آثارِ ذکر خواہ انوارات ہوں یا الہامات وکشف وکرامات وغیرہ، یہ خود بخود ظاہر ہوں تو بے شک معین ومددگار ہیں۔"

سادہ لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ ذکرِ الٰہی کے اثرات انسان پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بندہ اللہ اور صرف اللہ کے لیے اس کا ذکر کرے، اس کی نیت اللہ سے ماسوا نہ ہو، وہ کشف وکرامات کا طالب نہ ہو، لیکن یہ چیزیں ظاہر ہونے لگیں تو سمجھ لیں کہ راہِ سلوک میں یہ سالک کی مددگار رہوں گی۔ آپؒ نے کشف کو ذکر کے اثر وتاثیر میں شامل فرمایا ہے۔ نیز ذاکرین کے اللہ کے خاص بندے ہونے کی بات کی ہے۔

امام غزالیؒ "المنقذ من الضلال" میں فرماتے ہیں کہ:

"راہِ سلوک کی ابتدا ہی سے مشاہدات اور مکاشفات شروع ہوجاتے ہیں، حتیٰ کہ سالکین بیداری میں انبیاءؑ، ارواح اور ملائکہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، اُن کی بات چیت سنتے ہیں، اُن سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

کشف اور الہام میں فرق

"فیض الباری" میں ہے:

أَمَّا الْفَرْقُ بَيْنَ الْكَشْفِ وَالْإِلْهَامِ فَكَمَا قَالَ الشَّيْخُ الْمُجَدِّدُ السَّرْهِنْدِيُّ: أَنَّ الْكَشْفَ أَقْرَبُ مَا سَمُّوْهُ أَهْلُ الْمَعْقُوْلِ بِالْحِسِّيَّاتِ وَالْإِلْهَامَ إِلَى مَا سَمُّوْهُ بِالْوِجْدَانِيَّاتِ وَلَعَلَّ الْإِلْهَامَ أَقْرَبُ إِلَى الصَّوَابِ مِنَ الْكَشْفِ فَإِنَّ الْكَشْفَ رَفْعُ الْحِجَابَاتِ عَنِ الشَّيْءِ وَالْإِلْهَامَ إِلْقَاءُ الْمَضْمُوْنِ...

(فیض الباری، باب: کیف کان بدء الوحی، ۱:۱۹)

"کشف اور الہام میں فرق ہے، جیسا کہ شیخ مجدد سرہندیؒ نے فرمایا کہ اہل منطق جسے حسیات کہتے ہیں، کشف اس کے زیادہ قریب ہے، اور جسے وجدانیات کہتے ہیں الہام اس کے زیادہ قریب ہے۔ شاید الہام اقرب الی الصواب ہے بمقابلہ کشف کے۔ کیونکہ کشف نام ہے حجاب کا اٹھنا کسی شئے سے اور الہام دل میں کسی مضمون کا القا ہونا ہے۔"

کشف یا الہام اعلام من اللہ کی دو مختلف صورتیں ہیں، ان میں سے الہام اقرب الی الصواب ہے۔

کشف اور الہام میں فرق

'فیض الباری' میں ہے کہ:

"کشف اور الہام میں فرق ہے جیسا کہ شیخ مجدد سرہندیؒ نے فرمایا کہ اہلِ منطق (منطق کا علم جاننے والے) جسے حسیات کہتے ہیں، کشف اس کے زیادہ قریب ہے۔ اور جسے وہ وجدانیات کہتے ہیں، الہام اس کے زیادہ قریب ہے۔ شاید الہام اقرب الی الصواب (معتبر) ہے بمقابلہ کشف کے۔ کیونکہ کشف نام ہے کسی چیز سے حجاب کا اٹھنا اور الہام دل پر کسی مضمون کا القا ہونا ہے۔"

کشف یا الہام اعلام من اللہ کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں الہام زیادہ معتبر اور صحیح ہے کیونکہ کشف کسی چیز پر سے پردہ اٹھنے کو کہتے ہیں۔ پردہ اُٹھنے پر چیز دیکھی جاتی ہے اور دیکھنے کا معاملہ مادی آنکھ سے ہو یا روح کی آنکھ سے، غلطی کا امکان ہوسکتا ہے۔ پھر دیکھ کر سمجھنے میں بھی غلطی لگ سکتی ہے۔ جبکہ الہام ایک چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست ولی کے دل میں آتی ہے۔ کسی حس یا مدرکہ کا واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ درستی اور صحت میں کشف کی نسبت زیادہ معتبر اور معتمد (قابلِ اعتبار و اعتماد) ہے۔

حالتِ برزخی

عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت کے درمیان عرصہ کو عالمِ برزخ کہتے ہیں۔ اس عالم میں جو حالت پیش آتی ہے اسے حالتِ برزخی کہتے ہیں۔ اس میں میت پر دونوں جہانوں کے حالات منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام پر عالمِ دنیا میں یہ

حالات منکشف ہوتے ہیں۔ جو عارف باللہ اولیاء اللہ نورِ نبوت سے اپنے قلوب کو منور کر چکے ہوتے ہیں، ان پر بھی یہ حالت آتی ہے۔ دنیوی زندگی میں ان پر تین حالتیں آتی ہیں۔ ایک بیداری، دوسری نوم اور تیسری حالت ان دونوں کے درمیان حالتِ برزخی ہے۔ انبیاء علیہم السلام پر جب وحی نازل ہوتی ہے اور انہیں الہام اور انکشاف شروع ہوتا ہے تو ان پر بھی حالت طاری ہوتی ہے۔ اور اولیاء اللہ پر بھی بہ نیابتِ نبوت یہی حالت آتی ہے۔ اس حالت میں انبیاء اور اولیاء بھی برزخی وجدِ دنیا سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ یہ حالتِ استغراق، نہ بیداری ہوتی ہے نہ نوم۔ اس حالتِ برزخی میں الہام و انکشاف شروع ہو جاتا ہے۔

"فیض الباری" میں اس کی کچھ تفصیل یوں دی گئی ہے:

يَحْصُلُ لَهُ ﷺ مِنَ الْكَرْبِ عِنْدَ نُزُولِ الْقُرْآنِ وَهِيَ حَالَةٌ يُؤْخَذُ فِيهَا عَنْ حَالِ الدُّنْيَا مِنْ غَيْرِ مَوْتٍ فَهُوَ مَقَامٌ بَرْزَخِيٌّ يَحْصُلُ لَهُ عِنْدَ تَلَقِّي الْوَحْيِ وَلَمَّا كَانَ الْبَرْزَخُ الْعَامُّ يَنْكَشِفُ فِيهِ لِلْمَيِّتِ كَثِيرٌ مِنَ الْأَحْوَالِ خَصَّ اللهُ نَبِيَّهُ بِبَرْزَخٍ فِي الْحَيَاةِ يُلْقِي إِلَيْهِ فِيهِ وَحْيَهُ الْمُشْتَمِلَ عَلَى كَثِيرٍ مِنَ الْأَسْرَارِ وَقَدْ يَقَعُ لِكَثِيرٍ مِنَ الصُّلَحَاءِ عِنْدَ الْغَيْبَةِ بِالنَّوْمِ أَوْ غَيْرِهِ اطِّلَاعٌ عَلَى كَثِيرٍ مِنَ الْأَسْرَارِ وَذَالِكَ مُسْتَبِدٌّ مِنَ الْمَقَامِ النَّبَوِيِّ ﷺ وَيَشْهَدُ لَهُ حَدِيثُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّةِ... (فیض الباری، باب کیف کان بدء الوحی، ۱:۲۶)

"حضور اکرم ﷺ کو نزولِ قرآن کے وقت ایک حالت پیش آتی تھی جو موت کے بغیر برزخی حالت ہوتی تھی۔ یہ حالت القائے وحی کے وقت ہوتی تھی۔ عالمِ برزخ میں میت پر برزخی حالات منکشف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دنیا میں برزخی حالات سے مختص کیا ہے جب ان پر وحی نازل ہوتی، جو بہت سے اسرار پر مشتمل ہوتی تھی۔ اور یہ حالتِ برزخی جو مابین نوم اور بیداری کے ہے، اولیاء اللہ کے لیے بھی ہے۔ اس حالت میں ان پر بہت سے اسرارِ الٰہی القا ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ کے لیے یہ حالت مقامِ نبوت سے ماخوذ ہے۔ اس پر یہ حدیث گواہ ہے کہ مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔"

اور "مشکلات القرآن" میں ہے:

(فَلِذَالِكَ الْوَلِيُّ إِذَا اطَّلَعَهُ اللهُ عَلَى غَيْبِهِ لَمْ يَرَاهُ بِنُورِ نَفْسِهِ وَإِنَّمَا رَآهُ بِنُورِ مَتْبُوعِهِ) أَيْ بِنُورِ نَبِيِّهِ... (مشکلات القرآن، ۲۷۴)

ولی اللہ کشف میں جو کچھ دیکھتا ہے، وہ اپنے ذاتی نور سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنے نبی ﷺ کے نور سے دیکھتا ہے جن کا وہ تابع ہے۔

Scanned with CamScanner

حالتِ برزخی:

عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت (جہاں انسان قیامت کے حساب کتاب کے بعد جائے گا) کے درمیان کے عرصہ کو عالمِ برزخ کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی انتظارگاہ ہے جہاں دنیا سے جانے والے عارضی قیام کرتے ہیں۔ بالکل جیسے کوئی اپنے گھربار سے رخصت ہو کر ریلوے اسٹیشن پر آکر کمرۂ انتظار میں بیٹھ جاتا ہے جو اس کی منزل نہیں ہوتا۔ برزخی حیات میں میت پر دونوں عالم کے حالات منکشف ہوتے رہتے ہیں۔ انبیاءؑ پر عالمِ دنیا ہی میں یہ حالات منکشف ہو جاتے ہیں۔ جو عارف باللہ اولیاء اللہ نورِ نبوت سے اپنے قلوب کو منور کر چکے ہوتے ہیں، ان پر بھی یہ حالت (کشفِ احوال الآخرت) آتی ہے۔ دنیوی زندگی میں ان پر تین حالتیں آتی ہیں۔ ایک بیداری، دوسری نوم یعنی نیند اور تیسری حالت ان دونوں کے درمیان۔ یہی حالتِ برزخی ہے۔ انبیاءؑ پر جب وحی نازل ہوتی ہے اور اُنہیں کشف والہام شروع ہوتا ہے تو اُن پر یہی برزخی حالت طاری ہوتی ہے۔ اور اولیاء اللہ پر یہ حالت بہ نیابتِ نبوت آتی ہے (نائب انبیاء ہونے کی وجہ سے یہ حالت اولیاء کو نصیب ہوتی ہے)۔ اس حالت میں انبیاء اور اولیاء بظاہر دنیا سے منقطع ہو جاتے ہیں۔ یہ حالتِ استغراق، نہ بیداری ہوتی ہے نہ نیند۔ اس درمیان کی کیفیتِ برزخی میں کشف والہام شروع ہو جاتا ہے۔

'فیض الباری' میں اس کی تفصیل کچھ یوں دی گئی ہے:

حضورِ اکرم ﷺ کو نزولِ قرآن کے وقت ایک حالت پیش آتی تھی جو موت کے بغیر برزخی حالت ہوتی تھی۔ یہ حالت القائے وحی کے وقت ہوتی تھی۔ عالمِ برزخ میں میت پر برزخی حالات منکشف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دنیا میں برزخی حالات سے مختص کیا (یہ آپ ﷺ کا اختصاص یعنی منفرد خصوصیت ہے) جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی جو بہت سے اسرار پر مشتمل ہوتی تھی۔ اور یہ حالتِ برزخی جو مابین نوم اور بیداری کے ہے، اولیاء اللہ کے لیے بھی ہے (جو بہ نیابت اور باتباعِ نبیؑ حاصل ہوتی ہے)۔ اس حالت میں اُن پر بہت سے اسرارِ الٰہی القا ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ کے لیے یہ حالت مقامِ نبوت سے ماخوذ (حاصل کردہ) ہے۔ اس پر یہ حدیث مبارکہ گواہ ہے کہ مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔

اور 'مشکلاتِ قرآن' میں ہے کہ ولی اللہ کشف میں جو کچھ دیکھتا ہے، وہ اپنے ذاتی نور سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنے نبی ﷺ کے نور سے دیکھتا ہے جس کا وہ تابع ہے۔

انبیاءؑ اور اولیاء کو قبل از وجود اشیاء کا انکشاف

'فیض الباری' میں ہے:

اِعْلَمْ اَنَّ مَا يَرَوْنَهُ الْاَوْلِيَاءُ مِنَ الْاَشْيَاءِ قَبْلَ وُجُوْدِهَا فِي الْعَالَمِ لَهَا اَيْضًا نَحْوٌ مِّنَ الْوُجُوْدِ ... نا اَنَّ اَبَايَزِيْدَ الْبَسْطَامِيَّ رحمه الله لَمَّا مَرَّ مِنْ جَانِبِ مَدْرَسَةٍ وَهَبَّتِ الرِّيْحُ قَالَ: اِنِّيْ اَجِدُ مِنْهَا رِيْحَ عَبْدٍ ...

Scanned with CamScanner

مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ فَنَشَاءَ مِنْهُ الشَّيْخُ اَبُو الْحَسَنِ الْخَرَقَانِيُّ وَ كَمَا قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنِّيْ اَجِدُ نَفَسَ الرَّحْمٰنِ مِنَ الْيَمَنِ فَنَشَاءَ مِنْهُ الْاُوَيْسُ الْقَرَنِيُّ فَهٰذَا اَيْضًا نَحْوٌ مِّنَ الْوُجُوْدِ...

(فیض الباری، کتاب العلم، باب من اجاب الفتیا ـ الخ، ۱:۱۸۲)

"جان لو کہ اولیاء اللہ جس چیز کو اس کی پیدائش سے پہلے دیکھتے ہیں اس کا بھی ایک قسم کا وجود ہوتا ہے، جیسے بایزید بسطامیؒ ایک مدرسہ کے پاس سے گزرے تو ہوا کا جھونکا آیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس میں ایک مردِ خدا کی خوشبو آرہی ہے۔ چنانچہ (سو سال بعد) وہاں ابوالحسن خرقانیؒ پیدا ہوئے۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یمن کی طرف تجلیاتِ باری دیکھتا ہوں، چنانچہ وہاں اویس قرنیؒ پیدا ہوئے۔ یہ بھی پیدائش سے قبل ایک قسم کے وجود کی دلیل ہے۔"

اسی کتاب میں فرماتے ہیں:

وَقَدْ ثَبَتَ عِنْدَ الشَّرْعِ وُجُوْدَاتٌ لِّلشَّيْءِ قَبْلَ وُجُوْدِهَا فِيْ هٰذَا الْعَالَمِ...

(ایضاً، کتاب المظالم والقصاص، باب اثم من ظلم شیئا من الارض، ۳:۳۳۴)

"شریعت کی رو سے ثابت ہے کہ اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے ایک قسم کے وجود ہوتے ہیں۔"

پھر صفحہ ۳۳۷ پر فرمایا:

قَالَ: (هَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰى... الخ) وَ هٰذَا الَّذِيْ قُلْتُ: اِنَّ لِلشَّيْءِ وُجُوْدًا قَبْلَ ظُهُوْرِهٖ فِيْ هٰذَا الْعَالَمِ اَيْضًا فَالْفِتَنُ الَّتِيْ رَاٰهَا النَّبِيُّ ﷺ تَقْطُرُ خَلَالَ بُيُوْتِهِمْ لَمْ تَكُنْ فِيْ زَمَنِهٖ وَلٰكِنَّهٗ ﷺ رَاٰهَا بِنَحْوِ وُجُوْدِهَا قَبْلَ ظُهُوْرِهَا... (ایضاً، کتاب المظالم والقصاص، باب الغرفۃ والعلیۃ، ۳:۳۳۷)

"میں نے یہی بات کہی ہے کہ اشیاء کے اس دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے بھی ایک قسم کے وجود ہوتے ہیں۔ جو فتنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا، وہ گھروں کے دروازوں کے درمیان ٹھیک ثابت ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے وجود میں آنے سے پہلے کشف سے دیکھ لیا تھا۔ ان کا بھی ایک قسم کا وجود تھا۔"

اور "روح المعانی" میں ہے کہ اولیاء اللہ بقیدِ حیاتِ دنیوی جنت کی سیر کرتے ہیں:

وَالَّذِيْ ذَهَبَ اِلَيْهِ بَعْضُ سَادَاتِنَا الصُّوْفِيَّةِ قَدَّسَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَسْرَارَهُمْ اَنَّهَا فِي الْاَرْضِ عِنْدَ جَبَلِ الْيَاقُوْتِ تَحْتَ خَطِّ الْاِسْتِوَاءِ وَيُسَمُّوْنَهَا جَنَّتَ الْبَرْزَخِ... وَهِيَ الْاٰنَ مَوْجُوْدَةٌ وَاِنَّ الْعَارِفِيْنَ يَدْخُلُوْنَهَا الْيَوْمَ بِاَرْوَاحِهِمْ لَا بِاَجْسَامِهِمْ... (روح المعانی، ۱:۲۳۳)

"صوفیاء کرام نے فرمایا کہ (وہ جنت جس میں آدم علیہ السلام کو خدا نے رکھا تھا) وہ زمین پر برزخی جنت ہے جو جبلِ یاقوت کے پاس ہے۔ صوفیاء اپنے ارواح کے ساتھ حالتِ کشف میں اس جنت کی سیر کرتے ہیں، اجسام کے ساتھ نہیں۔"

عوام کا نیند کی حالت میں خواب میں مختلف اشیاء دیکھنا ایک عام سی بات ہے جو کسی کے لیے بھی حیرت کی بات نہیں۔ یہی صورت اولیاء اللہ کو بیداری کی حالت میں پیش آتی ہے۔ جیسے نیند کی حالت میں انسان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں، حرکات ختم

اور خیالات کی جولانی بھی نہیں ہوتی، اسی طرح اولیاء اللہ بیداری کی حالت میں اندھیرے کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں، آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس یکسوئی کی حالت میں ان پر حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

"مرقاۃ" میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

لِاَنَّ الظُّلْمَةَ اَجْلَى الْقُلُوْبِ... (مرقاۃ المفاتیح شرح المشکوٰۃ المصابیح، ۱: ۲۰)

"تاریکی دلوں کو بہت جلا بخشنے والی ہے۔"

"فیض الباری" میں فرمایا:

اِنَّ الْاَوْلِيَآءَ يَرَوْنَ فِيْ كُشُوْفِهِمْ اَشْيَآءَ بِعَيْنِ الْبَاصِرَةِ وَ لَا نَرَاهَا. كَذَالِكَ وَ الْاَنْبِيَآءُ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ يَرَوْنَ الْمَغِيْبَاتِ بِاَعْيُنِ الْبَاصِرَةِ فِي الْيَقْظَةِ... (فیض الباری، باب بدء الوحی، ۱: ۱۷)

"اولیاء اللہ کشف میں دل کی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے، اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام غیب کی چیزوں کو دل کی آنکھ سے بیداری کی حالت میں دیکھتے ہیں جن کو عوام نہیں دیکھ سکتے۔"

ہر چیز کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت۔ نگاہِ ظاہر صورت تک پہنچ کر رک جاتی ہے کیونکہ اس کی حد وہی ہے، مگر نگاہِ باطن یا بصیرت صورت سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جاتی ہے۔ اور نگاہ وہی ہے جو حقیقت کا کھوج لگالے۔

خوب کہا کسی نے:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن   جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

علمائے ظاہر بیں اور حقیقت شناس عارفین میں یہی فرق ہے۔ جیسا کہ "فیض الباری" میں اگلے صفحہ پر فرمایا:

وَنَظَرُ الْعُلَمَآءِ اَحْكَمُ... وَنَظَرُ اَرْبَابِ الْحَقَائِقِ اَسْبَقُ وَ اَلْطَفُ فَهُمْ يُمَثِّلُوْنَ عَلٰى مَا يَظْهَرُ مِنْ ظَاهِرِ الشَّرِيْعَةِ... وَهٰؤُلَآءِ يُرَاعُوْنَ مَا كَشَفَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ عَلَيْهِمْ مِنْ حَقَآئِقِ الشَّرِيْعَةِ وَ خَبِيْئَةِ اَسْرَارِهَا... وَفِي الْحَدِيْثِ "لِكُلِّ اٰيَةٍ ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ لِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ..." وَلٰكِنْ "مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ..."

(فیض الباری، باب: الکلام فی انہ ﷺ ھل جمیع بین الرویۃ والکلام لیلۃ المعراج، ۱: ۱۸)

"علمائے ظاہر کی نگاہ مضبوط ہے مگر اربابِ حقائق صوفیاء کی نگاہ بہت آگے ہے اور بڑی لطیف ہے۔ علمائے ظاہر تو ظاہر شریعت پر عمل کرتے ہیں اور اولیاء اللہ اُن امور کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ شریعت کے حقائق و رموز میں سے بذریعہ کشف ان پر ظاہر کرتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ہر آیتِ قرآنی کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اور ہر چیز کی ایک حد ہے لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نورِ بصیرت نہ دے اس کے لیے کوئی نور نہیں۔"

صورتِ شے اور حقیقتِ شے میں جو فرق ہے اس کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ کافی ہے۔

Scanned with CamScanner

کچھ بر خود غلط قسم کے لوگ علمِ حقائق اور علمِ اسرار کو علمِ غیب کی قبیل سے شمار کرتے ہیں۔ اور علمِ غیب خاصۂ خدا ہے، اس لیے کشف کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس کا علمی جواب گزشتہ کسی باب میں دیا جا چکا ہے۔

اصل بات یہ نہیں کہ اعتراض میں کوئی وزن ہے، حقیقت یہ ہے کہ لوگ قرآن و حدیث کو اپنا رہنما بنا کر ان کے پیچھے چلنے کے عادی ہی نہیں، یہ خدا اور رسول ﷺ کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن و حدیث میں سے صرف اسی کو حق سمجھتے ہیں، جو اُن کے اپنے ایجاد کردہ عقیدہ کے مطابق ہو۔

"فیض الباری" میں اس مسئلے پر اصولی بحث کی گئی ہے:

اِعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الْخَمْسَ لَمَّا كَانَتْ مِنَ الْاُمُوْرِ التَّكْوِيْنِيَّةِ دُوْنَ التَّشْرِيْعِيَّةِ لَمْ يُظْهِرْ عَلَيْهَا اَحَدًا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ اِلَّا بِمَا شَاءَ وَجَعَلَ مَفَاتِيْحَهٗ عِنْدَهٗ فَقَالَ: وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ... لِاَنَّهُمْ بُعِثُوْا لِلتَّشْرِيْعِ فَالْمُنَاسِبُ لَهُمْ عُلُوْمُ التَّشْرِيْعِ دُوْنَ التَّكْوِيْنِ ثُمَّ الْمُرَادُ: مِنْهُ اُصُوْلُهَا وَمَا عِلْمُ الْجُزْئِيَّاتِ... فَقَدْ يُعْطٰى مِنْهُ الْاَوْلِيَاءُ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَيْضًا لِاَنَّ عِلْمَ الْجُزْئِيَّاتِ لَيْسَ بِعِلْمٍ فِي الْحَقِيْقَةِ لِكَوْنِهَا مَحَطًّا لِلتَّحَوُّلَاتِ وَالتَّغَيُّرَاتِ...

(فیض الباری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام، ۱:۱۵۱)

"خوب سمجھ لو کہ مغیباتِ خمسہ کا تعلق امورِ تکوینی سے ہے، تشریعی سے نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق کسی نبی کو اطلاع نہیں دی، اور اس کی چابیاں اپنے پاس رکھیں اور فرمایا کہ غیب کی چابیاں اُس کے پاس ہیں، اُس کے بغیر انہیں کوئی نہیں جانتا۔ چونکہ انبیاء کرامؑ شریعت کے احکام بیان کرنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، اس لیے ان کے منصب کے مناسب شریعت کے علوم ہی ہیں، امورِ تکوینی نہیں۔ پھر علومِ خمسہ سے مراد اصولِ علم ہیں، جزئیات نہیں۔ جزئیات کا علم اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو بھی دے دیتا ہے کیونکہ جزوی علم حقیقت میں علم ہی نہیں کیونکہ وہ قابلِ تغیر و تبدل ہے۔"

اسی حقیقت کو ملا علی قاریؒ نے "مرقاۃ" (۱:۶۵) پر یوں بیان فرمایا:

فَاِنْ قُلْتَ قَدْ اَخْبَرَ الْاَنْبِيَاءَ وَ اَوْلِيَاءَ بِشَيْءٍ كَثِيْرٍ مِّنْ ذَالِكَ فَكَيْفَ الْحَصْرُ قُلْتُ الْحَصْرُ بِاعْتِبَارِ كُلِّيَّاتِهَا دُوْنَ جُزْئِيَّاتِهَا... (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۱:۶۵)

"اگر تو کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان مغیبات میں سے بہت حصوں کے متعلق انبیاء اور اولیاء کو خبر دے دی ہے تو حصر کیسا؟ تو میں کہوں گا کلیات کے اعتبار سے حصر ہے، جزئیات کے لحاظ سے نہیں۔" یعنی جزئیات میں سے انبیاء اور اولیاء کو اطلاع دے دی جاتی ہے جو مانع حصر نہیں۔

ان کا صورت شے تک پہنچ کر رک جانا بڑا حجاب ہے اور یہ حجاب درحقیقت عذاب ہے۔

جیسا کہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ... کے سلسلے میں فرمایا:

قَوْلُ السَّادَةِ الصُّوْفِيَّةِ اَلْحِجَابُ اَشَدُّ الْعَذَابِ... (مرقاۃ المفاتیح، شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۱:۷۵)

''صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ حجاب شدید تر عذاب ہے۔''

اس سلسلے میں ایک سوال توجہ طلب ہے کہ انبیاء کرامؑ اور اولیاء اللہ کو کشف میں اشیاء قبل از وجود جو دکھائی دیتی ہیں وہ کون سا وجود ہوتا ہے؟ کیا یہ وجود مثالی ہوتا ہے؟ کچھ لوگوں نے اپنی اٹکل سے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ وہ اشیاء کا وجودِ مثالی ہوتا ہے۔ مگر یہ رائے محض بے بنیاد ہے کیونکہ:

۱۔ مثال اُس چیز کی ہوتی ہے جس کا وجودِ اصلی پہلے موجود ہو۔ جب ممثل لہٗ کا وجود ہی نہیں تو مثال کس کی ہوگی؟

۲۔ انسانوں میں وجودِ مثلی سے تماثیل نوعی مراد ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی نوعِ انسانی کے فرد ہیں، اس لیے وجودِ مثالی کو کون کہہ سکتا ہے کہ اسی انسان کا فرد ہے؟ جب مثال شے دیدنی ہے نہ بودنی، جیسا کہ خواب میں دکھائی دینے والی چیز کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا، بلکہ اس کا وجود صرف دیکھنے کی حد تک ہے، پھر معدوم ہو جاتا ہے۔

۳۔ کشف میں جو وجود نظر آتا ہے وہ اس طرح کا ہے جیسے کسی مقرر کے ذہن میں تین چار گھنٹے کی تقریر کا وجود موجود ہوتا ہے۔ پھر اسی تقریر کو زبان پر لاتا ہے، یعنی جس تقریر کا وجودِ علمی تقدیری اس کے ذہن میں موجود تھا، اسی وجود کو زبان پر لا کر بیان کیا۔ اگر مقرر کے ذہن میں تقریر کا وجودِ مثالی مانا جائے تو علم بھی وجودِ مثالی کا ہوگا، اور تقریر بھی وجودِ مثالی کی ہوگی، کیونکہ جب اصل وجود کا علم ہی نہ تھا تو اس کا بیان کیونکر ہوگا؟

اسی طرح مستری کے ذہن میں مکان کا جو نقشہ ہوتا ہے، وہی مادّی طور پر اینٹ پتھر سے مل کر خارج میں ظاہر ہوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ذہن میں وجودِ مثالی کا نقشہ تھا اور مکان مثالی ہی تیار ہوا۔ مختصر یہ کہ جو وجود ذہن میں ہوتا ہے اس پر خارج میں ثمرات، اثرات اور احکام کی بنا ہوتی ہے۔

اس طرح تمام اشیاء کا وجودِ علمی تقدیری عند اللہ حاضر ہے۔ وہ اپنے قدیم ازلی علم سے ان کو جانتا ہے۔ وہی وجود اپنے وقت پر خارج میں مادّی دنیا میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

فَإِنَّ الْوُجُودَ الْخَارِجِيَّةَ هُوَ مَا يَكُونُ مَبْدَأً لِلْآثَارِ وَمَظْهَرَ الْأَحْكَامِ وَعَلَيْهِ تَرْتِيبُ الثَّمَرَاتِ مَا كَانَ لِوُجُودِ الذِّهْنِيِّ...

''پس وجودِ خارجی آثار کا مبدأ ہے اور احکام کا ظاہر کرنے والا ہے، اور اسی پر وجودِ ذہنی کے ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہر شے کا وجود اس کی پیدائش سے پہلے عالمِ تقدیر میں موجود ہوتا ہے، جس کو وجودِ علمی تقدیری کہا جاتا ہے۔ جس نے دنیا میں آنا ہے، اسی وجود پر اللہ تعالیٰ انبیاءؑ اور اولیاء کو مطلع فرماتے ہیں، یعنی ان کے جزوی واقعات کے متعلق اطلاع من اللہ ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اطلاع دے دی تو غیب نہ رہا۔

علمِ غیب کی تعریف

وَيُعْرَفُ بِالْحَوَاسِ الظَّاهِرَةِ وَلَا بِبَدَاهَةِ الْعَقْلِ...

''اس لیے جس کو ظاہری آنکھیں دیکھ لیں یا عقل کی روشنی سے معلوم ہو سکے وہ غیب کی تعریف میں نہیں آتا۔''

Scanned with CamScanner

غیب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ علم اس کا ذاتی ہو، کسی واسطہ یا ذریعہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حادث نہ ہو، اس کی ابتدا اور انتہا نہ ہو۔

جو علم ذاتی نہ ہو، وحی، کشف یا الہام کے واسطہ سے حاصل ہو، یا خواب کے ذریعہ سے حاصل ہو، اسے علمِ غیب کہنا صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو سراپا جہالت میں غرق ہیں اور جنہیں علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔

انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کو قبل از وجود اشیاء کا انکشاف

'فیض الباری' میں ہے:

"جان لو! کہ اولیاء اللہ جس چیز کو اس کی پیدائش سے پہلے دیکھتے ہیں، اس کا بھی ایک قسم کا وجود ہوتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ ایک مدرسہ کے پاس سے گزرے تو ہوا کا جھونکا آیا۔ آپؒ نے فرمایا، "مجھے اس میں ایک مردِ خدا کی خوشبو آرہی ہے۔" چنانچہ (سو سال بعد) وہاں ابوالحسن خرقانیؒ پیدا ہوئے۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں یمن کی طرف تجلیاتِ باری دیکھتا ہوں۔" چنانچہ وہاں اویسِ قرنیؒ پیدا ہوئے۔ یہ بھی پیدائش سے قبل ایک قسم کے وجود کی دلیل ہے۔"

اسی کتاب میں فرماتے ہیں کہ شریعت کی رو سے ثابت ہے کہ اشیاء کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ایک قسم کے وجود ہوتے ہیں۔ پھر صفحہ ۳۳۷ پر فرمایا: "میں نے یہی بات کہی ہے کہ اشیاء کے اس دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے بھی ایک قسم کے وجود ہوتے ہیں۔ جو فتنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا اور وہ گھروں کے دروازوں کے درمیان ٹھیک ثابت ہوئے (عین اسی طرح واقع ہوئے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے وجود میں آنے سے پہلے کشفاً دیکھ لیا تھا۔ اُن کا بھی ایک قسم کا وجود تھا۔"

اور 'روح المعانی' میں ہے کہ "اولیاء اللہ اس دنیا کی زندگی میں جنت کی سیر کرتے ہیں۔"

صوفیاء کرام نے فرمایا کہ (وہ جنت جس میں آدمؑ کو اللہ نے رکھا تھا) وہ زمین پر برزخی جنت ہے جو جبلِ یاقوت کے پاس ہے۔ صوفیاء کی ارواح (حیاتِ دنیوی میں) حالتِ کشف میں اس جنت کی سیر کرتی ہیں، اجسامِ مادی کے ساتھ نہیں۔

عوام الناس کا نیند کی حالت میں خواب میں مختلف اشیاء دیکھنا ایک عام سی بات ہے جو کسی کے لیے بھی حیرت کی بات نہیں۔ یہی صورت اولیاء اللہ کو بیداری کی حالت میں پیش آتی ہے جیسے نیند کی حالت میں آنکھیں بند ہوتی ہیں، حرکات ختم اور خیالات کی جولانی بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اولیاء اللہ بیداری کی حالت میں اندھیرے کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں، آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس یکسوئی کی حالت میں ان پر حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

'مرقاۃ' میں مُلّا علی قاری فرماتے ہیں: "تاریکی ذکر کے دوران دلوں کو بہت جلا بخشنے والی ہے۔"

'فیض الباری' میں ہے:

"اولیاء اللہ کشف میں دل کی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے اور انبیاء کرام غیب کی چیزوں کو ظاہر کی آنکھ سے بیداری کی حالت میں دیکھتے ہیں، جن کو عوام نہیں دیکھ سکتے۔"

ہر چیز کی ایک صورت ہوتی ہے اور ہر چیز کی ایک حقیقت بھی ہوتی ہے۔ ظاہری نگاہ صورت تک پہنچ کر رک جاتی ہے کیونکہ اُس کی حد وہاں تک ہے مگر بصیرت یا باطن کی نگاہ صورت سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جاتی ہے۔ اور نگاہ وہی ہے جو حقیقت کا کھوج لگالے۔

سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے بکری کا جگر نبی اکرم ﷺ کے لیے رکھا۔ سائل نے دروازے پہ صدا دی۔ سیدہؓ نے اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ جگر آپؓ نے نبی پاک ﷺ کے لیے رکھا تھا۔ آپ ﷺ گھر تشریف لائے، کھانے کو کچھ طلب کیا۔ سیدہؓ نے عرض کیا کہ بکری کا جگر ہے، پیش کیے دیتی ہوں۔ جا کر دیکھا تو وہاں پتھر دھرا تھا۔ سیدہؓ نے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کوئی سائل آیا تھا جسے آپؓ نے انکار کیا؟ سیدہؓ نے جواباً ہاں کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ کی راہ میں دیئے جانے سے انکار ہوا تو جگر نہ رہا پتھر ہو گیا۔ یعنی اس کی صورت جگر کی لیکن حقیقت محض ایک پتھر کی ہو گئی کیونکہ خانہ رسول ﷺ تھا اس لیے اس کی حقیقت ظاہر کر دی گئی۔

علمائے ظاہر بین اور حقیقت شناس عارفین میں یہی فرق ہے۔ جیسا کہ 'فیض الباری' میں اگلے ہی صفحے پر فرمایا:

"علمائے ظاہر کی نگاہ مضبوط ہے مگر اربابِ حقائق، صوفیاء کی نگاہ بہت آگے ہے اور بڑی لطیف ہے۔ علمائے ظواہر تو ظاہر شریعت پر عمل کرتے ہیں جبکہ اولیاء اللہ ان امور (باطنی نتائج) کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ شریعت کے حقائق و رموز میں سے بذریعہ کشف ان پر ظاہر کرتا ہے۔ اور حدیث مطہرہ میں ہے کہ ہر آیت قرآنی کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ اور ہر چیز کی ایک حد ہے لیکن جس کو اللہ نورِ بصیرت نہ دے، اس کے لیے کوئی نور نہیں۔

صورتِ اشیاء اور حقیقتِ اشیاء میں جو فرق ہے، اس کو سمجھنے سے پہلے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا قصہ کافی ہے۔ کچھ نام نہاد عالم حقائق کے علم کو (جو اشیاء کی حقیقت واصلیت کا علم ہے) اور علمِ اسرار (جو اشیاء کی حقیقت اور ان کی صورت کے پیچھے چھپے رازوں کا علم ہے) کو علمِ غیب کی کوئی قسم سمجھتے ہیں۔

علمِ غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، اس کے سوا دوسری کوئی ہستی کائنات میں ایسی نہیں جو علام الغیوب ہو۔ لیکن وہ لوگ اپنے اسی مفروضے کی بناء پر کشف کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے اس اعتراض کا علمی جواب پہلے کسی باب میں دیا جا چکا ہے۔ اس پر تو کوئی بحث نہیں کہ اعتراض میں کوئی وزن ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن و حدیث کو اپنا راہنما بنا کر اُن کے پیچھے چلنے کے عادی ہی نہیں۔ یہ معاذ اللہ! اللہ اور رسول ﷺ کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے قرآن و حدیث میں صرف اسی کو حق مانتے ہیں جو ان کے اپنے ایجاد کردہ عقیدے کے مطابق ہو۔

Scanned with CamScanner

'فیض الباری' میں اس مسئلے پر اصولی بحث کی گئی ہے:

خوب سمجھ لو کہ مغیباتِ خمسہ (یعنی پانچ چیزیں جن کا علم نہیں) کا تعلق امورِ تکوینی (قدرت کی طرف سے صادر ہونے والے امور) سے ہے، تشریعی (شریعت) سے نہیں۔ (جیسے موسیٰ کے اعتراض شریعت کے مطابق تھے، حضرت خضر کے جواب امورِ تکوینی تھے۔) اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کسی نبیؑ کو اطلاع نہیں دی اور اس کی چابیاں اپنے پاس رکھیں (یعنی سارے کا سارا علم اپنے پاس محفوظ رکھا) اور فرمایا کہ غیب کی چابیاں اس کے پاس ہیں۔ اس (اللہ تعالیٰ) کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ چونکہ انبیاء کرامؑ شریعت کے احکام بیان کرنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، اس لیے ان کے منصب کے مناسب شریعت کے علوم ہی ہیں، امورِ تکوینی نہیں (یعنی انہیں سمجھانا ان کا منصب نہیں)۔ پھر علوم خمسہ سے مراد اصولِ علم ہیں (علم کی بنیاد، وہ علم جن پر باقی تمام علوم کی بنیاد ہے)، جزئیات نہیں۔ جزئیات کا علم تو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو بھی دے دیتا ہے کیونکہ 'جزوی علم' حقیقت میں علم ہے ہی نہیں کیونکہ وہ قابلِ تغیّر و تبدل ہے۔

اس حقیقت کو مُلّا علی قاری نے 'مرقاۃ'، جلد اول، صفحہ ۶۵ پر یوں بیان فرمایا ہے:

اگر تُو کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان مغیبات میں سے بہت حصوں کے متعلق انبیاءؑ اور اولیاء کو خبر دے دی ہے تو حصر (علم کی حفاظت) کیسے ہوا؟ میں کہوں گا کہ کلیات کے اعتبار سے حصر ہے، جزئیات کے لحاظ سے نہیں۔ (کلی علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اللہ سارا علم کسی کو نہیں دیتا۔ ہاں جزئیات کا علم دے دیتا ہے کیونکہ علم کی جزئیات پر کلی علم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کا رکھنے والا اس علم کا حامل نہیں کہلا سکتا۔) یعنی جزئیات میں سے انبیاء اور اولیاء کو اطلاع دے دی جاتی ہے جو منافیِ حصر (حفاظتِ علم) نہیں۔

نگاہ کا صورتِ اشیاء تک پہنچ کر (وہیں) رک جانا، اور شے کے بنانے والے تک نہ جانا، بڑا حجاب ہے اور یہ حجاب درحقیقت عذاب ہے۔ جیسا کہ 'مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح' کی جلد اول کے صفحہ ۷۵ پر ہے وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ ...مِنْ نُّوْرٍ... کہ جس کے لیے اللہ نور نہ بنائے اس کے لیے کوئی نور نہیں، کے سلسلے میں فرمایا:

"صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حجاب شدید ترین عذاب ہے۔"

جب نظر حقیقتِ اشیاء تک نہ پہنچ سکے، دنیا و ما فیہا کی اصلیت و حقیقت نظر سے اوجھل ہو تو مقصدِ زندگی تک بھی سوچ و فکر کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ تو اس سے بڑا عذاب کیا ہوگا کہ انسان نہ خالق کو پہچانے، نہ اپنا مقصدِ تخلیق سمجھ سکے اور نہ ہی کائنات کی حقیقت سمجھ پائے۔

اس سلسلے میں ایک سوال توجہ طلب ہے کہ انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کو کشف میں جو اشیاء قبل از وجود دکھائی دیتی ہیں ان کا اصل وجود ہوتا ہے؟ کیا یہ وجود مثالی ہوتا ہے؟ کچھ لوگوں نے اپنی اٹکل سے یہی رائے ظاہر کی ہے کہ وہ اشیاء کا وجود مثالی ہوتا ہے مگر یہ رائے بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ:

۱۔ مثال (نقل) اس چیز کی ہوتی ہے جس کا وجودِ اصلی پہلے سے موجود ہو۔ جس کا وجود ہی نہیں ہے تو مثال (نقل) کیونکر ہوگی۔

۲۔ انسانوں میں وجودِ مثلی (مثالی وجود یا اس جیسا ایک دوسرا وجود) سے تماثلِ نوعی یعنی اسی قسم کی مثال مراد ہوتا ہے کہ یہ

دونوں ایک ہی نوعِ انسانی کے فرد (تمثیل) ہیں۔ جب مثالی شے (اس کی تمثیل) کا کوئی وجود ہی نہیں ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ وجودِ مثالی اسی انسان کا فرد (تمثیل) ہے؟ جیسا کہ خواب میں دکھائی دینے والی چیز کا کوئی وجود نہیں ہوتا، بلکہ اس کا وجود صرف دیکھنے کی حد تک ہے۔ پھر معدوم ہو جاتا ہے۔

۳۔ کشف میں جو وجود نظر آتا ہے وہ اس طرح کا ہے جیسے کسی مقرر کے ذہن میں تین چار گھنٹے کی تقریر کا وجود (خاکہ) موجود ہوتا ہے۔ پھر اسی تقریر کو زبان پر لاتا ہے یعنی جس تقریر کا وجود علمی تقدیری (پہلے سے لکھا ہوا) اس کے ذہن میں موجود تھا، اسی وجود کو زبان پر لا کر بیان کیا۔ اگر مقرر کے ذہن میں تقریر کا وجودِ مثالی مانا جائے تو علم بھی وجودِ مثالی کا ہوگا اور تقریر بھی وجودِ مثالی کی ہوگی کیونکہ جب اصل وجود کا علم ہی نہ تھا تو اس کا بیان کیونکر ہوگا۔

اسی طرح مستری کے ذہن میں مکان کا جو نقشہ ہوتا ہے، وہی مادی طور پر اینٹ پتھر سے مل کر خارج میں ظاہر ہوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ذہن میں وجودِ مثالی کا نقشہ تھا اور مکانِ مثالی ہی تیار ہوا۔ مختصر یہ کہ جو وجود ذہن میں ہوتا ہے اس پر خارج میں ثمرات، اثرات اور احکام کی بنا ہوتی ہے۔

اسی طرح تمام اشیاء کا وجود علمی، تقدیری عند اللہ حاضر ہے۔ وہ اپنے قدیم ازلی علم سے ان کو جانتا ہے۔ وہی وجود اپنے وقت پر خارج (ظاہر) میں مادی دنیا میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

"پس وجودِ خارجی آثار کا مبدأ (جس سے بنیاد بنتی ہے) ہے اور احکام کا ظاہر کرنے والا ہے اور اسی پر وجودِ ذہنی کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہر شے کا وجود اس کی پیدائش سے پہلے عالمِ تقدیر میں موجود ہوتا ہے، جس کو وجودِ علمی و تقدیری کہا جاتا ہے۔ جس نے دنیا میں آنا ہے اسی وجود پر اللہ تعالیٰ انبیاء اور اولیاء کو مطلع فرماتے ہیں۔ اس کی خبر ان ہستیوں کو دیتے ہیں یعنی آنے والے حادثات و واقعات کی جزئیات (کچھ حصے جو اللہ بتانا چاہیں) کی اطلاع ان مبارک ہستیوں کو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ یعنی ان کے جزوی واقعات کے متعلق اطلاع من جانب اللہ ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اطلاع دے دی تو غیب تو نہ رہا۔

علمِ غیب کی تعریف:

وَيُعْرَفُ بِالْحَوَاسِ الظَّاهِرَةِ وَلَا بِبَدَاهَةِ الْعَقْلِ...

۱۔ "اس لیے جس کو ظاہری آنکھیں دیکھ لیں یا عقل کی روشنی سے معلوم ہو سکے وہ غیب کی تعریف میں نہیں آتا۔"

۲۔ غیب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ علم کسی کا ذاتی ہو، کسی واسطہ یا ذریعہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حادث نہ ہو یعنی اس کی ابتدا اور انتہا نہ ہو۔ یہ نہیں کہ پہلے وہ علم نہیں تھا پھر کہیں سے مل گیا، جاننے والا اسے ہمیشہ سے جانتا ہو۔

جو علم ذاتی نہ ہو، کہیں سے حاصل ہوا ہو، وحی، کشف یا الہام کے واسطہ سے حاصل ہو، یا خواب کے ذریعہ سے حاصل ہو اسے علمِ غیب کہنا جہلاء کا کام ہے جو اپنی جہالت میں سرتاپا غرق ہیں اور انہیں علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔

Scanned with CamScanner

کشف اور الہام از قبیل وحیٔ انبیاءؑ ہیں

قَالَ ابْنُ حَجَرٍ وَ هٰذَا الْمَقَامُ الَّذِيْ اَشَارَ اِلَيْهِ هُوَ الْاِلْهَامُ وَ هُوَ مِنْ جُمْلَةِ اَصْنَافِ الْوَحْيِ اِلَى الْاَنْبِيَاءِ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من رای النبی ﷺ فی المنام، ۱۲: ۳۸۸)

"اور مقامِ اشار الیہ الہام ہے اور وحیٔ انبیاء کی قسموں میں سے ہے۔"

کشف اور الہام از قبیل وحیٔ انبیاءؑ ہیں

ابنِ حجر فرماتے ہیں کہ جس مقام کی طرف اشارہ کیا گیا (کیونکہ ان کی تحریر میں سے صرف ایک چھوٹا سا اقتباس لیا گیا ہے اور وہ پہلے سے جاری بات فرمار ہے ہیں) یہ الہام ہے اور یہ وحیٔ انبیا کی قسموں میں سے ہے۔ یہ بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح نبیؑ پر وحی آتی ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ نبی کی وحی قطعی ہوتی ہے اور الہام ظنی ہوتا ہے۔ اگر وحی کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے، وحی سے ٹکراتا ہے تو یہ باطل ہے اور وحی حق ہے۔

کشف اور خواب میں فرق

اِنَّ الْمَنَامَ يَرْجِعُ اِلٰى قَوَاعِدَ مُقَرَّرَةٍ وَلَهٗ تَاوِيْلَاتٌ مُخْتَلِفَةٌ وَيَقَعُ لِكُلِّ اَحَدٍ بِخِلَافِ الْاِلْهَامِ فَاِنَّهٗ لَا يَقَعُ اِلَّا لِلْخَوَاصِّ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من رای النبی ﷺ فی المنام، ۱۲: ۳۸۸)

"خوابوں کے لیے ایک قانونِ تعبیر مقرر ہے اور ان کی مختلف تعبیرات ہوتی ہیں اور خواب ہر شخص دیکھتا ہے، اس کے برعکس الہام، خواص سے مختص ہے۔"

کشف اور خواب میں فرق

خواب میں انسان عجیب وغریب چیزیں دیکھتا ہے۔ کبھی دیکھتا ہے کہ فلاں ملک گیا ہوا ہوں، کبھی مدتوں پہلے کا فوت شدہ شخص خواب میں نظر آتا ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ کشف اور خواب میں کیا فرق ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ فتح الباریؒ میں ہے کہ "خوابوں کے لیے ایک قانونِ تعبیر مقرر ہے" خواب تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو بسیار خور انسان کے معدے کی ریاحی تکلیف دماغ کو پریشان کرتی ہے۔ طرح طرح کے خیالات مختلف صورتوں میں متشکل ہو کر سامنے آتے تھے۔ ان خوابوں کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ اضغاث احلام، پریشان خیال۔ جس طرح شاہِ مصر نے دبلی اور موٹی گائیوں اور دبلی اور موٹی بالیوں والا خواب سنایا (سورۂ یوسف) تو انہوں نے تعبیر، اضغاث احلام یعنی خیالاتِ فاسدہ بتائی۔ لیکن وہ

Scanned with CamScanner

پریشان خیالی نہیں تھی، حضرت یوسف نے اس کی تعبیر بتا دی۔ دوسری قسم 'تسویل الشیطان' ہے جس میں برائی، خرابی، ڈرائنے مناظر ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ایسے خواب سے جاگنے پر 'لاحول' تین دفعہ پڑھ کر بائیں جانب تھوک دو۔ تیسری قسم کا خواب من جانب اللہ ہوتا ہے۔ اس تعبیر کا ایک قانون ہے جو اس سے واقف ہوں وہی تعبیر کو سمجھ سکتے ہیں جیسے حضرت یوسفؑ نے تعبیر بتائی۔ پھر خواب تو کوئی بھی دیکھ لیتا ہے، کشف والہام ہر شخص کو نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کے خاص بندوں کو ہوتا ہے جو خلوصِ دل رکھتے ہیں، جن کا عقیدہ و عمل درست ہوتا ہے۔ الہام کو خواب سے ملانے کا کوئی جواز نہیں۔

کشف والہام بدکاروں کا حصہ نہیں

وَ قَوْلُهٗ ﷺ قَدْ كَانَ فِي الْأُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ. فَثَبَتَ بِهٰذَا اَنَّ الْاِلْهَامَ حَقٌّ وَ اَنَّهٗ وَحْیٌ بَاطِنٌ، وَاِنَّمَا حُرِمَهُ الْعَاصِیْ لِاِسْتِیْلَاءِ وَحْیِ الشَّیْطٰنِ عَلَیْهِ...

(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من رای النبی ﷺ فی المنام، ۱۲:۳۸۸)

"(حضور ﷺ نے فاروقِ اعظمؓ کو محدث فرمایا) اور فرمایا کہ امم سابقہ میں بھی محدث ہوئے ہیں۔ اس سے الہام کا وحیِ باطنی اور حق ہونا ثابت ہوا۔ اور بدکاروں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے کیونکہ ان پر وحیِ شیطانی کا غلبہ ہوتا ہے۔"

کشف والہام بدکاروں کا حصہ نہیں

ایسے قلوب جن پر شیطان کا غلبہ ہو اور جنہیں شیطان القا کرتا ہو وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِیٰٓئِهِمْ... (الانعام:۱۲۱) یہ بات پہلے بھی ہو چکی کہ جو لوگ ان سے دوستی کر لیتے ہیں، شیاطین ان پر القا کرتے ہیں۔ ان کو کشف والہام نصیب نہیں ہوتا۔ یہ نیک لوگوں کا حصہ ہے۔

الہام کا انکار مردود ہے

قَالَ ابْنُ السَّمْعَانِیْ وَ اِنْكَارُ الْاِلْهَامِ مَرْدُوْدٌ وَ یَجُوْزُ اَنْ یَّفْعَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی بِعَبْدِهٖ مَا یُكْرِمُهٗ بِهٖ... (ایضاً، ۲:۳۸۸، ۳۸۹)

"ابن سمعانی نے فرمایا کہ الہام کا انکار مردود ہے۔ یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو بوجہِ الہام مکرم بنا دے۔"

Scanned with CamScanner

الہام کا انکار مردود ہے

یعنی کشف والہام سے انکار کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بات قرآن وحدیث سے ثابت اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر یہ انعام کردے اور اسے اس کے لیے باعثِ عزت بنادے۔

کشف والہام خاص اہل اللہ کا حصہ ہے

وَنَحْنُ لَا نُنْكِرُ اَنَّ اللهَ يُكْرِمُ عَبْدَهٗ بِزِيَادَةِ نُوْرٍ مِّنْهُ يَزْدَادُ بِهٖ نَظَرُهٗ وَيَقْوِىْ بِهٖ رَاْيُهٗ...وَاِنَّمَا هُوَ نُوْرٌ يَّخْتَصُّ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ...

(فتح البارى ، شرح صحيح البخارى، كتاب التعبير، باب من راى النبى ﷺ فى المنام، ۱۲: ۳۸۹)

"اور ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مکرم بنائے، اس کے نور قلبی میں اضافہ کرکے اس کی قلبی نظر کو قوی بنادے۔۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا نور ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے خصوصی طور پر عطا فرمادے۔"

کشف والہام خاص اہل اللہ کا حصہ ہے

'فتح الباری' میں ہے کہ "ہم اس بات سے منکر نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے کسی بندے کے نورِ قلبی میں اضافہ کردے اور اس کی قلبی نظر کو قوت عطا کردے۔ اس کشف والہام کے اکرام سے اسے مکرم بنادے، عزت عطا کردے۔

یعنی خواب ہر کوئی دیکھتا ہے۔ القائے شیطانی بدکاروں کو ہوتا ہے جو شیطان کو اپنا دوست رکھتے ہیں اور وہ ان کو الٹی بولی چیزیں بتاتا رہتا ہے لیکن کشف والہام عزت واکرام کا باعث ہے جو اللہ اپنے مقرب بندوں کو عطا کرتا ہے۔

کشف میں انقلابی اثر ہے

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ...الخ (الاعراف: ۱۲۰)

فَمَا رَفَعُوْا رُءُوْسَهُمْ حَتّٰى رَاَوُا الْجَنَّةَ وَالنَّارَ وَثَوَابَ اَهْلِهِمَا...الخ

(تفسیر ابن کثیر، ۲: ۲۴۷)

"ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ساحرینِ فرعون جو حضرت موسیٰؑ کے مقابل تھے، انہوں نے سجدے سے اس وقت سر اٹھایا جب جنت دوزخ اور عذاب وثواب دیکھ لیا۔"

Scanned with CamScanner

فائدہ:

یہ ہے کشف کا انقلابی اثر۔ ساحرینِ فرعون نے درباری قرب کو چھوڑا، انعام سے دستبردار ہوئے اور موت کا بخوشی اختیار کرنے کا اعلان کر دیا، کیونکہ کشف سے حقیقت واضح ہو چکی تھی اس لیے زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔

کشف میں انقلابی اثر ہے

قرآنِ کریم میں ہے جب فرعون کے جادوگر موسیٰؑ کے مقابلے میں آئے اور انہوں نے معجزہ دیکھا اور ایمان لے آئے۔ سر بسجود ہو گئے وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ... الخ۔ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں "تفسیر ابن کثیر" میں لکھا ہے، جب جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھا تو کیونکہ وہ خود جادوگر تھے، اس لیے فوراً سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں، اللہ کی شان کا مظہر ہے تو فوراً ایمان لے آئے اور سجدہ ریز ہوئے تو اللہ نے کشفاً انہیں جنت، دوزخ، ان کے عیش و عذاب سب دکھا دیئے۔ آخرت کو دیکھ کر ہی سجدہ سے سر اٹھایا۔ جب اٹھے تو فرعون نے کہا میں ہاتھ، پاؤں کاٹ دوں گا، سولی دے دوں گا تو انہوں نے سارا آخرت اور قیامت کا منظر بیان فرمایا اور ثواب و عذاب بیان کیے کہ ہم اس سزا کو قبول کرتے ہیں کیونکہ کشفاً اس کا اجر و ثواب دیکھ چکے تھے۔ اللہ نے جب پردہ اٹھا کر اصل حقیقت دکھا دی تو اس کا انقلابی اثر ہوا کہ کہاں تو وہ جادوگر، فرعون کا قرب اور انعام و اکرام چاہ رہے تھے، پھر ہر چیز کو ٹھوکر مار کر بخوشی موت کو گلے لگانے پر تل گئے۔ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ... (الاعراف: ۱۱۳) کو بھول گئے۔ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ... (الاعراف: ۱۱۴) کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اللہ کے حضور جھک گئے اور پھر مرنا تک قبول کر لیا کیونکہ کشف نے حقیقت واضح کر دی تھی۔

حقیقی ایمان بھی ایمانِ شہودی ہے

امام غزالیؒ نے ایمان کی مختلف قسمیں بیان فرمائی ہیں اور ہر قسم کی کچھ تفصیل بھی فرما دی ہے:

اَلْاَوَّلُ الْاُصُوْلِیُّ: قِشْرُ الْقِشْرِ وَهُوَ اِيْمَانُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْعِيَاذُ بِاللهِ...

اَلثَّانِيُّ: اَلتَّصْدِيْقُ بِمَعْنَى الْكَلِمَةِ وَالْاِيْمَانِ عُمُوْمُ الْمُسْلِمِيْنَ...

اَلثَّالِثُ: اِنْ شَاهَدَ ذٰلِكَ بِطَرِيْقِ الْكَشْفِ وَهُوَ مَقَامُ الْمُقَرَّبِيْنَ وَذٰلِكَ بِاَنْ يَّرٰى اَشْيَاءَ كَثِيْرَةً وَلٰكِنْ صَدَرَتْ مِنَ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ...

اَلرَّابِعُ: اَنْ لَّا يَرٰى اِلَّا وَاحِدًا وَهُوَ مُشَاهَدَةُ الصِّدِّيْقِيْنَ...

(مختصر احیاء العلوم المسمی المرشد الامین، ۲۸)

عَنِ الْحَارِثِ بْنِ مَالِكِ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّهٗ مَرَّ بِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقَالَ لَهٗ كَيْفَ اَصْبَحْتَ

Scanned with CamScanner

يَاحَارِثُ؟ قَالَ: اَصْبَحْتُ مُؤمِنًا حَقًّا وَ قَالَ: اُنْظُرْ مَا تَقُوْلُ فَاِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيْقَةً فَمَا حَقِيْقَةُ اِيْمَانِكَ؟ فَقَالَ: قَدْ عَزَفَتْ نَفْسِيْ عَنِ الدُّنْيَا فَاَسْهَرْتُ لَيْلِيْ وَ اَظْمَأْتُ نَهَارِيْ وَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى عَرْشِ رَبِّيْ بَارِزًا وَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَزَاوَرُوْنَ فِيْهَا...وَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى اَهْلِ النَّارِ يَتَضَاغَوْنَ فِيْهَا...
فَقَالَ: يَاحَارِثُ عَرَفْتَ فَالْزَمْ ثَلَاثًا... (تفسیر ابن کثیر، ۲۸۶:۲)

"حارث بن مالک فرماتے ہیں کہ میں رسول کریم ﷺ کے پاس سے گزرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اے حارث! کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا، حقیقی مومن ہوں۔ فرمایا، سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو۔ ہر شے کی حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے! تو حارثؓ نے کہا کہ میرے ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ میرا نفس دنیا سے منہ موڑ چکا ہے، یکسر دنیا میں مخلوق پر نگاہ نہیں، رات کو رب کو یاد کرتا ہوں دن کو روزہ رکھتا ہوں۔ کشف کی یہ حالت ہے کہ عرشِ الٰہی کو ظاہر باہر دیکھتا ہوں۔ اہلِ جنت کو دیکھتا ہوں کہ ایک دوسرے سے ملاقات کررہے ہیں اور اہل دوزخ کو چیختا ہوا دیکھتا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا، اے حارث! تو نے ٹھیک پہچانا! پس اسے لازم پکڑ (تین بار فرمایا)۔"

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مقربین اور صدیقین کا ایمان اصل اور کامل ایمان ہے، اور وہ شہودی ہے۔

امام ربانیؒ دفتر دوم، مکتوب نمبر ۸ میں فرماتے ہیں:

ایمان بغیب کہ نصیبِ اخصِ خواص است و ررنگ ایمانِ غیب عوام نیست، عوام بسماع یا باستدلال ایمان بغیب حاصل کردہ اند و اخصِ خواص غیب الغیب را در پس پردہائے ظِلالِ جمال وجلال و ورائے سِر اوقاتِ تجلیّات و ظہورات مطالعہ نمودہ ایمان بغیب حاصل نمودہ اند و متوسطان ظلال را اصل انگاشتہ و تجلیات را عین متجلی دانستہ بایمان شہودی خرسند اندور حقِ ایشان ایمان بغیب نصیبِ اعدا است۔۔۔ (مکتوباتِ امام ربانی، دفتر دوم، حصہ ششم، مکتوب ۸، ص:۲۶)

"ایمان بالغیب جو اخصِ خواص کے نصیب ہے عوام کے ایمان بالغیب کی طرح نہیں۔ عوام نے سماع اور استدلال کے ساتھ ایمان بالغیب حاصل کیا اور اخص نے جمال وجلال کے ظلال وتجلیات وظہورات کے پردوں کے پیچھے غیب الغیب کا مطالعہ کرکے ایمان بالغیب حاصل کیا ہے اور متوسط ظلال کو اصل خیال کرکے اور تجلیات کو عین متجلی جان کر ایمانِ شہودی کے ساتھ خوش ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان بالغیب نصیبِ اعدا ہے۔"

اور تفسیر عزیزیؒ پارہ الٓم میں ہے:

ایمان دو قسم ست ــ اول: ایمانِ تقلیدی، دوم: ایمانِ تحقیقی، و تحقیقی نیز دو قسم ست، استدلالی وکشفی، وہریک ازایں دو قسم با انجامے دارد کہ ازاں حد تجاوز نمیکند یا انجامے ندارد آنکہ انجام ندارد نیز دو قسم ست یا مشاہدہ است کہ مسمی بعین الیقین ست و باشہودِ ذاتی ست

Scanned with CamScanner

(تفسیر عزیزی، ۱:۸۸)
کہ مسمی بحق الیقین ست۔۔۔

"ایمان کی دو قسمیں ہیں: اول ایمانِ تقلیدی، دوسرے ایمانِ تحقیقی۔ اور تحقیقی کی بھی دو قسمیں ہیں: استدلالی اور کشفی، اور ہر ایک ان دو قسموں سے یا نہایت (حد) رکھے اور اس حد سے تجاوز نہ کرے۔ جو نہایت (حد) نہ رکھے اس کی مزید دو قسمیں ہیں: یا مشاہدہ ہے کہ اس کا نام عین الیقین ہے، اور یا مشہودِ ذاتی ہے کہ نام اس کا حق الیقین ہے۔"

حقیقی ایمان بھی ایمانِ شہودی ہے

یہاں امام غزالی نے ایمان کی مختلف قسمیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی قسم:۔ منافق کا ایمان: منافق کا ایمان اس سانپ کی طرح ہے جو اپنی کینچلی بدلتا ہے۔

دوسری قسم:۔ تصدیق بمعنی کلمہ اور ایمان: یہ عام مسلمانوں کا ایمان ہے۔

تیسری قسم:۔ مقربین کا ایمان: اگر کوئی اس کا مشاہدہ کشف کے طور پر کرے تو وہ مقربین کا مقام و مرتبہ ہے اور وہ اس طرح کہ بہت اسباب دیکھے لیکن وہ واحد وقہار کی جانب سے صادر ہو۔

چوتھی قسم:۔ صدیقین کا ایمان: وہ ایک ہی چیز دیکھتا ہو تو یہ صدیقین کا مشاہدہ ہے۔

ایمان کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایمان ویقین کی پختگی انسان کو اس درجہ پر لے جائے جہاں تمام پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ جائیں اور جس جس چیز پر وہ بن دیکھے محض زبانِ رسول ﷺ پر اعتبار کر کے ایمان لایا ہے، اللہ اس اعتبار کے صدقے میں اسے ان چیزوں کا مشاہدہ، قلب کی آنکھ سے کرا دے۔ جو ایمان کتاب سے پڑھ کر یا عالم سے سن کر غیوب پر ہوتا ہے، وہ بھی ایمان ہے لیکن اگر مشاہدہ ہو جائے تو کشف ایمان کی مزید تائید کر دیتا ہے تو وہ درجۂ ایمان، حقیقی ایمان ہے۔ جیسا کہ حارث انصاریؓ فرماتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ سے سرِ راہ ملے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "حارث! آج کس حال میں صبح کی؟" انہوں نے عرض کیا، "میں نے ایمان کے ساتھ صبح کی" (یعنی حقیقی مومن کی حیثیت سے صبح کی)۔ آپ ﷺ نے فرمایا، "ذرا سوچ کر کہو کیا کہہ رہے ہو! چونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟" (کیونکہ تم کہہ رہے ہو کہ تم نے حقیقی ایمان کے ساتھ صبح کی ہے)۔ حارثؓ عرض گزار ہوئے کہ میرا نفس دنیا سے منہ موڑ چکا ہے۔ کاروبارِ حیات میں میرا طریقِ زندگی یہ ہے کہ میں اپنی احتیاجوں، اپنی ضرورتوں کے لیے مخلوق کی بجائے خالق پر بھروسہ کرتا ہوں، رات کو رب کو یاد کرتا ہوں، دن کو روزہ رکھتا ہوں، اہلِ جنت و دوزخ کو ان کے حال میں دیکھتا ہوں۔ عرشِ الٰہی کو ظاہر و باہر یعنی بہت واضح دیکھتا ہوں۔

تو آپ ﷺ نے یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا کہ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اس کو لازم پکڑو۔"

لہٰذا اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مقربین اور صدیقین کا ایمان اصل اور کامل ہے اور ان کا ایمانِ شہودی ہے۔

Scanned with CamScanner

امام ربانی دفتر دوم، مکتوب نمبر ۸ میں فرماتے ہیں:

جو ایمان اللہ کے خاص الخاص بندوں کو نصیب ہوتا ہے وہ عوام کے ایمان بالغیب کی طرح نہیں کہ عوام نے سماع و استدلال کے ساتھ (سن اور سمجھ کر) ایمان بالغیب حاصل کیا ہے، جبکہ خواص نے تمام تر پردوں، حجابات اور تجلیات کے پارغیب الغیب کو دیکھ کر اسے حاصل کیا۔ ان کا ایمان انہیں اس درجے کا ادراک عطا کرتا ہے جو دلیل اور عقل سے ماورا ہے۔ متوسط یعنی عوام اور خواص کے درمیان کے لوگ جو کشف کی دولت رکھتے ہیں، امام ربانی کے مطابق یہ لوگ بھی عکس کو اصل سمجھ کر تجلیات اور جلوہ ریزی کو عین وہ ذات سمجھ بیٹھے ہیں جس کی کہ وہ تجلیات ہیں۔ وہ ظہورِ ذات (جو اللہ کی ذات کے مظاہر ہیں) کو اصلِ ذات سمجھ کر خوش ہیں کہ ان کے نزدیک ایمان بالغیب کی کوئی حیثیت نہیں۔

تفسیرِ عزیزی پارہ الٓمٓ میں ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں، ایک تقلیدی دوسرا تحقیقی۔ ایمانِ تحقیقی کی بھی دو اقسام ہیں، استدلالی اور کشفی۔ استدلالی ایمان علم الیقین ہے جیسے کسی نے دھواں دیکھا اور سمجھ لیا کہ آگ ہے۔ ایمانِ کشفی عین الیقین ہے کہ آگ دیکھ لی (جہاں سے دھواں اٹھ رہا ہے) اور اعلیٰ ترین درجۂ ایمان حق الیقین ہے، جیسے کوئی خود آگ میں گر گیا ہو۔ ظاہر ہے گرنے والے نے جس طرح آگ کو سمجھا، پہلے دو اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اصل ایمان اطمینانِ قلب ہے:

فَالطَّمَانِيْنَةُ اَصْلُ اُصُوْلِ الْاِيْمَانِ الَّتِيْ قَامَ عَلَيْهَا بِنَائُهٗ ثُمَّ يَطْمَئِنُّ اِلٰى خَبْرِهٖ عَمَّا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ اُمُوْرِ الْبَرْزَخِ وَ مَا بَعْدَهَا مِنْ اَحْوَالِ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى كَاَنَّهٗ يُشَاهِدُ ذٰلِكَ كُلَّهٗ عِيَانًا وَ هٰذَا حَقِيْقَةُ الْيَقِيْنِ... اِلٰى اَنْ قَالَ... فَهٰذَا هُوَ الْمُؤْمِنُ حَقًّا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرَةِ كَمَا فِيْ حَدِيْثِ الْحَارِثَةِ اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِكُلِّ حَقٍّ حَقِيْقَةً فَمَا حَقِيْقَةُ اِيْمَانِكَ؟ قَالَ عَزَفْتُ نَفْسِيْ عَنِ الدُّنْيَا وَ اَهْلِهَا وَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى عَرْشِ رَبِّيْ بَارِزًا وَ اِلٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَزَاوَرُوْنَ فِيْهَا وَ اَهْلِ النَّارِ لِيُعَذَّبُوْنَ فِيْهَا... فَقَالَ، عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهٗ... (کتاب الروح، ۲۶۹)

"پس اطمینانِ قلبی ایمان کی جڑ ہے جس پر ایمان قائم ہے، پھر اس کے بعد اس خبر کی طرف سے مطمئن ہونا جو احکام برزخ اور اس کے بعد احوال قیامت سے متعلق ہے یہاں تک کہ مومن یہ ساری چیزیں ظاہراً مشاہدہ کر رہا ہو۔ پھر فرمایا، یہی شخص یوم آخرت پر حقیقی ایمان رکھتا ہے جیسا حدیث حارثؓ میں ہے کہ میں حقیقی مومن کے طور پر صبح کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا، ہر دعوے کی حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا کہ میں نے دنیا اور اہل دنیا سے منہ پھیر لیا ہے، گویا کہ عرشِ الٰہی ظاہراً دیکھتا ہوں، اہلِ جنت کو دیکھتا ہوں کہ ایک دوسرے کی ملاقات کو جا رہے ہیں اور

اہلِ دوزخ کو دیکھتا ہوں کہ انہیں عذاب دیا جارہا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہے۔"

فائدہ:

اس سے ثابت ہوا کہ حقیقتِ ایمان اطمینانِ قلب کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اطمینانِ قلب ذکرِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کَمَا قَالَ تَعَالیٰ: اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ... اور حقیقتِ ایمان یہ ہے کہ مومن کا قلب اس قدر منور ہو جائے کہ اس کی روشنی میں عرشِ باری تعالیٰ جہاں سے امر نازل ہوتا ہے، نظر آ جائے، امور برزخ اور جنت دوزخ نظر آ جائیں۔ اسی کا نام کشف ہے اور یہی حقیقتِ ایمان کی دلیل ہے۔

سوال: جب دیگر صحابہ کرامؓ سے ایسے واقعات منقول نہیں تو کیا ان پر اعتراض وارد ہوگا؟

الجواب: ہر صحابی سے عدمِ نقل اور چیز ہے اور عدمِ کشف اور چیز ہے۔ عدمِ نقل سے عدمِ وجود کہاں ثابت ہوا؟ صحابہ کرامؓ کے انکشاف فرداً فرداً اتنے ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتے۔ ذخیرۂ احادیث ان سے بھرا پڑا ہے۔ چند مثالیں جو ہم نقل کر چکے ہیں اس سے استیعاب مقصود نہیں بلکہ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔

گزشتہ باب کا خلاصہ یہ ہے کہ کشف والہام وحیٔ باطنی ہے اور کمالاتِ نبوت ﷺ سے ہے اور نائب وخلیفۂ نبوت ہے۔ انقطاعِ نبوت اور انقطاعِ وحیٔ شرعی کے بعد یہ دلائل میں داخل ہے۔ یہ باطنی دولت انبیاء کا حصہ ہے جو بطور وراثت، انبیاء کی حقیقی اولاد یعنی تبعین کو ملتی ہے۔ اور یہ کہ کشف والہام بدکاروں کو نہیں حاصل ہوتا بلکہ خواص کو ہوتا ہے جن کے دل حقیقتِ ایمان سے منور ہو چکے ہیں۔

یہ بحث قدرے طویل ہوگئی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب ہمارے بعض نئے رفقائے حلقہ سے کشف القبور کے متعلق اظہار ہوتا ہے تو بات ذرا آگے چلتی ہے۔ نورِ بصیرت سے محروم مولوی نما لوگ جب سنتے ہیں تو چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور جھوٹے مدعیانِ ولایت و خلافت و سجادہ نشین جو اعلیٰ حضرت، خلیفۂ مجاز، پیر طریقت، رازدانِ شریعت، قطب الاقطاب، اور نہ جانے کیا کیا بنے بیٹھے ہیں۔ جب یہ باتیں سنتے ہیں تو دل ہی دل میں اپنی تہی دامنی پر نادم ہوتے ہیں مگر اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنے کے لیے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نسلاً بعد نسل یہ کمالات تو ہمارے نام رجسٹر ہو چکے ہیں۔ مگر رحمتِ الٰہی کو ایک خاص خاندان میں محدود کر دینے کی آخر کوئی دلیل؟ کوئی کہتا ہے کہ میاں کشف والہام کوئی چیز نہیں، اصل چیز تو رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ درست! مگر شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ کشف والہام رضائے الٰہی کا ثمرہ ہی تو ہیں۔ جن پر اللہ ناراض ہو، بھلا انہیں یہ انعام کیونکر عطا فرمائے گا؟

کوئی حسد کی آگ ذرا علمی رنگ میں اگلتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کشف ظنی چیز ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بجا! مگر یہ بھی تو فرمایئے کہ کیا کتبِ فقہ میں مذکور تمام مسائل قطعیہ ہی ہیں؟ کیا ذخیرۂ احادیث کی تمام حدیثیں متواتر اور قطعی ہیں؟ کیا وتر، سنت، نفل کی تعیین نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے؟ اگر محض ظنی ہونے کے احتمال پر کشف کی کوئی اہمیت نہیں تو فقۂ اسلامی

سے کیا سلوک کریں گے؟ کوئی یہ کہتا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ دین نقل ہے اور نقل خبر ہے اور خبر میں احتمال صدق و کذب دونوں کا ہے۔ تو پھر کیا اس احتمال پر پورے دین کو چھوڑ دینا چاہیے؟ کوئی کہتا ہے کہ کشف والہام کوئی حجتِ شرعی نہیں۔ اس کا تفصیلی جواب گزر چکا ہے، مختصر یہ ہے کہ اس کے انکار سے متواترات کا انکار لازم آتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کشف تو کافر کو بھی ہو جاتا ہے۔ یہ محض فریب ہے، جس گروہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہو کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ...(الاعراف: ۴۰) کیا اسے کشف ہو سکتا ہے؟ کیا وہ دوزخ جنت دیکھ سکتا ہے، ملائکہ اور انبیاءؑ کے ارواح سے ملاقات کر سکتا ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ اگر کافر کو کشف ہو جائے تو لازماً اپنے پیشواؤں اور آباؤ اجداد کو دوزخ میں جلتا ہوا دیکھے گا، تو کیا پھر وہ کفر پر قائم رہ سکتا ہے؟ اور اہلِ ایمان کو جنت میں دیکھ کر کفر پر ہی اڑا رہے گا؟ کافر کا عقیدہ ظلمت، عمل ظلمت، قول میں ظلمت، قلب میں ظلمت، کیا اندھیرے میں چیزیں نظر آتی ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ کافر کے لیے کشف نہیں۔

سب سے پہلے کشف کی حقیقت معلوم کر لینی چاہیے:

اَلْكَشْفُ عِنْدَ الصُّوفِيَةِ هُوَ انْكِشَافُ حَقَائِقِ إِلٰهِيَّةٍ لِلصُّوفِيِّ بَعْدَ اتِّخَاذِهِ طُرُقًا مَخْصُوصَةً لِلْوُصُولِ إِلٰى ذٰلِكَ وَأَهْلُ الْكَشْفِ عِنْدَهُمُ الَّذِيْنَ وَصَلُوْا إِلٰى مَقَامٍ سَامٍ فِي الصُّوفِيَّةِ فَيُشَاهِدُوْنَ حَقِيْقَةَ الْعَالَمِ الرُّوْحَانِيِّ مِنْ غَيْرِ نَظَرٍ قَلْبِيٍّ بَلْ بِنُوْرٍ يَّقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ...

صوفیوں کی اصطلاح میں کشف کی حقیقت یہ ہے۔ اگر کافر کو کشف ہوتا ہے تو ماننا پڑے گا کہ کافر اصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کافر کے دل میں وہ نور ڈال دیتا ہے کہ اسے حقائق الٰہیہ کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایمان لانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم، باب فی عجائب القلب میں فرمایا ہے کہ

وَالْكَشْفُ مِفْتَاحُ الْفَوْزِ الْأَكْبَرِ... (احیاء العلوم المسمی المرشد الامین، ۱۳۷)

جب کافر کو کشفِ اصطلاحی ہو جاتا ہے تو گویا اس کے ہاتھ میں فوزِ اکبر کی مفتاح آ گئی۔ کیا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ کافر کے کشف کی حقیقت امام ربانیؒ کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں:

کثرتِ جوع البتہ شفا بخش است و صفائے قلب می بخشند و جمیع دیگر را صفائے نفس صفائی قلب ہدایت افزاد نو بخش است و صفائے نفس ضلالت نماست و ظلمت افترا فلاسفۂ یونان و براہمہ و جوگیہ ہند ہمہ را ریاضت گرسنگی صفائی نفس بخشیدہ بضلالت و خسارت و دلالت نمودہ۔ افلاطونِ بے خرد اعتماد بر صفائے نفس خود نمودہ صُوَرِ کشفیہ خیالیہ خود را مقتدائے خود ساختہ عجب و رزید--- ندانست کہ ایں صفا از پوست رقیقہ امارہ او نگذشتہ است و امارۂ او برہمان خبث و نجاست خود است بیش ازیں نیست کہ نجاستِ مغلظہ را بشکر

Scanned with CamScanner

غلاف رقیق نمائند۔۔۔ (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، حصہ پنجم، مکتوب نمبر ۳۱۳،ص،۱۷۰)

معلوم ہوا کہ کافر اگر ریاضت کرے تو اس کو صفائے نفس حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر کشف عند الصوفیہ کا تعلق تو صفائے قلب سے ہے اور کافر کو صفائی قلب حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر کشف کیونکر ہو؟

حضرت لاہوریؒ فرماتے ہیں:

''یاد رکھیے! علم اور چیز ہے، تربیت اور چیز ہے۔ امراضِ روحانی کا فقط ایک علاج ہے، اور وہ اللہ والوں کی صحبت ہے۔ ان کی صحبت میں، اللہ کے پاک نام کی برکت سے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔۔۔ میں کیا عرض کروں، ان کے جوتوں کے ذروں میں وہ موتی ملتے ہیں جو بادشاہوں کے تاجوں میں نہیں ہوتے، بشرطیکہ عقیدت، ادب اور اطاعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ان میں سے ایک موتی حلال و حرام کی تمیز، دوسرا موتی ہے کشفِ قبور۔۔۔ جو سر پھرے نوجوان ان باتوں کو نہیں مانتے، ان سے کہا کرتا ہوں کہ چودہ سال کا خرچ میرے پاس جمع کرا دو تو تمہیں ایسے اللہ والوں کی صحبت میں بٹھاؤں گا جو تمہاری تربیت کریں گے پھر ایک منٹ میں تم بتا سکو گے کہ قَبْرُ هٰذَا الْمَقْبُوْرِ رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ وَقَبْرُ هٰذَا الْمَقْبُوْرِ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ۔۔۔'' (مجلسِ ذکر، حصہ اول: ۶۹، ۷۰)

حضرت لاہوریؒ نے کشفِ قبور کو جو کشفِ اصطلاحی کی ایک فرد ہے، ایک موتی قرار دیا ہے، جو اللہ والوں کی صحبت میں اللہ کے پاک نام کے ذکر کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔ اور ظاہر ہے کہ کافر ان دونوں شرائط سے محروم ہے، پھر اسے کشف کیونکر ہو؟

اور حضرت لاہوریؒ تو کشفِ قبور کو ہی کمال سمجھتے ہیں جو بڑی مدت کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایت سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ آپؒ تو سکھانے کی دعوت دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

''سنو! ہوش کرو، مجھے اللہ تعالیٰ نے باطن کی آنکھیں دی ہیں اور مجھے علم ہے کہ جو نوجوان علمائے کرام کو گالیاں دیتے مر گئے ہیں اُن کی قبریں جہنم کا گڑھا بنی ہوئی ہیں۔ اگر تم کو یقین نہیں آتا تو آؤ! میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ، میں نے یہ فن چالیس سال میں سیکھا ہے، تمہیں چار سال میں سکھا دوں گا۔'' (خدام الدین)

حضرت لاہوریؒ کے اس اعلان میں بیک وقت کئی باتیں پائی جاتی ہیں:

اپنے کمال کا دعویٰ بھی ہے اور دوسروں کو کامل بنانے کا اعلان بھی ہے۔ جن دو موتیوں کا مندرجہ بالا بیان میں ذکر ہوا ہے، ان میں سے ایک موتی یعنی کشفِ قبور کے لیے چالیس سال صَرف کرنے کا بیان بھی ہے، اور چار سال میں سکھانے کا دعویٰ بھی ہے، اور یقین پیدا کرنے کے لیے کشفِ قبور کو ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ حضرت لاہوریؒ جیسی شخصیت جس چیز کو چالیس سال کی محنت کے بعد حاصل کرے، وہ کافر کو کفر کی حالت میں رہ کر محض تپسیا سے حاصل ہو جائے۔

کشفِ قبور کے متعلق بوجوہ ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ کشفِ کونی ہے۔ اس کے متعلق بنیادی طور پر یہ بات

Scanned with CamScanner

سمجھ لینی چاہیے کہ کشفِ قبور میں مٹی کے گڑھے کا کشف نہیں ہوتا، بلکہ مقبور کی حالت کا کشف ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت لاہوریؒ کا ایک اقتباس گزر چکا ہے کہ صاحبِ کشف کو معلوم ہو جائے گا کہ مقبور رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ... میں ہے یا حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ... میں ہے۔ یعنی کشفِ قبور میں عذاب وثواب کا انکشاف ہوتا ہے، جو برزخ میں میت کو ہو رہا ہے۔ اب عذاب وثواب کو "عالمِ کونی" سے کون تعبیر کر سکتا ہے؟ اور کشفِ قبور میں اہل ایمان اور اولیاء اللہ کے درجات اور منازل کا انکشاف ہوتا ہے۔

"عالمِ کونی" عالمِ موجوداتِ ظاہریہ پر بولا جاتا ہے، جس کو قرآن نے عالمِ ظاہر، عالمِ محسوسات اور عالمِ شہادت بھی بیان کیا ہے۔ اور عالمِ شہادت عالمِ غیب کے مقابلے میں ہے۔ پس جس کشف کا تعلق عالمِ غیب سے ہو، اسے کشفِ کونی کہنا کہاں درست ہے؟ کشفِ کونی یہ ہے کہ "عالمِ کون" کی موجود اور ظاہر چیزیں جو نظر سے اوجھل ہیں، زمین پر ہیں ان کی حالت منکشف ہو جائے کیونکہ انہی چیزوں کا تعلق عالمِ شہادت سے ہے۔

وَقَدْ يُعَبِّرُوْنَ... عَنْ عَالَمِ الشَّهَادَةِ بِالْأَرْضِ... (عبقات، ۲۲۰)

"یعنی عالمِ شہادت کو زمین سے تعبیر کرتے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ کشفِ کونی میں عالمِ کونی کی اشیاء کی صورتیں منکشف ہوتی ہیں، جن کا ایمانیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اور عالمِ غیب کی اشیاء پر ایمان لانا فرض ہے، مثلاً ثواب وعذابِ قبر پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ عالمِ غیب سے ہے، عالمِ کون سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور ثواب وعذابِ قبر کا انکار کرنا کفر ہے، جیسا کہ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ نے عرف شذی میں فرمایا:

عَذَابُ الْقَبْرِ ثَبَتَ مُتَوَاتِرًا بِتَوَاتُرِ الْقَدْرِ الْمُشْتَرَكِ وَ قَالَ بِهٖ اَهْلُ السُّنَّةِ وَ الْجَمَاعَةِ قَاطِبَةً وَ مُنْكِرُ التَّوَاتُرِ هٰذَا لَا رَيْبَ فِيْ تَبْدِيْعِهٖ وَ مُنْكِرُ التَّوَاتُرِ بِالْقَدْرِ الْمُشْتَرَكِ كَافِرٌ اِنْ كَانَ التَّوَاتُرُ بَدِيْهِيًّا وَ فَاسِقٌ مُّبْتَدِعٌ اِنْ كَانَ نَظَرِيًّا...

(عرف شذی، ابواب الجنائز، باب عذاب القبر، ۳۸۹)

"عذاب وثوابِ قبر قدرِ مشترک وتواتر سے ثابت ہے اور اس پر تمام اہل السنۃ والجماعت کا اجماع ہے اور اس تواتر کے منکر کے بدعتی ہونے میں تو ذرا شک نہیں، اور منکر تواتر قدرِ مشترک کافر ہے اگر تواتر بدیہی ہے، اور بدتر فاسق اور بدعتی ہے اگر تواتر نظری ہے (اور عذاب وثوابِ قبر کا ثبوت جس تواتر سے ہے وہ بدیہی ہے)۔"

پس ثابت ہوا کہ عذاب وثوابِ قبر عالمِ آخرت کی چیزیں ہیں، جن پر ایمان لانا فرض ہے۔ اور عالمِ کون کے پہاڑ، درخت، انسان، حیوان وغیرہ کی صورتوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ... کی تفسیر میں صاحبِ تفسیرِ مظہری فرماتے ہیں:

فَالْمُرَادُ بِهٖ مَا غَابَ عَنْ اَبْصَارِهِمْ مِنْ ذَاتِ اللّٰهِ وَ صِفَاتِهٖ وَ الْمَلٰئِكَةِ وَ الْبَعْثِ وَ

Scanned with CamScanner

اَلْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَالصِّرَاطِ وَالْمِيْزَانِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَغَيْرِهٖ.. (تفسیر مظہری، ۱:۱۹)

"عالم غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو حاسۂ بصر سے باہر ہیں، جیسے ذات و صفات باری تعالیٰ، ملائکہ، قیامت، جنت، دوزخ، پل صراط، میزان اور عذاب قبر وغیرہ۔"

اسی طرح تفسیر قرطبی میں ہے:

كُلُّ مَا اَخْبَرَ بِهِ الرَّسُوْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِمَّا لَا تَهْتَدِيْ اِلَيْهِ الْعُقُوْلُ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَالْحَشْرِ وَالنَّشْرِ وَالصِّرَاطِ وَالْمِيْزَانِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ...

(تفسیر قرطبی، ۱:۱۶۳)

"غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی خبر نبی کریم ﷺ نے دی ہے، جن تک عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ اشراطِ قیامت، عذاب قبر، حشر و نشر، پل صراط، میزان، جنت و دوزخ۔"

اور تفسیر خازن اور معالم میں ہے:

وَالْغَيْبُ مَا كَانَ مَغِيْبًا مِّنَ الْعُيُوْنِ... قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: اَلْغَيْبُ هَاهُنَا كُلُّ مَا اُمِرْتَ بِالْاِيْمَانِ بِهٖ فِيْمَا غَابَ عَنْ بَصَرِكَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَالْبَعْثِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَالصِّرَاطِ وَالْمِيْزَانِ... (تفسیر خازن و معالم، ۲۹)

"غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ساتھ تمہیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے جو باصرہ کی دسترس سے باہر ہے، جیسے فرشتے، قیامت، جنت، دوزخ، پل صراط اور میزان۔"

غوث زمان سید عبدالعزیز دباغؒ فرماتے ہیں:

"لیکن انہیں (کفار کو) قبر النبی ﷺ اور وہ نور جو وہاں سے پھیل کر برزخ تک جا پہنچتا ہے، یا مثلاً اولیائے عارفین کی ذوات مبارکہ، یا ارواح مومنین جو صحن ہائے قبور میں ہیں، نہ ہی کسی فرشتہ کو دیکھ سکیں گے اور نہ ہی جنت، قلم، لوح اور نہ ان انوار کا مشاہدہ کر سکیں گے۔"

ثابت ہو گیا کہ ثواب و عذاب قبر کا تعلق عالم کون سے نہیں، امور آخرت سے ہے۔ اس لیے کشف قبور کشف کونی نہیں بلکہ کشف الٰہی میں داخل ہے۔

کشف قبور کو کشفِ کونی کہنے والوں نے بلاشبہ ٹھوکر کھائی، مگر کشف قبور کو علمِ غیب سے متعلق تسلیم کرنے والوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس قسم کے بعض پڑھے لکھے جہلاء کہتے ہیں:

"کشف قبور علمِ غیب سے ہے اور جو شخص کشف قبور کا دعویٰ کرے وہ مشرک ہے۔"

سبحان اللہ! کیا اجتہاد ہے! ان جہلاء کو نہ اس بات کا علم ہے کہ علمِ غیب کسے کہتے ہیں؟ نہ انہیں کرامت اولیاء اور خرقِ عادت سے واقفیت ہے۔ حالانکہ محض نام کا عالم بھی اتنا جانتا ہے کہ علمِ غیب جس کا دعویٰ کفر ہے، وہ ہے جس پر کسی قسم کی دلیل قائم نہ ہو، جو مخصوصِ باری تعالیٰ ہے۔ اور کشف تو ایک دلیل ہے اور اعلام من اللہ میں داخل ہے۔ اس پر علمِ غیب کا اطلاق کرنا نری جہالت ہے۔ ان حضرات کے دماغ میں علم کی جو آندھیاں چلتی ہیں تو عقائد و نظریات میں توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔

مثلاً جواہر القرآن، جلد اول میں مولانا حسین علی فرماتے ہیں:

"امرِ دوم: ذاتِ باری تعالیٰ، فرشتے، کتبِ سماویہ، انبیائے متقدمین علیہم الصلوٰۃ والسلام، احوالِ برزخ، علاماتِ قیامت، حشر و نشر، صراط و میزان، جنت، دوزخ، ثواب و عذابِ قبر، یہ تمام احکام عالمِ غیب کے ہیں۔۔۔ اور عالمِ غیب کے امور جو نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہیں، مثلاً عذابِ قبر، حشر نشر وغیرہ ان کا انکار کفر ہے۔" (جواہر القرآن، ۱:۱۹)

یعنی "مفسر" صاحب اقرار کرتے ہیں کہ عذابِ قبر نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے، اس کا انکار کفر ہے۔

اب ملاحظہ ہو جواہر القرآن، جلد دوم، فرماتے ہیں:

"عذابِ قبر نہ روح کو ہوتا ہے نہ بدن کو ہوتا ہے۔" (جواہر القرآن، ۲: ۹۰۴، ۹۰۵)

پھر سوال یہ ہے کہ کس کو ہوتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ عذابِ قبر کا انکار فرما رہے ہیں، اور صاحبِ جواہر القرآن عذابِ قبر کے منکر کو کافر قرار دے چکے ہیں۔

یعنی صاحبِ جواہر القرآن، جلد اول نے صاحبِ جواہر القرآن، جلد دوم کو کافر قرار دے دیا۔

جلد دوم والے صاحبِ جواہر القرآن کا عقیدہ وہی ہے جو معتزلہ میں سے بھی صرف دو آدمیوں کا عقیدہ تھا۔

اِنَّهٗ لَمْ يُنْكِرْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ (مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ) اِلَّا ضَرَارُ بْنُ عُمَرَ وَبِشْرُ الْمَرِيْسِيُّ۔۔۔

(عرف شذی، ابواب الجنائز، باب عذاب القبر، ۳۸۹)

اور لطف یہ کہ صاحبِ جواہر القرآن اہل السنۃ والجماعت بھی ہیں اور شیخ القرآن بھی ہیں۔

جفائیں بھی ہیں فریب بھی ہے نمود بھی ہے سنگھار بھی ہے
اور اس پہ دعویٰ حق پرستی اور اس پر یاں اعتبار بھی ہے

القا ہے تو شیطانی۔ اور اگر کوئی فرشتہ نظر آیا جیسا بدر میں ہوا تو وہ عذاب کے لیے، انعامِ باری تعالیٰ نہیں۔

بعض ظاہر بین جو اس سلسلے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں، ہم انہیں حقیقت سے روشناس کرائے دیتے ہیں کہ کافر مسلسل مجاہدے بھوکا پیاسا رہ کر بدن کو کمزور کر لیتا ہے اور بدن میں خون اور چربی کم ہو جاتی ہے تو اسے ایک طرح کی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اور قلب پر بعض مادی چیزوں کا عکس پڑتا ہے۔ یہ ہے کافر کے کشف کی حقیقت۔ اسے حقائقِ اشیاء، برزخ کے

Scanned with CamScanner

حالات، جنت ودوزخ اور عرش وکرسی کہاں نظر آئیں کیونکہ وَإِنَّمَا هُوَ نُورٌ يَخْتَصُّ اللهُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ..
(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من رأی النبی ﷺ فی المنام، ۳۸۹:۱۲م

اصل ایمان اطمینانِ قلب ہے

حقیقتِ ایمان یہ ہے کہ مومن کا قلب اس قدر منور ہو جائے کہ اس کی روشنی میں عرشِ باری تعالیٰ نظر آجائے۔ ''کتاب الروح'' میں علامہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں ''پس اطمینانِ قلبی، ایمان کی جڑ ہے جس پر ایمان قائم ہے۔ پھر اس کے بعد اس خبر کی طرف سے مطمئن ہونا جو احکام برزخ اور اس کے بعد احوالِ قیامت سے متعلق ہیں یہاں تک کہ مومن یہ ساری چیزیں ظاہراً مشاہدہ کر رہا ہو۔'' پھر فرمایا، یہی شخص یومِ آخرت پر حقیقی ایمان رکھتا ہے۔ جیسا حدیثِ حارثؓ میں ہے کہ میں حقیقی مومن ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا، ہر دعوے کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا کہ میں نے دنیا اور اہلِ دنیا سے منہ موڑ لیا ہے۔ عرشِ الٰہی ظاہر دیکھتا ہوں، اہلِ جنت کو دیکھتا ہوں کہ ایک دوسرے کی ملاقات کو جا رہے ہیں اور اہلِ دوزخ کو دیکھتا ہوں کہ انہیں عذاب دیا جا رہا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا ''یہ وہ بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہے۔'' یعنی حقیقی ایمان اور اعلیٰ ترین ایمان یہ ہے کہ ان چیزوں (غیوب) کا مشاہدہ بھی ہو جائے، جیسا کہ حضرت حارثؓ کو نصیب تھا اور حضور نبی کریم ﷺ نے انؓ کے مشاہدہ کی تصدیق فرمائی۔ اس ساری تفصیل کا لب لباب یہ ہے کہ حقیقتِ ایمان اطمینانِ قلب کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اطمینانِ قلب اللہ کے ذکر سے نصیب ہوتا ہے۔ کما قال تعالیٰ:

أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ... (الرعد:۲۸) ''اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

اطمینان یقینِ کامل کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ ہے۔ جب ایک بات پر یقینِ واثق ہو تو دل سکون کی حالت میں آجاتا ہے۔ ذکرِ الٰہی دل کو نورِ ایمان سے بھر دیتا ہے۔ اور حقیقتِ ایمان یہ ہے کہ مومن کا دل انواراتِ الٰہیہ سے اس قدر منور ہو جائے کہ اس روشنی میں عرشِ الٰہی، جنت ودوزخ اور امورِ برزخ نظر آجائیں، اسی کا نام کشف ہے اور یہی حقیقتِ ایمان کی دلیل ہے جیسا کہ حضرت حارثؓ نے بیان فرمایا۔ یہاں اکثر ایک عجیب سا سوال کیا جاتا ہے کہ اکثر صحابہؓ سے اس طرح کے واقعات بیان نہیں کیے گئے۔ اس لیے انؓ پر اعتراض وارد ہوگا کہ اس طرح کے (صحابہؓ سے متعلق) واقعات تو خال خال ملتے ہیں، تو کیا باقی صحابہؓ کا ایمان حقیقی نہیں تھا؟ اس کے جواب میں اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں ''ہر صحابی سے عدمِ نقل اور چیز ہے، اور عدمِ کشف اور چیز ہے۔'' یعنی یہ ضروری تو نہیں کہ ہر صحابیؓ کے کشف کی بات ہم تک پہنچے۔ اگر چند ایک کے بارے میں بھی علم ہو گیا تو یہ مثال صحابہ کرامؓ کی عظمت کا کافی ثبوت ہے۔ اگر کسی چیز کو آگے بیان نہ کیا جائے تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ کیا کہ جسے ہم نہیں جانتے وہ ہے ہی نہیں' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف صحابہؓ کے مشاہدات اگر جمع کیے جائیں تو ایک سلسلۂ کتب تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ ذخیرۂ حدیث یعنی کتبِ حدیث ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ چند مثالیں دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہی چند ایک مشاہدات تھے جو سارے کے سارے ہم نے بیان کر دیئے

Scanned with CamScanner

ہیں، بلکہ یہ تو مشتے از خروارے ہیں۔ جیسے غلے کا بڑا سا ڈھیر ہو تو اس میں سے ایک مٹھی ہی دکھانے کے لیے بھری جاتی ہے۔

گزشتہ باب کا خلاصہ یہ ہے کہ کشف و الہام وحیٔ باطنی ہے اور کمالاتِ نبوت سے ہے اور نائب و خلیفۂ نبوت ہے۔ انقطاعِ نبوت اور انقطاعِ وحیٔ شرعی کے بعد یہ دلائل میں داخل ہے۔ "نبوت کے حضور اکرم ﷺ پر تمام ہونے پر وحیٔ شرعی یعنی قرآن کا نزول اور حدیث مبارکہ کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن جو کشف حضور اکرم ﷺ کے حکم، قرآن و سنت کے مطابق ہو تو پھر وہ ایک مضبوط دلیل ہے۔" "یہ باطنی دولت انبیاءؑ کا حصہ ہے جو بطورِ وراثت انبیاءؑ کی حقیقی اولاد یعنی متبعین کو ملتی ہے۔" یعنی کشف و الہام اُن لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، جن کے دل حقیقتِ ایمان سے منور ہوتے ہیں۔

کچھ ناخواندہ مولوی یا مولوی نما لوگ جن کے پاس علم تو اُس پائے کا نہیں لیکن مولوی بنے ہوئے ہیں، یا پیشہ ور پیر جن کے پاس باطنی دولت تو ہے نہیں، کبھی کہیں کوئی بزرگ خاندان میں ہو گزرے اور نسلاً بعد نسل اسی ایک نام پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے حضرات ہمارے سلسلہ کے ساتھیوں سے کشف و الہام کی بات سن کر بڑے ناراض ہوتے ہیں۔ پیر صاحب کا تو یہ خیال ہے کہ یہ دولت بس انہی کے خاندان کی وراثت و ملکیت ہے، مگر کس دلیل کی رُو سے اللہ کی رحمت اور اس کے اکرام کو کسی ایک خاندان تک محدود کرتے ہیں؟ کسی کا خیال ہے کہ کشف و الہام کوئی چیز نہیں، اصل چیز تو رضائے الٰہی ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ کشف و الہام رضائے الٰہی کا انعام ہی تو ہے، جن پر اللہ ناراض ہو بھلا انہیں یہ انعام کیونکر عطا فرمائے گا۔ کوئی حسد کا اظہار ذرا علمی انداز میں کرتا ہے کہ "کشف ظنی چیز ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔" انہیں یہ یاد ہونا چاہیے کہ کتبِ فقہ میں مذکور تمام مسائل قطعیہ نہیں ہیں۔ یعنی سارے مسائل نصوصِ قرآنی سے اخذ شدہ نہیں ہیں یا صریح حدیث سے ثابت نہیں ہیں، تو علماء کا اجتہاد بھی تو ظنی چیز ہے۔ اگر ظنی چیز کسی کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہے تو پھر اس سب کا کیا کریں گے؟ کیا ذخیرۂ حدیث کی تمام احادیث متواتر اور قطعی ہیں؟ کیا وتر، سنت، نفل کی تعیین نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے؟ یہ سارے مسائل بھی تو ظنی ہیں اور اجتہادی ہیں۔ اگر محض ظنی ہونے کے احتمال پر کشف کی کوئی اہمیت نہیں تو فقہِ اسلامی سے آپ کیا سلوک کریں گے؟ پھر تو ساری فقہ بیکار ہو جائے گی۔

کوئی یہ کہتا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دین نقل ہو کر پہنچا ہے اور نقل خبر ہوتی ہے (جو چیز نقل ہو کر آتی ہے وہ خبر ہوتی ہے)۔ خبر میں جھوٹ اور سچ دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ کریم نے علمائے حق کو یہ توفیق بخشی کہ انہوں نے ہمیشہ کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا۔ لوگوں نے حدیثیں گھڑیں، علماء نے انہیں نکال کر الگ کیا۔ لوگوں نے قرآن میں کچھ تحریف کی کوشش کی، تو اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی اور علماء نے ان کی سازشیں بے نقاب کر دیں۔ اسی طرح کشف و الہام میں جو چیزیں شیطان کی طرف سے داخل کی گئیں، صوفیاء نے انہیں رد کر دیا۔ ہر خبر میں صدق و کذب کا احتمال تو ہوتا ہے لیکن اللہ نے اس کی حفاظت کا انتظام فرما دیا۔ اگر کوئی ویسے ہی کشف و الہام سے انکاری ہے تو ان متواتر حقائق کا جو نبی کریم ﷺ سے آج تک اکابرینِ امت سے ثابت ہیں، ان کا انکار لازم آتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ کشف تو کافر کو بھی ہو جاتا ہے۔ فرمایا، یہ جھوٹ ہے! کافر کو کشف نہیں ہو سکتا۔ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ

Scanned with CamScanner

اَبْوَابُ السَّمَآءِ... (الاعراف:۴۰) یعنی کافر کے متعلق تو قرآن میں یہ فیصلہ سنا دیا گیا ہے کہ "ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہیں جاتے"۔ نہ اُس کی دعا بالائے آسمان جاتی ہے، اُس کی روح کو بھی آسمان پر جانا نصیب نہیں ہوتا مرجائے تو سجین جو زمین سے نیچے ہے وہاں دھکیلا جاتا ہے، چونکہ برزخ تحت الثریٰ سے عرشِ اعلیٰ تک ساتھ ساتھ چلتا ہے جس طرح عالمِ دنیا ہے اور اسی کے اندر عالمِ برزخ بھی چل رہا ہے۔ تو یہ بات طے شدہ ہے کہ کافر کے لیے آسمان کا دروازہ کھولا ہی نہیں جاتا۔ ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر کافر کو کشف ہو جائے تو لازماً اپنے پیشواؤں اور آباؤ اجداد کو دوزخ میں جلتا ہوا دیکھ لے گا، تو کیا پھر بھی کفر پر قائم رہے گا؟ کافر تو ظلمت ہی ظلمت ہے۔ اس کا قول و فعل ظلمت، اس کا معبود ظلمت، عقیدہ ظلمت، عمل ظلمت، تو کیا اندھیرے میں کچھ نظر آسکتا ہے؟ ہاں جسے کم علم، بے خبر لوگ کشف کا نام دیتے ہیں وہ القائے شیطانی ہے جو کافر کو ہوتا ہے۔ کافر کو وہ خبریں ملتی ہیں جو شیطان القا کرتا ہے۔ اگر کافر کو کوئی فرشتہ نظر آئے بھی تو وہ عذاب کے لیے ہوتا ہے، جیسا کہ میدانِ بدر میں ہوا، یا جیسے موت کے وقت کافر کو بھی فرشتے نظر آجاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم دنیا میں کیا کرتے رہے؟ اب نکالو اپنی جان کو تاکہ تمہیں دوزخ میں لے جائیں۔ جہنم کے فرشتے، جہنم کے سامان، کافر کو نظر آتے ہیں لیکن اس وقت توبہ کا موقع نہیں ہوتا۔ یعنی جب بھی کافر کو فرشتے یا جہنم دکھائی دیتی ہے وہ بغرضِ عذاب ہوتی ہے نہ کہ رضائے الٰہی کے لیے۔ کافر دنیا کے حالات بتا دیتے ہیں۔ کسی کا بچہ گم ہو گیا یا کچھ اور معلومات جو اس دنیا سے متعلق ہوں تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ کافر چلے کاٹتا ہے۔ سوتا نہیں، کھاتا نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں، اس سے ایک یکسوئی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے، خیالات منتشر نہیں ہوتے۔ یا کسی دیوار پر نقطہ لگا کر اسے مسلسل دیکھتے ہیں یا شمع یا دیئے کی لو کو دیکھتے ہیں، یہاں سے ترقی کر کے سورج بینی تک جا پہنچتے ہیں اور گھنٹوں سورج پر نظر جمائے رکھتے ہیں اس طرح ارتکازِ توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے وہ ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کر لیتے ہیں، پھر جدھر کا خیال کرتے ہیں دماغ کی شعاعیں وہاں پہنچ کر تمام معلومات دیتی ہیں۔ موبائل فون کی ایجاد کے بعد اس نظامِ ذہنی کو سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ کراچی میں کیا ہو رہا ہے، امریکہ میں کوئی کیا کر رہا ہے، ہر وہ بات جو برقی مقناطیسی ایجادات یا ریڈیائی نظام، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن سے پتا چل جاتی ہے، کافر اسے ارتکازِ توجہ سے جان لیتا ہے۔ وہ اس برقی مقناطیسی اور ریڈیائی نظام سے جو اللہ کی طرف سے دماغ میں موجود ہے، کام لیتا ہے۔ لیکن کافر اس مادی توجہ سے برزخ، فرشتے، ارواح نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں کیونکہ وَاِنَّمَا هُوَ نُوْرٌ يَّخْتَصُّ بِهِ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ... یہ ساری چیزیں نور ہیں اور اللہ انہیں مخصوص کر دیتا ہے اپنے اُن بندوں کے ساتھ جن کے لیے وہ چاہتا ہے۔

سب سے پہلے کشف کی حقیقت معلوم کر لینی چاہیے۔

صوفیاء کی اصطلاح میں کشف کی حقیقت یہ ہے: اگر کافر کو کشف ہوتا ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کافر صحیح عقیدے پر ہے اور اللہ تعالیٰ کافر کے دل میں وہ نور ڈال دیتا ہے کہ جس کے ذریعے اسے حقائقِ الٰہیہ کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایمان لانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم، باب فی عجائب القلب میں فرمایا ہے کہ وَالْكَشْفُ مِفْتَاحُ الْفَوْزِ الْاَكْبَرِ...

Scanned with CamScanner

(کشف عظیم کامیابی کی کنجی ہے)، اگر کافر کو کشفِ اصطلاحی (وہ کشف جسے صوفیاء کشف مانتے ہیں) ہوجاتا ہے تو گویا اس کے ہاتھ میں عظیم کامیابی کی کنجی آ گئی۔ کیا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے؟

کافر کے کشف کی حقیقت امام ربانیؒ کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں:

کثرتِ جوع البتہ شفا بخش است ۔۔۔ غلاف رقیق نمائند۔

(مکتوباتِ امام ربانی، دفتر اول، حصہ پنجم، مکتوب نمبر ۳۱۳، ص، ۱۷۰)

بھوک کی زیادتی اگرچہ شفا بخش ہے۔ ایمان ہو تو یہ صفائے قلب کا باعث بنتی ہے (جیسا کہ روزہ سے ہوتا ہے) اور روح میں نورانیت لاتی ہے۔ ایمان نہ ہو تو یہ صفائے نفس کا ذریعہ بنتی ہے، نفس پاکیزہ نہیں ہوتا بس اس کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے، یا یہ کہہ لیں کہ دماغی صلاحیت اور قوت بڑھ جاتی ہے۔ وہ گمراہی اور ظلمت میں اور آگے چلا جاتا ہے۔ یونان کے فلسفی اور ہندوستان کے برہمن اور جوگی سخت ریاضت اور بھوک سے نفس کی صلاحیتوں کو جنہیں ہم دماغی صلاحیتیں کہہ سکتے ہیں، چمکا لیتے ہیں لیکن ظلمت و گمراہی میں بھی بڑھ جاتے ہیں۔ افلاطون نے بھی بے عقلی سے اپنے نفس کی صفاء پر اعتماد کرکے خیالی، تصوراتی چیزوں کو جو کہ اس کا نفس دکھاتا تھا، ان کو ہی اپنا امام بنا بیٹھا یعنی ان کی پیروی کرنے لگا۔ یہ نہ جانا کہ نفسِ امارہ کی صفاء اس کی صلاحیت بڑھا کر ناپاکی اور گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بظاہر نرم غلاف کے اندر شدید غلاظت بھری ہوتی ہے۔

سو معلوم ہوا کہ کافر اگر فاقہ و ریاضت کرے تو اس کو صفائے نفس حاصل ہوجاتی ہے۔ وہ دماغی صلاحیتیں کو، جو کہ بے حد و بے پناہ ہیں، نکھار اور بڑھا لیتا ہے۔ عام آدمی کی نسبت اپنی دماغی صلاحیتوں سے ہزاروں گنا زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ لیکن جسے صوفیاء کرام اصطلاحِ تصوف میں کشف کہتے ہیں، اس کا تعلق صفائے قلب سے ہے۔ ایمان کی نورانیت کے بغیر کافر کو قلب کی صفا حاصل ہو ہی نہیں سکتی، پھر کشف کیونکر ہوسکتا ہے؟

حضرت لاہوریؒ فرماتے ہیں: ''یاد رکھیے! علم اور چیز ہے، تربیت اور چیز ہے۔ امراضِ روحانی کا فقط ایک علاج ہے اور وہ اللہ والوں کی صحبت ہے۔ ان کی صحبت میں اللہ کے پاک نام کی برکت سے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔''

فرماتے ہیں اولیاء اللہ کے جوتوں کی خاک کے ذرّوں میں وہ موتی ملتے ہیں جو بادشاہوں کے تاجوں میں نہیں ہوتے لیکن شرط یہ ہے کہ عقیدت، ادب اور اطاعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ان لعل و جواہر میں پہلا نایاب موتی جو مرید کی جھولی میں گرتا ہے، وہ ہے حلال و حرام کی تمیز، دوسرا موتی ہے کشفِ قبور، عالمِ برزخ تک رسائی۔ نئی نسل کے جو سر پھرے نوجوان ان باتوں کو نہیں مانتے، میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ چودہ سال کا خرچہ ساتھ لے آؤ تو تمہیں ایسے اللہ والوں کی صحبت میں بٹھاؤں گا جو تمہاری تربیت کریں گے۔ پھر ایک منٹ میں تم خود بتا سکو گے کہ دفن ہونے والے کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ (مجلسِ ذکر، حصہ اول: ۶۹، ۷۰)

حضرت احمد علی لاہوریؒ نے کشف القبور کو، جو اصطلاحی کشف کی ایک قسم ہے، ایک موتی قرار دیا ہے یعنی فیضانِ اولیاء کا ایک ثمرہ، ایک فائدہ یا ایک نتیجہ قرار دیا ہے جو اللہ والوں کی صحبت میں اللہ کے پاک نام کی برکت سے حاصل

Scanned with CamScanner

ہوتا ہے، کہیں اور سے ہرگز نہیں ملتا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ کافر اہل اللہ کی صحبت اور ذکر اللہ، اور ان دونوں کی بنیاد ایمان سے محروم ہے، پھر اسے کشف کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

حضرت لاہوریؒ تو کشفِ قبور کو ہی کمال سمجھتے ہیں جو بڑی مدت کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایت سے حاصل ہوتا ہے بلکہ آپؒ تو اپنے رسالہ 'خدام الدین' میں اسے سیکھنے کی دعوت دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

"سنو! ہوش کرو، مجھے اللہ تعالیٰ نے باطن کی آنکھیں دی ہیں اور مجھے علم ہے کہ جو نوجوان علمائے کرام کو گالیاں دیتے مر گئے ہیں، ان کی قبریں جہنم کا گڑھا بنی ہوئی ہیں۔ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو آؤ! میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ، میں نے یہ فن چالیس سال میں سیکھا ہے، تمہیں چار سال میں سکھا دوں گا۔"

حضرتؒ کے اس اعلان میں بیک وقت کئی باتیں پائی جاتی ہیں۔

اپنے کمال کا دعویٰ بھی ہے اور دوسروں کو کامل بنانے کا اعلان بھی۔ جن دو موتیوں کا مندرجہ بالا بیان میں ذکر ہوا ہے، ان میں سے ایک موتی یعنی کشفِ قبور کے لیے چالیس سال صرف کرنے کا بیان بھی ہے اور چار سال میں سکھانے کا دعویٰ بھی ہے، اور اولیاء کے اہل اللہ ہونے کا یقین پیدا کرنے کے لیے کشفِ قبور کو ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ حضرت لاہوریؒ جیسی شخصیت جس چیز کو ۴۰ سال کی محنت کے بعد حاصل کرے، وہ کافر کو کفر کی حالت میں رہ کر محض ریاضت سے حاصل ہو جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

کشفِ قبور کے متعلق کچھ وجوہات کی بنا پر ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ کشفِ کونی عالمِ موجودات کا کشف ہے یعنی کہ اس دنیا کی اشیاء اور اس دنیا سے متعلق کشف ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ قبر کا گڑھا اسی دنیا کی زمین پر ہوتا ہے اس لیے اس کے معاملات کو دنیا کے احوال و معاملات ہی میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ دراصل اس کے متعلق بنیادی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کشفِ قبور میں مٹی کے گڑھے کا کشف نہیں ہوتا، بلکہ صاحبِ قبر کی حالت کا کشف ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت لاہوریؒ کا ایک اقتباس گزر چکا ہے کہ صاحبِ کشف کو معلوم ہو جائے گا کہ صاحبِ قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں۔ یعنی کشفِ قبور میں اس عذاب و ثواب کا انکشاف ہوتا ہے جو برزخ میں میت کو ہو رہا ہوتا ہے۔ اب ثواب و عذاب کو اس دنیا، اس مادی فانی عالم سے کون تعبیر کرے گا۔ کشفِ قبور میں اہلِ ایمان اور اولیاء اللہ کے درجات اور منازل کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔

عالمِ کون، عالمِ موجوداتِ ظاہریہ، دنیا اور اس کی اشیاء، معاملات و مقامات کے لیے بولا جاتا ہے۔ عالمِ کون کو قرآن نے عالمِ ظاہر، عالمِ محسوسات اور عالمِ شہادت بھی بیان کیا ہے، اور عالمِ شہادت عالمِ غیب کے مقابلے میں (برعکس) ہے کیونکہ عالمِ شہادت کی گواہی پانچوں حواس دیتے ہیں جبکہ عالمِ غیب کو حواسِ انسانی کے ذریعے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

پس جس کشف کا تعلق عالمِ غیب سے ہو، اسے کشفِ کونی کہنا کہاں درست ہے؟ کشفِ کونی کی حقیقت تو یہ ہے کہ اس دنیا کی موجود لیکن بظاہر نظر سے اوجھل چیزوں کی حالت منکشف ہو جائے کیونکہ انہی چیزوں کا تعلق عالمِ شہادت سے ہے۔

Scanned with CamScanner

مثلاً کوئی پاکستان میں بیٹھ کر امریکہ کے حالات بتادے۔

صاحب عبقات بھی عالم شہادت کو اس زمین اور اس دنیا سے تعبیر کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ کشفِ کونی میں اس عالم کی اشیاء کی صورتیں منکشف ہوتی ہیں، جن کا ایمانیات سے کوئی تعلق نہیں۔ایمان نام ہے عالم غیب کی اشیاء پہ یقین کرنے کا جو حواسِ خمسہ یا عقل کی تاویلات سے دیکھی یا سمجھی نہیں جاسکتیں۔زبانِ پیغمبر پر اعتماد و یقین کر کے ان پر ایمان و یقین رکھنا ہی ایمان ہے اور علام غیب کی اشیاء پر ایمان لانا فرض ہے، مثلاً ثواب وعذاب قبر پر ایمان لانا ضروری ہے۔اور یہ عالم غیب سے ہے، عالم کون سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔اس لیے ثواب وعذابِ قبر کا انکار کرنا کفر ہے۔

جیسا کہ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ نے عرف شذی میں فرمایا کہ عذاب وثوابِ قبر مشترک وتواتر سے ثابت ہے یعنی جسے علماء اور صوفیاء بتاتے چلے آرہے ہیں اور اس پر تمام اہل السنۃ والجماعت کا اجماع ہے۔اگر تواتر واضح یعنی علماء کرام سے ثابت ہے تو اس کا منکر بدعتی ہے، اگر تواتر مشاہداتی یعنی صوفیاء کرام سے ثابت ہے تو اس کا منکر بدتر فاسق ہے۔

عذاب وثوابِ قبر علماء اور صوفیاء کے تواتر سے ثابت ہیں۔یہ آخرت کی چیزیں ہیں لہٰذا ان پر ایمان لانا فرض اور انکار کفر ہے۔

جبکہ عالم کون کی چیزوں مثلاً پہاڑ، درخت، انسان، حیوان وغیرہ کی صورتوں پر ایمان لانا جزوِ ایمان نہیں۔

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ... کی تفسیر میں صاحبِ تفسیرِ مظہری فرماتے ہیں:

"عالم غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دائرہ نگاہ سے باہر ہیں جیسے ذات وصفاتِ باری تعالیٰ، ملائکہ، قیامت، جنت، دوزخ، پل صراط، میزان اور عذابِ قبر وغیرہ۔"

اسی طرح تفسیرِ قرطبی میں ہے:

"غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی خبر نبی کریم ﷺ نے دی ہے، جن تک عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی جیسا کہ اشراطِ قیامت (علاماتِ قیامت)، عذابِ قبر، حشر نشر، پل صراط، میزان، جنت، دوزخ۔"

اور تفسیر خازن اور معالم میں ہے:

"غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ساتھ تمہیں ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے جو باصرہ (دیکھنے کی صلاحیت) کی دسترس سے باہر ہے، جیسے فرشتے، قیامت، جنت، دوزخ، پل صراط اور میزان۔"

غوثِ زمان سید عبدالعزیز دباغؒ فرماتے ہیں:

"لیکن انہیں (کفار کو) قبر النبی ﷺ اور وہ نور جو وہاں سے پھیل کر برزخ تک جا پہنچتا ہے، یا مثلاً اولیائے عارفین کی ذواتِ مبارکہ، یا ارواحِ مومنین جو صحن ہائے قبور میں ہیں، نہ ہی کسی فرشتہ کو دیکھ سکیں گے اور نہ ہی جنت، قلم، لوح اور نہ ان انوار کا مشاہدہ کرسکیں گے۔"

Scanned with CamScanner

ثابت ہو گیا کہ ثواب وعذابِ قبر کا تعلق عالمِ کون سے نہیں، امورِ آخرت سے ہے اس لیے کشفِ قبور کشفِ کونی نہیں بلکہ کشفِ الٰہی میں داخل ہے۔

کشفِ قبور کو کشفِ کونی کہنے والوں نے بلا شبہ ٹھوکر کھائی، مگر کشفِ قبور کو علمِ غیب سے متعلق تسلیم کرنے والوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس قسم کے بعض پڑھے لکھے جہلاء کہتے ہیں:

"کشفِ قبور علومِ غیب سے ہے اور جو شخص کشفِ قبور کا دعویٰ کرے وہ مشرک ہے۔"

سبحان اللہ! کیا اجتہاد ہے، ان جہلا کو نہ اس بات کا علم ہے کہ علمِ غیب کسے کہتے ہیں، نہ انہیں کرامتِ اولیا اور عادت سے واقفیت ہے، حالانکہ محض نام کا عالم بھی اتنا جانتا ہے کہ علمِ غیب جس کا دعویٰ کفر ہے، وہ ہے جس پر کسی قسم کی دلیل قائم نہ ہو (اس علم کے حاصل ہونے کی کوئی وجہ، ذریعہ، مثلاً فلاں سے حاصل کیا، نہ ہو)، جو مخصوصِ باری تعالیٰ ہے۔ اور کشف تو ایک دلیل ہے اور اعلام من اللہ میں داخل ہے۔ اس پر علمِ غیب کا اطلاق کرنا نری جہالت ہے۔ ان حضرات کے دماغ میں علم کی جو آندھیاں چلتی ہیں تو عقائد و نظریات میں توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔ مثلاً جواہر القرآن، جلد اول میں مولانا حسین علی فرماتے ہیں:

"امرِ دوم: ذاتِ باری تعالیٰ، فرشتے، کتبِ سماویہ، انبیائے متقدمین علیہم الصلوٰۃ والسلام، احوالِ برزخ، علاماتِ قیامت، حشر نشر، صراط و میزان، جنت، دوزخ، ثواب وعذابِ قبر، یہ تمام احکام عالمِ غیب کے ہیں اور عالمِ غیب کے امور جو نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہیں، مثلاً عذابِ قبر، حشر نشر وغیرہ ان کا انکار کفر ہے۔"

یعنی "مفسر" صاحب اقرار کرتے ہیں کہ عذابِ قبر نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے، اس کا انکار کفر ہے۔

اور جواہر القرآن، جلد دوم میں فرماتے ہیں:

"عذابِ قبر نہ روح کو ہوتا ہے نہ بدن کو ہوتا ہے۔"

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر عذاب کس کو ہوتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ عذابِ قبر کا انکار فرما رہے ہیں۔

اور صاحب جواہر القرآن عذابِ قبر کے منکر کو کافر قرار دے چکے ہیں۔

یعنی صاحبِ جواہر القرآن، جلد اول نے صاحبِ جواہر القرآن، جلد دوم کو کافر قرار دے دیا۔

جلد دوم والے صاحبِ جواہر القرآن کا عقیدہ وہی ہے جو معتزلہ میں سے بھی صرف دو آدمیوں کا عقیدہ تھا۔

اِنَّهُ لَمْ يُنْكِرْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ (مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ) اِلَّا ضَرَارُ بْنُ عَمْرٍو وَبِشْرُ الْمَرِيْسِيُّ۔۔۔

(عرف شذی، ابواب الجنائز، باب عذاب القبر، ۳۸۹)

اور لطف یہ کہ صاحب جواہر القرآن (مولانا حسین علی) اہل السنۃ والجماعت بھی ہیں اور شیخ القرآن بھی۔

بعض ظاہر بین جو اس سلسلے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں، ہم انہیں حقیقت سے روشناس کرائے دیتے ہیں کہ کافر مسلسل مجاہدہ سے بھوکا پیاسا رہ کر بدن کو کمزور کر لیتا ہے اور بدن میں خون اور چربی کم ہو جاتی ہے تو اسے ایک طرح کی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اور قلب پر بعض مادی چیزوں کا عکس پڑتا ہے۔ یہ ہے کافر کے کشف کی حقیقت۔ اسے حقائقِ اشیاء، برزخ کے حالات، جنت دوزخ اور عرش و کرسی کہاں نظر آئیں کیونکہ وَاِنَّمَا هُوَ نُوْرٌ يَّخْتَصُّ اللّٰهُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔۔۔

محاکمہ مابین علمائے ظواہر و علمائے باطن از روئے کتاب اللہ

علمائے ظواہر کشف والہام کی مخالفت کو جائز سمجھتے ہیں اور صوفیاء کرام اس کی مخالفت کو حرام سمجھتے ہیں، بشرطیکہ ظواہر شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کشف والہام جو اپنے مافوق کے مخالف نہیں، اس پر عمل نہ کرنے سے گو دینی عقاب وطرد تو لاحق نہ ہوگا کہ موجبِ جزا وعذاب ہو مگر دنیوی اور بدنی تکلیفوں کا یقیناً موجب ہوگا۔ لہٰذا جسمانی اور دنیوی تکلیفوں سے بچنے کے لیے کشف والہام پر عمل ضروری ہوا۔ اس قانون کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔

اس تقریر سے کشف والہام کا موجب علم ہونا ثابت ہوا۔ پس علمائے ظواہر کے قول کے مطابق ناقابل التفات قرار دینا غلط ٹھہرا۔ پھر یہ ثابت ہوا کہ موجبِ وجوب نہیں، پس صوفیاء کرام کا موجبِ وجوب قرار دینا درست نہ ہوا۔ پس حق دونوں کے بین بین ہے۔ یعنی موجبِ علم ہے، قابلِ عمل ہے، مگر موجبِ وجوب نہیں۔ اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

وَقَوْلُهُ تَعَالَىٰ: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ... (الاعراف:۲۰)

وَقَوْلُهُ تَعَالَىٰ: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا... (الاعراف:۲۲)

۱۔ اس سے عصمت اور تصرف یعنی وسوسۂ شیطان کا اجتماع ہوا۔ معلوم ہوا کہ وسوسۂ شیطانی فی نفسہٖ گناہ نہیں، نہ منافی کمالات ہے جب تک موصل الی المعصیت نہ ہو جائے۔

۲۔ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو خطاب جو اکلِ شجرہ سے پہلے ہوا وہ الہامی خطاب تھا، نہ کہ وحی شرعی جیسا کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الاعراف:۱۹) میں امام رازیؒ نے فرمایا کہ دونوں کو خطاب تھا اور حضرت حوا کو بلا واسطہ حضرت آدمؑ کے ہوتا تھا۔

لِاَنَّهُ مَا كَانَ مَعَ اٰدَمَ فِي الْجَنَّةِ مِنَ الْبَشَرِ اِلَّا حَوَّا وَ اِنَّ الْخِطَابَ كَانَ يَاْتِيْهَا مِنْ غَيْرِ وَاسِطَةِ اٰدَمَ بِدَلِيْلِ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ... (اربعین فی اصول الدین، ۳۳۹)

"کیونکہ حضرت آدمؑ کے ہمراہ جنت میں کوئی انسان سوائے حضرت حواؑ کے موجود نہ تھا، اور حضرت حواؑ کو جو خطاب خدا کی طرف سے ہوتا بغیر واسطۂ حضرت آدمؑ کے ہوتا، جیسا کہ آیت وَلَا تَقْرَبَا سے ظاہر ہے۔"

۳۔ اس الہام پر عمل نہ کرنے سے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جسمانی اور دنیوی مصائب پیش آئے نہ کہ دینی عقاب۔ اگرچہ قرآن نے حضرت آدمؑ کے لیے عَصٰى اٰدَمُ (طٰهٰ:۱۲۱) فرمایا ہے، مگر یہ معصیتِ لغوی ہے، معصیتِ شرعی قرآن سے ثابت نہیں۔ قرآن نے بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ہی جرم بیان کیا ہے حالانکہ یہ جرم نہیں، کیونکہ زوجین کے بدنوں کا ایک دوسرے کے سامنے کھل جانا شرعی جرم نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ الہام موجب علم ہے، قابلِ عمل ہے، اس پر عمل نہ کرنے سے بدنی اور دنیوی تکلیف ہوئی، دینی عقاب لاحق نہ ہوا یعنی موجبِ وجوب نہیں۔

Scanned with CamScanner

اسی طرح حضرت مریم کو پانچ طرح کا الہامی خطاب ہوا:

۱۔ وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا... قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا... (آل عمران:۳۷)

یہ خطاب تربیت جسمانی کے لیے ہے۔

۲۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ... وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ... (آل عمران:۴۲)

یہ خطاب تربیتِ روحانی کے لیے ہے۔

۳۔ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ... (آل عمران:۴۳)

یہ خطاب تکلیفِ شرعی کا ہے۔

۴۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ... اِنَّ اللّٰهَ... وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ... (آل عمران:۴۵)

اس خطاب میں حضرت عیسیٰؑ کی بشارت ہے۔

۵۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ... فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا... (مریم:۲۴۔۲۶)

یہ خطاب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد تسلی کے لیے ہے۔

ان میں سے چار خطاب ملائکہ کی طرف سے ہیں جو مامور من اللہ تھے۔

فوائد:

۱۔ ملائکہ کا انسان سے کلام کرنا ثابت ہوا۔

۲۔ حضرت مریمؑ کا واقعہ بیان کر کے بتایا کہ انبیاءؑ کے متبعین کو یہ کمالات بطورِ میراث ملتے ہیں۔ تم بھی نبی کریم ﷺ کے متبع بن جاؤ تمہیں یہ کمالات پہلے انبیاءؑ کے متبعین سے بڑھ کر ملیں گے۔

۳۔ جو اللہ کا ہو رہے، اللہ اس کا ہو رہتا ہے۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ... (الزمر:۳۶) حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو غیروں سے بچایا۔ غیبی رزق دیا، عزت بچائی۔ تم بھی اس کے ہو رہو، سب کچھ ملے گا۔ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ... (طلاق:۳) سے مزید تاکید فرمادی۔

۴۔ بتایا کہ میں اپنے بندوں کی امداد کے لیے بڑی بڑی ہستیوں کو مقرر کرتا ہوں۔ دیکھا! میں نے حضرت مریم علیہ السلام کی کفالت ایک نبیؑ کو سونپی اور ملائکہ میں سے حضرت جبرئیلؑ کو مقرر کیا۔

۵۔ جبرئیلؑ ولی اللہ کے پاس آسکتے ہیں، صرف وحیٔ شرعی اور وحیٔ احکامی کا سلسلہ ختم ہوا کیونکہ دین مکمل ہو چکا ہے۔

۶۔ حضرت مریمؑ کو کشف والہام کے ذریعے ہدایات دی گئیں۔

۷۔ حضرت مریمؑ نے ان ہدایات پر عمل کیا۔

پس ثابت ہو گیا کہ کشف والہام موجب علم بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ اولیاء اللہ کی شان میں جو احادیث متعلقہ باب میں بیان کی گئی ہیں اور جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام قیامت کے دن اولیاء اللہ پر غبطہ کریں گے۔

Scanned with CamScanner

ان احادیث کی ان آیات سے مطابقت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت زکریا نبی نے حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل دیکھ کر غبطہ کیا اور طالبِ اولاد ہوئے۔ اسی طرح حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کے واقعہ سے بھی غبطہ ثابت ہوتا ہے۔ ظنِ غالب یہ ہے کہ گزشتہ شریعتوں میں یہ اصول تھا کہ جو کشف والہام کسی صحیح متبعِ انبیاء کو ہوا اور وہ عام قانون کے خلاف ہو تو وہ کشف اس قانون کا مخصص ہوگا۔ مثلاً قانون یہ تھا کہ نابالغ بچہ کو خواہ کافر ہو، قتل نہ کیا جائے مگر کسی مخفی علت کے تحت حضرت خضر علیہ السلام نے کافر بچہ کو قتل کر دیا تو یہ خلافِ قانون نہ ٹھہرا بلکہ اس قانون کا مخصص قرار پایا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خلاصہ:

کشف والہام اولیاء اللہ کے لیے خاص ہیں، نائب وحی ہیں، آسمانی علوم کا واسطہ ہیں۔ گو وحی کے مقابلہ میں کمزور واسطہ ہیں۔ یعنی موجبِ علم ہیں، قابلِ عمل ہیں، موجب وجوب نہیں۔

سوال: علمِ تصوف اور کشف والہام کا تعلق علمِ ظاہری سے ہے۔ بے علم کو کیوں کر کشف ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے کے بے علم بھی کشف ومکاشفات کا اظہار کرتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے؟

الجواب: صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات میں ایمان اور علم کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ عقدہ خود بخود حل ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو پہلے ایمان کی دولت نصیب ہوئی جو بجائے خود اجمالی علم کا ثمرہ تھا لیکن دین کا تفصیلی علم ایمان کے بعد حاصل ہوا۔ اسی طرح تصوف کا تعلق تزکیۂ باطن سے ہے جو بمنزلۂ ایمان ہے۔ اس کے حصول کے لیے شیخ کامل سے عقیدت اور اس کا اتباع لازمی ہے، علمِ تفصیلی شرط نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تزکیۂ باطن سے کشف والہام حاصل ہو جاتا ہے، پس کشف والہام کے لیے بھی علم شرط نہیں۔ ہاں! اس کی حفاظت اور مزید ترقی کے لیے علمِ ظاہری کی ضرورت ہے اور یہ علمِ ظاہری یا تو اکتساب سے حاصل ہوتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرحِ صدر کے طور پر ہوتا ہے۔

كَمَا قَالَ اللهُ تَعَالٰى: اَفَمَنْ شَرَحَ اللهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللهِ... (الزمر: ۲۲)

"سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے، کیا وہ شخص اور اہلِ قساوت برابر ہیں؟ سو جن لوگوں کے دل اللہ کے ذکر سے متاثر نہیں ہوتے، ان کے لیے بڑی خرابی ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ذکرِ الٰہی سے شرحِ صدر اور نورِ باطن عطا ہو جاتا ہے، اور تصوف کی ابتدا اور انتہا ذکرِ الٰہی ہے اس لیے تصوف وسلوک کے حصول سے یقیناً کشف ہو جاتا ہے، کسی کو کم کسی کو زیادہ۔

کشف کو محفوظ رکھنے کے لیے اور کشف کی تکمیل کے لیے علم کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ روح کے کلام میں اجمال ہوتا ہے، رموز واشارات ہوتے ہیں۔ اس کلام کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے آٹھ، دس برس کا عرصہ لگتا ہے جب کہیں جا کر عالمِ برزخ کی اصطلاحات پورے طور پر سمجھ میں آتی ہیں۔ اس سے پہلے کشف میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

علمِ ظاہری کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اس کے بغیر منازلِ سلوک تو طے ہو جاتے ہیں مگر مناصب نہیں مل جاتے۔ اکثر قانون صوفیاء کا دیکھا ہے اور مشاہدہ سے بھی معلوم ہوا ہے کہ قطب، غوث، قیوم، فرد اور قطب وحدت کے مناصب خلفائے اربعہ کی نسل میں ہی رہے ہیں۔ یہ قاعدہ اکثریہ ہے، کلیہ نہیں۔

کشف، علم اور مناصب کا ذکر آ گیا تو یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ذکرِ الٰہی سے کشفِ قبور تو لازماً ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اتنا تیز کشف ہوتا ہے کہ قبور کی طرف محض خیال کرنے سے پورے حالات منکشف ہو جاتے ہیں۔ سینکڑوں آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کو لوگوں نے غوث اور قطب سمجھ رکھا ہے، انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان کی قبروں کا طواف کرتے رہتے ہیں حالانکہ یہ حرکت عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے، اور صاحبِ قبر پر وہ کچھ گزر رہی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔۔۔ ایک مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔ روضہ بنا ہوا ہے، قبر پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، بوسے دیئے جا رہے ہیں مگر صاحبِ قبر زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، کتے کی طرح اٹھ اٹھ کر حملہ کرتا ہے۔

ایک اور ایسے "غوث" کے مزار پر ہر ہفتہ میلہ لگتا ہے حالانکہ صاحبِ قبر کافر ساد ھو ہے۔ کسی نے غلطی سے دفن کر دیا، رفتہ رفتہ غوث بن گیا اور روضہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کو ایسا دردناک اور بھیانک قسم کا عذاب ہو رہا ہے کہ اس سے کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں غوث کا منصب صرف چند ایک ہستیوں کو ملا ہے۔

سب سے پہلے غوث عبدالہادی شاہ رحمۃ اللہ علیہ بھیرہ والے، ان کا مدفن پوشیدہ ہے۔ پھر حضرت بہاؤ الحق زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ اور بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ قلعہ لاہور میں ایک غوث مدفون ہیں، علی ہجویریؒ نام ہے۔ یہ داتا صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ سے الگ دوسری شخصیت ہیں، نام وہی ہے۔ ان کا مدفن پوشیدہ ہے، ان کی طرف سے قبر کا نشان بتانے کی سخت ممانعت ہے۔ ایک غوث ریاستِ دیر کی طرف ہوئے ہیں، ان کا نام گل بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ ان کے علاوہ اس ملک میں کوئی غوث نہیں ہوا۔ ہاں! بڑی بڑی ہستیاں گزری ہیں مگر وہ قطب کے منصب تک ہی ہیں۔

محاکمہ مابین علمائے ظواہر و علمائے باطن از روئے کتاب اللہ

علمائے ظواہر اور علمائے باطن کے درمیان اللہ کی کتاب سے کیسے فیصلہ ہو گا؟ بعض علماء جنہیں روحانی علوم کی معلومات نہیں لیکن انہوں نے ظاہری علوم میں بڑے بڑے نام پیدا کیے ہیں، وہ کشف و الہام کا اقرار نہیں کرتے بلکہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ صوفیوں سے بات کی جائے تو وہ اس کی مخالفت کو حرام کہتے ہیں۔ وہ کشف و الہام جو کتاب و سنت کے مطابق ہو اس کی مخالفت ان کے نزدیک حرام ہے۔ مزید یہ کہ صوفی کا کشف اگر قرآن و سنت کے مطابق ہو (شریعت کے مطابق ہو) تو صاحبِ کشف کے اپنے لیے وہ دلیل شرعی ہے، اس پر عمل کرنا ہو گا، لیکن کوئی دوسرا اس کے کشف کا مکلف نہیں۔ نبیؐ کا کشف نبیؐ کی ذات کے لیے بھی دلیل ہے اور اس کی ساری امت کے لیے بھی دلیل ہے کہ ساری امت کو اس پر عمل کرنا ہو گا۔ امت عمل

Scanned with CamScanner

نہیں کرے گی تو آخرت میں عذاب ہوگا۔ صوفی کو اگر کشفاً کسی بات، کسی کام کی سمجھ آتی ہے کہ ایسا کرو اگر وہ کشف شریعت کے مطابق ہے تو پھر اس کے اپنے لیے حجت ہے، دوسرے کے لیے نہیں، اور وہ خود اس پر عمل نہیں کرے گا تو عذاب وثواب نہیں ہو گا یعنی اس کے کشف کی وہ حیثیت نہیں جو نبیؑ کے کشف کی ہے کیونکہ وہ (بحیثیت امتی) اگر نبی کے کشف پر عمل نہیں کرے گا تو عذاب ہوگا، کرے گا تو ثواب ہوگا، جبکہ صوفی کے کشف کا کوئی دوسرا مکلف ہی نہیں۔ خود صوفی اگر اپنے کشف پر عمل نہیں کرے گا تو اسے دنیوی نقصان ہوگا، آخرت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ سلسلہ میں بہت سے ایسے ساتھی تھے جو بڑے اچھے تھے، انہیں مشاہدات ہوتے تھے، اور جن لوگوں کو کشف نہیں ہوتا تھا وہ انہیں گھیرے رکھتے تھے کہ ''فلاں بات کے بارے بتایئے، فلاں بات کے بارے بتایئے۔'' اس کا نتیجہ یہ نکلا وہ لوگ غرور میں مبتلا ہو گئے، انہیں گھمنڈ ہونے لگا کہ شاید ہم کوئی بہت ہی متبرک ہستیاں ہیں کیونکہ ہمیں کشف ہوتا ہے۔ غرور صوفی کے لیے زہرِ قاتل ہوتا ہے۔ انہیں بھی مار گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ برس ہا برس کی محنتیں ضائع گئیں، ذکر چھوٹ گیا، مشاہدات بھی گئے۔ کئی لوگ جو اُن کے معتقد ہوئے وہ بھی ساتھ ہی ڈوبے، توفیقِ ذکر چھن گئی، سلسلے سے بھی خارج ہو گئے، تو کیا حاصل ہوا؟ اس سارے فساد کی جڑ کیا تھی؟ یہی کہ جب اصول ہے کہ صوفی کو جو کشف ہوتا ہے دوسرا بندہ اس کا مکلف ہی نہیں تو پھر دوسروں کو اس سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بالفرض مجھے کشف ہوتا ہے میں کشفاً ایک بات دیکھتا ہوں، آپ اس کے مکلف ہی نہیں ہیں تو پھر آپ کو اس کے سننے کی کیا ضرورت ہے، آپ اپنے کام کی بات سنیں۔ اسی طرح کسی ساتھی کو اگر کشف ہوتا ہے تو اسے بھی یہ احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ جب وہ اپنے انکشافات بیان کرنے لگتا ہے تو ایک طرح سے شیطان بھی ساتھ ہو جاتا ہے کہ تم بہت پارسا ہو، ہر کسی کو کشف نہیں ہوتا تم کوئی خاص ہستی ہو، اور یہ غرور صوفی کا رستہ کھوٹا کر دیتا ہے۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ کشف والہام بہت اچھی چیز ہے اور ہر ذاکر کو ہو سکتا ہے۔ کشف ہوتا ہے کسی چیز سے پردہ ہٹا دینا۔ الہام کسی چیز کے من جانب اللہ دل میں القا ہونے کو کہتے ہیں۔ ایک قوت اور بھی ہے جسے وجدان کہتے ہیں، یہ سب سے مضبوط تر ہوتا ہے۔ بلکہ کشف کو پرکھنے کا معیار یا کسوٹی بھی وجدان ہی ہے۔ کشف میں غلطی لگے تو صوفی کا دل اسے رَد کر دیتا ہے کیونکہ وجدان نام ہی اس بات کا ہے کہ دل میں من جانب اللہ ایک چیز پورے یقین کے ساتھ جم جائے۔ تو یہ وجدان ہر ذاکر کو نصیب ہو جاتا ہے۔ رہی بات مشاہدات وکشف کی تو یہ از قسمِ ثمرات (اجر) ہیں۔ ایک قسم کا معاوضہ یا ثواب ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ جنہیں کشف نہیں ہوتا انہیں جب ذکر کا اجر ملے گا تو ان کا اجر اہلِ کشف سے زیادہ ہوگا کیونکہ کشف اجر ہے، تو جو اجر مل چکا وہ سارے اجر میں سے منہا ہو جائے گا۔ تب حشر کے دن یہ لوگ رشک کریں گے کہ کاش مجھے دنیا میں کشف نہ ہوتا تو آج اس کے بدلے مجھے مزید درجات نصیب ہوتے۔ گو کہ کشف انعامِ الٰہی ہے مگر یہ ایسی بات نہیں کہ بندہ (بجائے شکر گزار ہونے کے) اکڑ جائے اور تباہ ہو جائے۔

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ کشف کو موجبِ علم سمجھنے کی بجائے موجب وجوب سمجھنا بھی غلط ہے، اور جو علمائے ظواہر

Scanned with CamScanner

نے کہا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، یہ بھی غلط ہے۔ "حق دونوں کے بین بین ہے" یعنی نہ صوفی کے کشف کو حجتِ شرعی کے سامنے کھڑا کیا جائے اور نہ اسے رد کیا جائے۔ شریعت کے مطابق ہے تو خود صاحبِ کشف اس پر عمل کرے۔ نہیں کرے گا تو کوئی دنیوی، جسمانی نقصان اٹھائے گا کیونکہ کشف موجبِ علم یعنی کہ معلومات کا باعث ہے۔ کسی بھی قسم کے علم کا سبب ہے قابلِ عمل ہے، مگر 'موجبِ وجوب' نہیں۔ علم کا سبب ہے مگر اس سے منکشف چیز فرض نہیں ہو جاتی۔ اس سے آخرت کا عذاب بھی متعلق نہیں ہے۔

اس سلسلے میں پہلی مثال حضرت آدمؑ کی دی ہے۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ...الخ۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت آدمؑ و حواؑ کو شیطان نے وسوسہ ڈالا۔ جب انہوں نے پھل کھالیا تو ان کی شرمگاہیں کھل گئیں یعنی پہلے تو جنت کا ایسا لباس تھا جس سے ستر تھا، پھر ستر کھل گیا۔ یعنی پتا چلا کہ نبیؑ تو معصوم عن الخطا ہوتا ہے لیکن انہیں وسوسۂ شیطانی ہوا اور اس کے مطابق عمل بھی کر لیا۔ معلوم ہوا کہ شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آجانا گناہ یا جرم نہیں، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق جب مومن اسے رد کرتا ہے تو اسے جہاد کا ثواب ملتا ہے۔ شیطان تو وسوسے ڈالتا رہتا ہے، کوشش کرتا رہتا ہے، بندہ کہیں بھی پہنچ جائے وہ ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا زمین و آسمان کا درمیان روشنی سے بھر گیا۔ آواز آئی "اے عبدالقادر! میں تیرا ربّ ہوں، آج سے میں نے تجھ پر نمازیں معاف کر دیں۔" حضرتؒ فرماتے ہیں میں نے فوراً کہا کہ بدمعاش! بکواس کرتا ہے، ربّ نے تو نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فرض کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا کون ہے کہ اسے نماز معاف ہو جائے۔ تُو شیطان ہے اور بکواس کر رہا ہے۔ آپؒ نے 'لاحول' پڑھی تو ایک دم روشنی تاریکی میں بدل گئی۔ شیطان چیخ مار کر بھاگا اور جاتے جاتے کہنے لگا "عبدالقادر! تجھے تیرے علم نے بچا لیا۔" آپؒ نے پھر 'لاحول' پڑھی اور فرمایا "بے ایمان جاتے جاتے بھی وار کر رہا ہے، مجھے میرے ربّ کے فضل نے بچا لیا، میرے علم نے نہیں۔" لہٰذا شیطان تو وسوسہ ڈالتا ہی ہے لیکن وجدان ایک ایسی قوت ہے کہ اسے رد کر دیتی ہے، دل اسے صحیح مانتا ہی نہیں۔ تو فرمایا، شیطان کا وسوسہ ڈالنا (بندے کا) گناہ نہیں بلکہ جب اسے رد کیا جائے تو جہاد کا ثواب ملتا ہے۔ نہ یہ کمالات کے منافی ہے؛ بڑے سے بڑے مقام والے کو وسوسہ آ سکتا ہے۔ ہاں! وسوسہ تب جرم بنتا ہے جب اس پر عمل کر کے شریعت کی خلاف ورزی کی جائے، بلکہ دوگنا جرم بنتا ہے، ایک تو یہ کہ شیطان کی پیروی کی، دوسرا یہ کہ شریعت کے خلاف کیا۔ ایک اور بات جو خصوصاً غور طلب ہے۔ ایک ہوتا ہے وسوسے کا آنا اور ایک ہے وساوس کا لانا۔ یعنی ایک تو یہ کہ شیطان نے کوئی بات دل میں ڈالی، ایک یہ کہ بندہ خود ہی اوٹ پٹانگ سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ ارادی طور پر وسوسے لاتا ہے۔ یہ صورتِ حال پہلی صورت سے زیادہ بری اور نقصان دہ ہے۔ ان دونوں صورتوں سے بچنے کا بہترین حل ذکرِ قلبی ہے کیونکہ دل ایک وقت میں دو باتیں نہیں سوچ سکتا۔ جب دل و دماغ ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوں گے تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کا تحفظ نصیب ہو گا۔

آگے بات ہو رہی ہے کہ "حضرت آدمؑ و حواؑ کو خطاب جو اکلِ شجرہ سے پہلے ہوا، وہ الہامی خطاب تھا، وحیِ شرعی نہیں تھی۔" یعنی جو خطابِ الٰہی حضرت آدمؑ اور حواؑ کو درخت کا پھل نہ کھانے کے لیے ہوا وہ وحیِ شرعی نہیں تھی، وہ الہامی خطاب تھا۔

جیسے صوتی کو کشفاً ہوتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ... اور نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ... یہ دونوں آیات تثنیہ کے صیغے کے ساتھ ہیں۔ یعنی آدمؑ وحواؑ دونوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ یعنی یہ جو الہام یا وحی تھی اس کے مخاطب صرف آدمؑ ہی نہیں، اماں حواؑ بھی تھیں اور حواؑ تو نبی نہیں تھیں، لہٰذا یہ وحیٔ شرعی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو صرف آدمؑ سنتے، اور اماں حواؑ آدمؑ سے سن کر عمل کرتیں۔ اور اگر یہ وحیٔ شرعی ہوتی تو اس کی خلاف ورزی آخرت کے عذاب کا باعث ہو سکتی تھی۔ امام رازیؒ بھی فرماتے ہیں کہ وحیٔ شرعی نہیں، کشف والہام تھا۔ اس الہام پر عمل نہ کرنے سے حضرت آدمؑ وحواؑ کو جسمانی اور دنیوی مصائب پیش آئے نہ کہ دینی عقاب (سزا)۔ ستر کھل گئے، جس جنت میں قیامت پذیر تھے وہاں سے عالمِ آب وگل میں آنا پڑا۔ عذابِ آخرت اس پر مرتب نہیں ہوا کیونکہ کشف و الہام کی خلاف ورزی تھی اس لیے دنیوی مصائب ہی پیش آئے۔ قرآن میں ہے، وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى... اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو چن لیا اور منتخب فرمالیا۔ غلطی جو آدمؑ سے ہوئی تو اس پر لفظ 'معصیت' اللہ نے فرمایا۔ قرآن میں اس طرح کے الفاظ جہاں کہیں انبیاءؑ کے لیے آئے ہیں ان کے لیے قانون ہے کہ ان سے اسم فاعل بنانا شرعاً حرام ہے۔ اللہ نے آدمؑ کے عمل کو معصیت کہا، لیکن اگر کوئی آدمؑ کو عاصی کہے گا تو یہ حرام ہوگا۔ اس لیے کہ یہ معصیتِ شرعی نہیں، معصیتِ لغوی ہے۔ اس لیے اس کی جو سزا ملی، وہ یہ تھی کہ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا... کہ ان کے ستر کھل گئے۔ اور میاں بیوی کا ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل جانا شرعاً حرام نہیں ہے لہٰذا یہ کوئی اخروی عذاب نہیں ہے۔ اور جنت سے آنا پڑا، یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس جنت میں پیدائش کے بعد آدمؑ کو رکھا گیا وہ برزخ کی جنت ہے، جو مومن کو قیامت تک نصیب ہوتی ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ "قبر یا جنت کا باغ ہے یا دوزخ کا گڑھا" مرنے کے بعد کافر کی قبر میں جہنم کا اثر آجاتا ہے، وہ جہنم کا گڑھا بن جاتی ہے۔ مومن کی قبر میں جنت کی ہوائیں، خوشبوئیں، روشنی اور جنت کی نعمتیں آجاتی ہیں، وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بن جاتی ہے۔ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ (الواقعہ:۸۹)۔ یہ جنت دوزخ، برزخ کی ہے۔ حقیقی جنت دوزخ جو ہمیشہ رہے گی، اس میں داخلہ قیامت کے بعد ہوگا۔ اسی طرح فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرمایا: اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا... وہ غرق ہوئے، پس داخل ہو گئے جہنم میں۔ اور فرمایا کہ قیامت کو اشد عذاب میں داخل ہوں گے۔ فرعون قیامت کے دن قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان سب کو آگ میں لے جائے گا۔ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ... (ہود:۹۸)۔ غرق ہونے کے بعد فرعون برزخ کے جہنم میں ہے، قیامت کے بعد حقیقی جہنم میں ہوگا۔

آدمؑ وحواؑ کے کشف والہام کے بعد مریمؑ پر ہونے والے کشف والہام کی بات ہوتی ہے۔ حضرت مریمؑ کو پانچ الہامی خطاب کیے گئے۔ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا... الخ۔ حضرت زکریاؑ کو ان کی کفالت سپرد کی گئی تو پہلا خطاب بھیجے ہوئے پھلوں کی صورت ہوا ہے، قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا... الخ۔ حضرت زکریاؑ جب باہر جاتے (بیت المقدس سے) تو مریمؑ کے حجرے کو باہر سے تالا لگا کر چابی پاس رکھتے تھے۔ جب آکر تالا کھولتے تو اندر بے موسم کے پھلوں کا ڈھیر ہوتا جو اس علاقے کے بھی نہیں ہوتے تھے۔ آپؑ نے ان سے پوچھا کہ آپ کے پاس یہ کہاں سے آئے؟ یعنی انہیں غذا اللہ کی جانب سے ملتی تھی تو یہ ان کی جسمانی تربیت کے لیے تھا۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ... وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ... جب فرشتے نے حضرت مریمؑ سے بات کی اور انہیں بتایا کہ اللہ نے آج کے عہد کی تمام عورتوں پر تمہیں سرفراز فرمایا، منتخب فرمالیا تو یہ خطاب

Scanned with CamScanner

تربیت روحانی کے لیے تھا۔ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ...وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ... یہ خطاب تکلیفِ شرعی کے لیے ہے پھر آپؑ کو حکم ہوا کہ اپنے رب کے ساتھ استقامت سے رہیے، اپنے رب کی اطاعت کیجیے، سجدہ کیجیے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیجیے۔ فرمایا کہ خطاب انہیں شرع کا مکلف کرنے کے لیے تھا۔ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ... وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ... اس خطاب میں فرشتے نے بات کی کہ اللہ آپ کو بیٹا دے گا اور اللہ اسے اپنا نبی بنائے گا۔ یہ خطاب بشارت کے لیے تھا فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ...فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا... یہ خطاب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد تسلی کے لیے ہے۔ یہ سارا خطاب فرشتوں کی طرف سے حضرت مریمؑ کو ہوئے جنہیں اللہ نے حکم دیا تھا کہ انؑ سے جا کر یہ بات کہو۔ حضرت مریمؑ کا واقعہ بیان کر کے بتایا کہ انبیاءؑ کے متبعین کو یہ کمالات بطورِ میراث ملتے ہیں۔ حضرت مریمؑ بھی تو نبی نہیں تھیں لیکن اللہ کی طرف سے الہام و القا ہونا ثابت ہوا۔ فرشتے کا ان کے ساتھ ہم کلام ہونا بھی ثابت ہوا، ان کا اپنے کشف پر عمل کرنا بھی ثابت ہوا۔ تو فرمایا کہ تم بھی اپنے نبی کریم ﷺ کے متبع بن جاؤ، تمہیں یہ کمالات پہلے انبیاءؑ کے متبعین سے بڑھ کر ملیں گے کیونکہ جو اللہ کا ہو رہے، اللہ اس کا ہو رہتا ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ... ''کیا اللہ ہی اپنے بندے کے لیے کافی نہیں!''

جیسا کہ اس نے حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو غیروں سے بچایا، غیبی رزق دیا، عزت بچائی۔ تو (اے مسلمانو!) تم بھی اس کے ہو رہو، سب کچھ ملے گا۔ وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ... سے مزید تاکید فرما دی۔ وہ اپنے بندوں کو روزی ایسے ذریعوں سے دیتا ہے کہ جن کا کسی کو گمان تک نہیں ہوتا۔ ان الہامات و انکشافات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رب اپنے بندوں کی امداد کے لیے بڑی بڑی ہستیوں کو مقرر کرتا ہے۔ حضرت مریمؑ کی ظاہری کفالت حضرت زکریاؑ کو سونپی اور باطنی طور پر حضرت جبرائیلؑ کو مقرر کر دیا جو انہیں باتیں بتاتے اور انؑ سے بات کرتے تھے۔ اللہ قادر ہے، وہ اپنے بندوں کی اس طرح حفاظت فرماتا ہے کہ ظاہری و روحانی، دونوں اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جبرئیل امینؑ کسی ولی اللہ کے پاس تشریف لا سکتے ہیں، اس کی مدد و رہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہاں! سلسلۂ وحی جس سے احکامِ شریعت بنتے تھے، ختم ہو گیا۔ وحیٔ احکامی و شرعی صرف نبی کریم ﷺ کا خاصہ تھی۔ اس کا آنا ختم ہو گیا۔

کشف والہام کے ذریعے کسی کو ہدایات دی جا سکتی ہیں جیسا کہ مریمؑ کو دی گئیں۔ بذریعہ کشف والہام بتایا گیا کہ اللہ آپؑ کو بیٹا دے گا۔ انہوں نے اس پر بحث بھی کی کہ میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ جبرئیل امینؑ نے عرض کیا کہ اللہ قادر ہے، وہ اپنی قدرت سے دے گا۔ وہ (عیسیٰؑ) اس کا کلمہ، اس کی روح ہوگی۔ پھر جیسے جیسے جبرئیل امینؑ نے ہدایات دیں انہوں نے عمل کیا۔ جنگل کے ایک کونے میں نکل گئیں۔ کھجور کے درخت سے کھجوریں کھائیں۔ اللہ نے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ وہ ساری ہدایات جو کشفاً انہیں ملیں، ان پر انہوں نے عمل کیا جس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کشف والہام موجبِ علم بھی ہے اور قابلِ عمل بھی ہے۔ صاحبِ کشف کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

بعض احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ انبیاءؑ قیامت کے دن اولیاء اللہ پر غبطہ (رشک) کریں گے۔ یہ بات حضرت مریمؑ کے واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ حضرت زکریاؑ نبی تھے، حضرت مریمؑ ولیہ تھیں۔ مریمؑ کے پاس بے موسم کے

Scanned with CamScanner

(وہ بھی جبکہ حجرہ کا دروازہ باہر سے مقفل ہوتا تھا) دیکھ کر رشک کیا اور دعا کی کہ یا اللہ! تُو قادر ہے، مریمؑ کو بے موسے پھل پھل (دے سکتا ہے تو مجھے بے موسمی (آپؑ پر بڑھاپے کا عالم تھا) اولاد بھی عطا کر سکتا ہے کیونکہ میرے وارثوں میں کوئی ایسا نہیں جو اس سلسلے کو جاری رکھ سکے۔ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ۔۔۔ میرے بعد اندیشہ ہے کہ دین کا سلسلہ جاری نہ رہ سکے گا۔ لہٰذا مجھے صاحبِ اولاد کر۔ اسے غبطہ یا رشک کرنا کہتے ہیں۔ اسی طرح واقعۂ خضر و موسیٰؑ سے بھی غبطہ ثابت ہے۔ موسیٰؑ نبی تھے اور نبی کے پاس علمِ تشریعی ہوتا ہے۔ ولی کے پاس تشریعی علم نہیں ہوتا، وہ بس اس پر عمل کرنے کا مکلف ہوتا ہے۔ چونکہ خضرؑ کو اللہ تعالیٰ نے تکوینی امور پر فرشتوں کی جگہ مقرر کر رکھا تھا اس لیے انہیں ان باتوں کا علم تھا جو موسیٰؑ کے علم میں نہیں تھیں۔ موسیٰؑ ہر اس کام پر اعتراض کرتے جو خضرؑ ان کے سامنے کرتے۔ موسیٰؑ کے پاس جواز تھا کہ وہ شرعاً جائز نہیں تھے کیونکہ ان کے پاس تشریعی علم تھا۔ آخر میں خضرؑ نے اپنے ہر کام کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ یہ سب کچھ بحکمِ الٰہی کیا گیا تو اس پر موسیٰؑ نے غبطہ کیا کہ ایک بات میرے علم کی حد سے باہر ہے اور خضرؑ اسے جانتے ہیں۔ حالانکہ خضرؑ ولی تھے جبکہ حضرت موسیٰؑ ایک نبی تھے۔

یہاں اعلیٰ حضرتؒ ایک اور نکتہ اٹھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''میرا غالب خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ سے پہلے جو امتیں تھیں ان میں اگر کسی ولی کو کشف ہوتا اور اس نبی کی شریعت کے خلاف بھی ہوتا تو وہ کشف مخصص بن جاتا۔'' یعنی تخصیص ہو جاتی تھی کہ یہ کام شریعت کے خلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ پہلی امتوں میں بہت زیادہ امکان ہے کہ ایسا ہو لیکن اب نہیں، یعنی نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد نہیں۔ مثلاً پہلی شریعتوں میں بھی قانون یہ تھا کہ نابالغ بچہ خواہ کافر ہو قتل نہ کیا جائے لیکن کسی مخفی علت کے تحت خضرؑ نے بچہ قتل کر دیا جس پر موسیٰؑ معترض بھی ہوئے۔ لیکن آپؒ فرماتے ہیں کہ اس قانون کی تخصیص ہو گئی کہ جس حکم کے تحت انہوں نے ایسا کیا وہ اس قانون سے الگ ہے، مخصوص ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا تو یہ گمان ہے۔ صحیح علم اللہ کے پاس ہے۔

''کشف والہام اللہ کے لیے خاص ہیں، نائبِ وحی ہیں، آسمانی علوم کا واسطہ ہیں۔ گو وحی کے مقابلے میں کمزور واسطہ ہیں یعنی موجبِ علم ہیں، علم کا ذریعہ ہیں، قابلِ عمل ہیں لیکن موجبِ وجوب نہیں۔'' یعنی ان سے حکمِ شرعی واجب نہیں ہوتا۔ خود صاحبِ کشف کے لیے بھی یہ تب ہی قابلِ عمل ہیں اگر حکمِ شرعی کے مطابق ہیں۔ صاحبِ کشف ہی اپنے کشف پر عمل کرے گا، باقی کوئی دوسرا مکلف نہیں ہے کیونکہ کشف علم کا باعث ہے۔ اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''علمِ تصوف اور کشف والہام کا تعلق علمِ ظاہری سے ہے، پھر بے علم کو کیونکر کشف ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے (سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ) کے بے علم بھی کشف اور مکاشفات کا اظہار کرتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے؟''

اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ صوفی کو کشف والہام ہوتا ہے لیکن اس کے لیے پہلے علمِ ظاہری ہونا شرط ہے، وہ شریعت کو جانتا ہو۔ عمل کرنے کے لیے جاننا شرط ہے۔ عالم ہو، پھر اسے کشف ہو تو بات بنتی ہے، آپ کے سلسلہ میں ان پڑھ بھی کشف ہونے کے دعویدار ہیں۔ جواب میں حضرتؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ سارے پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن ایمان اور علم کی ترتیب کو سمجھ لیں تو یہ گرہ خود بخود کھل جائے گی۔ صحابہ کرامؓ کو پہلے ایمان کی دولت نصیب ہوئی جو بجائے خود

Scanned with CamScanner

اجمالی علم کا ثمرہ تھا۔ یعنی اللہ کی ذات وصفات کا علم، نبوت کی ضرورت اور آپ ﷺ کے نبی ہونے کا علم ہوا تو ایمان نصیب ہوا۔ ایمان لانے کے بعد پھر دین کا تفصیلی علم نصیب ہوا۔ اسی طرح تصوف کا تعلق تزکیۂ باطن سے ہے جو بمنزلہ ایمان ہے۔ تصوف میں بھی وہ نورِ ایمان، تزکیۂ باطن سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ایمان میں وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو وہ نور پیدا کرتی ہے جس سے مشاہدات ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ہر شخص کا عالم ہونا ضروری نہیں، بس بندۂ کامل شیخ سے وابستہ ہو، اس کا اتباع کرے، اس سے عقیدت رکھے تو جو تزکیہ نصیب ہوگا، اس کی توجہ سے وہ ایمان کا ذریعہ بھی بنے گا اور جب ایمان مضبوط ہوگا تو اس شخص پر کشف ومشاہدہ بھی ہوگا۔ حصولِ کشف والہام کے لیے علم شرط نہیں۔

لیکن اسے قائم رکھنے کے لیے اور ایسے امور سے بچنے کے لیے جو اسے ضائع کرنے کا باعث بن سکتے ہوں اور کشف والہام میں مزید ترقی کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے۔ اب ظاہری علم یا تو کتاب سے حاصل ہوتا ہے یا استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے ملتا ہے، یا پھر اللہ کی مہربانی سے شرح صدر کے طور پر عطا ہوتا ہے۔ بہت سے صوفیاء کو اللہ تعالیٰ ظاہری علم بغیر پڑھے عطا کر دیتا ہے۔ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ... الخ (الانعام:۱۲۵)

اسی طرح فرمایا: "سو جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے...... الخ" یعنی قرآن میں ہے کہ ذکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دل کھول دیتا ہے یعنی دل علوم سے بھر دیتا ہے۔ علم یا تو ظاہری ذرائع سے حاصل ہوتا ہے، یا اللہ القا والہام کے ذریعے ان کے دل میں علم اتار دیتا ہے۔ اور یہ ذکرِ الٰہی سے ممکن ہوتا ہے کیونکہ جن کو ذکرِ الٰہی کی توفیق نہیں ملتی، جن کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں (ذکر سے محروم ہونے کی وجہ سے) وہ نورِ باطن یعنی نورِ علم سے بھی محروم رہتے ہیں۔ تصوف کی ابتدا اور انتہا ذکرِ الٰہی ہے۔ ذکرِ الٰہی سے شرح صدر اور نورِ باطن عطا ہوتا ہے اس لیے تصوف وسلوک کے حصول سے یقیناً کشف ہو جاتا ہے، کسی کو کم، کسی کو زیادہ۔

"کشف کو محفوظ رکھنے کے لیے اور کشف کی تکمیل کے لیے علم کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ روح کے کلام میں اجمال ہوتا ہے"۔

دنیا سے چلے جانے کے بعد عالمِ برزخ میں جا کر بندے میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ جاتی ہے، وہ یہ کہ وہ زائد از ضرورت لب نہیں کھولتا۔ برزخ میں کلام کرنے کا ایک الگ طریقہ وسلیقہ ہے جو باقاعدہ سیکھنا اور سکھانا پڑتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی بزرگ سے (یعنی عالمِ ارواح میں کسی روح سے)، کسی صاحبِ قبر سے کوئی سوال کیا جائے تو اگر اس کا جواب انکار میں ہو تو عموماً وہ جواب ہی نہیں دیتے، خاموش رہتے ہیں جس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بات غلط ہے جو یہ اس کی تصدیق نہیں کر رہے۔ اگر وہ لوگ لب کشائی کرتے ہیں تو مختصر ترین الفاظ ہوتے ہیں، اشارے اور کنائے ہوتے ہیں۔ وہاں پتا چل جاتا ہے کہ لب کھولنے کا صلہ کیا ہوتا ہے۔ یہاں تو ہم دھڑا دھڑ بولے جاتے ہیں، یہ خیال آتا ہی نہیں کہ کراماً کاتبین لکھ رہے ہیں اور ان کا لکھا ہوا اللہ کی بارگاہ میں کھلے گا۔ ہمیں یہ بھی پتا ہو کہ دن بھر کی باتیں جو میں نے کی ہیں، شام کو کوئی جا کر لکھی ہوئی میرے والدین کو دکھائے گا تو ہم محتاط ہو جائیں گے۔ اگر یہ یقین ہو کہ یہ باتیں اللہ کے حضور میں جاتی ہیں تو کیا حال ہو؟

Scanned with CamScanner

اہلِ برزخ پر تو یہ سب کچھ کھل چکا ہوتا ہے۔ بارگاہِ اُلوہیت سامنے ہوتی ہے۔ نجات میں بھی ہوں تو زائد از ضرورت بات نہیں کرتے، اجمالاً کلام کرتے ہیں یعنی مختصر ترین بات کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو تو رمز و اشارہ میں بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، لب نہیں ہلاتے۔ ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے بھی محنت کرنا پڑتی ہے، شیخ سے ان رموز و کنایہ کے مطالب سمجھنے پڑتے ہیں۔ سالہا سال بعد کہیں جا کر بصد محنت اہلِ برزخ کی زبان سمجھ میں آتی ہے۔

علمِ ظاہری کی ضرورت اس لیے بھی پیش آتی ہے کہ اس کے بغیر منازلِ سلوک تو طے ہو جاتے ہیں مگر مناصب نہیں دیے جاتے۔ کوئی سالک اگر عالم نہیں ہے تو اس کا عالم کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ شیخ اس کی رہنمائی کرتا ہے، جائز و ناجائز بتاتا ہے تو گزارا ہو جاتا ہے۔ سلوک تو طے ہو جاتا ہے لیکن منصب نہیں ملتا۔ اسے ابدال، قطب، غوث وغیرہ نہیں بنایا جاتا کیونکہ اس کے لیے علمِ ظاہری کی بھی ضرورت ہے۔ قانونِ صوفیاء یہ ہے کہ الا ماشاء اللہ کسی کو نواز دے تو اللہ قادر ہے، لیکن قانون یہی ہے کہ منصب علماء کو دیا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میرے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ اکثر چوٹی کے مناصب یعنی قطب، غوث، قیوم، فرد، قطبِ وحدت یہ اکثر خلفائے اربعہ، خلفائے راشدین کی اولاد میں ہوتے ہیں۔ یہ قاعدہ اکثریہ ہے، کلیہ نہیں۔ باقی لوگوں میں بھی ہو سکتے ہیں لیکن عموماً خلفائے راشدین کی اولاد سے ہوتے ہیں۔

کشف، علم اور مناصب کا ذکر آ گیا تو یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ذکرِ الٰہی سے کشفِ قبور تو لازماً ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اتنا تیز کشف ہوتا ہے کہ قبور کی طرف محض خیال کرنے سے پورے حالات منکشف ہو جاتے ہیں۔ سینکڑوں آدمی ایسے ہوتے ہیں جنہیں لوگوں نے غوث اور قطب سمجھ رکھا ہے۔ بڑے بڑے روضے بنا رکھے ہیں، بڑی چادریں چڑھا رکھی ہیں، انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں حالانکہ یہ عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ دعوائے اسلام کے ساتھ قبروں کو ربّ سمجھنا، اپنی ضرورتیں ان سے مانگنا اسلام کے خلاف و برعکس ہے۔ حضرتؒ اپنا ایک مشاہدہ لکھتے ہیں کہ ایک مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔ روضہ بنا ہوا اور چادریں چڑھی ہوئیں، بوسے دیئے جا رہے ہیں مگر صاحبِ قبر زنجیروں سے جکڑا ہوا اُٹھ اُٹھ کر کتے کی طرح حملہ کرتا ہے۔ شکل بھی اس کی انسانی نہیں تھی، درندے کی شکل تھی۔ روحانی طور پر بھی اندر داخل ہوں تو اُٹھ اُٹھ کر کاٹنے کو دوڑتا تھا، اس سے بات نہ ہو سکی۔ دوسرا واقعہ حضرتؒ نے میری موجودگی میں سنایا اور میں بذاتِ خود بھی اس قبر کا علم رکھتا ہوں۔ اوپر بڑا سا مقبرہ بنا ہوا ہے، ہر سال میلہ لگتا ہے، لاکھوں میں نذرانے ہوتے ہیں۔ بڑا شہر ہے، ہر دکاندار دس دس ہزار، پانچ ہزار، دو دو ہزار نذرانہ دیتے ہیں پھر جو سفید پوش ہیں وہ بھی حسبِ توفیق دیتے ہیں۔ غوث صاحب کہہ کر پکارے جاتے ہیں۔ حالانکہ صاحبِ قبر کافر سادھو ہے، کسی نے غلطی سے دفن کر دیا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا، وہاں ننگ دھڑنگ پڑا رہا، مرا تو مسلمانوں نے دفن کر کے مقبرہ بنا دیا اور رفتہ رفتہ غوث بن گیا۔ اس کی قبر میں جہنم کی اتنی آگ ہے، اس شدت کا عذاب ہے کہ اس سے بات کرنا ممکن نہیں۔

حضرتؒ فرماتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں غوث کا منصب صرف چند ایک ہستیوں کو ملا ہے۔ سب سے پہلے حضرت عبدالہادی شاہؒ ہیں، بھیرہ میں دفن ہیں، ان کی قبر کا کسی کو علم نہیں۔ انہیں کفار نے شہید کر کے اندھے کنویں میں ڈال کر اوپر سے کنواں بند کر دیا۔ ایک دفعہ مجھے بھیرہ جانے کا اتفاق ہوا، ایک حکیم صاحب (جو وصال پا چکے ہیں) سے ملنا تھا۔

وہاں سے واپسی کے لیے اٹھا اور سرگودھا جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف بلایا ہے۔ مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ کدھر جانا ہے۔ بھیرہ میرا دیکھا ہوا شہر بھی نہیں تھا، میں بس سے اتر آیا اور چل پڑا چلتا گیا، ایک گلی میں داخل ہو کر چلتا گیا چلتا گیا، موڑ مڑتا گیا۔ اندرونِ شہر ایک چھوٹی سی مسجد تھی، وہاں پہنچا تو میں مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد کے سامنے کچھ گھر تھے، کئی منزلہ مکان تھے، ان کے نیچے کہیں وہ غوث صاحب تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مہربانی کی تو میں اس مسجد میں کچھ دیر بیٹھا رہا، ان کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔ کچھ دیر بعد جب اجازت ملی تو اٹھ کر چلا آیا۔ ان کے مرقد مبارک پر جن لوگوں کے گھر ہیں، غوث صاحبؒ ان سے تنگ ہیں، فرماتے ہیں کہ یہ بدکار ہیں، موذی ہیں، ان کے مرد عورتیں اچھے نہیں ہیں۔ یہ بے حیا لوگ ہیں، بدکاری کرتے ہیں اور مجھے کوفت ہوتی ہے۔

اس برصغیر میں صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ بھی آئے لیکن سب سے پہلے صاحبِ منصب غوث ولی عبدالہادی شاہ صاحبؒ ہی ہوئے ہیں۔ پھر بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ غوث ہیں۔ بوعلی قلندرؒ غوث ہوئے ہیں۔ قلعۂ لاہور میں بھی ایک غوث مدفون ہیں 'علی ہجویری' نام ہے، یہ بھی محلہ ہجویر کے رہنے والے تھے۔ یہ داتا صاحب سے صدیوں پہلے کے ہیں۔ شاہی قلعہ بننے سے بھی اتنا عرصہ پہلے وفات پائی کہ شاہی قلعہ کی بنیادیں کھودی گئیں تو ان کی قبر کہیں دور نیچے تھی۔ جس طرح داتا دربار میں بھی داتا صاحبؒ کی قبر کہیں ساٹھ ستر فٹ نیچے ہے۔ اسی طرح وقت کے ساتھ ان غوث صاحبؒ کی قبر بھی بہت نیچے چلی گئی۔ وہ مزاج کے بڑے سخت ہیں، بہت کم کسی صاحبِ کشف کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ جس نے میری قبر کی نشاندہی کی، اس کے مقامات سلب ہو جائیں گے۔ ایک غوث ریاست دِیر کی طرف ہوئے ہیں، ان کا نام 'گل بادشاہ' تھا۔ یہ تمام ہستیاں حضرتؒ کے مشاہدہ میں آئی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی غوث اس ملک میں نہیں ہوا۔ اس عہد سے پہلے ان کے علاوہ کوئی غوث نظر میں نہیں آتا۔ ہاں! اقطاب اور اس سے نیچے کے مناصب کے لوگ ہیں۔ اور اولیاء اللہ اور صوفیاء سے تو زمین اس طرح روشن ہے جس طرح آسمان ستاروں سے روشن ہے۔ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عہد میں ہر دور میں اللہ کے بندے رہے ہیں۔ یہ دو تین مشاہدات حضرتؒ نے آخر میں ارشاد فرما دیئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

باب (18)

رویتِ انبیاءؑ وملائکہ

رویت انبیاءؑ وملائکہ وارواح کا معاملہ کشف سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں، ہاں کبھی اس راہ کے سالک کو یہ نعمتیں ضمناً حاصل ہو جاتی ہیں۔ پچھلے کئی ابواب میں بیان ہو چکا ہے کہ تصوف وسلوک میں مقصود بالذات رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس کی تکرار کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ مروجہ تصوف میں سب سے زیادہ بے اعتنائی اسی سے برتی جاتی ہے۔
صحیح اسلامی تصوف تو محبتِ الٰہی اور اتباعِ سنت ہی کا نام ہے اس کی ابتدا اور انتہا یہی ہے۔

اَمَّا الْبَدَايَةُ فَالْاِشْتِغَالُ بِالْعُبُوْدِيَّةِ وَ اَمَّا النِّهَايَةُ فَقَطْعُ النَّظْرِ عَنِ الْاَسْبَابِ وَ تَفْوِيْضِ الْاُمُوْرِ كُلِّهَا اِلَى اللّٰهِ...

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ... (العنکبوت:۵۷)

"تصوف کی ابتدا اللہ کی عبادت میں مشغول ہونا ہے اور اس کی انتہا اسباب سے نظر اٹھالینا اور تمام امور کو اللہ کے سپرد کر دینا ہے۔ ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے پھر لوٹ کے ہمارے پاس آنا ہے۔"

رویت انبیاءؑ وملائکہ

فوت شدہ لوگوں کی ارواح کو ظاہری آنکھوں سے تو نہیں دیکھا جا سکتا، ہاں کشفاً دیکھا جا سکتا ہے اور معاملے کا تعلق بھی کشف سے ہے، خواہ وہ ارواح عام مسلمانوں کی ہوں یا انبیاءؑ کی، یا فرشتے ہوں۔ سالک اس مقصد کے لیے مجاہدہ نہیں کرتا کہ ارواح یا فرشتے نظر آئیں اور یہ کوئی مقصود بالذات نہیں ہے۔ مجاہدہ تو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے چونکہ مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے لیکن جب سینہ منور ہوتا ہے اور قلب روشن ہوتا ہے تو ضمناً یہ نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ پہلے بھی کئی بار یہ بات دہرائی جا چکی ہے کہ مقصود بالذات اللہ کی رضا ہے اور اس کے بار بار دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ تصوف کے نام پر بناوٹی چیزیں بن گئی ہیں اور جن کے پاس یہ نعمت نہیں وہ زیادہ بے اعتنائی برتتے ہی رضائے الٰہی سے ہیں جبکہ تصوف کی حقیقت اللہ کی محبت اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت ہے۔ اس کی ابتدا بھی یہی ہے اور انتہا بھی۔ کوئی شروع بھی کرے گا تو اسی سے کرے گا، جوں جوں اس کا خلوص بڑھتا جائے گا، ترقی درجات ہوتی جائے گی۔ کوئی منتہی ہے تو بھی اتباعِ سنت اور رضائے الٰہی کے حصول ہی کی کوشش کرے گا۔
تصوف کی ابتدا اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جانا ہے۔ اور عبادت سے مراد صرف نماز، روزہ ہی نہیں بلکہ عبادت سے مراد زندگی کے ہر شعبے اور ہر کام میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ انسان دنیا میں رہتے ہوئے سارے اسباب تو اختیار کرے کیونکہ جائز اسباب کا اختیار کرنا بھی عبادت اور اطاعت ہے لیکن اس کی امید اسباب پر نہ ہو، مسبب الاسباب پر ہو۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ اسباب کو چھوڑ دینا تو الگ بات ہے۔ لیکن جب تک کسی کے حواس قائم ہیں

Scanned with CamScanner

اور عقل درست ہے، کوئی مانع یا رکاوٹ نہیں تو ترکِ سبب شرعاً جائز نہیں ہے۔ ہاں! ناجائز اسباب اختیار کرنا بھی ناجائز ہے تو یہ بڑا مشکل معاملہ ہے کہ اسباب بھی اختیار کرے لیکن امید اسباب پر نہ ہو، مسبب الاسباب پر ہو۔ اور یہ نعمت تصوف ذکر الٰہی اور قلبی قوت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ... ہر شخص کو مرنا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔
یعنی دنیا میں اس طرح زندہ رہے کہ اس کا ہر کام موت کی تیاری نظر آئے۔

رویت انبیاءؑ کا ثبوت

رسول کریم ﷺ، انبیائے کرامؑ اور ملائکہ کی حالتِ بیداری میں رویت مختلف فیہ نہیں ہے۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو اس میں کہ مرئی یعنی جو دیکھے جاتے ہیں اُن کی ذاتِ مقدسہ بعینہٖ ہے، یا اُس کی مثل ہے۔ ایک قلیل بلکہ اقل جماعت کا خیال ہے کہ مرئی صورت عین ذات نہیں بلکہ صورتِ مثالیہ ہوتی ہے۔ اکثر علمائے ظواہر و باطن حالت بیداری میں رویت رسول ﷺ بعینہٖ کے قائل ہیں۔

۱۔ علامہ ابن تیمیہ نے 'اقتضائے صراط مستقیم' میں اس پر اظہارِ رائے کیا ہے اور اس کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ایک آدمی نے حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت کی، آپ ﷺ نے اسے فرمایا کہ عمرؓ کو کہو کہ صلوٰۃ استسقاء کے لیے لوگوں کو باہر نکالو۔

۲۔ شاہ ولی اللہؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ میں نے قرآنِ مجید حضورِ اکرم ﷺ سے پڑھا۔

وَاِنْ سَئَلْتَنِیْ عَنِ الْخَبَرِ الصِّدْقِ فَاِنِّیْ تِلْمِیْذُ الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ بِلَا وَاسِطَةٍ كَمَا اَنِّیْ اُوَیْسِیٌّ لِرُوْحِ حَضْرَةِ الرِّسَالَةِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... (الفوز الکبیر:۷۶)

"اگر سچ پوچھو تو (میں تعلیمِ قرآن میں اویسی ہوں جس طرح فیضِ باطنی میں اویسی ہوں)، میں نے روحِ نبی اکرم ﷺ سے بلاواسطہ قرآن مجید پڑھا جیسے فیضِ باطنی حاصل کیا۔"

مزید تفصیل کے لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی 'فیوض الحرمین' اور 'تفہیمات الٰہیہ' ملاحظہ ہوں۔

۳۔ علامہ سیوطی نے ایک مستقل کتاب 'تنویر الملک فی امکان رویۃ النبی ﷺ والملک' لکھی ہے۔ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

۴۔ امام غزالی فرماتے ہیں:

وَمِنْ اَوَّلِ الطَّرِيْقَةِ تَبْتَدِاُ الْمُشَاهِدَاتُ وَ الْمُكَاشِفَاتُ حَتّٰى اَنَّهُمْ فِيْ يَقْظِهِمْ يُشَاهِدُوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ اَرْوَاحَ الْاَنْبِيَآءِ وَ يَسْمَعُوْنَ مِنْهُمْ اَصْوَاتًا وَ يَقْتَبِسُوْنَ مِنْهُمْ فَوَائِدَ... (المنقذ من الضلال:۵۰)

Scanned with CamScanner

طریقۂ سلوک کی ابتدا ہی مشاہدات اور مکاشفات کا شروع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ سالکین بیداری میں انبیاءؑ کے ارواح اور ملائکہ کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کا کلام سنتے ہیں اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔"

مگر امام غزالیؒ دیگر صوفیاء اور علماء سے اتنا اختلاف کرتے ہیں کہ رویتِ مثال کے قائل ہیں، عینِ ذات کے قائل نہیں۔

رویتِ انبیاء کا ثبوت

حالتِ بیداری میں ارواح یا فرشتوں کو دیکھنے یا نبی کریم ﷺ کی زیارت کے ہونے میں متقدمین سے لے کر آج تک کسی عالم نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اگر کچھ قدرے یا تھوڑا بہت ہے تو اس بات میں کہ نبی کریم ﷺ کی زیارت حضور ﷺ کے جسدِ اطہر، روحِ پاک، اُسی وجودِ عالی اور اُسی حیثیت سے ہوتی ہے، یا وجودِ مثالی ہوتا ہے۔ بہت تھوڑے علماء کا یہ خیال ہے کہ جو حضور ﷺ کی زیارت ہوتی ہے، یا دوسری ارواح اور فرشتوں کی زیارت ہوتی ہے تو ان کی اصلی صورت نہیں بلکہ صورتِ مثالی ہوتی ہے، اور ایسا کہنے والے لوگ اقل یعنی بہت تھوڑے ہیں۔

علمائے ظاہر و باطن کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ جب حضور ﷺ کی زیارت ہوتی ہے تو بعینہٖ ذاتِ رسول ﷺ کی ہوتی ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب 'اقتضائے صراطِ مستقیم' میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک آدمی کو حضور ﷺ کی زیارت ہوئی۔ حضور ﷺ نے اسے پیغام دیا کہ قحط سالی ہے، فاروقِ اعظمؓ سے کہو کہ لوگوں کو نمازِ استسقاء کے لیے باہر نکالیں۔ یہاں یہ روایت اتنی ہی بیان کی گئی ہے۔ آگے یہ ہے کہ اس آدمی نے حضرت عمرؓ کو پیغام دیا اور انہوں نے نمازِ استسقاء پڑھائی۔ یہ اعتراض نہیں کیا کہ حالتِ بیداری میں حضور ﷺ کی زیارت کیسے ہو سکتی ہے بلکہ اس حکم کو درست سمجھا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح میں نے روحانی فیض بطرزِ اویسی، نسبتِ اویسی سے حاصل کیا اسی طرح میں نے قرآنِ کریم نبی کریم ﷺ سے پڑھا ہے اور میں آپ ﷺ کا شاگرد ہوں۔ مزید تفصیل شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "فیوض الحرمین" یا 'تفہیماتِ الٰہیہ' سے دیکھی جا سکتی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے، 'تنور الملک فی امکان رویۃ النبی ﷺ والملک'۔ اس سے بھی مزید تفصیل پڑھی جا سکتی ہے۔ امام غزالیؒ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زیارت اور رویت کے قائل ہیں۔ فرشتوں کو دیکھا جاتا ہے، ان کی باتیں سنی جاتی ہیں اور ان سے فیض حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں "امام غزالیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ رویت شکلِ مثالی کی ہوتی ہے نہ کہ حقیقی کی۔"

رویتِ عینِ ذات اور صورتِ مثالی میں اختلاف

علامہ عبدالوہابؒ شعرانی نے امام غزالیؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے:

قَالَ (اَیْ غزالیؒ) اِنَّمَا هُوَ مِثَالُ رُوْحِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُقَدَّسَةِ عَنِ الصُّوْرَةِ وَالشَّكْلِ

وَشِبْهِ رُؤْيَةِ اللّٰهِ فِي الْمَنَامِ بِذٰلِكَ فَلَا أَدْرِيْ مَا أَرَادَ بِهٖ رَحِمَهُ اللّٰهُ... (الیواقیت والجواہر، ۱: ۱۳۳)

"امام غزالی نے فرمایا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی روح کی مثال کی زیارت ہوتی ہے نہ بعینہٖ جسمِ مقدس کی اور اس کو رویتِ باری فی المنام سے تشبیہ دی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے آپ کا ارادہ کیا ہے۔"

پھر علامہ شعرانی فرماتے ہیں کہ شیخ صالح عطیہ ابناسی، شیخ قاسم مغربی اور قاضی زکریا نے امام سیوطیؒ سے سنا ہے کہ:

يَقُوْلُ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْيَقْظَةِ بِضْعًا وَّسَبْعِيْنَ مَرَّةً...

(الیواقیت الجواہر، ۱: ۱۳۳)

"فرماتے ہیں: میں نے حضورِ اکرم ﷺ کو ستر سے زیادہ مرتبہ بیداری میں دیکھا۔"

علامہ سیوطیؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے:

هَلِ الرُّؤْيَةُ لِذَاتِ الْمُصْطَفٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِجِسْمِهٖ وَرُوْحِهٖ أَوْ لِمِثَالِهٖ... وَ فَصَّلَ الْقَاضِيْ أَبُوْ بَكْرِ بْنُ الْعَرَبِيِّ فَقَالَ: رُؤْيَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصِفَتِهِ الْمَعْلُوْمَةِ إِدْرَاكٌ عَلَى الْحَقِيْقَةِ، وَرُؤْيَتُهٗ عَلٰى غَيْرِ صِفَتِهٖ إِدْرَاكٌ لِّلْمِثَالِ وَ هٰذَا الَّذِيْ قَالَهُ الْقَاضِيْ فِيْ غَايَةِ الْحُسْنِ وَ لَا يَمْتَنِعُ رُؤْيَةُ ذَاتِهِ الشَّرِيْفَةِ بِجَسَدِهٖ وَ رُوْحِهٖ وَ ذٰلِكَ لِأَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ سَائِرَ الْأَنْبِيَاءِ أَحْيَاءٌ...

(الحاوی للفتاوی، ۲: ۲۵۰)

قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ: ثُمَّ أَتَيْتُ عُثْمَانَ لِأُسَلِّمَ عَلَيْهِ وَ هُوَ مَحْصُوْرٌ فَقَالَ: مَرْحَبًا يَا أَخِيْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ هٰذِهِ الْخَوْخَةِ فَقَالَ: يَا عُثْمَانُ حَصَرُوْكَ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: عَطَّشُوْكَ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، فَأَدْلٰى لِيْ دَلْوًا فِيْهِ مَاءٌ فَشَرِبْتُ حَتّٰى رَوِيْتُ حَتّٰى إِنِّيْ لَأَجِدُ بَرْدَهٗ بَيْنَ ثَدْيَيَّ وَ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَقَالَ: إِنْ شِئْتَ نُصِرْتَ عَلَيْهِمْ، وَ إِنْ شِئْتَ أَفْطَرْتَ عِنْدَنَا فَاخْتَرْتُ أَنْ أُفْطِرَ عِنْدَهٗ... فَقُتِلَ ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَ هٰذِهِ الْقِصَّةُ مَشْهُوْرَةٌ عَنْ عُثْمَانَ مُخَرَّجَةٌ فِيْ كُتُبِ الْحَدِيْثِ بِالْإِسْنَادِ أَخْرَجَهَا الْحَارِثُ ابْنُ أَبِيْ أُسَامَةَ فِيْ مُسْنَدِهٖ وَغَيْرُهٗ وَ قَدْ فَهِمَ الْمُصَنِّفُ مِنْهَا أَنَّهَا رُؤْيَتُهٗ يَقْظَةً وَ إِنْ لَّمْ يَصْلُحْ عَدُّهَا فِي الْكَرَامَاتِ لِأَنَّ رُؤْيَةَ الْمَنَامِ يَسْتَوِيْ فِيْهَا كُلُّ أَحَدٍ... (الحاوی للفتاوی، ۲: ۲۴۸، ۲۴۹)

"کیا رویتِ رسول ﷺ بجسمہٖ ہے یا صورتِ مثالی کا دیکھنا ہے؟ اور قاضی ابوبکر بن العربی نے اس پر محاکمہ کیا اور فرمایا کہ صفتِ معلومہ کے ساتھ حضور ﷺ کی رویت حقیقت پر محمول ہوگی اور غیر صفتِ معلومہ کے ساتھ رویت مثالی پر محمول ہوگی۔ قاضی موصوف کا محاکمہ بہت خوب ہے اور

حضور ﷺ کی رویت جسدی و روحی میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا کیونکہ حضور اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء زندہ ہیں۔ عبداللہ بن سلام نے کہا کہ پھر میں حضرت عثمانؓ کے پاس آیا تاکہ انہیں سلام عرض کروں اور وہ محصور تھے۔ حضرت عثمانؓ نے مجھے خوش آمدید کہا اور فرمایا میں نے حضور اکرم ﷺ کو اس کوچہ میں دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، لوگوں نے تمہیں محصور کر لیا ہے؟ عرض کیا، جی ہاں۔ پھر فرمایا، انہوں نے پیاسا رکھا؟ عرض کیا، جی ہاں۔ پھر حضور ﷺ نے میری طرف ڈول بڑھا دیا جس میں پانی تھا۔ میں نے پانی پیا اور سیر ہو گیا حتیٰ کہ میں اس کی ٹھنڈک سینے میں محسوس کرتا ہوں۔ پھر فرمایا، ''اگر تو چاہے تو میں تمہاری مدد کروں اور اگر تو چاہے تو آج ہمارے پاس افطاری کرے۔'' تو میں نے اس کو پسند کیا کہ آپ ﷺ کے ساتھ افطاری کروں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ اسی روز شہید کر دیئے گئے، اور یہ قصہ مشہور ہے اور کتب احادیث میں باسناد موجود ہے۔ اس کو ابن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں اخراج کیا ہے اور دوسروں نے بھی۔ اور محقق بات یہ ہے کہ مصنف اس روایت سے رویتِ رسول ﷺ کو بیداری میں سمجھا، ورنہ اس روایت کو کرامت کے ضمن میں بیان کرنا ٹھیک نہ ہوگا کیونکہ خواب میں رویتِ رسول ﷺ میں تو سب لوگ مساوی ہیں۔"

رویتِ عینِ ذات اور صورتِ مثالی میں اختلاف

علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ امام غزالیؒ کا یہ فرمانا کہ حضور ﷺ کی زیارت شکلِ مثالی کی ہوتی ہے، جیسے اگر کسی کو خواب میں اللہ کی زیارت ہو تو عینِ ذات کو تو نہیں دیکھتا۔ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا امام غزالیؒ نے ایسا کیوں لکھا ہے۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں نیند میں نہیں، بیداری میں اور کھلی آنکھوں سے میں نے رسول ﷺ کو ستر سے زیادہ بار دیکھا (عربی محاورہ ہے کہ کوئی چیز بہت زیادہ بار کی ہو تو کہتے ہیں کہ ستر بار کی، یا اس سے زیادہ بار کی۔ جیسے ہمارے ہاں محاورہ ہے کہ یہ کام میں نے ہزاروں بار کیا، مراد یہ ہوتی ہے کہ بہت زیادہ کیا ہے)۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ امام سیوطیؒ نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ حضور ﷺ کی زیارت صورتِ مثالی کی ہوتی ہے یا عینِ ذاتِ حضور ﷺ کی؟ قاضی ابوبکرؒ فرماتے تھے اگر کوئی حضور ﷺ کا حلیہ مبارک، قد و قامت، اعضاء وغیرہ پہچان سکتا ہو تو حقیقی زیارت ہوگی، جبکہ ایسی صورت میں حضور ﷺ کی زیارت ہونا جیسی آپ ﷺ کی صحیح صورت نہیں ہے، صورتِ مثالی ہوگی۔ عموماً صورتِ مثالی خواب میں ہوتی ہے، جیسے کسی نے بیمار کو دیکھا اور سمجھا حضور ﷺ ہیں۔ اس کی تعبیر ہوگی کہ حضور ﷺ کے دین میں کہیں خرابی پیدا ہو رہی تھی۔ حضور ﷺ کی ذات سے مراد دین کی صورتِ مثالی ہے۔ حضور ﷺ کی صفتِ معلومہ یعنی جس طرح آپ ﷺ تھے ویسے کسی نے دیکھا تو حقیقی صورتِ مبارک ہوگی۔ مزید فرماتے ہیں یہ محاکمہ بہت اچھا ہے لیکن اس میں کوئی چیز رکاوٹ

Scanned with CamScanner

نہیں کہ آپ ﷺ کی زیارت میں آپ ﷺ ہی کو بعینہٖ دیکھا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ اور دیگر تمام انبیاءؑ زندہ ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے وصالِ نبوی ﷺ، انبیاءؑ کے وصال اور موت کے بارے لکھا ہے کہ نبیؑ کی موت عام آدمی کی موت کی طرح نہیں ہوتی کہ روحِ اقدس کو الگ کر لیا جائے اور جسم الگ ہو جائے، بلکہ نبیؑ کے وصال کی مثال یوں ہے کہ جس طرح شمع پر قندیل ہو اور اس پر پردہ ڈال دیا جائے۔ نبیؑ کی موت یہ ہوتی ہے کہ وجودِ اطہر اور روحِ اقدس کے عالمِ دنیا سے رشتے کٹ کر عالمِ برزخ سے جڑ جاتے ہیں۔ موسم، غذا، عبادات، برزخ کی ہوتی ہیں، آرام برزخ میں فرماتے ہیں یعنی عالم بدل جاتا ہے وجودِ اقدس اور روحِ اطہر وہی ہوتی ہے۔ عام آدمی کی طرح نبیؑ کی روح قبض نہیں کی جاتی۔ جہاں تک نبی اکرم ﷺ کا تعلق ہے، اس بات پہ تو سب متفق ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے جتنے وجود پیدا فرمائے ہیں وہ وجود عرش کا ہو، فرش کا ہو، آسمانوں کا ہو یا ملائکہ کا، ان میں سب سے افضل وجود محمد رسول اللہ ﷺ کا وجودِ عالی ہے۔

چونکہ روحِ اطہر کا قیام وجودِ عالی ہے تو اگر یہ مانا جائے کہ وصالِ اقدس کے بعد روحِ اطہر الگ ہو کر عالمِ ملکوت میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ بھی چلی جائے تو وہ جگہ مرتبے میں جسمِ اطہر سے کم ہو گی کیونکہ وہ جگہ بھی تو مخلوق ہے اور مخلوق میں سب سے اعلیٰ وجود محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی روحِ مبارک اعلیٰ جگہ سے کمتر جگہ تشریف لے جائے گی جبکہ ہر نیک آدمی کے بارے تو ہم سب کا یہ عقیدہ ونظریہ ہے کہ مرنے کے بعد روح پہلے سے اعلیٰ جگہ چلی جاتی ہے، لہٰذا وصالِ نبوی ﷺ عام آدمی کی طرح نہیں۔

شہید کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ زندہ ہیں، ان کے بارے سوچنا بھی منع ہے کہ وہ مر گئے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ... (آل عمران:۱۶۹)

ایک اور جگہ فرمایا: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ ... الخ (البقرہ:۱۵۴)

کبھی زبان سے نہ نکالو کہ شہید مر گیا، وہ زندہ ہے۔ تو شہید وہ ہوتا ہے جو نبی کی اطاعت پہ جان دے دے۔ جس کی غلامی پہ جان دینے والا نہیں مرتا، وہ خود کیا مر جاتا ہے؟ ایک کافر کی موت ہے، ایک مومن کی ہے، ایک فاسق گناہگار کی موت ہے، ایک مومن، صالح، عابد و زاہد کی موت ہے، ایک ولی اللہ کی موت ہے، ایک شہید ایک صدیق کی موت ہے، ایک انبیاء علیہم السلام کا وصال ہے۔ لہٰذا لفظ 'موت' کا اطلاق ہوتا ہے لیکن حالات مختلف ہوتے ہیں۔

عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا میں حضرت عثمانؓ کے پاس سلام کرنے کی غرض سے حاضر ہوا جب آپؓ کا مدینہ منورہ میں محاصرہ کیا جا چکا تھا۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور بتایا، میں نے ابھی اپنے سامنے اس کوچے میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اے عثمان! انہوں نے تیرا محاصرہ کر لیا ہے اور تجھے گھیر لیا ہے؟ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! بے شک میرا محاصرہ کر لیا اور مجھے گھر میں بند کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، انہوں نے تجھے پیاسا بھی رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! بے شک مجھے پانی بھی نہیں دیا جا رہا۔ حضور ﷺ نے ایک ڈول میری طرف

Scanned with CamScanner

برتن دیا جس میں پانی تھا۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں، "میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور اس کی ٹھنڈک میں اپنے سینے اور شانوں کے درمیان یعنی آگے سے پیچھے تک محسوس کر رہا ہوں۔" حضور ﷺ نے فرمایا، "اگر تو چاہے تو میں تیری مدد کا انتظام کروں کہ یہ محاصرہ ٹوٹ جائے یا تو چاہے تو آج یہ بھوک پیاس میرے پاس آ کر افطار کرنا۔" حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ ابن سلامؓ سے فرمایا، "میں نے اس بات کو اختیار کیا کہ میں آج کا روزہ آپ ﷺ کی خدمت میں آ کر افطار کروں گا۔" فرماتے ہیں ان کو اسی دن شہید کر دیا گیا۔ صاحب 'الحاوی للفتاوٰی' مزید فرماتے ہیں یہ احادیث میں مشہور واقعہ ہے اور متعدد محدثین نے اس واقعہ کو نقل فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن سلامؓ کی یہ روایت بطور کرامت نقل کی گئی ہے۔ کرامت تو تب ہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بیداری میں زیارت کی، پانی ملا، پیا، محسوس کیا اور پیاس بھی بجھ گئی۔ باتیں بھی ہوئیں، ان پر عمل بھی ہوا اور پھر واقعہ بھی اسی طرح ہو گیا۔

حالت بیداری میں رویت کی بنیاد

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے الفاظ سے یہ مفہوم اخذ کیا گیا اور یہی روایت اس کی بنیاد ہے۔

إِنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ رَآنِيْ فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِيْ فِي الْيَقَظَةِ... (فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب من رأى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام، ۱۲: ۳۸۳)

"میں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا، قریب ہے کہ وہ بیداری میں بھی دیکھ لے گا۔"

حالتِ بیداری میں رویت کی بنیاد

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کردہ حدیث مبارکہ ہے جس کا مفہوم ہے، اگر کسی کو خواب میں زیارتِ رسول ﷺ ہوتی ہے تو پھر ان شاء اللہ وہ ایسے لوگوں کے پاس پہنچ جائے گا جو اس کی تربیت کریں گے۔ وہ اس قابل ہو جائے گا کہ بیداری میں بھی حضور ﷺ کو دیکھے۔ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا نہ بھی ہو تو جسے خواب میں زیارت ہو جائے، موت آتی ہے تو موت سے پہلے اسے ضرور حضور ﷺ کی زیارت ہو جاتی ہے۔

مشائخ کے اقوال

قَالَ الشَّيْخُ صَفِيُّ الدِّيْنِ فِيْ رِسَالَتِهٖ قَالَ لِيَ الشَّيْخُ اَبُو الْعَبَّاسِ الْحَرَّارُ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً فَوَجَدْتُهٗ يَكْتُبُ مَنَاشِيْرَ لِلْاَوْلِيَاءِ بِالْوِلَايَةِ

Scanned with CamScanner

وَ كَتَبَ لِأَخِيْ مُحَمَّدٍ مِّنْهُمْ مَنْشُوْرًا... (الحاوی للفتاوی، ۲: ۲۴۵)

"شیخ صفی الدین اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں کہ شیخ ابو العباس نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اولیاء کے لیے ولایت کے منشور لکھ رہے ہیں، ان میں ایک میرے بھائی محمد کا منشور بھی تھا۔"

قَالَ اَبُوْ عَبْدُ اللهِ الْقُرَشِيُّ فَسَافَرْتُ إِلَى الشَّامِ فَلَمَّا وَصَلْتُ إِلٰى قَرِيْبِ ضَرِيْحِ الْخَلِيْلِ عَلَيْهِ السَّلَامِ تَلَقَّانِي الْخَلِيْلُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِجْعَلْ ضِيَافَتِيْ عِنْدَكَ الدُّعَاءَ لِأَهْلِ مِصْرَ فَدَعَا لَهُمْ فَفَرَّجَ اللهُ عَنْهُمْ قَالَ الْيَافِعِيُّ وَ قَوْلُهُ تَلَقَّانِي الْخَلِيْلُ قَوْلٌ حَقٌّ لَا يُنْكِرُهُ إِلَّا جَاهِلٌ بِمَعْرِفَتِهِ مَا يَرِدُ عَلَيْهِمْ مِنَ الْأَحْوَالِ الَّتِيْ يُشَاهِدُوْنَ فِيْهَا مَلَكُوْتَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَ يَنْظُرُوْنَ الْأَنْبِيَاءَ أَحْيَاءً غَيْرَ أَمْوَاتٍ كَمَا نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى مُوْسٰى فِي الْأَرْضِ وَ نَظَرَهُ أَيْضًا هُوَ وَ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْأَنْبِيَاءِ وَسَمِعَ مِنْهُمْ مُخَاطَبَاتٍ... (الحاوی للفتاوی، ۲: ۲۴۳)

"ابو عبداللہ قرشی کہتے ہیں کہ میں نے شام کا سفر کیا۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے مزارِ مقدس پر پہنچا تو آپؑ مجھے ملے۔ میں نے عرض کیا کہ آپؑ کے ہاں میری مہمانی یہ ہے کہ اہلِ مصر کے لیے دعا فرمائیں۔ آپؑ نے دعا فرمائی تو اہلِ مصر کی مصیبت دور ہوگئی۔ امام یافعیؒ فرماتے ہیں کہ قرشی کا یہ قول کہ میری ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی، اس کا انکار صرف جاہل ہی کرے گا جو صوفیاء کے احوال سے ناواقف ہے۔ وہ لوگ آسمان اور زمین کا مشاہدہ کرتے ہیں، انبیاء کو زندہ دیکھتے ہیں جیسا حضور ﷺ نے حضرت موسیٰؑ کو زمین پر دیکھا اور ان کو معہ جماعت کے آسمان پر دیکھا اور ان سے باتیں سنیں۔"

قَالَ رَجُلٌ لِّلشَّيْخِ أَبِي الْعَبَّاسِ الْمَرْسِيِّ يَا سَيِّدِيْ صَافِحْنِيْ بِكَفِّكَ هٰذِهٖ فَإِنَّكَ لَقِيْتَ رِجَالًا وَ بِلَادًا فَقَالَ وَ اللهِ مَا صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هٰذِهٖ إِلَّا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَ قَالَ الشَّيْخُ لَوْ حَجَبَ عَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرْفَةَ عَيْنٍ مَّا عَدَدْتُ نَفْسِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ... (ایضاً، ۲: ۲۴۴)

"ایک شخص نے شیخ ابو العباس المرسی سے عرض کیا مجھ سے مصافحہ کیجیے کیونکہ آپ بڑے ملکوں میں پھرے ہیں اور بڑے بڑے مردانِ خدا سے مصافحہ کیا۔ شیخ نے فرمایا، میں نے یہ ہاتھ سوائے رسولِ اکرم ﷺ کے کسی سے نہیں ملائے، اور فرمایا کہ اگر حضور ﷺ کی ذات ایک لمحہ کے لیے بھی میری آنکھ سے اوجھل ہوجائے تو میں اپنے آپ کو مسلمان نہیں سمجھتا۔"

وَ قَالَ الْبَارِزِيُّ: وَ قَدْ سَمِعَ مِنْ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْأَوْلِيَاءِ فِيْ زَمَانِنَا وَ قَبْلِهٖ أَنَّهُمْ رَأَوْ

النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْيَقْظَةِ حَيًّا بَعْدَ وَفَاتِهِ... (الحاوی للفتاوی، ۲:۲۴۴)

"علامہ بارزی نے کہا کہ محقق بات یہ ہے کہ ایک جماعتِ اولیاء نے ہمارے زمانے میں بھی اور اس سے پہلے بھی رسولِ اکرم ﷺ کو بعد از وفات زندہ، حالتِ بیداری میں دیکھا۔"

"از بعض صالحین حکایات دریں باب آمده و بصحت رسیده و حکایات و روایات مشائخ بسیار است نزدیک بحد تواتر رسیده است۔"

(اشعۃ اللمعات، کتاب الرؤیا، فصل اول، ۳:۶۳۹)

مشائخ کے اقوال

شیخ صفی الدین فرماتے ہیں، شیخ ابوالعباس نے مجھ سے بیان کیا کہ "ایک مرتبہ میں حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اولیاء اللہ کے لیے مراتب، مقامات یا ان کے قاعدے تحریر فرما رہے تھے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے دیکھا ایک میرے بھائی کے لیے بھی تھا۔

حضرت ابوعبداللہ قرشی فرماتے ہیں، میں شام کے سفر پر تھا، جب میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی قبر مبارک کے قریب پہنچا تو مجھے ابراہیمؑ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؑ! میں آپ کا مہمان ہوں۔ میری مہمان داری یہ ہے کہ اہلِ مصر کے لیے دعا فرما دیجیے (کیونکہ مصر پر اُس وقت قحط سالی کی صورت میں مصیبت آئی ہوئی تھی اور حضرت ابوعبداللہ مصر سے چل کر گئے تھے)۔ فرماتے ہیں، ابراہیم خلیل اللہ نے اہلِ مصر کے لیے دعا فرمائی اور اللہ نے ان پر سے وہ مصیبت دور کر دی۔ یافعیؒ فرماتے ہیں، حضرت ابوعبداللہ کا یہ فرمانا کہ مجھے ابراہیم خلیل اللہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے، حق اور سچی بات ہے۔ اس کا انکار کوئی جاہل ہی کرے گا جو اہل اللہ کے حالات سے واقف نہیں۔ یہ لوگ تو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مشاہدہ کرتے ہیں، جماعتِ انبیاءؑ کی زیارت کرتے ہیں، فرشتوں اور روحوں کو دیکھتے ہیں اور ملاقات نصیب ہوتی ہے، ان سے باتیں کرتے اور ان سے باتیں سنتے ہیں۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے شبِ معراج موسیٰؑ کو دیکھا کہ قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح ہودؑ کو دیکھا اور بیت المقدس میں سارے نبیوں کی جماعت سے ملاقات فرمائی۔ پھر آسمانوں پہ حضور ﷺ نے بہت سے انبیاءؑ سے ملاقات فرمائی۔ اُس وقت حضور ﷺ حیات تھے، بیدار بھی تھے اور اسی عالمِ دنیا میں جلوہ افروز تھے۔ اس کی اصل بھی یہی ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ تھا اور معجزہ کرامت بن کر ولی میں منتقل ہوتا ہے۔ اس لیے ولی کی کرامت برحق ہے۔

'الحاوی للفتاویٰ' میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے شیخ ابوالعباس سے عرض کیا! میرے ساتھ اپنے ہاتھوں سے مصافحہ فرمائیے کیونکہ آپ بہت ملکوں میں پھرے ہیں اور اللہ کے بڑے بڑے نیک بندوں سے مصافحہ کیا ہے۔ میرے ساتھ بھی مصافحہ فرمائیے تاکہ آپ کے ہاتھوں میں جو برکت ہے وہ مجھے بھی نصیب ہو۔ انہوں نے جواب دیا، اللہ کی قسم! میں نے اپنے

دونوں ہاتھوں سے صرف رسول اللہ ﷺ سے مصافحہ کیا ہے اور انہی سے مصافحہ کرتا ہوں، میں کسی اور سے
انہوں نے اس شخص کو بھی جواب دیا کہ میں تم سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا کیونکہ میں یہ ہاتھ حضور ﷺ
کسی دوسرے سے نہیں۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ ایک لحہ بھی میری آنکھوں
تو میں خود کو مسلمان نہ سمجھوں۔

علامہ بازری نے کہا یہ محقق بات ہے کہ ایک جماعتِ اولیاء نے ہمارے زمانے میں بھی اور
حضور ﷺ کو بعد از وفات زندہ، حالتِ بیداری میں دیکھا۔

علمائے امت کی تحقیق

علامہ ابن حجر مکی اس پر بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

هَلْ تُمْكِنُ رُؤْيَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْيَقْظَةِ (فَأَجَابَ) بِقَوْلِهِ أَنْكَرَ ذٰلِكَ جَمَاعَةٌ وَ جَوَّزَهُ اٰخَرُوْنَ وَ هُوَ الْحَقُّ فَقَدْ اَخْبَرَ بِذَالِكَ مِنْ وِلَايَتِهِمْ مِنَ الصَّالِحِيْنَ بَلِ اسْتَدَلَّ بِحَدِيْثِ الْبُخَارِيِّ مَنْ رَاٰنِيْ فِي الْمَنَامِ فَسَيَرَانِيْ فِي الْيَقْظَةِ اَيْ بِعَيْنَيْ رَأْسِهِ وَ قِيْلَ بِعَيْنِ قَلْبِهِ ثُمَّ قَالَ وَ فِيْ شَرْحِ ابْنِ اَبِيْ جَمْرَةَ لِلْاَحَادِيْثِ الَّتِيْ اِنْتَقَاهَا مِنَ الْبُخَارِيِّ تَرْجِيْحُ بَقَاءِ الْحَدِيْثِ عَلٰى عُمُوْمِهِ فِيْ حَيَاتِهٖ وَمَمَاتِهٖ لِمَنْ لَّهٗ اَهْلِيَّةُ اِتِّبَاعِ السُّنَّةِ وَلِغَيْرِهٖ قَالَ وَ مَنْ يَّدَّعِي الْخُصُوْصَ بِغَيْرِ تَخْصِيْصٍ مِنْهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ تَعَسَّفَ ثُمَّ اَلْزَمَ مُنْكِرَ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ غَيْرُ مُصَدِّقٍ بِقَوْلِ الصَّادِقِ وَ بِاَنَّهٗ جَاهِلٌ بِقُدْرَةِ الْقَادِرِ وَ بِاَنَّهٗ مُنْكِرٌ كَرَامَاتِ الْاَوْلِيَاءِ مَعَ ثُبُوْتِهَا بِدَلَائِلِ السُّنَّةِ الْوَاضِحَةِ وَ مُرَادُهٗ بِعُمُوْمِ ذٰلِكَ وُقُوْعُ رُؤْيَةِ الْيَقْظَةِ الْمَوْعُوْدِ بِهَا لِمَنْ رَاٰهُ فِي النَّوْمِ وَلَوْ مَرَّةً وَاحِدَةً تَحْقِيْقًا لِوَعْدِهِ الشَّرِيْفِ الَّذِيْ لَا يَخْلِفُ وَ اَكْثَرُ مَا يَقَعُ ذَالِكَ لِلْعَامَّةِ قَبْلَ الْمَوْتِ عِنْدَ الْاِحْتِضَارِ فَلَا تَخْرُجُ رُوْحُهٗ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰى يَرَاهُ... (فتاویٰ الحدیثیہ، ۱:۲۱۲)

کیا رسول اکرم ﷺ کی زیارت بیداری میں ممکن ہے؟ (علامہ ابن حجر نے جواب دیا) کہ ایک جماعت منکر ہے اور ایک جماعت قائل ہے اور یہی جماعت حق پر ہے۔ رویت کی خبر صالحین (کی ایسی جماعت) نے دی ہے (جس پر اتہام نہیں لگایا جا سکتا) بلکہ جواز کی دلیل، حدیث بخاری سے پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب بیداری میں دیکھے گا۔ تو کسی نے سر کی آنکھوں سے دیکھنا مراد لیا ہے، کسی نے دل کی آنکھوں سے۔ پھر ابن حجر نے شارح بخاری عبداللہ ابن

ابی جمرہ کا قول پیش کیا جنہوں نے 'بخاری' کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے خواب کی حدیث کو عموم پر ترجیح دی ہے خواہ حیات میں ہو، خواہ ممات میں مگر کامل متبع سنت کے لیے ہے۔ پھر شارح مذکور نے فرمایا جس نے تخصیصِ حدیث کا دعویٰ کیا ہے، اس نے تعسف کیا ہے۔ پھر اس کو الزام دیا ہے کہ جب حضور ﷺ نے تخصیص نہیں فرمائی تو وہ کیوں کرتا ہے؟ پھر یہ کہ فرمانِ نبوی ﷺ کا منکر ہے، پھر یہ قدرت قادر سے جاہل ہے اور وہ کراماتِ اولیاء کا منکر ہے۔ حالانکہ کرامات واضح سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہیں اور مراد شارح مذکور کی عموم حدیث سے رسولِ اکرم ﷺ کی زیارتِ بیداری میں ہے جس کا وعدہ حضور ﷺ نے خواب والے کو دیا ہے۔ اگرچہ زیارت ایک دفعہ ہو، وعدہ پورا کرنے کے لیے کافی ہے، اس میں تخلف جائز نہیں۔ اور اکثر عوام الناس کو قریبِ موت زیارت ہو جاتی ہے اور روح اس کے جسد سے خارج نہیں ہوتی جب تک زیارت نہ ہو جائے۔"

'بخاری' کی اس روایت کا صحیح مفہوم تو یہی ہے جو رویتِ یقظہ سے بیان کیا گیا ہے۔

البتہ 'مسلم' میں فَكَاَنَّمَا رَاٰنِيْ... ہے اور ابن ماجہ میں فَقَدْ رَاٰنِيْ... ہے۔ ان میں احتمال ہیں۔ اور 'بخاری' کی اس حدیث میں یہ تاویل کرنا کہ عنقریب اس کی صحیح تعبیر دیکھ لے گا کتنا تعسف ہے۔ فَسَيَرَانِيْ... کا مفعول ضمیر متکلم آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے اور تعبیرِ خواب کو مفعول بنانا تاویلِ بعید ہے۔ درحقیقت مفعول ضمیر متکلم حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جو لیلۃ المعراج کے سلسلے میں آئی ہیں کہ حضور ﷺ نے انبیاء کو دیکھا، ان سے باتیں کیں، استفادہ کیا۔ یہ تھا معجزہ حضور ﷺ کا اور یہی ہوئی کرامت اولیاء کی۔

وَقَدْ تَقَرَّرَ اَنَّ مَا جَازَ لِلْاَنْبِيَآءِ مُعْجِزَةٌ جَازَ لِلْاَوْلِيَآءِ كَرَامَةٌ... (فتاویٰ الحدیثیہ، ۱: ۲۱۳)

"یہ بات جمہور کے نزدیک ثابت ہو چکی ہے کہ جو چیز انبیاء کے لیے معجزہ ہے، اولیاء کے لیے کرامت ہے۔"

اور امام رازیؒ نے فرمایا:

اَنَّا لَا نُجَوِّزُ ظُهُوْرَ الْكَرَامَةِ عَلَى الْوَلِيِّ عِنْدَ اِدِّعَاءِ الْوِلَايَةِ اِلَّا اِذَا اَقَرَّ عِنْدَ تِلْكَ الدَّعْوٰى بِكَوْنِهٖ عَلٰى دِيْنِ ذٰلِكَ النَّبِيِّ وَ مَتٰى كَانَ الْاَمْرُ كَذٰلِكَ صَارَتْ تِلْكَ الْكَرَامَةُ مُعْجِزَةً لِّذٰلِكَ النَّبِيِّ وَمُؤَكِّدَةً لِّرِسَالَتِهٖ... (تفسیر الکبیر، ۵: ۶۶۸)

"ہم کسی مدعی ولایت سے ظہورِ کرامت کے اس وقت قائل ہوں گے جب وہ اس دعویٰ کے ساتھ یہ اقرار بھی کرے کہ میں اس نبی کے دین پر ہوں۔ اور جب دعویٰ اس صورت میں ہوا تو یہ کرامت اس نبی کا معجزہ ہوگا اور اس کی رسالت کی تائید ہوگی۔"

لیکن بعض ظاہربین علماء جب اس کو نہیں سمجھ سکتے تو سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جیسا امام رازیؒ نے فرمایا:

فَاِنَّ وَرَآئَهَا اَسْرَارٌ دَقِيْقَةٌ وَّ اَحْوَالٌ عَمِيْقَةٌ مَّنْ لَّمْ يَصِلْ اِلَيْهَا لَمْ يُصَدِّقْ بِهَا...

(ایضاً، ۵: ۶۶۸)

"اس سے آگے دقیق اور عمیق اسرار ہیں۔ جب تک انسان ان امور تک نہ پہنچے تو ان کی تصدیق اس کے لیے محال ہے۔"

فائدہ:

نبی کا معجزہ نہ عینِ نبوت ہے نہ جزوِ نبوت، نہ شرطِ نبوت بلکہ ایک دلیل اور سند ہے اور کمالاتِ نبوت کی علامات میں سے ہے۔ یہی معجزہ منتقل ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اس کے صحیح وارثوں میں کرامت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کشف، رویتِ انبیاء، ملائکہ اور ارواح کرامت کی قسم سے ہیں۔

علمائے امت کی تحقیق

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں، علامہ ابن حجر مکیؒ نے اس پر کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بیداری میں ممکن ہے تحقیق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ایک جماعت قائل ہے اور ایک جماعت منکر ہے۔ جو قائل ہیں وہ حق پر ہیں، جو انکار کرتے ہیں وہ غلط ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر آج تک اُن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا دعویٰ کیا ہے جو انتہائی نیک اور اتباعِ سنت کرنے والے اور عظیم لوگ ہیں، ان پر جھوٹ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ رویت کے جائز ہونے کی دلیل 'بخاری شریف' کی حدیث کہ "جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ عنقریب بیداری میں دیکھے گا" کو پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ اس کے لیے ہے جو کامل متبع یعنی سنت کا اتباع کرنے والا ہو۔ شارح مذکور نے فرمایا "جس نے تخصیصِ حدیث کا دعویٰ کیا ہے، اس نے تعسف کیا ہے" یعنی جس نے حدیث کو کسی کے ساتھ خاص کر دیا ہے اس نے زیادتی کی ہے۔ حدیث کسی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ نعمت ہر ایک کو نصیب ہو سکتی ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عموم میں اور عام مسلمانوں کے لیے رکھا ہے تو کوئی تخصیص کیوں کرتا ہے؟ ہاں! اگر کوئی انکار کرتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا منکر ہے اور اللہ کی قدرت سے اور اس کے کمال سے بھی ناواقف ہے۔ وہ کراماتِ اولیاء کا منکر ہے حالانکہ کرامات واضح سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے خواب میں میری زیارت کی وہ بیداری میں بھی کرے گا اور شارح حالتِ بیداری میں زیارت کی بات کر رہا ہے۔ اگرچہ زیارت ایک دفعہ ہو، وعدہ پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس میں اختلاف کرنا جائز بات نہیں ہے۔ اکثر عوام الناس کو قریبِ موت زیارت ہو جاتی ہے یعنی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں کوئی شیخ نہیں ملتا یا وہ تربیت نہیں ہوتی کہ اس مقام تک پہنچ سکیں۔ جنہیں اللہ سرفراز کرنا چاہے اور جنہوں نے زندگی بھر عبادت اور اتباعِ سنت کی ہو، انہیں موت کے وقت جب یکسوئی نصیب ہوتی ہے تو اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں بھی ہے کہ اس میں روح ہوتی ہے لیکن وہ تمہیں نہ دیکھتا اور نہ تمہاری سنتا ہے، اُس وقت میرے ساتھ بات کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا بخاری کی اس روایت کا صحیح مفہوم حالتِ بیداری میں زیارت کا ہونا ہے۔ چونکہ دو روایتیں ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے فَكَأَنَّمَا رَآنِي "گویا اس نے مجھے دیکھا" اور ابن ماجہ میں ہے فَقَدْ رَآنِي... "یقیناً اس نے مجھ ہی کو دیکھا۔" ان دو روایتوں میں یہ تاویل کی گئی ہے کہ عنقریب اس کی صحیح تعبیر دیکھ لے گا۔ چونکہ حدیث میں ضمیر متکلم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اس لیے

Scanned with CamScanner

تعبیر خواب کو اس کا مفعول بنانا صحیح نہیں۔ اس کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جو لیلۃ المعراج کے سلسلہ میں آئی ہیں کہ شب معراج حضور ﷺ نے مختلف انبیاء سے ملاقات کی، بیت المقدس میں تمام انبیاءؑ کی امامت فرمائی، مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاءؑ سے بات ہوئی۔ جس طرح صلوٰۃ کے بارے ملتا ہے کہ پچاس فرض ہوئیں، حضور ﷺ واپس تشریف لا رہے تھے تو موسیٰؑ سے بات ہوئی۔ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! میری امت پر دو فرض تھیں، وہ ان کے لیے بوجھ بن گئیں، پچاس بہت زیادہ ہیں۔ حضور ﷺ واپس تشریف لے گئے، کئی بار آنا جانا ہوا تو پچاس کی پانچ رہ گئیں۔ موسیٰؑ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! ابھی بھی زیادہ ہیں۔ فرمایا، اب مجھے شرم آتی ہے، اب واپس نہیں جاؤں گا۔ اس پہ بھی علماء فرماتے ہیں کہ جو پانچ نمازیں ادا کرتا ہے اسے ثواب پچاس کا ملتا ہے۔ تو کیا یہ سب بیداری میں نہیں تھا؟ یہ معجزہ ہے نبی کریم ﷺ کا، اور نبی کا معجزہ بطورِ کرامت اولیائے امت میں منتقل ہوتا ہے۔

اور 'فتاویٰ الحدیثیہ' میں ہے کہ یہ جائز ہے کہ نبی کا معجزہ بطورِ کرامت ولی میں منتقل ہو کر اس کی کرامت بنتا ہے۔ ولی کی کرامت بھی نبی کا معجزہ ہے۔ علامہ ابنِ کثیر نے فرمایا، کسی ولی کی ولایت کا دعویٰ تب تک صحیح نہیں جب تک اس کا ایمان اور عمل نبیؑ کے ساتھ درست نہ ہو۔ جب وہ اس نبیؑ کا متبع ہے تو نبیؑ کا معجزہ بطورِ کرامت اس میں آسکتا ہے۔ اسی طرح ولی کی کرامت اس کی بڑائی کے لیے نہیں ہوتی بلکہ نبیؑ کے معجزے کے قائم مقام ہو کر نبیؑ کی صداقت اور اس کی رسالت کی صداقت کی دلیل بنتی ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں، یہ معاملہ وراءالوراء کا ہے، یہ باتیں بہت دور کی ہیں۔ جو ان حقیقتوں کو سمجھ نہیں سکتا اور اس شعبے کو جانتا نہیں، وہ اپنی نادانی کی وجہ سے انکار کر دیتا ہے اور کسی کا نادانی کی وجہ سے انکار کر دینا حقیقت کا انکار نہیں ہوسکتا۔

فائدہ:

"نبی کا معجزہ نہ تو عینِ نبوت ہے اور نہ جزوِ نبوت۔" ایسی بات نہیں کہ معجزہ ہی نبوت ہے اور ایسی بات بھی نہیں کہ معجزہ نبوت کا ایک حصہ ہے اور اگر معجزہ نہ ہوا تو نبوت نامکمل رہ جائے گی۔ شرطِ نبوت بھی نہیں کہ ضرور معجزہ دکھائے تو نبی ہے، اگر معجزہ نہ دکھائے تو اس کی نبوت نہ مانی جائے گی۔ یہ تینوں باتیں نہیں ہیں بلکہ نبیؑ کا معجزہ نبوت کی دلیل اور سند ہوتا ہے اور نبی کو جو نبوت کی وجہ سے کمالات نصیب ہوتے ہیں یہ ان کی علامت اور نبی کے سچے ہونے کی دلیل ہے۔ پھر فرمایا، کشف ہونا، انبیاءؑ کی زیارت کا ہونا، فرشتوں کی زیارت کا ہونا یا ارواح سے ملاقات اولیاء اللہ کی کرامات میں سے ہیں۔ جب یہ نبیؑ سے صادر ہوتی ہیں تو معجزہ ہوتا ہے، ولی سے ہوتی ہیں تو کرامت ہے۔

رؤیتِ جنات وشیاطین

جنات وشیاطین

کیا جنات اور شیطان کو دیکھنا ممکن ہے؟ قرآن میں آتا ہے کہ جن اور شیاطین نہیں دیکھے جاتے ہیں، وہ ہمیں دیکھتے ہیں۔

إِنَّهُ يَرَىٰكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ... (الاعراف:۲۷)

Scanned with CamScanner

اور حدیث میں آتا ہے کہ عذاب وثواب قبر ثقلین نہیں دیکھ سکتے۔ رؤیت عذاب وثواب کا قائل ہونا قرآن وحدیث کے خلاف ہے اور امام شافعیؒ نے تو مدعی رؤیت جن کی شہادت بھی مردود قرار دی ہے۔

رؤیتِ جنات وشیاطین

قرآن کی آیت ہے کہ شیطان اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، اور حدیث میں آتا ہے کہ عذاب وثوابِ قبر ثقلین نہیں دیکھ سکتے۔ ثقل بوجھ کو کہتے ہیں، اس طرح ثقلین ہوتا ہے، دو بوجھ۔ جنوں اور انسانوں کو ملا کر زمین کے دو بوجھ کہا جاتا ہے۔ تو ثقلین سے مراد ہے کہ 'جن اور انسان'۔ ہمارے لوگ تو نام ہی ''محمد ثقلین'' اور ''ثقلین حسین'' رکھ لیتے ہیں۔ پتا نہیں یہ نام کیا ہے؟ 'دو بوجھ حسین' میری سمجھ میں نہیں آتا، کیوں رکھتے ہیں؟ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو کوئی کہے کہ میں نے جن یا شیطان کو دیکھا ہے، وہ اتنا جھوٹ بول رہا ہے کہ اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ اور یہ اعتراض ہے کہ اگر کوئی اس کا قائل ہے تو وہ قرآن اور حدیث کا منکر ہے۔

رؤیتِ جنات کا ثبوت

وَ اسْتَدَلَّ الْخَطَّابِيُّ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ عَلٰى اَنَّ اَصْحَابَ سُلَيْمَانَ كَانُوْا يَرَوْنَ الْجِنَّ فِيْ اَشْكَالِهِمْ وَ هَيْئَتِهِمْ حَالَ تَصَرُّفِهِمْ قَالَ: وَ اَمَّا قَوْلُهٗ تَعَالٰى (اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ... الخ... فَالْمُرَادُ الْاَكْثَرُ الْاَغْلَبُ مِنْ اَحْوَالِ بَنِيْ اٰدَمَ...

(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب فضل الطلیعة، ۶:۴۵۹)

"علامہ خطابی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں ذکر ہے (کہ نبی اکرم ﷺ نے جن کو باندھنا چاہا تھا کہ صبح مدینے کے لڑکے اس سے کھیلیں مگر بھائی سلیمانؑ کی دعا کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا) کہ حضرت سلیمانؑ کے صحابی جنوں سے کام لیتے وقت انہیں دیکھتے تھے۔ رہا فرمانِ باری تعالیٰ کہ شیطان اور اس کا کنبہ تمہیں اس جگہ سے دیکھتا ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے، تو یہ حکم اکثر اور اغلب پر ہے، یہ نہیں کہ جن دیکھے نہیں جا سکتے۔"

اس پر علامہ ابن حجرؒ نے اعتراض کیا ہے اور فرمایا ہے:

بِاَنَّ نَفْيَ رُؤْيَةِ الْاِنْسِ لِلْجِنِّ عَلٰى هَيْئَتِهِمْ لَيْسَ بِقَاطِعٍ مِّنَ الْاٰيَةِ بَلْ ظَاهِرُهَا اَنَّهٗ مُمْكِنٌ فَاِنَّ نَفْيَ رُؤْيَتِنَا اِيَّاهُمْ مُقَيَّدٌ بِحَالِ رُؤْيَتِهِمْ لَنَا وَ لَا يَنْفِيْ اِمْكَانَ رُؤْيَتِنَا لَهُمْ فِيْ غَيْرِ تِلْكَ الْحَالَةِ وَيَحْتَمِلُ الْعُمُوْمَ...

(فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب فضل الطلیعة، ۶:۴۵۹)

"نفی رویت جنات آیت سے قطعی طور پر ثابت نہیں بلکہ صرف احتمال ہے کیونکہ ہماری عدم رؤیت مقید ہے ان کی رویت کے وقت سے، نہ کہ عام۔ ہاں احتمال عموم کا بھی ہے۔"

Scanned with CamScanner

علامہ آلوسی نے اس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا:

وَقَالَ وَالْقَضِيَّةُ مُطْلَقَةٌ لَا دَائِمَةٌ... وَفِيْهِ وَعَلٰى هٰذَا لَا يُفَسَّقُ مُدَّعِىْ رُؤْيَتِهِمْ فِىْ صُوَرِهِمُ الْأَصْلِيَّةِ إِذَا كَانَ مَظِنَّةً لِكَرَامَةٍ وَلَيْسَ فِى الْآيَةِ أَكْثَرُ مِنْ نَفْيِ رُؤْيَتِهِمْ كَذٰلِكَ بِحَسْبِ الْعَادَةِ... (روح المعانی، ۸:۱۰۵،۱۰۶)

"یہ قضیہ مطلقہ ہے، دائمہ نہیں۔ اور اسی روح المعانی میں ہے کہ مدعی رویت کا فاسق نہ ہوگا کہ اس کی شہادت رد کی جائے، خصوصاً جب کرامت کا گمان بھی ہو، اور آیت میں نفی رویت کی بطور عادت کے ہے، نہ کہ بطور خرقِ عادت کے۔"

اور علامہ بیہقی نے مناقب امام شافعیؒ میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

وَرَوَى الْبَيْهَقِىْ فِىْ مَنَاقِبِ شَافِعِىْ بِإِسْنَادٍ عَنِ الرَّبِيْعِ سَمِعْتُ الشَّافِعِىَّ يَقُوْلُ: مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ يَرَى الْجِنَّ أَبْطَلْنَا شَهَادَتَهُ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ نَبِيًّا... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الجن وثوابهم وعقابهم، ۶:۳۴۳)

"حضرت ربیع فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعیؒ سے سنا کہ جس شخص نے کہا کہ میں جنوں کو دیکھتا ہوں، ہم اس کی شہادت مردود قرار دیتے ہیں، سوائے اس کے کہ دیکھنے والا نبی ہو۔"

فائدہ:

۱۔ علامہ بیہقی نے جو قول امام شافعیؒ کا نقل کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کی مراد رویت بصری ہے جو بطور عادت کے ہو، نہ کہ خرقِ عادت۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ روحانی اور قلبی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے جو اَلَّا اَنْ یَّكُوْنَ نَبِيًّا... کی استثناء سے ظاہر ہے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ کشف از قبیلِ کرامت ہے اور کرامت معجزہ کی فرع ہے۔ نبی کا جنات کو دیکھنا معجزہ ہوا، اور ولی کا دیکھنا کرامت ہوا۔

۲۔ علامہ آلوسی کے بیان سے معلوم ہوا کہ عادت کے طور پر رویت ممکن نہیں، لیکن کرامت کے طور پر ممکن ہے۔ اس سے حدیث ثقلین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ عذاب وثوابِ قبر عادت کے طور پر معلوم نہیں ہو سکتے، ہاں خرقِ عادت کے طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ کشفِ قبور کے سینکڑوں واقعات رسول اکرم ﷺ سے اور صحابہؓ سے احادیث میں موجود ہیں۔ لہٰذا نفی سے نفی عادت کی ہوئی، اور ثبوت سے ثبوت خرقِ عادت کا ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ خرقِ عادت ہے تو عادت سے کیسے بتایا جا سکتا ہے اور کیونکر معلوم ہو سکتا ہے؟ ہاں! کم از کم چھ ماہ مسلسل صَرف کرو، اگر خدا کو منظور ہوا تو دیکھ لوگے۔

Scanned with CamScanner

رؤیتِ جنات کا ثبوت

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس کا ثبوت موجود ہے اور جواباً عرض کرتے ہیں کہ علامہ خطابیؒ نے اس حدیث سے استدلال فرمایا کہ جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا، میں نے جن کو پکڑ لیا تھا، میں نے چاہا کہ اسے درخت کے ساتھ باندھ دوں اور صبح مدینہ کے لڑکے اس کے ساتھ کھیلیں مگر مجھے حضرت سلیمانؑ کی دعا یاد آ گئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور جانے دیا۔ حضرت سلیمانؑ کی دعا قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ اللہ مجھے وہ حکومت دے جو میرے بعد کسی کو نہ دے۔ تو علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے صحابی، جنوں سے عمارات اور محلات بنواتے تھے، خدمت لیتے تھے تو انہیں دیکھتے تھے، ان کا کام دیکھتے تھے۔ ''رہا فرمانِ باری تعالیٰ کہ ''شیطان کا کنبہ تمہیں اس جگہ سے دیکھتا ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔'' یہ اکثریت کی بنیاد پر ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حواسِ ظاہری سے نہیں دیکھا جا سکتا، عادت کے طور پر دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور یہ دیکھنا یعنی جنات کو دیکھنا بطورِ کرامت کے ہے، یہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ نہیں کہ کوئی بھی نہیں کر سکتا، ورنہ حضرت سلیمانؑ کے خدام جو جنوں سے کام لینے پر مقرر تھے اگر جنوں کو نہ دیکھ سکتے تو ان سے کام کیسے لیتے؟ دیواریں، محل، مکان، فرش کس طرح بنواتے؟ یا جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں جن کو باندھ دیتا اور اس کے ساتھ مدینہ کے لڑکے کھیلتے۔ یہ ایک حقیقت ہے لیکن خرقِ عادت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ عادتاً ایسا کوئی نہیں کر سکتا۔

اس پر علامہ ابن حجرؒ نے اعتراض کیا ہے اور فرمایا ہے (ترجمہ) ''نفیٔ رؤیتِ جنات آیتِ قرآنی سے قطعی طور پر ثابت نہیں بلکہ صرف احتمال ہے کیونکہ ہماری عدمِ رویت مقید ہے ان کی رؤیت کے وقت سے، نہ کہ عام۔'' (یہ علمی باتیں ہیں) علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اگر قرآن نے منع کیا ہے، وہ ایسی جگہ سے تمہیں دیکھ لیتے ہیں جہاں تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، تو فرمایا، یہ عام نہیں ہے۔ یہ آیت خاص ہے کہ شیطان چھپ کر یا ایسی حالت میں تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ تو کوئی انسان بھی کر سکتا ہے کہ وہ چھپ کر ہمیں دیکھے مگر ہم اسے نہ دیکھ رہے ہوں۔ فرمایا کہ یہ نفی عام نہیں ہے، یہ اس خاص وقت کے لیے ہے جب وہ چھپ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک تو یہ استثنائے خاص ہے اور دوسرا احتمال ہے کہ عموماً ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ''یہ قضیۂ مطلقہ ہے، دائمہ نہیں ہے۔'' یعنی یہ مطلق ہے، ایسا ہو سکتا ہے لیکن اس میں دوام یا ہمیشگی نہیں ہے۔ ''روح المعانی'' میں ہے کہ کرامت کے طور پر کوئی دیکھے تو وہ رد نہیں کی جائے گی۔ امام شافعیؒ کا یہ کہنا کہ ''وہ جھوٹ بول رہا ہے'' وہ بطورِ عادت کے ہے کہ ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ صاحبِ کرامت کے دیکھنے کو انہوں نے رد نہیں فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت اس لیے رد کرتے ہیں کہ جنوں، شیطانوں اور فرشتوں کو دیکھنا تو معجزہ ہے تو پھر ایک عام آدمی یہ دعویٰ کیوں کرے؟ یا پھر وہ نبی کریم ﷺ کا متبع ہو اور اس قدر ہو کہ وہ معجزہ بطورِ کرامت اس میں آ جائے۔ کوئی فاسق کہے گا تو جھوٹ ہوگا۔

ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی پوچھنا چاہے کہ مجھے سمجھاؤ کہ رؤیتِ جنات کس طرح ممکن ہے اور یہ کیسے ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے؟ تو فرمایا کہ تم عادتاً پوچھتے ہو اور یہ معاملہ 'خرقِ عادت' کا ہے۔ تو خرقِ عادت کو عادت سے، عام باتوں سے کیسے سمجھایا جا سکتا ہے؟ ہاں! چھ ماہ لے کر آجاؤ، اللہ اللہ کرو، محنت، مجاہدہ کرو، اگر اللہ کو منظور ہوا تو تمہیں سمجھ آجائے گی اور یہ سب خرقِ عادت ہوگا۔

خرقِ عادت اور اہل السنۃ والجماعت کا مسلک

کشف و کرامت کا تعلق خرقِ عادت سے ہے اور اہلِ سنت کے نزدیک کرامت معجزہ کی فرع ہے، اس کے انکار سے متواترات کا انکار لازم آتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے وہ غلط فہمی سے امورِ خرقِ عادت کو امورِ عادیہ طبعیہ پہ قیاس کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ قدرتِ قادر کے انکار کا ارتکاب کرتے ہیں۔

عِنْدَ اَهْلِ السُّنَّةِ اَنَّ الرُّؤْيَةَ لَا يُشْتَرَطُ لَهَا عَقْلًا عُضْوٌ مَّخْصُوْصٌ وَّلَا مُقَابَلَةٌ وَّلَا قُرْبٌ وَاِنَّمَا تِلْكَ اُمُوْرٌ عَادِيَةٌ يَجُوْزُ حُصُوْلُ الْاِدْرَاكِ مَعَ عَدَمِهَا عَقْلًا وَلِذٰلِكَ حَكَمُوْا بِجَوَازِ رُؤْيَةِ اللهِ تَعَالٰى فِي الدَّارِ الْاٰخِرَةِ خِلَافًا لِاَهْلِ الْبِدَعِ لِوُقُوْفِهِمْ مَعَ الْعَادَةِ...

(فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب الصلوۃ، باب عظۃ الامام الناس... القبلہ، ۱:۵۱۳)

"اہل سنت کا رؤیت کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اس کے لیے کسی خاص اندام یعنی آنکھ کا ہونا شرط نہیں۔ نہ مرئی کا مقابل اور قریب ہونا شرط ہے کیونکہ یہ امورِ عادیہ ہیں اور رؤیت عقلاً جائز ہے بغیر ان امور عادیہ کے، اسی وجہ سے آخرت میں رویتِ باری تعالیٰ کے جواز کا حکم کیا ہے۔ اس کے برعکس اہل بدعت رؤیت کو عادت پر موقوف جانتے ہیں۔"

اور یہ واضح بات ہے کہ جس شخص کو نبی کریم ﷺ کی زیارت خواب میں ہوتی ہے وہ مردِ صالح ہے، اس کے قلب میں نور ہے۔ اگر کاملین میں سے کوئی اس کی تربیت کرنے والا ہو تو وہ بیداری میں بھی یقیناً حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو جائے گا۔

"وبعض می گویند کہ ایں بشارت است برائیان کہ جمال او را در خواب کہ آخر بعد از انقطاع و ارتفاع کدوراتِ نفسانیہ و قطع علائق جسمانیہ بمرتبہ بر سند کہ بے حجاب کشفاً و عیاناً در بیداری بایں سعادت فائز باشند چنانچہ اہل خصوص از اولیاء رامے باشد۔" (اشعۃ اللمعات، کتاب الرؤیا، فصل اول، ۳: ۶۴۰)

البتہ ان حجابات کے دور کرنے کے لیے مناسب ذرائع اور وسائل اختیار کرنے پڑیں گے جن سے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب ہو جائے۔ حجاب اٹھا تو زیارت ہو جائے گی اور وہ وسیلہ جس سے حجابات دور ہوتے ہیں ذکر الٰہی ہے۔ اس سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے، ملائکہ اور انبیاءؑ سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ذکرِ الٰہی کے ساتھ چند شرائط ہیں:

(۱) تصحیح عقائد ضروری ہے، شرک و بدعت کو دل سے نکال دے۔

(۲) اعمالِ صالحہ کا عادی ہو جائے۔

(۳) حرام سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔

(۴) کامل کی صحبت اختیار کرے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبلِ نبوت زندگی پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

اَنَّ اللّٰہَ بَغَّضَ اِلَیْہِ الْاَوْثَانَ وَ حَبَّبَ اِلَیْہِ خِلَالَ الْخَیْرِ وَ لُزُوْمَ الْوَحْدَۃِ فِرَارًا مِّنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ. فَلَمَّا لَزِمَ ذٰلِکَ اَعْطَاہُ اللّٰہُ عَلٰی قَدْرِ نِیَّتِہٖ وَ وَھَبَ لَہُ النُّبُوَّۃَ کَمَا یُقَالُ الْفَوَاتِحُ عُنْوَانُ الْخَوَاتِمِ... وَقَالَ ابْنُ الْمُنِیْرِ: کَانَ مُقَدِّمَۃُ النُّبُوَّۃِ فِیْ حَقِّ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْھِجْرَۃَ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی عَزَّ وَ جَلَّ بِالْخَلْوَۃِ فِیْ غَارِ حِرَاءٍ...

(فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ، ۱:۱۱)

"اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کے دل میں بتوں کے خلاف بغض ڈال دیا تھا اور اچھی عادتوں کو محبوب بنا دیا تھا اور حضور ﷺ نے تنہائی اور برے ساتھیوں سے دوری کو پسند فرمایا۔ جب آپ ﷺ نے ان اوصافِ حمیدہ کو اپنایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی نیت کے مطابق دیا اور نبوت عطا فرمائی۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ابتدا خاتمہ کا عنوان ہوتا ہے، اور ابنِ منیر شارحِ 'بخاری' نے کہا کہ یہ نبوت کا مقدمہ تھا کہ آپ ﷺ نے مخلوق سے خالق کی طرف ہجرت کی اور غارِ حرا میں تنہائی اختیار فرمائی۔"

قلب کی بحث میں تفصیل سے بیان ہو چکا کہ اصل دانا بینا قلب ہے۔ معاصی کے ارتکاب سے اس پر غبار بیٹھ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی دل کا سب سے خطرناک مرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کو کہیں یوں بیان کیا ہے کہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ... (المطففین: ۱۴)، کبھی فرمایا، اٰثِمٌ قَلْبُہٗ... (البقرہ: ۲۸۳)،

اور کہیں فرمایا کہ فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ... (الحج: ۴۶)

یعنی ان کے سر کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ ان کے سینے میں دل اندھے ہیں۔ یہاں "عَمِیٰ" اور "بَصَرٌ" کا تقابل عدم اور ملکہ کا ہے۔ اندھے کا لفظ اس پر بولا جاتا ہے جس کے شان سے دیکھنا ہو، عَمِیَ مِنْ شَاْنِہٖ اَنْ یَّکُوْنَ بَصِیْرًا... پتھر اور دیوار کو کوئی اندھا نہیں کہتا۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے دل کو اس لیے اندھا فرمایا، اس کے شان سے بینائی تھی۔

سوال: یہ آیتیں تو کفار کے حق میں نازل ہوئیں جن کے دلوں پر کفر کی ظلمت چھا چکی تھی اور وہ حق کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔

الجواب: اثر تو ایک ہے یعنی عدم رؤیت قلوب۔ ہاں! موثر اور سبب مختلف ہو سکتے ہیں۔ کفار کے عدمِ رؤیت قلب کا سبب ظلمتِ کفر ہے اور مسلمان کے عدم رؤیت قلب کا سبب ظلمتِ عصیاں، فسق و فجور، مخالفتِ سنت اور اتباع ہوئی

ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اثر واحد ہو تو مؤثر اور سبب بھی واحد ہو۔ امراضِ قلب کے ماہر معالج انبیاء علیہم السلام تھے، انہوں نے قلب کی صحت کا نسخہ ذکر الٰہی بتایا جس سے قلبِ سلیم اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ قلب کے لیے غذائے صالحہ، شریعتِ حقہ کی پیروی اور احکامِ الٰہی کی پابندی بتایا، اور غذائے فاسدہ یعنی شرک و بدعت اور اتباعِ ہویٰ سے منع فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے صحیح جانشینوں نے ان کی نیابت کی، جن کو صوفیاء کرام اور علمائے ربانی کہا جاتا ہے مگر آج ان کے وجود عنقا ہیں۔ مشیخیت اور سجادہ نشینی، علم و فضل اور وعظ و تبلیغ کے دعوے تو موجود ہیں مگر حقیقت غائب ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے زمانے کے حالات کا جو نقشہ 'تفہیمات الٰہیہ' میں کھینچا ہے آج کے حالات اس سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اے سجادہ نشینو! جو اپنے آباء کی مسندوں پر بغیر کسی استحقاق کے جمے بیٹھے ہو، تم نے وہ طریقہ تو چھوڑ دیا جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا تھا اور اپنی خواہشات کی اتباع کو تم نے دین بنالیا اور ہر شخص پیشوا بنا بیٹھا ہے اور اپنے آپ کو ہادی اور مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ حقیقت میں ضال اور مضل ہے۔ ہم ان لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض دنیوی اغراض اور مادی مفاد کی خاطر لوگوں سے بیعت لیتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ راہزن اور ڈاکو ہیں، جھوٹے اور فتنہ پرواز ہیں۔ لوگو! خبردار! ان ڈاکوؤں سے ہوشیار رہنا۔ تمہیں تو صرف اس شخص کو اپنا مرشد اور پیشوا بنانا ہے جو کتاب و سنت کی طرف دعوت دے۔۔۔ الخ" (تفہیماتِ الٰہیہ، ۱: ۲۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ جب سے عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آنے لگے ہیں، وہ مقام جہاں سے ارشاد و ہدایت کے چشمے پھوٹتے تھے، آج بیہودگی اور عیاشی، بے دینی اور آوارگی کے مرکز بن گئے ہیں۔ جہاں دین کے علاوہ سب کچھ موجود ہے اور جہاں سے دینداری اور ہدایت کے علاوہ سب کچھ ملتا ہے۔ دنیا بن رہی ہے اور عاقبت بگڑ رہی ہے اور اسے ایک کاروبار بنالیا گیا ہے۔

اور علماء کا جو نقشہ امام غزالیؒ نے 'احیاء العلوم' میں کھینچا ہے وہ چھٹی صدی ہجری کے علماء سے متعلق ہے، فرماتے ہیں:

أَقُولُ لَكُمْ لَا تَكُونُوا كَالْمَنْخَلِ يَخْرُجُ مِنْهُ الدَّقِيقُ الطَّيِّبُ وَ تَبْقَى فِيهِ النُّخَالَةُ
كَذَالِكَ أَنْتُمْ تُخْرِجُونَ الْحِكَمَ مِنْ أَفْوَاهِكُمْ وَ يَبْقَى الْغِلُّ فِي صُدُورِكُمْ...
أَفْسَدْتُمْ آخِرَتَكُمْ فَصَلَاحُ الدُّنْيَا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِنْ صَلَاحِ الْآخِرَةِ فَأَيُّ النَّاسِ
أَخْسَرُ مِنْكُمْ لَوْ تَعْلَمُونَ... (احیاء علوم الدین، ۳: ۱۵۸)

امام غزالیؒ کو اپنے زمانہ کے علماء سے شکایت ہے کہ تم چھلنی کی مانند ہو جس سے باریک اور عمدہ آٹا نکل جاتا ہے اور چھان اس کے اندر رہ جاتا ہے۔ مگر آج کے علماء (الا ماشاء اللہ) کی حالت یہ ہے کہ وہ اس موٹی چھلنی کی مانند ہیں جس سے چھان بھی خارج ہوتا رہتا ہے اور وہی حصہ چھلنی کے اندر رہ جاتا ہے جو سب سے زیادہ ردی اور بیکار ہو۔ اسی طرح ان کے

منہ سے اگر کبھی کبھار حکمت کی ایک آدھ بات نکلتی ہے تو اس کے ساتھ دس باتیں ایسی بھی نکلتی ہیں جو تہذیب اور شرافت کا ماتم کرتی ہوئی فضا میں پھیل جاتی ہیں۔

اور مغرب زدہ امراا اور جوانوں کی یہ حالت ہے کہ شیکسپیئر اور کارلائل کا کلام ان کا قرآن ہے اور مغرب کی بے حیائی اور فحاشی کی اندھی تقلید ان کی سنت ہے، اور نائٹ کلب اور بال روم کی حاضری دینا ان کی نماز ہے، اور کمزوروں اور بیکسوں کی تحقیر اور تذلیل ان کا جہاد ہے اور پیسہ ان کا ایمان ہے۔ سود اور رشوت کے ذریعہ بنک بیلنس بنانا ان کا مقصدِ حیات ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ... (الزمر:۱۵)

جب ہمارے فکر و عمل کی حالت یہ ہے، ہمارے عوام اور خواص کی ذہنیت اس قسم کی ہے تو قلوب کی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ جب ان کے قلوب نورِ بصیرت سے محروم ہیں تو اپنے اوپر قیاس کر کے صلحائے امت اور اصحاب بصیرت کا انکار کر دیں، یا رویت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیں تو ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ کسی شخص کو نابینا آدمی سے یہ گلہ نہیں ہوتا کہ وہ دیکھتا کیوں نہیں؟ بلکہ ان کی حالت قابلِ رحم ہے، ان کے دل روگی ہیں، ان کے قلوب بیمار ہیں۔ اس لیے ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ کسی معالجِ روحانی کی خدمت میں جا کر اپنے قلوب کا علاج کرائیں۔

دِل بینا بھی کر خدا سے طلب   آنکھ کا نور دِل کا نور نہیں

خرقِ عادت اور اہل السنۃ والجماعت کا مسلک

بطورِ کرامت اور عادت کے خلاف جن چیزوں کا ظہور ہوتا ہے خرقِ عادت کہلاتا ہے۔ معجزہ اور کرامت کا شمار خرقِ عادت میں ہوتا ہے۔ معجزہ منتقل ہو کر بطورِ کرامت ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ ولی کی کرامت بھی دراصل نبی کا معجزہ ہوتی ہے کیونکہ یہ ولی کو نبیؐ کے اتباع کے طفیل نصیب ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ اس لیے انکار کرتے ہیں کہ عادتاً یہ عام آدمی سے محال ہے لہٰذا ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسے انکار سے اللہ کی قدرتِ کاملہ اور اس کے قادر ہونے کا انکار ہوتا ہے، اور وہ حقیقتیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک متواتر اور صحیح سند کے ساتھ پہنچی ہیں، ان کا بھی انکار ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ رویت کے لیے ظاہری اعضاء کا ہونا شرط نہیں۔ رویت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہونا، ارواح یا فرشتوں کو دیکھنا ہے۔ چونکہ مادی آنکھ کے لیے شرطیں ہیں کہ جسے دیکھ رہی ہے وہ سامنے ہو، قریب ہو۔ اگر دور ہو تو دیکھ سکتی ہے، پہچان نہیں سکتی۔ مگر رویت کے لیے یہ بھی شرط نہیں کہ جسے دیکھا جا رہا ہے وہ قریب ہو یا سامنے ہو۔ خرقِ عادت یا کرامت کے لیے ان شرائط کا ہونا ضروری نہیں۔ مادی آنکھ سے دیکھنا امورِ عادیہ میں شامل ہے اور امورِ عادیہ سے مراد وہ کام ہیں جو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لہٰذا رویت ان اسباب اور امورِ عادیہ کے بغیر ممکن ہے، اسی لیے آخرت میں اللہ جل شانہٗ کا دیدار ہوگا اور اس کے لیے ظاہری آنکھ ضروری نہیں ہے جبکہ اہلِ بدعت جنہوں نے خلافِ سنت بدعات ایجاد کی ہیں وہ اسے امورِ عادی میں سمجھتے ہیں کہ ہر کوئی ایسا کر سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

جسے خواب میں زیارت ہوتی ہے اس کے لیے بھی یہ اس چیز کی دلیل ہے کہ کچھ صلاحیت اور نور تو اس کے دل میں ہے کہ زیارت نصیب ہوئی۔ اس کے ساتھ اگر اسے تربیت بھی مل جائے تو بیداری میں بھی دیکھ سکے گا۔ 'اشعۃ اللمعات' میں ہے کہ بعض کہتے ہیں یہ ان کے لیے خوشخبری ہے کہ اگر ان کے دل میں نور ہے، تو نفسانی علائق اور کدوراتِ نفسانیہ کے انقطاع کے بعد جب انہیں یکسوئی نصیب ہوتی ہے یعنی جب بندہ سوجاتا ہے تو ساری چیزوں کا انقطاع ہو جاتا ہے، آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، کان نہیں سنتے، بندہ ہر چیز سے، ہر طرف سے فارغ ہو جاتا ہے تو انہیں جمالِ جہاں آرا ذاتِ حضور اکرم ﷺ کی خواب میں زیارت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں اگر وہ بیداری میں متوجہ الی اللہ ہوں اور کوئی ایسا تربیت کرنے والا مل جائے کہ انہیں بیداری میں کدوراتِ نفسانیہ سے انقطاع نصیب ہو جائے تو انہیں حالتِ بیداری میں بھی یہ سعادت حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ حالتِ بیداری میں ذاتِ رسول اکرم ﷺ کی زیارت کریں اور یہ خاص اولیاء اللہ کو نصیب ہوتی ہے۔ ہاں! گناہوں کی وجہ سے دل پر جو حجاب آجاتے ہیں، ان حجابات کو دور کرنے کے لیے بھی مختلف ذرائع اور وسائل اختیار کرنا پڑیں گے جن سے قلب صاف ہو جائے اور نفس پاک ہو جائے۔ جیسے ہی حجاب اٹھا، زیارت ہو جائے گی۔ اور وہ وسیلہ اور ذریعہ جس سے حجابات دور ہوتے ہیں، ذکرِ الٰہی ہے۔ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے، ملائکہ اور انبیاءؑ سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر ذکرِ الٰہی کے ساتھ چند شرائط بھی ہیں۔ جن میں پہلی شرط یہ ہے کہ ذکر سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ عقیدہ خالص ہو اور اللہ کے ساتھ شرک یا نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف بدعت میں مبتلا نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کا عادی ہو جائے اور نیکی کو اپنی عادت بنالے۔ تیسری شرط ہے کہ حرام سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرے، جبکہ چوتھی شرط ہے کہ کامل کی صحبت اختیار کرے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرے۔

نبی کریم ﷺ کی قبلِ نبوت زندگی پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، 'فتح الباری' جو بخاری شریف کی شرح ہے، میں بیان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے دل میں بتوں کے خلاف بغض ڈال دیا تھا یعنی حضور ﷺ بتوں کو بہت برا سمجھتے تھے، اور اچھی عادتوں کو محبوب بنا دیا تھا۔ چونکہ لوگ کفر و شرک میں مبتلا تھے تو حضور ﷺ لوگوں سے کٹ کر حرا میں تشریف لے جاتے۔ جب آپ نے ان اوصافِ حمیدہ کو اپنایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی نیت کے مطابق دیا اور نبوت عطا فرمائی۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ابتدا خاتمہ کا عنوان ہوتا ہے، یعنی کسی کام کی ابتدا ہی اس کام کی بنیاد بنتی ہے۔ پھر خاتمہ بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کام کو شروع کیا جائے۔ اور ابن منیر شارحِ 'بخاری' نے کہا ہے کہ یہ نبوت کا مقدمہ تھا کہ آپ ﷺ نے مخلوق سے خالق کی طرف ہجرت کی اور غارِ حرا میں تنہائی اختیار فرمائی۔ اور جس طرح حضور ﷺ برے معاشرے اور برے لوگوں سے کٹ کر یا علیحدہ ہو کر حرا میں تشریف لے جاتے تھے، اسی طرح سالک کو برے ساتھیوں، برے ماحول اور برائی سے الگ ہونا چاہیے۔

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ کان، آنکھ وغیرہ یہ مادی حسیات ہیں اور مادی چیزوں تک ان کی رسائی ہے جبکہ روحانی، غیبی، باطنی نعمتوں کا دیکھنا یا باتیں سننا قلب کا کام ہے۔ اور اگر کسی میں ایمان ہو لیکن وہ گناہگار ہو تو گناہ کرنے سے بھی اس کے قلب پر غبار بیٹھ جاتا ہے اور گرد جم جاتی ہے، رفتہ رفتہ اس کی بینائی ختم ہو جاتی ہے اور یہی دل کا سب سے خطرناک مرض

Scanned with CamScanner

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کو قرآنِ کریم میں کہیں یوں بیان کیا ہے کہ ''ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے'' اور کہیں فرمایا کہ ''ان کے دل بدکار اور گناہگار ہیں'' اور کہیں فرمایا کہ ''ان کے سر کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ ان کے سینے میں دل اندھے ہیں۔'' یہاں 'عمیٰ' اور 'بصر' کا تقابل عموم اور ملکہ کا ہے۔ یعنی یہاں اندھا ہونا اور دیکھنے کا جو مقابلہ ہے وہ دیکھنے کے ملکہ ضائع ہونا یا دیکھنے کی قوت کا باقی رہنا ہے۔ دل میں مادی آنکھ کی طرح کوئی آنکھ نہیں ہوتی۔ دیکھنے کی ایک قوت ہوتی ہے اگر وہ قوت ضائع ہو جائے تو دل اندھا ہو جاتا ہے اور وہ قوت حاصل ہو تو دل بینا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں 'عمیٰ' کا اطلاق ہے یعنی دل اندھا ہو جاتا ہے۔ اندھا اسے کہتے ہیں جو دیکھنے کے آلات یا اعضا رکھتا ہو مگر دیکھ نہ سکتا ہو۔ جیسے انسانوں اور جنوں کی آنکھیں ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے، تو اندھے ہیں۔ ورنہ کوئی دیواروں یا پتھروں کو تو اندھا نہیں کہتا کیونکہ ان کی نظر ہی نہیں یا ان کے پاس یہ قوت سرے سے ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اگر قرآن نے دل کو اندھا کہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دل میں دیکھنے کی قوت ہوتی ہے مگر گناہوں اور غلط عقائد رکھنے سے وہ قوت کھو دیتا ہے جس کی وجہ سے اندھا ہو جاتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے اور اعتراض بنتا ہے کہ جن آیتوں میں دل کا اندھا ہونا بتایا گیا ہے یہ تو کافروں کے لیے نازل ہوئیں تھیں۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اثر تو ایک ہے کہ دل اندھا ہو گیا، ہاں! اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ کافر کا کفر کے سبب اور مومن کا گناہوں کے سبب۔ آنکھوں پر پردہ ڈال دیا جائے تو بھی اندھی ہو جاتی ہیں، کوئی بالکل پھوڑ ہی دے تو بھی اندھی ہو جاتی ہیں۔ مومن اور کافر میں یہ فرق بھی ہے کہ اگر کوئی کفر سے توبہ نہیں کرتا تو اثر ایسے ہے جیسے آنکھ پھوڑ دی گئی، اور اگر مومن ہے، گناہ گار ہے، اس کی آنکھ ہے مگر دیکھ نہیں سکتا کیونکہ گناہوں کی وجہ سے اس پر پردہ آ گیا۔ اثر تو دونوں کا ایک ہے۔ اگر پردہ ڈال دیا تو بھی دیکھنے سے محروم ہو گئی اور اگر پھوڑ دی گئی تو بھی دیکھنے سے محروم ہو گئی۔ کافر کا دل اگر اندھا ہو جاتا ہے تو اس کے اندھا ہونے کا سبب کفر کی ظلمت اور تاریکی ہے، اور مسلمان کا دل اگر نہیں دیکھ رہا تو اس کا سبب گناہوں کی تاریکی ہے۔ گناہ کرنا، سنت کی مخالفت اور خواہشات کی پیروی، یہ سب مومن کے دل کے اندھا ہونے کے اسباب ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر اثر ایک ہے تو اس کا سبب بھی ایک ہی ہو۔ اب اگر کسی کو بخار ہے تو وہ گرمی سے بھی ہو سکتا ہے اور ٹھنڈ لگنے سے بھی۔ نتیجہ تو ایک ہے، اسباب مختلف ہیں۔ دل کے تمام امراض کا علاج صرف اللہ کے نبیوں کے پاس تھا، لہٰذا انبیاءؑ نے قلب کی اصلاح کا سب سے اعلیٰ نسخہ اللہ کا ذکر بتایا۔ جس کے نتیجے میں قلبِ سلیم عطا ہوتا ہے۔ قلب سالم اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

قلبِ سلیم کے لیے غذائے صالحہ یعنی حلال اور پاکیزہ غذا ہو اور شریعت کی پیروی بھی ہو۔ جبکہ بری غذا، شرک، بدعت اور ناجائز خواہشات کی پیروی نہ ہو، اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ انبیاءؑ کے بعد ان کے صحیح جانشینوں نے ان کی نیابت کی، جن کو صوفیاء کرام اور علمائے ربانی کہا جاتا ہے مگر آج کی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ اس کے برعکس پیری مریدی، بڑی بڑی خانقاہیں اور گدیاں موجود ہیں۔ حضرت ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب 'تفہیماتِ الٰہیہ' میں اپنے زمانے کے لوگوں کے حالات بیان کیے ہیں، آج تو اُس دور کی نسبت حالات کہیں بدتر ہو گئے ہیں۔

حضرت ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں، ''اے سجادہ نشینو! جو بغیر کسی استحقاق کے محض اس وجہ سے خانقاہوں پر قابض ہو گئے ہو کہ تم ان کی اولاد ہو جو شاید خود تو نیک تھے اور اس قابل تھے کہ لوگوں کی اصلاح فرماتے تھے۔ تم نے وہ طریقہ چھوڑ دیا جو

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا تھا اور اپنی خواہشات کے اتباع کو تم نے دین بنالیا۔ "ہر شخص نے اپنے آپ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ سمجھ رکھا ہے حالانکہ نہ صرف وہ خود گمراہ ہے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کر رہا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض روپے جمع کرنے، اپنی بات بنانے یا ذاتی اغراض اور مفاد کے لیے بیعت لیتے پھرتے ہیں۔ "یہ لوگ راہزن اور ڈاکو ہیں، جھوٹے اور فتنہ پرداز ہیں۔ لوگو خبردار! ان ڈاکوؤں سے ہوشیار رہنا۔ تمہیں تو صرف اس شخص کو مرشد اور پیشوا بنانا ہے جو کتاب وسنت کی طرف دعوت دے۔" اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں، یہ عقابوں کے نشیمن جب سے زاغوں کے تصرف میں آئے ہیں، وہ مقام جہاں سے ہدایت کے چشمے پھوٹتے تھے، آج بیہودگی اور عیاشی، بے دینی اور آوارگی کے مرکز بن گئے ہیں جہاں دینداری اور ہدایت کے علاوہ سب کچھ ملتا ہے۔

امام غزالیؒ چھٹی صدی ہجری میں اُس وقت کے علماء کے متعلق فرماتے ہیں کہ تم ایک چھلنی کی طرح سے ہو جس سے آٹا نکل جاتا ہے اور چھان بورہ اس میں رہ جاتا ہے، یعنی اصل حقیقتیں تو تم ضائع کر چکے ہو اور رسومات اور بدعات کو لے کر دنیا میں تماشا بنا کر پھر رہے ہو۔ تمہارے منہ سے اچھی باتیں نکلتی ہیں مگر تمہارے دل میں خرافات بھری ہوئی ہیں۔ تم نے آخرت تباہ کر لی اور پیسے جمع کر کے دنیا خوب کمالی۔ یہ دنیا تمہیں آخرت کی اصلاح سے زیادہ محبوب بھی ہے۔ اگر تم میں کوئی سمجھ ہے یا کچھ علم رکھتے ہو تو اس سے بڑا نقصان اور کیا ہوگا کہ آخرت تباہ ہو رہی ہے۔ امام غزالیؒ نے یہ بات چھٹی صدی ہجری میں اس وقت کے پیرزادوں اور گدی نشینوں سے کہی تھی اور ان کے بارے رائے دے رہے تھے۔ اب تو پندرہویں صدی ہے، اب کیا حالت ہوگی۔ مغرب زدہ طبقے کی جب ہم باتیں سنتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک آخری دلیل تو وہی بات ہوتی ہے جو کفر کی دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے کی۔ وہ حوالے بھی ان ہی کے دیتے ہیں کہ 'شیکسپیئر' نے یہ کہا، 'کارلائل' نے یہ کہا اور انہی جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر اس پر فخر کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کی بات ہی نہیں کرتے۔ یعنی ان کے نزدیک کمال یہ ہے کہ مغرب کے کفار جیسے بن جاؤ۔ گاڑی، لباس، حلیہ سب انہی کی طرح ہو تو بڑے فخر کی بات ہے۔ یہ ظاہر کو بھی بے دینوں جیسا بنانا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ جب ان کی عملی زندگی ایسی ہے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دلوں کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر کا حال یہ ہے تو باطن کی اصلاح کون کرے گا؟ اور ان کے قلوب کی اصلاح کیا ہو جب ان کے نزدیک کفار کی پیروی ہی قابلِ فخر ہے۔ تو پھر یہ رجال اللہ کی کرامات کے قائل کس طرح ہو سکتے ہیں؟ یا ان کی عقیدت ان میں کہاں آئے گی؟ لہٰذا اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں اسی لیے ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ جب لوگوں نے خود کو اندھا کر لیا ہے کہ حضور ﷺ جیسا، اور حضور ﷺ کے صحابہؓ جیسا بننے کی بجائے کفار جیسا بننے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو اندھے سے بھلا کون گلہ کرے گا کہ اس نے مجھے کیوں نہیں دیکھا اور پہچانا۔ جہاں دلیل دینا ہوتی ہے وہاں قرآن وسنت کی بجائے کسی کافر کا قول بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں تو ان سے کیا توقع رکھی جائے کہ یہ کمالِ باطنی کو پہچانیں گے، بلکہ ان کی حالت تو قابلِ رحم ہے، ان کے دل روگی ہیں۔ اس لیے ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ کسی معالجِ روحانی کی خدمت میں جا کر اپنے قلوب کا علاج کرائیں۔

Scanned with CamScanner

باب(19)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روحانی بیعت

سوال: آپ نے کہیں ذکر کیا ہے کہ ابتدائی منازلِ سلوک طے کرانے کے بعد ہمارے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ سے روحانی بیعت
کراتے ہیں۔ کیا اس کا ثبوت متقدمین صوفیاء میں بھی ملتا ہے؟

الجواب: علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا:

وَقَالَ تَاجُ ابْنُ عَطَآءِ اللهِ عَنْ شَيْخِهِ الْكَامِلِ الْعَارِفِ أَبِي الْعَبَّاسِ الْمَرْسِيِّ صَافَحْتُ بِكَفِّي
رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... سَيِّدِيْ عَلِيٌّ وَفَا قَالَ... فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبَّلَ
وَجْهِيْ فَعَانَقَنِيْ فَقَالَ: وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ... (فتاویٰ الحدیثیہ، ۱: ۲۱۳)

"تاج ابن عطاء اللہ نے فرمایا کہ میرے شیخ عارف کامل ابو العباس المرسی نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے آپ کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کیا۔ اور عارف علی وفا نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو روبرو دیکھا، پھر آپ نے میرے ساتھ معانقہ فرمایا پھر فرمایا، اللہ تعالیٰ کی نعمت بیان کیا کر۔"

از شیخ ابو المسعود آورده که مصافحه می کرد آنحضرت صلی الله علیه وسلم را بعد ہر نماز۔ (اشعۃ اللمعات، کتاب الرؤیا، فصل اوّل ۳: ۶۴۰)

"شیخ ابو مسعود سے روایت ہے کہ میں نے ہر نماز کے بعد رسول کریم ﷺ سے مصافحہ کیا ہے۔"

اور آخر میں امام الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کی زبانی تفصیل سنیے:

"چوں ایں معرفت جلیله بخاطرم جاگرفت آنحضرت صلی الله علیه وسلم تبسم کناں سر از جیبِ مراقبه بیروں آوردن و دو دست خویش برداشتند و اشارت فرمودند، به بیعت و مصافحه۔ ایں فقیر برخاست و زانو بزانوئے او متصل ساخته و دو دست خود درمیان دو دست آنحضرت صلی الله علیه وسلم نہاده بیعت کرد و بعد از فراغ بیعت چشم فرد بستند۔" (الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: ۷)

"جب یہ عظیم معرفتِ جلیلہ میرے دل میں جاگزیں ہوئی، آنحضرت ﷺ نے مسکراتے ہوئے مراقبے سے سر مبارک اٹھایا اور اپنے دونوں مبارک ہاتھوں سے میری طرف مصافحہ اور بیعت کا اشارہ فرمایا۔ یہ فقیر اٹھا اور اپنے زانو آنحضرت ﷺ کے زانوؤں کے ساتھ ملائے اور اپنے دونوں ہاتھ آنحضرت ﷺ کے مبارک ہاتھوں کے درمیان رکھے اور بیعت کی۔ بیعت لینے سے فارغ ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے اپنی مبارک آنکھیں بند فرما لیں۔"

Scanned with CamScanner

رسول کریم ﷺ سے روحانی بیعت

سوال: سوال کیا گیا ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ اویسیہ والے کہتے ہیں ہم حضور اکرم ﷺ کے دستِ اقدس پہ بیعت کراتے ہیں، کیا متقدمین یعنی پہلوں میں یا سلف صالحین میں اس کا کوئی ثبوت ہے؟

الجواب: اعلیٰ حضرتؒ نے جواب عرض کرتے ہوئے علامہ ابن حجرؒ کا قول نقل فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں، تاج ابن عطاء اللہ نے فرمایا کہ میرے شیخ عارفِ کامل ابو العباس المرسی نے فرمایا، میں نے حضور اکرم ﷺ سے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کیا۔ اور عارف علی وفا نے فرمایا، میں نے رسول کریم ﷺ کو روبرو دیکھا، پھر آپ ﷺ نے مجھے سینے سے لگایا، اور پھر فرمایا کہ اللہ کی نعمت یعنی دین کو بیان کیا کر اور مجھے اس کا حکم دیا۔ اب اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میری اس ملاقات کو لوگوں پر بیان کرتا کہ دوسرے لوگ بھی یہ نعمت حاصل کرنے کے لیے محنت کریں۔ پھر قرآن مجید کے حوالے سے ارشاد فرمایا، وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ... (الضحیٰ:11) یعنی اللہ کے انعامات کا اظہار کیا جانا چاہیے۔ 'اشعۃ للمعات' میں ہے، حضرت شیخ ابو المسعودؒ سے بات آئی ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد نبی کریم ﷺ سے مصافحہ کرتے تھے یعنی دونوں ہاتھ ملاتے تھے۔ اور شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ جب میرے دل میں معرفت کا یہ معیار جم گیا اور مجھے یہ استعدادِ قلبی حاصل ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ جو مراقب الی اللہ، جلوہ افروز تھے۔ آپ ﷺ نے مسکرا کر مراقبے سے سر مبارک اٹھایا اور اپنے دونوں دست ہائے مبارک بڑھا کر مجھے بیعت کا اشارہ فرمایا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں، روحانی طور پر میں اپنی جگہ سے اٹھا، حضور ﷺ کے سامنے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ حضور ﷺ کے ہاتھوں میں دے کر آپ ﷺ سے بیعت کی۔ میری بیعت لینے کے بعد حضور ﷺ نے چشم ہائے مبارک بند فرما لیں اور مراقب ہو گئے۔

لہٰذا متقدمین میں یہ ثبوت ہے کہ بعض کو روحانی بیعت نصیب ہوئی، بعض کو مصافحہ نصیب ہوا جبکہ بعض ایسے بھی تھے کہ جو ہر نماز میں حضور ﷺ سے مصافحہ کرتے تھے۔ اسی طرح پہلے بھی روایات گزر چکی ہیں جن میں سے ایک روایت تھا ہے کہ اگر حضور ﷺ کا رخِ انور ایک لحہ بھی میری آنکھوں سے پوشیدہ ہو جائے تو میں خود کو مسلمان نہ سمجھوں۔

Scanned with CamScanner

باب (20)

کلام بالارواح

کلام بالارواح یا کشفِ قبور کا انکار دراصل دعویٰ بلا دلیل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس موضوع پر کچھ کرنے کے لیے علمی اور نقلی دلائل سے رہنمائی حاصل کی جائے تو اقرار کیے بغیر بات نہیں بنتی اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اہل اللہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے جو نبی کریم ﷺ کے صحیح جانشینوں کو میراثِ نبوی ﷺ کے طور پر اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کلام بالارواح کی شریعت میں اصل بھی ہے یا نہیں؟ پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ سابقین سے اس کی نقل بھی ملتی ہے یا نہیں؟ پھر یہ دیکھنا ہے کہ اسلاف میں اس کی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جنہیں حقیقتِ نفس الامری کہا جاسکتا ہے؟

اگر ان تینوں صورتوں میں دلائل قاطعہ مل جائیں تو انکار کرنا جہالت یا ضد اور عناد کے بغیر کچھ نہیں۔

(۱) بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام کو رسولِ خدا ﷺ کی اقتدا کے لیے جمع کیا گیا تھا، پھر ارواحِ انبیاء سے مکالمہ ہوا۔

فَقَالَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اتَّخَذَنِيْ خَلِيْلًا وَّ اَعْطَانِيْ مُلْكًا عَظِيْمًا وَ جَعَلَنِيْ اُمَّةً قَانِتًا يُؤْتَمُّ بِيْ وَاَنْقَذَنِيْ مِنَ النَّارِ وَ جَعَلَهَا عَلَيَّ بَرْدًا وَّسَلَامًا ثُمَّ اِنَّ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ اَثْنٰى عَلٰى رَبِّهٖ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَلَّمَنِيْ تَكْلِيْمًا وَّ جَعَلَ هَلَاكَ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَ نَجَاةَ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى يَدَيَّ وَ جَعَلَ مِنْ اُمَّتِيْ قَوْمًا يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ثُمَّ اِنَّ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَثْنٰى عَلٰى رَبِّهٖ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ لِيْ مُلْكًا عَظِيْمًا وَّ عَلَّمَنِي الزَّبُوْرَ وَ اَلَانَ لِيَ الْحَدِيْدَ وَ سَخَّرَ لِيَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ... الخ (تفسیر ابن کثیر، ۳:۱۸)

"حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے خلیل بنایا ہے اور مجھے عظیم ملک عطا کیا اور مجھے اطاعت شعار امت بنایا اور مجھے آگ میں سے نکالا اور آگ کو میرے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔ پھر موسیٰؑ نے اپنے رب کی ثناء بیان کی اور کہا تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ سے خوب کلام کی اور میرے ہاتھ سے فرعون کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور میری امت سے ایسے لوگ پیدا کیے جو حق و ہدایت پر قائم رہے اور رہنمائی کرتے رہے۔ پھر اسی طرح حضرت داؤدؑ نے کہا کہ تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے سلطنت عطا کی، مجھے زبور کی تعلیم دی، میرے لیے لوہے کو نرم کر دیا اور میرے لیے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ میرے ساتھ مل کر پہاڑ اور پرندے تسبیح پڑھتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

یہ واقعہ کلام بالارواح کی اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ:

۱۔ زندہ انسان ارواح کی کلام سن سکتا ہے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے انبیاءؑ کے ارواح کی کلام سنی۔

۲۔ زندہ انسان برزخ والوں کو دیکھ سکتا ہے۔

۳۔ انسان پر دنیوی زندگی میں جو حالات گزرتے ہیں، برزخ میں روح کو خوب یاد ہوتے ہیں۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ دلائل ان لوگوں کے نقطۂ نظر کے مطابق پیش کیے جا رہے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ بیت المقدس میں ارواح متشکل تھے، اُن سے کلام ہوئی۔لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ ارواح مع الاجساد بیت المقدس میں حاضر ہوئے تھے اور قرآن و سنت سے دلائل بھی ہمارے عقیدے کے حق میں قوی ہیں۔جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب 'سماع موتیٰ' میں بیان کر دی ہے۔

شب معراج حضور اکرم ﷺ کی انبیاء کرام کے ارواح سے آسمانوں پر یکے بعد دیگرے جو ملاقات ہوئی، اس کی تفصیل 'صحیح مسلم شریف' میں موجود ہے۔بخوف طوالت صرف حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ارواحِ انبیاءؑ سے ملاقات بھی ہوئی اور کلام بھی ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کے ساتھ شب معراج میں جو واقعات پیش آئے، وہ واقعات کے اعتبار سے کلام بالارواح کی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اب حضور کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو، جو دوسری حیثیت سے اصل قرار دی جاتی ہے:

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ (اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ وَ اَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ) اَلْمُرَادُ بِمَا الْمَوْصُوْلَۃُ فِیْہِمَا مَغِیْبَاتٌ وَ اُمُوْرٌ فِی الْمَلَاءِ الْاَعْلٰی اِطَّلَعَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہَا وَ غَیْرُہٗ ﷺ لَا یَرَاھَا کَرُؤْیَۃِ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ الْجَنَّۃِ وَ النَّارِ وَ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ الْاِطِّلَاعِ عَلَی الْمَوْتٰی وَ اَحْوَالِ الْبَرْزَخِ سِمَاعَہٗ لِاَصْوَاتِ الْمُعَذَّبِیْنَ فِی الْقُبُوْرِ... (نسیم الریاض، ۲:۱۳۸)

"حضور اکرم ﷺ نے فرمایا میں دیکھتا ہوں جو چیزیں تم نہیں دیکھتے اور اُس کلام کو سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ان دونوں جملوں میں 'ما' موصولہ ہے اور اس سے مراد مغیبات ہیں اور وہ امور ہیں جو ملاء اعلیٰ میں واقع ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس پر مطلع فرمایا جو دوسرے لوگ نہیں دیکھتے۔جیسے ملائکہ کو دیکھنا، جنت دوزخ، عذابِ قبر کو دیکھنا، برزخ کے حالات اور ان لوگوں کی آوازیں جو قبروں میں عذاب سے دوچار ہیں۔"

اس حدیث سے اور اس کی شرح سے جہاں معلوم ہوتا ہے کہ کلام بالارواح کی اصل، شریعت میں موجود ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عذابِ قبر مغیبات میں سے ہے، اور مغیبات پر ایمان لانا فرض ہے۔اس لیے کشفِ قبور کو کوئی کہ علمی لغزش ہے۔

Scanned with CamScanner

بحث کی دوسری شق کے متعلق چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اَلثَّانِي اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ فِي حَيَاتِهِ كَانَ يَرَى الْاَنْبِيَاءَ وَ يَجْتَمِعُ بِهِمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا تَقَدَّمَ اَنَّهُ رَاٰى عِيْسٰى فِي الطَّوَافِ وَ صَحَّ اَنَّهُ ﷺ مَرَّ عَلٰى مُوْسٰى وَ هُوَ يُصَلِّيْ فِيْ قَبْرِهٖ وَ صَحَّ اَنَّهُ ﷺ قَالَ: اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ يُصَلُّوْنَ فَكَذٰلِكَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِلَى الْاَرْضِ يَرَى الْاَنْبِيَاءَ وَ يَجْتَمِعُ بِهِمْ وَ مِنْ جُمْلَتِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَاْخُذُ عَنْهُ مَا يُحْتَاجُ اِلَيْهِ مِنْ اَحْكَامِ شَرِيْعَةٍ... (الحاوی للفتاویٰ، ۲:۲۹۱)

"امر دوم یہ کہ نبی ﷺ اس دنیوی زندگی میں انبیاء کو دیکھتے اور ان سے ملاقات کرتے تھے، جیسا کہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے عیسیٰ کو طواف میں دیکھا، اور یہ صحیح ہے کہ آپ ﷺ موسیٰ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ قبر میں نماز پڑھ رہے تھے، اور یہ صحیح ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء زندہ ہیں، نماز پڑھتے ہیں۔ اسی طرح جب عیسیٰؑ زمین پر واپس آئیں گے، انبیاءؑ کو دیکھیں گے اور اُن سے ملاقات کریں گے۔ ان میں سے ایک حضور ﷺ ہیں، اور عیسیٰؑ حضور اکرم ﷺ سے احکامِ شریعت حاصل کریں گے، جن احکام کے وہ محتاج ہوں گے۔"

اب یہ دیکھنا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی یہ میراث جن لوگوں کو ملتی ہے، اُن میں کون سی ایسی خوبی ہے جو دوسرے لوگوں میں نہیں پائی جاتی۔ جب ایسے حضرات کے حالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سارے کے سارے اصحابِ تصوف و سلوک ہی گزرے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس دولت کے ملنے کا واحد ذریعہ تصوف و سلوک ہے۔ اس علم و فن کی فضیلت کے متعلق علامہ وزیر فرماتے ہیں:

هٰذَا بَحْرٌ عَمِيْقٌ لَا سَاحِلَ لَهٗ لَا يَصِحُّ رُكُوْبُهٗ اِلَّا فِيْ سُفُنِ الْمُكَاشَفَةِ وَ لَيْلٌ جَهِيْمٌ لَا يَحْسُنُ مَسْرَاهُ اِلَّا بَعْدَ طُلُوْعِ اَهِلَّةِ الْمُشَاهَدَةِ ... اِنَّ ذٰلِكَ مِنَ الْعُلُوْمِ الضَّرُوْرِيَّةِ التَّجْرِبَةِ الْمُتَوَاتِرَةِ عَنْ اَرْبَابِ الرِّيَاضَاتِ وَ مُلَازَمَةِ الْخَلَوَاتِ فَاِنَّهُمْ يَرَوْنَ فِي الْيَقْظَةِ مِثْلَ مَا يَرَاهُ النَّاسُ فِي النَّوْمِ وَ يَسْمَعُوْنَ مُخَاطَبَاتٍ مِّنْ غَيْرِ رُؤْيَةِ الْمُخَاطِبِ...

(الروض الباسم، ۲:۵۷)

"یہ (علمِ سلوک) بہت گہرا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ مکاشفہ کی کشتی کے بغیر اس سمندر میں سفر کرنا درست نہیں، اور یہ ایک سیاہ رات ہے جس میں مشاہدہ کے چاند کے طلوع ہونے کے بغیر سفر کرنا درست نہیں۔ یہ علوم ضروری اور بدیہی ہیں۔ تجربہ سے، تواتر کے ساتھ اصحابِ ریاضت سے ثابت ہیں جنھوں نے تخلیہ کو لازم سمجھا اور وہ بیداری میں وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو دوسرے لوگ خواب میں دیکھتے ہیں اور وہ مخاطب کو دیکھے بغیر اس کا کلام سن لیتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

اب ان حضرات کے واقعات دیکھیے جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی تھی:

قَالَ الشَّيْخُ عَبْدُ الْقَادِرِ جِيلَانِيٌّ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ الظُّهْرِ فَقَالَ لِي يَا بُنَيَّ لِمَ لَا تَتَكَلَّمُ، قُلْتُ: يَا أَبَتَاهُ أَنَا رَجُلٌ أَعْجَمِيٌّ كَيْفَ أَتَكَلَّمُ عَلَى فُصَحَاءِ بَغْدَادَ. فَقَالَ: إِفْتَحْ فَاكَ فَفَتَحْتُهُ فَتَفَلَ فِيْهِ سَبْعًا وَقَالَ: تَكَلَّمْ عَلَى النَّاسِ وَادْعُ إِلَى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ... فَصَلَّيْتُ الظُّهْرَ وَ جَلَسْتُ وَحَضَرَنِي خَلْقٌ كَثِيْرٌ فَارْتَجَّ عَلَيَّ فَرَأَيْتُ عَلِيًّا قَائِمًا بِإِزَائِي فِي الْمَجْلِسِ. فَقَالَ لِي مِثْلَ مَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ... (الحاوی للفتاوی، ۲:۴۴۳)

"شیخ عبدالقادر جیلانی" فرماتے ہیں کہ میں نے ظہر سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا، بیٹا تم بات کیوں نہیں کرتے؟ عرض کیا، ابا جان میں عجمی ہوں، فصحائے بغداد کی طرح کلام کیسے کر سکتا ہوں؟ فرمایا اپنا منہ کھول، میں نے منہ کھولا۔ حضور ﷺ نے سات مرتبہ میرے منہ میں لعاب دہن ڈالا اور فرمایا کہ لوگوں کو حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ذریعے اللہ کی طرف دعوت دے۔ پھر میں نے ظہر کی نماز پڑھی اور بیٹھ گیا، ایک ہجوم میرے گرد جمع ہو گیا۔ پھر میں نے حضرت علیؓ کو اپنے پاس کھڑا ہوا دیکھا، انہوں نے بھی مجھے وہی کچھ فرمایا جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔"

یہی واقعہ امام یافعیؒ نے 'کفایۃ المعتقد' میں صفحہ ۳۸۷ پر درج فرمایا ہے:

وَقَالَ أَيْضًا فِي تَرْجَمَةِ الشَّيْخِ خَلِيْفَةَ بْنِ مُوْسَى النَّهْرِ مَلْكِيٍّ كَانَ كَثِيْرًا الرُّؤْيَةِ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْظَةً وَمَنَامًا فَكَانَ يُقَالُ: إِنَّ أَكْثَرَ أَفْعَالِهِ مُتَلَقَّاةٌ مِنْهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَمْرٍ مِنْهُ إِمَّا يَقْظَةً وَإِمَّا مَنَامًا وَرَآهُ فِي لَيْلَةٍ وَاحِدَةٍ سَبْعَ عَشْرَةَ مَرَّةً... (الحاوی للفتاوی، ۲:۴۴۴)

"شیخ خلیفہ بن موسیٰ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ خواب اور بیداری میں کثرت سے حضور ﷺ کی زیارت کیا کرتے تھے، اور کہا جاتا تھا کہ ان کے اکثر کام حضور اکرم ﷺ کی تلقی سے ہوتے تھے، خواہ تلقی خواب میں ہو یا بیداری میں۔ اور انہوں نے حضور ﷺ کو ایک رات میں سترہ مرتبہ دیکھا۔"

علامہ الکمال الادفوی نے اپنی کتاب 'الطالع السعید' میں الترجمہ علامہ صفی ابی عبداللہ محمد بن یحییٰ الاسوانی میں فرمایا:

كَانَ مَشْهُوْرًا بِالصَّلَاحِ وَلَهُ مُكَاشَفَاتٌ وَكَرَامَاتٌ كَتَبَ عَنْهُ ابْنُ دَقِيْقِ الْعِيْدِ ابْنِ النُّعْمَانِ وَالْقُطْبُ الْعَسْقَلَانِيُّ وَكَانَ يَذْكُرُ أَنَّهُ يَرَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَجْتَمِعُ بِهِ... (الحاوی للفتاوی، رسالة تنوير الحلك في امكان رؤية النبي والملك، ۲:۴۴۴؛ الطالع السعيد)

Scanned with CamScanner

"وہ بہت صالح مشہور تھے۔ ابن دقیق العید ابن النعمان اور قطب عسقلانی نے ان کے مکاشفات اور کرامات کا ذکر کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی اور مجلس کی۔"

جلال الدین سیوطیؒ نے شیخ عبدالغفار بن نوح کی کتاب 'الوحید' کے حوالے سے فرمایا:

كَانَ لِلشَّيْخِ اَبِي الْعَبَّاسِ الْعَزَفِيِّ وُصْلَةٌ بِالنَّبِيِّ ﷺ اِذَا سَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَيُجَارِبُهُ اِذَا تَحَدَّثَ مَعَهُ...

(الحاوی للفتاوٰی، رسالۃ تنویر الحلك فی إمكان رؤیۃ النبی و الملك، ۲:۴۴۴)

"شیخ ابی العباس العزفی کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوتی تھی۔ جب آپ سلام کہتے تو حضور اکرم ﷺ جواب دیتے، اور جب حضور ﷺ سے گفتگو کرتے تو حضور ﷺ اس کا جواب دیتے تھے۔"

جلال الدین سیوطی، ابنِ فارس کی کتاب 'المنح الالهیة فی مناقب السادة الوفائية' کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

قَالَ (اَيِ ابْنُ فَارِسَ) كُنْتُ وَاَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِيْنَ اَقْرَاُ الْقُرْاٰنَ عَلٰى رَجُلٍ يُقَالُ لَهُ الشَّيْخُ يَعْقُوْبُ فَاَتَيْتُهُ يَوْمًا فَرَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْظَةً لَا مَنَامًا وَعَلَيْهِ قَمِيْصٌ اَبْيَضُ قُطْنٌ ثُمَّ رَاَيْتُ الْقَمِيْصَ عَلَيَّ فَقَالَ لِيْ اِقْرَاْ فَقَرَاْتُ عَلَيْهِ سُوْرَةَ وَالضُّحٰى وَ اَلَمْ نَشْرَحْ ثُمَّ غَابَ عَنِّيْ فَلَمَّا اَنْ بَلَغْتُ اِحْدٰى وَ عِشْرِيْنَ سَنَةً اَحْرَمْتُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ بِالْقَرَافَةِ فَرَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُبَالَةَ وَجْهِيْ فَعَانَقَنِيْ وَقَالَ لِيْ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ...

(الحاوی للفتاوٰی، رسالۃ تنویر الحلك فی إمكان رؤیۃ النبی و الملك، ۲:۴۴۶)

"ابن فارس کہتے ہیں کہ جب میں پانچ برس کا تھا تو شیخ یعقوب سے قرآن مجید پڑھتا تھا۔ ایک روز میں ان کے پاس آیا تو میں نے نبی کریم ﷺ کو عین بیداری میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے ایک سفید سوتی قمیص پہن رکھی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ قمیص میں نے پہنی ہوئی ہے۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، پڑھ! میں نے سورۃ والضحٰی اور الم نشرح پڑھی، پھر حضور ﷺ غائب ہو گئے۔ جب میری عمر ۲۱ برس کی ہوئی، میں نے قرافہ میں صبح کی نماز کی نیت باندھی تو میں نے حضور ﷺ کو اپنے سامنے دیکھا، پھر حضور ﷺ نے معانقہ فرمایا اور فرمایا، اپنے رب کی نعمت بیان کر۔"

اور معجم شیخ برہان الدین بقاعی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں:

قَالَ حَدَّثَنِيْ الْاِمَامُ اَبُو الْفَضْلِ بْنُ الْفَضْلِ النُّوَيْرِيُّ اَنَّ سَيِّدَ نُوْرَ الدِّيْنِ بْنَ يَحْيٰى وَالِدَ الشَّرِيْفِ عَفِيْفِ الدِّيْنِ لَمَّا وَرَدَ اِلَى رَوْضَةِ الشَّرِيْفَةِ قَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ

أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ سَمِعَ مَنْ كَانَ بِحَضْرَتِهِ قَائِلًا مِّنَ الْقَبْرِ يَقُوْلُ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ يَاوَلَدِيْ... (الحاوی للفتاوٰی، رسالة تنویر الحلك فی إمكان رؤية النبی و الملك، ۲:۴۴۷، بحواله معجم شیخ برهان الدین بقاعی)

"کہتے ہیں امام ابوالفضل النویری نے مجھ سے بیان کیا کہ سید نور الدین جب روضۂ اطہر پر حاضری دیتے تو کہتے السلام علیک ایھا النبی ﷺ۔ جو لوگ وہاں موجود ہوتے وہ قبر مبارک سے یہ آواز سنتے کہ وعلیک السلام یا ولدی۔"

حافظ محب الدین بن النجار نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے جس کو علامہ سیوطی نے الحاوی للفتاوٰی میں بیان فرمایا ہے کہ شیخ عبدالواحد بن عبدالملک نے بیان فرمایا کہ:

حَجَجْتُ وَزُرْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَبَيْنَا اَنَا جَالِسٌ عِنْدَ الْحُجْرَةِ إِذْ دَخَلَ الشَّيْخُ اَبُوْبَكْرِ الدِّيَارُ الْبَكْرِيُّ وَوَقَفَ بِإِزَاءِ وَجْهِ النَّبِيِّ ﷺ وَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ فَسَمِعْتُ صَوْتًا مِّنْ دَاخِلِ الْحُجْرَةِ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ يَا اَبَابَكْرٍ وَسَمِعَهُ مَنْ حَضَرَهُ...
(الحاوی للفتاوٰی، ۲:۴۴۷)

"میں نے حج کیا اور نبی ﷺ کی زیارت کی۔ جب میں روضۂ اطہر کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ابوبکر دیار بکری آئے اور مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر کہا السلام علیک یا رسول اللہ۔ میں نے روضۂ اطہر کے اندر سے یہ آواز سنی وعلیک السلام یا ابوبکر۔ اور میرے علاوہ جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے بھی یہ آواز سنی۔"

طبقاتِ شعرانی میں سید محمد شاذلیؒ کے ترجمہ میں بیان کیا:

وَكَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَثِيْرَ الرُّؤْيَا لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَكَانَ يَقُوْلُ قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ اِنَّ النَّاسَ يُكَذِّبُوْنَنِيْ فِيْ صِحَّتِهِ رُؤْيَتِيْ لَكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ كَذَّبَكَ فِيْهَا لَا يَمُوْتُ اِلَّا يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا اَوْ مَجُوْسِيًّا... (طبقات الشعرانی، ۲:۶۷)

"سید محمد شاذلیؒ کثرت سے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! لوگ میری رویت کا انکار کرتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے تیری تکذیب کی وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی ہو کر مرے گا۔"

وَكَانَ (اَیْ شَاذِلِیؒ) يَقُوْلُ رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَسَاَلْتُهُ عَنِ الْحَدِيْثِ الْمَشْهُوْرِ اُذْكُرِ اللهَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ وَفِيْ صَحِيْحِ ابْنِ حِبَّانَ اَكْثِرُوْا مِنْ ذِكْرِ اللهِ يَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ فَقَالَ ﷺ صَدَقَ ابْنُ حِبَّانَ فِيْ رِوَايَتِهِ وَصَدَقَ رَاوِيُّ اُذْكُرُوا اللهَ فَاِنِّيْ قُلْتُهُمَا مَعًا

Scanned with CamScanner

مَرَّةً قُلْتُ هٰذَا وَمَرَّةً قُلْتُ هٰذَا ... (طبقات الشعرانی، ۲:۷۰)

"سید محمد شاذلیؒ فرماتے تھے کہ میں نے نبی ﷺ کی زیارت کی اور مشہور حدیث اذکرو اللہ ۔۔۔ الخ کے متعلق پوچھا کہ ابن حبان نے اَکْثِرُوْا مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ... لکھا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابن حبان بھی سچا ہے اور پہلی حدیث کا راوی بھی سچا ہے۔ میں نے ایک دفعہ وہ الفاظ کہے اور دوسری مرتبہ دوسرے الفاظ۔"

پھر اسی صفحہ پر ہے کہ پھر رسول کریم ﷺ اور میرے مابین حجاب حائل ہو گیا اور رویت ختم ہو گئی۔

وَ کُنْتُ اِشْتَغَلْتُ بِقِرَاءَةِ جَمَاعَةٍ فِی الْفِقْهِ وَ وَقَعَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَهُمْ جِدَالٌ فِیْ اِدْحَاضِ حُجَجِ بَعْضِ الْعُلَمَاءِ فَتَرَکْتُ الْاِشْتِغَالَ بِالْفِقْهِ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْفِقْهُ مِنْ شَرِیْعَتِكَ فَقَالَ بَلٰی وَ لٰکِنْ یَّحْتَاجُ اِلٰی اَدَبٍ بَیْنَ الْاَئِمَّةِ...
(طبقاتِ شعرانی، ۲:۷۰)

"میں ایک جماعت کو فقہ پڑھانے میں مشغول تھا، میرے اور ان کے درمیان بعض علماء کے دلائل کے بارے میں اختلاف واقع ہو گیا۔ میں نے فقہ کا مشغلہ چھوڑ دیا۔ پھر میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! کیا فقہ کا علم آپ کی شریعت میں سے نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا، کیوں نہیں! مگر فقہاء کے دلائل کا رد کرنے میں ادب اور احتیاط لازم ہے۔"

قَالَ (اَیْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِیْ جَمْرَةَ) اَنَا اَجْتَمِعُ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقْظَةً...
(طبقات الشعرانی، ۱:۱۵)

"عبداللہ ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ بیداری میں زیارت اور مجلس کرتا رہتا ہوں۔"

وَمِنْهُمْ سَیِّدُنَا شَمْسُ الدِّیْنِ الْحَنَفِیُّ یَقُوْلُ رَاَیْتُ جَدِّیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ خَیْمَةٍ عَظِیْمَةٍ وَ الْاَوْلِیَاءُ یَجِیْئُوْنَ فَیُسَلِّمُوْنَ عَلَیْهِ وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ...
(ایضاً، ۲:۹۱)

"ان میں سے ایک شمس الدین حنفی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں، میں نے اپنے جدِ بزرگوار یعنی حضور اکرم ﷺ کو ایک بڑے خیمہ میں دیکھا، اور دیکھا کہ اولیاء کرام ایک ایک کر کے آتے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔"

وَمِنْهُمُ الشَّیْخُ صَدْرُ الدِّیْنِ الْبِکْرِیُّ الْمُخْلِصُ وَ لَمَّا حَجَّ وَ زَارَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَدَّ السَّلَامِ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ... (ایضاً، ۲:۱۴۸)

"ان میں جملہ شیخ مخلص ہیں، جب انہوں نے حج کیا اور روضہ اطہر پر حاضری دی تو حضور اکرم ﷺ سے سلام کا جواب سنا۔"

Scanned with CamScanner

(وَ مِنْهُمُ السَّيُوْطِيُّ) يَقُوْلُ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْيَقْظَةِ بِضْعًا وَّ سَبْعِيْنَ مَرَّةً وَ قُلْتُ لَهُ فِي مَرَّةٍ مِّنْهَا هَلْ اَنَا مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، فَقُلْتُ مِنْ غَيْرِ عَذَابٍ يَسْبِقُ، فَقَالَ: لَكَ ذٰلِكَ. قَالَ الشَّيْخُ الْعَطِيَّةُ وَ سَأَلْتُ الشَّيْخَ جَلَالَ الدِّيْنِ (السُّيُوْطِيَّ) مَرَّةً اَنْ يَّجْتَمِعَ بِالسُّلْطَانِ الْغَوْرِيِّ فِيْ ضَرُوْرَةٍ وَقَعَتْ لِيْ، فَقَالَ لِيْ يَا عَطِيَّةُ اَنَا اَجْتَمِعُ بِالنَّبِيِّ ﷺ يَقْظَةً وَ اَخْشٰى اِنْ اِجْتَمَعْتُ بِالْغَوْرِيِّ اَنْ يَّحْتَجِبَ ﷺ عَنِّيْ... (الیواقیت والجواہر،۱:۱۳۳)

"ازاں جملہ علامہ سیوطیؒ ہیں، وہ فرماتے ہیں میں نے رسول کریم ﷺ کو بیداری میں ستر سے زائد مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ کیا میں جنتی ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں! پھر میں نے عرض کیا، بغیر کسی عذاب کے؟ فرمایا، تمہارے لیے ایسا ہی ہے۔ شیخ عطیہ کہتے ہیں، میں نے علامہ سیوطیؒ سے ایک مرتبہ اپنی ایک ضرورت کے سلسلے میں سلطان غوری سے ملنے کو کہا تو علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ میں بیداری میں حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتا ہوں، اگر میں سلطان غوری کی خدمت میں جاؤں تو مجھے حضور اکرم ﷺ سے شرم آتی ہے۔"

وَ سُئِلَ الْحَافِظُ اَبُوْ عَبْدِاللهِ الذَّهَبِيُّ عَنْ قَوْلِ الشَّيْخِ مُحْيِ الدِّيْنِ ابْنِ الْعَرَبِيِّ فِيْ كِتَابِهِ الْفُصُوْصِ اَنَّهُ مَا صَنَّفَهُ اِلَّا بِاِذْنٍ مِّنَ الْحَضْرَةِ النَّبَوِيَّةِ ﷺ فَقَالَ الْحَافِظُ مَا اَظُنُّ اَنَّ مِثْلَ هٰذَا الشَّيْخِ مُحْيِ الدِّيْنِ يَكْذِبُ اَصْلًا مَّعَ اَنَّ الْحَافِظَ الذَّهَبِيَّ كَانَ مِنْ اَشَدِّ الْمُنْكِرِيْنَ عَلَى الشَّيْخِ وَ عَلٰى طَائِفَةِ الصُّوْفِيَّةِ هُوَ وَ ابْنُ تَيْمِيَّةَ...

(الیواقیت والجواہر،۱:۹)

"علامہ ذہبی سے شیخ محی الدین ابن عربی کے اس قول کے متعلق سوال کیا گیا کہ "میں نے کتاب 'فصوص' حضور اکرم ﷺ کے حکم سے تصنیف کی۔" حافظ ذہبی نے کہا میں یہ گمان نہیں کرسکتا کہ شیخ محی الدین جیسا شخص جھوٹ بولے، حالانکہ علامہ ذہبی ایسے شخص ہیں جو ابن عربی اور صوفیاء کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اور ابن تیمیہ دونوں شدید مخالفین میں سے ہیں۔"

اور 'طبقات شعرانی' میں شیخ علامہ عبداللہ بن ابی جمرہ، سید شمس الدین حنفی، الشیخ مخلص اور کئی دیگر اولیائے کرام کے حالات میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ حضرات حالتِ بیداری میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کلام روحانی کیا کرتے تھے۔

اسی طرح 'الیواقیت والجواہر' میں متعدد اولیائے کرام کے متعلق کلام بالارواح کے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ان حضرات کی ملاقات، مکالمہ اور استفادہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اب ہم ایک ایسی ہستی کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے یہاں خوب جانی پہچانی ہے، وہ ہیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

آپؒ نے فرمایا:

① سَأَلْتُهُ ﷺ سُوَالًا رُوحَانِيًّا عَنْ مَعْنٰى قَوْلِهٖ "كُنْتُ نَبِيًّا وَ آدَمُ مُنْجَدِلٌ بَيْنَ الْمَاءِ وَ الطِّيْنِ..." فَفَاضَ عَلٰى رُوْحِيْ مِنْ رُوْحِهِ الْكَرِيْمِ... الخ (تفہیمات الٰہیہ، ۲:۲۴۹)

"میں نے حضورِ اکرم سے كُنْتُ نَبِيًّا... الخ، حدیث کے معنی کے متعلق روحانی طور پر سوال کیا تو حضور ﷺ کے روح پر فتوح سے میرے دل پر القا ہوا۔۔۔ الخ۔"

② سَأَلْتُهُ ﷺ سُوَالًا رُوحَانِيًّا عَنْ مَعْنٰى قَوْلِهٖ كَانَ فِيْ عَمَاءٍ.... الخ (تفہیمات الٰہیہ، ۲:۲۴۹)

"میں نے حضور ﷺ سے 'كَانَ فِيْ عَمَاءٍ' کے متعلق روحانی طور پر سوال کیا۔۔۔ الخ"

③ سَأَلْتُهُ ﷺ سُوَالًا رُوحَانِيًّا عَنِ التَّسَبُّبِ وَ تَرْكِهَا اَيُّهُمَا اَحْسَنُ لِيْ فَفَاضَ مِنْهُ ﷺ عَلٰى رُوْحِيْ... الخ (تفہیمات الٰہیہ، ۲:۲۴۹)

"میں نے حضورِ اکرم ﷺ سے روحانی طور پر سبب کے اختیار اور ترک کے متعلق سوال کیا تو حضور ﷺ کی طرف سے میرے دل پر القا ہوا۔۔۔ الخ"

④ سَأَلْتُهُ ﷺ سُوَالًا رُوحَانِيًّا عَنْ سِرِّ تَفْضِيْلِ الشَّيْخَيْنِ عَلٰى عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ مَعَ اَنَّهٗ اَشْرَفُهُمْ نَسَبًا وَ اَقْضَاهُمْ حُكْمًا وَ اَشْجَعُهُمْ جِنَانًا وَ الصُّوْفِيَّةُ اٰخِرُهُمْ يَنْتَسِبُوْنَ اِلَيْهِ فَفَاضَ عَلٰى قَلْبِيْ مِنْهُ ﷺ... وَجْهَيْنِ وَجْهًا ظَاهِرًا وَّ وَجْهًا بَاطِنًا فَالْوَجْهُ الظَّاهِرُ اِلٰى اِقَامَةِ الْعَدْلِ فِي النَّاسِ وَ تَالِيْفِهِمْ وَ اِرْشَادِهِمْ اِلٰى ظَاهِرِ الشَّرِيْعَةِ وَهُمَا بِمَنْزِلَةِ الْجَوَارِحِ فِيْ ذٰلِكَ وَ الْوَجْهُ الْبَاطِنُ اِلٰى مَرَاتِبِ الْفَنَاءِ وَ الْبَقَاءِ وَ عُلُوْمِهِ الْمَدُوِيَّةِ كُلُّهَا اِنَّمَا تَنْبَعُ مِنَ الْوَجْهِ الظَّاهِرِ... (تفہیمات الٰہیہ، ۲:۲۵۰)

"میں نے حضورِ اکرم ﷺ سے حضرت علیؓ پر شیخین کی تفضیل کے راز کے متعلق روحانی طور پر عرض کیا کہ حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے افضل ہیں، فیصلہ کے اعتبار سے اقضی ہیں، سب سے زیادہ شجاع ہیں اور صوفی تمام کے تمام انہی کی طرف منسوب ہیں تو حضورِ اکرم ﷺ سے میرے قلب پر القا ہوا کہ میری نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہر، ایک باطن۔ ظاہری پہلو کا تعلق لوگوں میں عدل قائم کرنا، ان کی تالیف اور ان کی ہدایت کا سامان کرنا۔ اس معاملے میں وہ دونوں (شیخین) میرے دست و بازو کی حیثیت رکھتے ہیں، اور باطنی پہلو کا تعلق فنا و بقا کے مراتب وغیرہ سے ہے۔ مگر ان سارے پہلوؤں کا منبع اور ماخذ ظاہری پہلو ہے یعنی شریعت ہے۔"

سَأَلْتُهُ ﷺ سُوَالًا عَنْ شِيْعَةٍ فَاَوْحَا اِلَيَّ اَنَّ مَذْهَبَهُمْ بَاطِلٌ وَ بُطْلَانُ مَذْهَبِهِمْ يُعْرَفُ مِنْ لَفْظِ الْاِمَامِ وَ لَمَّا اَفَقْتُ عَرَفْتُ اَنَّ الْاِمَامَ عِنْدَهُمْ هُوَ الْمَعْصُوْمُ

Scanned with CamScanner

اَلْمَفْرُوْضُ الطَّاعَةُ الْمُوْحٰى اِلَيْهِ وَحْيًا بَاطِنِيًّا وَ هٰذَا هُوَ مَعْنَى النَّبِيِّ فَمَذْهَبُهُمْ يَسْتَلْزِمُ اِنْكَارَ خَتْمِ النُّبُوَّةِ... (تفہیمات الٰہیہ، ۲: ۲۵۰)

میں نے حضور اکرم ﷺ سے شیعہ کے متعلق روحانی طور پر سوال کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُن کا مذہب باطل ہے اور اس کے بطلان کی دلیل لفظ 'امام' سے ظاہر ہے۔ جب میں نے غور کیا تو یہ راز مجھ پر کھلا کہ شیعہ کے نزدیک امام 'معصوم' ہوتا ہے اور اس کی 'اطاعت فرض' ہے، اس پر باطنی وحی ہوتی ہے۔ اور یہی اوصاف نبی کے ہوتے ہیں اس لیے ان کے عقیدہ سے انکار ختم نبوت لازم آتا ہے۔"

سَاَلْتُهٗ ﷺ عَنْ هٰذِهِ الْمَذَاهِبِ وَ هٰذِهِ الطُّرُقِ اَيُّهَا اَوْلٰى عِنْدَهٗ بِالْاَخْذِ وَ اَحَبُّ فَفَاضَ عَلٰى قَلْبِيْ مِنْهُ ﷺ اَنَّ الْمَذَاهِبَ وَ الطُّرُقَ كُلَّهَا سَوَآءٌ وَ لَا فَضْلَ لِوَاحِدٍ عَلَى الْاٰخَرِ... (تفہیماتِ الٰہیہ، ۲: ۲۵۰)

"میں نے حضور اکرم ﷺ سے ان مذاہب (مذاہبِ اربعہ)، چار سلسلوں (تصوف) کے متعلق سوال کیا کہ ان میں سے افضل کون سا ہے اور آپ کو سب سے زیادہ پسند کون سا ہے؟ تو حضور ﷺ کی طرف سے مجھ پر القا ہوا کہ تمام مذاہب اور تمام سلسلے یکساں ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔"

'تفہیماتِ الٰہیہ' میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیسیوں واقعات درج ہیں جن سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ نے بے شمار علمی اور دینی مسائل میں حضور ﷺ کے روح پُرفتوح سے استفادہ کیا جس کا واحد ذریعہ کلام بالارواح تھا۔

اس کے بعد زمانی اعتبار سے اور قریب آجایئے۔

'نقشِ حیاتِ مدنی'، حصہ اول، صفحہ نمبر ۱۱۰ اور 'شیخ الاسلام'، صفحہ نمبر ۶۱:

"مواجہ شریفہ میں جبکہ آپ بیدار ہیں، آنحضرت ﷺ کی زیارت اس طرح ہوتی ہے کہ آپ میں اور ذاتِ اقدس سرورِ کائنات ﷺ میں کوئی حجاب کسی قسم کا نہیں ہے۔"

اور 'شیخ الاسلام'، صفحہ ۱۶۴ پر مولانا رشید احمد صدیقی بیان کرتے ہیں:

"حضرت مدنی نے تقریباً دو بجے شب راقم الحروف اور چوہدری محمد مصطفیٰ، انسپکٹر مدارس کو طلب فرمایا۔ دونوں فوراً حاضر ہوئے۔ ارشاد فرمایا کہ بھائی اصحابِ باطنی نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں، کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں اور جس بات کو حق سمجھتے ہیں اس کی تبلیغ پوری قوت سے کریں گے۔"

'بلغۃ الحیران' میں مولانا حسین علیؒ فرماتے ہیں:

رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَانَقَنِيْ وَ ذَهَبَ بِيْ فِيْ مُعَانَقَتِهٖ عَلَى الصِّرَاطِ (اَیْ پُلِ صراط)

رَاَيْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَتَبَ لِيْ ضَمِيْنَةً خَتَمَ عَلَيْهِ بِيَدِهِ الْمُبَارَكِ وَ كَانَ مَعَهٗ

اَکْثَرُ الْاَکَابِرِ دَعَوْتُ عِنْدَ بَیْتِ اللهِ الْحَرَامِ ثُمَّ جِئْتُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَقُلْتُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللهِ فَعَانَقَنِیْ ﷺ وَ عَلَّمَنِی اللَّطَائِفَ وَالْاَذْکَارَ وَ رَاَیْتُ اَنَّهٗ یَسْقُطُ فَاَمْسَکْتُهٗ وَ اعْتَصَمْتُهٗ عَنِ السُّقُوْطِ...وَ قَعَدْتُ عِنْدَ مَزَارِ الْاِمَامِ الرَّبَّانِیْ فَقَالَ لِیْ فِی الْمُکَاشَفَةِ بَیَانُ مَسْئَلَةِ التَّوْحِیْدِ اَعْلٰی دَرَجَةً عَنِ السُّلُوْکِ وَرَاَیْتُ الْاَنْبِیَاءَ کُلَّهُمْ مِنْ اٰدَمَ اِلٰی نَبِیِّنَا ﷺ کُلُّهُمْ یُنَادُوْنَ بِاَعْلٰی نِدَاءٍ اَنَّ مَنْ دَعَا غَیْرَ اللهِ تَعَالٰی مُعْتَقِدًا اَنَّهٗ یَعْلَمُ وَ یَسْمَعُ فَهُوَ کَافِرٌ... (بلغة الحیران،۸۰)

"میں نے حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت کی۔آپ نے مجھے بغل میں لے لیا اور پل صراط پر چل دیئے۔میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے میرے لیے ضمانت نامہ لکھا اور اپنے دستِ مبارک سے اس پر مہر لگائی اور آپ ﷺ کے ساتھ بہت سے اکابر تھے۔میں نے بیت اللہ کے پاس دعا کی، پھر حضور ﷺ نے معانقہ فرمایا اور مجھے لطائف و اذکار سکھائے، اور میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ گرنے لگے ہیں، میں نے حضور ﷺ کو تھام لیا اور گرنے سے بچالیا۔اور میں امام ربانیؒ کے مزار پر بیٹھا تھا، آپؒ نے مکاشفہ میں فرمایا،"سلوک سے بھی اونچا درجہ مسئلہ توحید کا بیان ہے۔" اور میں نے حضرت آدمؑ سے لے کر حضورِ اکرم ﷺ تک تمام انبیاء کی زیارت کی۔تمام انبیاء کرامؑ نہایت بلند آواز سے فرمارہے ہیں کہ جو شخص غیراللہ کو اس عقیدے کے ساتھ پکارے کہ وہ جانتا اور سنتا ہے، وہ کافر ہے۔"

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کلام بالارواح کی اصل، شریعت میں موجود ہے، اور حضورِ اکرم ﷺ کے صحیح جانشینوں کو حضور ﷺ کی یہ میراث بطورِ انعامِ باری ملتی رہی ہے اور ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ کلام بالارواح کی اصل نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور صحابہ کرامؓ سے اس پر عمل کرنے کی کثیر مثالیں ملتی ہیں۔طوالت کے خوف سے یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔پھر اولیاء کرام کی مقدس جماعت نے حضورِ اکرم ﷺ اور صحابہؓ کی اس سنت پر عمل کیا۔یہ سنت مدت سے قریباً مردہ ہوچکی تھی۔جس نے اس مردہ سنت کا احیاء کیا وہ تو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق سو شہیدوں کے ثواب کا مستحق ہے۔اس کے برعکس جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ درحقیقت حضور ﷺ کی سنت کا انکار کرتے ہیں، صحابہؓ کے عمل اور ان کی فضیلت کا انکار کرتے ہیں اور اولیائے کرام کی مقدس جماعت جس کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے، ان کا انکار کرتے ہیں اور ان پر طعن کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ایسے منقول واقعات کی حیثیت کیا ہے، کیا ان سے استدلال کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی تحقیق کا ماحصل قابلِ غور ہے:

Scanned with CamScanner

إِنَّ الذَّاكِرِيْنَ لِهٰذِهِ الْمَنَاقِبِ لَيْسُوْا مِمَّنْ لَّا يُعْتَمَدُ عَلَيْهِ أَوْ مِمَّنْ لَّا يَكُوْنُ حُجَّةً فِي النَّقْلِ بَلْ أَئِمَّةُ الْإِسْلَامِ وَالْأَنَامِ الَّذِيْنَ يُرْجَعُ إِلٰى أَقْوَالِهِمْ فِي الْمُهِمَّاتِ وَتُجْعَلُ أَخْبَارُهُمْ مِنَ الْقَطْعِيَّاتِ كَأَبِيْ نُعَيْمٍ وَابْنِ كَثِيْرٍ وَالسَّمْعَانِيِّ وَابْنِ حَجَرٍ الْمَكِّيِّ وَابْنِ حَجَرَ الْعَسْقَلَانِيِّ وَالسُّيُوْطِيِّ وَعَلِيِّ الْقَارِيِّ وَشَمْسِ الْعُلَمَاءِ الْكُرْدِيِّ وَالنَّوَوِيِّ وَعَبْدِ الْوَهَّابِ الشِّعْرَانِيِّ وَشَيْخِ الْإِسْلَامِ الذَّهَبِيِّ وَمَنْ يَّتَّخِذْ حَذْوَهُمْ اَقْتَدٰى هٰؤُلَاءِ قَدْ أَدْرَجُوْا فِيْ تَصَانِيْفِهِمْ مَا يُرٰى أَنَّهُ كَذِبٌ أَوِ اعْتَمَدُوْا عَلٰى نَقْلِ مَا يَنْقُلُهُ أَرْبَابُ الْكَذِبِ كَلَّا وَاللّٰهِ هُمْ أَئِمَّةٌ مُحْتَاطُوْنَ لَا يُنَاقِشُوْنَ فِيْمَا يَكْتُبُوْنَ فَإِنْ شَكَكْتَ فِيْ ذٰلِكَ فَارْجِعْ إِلَى الطَّبَقَاتِ يَنْكَشِفُ لَكَ أَحْوَالُ صِدْقِ هٰؤُلَاءِ الثِّقَاتِ وَإِنَّ وُقُوْعَ مِثْلِ هٰذَا وَإِنِ اسْتَبْعَدَ مِنَ الْعَوَامِ لٰكِنْ لَّا يَسْتَبْعِدُ ذَالِكَ مِنْ أَهْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَإِنَّهُمْ أُعْطُوْا مِنْ رَّبِّهِمْ قُوَّةٌ مَلَكِيَّةٌ وَصَلُوْا بِهَا إِلٰى هٰذِهِ الصِّفَاتِ لَا يُنْكِرُهُ إِلَّا مَنْ يُّنْكِرُ صُدُوْرَ الْكَرَامَاتِ وَخَوَارِقِ الصَّادِرَةِ وَالْجَاهِلُ الْمُتَعَسِّفُ لَا يَنْفَعُهُ شَيْءٌ وَإِنْ طَوَّلْنَا هُنَالِكَ فَإِنْ شَكَّ فِيْ ذٰلِكَ شَاكٌّ عُلِمَ قَطْعًا إِنَّهُ مُتَعَصِّبٌ خَارِجٌ عَنْ حَدِّ الْخِطَابِ لَا يَلِيْقُ مَعَهُ إِلَّا الزَّجْرَ وَالْعِتَابَ...

"یہ ناقلین حضرات ایسے نہیں کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے اور ایسے نہیں کہ ان کی نقل کو حجت قرار نہ دیا جائے بلکہ وہ ائمہ اسلام ہیں اور لوگوں کے لیے ستون ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اہم امور میں ان کے اقوال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور ان کے بیان کو قطعیت کا درجہ حاصل ہے۔ جیسے ابونعیم، ابن کثیر، سمعانی، ابن حجر مکی، ابن حجر عسقلانی، علامہ سیوطی، ملاعلی قاری، شمس العلماء کردی، نووی اور عبدالوہاب الشعرانی اور شیخ الاسلام ذہبی، اور اسی پایہ کے لوگ ہیں۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ان حضرات نے اپنی تصانیف میں جھوٹ ملا دیا ہے یا جھوٹے لوگوں کی نقل پر اعتماد کر بیٹھے ہیں؟ خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں۔ وہ امام ہیں، بڑے محتاط ہیں اور جو لکھ دیتے ہیں اس میں مناقشہ نہیں کیا جاتا اور تجھے اس میں شک ہو تو 'طبقات' کی طرف رجوع کر، تجھ پر ان معتبر حضرات کی صداقت کھل جائے گی۔ عوام سے تو ایسی باتوں کا امکان ہے لیکن ان اہل اللہ سے ان باتوں کا امکان نہیں کیونکہ انہیں اپنے رب کی طرف سے قوت ملکہ عطا ہوئی ہے اور اس قوت کی وجہ سے وہ ان صفات تک پہنچے۔ ان کا انکار صرف وہی کرتا ہے جو کرامات کے صدور کا منکر ہو، اور جہاں تک جاہل متعصب کا تعلق ہے، اسے کوئی چیز فائدہ نہیں دے سکتی۔ اگر کوئی اس امر میں شک کرے تو وہ قطعی طور پر متعصب ہے، وہ اس قابل نہیں کہ اس سے گفتگو کی جائے۔ وہ تو زجر و توبیخ کے لائق ہے۔"

Scanned with CamScanner

علامہ سیوطی نے بھی ابن ابی جمرہ کے حوالے سے اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے:

قَالَ (اَیْ اَبِیْ جَمْرَۃَ) وَالْمُنْکِرُ لِهٰذَا لَا یَخْلُوْا اِمَّا اَنْ یُّصَدِّقَ بِکَرَامَاتِ الْاَوْلِیَاءِ اَوْ یُکَذِّبَ بِهَا فَاِنْ کَانَ مِمَّنْ یُّکَذِّبُ بِهَا فَقَدْ سَقَطَ الْبَحْثُ مَعَهٗ فَاِنَّهٗ یُکَذِّبُ مَا اَثْبَتَهُ السُّنَّۃُ بِالدَّلَائِلِ الْوَاضِحَۃِ وَاِنْ کَانَ مُصَدِّقًا بِهَا فَهٰذِهٖ مِنْ ذٰلِکَ الْقَبِیْلِ لِاَنَّ الْاَوْلِیَاءَ یُکْشَفُ لَهُمْ بِخَرْقِ الْعَادَۃِ عَنْ اَشْیَاءَ فِی الْعَالَمَیْنِ الْعَلَوِیِّ وَالسُّفْلِیِّ عَدِیْدَۃً فَلَا یُنْکَرُ هٰذَا مَعَ التَّصْدِیْقِ بِذٰلِکَ ... (الحاوی للفتاوی، ۲:۴۳۹)

"ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں کہ اس کا منکر یا تو کراماتِ اولیاء کی تصدیق کرتا ہے یا تکذیب۔ اگر تکذیب کرتا ہے تو اس سے بحث فضول ہے کیونکہ وہ اس حقیقت کو جھٹلا رہا ہے جو سنت سے، واضح دلائل سے ثابت ہے۔ اور اگر وہ تصدیق کرنے والا ہے، وہ اسی قبیل سے ہے کیونکہ اولیاء پر تو عالمِ سفلی اور علوی سے خرقِ عادت کے طور پر بے شمار چیزیں منکشف ہوتی ہیں اور اس تصدیق کے ساتھ انکار جمع نہیں ہوسکتا۔"

پھر صفحہ ۱۰۲ پر فرماتے ہیں:

وَاِنِ اعْتُبِرَ مِثْلُ هٰذَا الشَّکِّ اِرْتَفَعَ الْاَمَانُ عَنْ کُتُبِ التَّوَارِیْخِ وَاَسْمَاءِ الرِّجَالِ فَاِنَّهُمْ یَکْتُبُوْنَ...

"اگر اس قسم کا شک معتبر قرار دیا جائے تو تاریخ اور اسماء رجال کی کتابوں سے اعتبار اٹھ جاتا ہے کیونکہ انہوں نے یہ واقعات لکھے ہیں۔"

اور 'تدریب الراوی' میں فرمایا:

وَمَنِ اعْتَقَدَ اَنَّ النَّاسَ اِتَّفَقُوْا عَلَی الْخَطَاءِ فِیْ ذٰلِکَ فَهُوَ اَوْلٰی بِالْخَطَاءِ مِنْهُمْ وَلَوْلَا جَوَازُ الْاِعْتِمَادِ عَلٰی ذٰلِکَ لَتَعَطَّلَ کَثِیْرٌ مِّنَ الْمَصَالِحِ الْمُتَعَلِّقَۃِ بِهَا ... (تدریب الراوی، ۱۰)

قُلْتُ مَنْ یُّکَذِّبُ الْعُلَمَاءَ الْمُتَقَدِّمِیْنَ فَهُوَ اَکْذَبُ الْکَاذِبِیْنَ ... (الرفع والتکمیل، ۶۴)

"اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ ان حضرات نے غلط باتوں پر اتفاق کر لیا ہے تو وہ خود ایک بہت بڑی غلطی کا شکار ہے۔ اگر ان حضرات پر اعتماد نہ کیا جائے تو بے شمار امور میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔"

میں کہتا ہوں جو علمائے متقدمین کی تکذیب کرتا ہے وہ بہت بڑا کذاب ہے۔

ان حضرات کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ کشفِ قبور اور کلام بالارواح کا انکار کرنا نری جہالت ہے۔ ایسا منکر اس قابل نہیں کہ علمی سطح پر اس سے کوئی گفتگو کی جائے۔

اس سلسلے میں ایک پہلو ابھی تشنہ ہے کہ یہ نعمت صرف مخصوص حضرات کو ہی کیوں عطا کی جاتی ہے؟

Scanned with CamScanner

اس کی حکمت حافظ ابن قیم نے بیان فرمائی ہے:

فَإِذَا شَاءَ اللهُ سُبْحَانَهُ أَنْ يُطْلِعَ عَلَى ذٰلِكَ بَعْضَ عَبِيدِهِ أَطْلَعَهُ وَغَيَّبَهُ عَنْ غَيْرِهِ إِذْ لَوْ أَطْلَعَ الْعِبَادُ كُلُّهُمْ لَزَالَتْ كَلِمَةُ التَّكْلِيفِ وَ الْإِيمَانُ بِالْغَيْبِ وَ لَمَا تَدَافَنَ النَّاسُ كَمَا فِي الصَّحِيحَيْنِ عَنْهُ ﷺ لَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوا لَدَعَوْتُ اللهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ مَا أَسْمَعُ... (كتاب الروح، ٨١، ٨٢)

"جب اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو (عذاب قبر) پر مطلع کرنا چاہے، کر دیتا ہے اور بعض بندوں سے پوشیدہ رکھتا ہے کیونکہ اگر تمام لوگوں کو مطلع کر دے تو مکلف ہونے اور غیب پر ایمان لانے کا سوال اٹھ جائے اور لوگ دفن کرنا چھوڑ دیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، اگر تم دفن کرنا نہ چھوڑ دیتے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ تمہیں عذابِ قبر سنا دیتا جیسا کہ میں سنتا ہوں۔"

اور فرماتے ہیں:

فَرُؤْيَةُ هٰذِهِ النَّارِ فِي الْقَبْرِ كَرُؤْيَةِ الْمَلَائِكَةِ وَ الْجِنِّ تَقَعُ أَحْيَانًا لِمَنْ شَاءَ اللهُ أَنْ يُرِيَهُ ذٰلِكَ... (كتاب الروح، ٨١، ٨٢)

"قبر میں جہنم کی آگ کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسا ملائکہ اور جنوں کو دیکھنا۔ جب اللہ چاہے کبھی کبھی دکھا دیتا ہے۔"

اور فرماتے ہیں:

وَقُدْرَةُ الرَّبِّ تَعَالَى أَوْسَعُ وَ أَعْجَبُ مِنْ ذٰلِكَ وَقَدْ أَرَانَا اللهُ مِنْ آيَاتِ قُدْرَتِهِ فِي هٰذِهِ الدَّارِ مَا هُوَ أَعْجَبُ مِنْ ذٰلِكَ بِكَثِيرٍ وَ لٰكِنَّ النُّفُوسَ مُولَعَةٌ بِالتَّكْذِيبِ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ عِلْمًا إِلَّا مَنْ وَفَّقَهُ اللهُ وَ عَصَمَهُ... فَلَيْسَ مَعَ الزَّنَادِقَةِ وَ الْمَلَاحِدَةِ إِلَّا مُجَرَّدُ تَكْذِيبِ الرَّسُولِ... (كتاب الروح، ٨١)

"اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے بھی وسیع اور عجیب ہے۔ اُس نے اس دنیا میں ہمیں اپنی قدرت کی ایسی کثیر نشانیاں دکھائی ہیں جو اس سے بھی بڑھ کر عجیب ہیں۔ لیکن انسان جن باتوں کا علم نہیں رکھتا ان کی تکذیب کی احمقانہ جرأت کر بیٹھتا ہے۔ ہاں! اللہ تعالیٰ جسے اپنے فضل سے بچالے۔ زندیق اور ملحد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس کی حکمت یوں بیان فرمائی ہے:

وَ الظَّاهِرُ أَنَّ اللهَ تَعَالَى صَرَفَ أَبْصَارَ الْعِبَادِ وَ أَسْمَاعَهُمْ عَنْ مُشَاهَدَةِ ذٰلِكَ وَ سَتَرَهُ عَنْهُمْ إِبْقَاءً عَلَيْهِمْ لِئَلَّا يَتَدَافَنُوا. وَ لَيْسَتْ لِلْجَوَارِحِ الدُّنْيَوِيَّةِ قُدْرَةٌ عَلَى إِدْرَاكِ أُمُورِ الْمَلَكُوتِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللهُ...

(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر، ٣:٢٣٥)

Scanned with CamScanner

"اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے مشاہدہ سے عام لوگوں کی نگاہ کو روک رکھا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ دفن کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اور ان مادی اعضا کو یہ قدرت ہی نہیں دی گئی کہ عالمِ ملکوت کے امور کا مشاہدہ کر سکیں۔"

فوائد:

حافظ ابن قیم کے بیان سے چند امور کی وضاحت ہوتی ہے:

۱۔ عذاب وثوابِ قبر کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو مطلع فرماتے ہیں۔

۲۔ عوام کو مطلع نہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس دار التکلیف میں ایمان بالغیب کا سوال اٹھ جاتا ہے اور لوگ ڈر کے مارے مردوں کو دفن کرنا ہی چھوڑ دیتے۔

۳۔ عذاب وثوابِ قبر کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہے، عالمِ کونی سے نہیں لہٰذا کشفِ قبور کشفِ کونی نہیں۔ جن حضرات نے اسے کشفِ کونی کہا ہے انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

۴۔ کشفِ قبور میں اموات اور عذاب وثواب کو دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے جنات اور ملائکہ کو دیکھنا کیونکہ روح اور عذاب و ثوابِ قبر بھی لطیف اور جنات وملائکہ بھی لطیف ہیں۔

۵۔ عذاب وثوابِ قبر بھی ملکوت سے ہے اور عالمِ ملکوت کی چیزیں مادی آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتیں اور باتیں مادی کانوں سے نہیں سنی جاسکتیں بلکہ اس کا ذریعہ قلب اور روح کی آنکھیں اور کان ہیں اور یہ خاص اولیاء اللہ کو عطا ہوتی ہیں اس لیے کشفِ قبور اور کلام بالارواح اللہ کے خاص بندوں کا حصہ ہے۔

۶۔ کشفِ قبور اور کشفِ ملائکہ کا انکار صرف ملحدین، زندیق اور مکذبینِ رسول ﷺ ہی کرتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں اولیائے کرام کے متعدد واقعات درج کیے گئے ہیں کہ انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ مکالمہ یا معانقہ یا مصافحہ کیا اور حضور ﷺ سے استفادہ کیا۔ اس سلسلے میں علامہ سیوطی کا ایک قول پیش کر دینا ضروری ہے جو قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے:

فَحَصَلَ مِنْ مَّجْمُوْعِ هٰذِهِ النُّقُوْلِ وَ الْاَحَادِيْثِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ حَيٌّ بِجَسَدِهٖ وَ رُوْحِهٖ وَ اَنَّهٗ يَتَصَرَّفُ وَ يَسِيْرُ حَيْثُ شَاءَ فِيْ اَيِّ اَقْطَارِ الْاَرْضِ وَ فِي الْمَلَكُوْتِ وَ هُوَ بِهَيْئَتِهِ الَّتِيْ كَانَ عَلَيْهَا قَبْلَ وَفَاتِهٖ لَمْ يَتَبَدَّلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَ اَنَّهٗ مُغَيَّبٌ عَنِ الْاَبْصَارِ كَمَا غُيِّبَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مَعَ كَوْنِهِمْ اَحْيَاءً بِاَجْسَادِهِمْ فَاِذَا اَرَادَ اللهُ رَفْعَ الْحِجَابِ عَمَّنْ اَرَادَ اِكْرَامَهٗ بِرُؤْيَتِهٖ رَاٰهُ عَلٰى هَيْئَتِهِ الَّتِيْ هُوَ عَلَيْهَا لَا مَانِعَ مِنْ ذٰلِكَ وَ لَا دَاعِيَ اِلَى التَّخْصِيْصِ بِرُؤْيَةِ الْمِثَالِ... (الحاوی للفتاویٰ، ۲: ۲۵۳)

"ان ساری احادیث اور منقولات کا ماحصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جسد اور روح کے ساتھ زندہ ہیں۔ آپ ﷺ زمین کے جس حصے میں اور عالمِ ملکوت میں جانا چاہیں، جاسکتے ہیں اور تصرف

Scanned with CamScanner

کر سکتے ہیں، جیسا زندگی میں کر سکتے تھے۔ اور آپ ﷺ اسی ہیئت میں زندہ ہیں جس ہیئت میں قبل از وفات تھے، اس میں تغیر نہیں آیا۔ اور آپ ﷺ ایسے ہی پوشیدہ ہیں جیسے ملائکہ جو کہ زندہ ہیں۔ اللہ جب چاہے اور جس شخص کے لیے چاہے، حجاب اٹھا دیتا ہے اور اُسے حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف کرتا ہے اور وہ شخص حضورِ اکرم ﷺ کو اُسی ہیئت پر دیکھتا ہے۔ اس میں کوئی مانع نہیں اور عالمِ مثال سے اس رویت کا کوئی تخصص نہیں۔" پھر فرماتے ہیں:

قُلْتُ اَظْهَرُ مِنْ هٰذَا اَنْ يُّحْمَلَ عَلَى الْحَالَةِ الَّتِيْ تَعْتَرِيْ اَرْبَابَ الْاَحْوَالِ وَ يُشَاهِدُوْنَ فِيْهَا مَا يُشَاهِدُوْنَ وَ يَسْمَعُوْنَ مَا يَسْمَعُوْنَ وَ الصَّحَابَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ هُمْ رُؤُسُ اَرْبَابِ الْاَحْوَالِ... (الحاوی للفتاوی، ۲:۲۶۰)

"میں کہتا ہوں، اس سے ظاہر ہے کہ اربابِ حال کو یہی حالت پیش آتی ہے اور اُسی حالت میں مشاہدہ کرتے ہیں اور سنتے ہیں جو سنتے ہیں، اور صحابہ کرامؓ تو اربابِ حال کے سردار ہیں۔"

علامہ سیوطیؒ کے قول سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ حضورِ اکرم ﷺ روح مع الجسد کے زندہ ہیں۔

۲۔ حضورِ اکرم ﷺ کی یہ حیات ایسی ہے کہ عوام کی نگاہ سے اوجھل ہیں، جیسے ملائکہ زندہ ہیں مگر عوام کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔

۳۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت کرانا چاہتا ہے تو وہ حجاب اٹھا دیتا ہے۔

۴۔ یہ ساری باتیں ان احادیث اور علمائے ربانی اور اولیائے کرام سے منقول واقعات کا ماحصل ہے جو اس سلسلے میں مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچی ہے۔

اس کے باوجود اس حقیقت کے انکار میں جو آوازیں اٹھ رہی ہیں یا اٹھائی جا رہی ہیں اس کا سبب کیا ہے؟

سید محمد حریری بیومی نے اپنی کتاب، کتاب الروح وماھیتھا میں بیان کیا ہے:

وَاِنَّمَا النَّاسُ تُنْكِرُ هٰذِهِ الْكَرَامَاتِ لِكَثَافَةِ حِجَابِهِمْ وَ تَلَبُّثِهِمْ بِالذُّنُوْبِ وَ تَعَلُّقِهِمْ بِالدُّنْيَا... وَمَعَ ذٰلِكَ اَنَّهُمْ يُرِيْدُوْنَ الْاِطِّلَاعَ عَلٰى اَسْرَارِ الْاَوْلِيَاءِ مَعَ اِسْتِحَالَةِ ذٰلِكَ لِمَا هُمْ فِيْهِ اَخَصُّ بِالذِّكْرِ مِنْهُمْ جُفَاةُ الْعُلَمَاءِ الْمُتَمَسِّكِيْنَ بِالْغَرَضِ الدُّنْيَوِيِّ الزَّائِلِ الْاَشْعَاءِ بِطَبْعِهِمُ الْمُتَمَسِّكِيْنَ عَلٰى اَبْوَابِ الْحُكَّامِ وَ الْاُمَرَاءِ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّرَوْنَ هٰذِهِ الْاَسْرَارَ بِنُفُوْسِهِمُ الْمُلَوَّثَةِ وَلَمَّا لَمْ يَصِلُوْا اِلٰى شَيْءٍ مِّنْهَا يُنْكِرُوْنَ الْكَرَامَاتِ وَيَحْصُرُوْهَا فِيْ عِلْمِهِمُ الظَّاهِرِيِّ الْمَحْدُوْدِ كُلُّهُمْ اَوْ غَالِبُهُمْ شَرٌّ وَّ وَبَالٌ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَ عَلَى النَّاسِ۔ فَهُمْ كَبَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَلَمَّا يَرَوْنَهُمْ يُنْكِرُوْنَ جَحْدًا اَوْ حَسَدًا وَبُغْضًا... (اَعَاذَنَا اللهُ مِنْهَا)... (کتاب الروح وماھیتھا، ۲۶۰)

"لوگ ان کرامت کا انکار بوجہ حجاب کی کثافت، گناہوں کی آلودگی اور دنیا سے تعلق کے کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ اولیاء کے اسرار سے مطلع ہو جائیں جو محال ہے۔ ان منکرین میں ان ظالم علماء کا ذکر خصوصیت سے آتا ہے جو عارضی دنیوی اغراض سے چمٹے ہوئے ہیں۔ جو حریص الطبع ہیں اور حکام اور امراُ کے دروازوں پر جبہ سائی کررہے ہیں۔ پھر چاہتے ہیں کہ ان اسرار کو دیکھ لیں حالانکہ ان کے نفوس ان آلودگیوں میں ملوث ہیں۔ جب انہیں یہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی تو کراماتِ اولیاء کا انکار کر دیتے ہیں اور اسے محدود علمِ ظاہری میں محصور سمجھتے ہیں۔ وہ سب کے سب یا غالب اکثریت، اپنی جانوں کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے شر اور وبال ہیں۔ اور وہ بنی اسرائیل کی مانند ہیں جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتے ہیں مگر جب انہیں دیکھتے ہیں تو جحود، حسد اور بغض کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں۔"
(اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے)۔

طبقات شعرانی میں حضرت شاذلیؒ کا فرمان:

رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَقَالَ لِیْ عَنْ نَفْسِهٖ لَسْتُ بِمَیِّتٍ وَ اِنَّمَا مَوْتِیْ عِبَارَةٌ عَنْ تَسَتُّرِیْ عَمَّنْ لَا یَفْقَهُ عَنِ اللهِ تَعَالٰی وَ اَمَّا مَنْ یُّفَقِّهُ عَنِ اللهِ فَهَا اَنَا اَرَاهُ وَیَرَانِیْ....
(طبقات شعرانی، ۲:۷۶)

"میں نے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، مجھے حضور ﷺ نے خود فرمایا، میں مردہ نہیں ہوں، میری موت عبارت ہے اُس شخص سے پوشیدہ ہونا جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بصیرت حاصل نہیں اور جسے اللہ تعالیٰ بصیرت دے تو میں اُسے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے دیکھتا ہے۔"

اور تفسیر جمل کے حاشیہ پر ہے:

قَالَ الْقُرْطُبِیُّ وَ الَّذِیْ یُزِیْحُ الْاِشْکَالَ مَا قَالَهٗ بَعْضُ مَشَآئِخِنَا اَنَّ الْمَوْتَ لَیْسَ بِعَدَمٍ مَحْضٍ بِالنِّسْبَةِ لِلْاَنْبِیَآءِ عَلَیْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَ الشُّهَدَآءُ فَاِنَّهُمْ مَوْجُوْدُوْنَ اَحْیَآءٌ وَّاِنْ لَّمْ نَرَهُمْ۔ (حاشیة الجمل علی الجلالین، ۶:۴۴۷)

"قرطبی (سورۂ زمر کی آیت نمبر ۶۸ "وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ" کے تحت) کہتے ہیں کہ وہ جواب جو اشکال کو زائل کر دیتا ہے وہ بات ہے جو ہمارے بعض مشائخ نے فرمائی ہے کہ موت بہ نسبت انبیاءؑ اور شہداُ کے عدمِ محض نہیں کیونکہ وہ زندہ موجود ہیں اگرچہ ہم نہیں دیکھتے۔"

اسی طرح 'کتاب الروح' میں ہے:

اَنَّ مَوْتَ الْاَنْبِیَآءِ اِنَّمَا هُوَ رَاجِعٌ اِلٰی اَنْ غَیَّبُوْا عَنَّا بِحَیْثُ لَا نُدْرِکُهُمْ وَاِنْ کَانُوْا مَوْجُوْدِیْنَ اَحْیَآءً وَذٰلِکَ کَالْحَالِ فِی الْمَلٰٓئِکَةِ فَاِنَّهُمْ اَحْیَآءٌ مَّوْجُوْدُوْنَ وَلَا نَرَاهُمْ... (کتاب الروح، ۴۳)

Scanned with CamScanner

"ابن قیم نے فرمایا، انبیاءؑ کی موت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ ہم سے غائب کیے گئے ہیں اس حیثیت سے کہ ہم انہیں نہیں دیکھتے، اگرچہ وہ موجود ہیں، زندہ ہیں اور یہ زندگی ان کی، مثل فرشتوں کے ہے۔ پس وہ فرشتے زندہ ہیں، موجود ہیں اور ہم انہیں نہیں دیکھتے۔"

اور آخر میں صاحب 'روح المعانی' کا ایک قول سن لیجیے۔ کراماتِ اولیاء کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَهٰذَا اَمْرٌ مُّقَرَّرٌ عِنْدَ السَّادَةِ الصُّوْفِيَّةِ مَشْهُوْرٌ فِيْمَا بَيْنَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ طَيِّ الْمَسَافَةِ وَاِنْكَارُ مَنْ يُّنْكِرُ كُلًّا مِّنْهُمَا عَلَيْهِمْ مُكَابَرَةٌ لَا تَصْدُرُ اِلَّا مِنْ جَاهِلٍ اَوْ مُعَانِدٍ...

(روح المعانی، ۲۳: ۱۴)

"اور یہ بات بڑے بڑے صوفیوں میں مشہور ہے اور درست ہے اور یہ مسافت کو طے کیے بغیر ہے، اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے وہ صرف اپنی بڑائی جتانے کے لیے ایسا کرتا ہے اور یہ حرکت صرف ایک جاہل اور دشمن ضدی، عنادی ہی کر سکتا ہے۔"

علماء میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

۲۶ نومبر ۱۹۷۱ء مطابق ۷ شوال المکرم، موضع چکڑالہ میں قاضی شمس الدین صاحب تشریف لے گئے۔ مسجد غازی خیل میں بعد از جمعہ انہوں نے تقریر فرمائی۔ سینکڑوں کا مجمع تھا، موافق و مخالف سب موجود تھے۔ قاضی صاحب کو حاجی عبداللہ اور مولوی سلیمان صاحب نے دعوت دی تھی۔ مولوی صاحب نے ہماری کتاب 'اسرار الحرمین' قاضی صاحب کے سامنے میز پر رکھ دی۔ غرض یہ تھی کہ قاضی صاحب اس کتاب کے خلاف تقریر فرمائیں اور ان کے عقیدۂ انکارِ کراماتِ اولیاء کو تقویت پہنچے۔ قاضی صاحب نے کتاب کی تصدیق اور تائید کرتے ہوئے ایک غلطی کی نشاندہی کی کہ کتاب میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکالمہ درج ہے جو روحانی طور پر ہوا۔ اس میں حضرت فاطمہؓ کے کلام میں ایک لفظ 'شکیت' درج ہے، مگر لفظ 'شکوت' ہونا چاہیے کیونکہ صحیح عربی لفظ یہی ہے اور حضرت فاطمہؓ تو فصحائے عرب میں سے تھیں۔ مگر قاضی صاحب نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کو کلام کے سمجھنے میں غلطی ہوئی، یا کاتب سے سہواً ہوا۔ اس کے علاوہ باقی کتاب بالکل صحیح ہے، اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں مولانا حسین علی صاحبؒ کے پاس موجود تھا۔ محمد طاہر پنج پیری اور ایک اور شخص بھی موجود تھا کہ آپ کا لانگری نور محمد کشمیری روتا روتا آیا، ہاتھ میں ایک خط تھا۔ مولانا نے وجہ پوچھی تو کہا کہ حضرت میری والدہ فوت ہو گئی ہے۔ مولانا نے یہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند رکھیں اور فرمایا کہ تمہیں کسی نے دھوکا دیا ہے، تمہاری ماں زندہ ہے اور اس وقت اپنے گھر کے صحن میں جھاڑو دے رہی ہے، لیکن دیکھنا یہ بات میری زندگی میں کسی کو نہ بتانا۔ پھر نور محمد گھر گیا تو واقعہ ہو بہو ایسا ہی پایا جیسے مولانا نے اپنے کشف سے فرمایا تھا۔

Scanned with CamScanner

قاضی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ میں ۲۴ سال تک مولانا حسین علیؒ کی خدمت میں اس فن کی تحصیل کے لیے حاضر ہوتا رہا مگر میری قسمت میں نہیں تھا، مجھے حاصل نہ ہوسکا۔ مگر اپنی محرومی کی وجہ سے اصل شے کا انکار کردینا کہاں کی دانائی ہے؟ صوفیاء کے منازلِ سلوک کے متعلق کتابوں کے حوالے پیش کروں مگر وقت کی قلت مانع ہے، البتہ صوفیاء کو اپنے منازل کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کو نقصان ہوتا ہے۔ اس پر مولوی محمد سلیمان صاحب نے کہا کہ صوفیاء تو ظاہر کردیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ بعض ایسے منازل ہیں کہ سالک ان مقامات سے آگے ترقی کرجائے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

کلام بالا رواح

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ کلام بالا روح یا کشفِ قبور کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نہیں۔ اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے علمی اور نقلی دلائل سے رہنمائی حاصل کی جائے تو اقرار کیے بغیر بات نہیں بنتی (جو دلائل قرآن وسنت یا پہلی آسمانی کتابوں سے نقل ہوکر آتے ہیں انہیں نقلی اور علمی دلائل کہا جاتا ہے)۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اہل اللہ پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے جو نبی کریم ﷺ کے صحیح جانشینوں کو میراثِ نبوی ﷺ کے طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی اصل شریعت میں ہے یا نہیں کہ آیا ارواح سے کلام ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یعنی کیا شریعت میں اس کی کوئی بنیاد ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ متقدمین اور سلف صالحین سے اس کی کوئی دلیل ملتی ہے؟ اور پھر یہ کہ کیا متقدمین اور سلف صالحین میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ ایسی حقیقت ہے جس کو رد نہیں کیا جاسکتا؟

جب مذکورہ بالا تینوں صورتیں موجود ہوں اور تینوں طرح کے علمی اور نقلی دلائل مل جائیں کہ شریعت میں اس کی اصل بھی موجود ہو اور سلف صالحین سے اس کا ثبوت بھی ملے تو پھر اس کا انکار محض ضد اور جہالت ہے۔ یہ واقعہ کہ شب معراج اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ کو بیت المقدس میں جمع فرمایا جنھوں نے نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں دو رکعت نماز ادا فرمائی، روحوں سے کلام کی بنیاد بنتا ہے۔ اس بارے کہ جب انبیاءؑ بیت المقدس میں جمع ہوئے اور ہر ایک نے جس انداز میں اللہ کی حمد وثنا بیان فرمائی، تفسیر ابن کثیر سے ایک عبارت نقل کی گئی ہے کہ "حضرت ابراہیمؑ نے کہا، تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے خلیل بنایا ہے اور مجھے عظیم ملک عطا کیا اور مجھے اطاعت شعار بندہ بنایا اور مجھے آگ میں سے نکالا اور آگ کو میرے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔ پھر موسیٰؑ نے اپنے رب کی ثنا بیان کی اور کہا تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ سے خوب کلام کیا اور میرے ہاتھ سے فرعون کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور میری امت سے ایسے لوگ پیدا کیے جو حق وہدایت پر قائم رہے اور رہنمائی کرتے رہے۔ پھر اسی طرح حضرت داؤدؑ نے کہا کہ تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے سلطنت عطا کی، مجھے زبور کی تعلیم دی، میرے لیے لوہے کو نرم کردیا اور میرے لیے پہاڑوں کو مسخر کردیا کہ میرے ساتھ مل کر پہاڑ اور پرندے تسبیح پڑھتے ہیں"۔

Scanned with CamScanner

انبیاءؑ نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو دنیوی زندگی میں ان پر ہوئے تھے۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر انسان پر دنیوی زندگی میں جو حالات گزرتے ہیں، برزخ میں وہ سب باتیں یاد ہوتی ہیں۔ اور یہ کہ زندہ انسان ارواح کا کلام سن سکتا ہے اور برزخ والوں کو دیکھ سکتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے انبیاءؑ کے ارواح کا کلام سنا۔ اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ دلائل تو اس طبقے کے لیے ہیں جن کا عقیدہ اور سمجھ یہ ہے کہ انبیاءؑ کی روحیں تشریف لائی تھیں جو متشکل ہو کر نظر آ رہی تھیں (مسلمانوں میں ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو عہدِ جدید کی پیداوار ہے اور جو کہتے ہیں کہ انبیاءؑ کے جسم نہیں تھے، صرف ارواح تشریف لائی تھیں)۔ لیکن اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں ہمارا عقیدہ یہ ہے اور حق بھی یہی ہے کہ جس طرح دنیاوی زندگی میں نبی حیات ہوتا ہے، اسی طرح زندہ انبیاءؑ روح مع الاجساد وہاں تشریف لائے تھے۔ ہمارے عقیدے کے حق میں قرآن وسنت سے بھی قوی دلائل میسر ہیں جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب 'سماع موتیٰ' میں بیان کر دی ہے۔ 'سماع موتیٰ' حضرتؒ کی دوسری تصنیف ہے کہ (مردے سے کس طرح کلام ہو سکتی ہے اور کیا مردہ سن سکتا ہے یا نہیں؟) اسی طرح شبِ معراج حضورِ اکرم ﷺ کی انبیائے کرام کے ارواح سے آسمانوں پر یکے بعد دیگرے جو ملاقات ہوئی اس کی تفصیل صحیح مسلم شریف میں موجود ہے اور خوفِ طوالت صرف حوالہ پر اکتفا کیے دیتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ارواح سے ملاقات بھی ہوئی اور کلام بھی ہوا۔ نبی پاک ﷺ کے ساتھ شبِ معراج میں جو واقعات پیش آئے وہ واقعات اعتبار کے لحاظ سے کلام بالارواح کی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب 'نسیم الریاض' سے حضورِ اکرم ﷺ کا وہ ارشاد بھی ملاحظہ ہو جو دوسری حیثیت سے اصل قرار دی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "میں دیکھتا ہوں جو چیزیں تم نہیں دیکھتے اور اس کلام کو سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے" اور ان دونوں جملوں میں 'ما' موصولہ ہے یعنی اس سے مراد وہ باتیں ہیں جو ظاہری آنکھوں، کانوں وغیرہ سے سنی یا دیکھی نہیں جا سکتیں، جنہیں 'مغیبات' یعنی غائب چیزیں کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس پر مطلع فرمایا جو دوسرے لوگ نہیں دیکھتے۔ جیسے ملائکہ کو دیکھنا، جنت اور دوزخ یا عذابِ قبر کو دیکھنا، برزخ کے حالات اور لوگوں کی آوازیں جو قبروں میں عذاب سے دوچار ہیں۔ اس حدیث اور اس کی شرح سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام بالارواح کی شریعت میں اصل موجود ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عذابِ قبر مغیبات میں سے ہے اور مغیبات پر ایمان لانا فرض ہے۔ اس لیے ایک طبقے کا یہ کہنا کہ قبر کا عذاب تکوینی اور کونی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے، یہ درست نہیں ہے (کونی چیزیں وہ ہوتی ہیں جو کائنات میں سامنے نظر آتی ہیں اور جن کا وجود ظاہر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے)۔

بحث کی دوسری شق کے متعلق چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ 'الحاوی للفتاویٰ' میں ہے کہ نبی کریم ﷺ اس دنیوی زندگی میں انبیاءؑ کو دیکھتے اور ان سے ملاقات کرتے تھے، انہوں نے عیسیٰؑ کو طواف میں دیکھا اور یہ صحیح ہے کہ آپ ﷺ موسیٰؑ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اور یہ صحیح ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ انبیاءؑ زندہ ہیں، نماز پڑھتے ہیں۔ اسی طرح جب عیسیٰؑ زمین پر واپس آئیں گے، انبیاءؑ کو دیکھیں گے اور ان سے ملاقات کریں گے، ان میں سے ایک حضور ﷺ ہیں اور عیسیٰؑ حضور ﷺ سے احکامِ شریعت حاصل کریں گے جن احکام کے وہ محتاج ہوں گے۔"

Scanned with CamScanner

الحاوی للفتاویٰ میں یہ بھی ہے کہ جب عیسیٰؑ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو جن مسائل کی تشریحات یا تصحیح کرنا چاہیں گے ان کے بارے حضور ﷺ سے تصدیق فرمائیں گے کہ یہ آپ ﷺ کا حکم ہے یا لوگوں کی گھڑی ہوئی بات ہے (چونکہ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے عہد کے آنے تک مسائل میں کتنا شور بپا ہو چکا ہے اور کتنے مختلف عقیدے پیدا ہو گئے ہیں۔ اللہ جانے حضرت عیسیٰؑ کے آنے میں کتنا وقت ہے اور ان کے آنے تک کتنی اور خرابیاں پیدا ہو چکی ہوں گی) جن چیزوں کو احکامِ شریعت کے نام پر رواج دیا جائے گا، ان کے بارے وہ آپ ﷺ سے استفسار فرمائیں گے۔ تو وہ کلام کرنا یا استفسار فرمانا برزخ میں ہوگا چونکہ حضور ﷺ تو عالمِ برزخ میں جلوہ افروز ہیں۔

اب جو قابلِ غور بات ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی یہ میراث سب مسلمانوں کو کیوں حاصل نہیں ہوتی؟ یہ کمال چیدہ چیدہ لوگوں کو کیوں حاصل ہوتا ہے؟ وہ لوگ جنہیں برزخ میں کلام، حضور ﷺ کی زیارت، ارواح سے کلام یا قبر کے عذاب وثواب کا مشاہدہ ہوا ہو، ایسے لوگوں کو جب تاریخ سے چھانٹ کر جمع کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ سارے لوگ صوفی تھے اور سارے اہلِ سلوک تھے۔ معلوم ہوا کہ اس دولت کے ملنے کا واحد ذریعہ تصوف وسلوک ہے۔ اس علم وفن کی فضیلت کے متعلق علامہ وزیر فرماتے ہیں 'الروض الباسم' میں ہے کہ" یہ (علمِ سلوک) بہت گہرا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ مکاشفہ کی کشتی کے بغیر اس سمندر میں سفر کرنا درست نہیں، اور یہ ایک سیاہ رات ہے جس میں مشاہدہ کے چاند کے طلوع ہونے کے بغیر سفر کرنا درست نہیں۔ یہ علوم ضروری اور بدیہی (واضح) ہیں، تجربہ سے تواتر کے ساتھ اصحابِ ریاضت سے ثابت ہیں جنہوں نے تخلیہ کو لازم سمجھا اور وہ بیداری میں وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو دوسرے لوگ خواب میں دیکھتے ہیں اور وہ مخاطب کو دیکھے بغیر ان کا کلام سن لیتے ہیں۔"

اب ان حضرات کے واقعات نقل کیے جاتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی تھی۔ 'الحاوی للفتاویٰ' میں ہے؛ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ظہر سے پہلے حضور ﷺ کی زیارت کی، حضور ﷺ نے فرمایا، بیٹا تم بات کیوں نہیں کرتے؟ عرض کیا، ابا جان! میں عجمی ہوں، عرب سے باہر کا رہنے والا ہوں، میں فصحائے بغداد کے مقابلے میں کس طرح کلام کر سکتا ہوں، چونکہ بغداد اہلِ علم کا مرکز ہے، بڑے بڑے فصیح اور عالم لوگ یہاں موجود ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا، 'اپنا منہ کھول'، میں نے منہ کھولا، حضور ﷺ نے سات مرتبہ میرے منہ میں لعابِ دہن ڈالا اور فرمایا کہ لوگوں کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعے اللہ کی طرف دعوت دے۔ پھر میں نے ظہر کی نماز پڑھی اور بیٹھ گیا۔ ایک ہجوم میرے گرد جمع ہو گیا۔ پھر میں نے حضرت علیؓ کو اپنے پاس کھڑا ہوا دیکھا، انہوں نے بھی وہی کچھ فرمایا جو حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔ یہی واقعہ اعلیٰ حضرتؒ نے 'الحاوی للفتاویٰ' سے لیا ہے۔ جہاں یہ واقعہ امام یافعیؒ کی کتاب 'کفایۃ المعتقد' کے حوالے سے درج ہے۔

'الحاوی للفتاویٰ' میں ہے، شیخ خلیفہ بن موسیٰ کے حالات میں لکھا ہے کہ" وہ خواب اور بیداری میں کثرت سے حضور ﷺ کی زیارت کیا کرتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ان کے اکثر کام حضور اکرم ﷺ کی تلقی سے ہوتے تھے یعنی ان کے اکثر کام ذاتی نہیں ہوتے تھے بلکہ جو حضور اکرم ﷺ کی طرف سے ان پر القا ہوتا تھا تو بات آگے لوگوں کو سناتے تھے، تلقی خواب میں

Scanned with CamScanner

ہو یا بیداری میں۔ اور انہوں نے حضور ﷺ کو ایک رات میں سترہ مرتبہ دیکھا۔" علامہ الکمال الادفوی نے اپنی کتاب 'الطالع السعید' میں الترجمہ 'علامہ صفی ابی عبداللہ محمد بن یحییٰ الاسوانی' میں فرمایا: وہ بہت صالح مشہور تھے۔ ابن دقیق العید، ابن النعمان اور قطب عسقلانی نے ان کے مکاشفات اور کرامات کا ذکر کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کی زیارت کی، آپ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے رہے اور مجلس کا اعزاز حاصل کیا۔

علامہ سیوطیؒ نے الحاوی للفتاوئ میں شیخ عبدالغفار بن نوح کی کتاب 'الوحید' کے حوالہ سے فرمایا، شیخ ابی العباس العرفی کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوتی تھی۔ جب آپ سلام کہتے تو حضور ﷺ جواب دیتے تھے اور جب حضور ﷺ سے گفتگو کرتے تو حضور ﷺ جواب دیتے تھے اور ابن فارسؒ کی کتاب 'المنح الالٰہیہ فی مناقب السادۃ الوفائیہ' میں ابن فارسؒ کہتے ہیں جب میں پانچ برس کا تھا تو شیخ یعقوبؒ سے قرآنِ کریم پڑھتا تھا ایک روز میں ان کے پاس آیا تو میں نے نبی کریم ﷺ کو عین بیداری میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے ایک سفید سوتی قمیص پہن رکھی تھی، پھر میں نے دیکھا کہ وہ قمیص میں نے پہن رکھی ہے۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، پڑھ! میں نے سورۃ 'والضحیٰ' اور 'الم نشرح' پڑھی، پھر حضور ﷺ غائب ہو گئے۔ جب میری عمر ۲۱ برس کی ہوئی، میں نے قرافہ میں صبح کی نماز کی نیت باندھی تو میں نے حضور اکرم ﷺ کو اپنے سامنے دیکھا۔ پھر حضور ﷺ نے معانقہ فرمایا اور فرمایا، اپنے رب کی نعمت بیان کر۔ 'معجم شیخ برہان الدین بقاعی' میں بیان ہوا ہے...... قال حدثنی الامام ابوالفضل بن ابی الفضل... الخ۔ کہتے ہیں کہ امام ابوالفضل النویری نے مجھ سے بیان کیا کہ سید نورالدینؒ جب روضۂ اطہر پر حاضر ہوتے اور سلام کہتے تو حضور ﷺ جواب ارشاد فرماتے اور جتنے لوگ روضۂ اطہر پر موجود ہوتے سب سنتے تھے۔ حافظ محب الدین بن النجار نے اپنی تاریخ میں نقل کیا کہ علامہ سیوطی نے 'الحاوی للفتاوئ' کی جلد ۲، صفحہ ۲۴۷ پر بیان فرمایا ہے کہ عبدالواحد بن عبدالمالک نے بیان فرمایا، میں نے حج کیا اور نبی کریم ﷺ کی زیارت کی، جب میں روضۂ اطہر کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو ابوبکر دیار بکریؒ آئے اور مواجہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر کہا اسلام علیک یا رسول اللہ ﷺ۔ میں نے روضۂ اطہر کے اندر سے یہ آواز سنی، وعلیک السلام...... الخ۔ اور میرے علاوہ جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے بھی یہ آواز سنی۔ طبقات الشعرانی میں سید محمد شاذلیؒ کے ترجمہ میں بیان کیا...... سید محمد شاذلیؒ کثرت سے حضور ﷺ کی زیارت کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور ﷺ جو میں آپ کی زیارت کرتا ہوں اور یہ بات لوگوں سے کہتا ہوں تو لوگ انکار کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے تیری بات کا انکار کیا تو وہ یہودی یا نصرانی یا مجوسی ہو کر مرے گا۔

طبقات شعرانی میں ہے:

"سید محمد شاذلیؒ فرماتے تھے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی زیارت کی اور مشہور حدیث اُذْکُرِ اللّٰہَ...... الخ، کے متعلق پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ ان دونوں میں سے کون سی درست ہے (چونکہ وہ حدیث دو طرح کے الفاظ میں ملتی ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا، دونوں درست ہیں۔ میں نے ایک دفعہ وہ الفاظ کہے اور دوسری مرتبہ دوسرے الفاظ، پھر اسی صفحہ پر ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ اور میرے درمیان حجاب حائل ہو گیا اور رویت ختم ہو گئی۔"

Scanned with CamScanner

وَ کُنتُ اِشتَغَلتُ بِقِرَآءَةِ جَمَاعَةٍ فِي الفِقهِ وَوَقَعَ بَینِی وَبَینَهُم جِدَالٌ فِی اِدحَاضِ حُجَجِ بَعضِ العُلَمَآءِ فَتَرَکتُ الاِشتِغَالَ بِالفِقهِ فَقُلتُ: یَارَسُولَ اللهِ ﷺ اَلفِقهُ مِن شَرِیعَتِکَ؟ فَقَالَ: بَلٰی وَلٰکِن یُحتَاجُ اِلٰی اٰدَبٍ بَینَ الاَئِمَّةِ...

علامہ شاذلیؒ فرماتے ہیں، میں ایک جماعت کو فقہ پڑھانے میں مشغول تھا، میرے اور ان کے درمیان علماء کے دلائل کے بارے میں اختلاف واقع ہوگیا میں نے فقہ کا مشغلہ چھوڑ دیا پھر میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور ﷺ کیا فقہ کا علم آپ کی شریعت میں سے نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا، "کیوں نہیں! فقہ شریعت میں سے ہے اور شریعت ہی کا حصہ ہے لیکن فقہا کے دلائل کے رد کرنے میں ادب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔"

فقہ میں چار آئمہ ہیں، اگر آپ کسی ایک امام کی دلیل پر قائم ہوتے ہیں تو دوسرے کی دلیل کو رد کرنے میں ان کا ادب لازم ہے چونکہ چاروں برحق ہیں۔ ان میں فروعی اور جزوی اختلاف ہیں، اصل میں کوئی اختلاف نہیں۔ آئمہ میں ترجیح کا فرق ہے، حق اور باطل کا نہیں۔ یعنی جو ایک فقہ کی پیروی کرتا ہے وہ اس ایک کو ترجیح دیتا ہے، یہ نہیں کہتا کہ دوسرا امام غلط ہے۔ مثلاً اگر ہم امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہتے کہ باقی تین امام (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کی رائے معاذ اللہ! غلط ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ باقی آئمہ بھی حق پر ہیں مگر امام ابوحنیفہؒ کی رائے ان سے زیادہ بہتر اور حضور ﷺ کی رائے کے زیادہ قریب ہے۔ 'طبقات شعرانی' صفحہ ۱۶ پر عبداللہ ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیداری میں زیارت اور مجلس کرتا ہوں۔ 'طبقات' میں بھی ہے کہ ان میں سے ایک شمس الدین حنفی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جدِ بزرگوار یعنی حضور اکرم ﷺ کو ایک بڑے خیمہ میں دیکھا اور دیکھا کہ اولیاء اللہ ایک ایک کر کے آتے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔ اسی طرح 'طبقات' جلد دوم کے صفحہ ۱۴۸ پر ہے کہ ازانجملہ شیخ مخلص ہیں۔ جب انہوں نے حج کیا اور روضۂ اطہر ﷺ پر حاضری دی تو حضور ﷺ سے سلام کا جواب سنا۔ 'الیواقیت الجواہر' میں ہے کہ ازاں جملہ علامہ سیوطی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیداری میں ستر سے زائد مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کیا میں جنتی ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا، ہاں! پھر میں نے عرض کیا، بغیر کسی عذاب کے؟ (کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے کچھ ایسے جرائم ہوں گے جن کے لیے انہیں جہنم جانا پڑے گا۔ وہاں سے نجات ہوگی پھر جنت میں جائیں گے) تو حضور ﷺ نے فرمایا، تمہارے لیے ایسا ہی ہے۔ شیخ عطیہ کہتے ہیں، میں نے علامہ سیوطیؒ سے ایک مرتبہ اپنی ضرورت کے سلسلے میں سلطان غوری سے ملنے کو کہا۔ چونکہ انہیں کوئی کام تھا تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ سلطان غوری سے مل کر میری سفارش کر دیں تا کہ میرا یہ کام ہو جائے۔ علامہ سیوطی نے فرمایا کہ جب مجھے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے تو میں کسی دنیوی کام کے لیے بادشاہ کے پاس کیوں جاؤں؟ میری تو دنیا و آخرت یہیں ہے۔ مجھے حضور ﷺ سے شرم آتی ہے کہ حضور ﷺ فرمائیں گے کہ میرے ہوتے ہوئے تم بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے گئے۔ 'الیواقیت والجواہر' میں ہے کہ شیخ ابن عربی نے ایک کتاب 'فصوص الحکم' لکھی تھی اور نبی کریم ﷺ سے اس کی تصدیق

کروائی تھی۔ تو ابن عربی کے اس قول کے متعلق علامہ ذہبی سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ ابن عربی جیسا شخص جھوٹ بولے گا۔ انہوں نے سچ کہا ہے۔ علامہ ذہبی ویسے تو صوفیوں اور ابن عربی سے اختلاف رکھتے تھے مگر انہوں نے ابن عربی کے قول کو جھوٹا گمان نہ کیا۔ ان کے ساتھ ابن تیمیہ بھی شدید مخالفین میں ہیں۔ طبقاتِ شعرانی میں شیخ علامہ عبداللہ بن ابی جمرہ، سید شمس الدین حنفی، الشیخ مخلص اور کئی دیگر اولیائے کرام کے حالات میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ حضرات حالتِ بیداری میں حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ کلامِ روحانی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح 'الیواقیت والجواہر' میں متعدد اولیاء کرام کے متعلق کلام بالا رواح کے سلسلے میں حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ ان حضرات کی ملاقات، مکالمہ اور استفادہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اب ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا جاتا ہے جو اپنے یہاں خوب جانی پہچانی جاتی ہے۔ وہ ہیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ 'تفہیماتِ الٰہیہ' میں فرماتے ہیں، میں نے حضور ﷺ سے كُنْتُ نَبِيًّا وَادَمُ مُنْجَدِلٌ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ... اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ حدیث کے معنی کے متعلق سوال کیا تو حضور ﷺ کے روح پُرفتوح سے میرے دل پر القاہوا۔ میں نے حضور ﷺ سے 'كَانَ فِيْ عَمَاءٍ' کے متعلق روحانی سوال کیا۔ میں نے حضور ﷺ سے روحانی طور پر سبب کے اختیار اور ترک کے متعلق سوال کیا تو مجھے ان سوالوں کے جواب ملے اور حضور ﷺ کی طرف سے میرے دل پر القاہوا۔ پھر میں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے تین اوصاف گنے، پہلا یہ کہ وہ نسب کے اعتبار سے افضل ہیں چونکہ نسب میں وہ آپ ﷺ کے قریب تر ہیں۔ دوسرا یہ کہ شرعی اعتبار سے وہ ان میں سب سے اعلیٰ اور اچھے فیصلے دیتے تھے، پھر وہ بڑے بہادر اور شجاع بھی ہیں اور تیسرا یہ کہ تمام سلاسلِ ہائے تصوف انہی کی طرف منسوب ہیں اور آپ ﷺ کا فیض ان کی ذات سے آگے بڑھا۔ تو میں نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ ان اوصاف کی بنا پر کیوں نہ حضرت علیؓ کو شیخین پر فضیلت دی جائے؟ (سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور فاروقِ اعظمؓ کو شیخین کہتے ہیں) تو حضور ﷺ سے میرے قلب پر القاہوا کہ میری نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ ظاہری پہلو یعنی دین کے نفاذ اور اس کو پھیلانے میں ابوبکر صدیقؓ اور فاروقِ اعظمؓ میرے دست وبازو کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی ان کو استعمال کر کے اللہ کریم نے ایک جہان میں دین پھیلایا اور باطنی پہلو کا جہاں تک تعلق ہے اور یہ باطنی کمالات جن میں فنا بقا، یا سلوک وتصوف ہے، جن کے بارے کہتے ہو کہ حضرت علیؓ سے فیض آگے بڑھا تو اس سب کی اصل بھی شریعت ہے۔ شریعت پر ہی عمل کر کے وہ نصیب ہوتا ہے اور شریعت کے نفاذ میں ابوبکرؓ اور عمرؓ میرے دست وبازو ہیں۔ ان کے ذریعے دین کا نفاذ ایک عالم پر کیا گیا۔

یہاں میں ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ یہ بات کہ سارے سلاسلِ تصوف حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے شروع ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو برکات نبی کریم ﷺ سے تقسیم ہوئیں وہ باطنی اور ظاہری دونوں پہلوؤں سے مکمل طور پر حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے حاصل کیں۔ ان سے سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے بھی دونوں پہلو جامع حیثیت سے حاصل کیے۔ حضرت عثمانؓ کو بھی ظاہری، باطنی پہلو اسی طرح نصیب ہوئے۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی باری آئی اور

آپ کی خلافت آئی تو باطنی اور قلبی طور پر آپؓ نے کمالات حاصل کیے لیکن ظاہری استحکام جو عہدِ عثمانی کے آخری حصے میں بگڑ چکا تھا وہ حضرت علیؓ سے بھی قابو نہ آسکا۔ ظاہر کی بات ثانوی درجے میں چلی گئی اور باطنی کمالات حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصریؒ نے حاصل کیے، پھر ان سے دیگر سلاسلِ تصوف بن گئے۔ اس لیے سارے سلاسلِ تصوف جا کر حضرت علیؓ پر رک جاتے ہیں سوائے نسبتِ اویسیہ کے، کیونکہ یہ براہِ راست سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے چلتی ہے۔

'تفہیماتِ الٰہیہ' میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے شیعہ کے متعلق جو کہ ایک بہت بڑا فرقہ ہے، سوال کیا کہ یہ حق پر ہے یا نہیں؟ تو حضور ﷺ نے مجھے جواب دیا کہ ان کا مذہب باطل ہے اور مزید فرمایا کہ ان کا جو امام کا عقیدہ ہے وہ ہی ان کے بطلان کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان پر میں نے جب غور کیا تو مجھے یہ سمجھ آئی کہ یہ تو امام کو معصوم سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہ امام پر باطنی وحی نازل ہوتی ہے اور ساتھ ہی ان کا عقیدہ ہے کہ امام کی اطاعت فرض ہے۔ یہ سارے اوصاف تو نبی کریم ﷺ کے ہیں تو گویا یہ بارہ اماموں کو بارہ نبی بعد میں مانتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے سے ختمِ نبوت کا انکار ہوتا ہے لہٰذا یہ عقیدہ ان کے بطلان کے لیے کافی ہے۔

'تفہیماتِ الٰہیہ' میں ہے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ فقہ کے مذاہب اور تصوف کے سلاسل میں کون سے افضل ہیں اور آپ ﷺ کو سب سے زیادہ کون سا پسند ہے؟ تو حضور ﷺ کی طرف سے مجھ پر القا ہوا کہ تمام مذاہب اور سلسلے یکساں ہیں، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ اور ہر ایک کا ذاتی عمل ہے جو جتنا جس پر عمل کرتا ہے اتنا وہ پسندیدہ ہے۔ 'تفہیماتِ الٰہیہ' میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیسیوں واقعات درج ہیں جن سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ نے بے شمار علمی اور دینی مسائل میں حضور ﷺ کی روحِ پرفتوح سے استفادہ کیا۔ جس کا واحد ذریعہ کلام بالا رواح تھا۔

اس کے بعد زمانی اعتبار سے اور قریب آجائیے۔ 'نقشِ حیاتِ مدنی' صفحہ ۱۱۰ اور 'شیخ الاسلام' صفحہ ۶۱ میں ہے کہ آپ مواجہ شریف میں ہیں اور بیدار ہیں۔ آپ کو آنحضرت ﷺ کی زیارت اس طرح ہوتی ہے کہ آپ میں اور ذاتِ اقدس سرورِ کائنات ﷺ میں کسی قسم کا کوئی حجاب نہیں ہے۔ اور 'شیخ الاسلام' صفحہ ۱۶۴ پر مولانا رشید احمد صدیقی بیان کرتے ہیں کہ حضرت مدنی نے تقریباً دو بجے رات راقم الحروف اور چودھری محمد مصطفیٰ 'انسپکٹر مدارس' کو طلب کیا اور ارشاد فرمایا کہ اصحابِ باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا ہے کہ اہل اللہ کی جو باطنی مجلس بارگاہِ ﷺ میں ہوتی ہے جس میں حقیقتاً فیصلے ہوتے اور دنیا پر نافذ ہوتے ہیں، اس میں فیصلہ ہو گیا ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو گا۔ کیونکہ یہ لوگ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے اور ان کا مسلک صرف یہ تھا کہ انگریزوں نے برصغیر مسلمانوں سے لیا تھا اس لیے انہیں چاہیے کہ مسلمانوں کو واپس کریں اور چلے جائیں اور یہ ملک ایسا ہی رہے۔ بعد میں جو ہو گا ہم سنبھال لیں گے یہ تقسیم نہیں ہونا چاہیے۔ تو حضرت مدنیؒ نے مزید ارشاد فرمایا کہ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب اور بنگال کا بھی کچھ حصہ تقسیم ہو جائے گا۔ (واقعی پنجاب کا بھی اور بنگال کا بھی کچھ حصہ ہندوستان میں چلا گیا)۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں، کیا کریں؟ آپؒ نے فرمایا کہ ظاہراً تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تقسیم نہیں ہو گی لیکن ہمیں پتا ہے کہ تقسیم تو ہو گی ہم ظاہری شریعت کے مکلف ہیں لہٰذا ہم اس پر زور لگاتے

Scanned with CamScanner

رہیں گے کہ تقسیم نہ ہو۔'بلغتہ الحیران' صفحہ ۸ پر مولانا حسن علی دیوبندی مکتبۂ فکر کے علماء میں سے ایک بہت بڑے استاد تھے۔ بڑے مشہور اساتذہ میں سے تھے، کاشتکار تھے، زمینداری کرتے تھے اور مدارس سے فارغ التحصیل علماء ان کے پاس علمی تکمیل کے لیے جاتے تھے اور مختلف موضوعات پر پڑھتے تھے۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ فصل تیار ہو جاتی، گندم کی کٹائی خود کر رہے ہوتے تھے اور گرداگرد کھیت کے منڈیروں پر علماء بیٹھے، اپنا اپنا سبق پڑھ رہے ہوتے تھے۔ جہاں کوئی غلطی کرتا وہاں ٹوک دیتے تھے کہ یہ اس طرح نہیں اس طرح ہے اور خود گندم کاٹ رہے ہوتے تھے۔ اس پائے کے عالم تھے اور کچھ اس طرح کی ان کی زندگی تھی۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ تصوف، کلام بالا رواح یا کشفِ قبور کا انکار کرتا ہے۔ ان کی اکثریت اپنے آپ کو ان سے متعلق ہونے کی مدعی بھی ہے۔ تو مولانا اپنی کتاب 'بلغتہ الحیر ان' میں فرماتے ہیں، میں نے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، آپ ﷺ نے مجھے بغل میں لے لیا اور پل صراط پر چل دیئے اور میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے میرے لیے ضمانت نامہ لکھا اور اپنے دستِ مبارک سے اس پر مہر لگائی۔ آپ ﷺ کے پاس بہت سے اکابر تھے۔ میں نے بیت اللہ کے پاس دعا کی، پھر حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا، سلام عرض کیا۔ حضور ﷺ نے معانقہ فرمایا اور مجھے لطائف واذکار سکھائے اور میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ گرنے لگے میں نے حضور ﷺ کو تھام لیا اور گرنے سے بچا لیا (اس مشاہدہ کی تعبیر فرمائی گئی تھی کہ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے مراد دین اسلام تھا۔ مراد یہ تھی کہ اسلام میں کمزوری آنے لگی ہے اور لوگ دین چھوڑنے لگے ہیں تو اللہ نے ان سے کام لیا کہ انہوں نے پھر سے لوگوں کے ایمان تازہ کیے)۔ تو فرماتے ہیں میں امام ربانیؒ کے مزار پر بیٹھا تھا، آپؒ نے مکاشفہ میں فرمایا، سلوک سے بھی اونچا درجہ مسئلۂ توحید کا بیان ہے۔ میں نے حضرت آدمؑ سے لے کر حضور ﷺ تک تمام انبیاءؑ کی زیارت کی۔ تمام انبیاء کرامؑ نہایت بلند آواز سے فرما رہے ہیں کہ جو شخص غیر اللہ کو اس عقیدے کے ساتھ پکارے کہ وہ جانتا اور سنتا ہے، وہ کافر ہے۔

ان اقتباسات سے تین چیزیں ثابت ہوگئیں۔ ایک تو یہ کہ روح سے کلام کی اصل شریعت میں موجود ہے۔ دوسری بات یہ ثابت کرنا تھی کہ یہ باتیں متقدمین سے نقل ہو کر اور علم کے ساتھ آئی ہیں، اور تیسری بات یہ کہ ایسے واقعات واقع بھی ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کے صحیح جانشینوں کو حضور ﷺ کی یہ میراث بطور انعامِ باری ملتی رہی ہے اور ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کلام بالا رواح کی اصل نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ صحابہ کرامؓ سے اس پر عمل کرنے کی کثیر مثالیں ملتی ہیں۔ پھر اولیاء کی مقدس جماعت نے حضور اکرم ﷺ اور صحابہؓ کی سنت پر عمل کیا۔ یہ سنت مدت سے تقریباً مردہ ہو چکی تھی۔ جس نے اس مردہ سنت کا احیاء کیا تو وہ حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق سو شہیدوں کے ثواب کا مستحق ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں تو وہ درحقیقت حضور ﷺ کی سنت کا انکار کرتے ہیں، اور اولیائے کرام کی مقدس جماعت جس کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں، لاکھوں تک پہنچتی ہے، ان کا انکار کرتے ہیں اور ان پر طعن کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ایسے منقول واقعات کی حیثیت کیا ہے، کیا ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں مولانا عبدالحئی لکھنویؒ کی تحقیق کا ماحصل قابلِ غور ہے۔ مولانا عبدالحئی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ واقعات آگے نقل کیے اور بیان فرمائے ہیں وہ ایسے

Scanned with CamScanner

نہیں کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اور ایسے نہیں کہ ان کی نقل کو حجت قرار دیا جائے بلکہ وہ آئمۂ اسلام ہیں اور لوگوں کے لیے ستون کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ اہم امور میں ان کے اقوال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اور وہ بات قطعی طور پر سچی ہوتی ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ جیسے ابونعیم، ابنِ کثیر، سمعانی، ابنِ حجر مکی، ابن حجر عسقلانی، علامہ سیوطی، ملا علی قاری، شمس العلماء کردی، نووی، عبدالوہاب الشعرانی اور شیخ الاسلام ذہبی اور اسی پایہ کے اور لوگ بھی ہیں۔ تو تمہارا کیا خیال ہے کہ ان حضرات نے اپنی تصانیف میں جھوٹ ملا دیا ہے یا کیا یہ لوگ جھوٹے لوگوں کی نقل پر اعتماد کر بیٹھے ہیں؟ اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں، وہ امام ہیں اور بڑے محتاط ہیں۔ جو کچھ دیتے ہیں اس پر مناقشہ نہیں کیا جاتا، یعنی اس پر کوئی بحث نہیں کی جاتی۔ اور مولانا فرماتے ہیں کہ اگر تجھے اس میں شک ہو تو طبقات کی طرف رجوع کر، تجھ پر ان معتبر حضرات کی صداقت کھل جائے گی۔ عوام سے تو ایسی باتوں کا امکان ہے لیکن ان اہل اللہ سے ایسی باتوں کا امکان نہیں کیونکہ انہیں اپنے رب کی طرف سے قوتِ ملکیہ عطا ہوئی ہے اور اس قوت کی وجہ سے ان صفات تک پہنچے۔ ان کا انکار صرف وہی کرتا ہے جو کرامات کے صدور کا منکر ہو اور جہاں تک جاہل متعصب کا تعلق ہے، اسے کوئی چیز فائدہ نہیں دے سکتی اور اگر کوئی اس امر میں شک کرے تو وہ قطعی طور پر متعصب ہے اور اس قابل نہیں کہ اس سے گفتگو کی جائے۔ وہ تو زجر و توبیخ کے لائق ہے یعنی ایسے بندے کو تو جھڑک دینا چاہیے۔ جو انکار کرے اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں، وہ تو اس قابل ہی نہیں کہ اس سے بات کی جائے۔ علامہ سیوطی نے بھی ابن جمرہ کے حوالے سے اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔ الحاوی للفتاوئ، جلد ۲، صفحہ ۳۳۹ پر ابن ابی جمرہ فرماتے ہیں کہ اس کا منکر یا تو کراماتِ اولیاء کی تصدیق کرتا ہے یا تکذیب۔ اگر تکذیب کرتا ہے تو اس سے بحث فضول ہے کیونکہ وہ اس حقیقت کو جھٹلا رہا ہے جو سنت سے واضح دلائل سے ثابت ہے اور اگر وہ تصدیق کرنے والا ہے وہ اسی قبیل سے ہے کیونکہ اولیاء پر تو عالمِ سفلی اور علوی سے خرقِ عادت کے طور پر بے شمار چیزیں منکشف ہوتی ہیں اس تصدیق کے ساتھ انکار جمع نہیں ہو سکتا۔ پھر صفحہ ۱۰۲ پر فرماتے ہیں کہ اگر اس قسم کا شک معتبر قرار دیا جائے تو تاریخ اور اسماء رجال کی کتابوں سے اعتبار اٹھ جاتا ہے کیونکہ ان میں یہ واقعات لکھے ہیں، یعنی اگر انکارِ کرامات پر یقین کیا جائے تو پھر نہ اسماء الرجال کی کتابیں بچتی ہیں اور نہ حدیث اور تاریخ کی کہ ان سب میں یہ واقعات لکھے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ جھوٹے ہیں تو پھر ان کتابوں کی صداقت سے اعتبار اٹھ جائے گا۔

'تدریب الراوی' کے صفحہ ۱۱، اور 'الرفع والتکمیل' کے صفحہ ۶۴ پر فرمایا اگر کسی کو خیال ہو کہ ان حضرات کی غلط باتوں پر اتفاق کر لیا جائے تو وہ خود ایک بہت بڑی غلطی کا شکار ہے۔ اگر ان حضرات پر اعتماد نہ کیا جائے تو بے شمار امور میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جو علماء متقدمین کی تکذیب کرتا ہے وہ بڑا کذاب ہے۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو ان افراد کی تکذیب کرے تو اولیاء اللہ کی اتنی بڑی جماعت کو جھوٹا کہنے کی بجائے یہ زیادہ آسان ہے کہ اسے جھوٹا کہہ دیا جائے۔
ان حضرات کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ کشفِ قبور اور کلام بالارواح کا انکار کرنا نری جہالت ہے ایسا منکر اس قابل نہیں کہ علمی سطح پر اس سے گفتگو کی جائے۔

اس سلسلے میں ایک پہلو ابھی تشنہ ہے اور یہ نعمت صرف مخصوص حضرات کو ہی عطا کیوں ہوتی ہے، ہر ایک کو کیوں عطا نہیں ہوتی؟ اس کی حکمت حافظ ابن قیم نے 'کتاب الروح' میں بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عذاب

Scanned with CamScanner

قبر پر مطلع کرنا چاہے، کر دیتا ہے اور بعض بندوں سے پوشیدہ رکھتا ہے کیونکہ اگر تمام لوگوں کو مطلع کر دے تو مکلف ہونے اور غیب پر ایمان لانے کا سوال اٹھ جائے اور لوگ دفن کرنا چھوڑ دیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم دفن کرنا نہ چھوڑ دیتے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ تمہیں عذابِ قبر سنا دیتا جیسا کہ میں سنتا ہوں۔ اور صفحہ ۸۲ پر فرماتے ہیں کہ قبر میں جہنم کی آگ کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسا ملائکہ اور جنوں کو دیکھنا۔ جب اللہ چاہے دکھا دیتا ہے۔ اور صفحہ ۸۱ پر فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے بھی وسیع اور عجیب ہے۔ اس نے اس دنیا میں ہمیں اپنی قدرت کی ایسی نشانیاں دکھائی ہیں جو اس سے بڑھ کر بھی عجیب ہیں لیکن انسان جن باتوں کا علم نہیں رکھتا ان کی تکذیب کی احمقانہ جرأت کر بیٹھتا ہے۔ ہاں! اللہ تعالیٰ جسے اپنے فضل سے بچالے۔ زندیق ملحد، رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کے سوا کر ہی کیا سکتا ہے۔ اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس کی حکمت یوں بیان فرمائی ہے۔ 'فتح الباری' جلد ۳، صفحہ ۲۳۵ پر ہے "اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے مشاہدہ سے عام لوگوں کی نگاہ کو روک رکھا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ دفن کرنا ہی چھوڑ دیں اور ان مادی اعضاء کو یہ قدرت ہی نہیں دی کہ عالمِ ملکوت کے امور کا مشاہدہ کر سکیں۔" تو اصل بات یہی ہے کہ مادی اعضا کان، آنکھ وغیرہ عالمِ ملکوت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور باطنی اعضا قلب کی آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو زندہ کرنے کے لیے صوفی اور اہلِ سلوک، مشائخ سے توجہ لیتے ہیں۔
پہلی بات یہ ہے کہ یہ برکات نبوی ﷺ ہیں جو سینہ بہ سینہ آتی ہیں، کوئی بندہ ایجاد نہیں کر سکتا، جس طرح قرآن و حدیث حضور اکرم ﷺ سے پہنچے ہیں اسی طرح یہ باطنی کمالات بھی انعکاسی طور پر حضور ﷺ سے ہی پہنچتے ہیں۔

وہ لوگ جنہیں کوئی شیخ نصیب ہوتا ہے اور پھر وہ محنت و مجاہدہ کرتے ہیں، اُنہی کو یہ نعمتیں ملتی ہیں، جو لوگ نہیں کرتے ان کو نہیں ملتیں۔ دنیوی علوم میں بھی ایسا ہے کہ ایک بندہ دس گاڑیاں تو خرید لیتا ہے لیکن انہیں چلانے کے لیے ڈرائیور ہی رکھتا ہے کیونکہ خود اسے چلانا نہیں آتی۔ کتنے لوگ ہیں جو گاڑی چلاتے تو ہیں لیکن اگر خراب ہو جائے تو ٹھیک نہیں کر سکتے، اس کے لیے مستری چاہیے۔ یعنی بندے کو وہی فن آتا ہے جو وہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح یہ باطنی کمال کی نعمت بھی انہی کو ملی جنہوں نے برکاتِ نبوی ﷺ حاصل کیں۔ عذاب و ثوابِ قبر کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو مطلع فرماتے ہیں۔
عذاب و ثواب کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہے، عالمِ کونی سے نہیں یعنی یہ مادی چیزوں میں سے نہیں ہے کہ مادی آنکھ سے نظر آ جائے۔ لہٰذا کشف القبور، کشفِ کونی نہیں۔ جن حضرات نے اسے کشفِ کونی کہا، انہوں نے ٹھوکر کھائی۔ کشفِ قبور میں اموات اور عذاب و ثواب کو دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے جنات اور ملائکہ کو دیکھنا کیونکہ روح اور عذاب و ثوابِ قبر بھی لطیف اور جنات و ملائکہ بھی لطیف ہیں۔ عذاب و ثوابِ قبر بھی عالمِ ملکوت سے ہے۔ عالمِ ملکوت کی چیزیں مادی آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتیں اور باتیں مادی کانوں سے نہیں سنی جا سکتیں بلکہ اس کا ذریعہ قلب اور روح کی آنکھیں اور کان ہیں اور یہ خاص اولیاء اللہ کو عطا ہوتی ہیں۔ اس لیے کشفِ قبور اور کلام بالارواح اللہ کے خاص بندوں کا حصہ ہے۔ کشفِ قبور اور کشفِ ملائکہ کا انکار صرف ملحدین، زندیق اور مکذبین رسول اللہ ﷺ ہی کرتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں اولیائے کرام کے متعدد واقعات درج کیے گئے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ سے مکالمہ یا معانقہ یا مصافحہ کیا اور حضور ﷺ سے استفادہ کیا۔ اس پر علامہ سیوطیؒ

Scanned with CamScanner

کا ایک قول پیش کر دینا ضروری ہے کہ جو قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'الحاوی للفتاوی'، جلد ۲، صفحہ ۴۵۳ پر فرماتے ہیں
ان ساری احادیث اور منقولات کا ماحصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جسد اور روح کے ساتھ زندہ ہیں۔ آپ ﷺ زمین کے جس حصے اور عالمِ ملکوت میں جانا چاہیں جا سکتے ہیں اور تصرف کر سکتے ہیں، جیسا زندگی میں کر سکتے تھے۔ اور آپ ﷺ اسی ہیئت میں زندہ ہیں جس ہیئت میں قبل از وفات تھے، اس میں تغیر نہیں آیا۔ اور آپ ﷺ ایسے ہی پوشیدہ ہیں جیسے ملائکہ جو کہ زندہ ہیں۔ جب اللہ چاہے، جس شخص کے لیے چاہے حجاب اٹھا دیتا ہے اور اسے حضور ﷺ کی زیارت سے مشرف کرتا ہے۔ وہ شخص حضور ﷺ کو اسی ہیئت پر دیکھتا ہے، اس میں کوئی مانع نہیں۔ عالمِ مثال سے اس رویت کا کوئی تخصص نہیں یعنی حضور ﷺ کی زیارت کا ہونا یا حضور ﷺ کا کچھ ارشاد فرمانا کوئی مثالی چیز نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔

'الحاوی للفتاوی'، جلد ۲، صفحہ ۴۶۰ پر ہے۔ "میں کہتا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ اربابِ حال کو یہی حالت پیش آتی ہے اور اسی حالت میں مشاہدہ کرتے ہیں اور سنتے ہیں اور صحابہ کرامؓ تو اربابِ حال کے سردار ہیں۔"

علامہ سیوطیؒ کے قول سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ:

۱۔ حضور ﷺ روح مع الجسد کے زندہ ہیں۔

۲۔ حضور ﷺ کی یہ حیات ایسی ہے کہ عوام کی نگاہ سے اوجھل ہیں جیسے ملائکہ زندہ ہیں مگر عوام کو نظر نہیں آتے۔

۳۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو حضور ﷺ کی زیارت کرانا چاہتا ہے تو وہ حجاب اٹھا دیتا ہے۔

۴۔ اس میں صورتِ مثالی کی تخصیص نہیں یعنی صورتِ مثالی نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ کی حقیقی صورت مبارک ہوتی ہے۔

یہ ساری باتیں، ان احادیث، علمائے ربانی اور اولیائے کرام سے منقول واقعات کا ماحصل ہیں جو اس سلسلے میں مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت کے انکار پر جو آوازیں اٹھ رہی ہیں یا اٹھائی جا رہی ہیں، اس کا سبب کیا ہے؟ 'سید محمد حریری بیومی' نے اپنی کتاب 'کتاب الروح وماہیتہا' صفحہ ۴۶ پر بیان فرمایا ہے کہ لوگ ان کرامات کا انکار بوجہ حجاب کی کثافت، گناہوں کی آلودگی اور دنیا سے تعلق کے کرتے ہیں یعنی لوگوں کے گناہ ان کے سامنے حائل ہوتے ہیں اس کی کثافت ان میں آ جاتی ہے اور دنیا کی محبت ان میں رچی بسی ہوتی ہے۔ انہیں خود یہ چیز حاصل نہیں ہوتی تو انکار کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ اولیاء کے اسرار سے مطلع ہو جائیں یعنی حالت یہ ہوتی ہے کہ یہ چاہتے ہیں ہمیں نظر آئے اور جب نظر نہیں آتا تو انکار کر دیتے ہیں۔ ان منکرین میں ان کے ظالم علما کا ذکر خصوصیت سے آتا ہے جو عارضی، دنیوی اغراض سے چمٹے ہوتے ہیں جو حریص الطبع اور لالچی ہیں اور حکام اور امراء کے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ یعنی مقصدِ حیات تو ان کا دنیا جمع کرنا ہوتا ہے اور حکام و امراء کے دروازے پر ان کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ کردار تو ان کا یہ ہوتا ہے پھر چاہتے ہیں کہ یہ نعمت انہیں بھی نصیب ہو حالانکہ ان کے نفوس ان آلودگیوں میں ملوث ہیں۔ جب انہیں یہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی تو کراماتِ اولیاء کا انکار کر دیتے ہیں اور اسے محدود علمِ ظاہری میں محصور سمجھتے ہیں۔ وہ سب کے سب یا غالب اکثریت، اپنی جانوں کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے شر اور وبال ہیں۔ وہ بنی اسرائیل کی مانند ہیں جو

Scanned with CamScanner

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لاتے ہیں مگر جب انہیں دیکھتے ہیں تو جحود، حسد اور بغض کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں۔ یعنی ان علمائے ظواہر کا رویہ بنی اسرائیل کی طرح ہے جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے تو کہتے تھے نبی آخر الزماں ﷺ مبعوث ہوگا اور خوشخبریاں دیتے تھے کہ ہم ایمان لائیں گے لیکن جب حضور ﷺ کو دیکھا تو انکار کر دیا۔

'طبقاتِ شعرانی'، جلد ۲، صفحہ ۷۶ پر حضرت شاذلیؒ کا بیان ہے، میں نے حضور ﷺ کی زیارت کی، مجھے حضور ﷺ نے خود فرمایا، میں مردہ نہیں ہوں۔ میری موت عبارت ہے اس شخص سے پوشیدہ ہونا، جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بصیرت حاصل نہیں اور جسے اللہ تعالیٰ بصیرت دے، میں اسے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے دیکھتا ہے۔ یعنی حضور ﷺ نے فرمایا، میری موت صرف اتنی ہے کہ جس کے پاس نورِ بصیرت نہیں، وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا اور جنہیں اللہ نے بصیرت دی ہے وہ مجھے دیکھتے ہیں اور میں انہیں دیکھتا ہوں۔

'تفسیرِ جمل'، جلد ۶، صفحہ ۷۴۴ پر 'قرطبی' کہتے ہیں کہ وہ جواب جو اشکال کو زائل کر دیتا ہے، وہ بات ہے جو ہمارے بعض مشائخ نے فرمائی ہے کہ شہید ربانی کی موت معدوم ہو جانا نہیں ہے یا مٹ جانا نہیں ہے بلکہ ایک پردہ درمیان میں آجاتا ہے جسے عام آدمی نہیں دیکھ سکتا لیکن وہ زندہ موجود ہیں۔ شہداً کے بارے قرآن کریم نے فرمایا کہ انہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں۔ ابنِ قیم نے فرمایا! انبیاء کی موت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ ہم سے غائب کیے گئے، اس حیثیت سے کہ ہم انہیں نہیں دیکھتے اگرچہ وہ موجود ہیں، زندہ ہیں۔ یہ زندگی ان کی مثل فرشتوں کے ہے کہ وہ فرشتے زندہ ہیں، موجود ہیں اور ہم انہیں نہیں دیکھتے اور آخر میں صاحبِ 'روح المعانی' کا ایک قول سن لیجیے۔ کراماتِ اولیاء کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور یہ بات بڑے بڑے صوفیوں میں مشہور ہے اور درست ہے اور یہ مسافت کو طے کیے بغیر ہے کہ اکثر لوگ کراماتِ اولیاء کا انکار اپنی بڑائی جتانے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ بات مان لی گئی تو پھر ان کی عظمت بن جائے گی اور ہمارے پاس یہ نعمت چونکہ نہیں ہے تو لوگ ہمیں چھوٹا سمجھیں گے اور یہ حرکت صرف ایک جاہل دشمن، ضدی اور عنادی ہی کر سکتا ہے۔ علماء میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود حق وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مثال کے طور پر واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ 'قاضی شمس الدین' مشہور علماء میں سے تھے اور بڑے بڑے علماء کے استادوں میں سے تھے۔ بہت بڑے فاضل تھے اور خود صوفی بھی نہیں تھے۔ علمِ ظاہری میں بہت معروف تھے، سرحد کے تھے، ان کا وصال ہو گیا (اللہ ان پر رحم فرمائے)۔ اعلیٰ حضرتؒ نے مثال کے طور پر ان کا واقعہ نقل فرمایا ہے۔ ۲۶ نومبر، ۱۹۷۱ء بمطابق، شوال المکرم، موضع چکڑالہ میں قاضی شمس الدین کو دوسرے گاؤں کے لوگوں نے جلسے میں تقریر کے لیے دعوت دی۔ وہ وہاں تشریف لے گئے، مسجد غازی خیل میں جمعہ کی تقریر کسی اور عالم نے کی۔ جمعہ کے بعد جلسہ تھا تو انہوں نے جلسے میں تقریر فرمائی۔ سینکڑوں کا مجمع تھا، موافق ومخالف سب موجود تھے۔ قاضی صاحب کو حاجی عبداللہ اور مولوی سلیمان نے دعوت دی تھی۔ مولوی صاحب نے قاضی صاحب کو تکلیف ہی اس لیے دی تھی کہ وہ اس بات کا رد فرمائیں کہ ارواح سے کلام نہیں ہو سکتی چنانچہ انہوں نے 'اسرار الحرمین' ان کے سامنے میز پر رکھ دی چونکہ اعلیٰ حضرتؒ کی مخالفت کے لیے ہی انہیں دعوت دی گئی تھی

(جب آپؒ پہلے حج سے واپس آئے تو حضرتؒ کے حکم سے ایک کتاب 'اسرار الحرمین' لکھی گئی تھی۔ اس میں وہ باتیں درج کی گئی تھیں جو بارگاہِ نبوی ﷺ اور دوسرے حضرات کی خدمت میں ہوئیں)۔ غرض یہ تھی کہ قاضی صاحب اس کتاب کے خلاف تقریر فرمائیں اور ان کے عقیدۂ انکار کرامات اولیاء کو تقویت پہنچے گی۔ قاضی صاحب نے کتاب کی تصدیق اور تائید کرتے ہوئے محض ایک غلطی کی نشاندہی کی۔ کتاب میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا مکالمہ درج ہے، اس میں حضرت فاطمہؓ کے کلام میں ایک لفظ 'مشکیت' درج ہے تو وہ گرامر کی غلطی تھی۔ وہ "مشکیت" نہیں ہونا چاہیے تھا، "شکوت" ("میں نے شکایت کی") ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ فصیح عربی لفظ یہی ہے اور حضرت فاطمہؓ تو فصحائے عرب میں سے تھیں مگر قاضی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کو کلام سمجھنے میں غلطی ہوئی، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کاتب نے غلطی سے کتاب میں لکھ دیا ہو۔ اس کے علاوہ باقی کتاب صحیح ہے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر مولانا شمس الدینؒ نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں قاضی حسین علی صاحبؒ کے پاس موجود تھا، 'مولانا طاہر پنج پیری بھی موجود تھے کہ ان کا لانگری روتا ہوا آیا، ہاتھ میں ایک خط تھا۔ مولانا نے وجہ پوچھی تو کہا کہ حضرت! میری والدہ فوت ہوچکی ہے۔ مولانا نے یہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند رکھیں اور فرمایا تمہیں کسی نے دھوکا دیا ہے، تمہاری ماں زندہ ہے اس وقت اپنے گھر کے صحن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ بات کسی کو نہ بتانا۔ چنانچہ نور محمد گھر گیا تو واقعہ ہو بہو ایسا ہی پایا جیسے مولانا نے اپنے کشف سے فرمایا تھا۔ قاضی صاحب نے کتاب کی تصدیق بھی کی اور پھر مولانا حسینؒ کا یہ کشف بھی سنایا کہ میرے سامنے یہ واقعہ ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ میں ۲۴ سال تک مولانا حسین علی کی خدمت میں اس فن کی تحصیل کے لیے حاضر ہوتا رہا مگر میری قسمت میں نہیں تھا، مجھے حاصل نہ ہوسکا۔ مگر اپنی محرومی کی وجہ سے اصل شے کا انکار کر دینا کہاں کی دانائی ہے۔ صوفیاء کے منازل سلوک کے متعلق کتابوں کے حوالے پیش کروں مگر وقت کی قلت مانع ہے، البتہ صوفیاء کو اپنے منازل کا اظہار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان کو نقصان ہوتا ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا صوفیاء تو ظاہر کر دیتے ہیں۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ بعض ایسے منازل ہوتے ہیں کہ سالک ان مقامات سے آگے ترقی کر جائے تو اسے نقصان نہیں ہوتا۔ 'مولانا شمس الدین افغانی' کا یہ واقعہ ہے، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ بعض ایسے علماء بھی ہیں جنہوں نے اس فن کو حاصل تو نہیں کیا لیکن وہ عالم ہیں، سمجھتے ہیں، دیانتدار ہیں، اس کی تصدیق فرماتے ہیں اور بعض بیوقوف ہیں، دنیادار ہیں اور اپنے وقار کے طمع میں آکر اس کا انکار کر دیتے ہیں، ورنہ انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

Scanned with CamScanner

باب (21)

تصوف اور اصحابِ تصوف

پر چند اعتراضات اور ان کے جوابات

پہلا اعتراض: تصوف ایک بدعت ہے

انسان بھی عجیب مجموعہ اضداد ہے۔ اس نے زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ہر شعبہ زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل کے لیے ایک الگ اصول قائم کر رکھا ہے۔ اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے اصول مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد بھی ہیں، مثلاً جسمانی صحت ایک شعبہ ہے جس کے لیے یہ اصول بنا رکھا ہے کہ صحت بگڑ جائے تو اس کے علاج کے لیے کسی ماہر طبیب یا ڈاکٹر سے مشورہ لیا جائے، کسی عطائی سے مشورہ لینے میں نقصان کا خطرہ ہے، اور اپنی سمجھ کے مطابق بھی خود علاج شروع نہ کیا جائے کیونکہ جان کا خطرہ ہے۔ اسی طرح ایک شعبہ قانونی معاملات ہیں۔ اس سلسلے میں حرفِ آخر کسی ماہر قانون کی رائے کو سمجھتے ہیں۔ یہ اصول بالکل درست ہیں لیکن جہاں دین و ایمان کا معاملہ آیا، ہر شخص ایک مجتہد کی طرح نہایت آزادی سے جو چاہے گا منہ سے نکال دے گا۔ اور لطف یہ کہ ہر بے تکی بات کو سند اور حرفِ آخر ہی سمجھے گا۔ دین کے معاملے میں اس اصول کی کارفرمائی سے عجیب مشکل پیش آتی ہے۔ شاید ایسے حالات سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے کہ:

تنگ بر ما راہ گذارِ دیں شدہ　　ہر لیمئے رازدارِ دیں شدہ

تصوف کو بدعت کہنے کا معاملہ بھی اسی قسم کے مجتہدین کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں ایک باب ''تصوف کا ثبوت'' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس سوال کا تفصیلی جواب اور علمی تحقیق کا ذخیرہ اس باب میں ملے گا۔ اور اگر کسی کو اس سے زیادہ تفصیل درکار ہے اور علم سے کوئی رشتہ ہے تو فتح الباری، اقتضا صراطِ مستقیم، الاعتصام اور فتح الملہم کے متعلقہ حصوں کو ایک نظر دیکھ لے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف کو بدعت کہنا دین کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، اور اس کے ساتھ ہی اگر آدمی برخود غلط بھی ہو تو اس سے بھی بڑی بڑی ٹھوکریں کھا سکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی دستور کی عبارت میں تمام جزئیات کا بیان نہیں ہوتا بلکہ صرف اصول وکلیات بیان ہوتے ہیں۔ اسلام کا دستور قرآن ہے۔ اس میں دین کے تمام اصول وکلیات موجود ہیں۔ ان اصول وکلیات کی عملی تعبیرات اسوۂ نبوی میں موجود ہیں اور ان اصول وکلیات سے جزئیات کے استخراج کا طریقہ بھی حضور ﷺ نے سکھا دیا۔ علمائے حق جو ورثۃ الانبیاء ہیں، اس طریق استخراج کے مطابق وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جزئیات کا استخراج کرتے رہے ہیں۔

اصول اور کلیات مقاصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ذرائع و وسائل کو ڈھونڈ نکالنا جو مقاصد کے حصول میں ممد ثابت

Scanned with CamScanner

ہوں اور انہیں ذرائع سمجھ کر ہی اختیار کیا جائے، دین کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہاں! یہ وسائل اُس صورت میں بدعت ہوں گے جب انہیں جزوِ دین یا اصلِ دین سمجھا جائے، ورنہ یہ وسائل مقاصد کے حکم میں ہوں گے کیونکہ ذرائع اور وسائل مقصد کا موقوف علیہ ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں حکم ہوا، یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ... (المائدہ: ۶۷)، یا حضور ﷺ نے فرمایا: بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً... یہ حکم دیا گیا کہ تبلیغ کرو۔ پس تبلیغ کرنا مقصد ٹھہرا، ذریعہ کی تعیین نہیں کی۔ زبان سے ہو، تحریر سے ہو، عمل سے ہو، منبر پر چڑھ کر ہو، کرسی پر بیٹھ کر ہو، مسجد میں ہو، میدان میں ہو، گاڑی میں بیٹھ کر ہو، موٹر میں ہو، تقریر میں لاؤڈ سپیکر استعمال کیا جائے۔ یہ تمام ذرائع ہیں اور چونکہ یہ ذرائع اشاعتِ دین کے لیے ہیں لہٰذا یہ مقدمۂ دین ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا... (الاحزاب: ۴۱)۔ اب یہ کہ تنہا ذکر کریں، حلقہ میں بیٹھ کر کریں، زبان سے کریں، قلب و روح سے کریں، چلتے پھرتے کریں، بیٹھ کر کریں یا لیٹے ہوئے کریں، انگلیوں پر گن کر کریں یا تسبیح کے ذریعہ کریں۔ تمام وسائل و ذرائع ہیں اور ذکرِ الٰہی مقصد ہے۔ ان ذرائع کو بدعت کہنا حصولِ مقصد میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

میں مسلک کے لحاظ سے دیوبندی ہوں۔ شرک و بدعت کا دشمن ہوں، انسان پرستی اور قبر پرستی کا دشمن ہوں، نذر نیاز کھانا، مقررہ اوقات پر عرس کرنا، غیروں کے مال پر نظر رکھنا میرے مسلک کے خلاف ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ دائیں ہاتھ میں کتاب اللہ، بائیں ہاتھ میں سنت رسول اللہ ﷺ اور سامنے سلف صالحین کی اختیار کردہ صراطِ مستقیم اور بس۔ امورِ کشفیہ کا اعتبار ہوگا جب کتاب و سنت سے متصادم نہ ہوں، ورنہ القائے شیطانی ہوگا۔ میرا سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ ہے جس میں روح سے بھی فیض لیا جاتا ہے۔ مگر روح سے فیض لینے سے مراد وہ نہیں جو جہلاء سمجھتے ہیں بلکہ روح سے کسبِ فیض کی حقیقت گذشتہ کسی باب میں بیان ہو چکی ہے۔ ہاں مبتدی کے لیے روح سے فیض حاصل کرنا محال ہے۔

میں تصورِ شیخ کا حامی نہیں اور ہمارے سلسلہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ وظائفِ لسانی میں ہمارے ہاں سب سے بڑا وظیفہ تلاوتِ قرآن مجید ہے، پھر استغفار اور درود شریف۔ حلقۂ ذکر میں صرف 'اللہ ھو' کا ذکر کرایا جاتا ہے، یا ہر مقام پر آیاتِ قرآنی کا وظیفہ بتایا جاتا ہے۔ سیرِ کعبہ میں لبیک کا وظیفہ اور فنا فی الرسول میں درود شریف۔ باقی تمام منازلِ سلوک میں سوائے اسمِ 'اللہ' کے کوئی دوسرا ذکر نہیں بتایا جاتا۔

رفقاء کو جمع کر کے توجہ کرنا، سانس کے ذریعے ذکر کرنا وغیرہ مقصود نہیں سمجھتا بلکہ وسیلہ اور مقدمہ مقصود کا سمجھتا ہوں۔ نہ خود حلقہ بنانا دین ہے، نہ توجہ کرنا ہی دین ہے، نہ صرف ناک سے سانس لینا ہی دین ہے۔ ہاں! یہ مقدماتِ دین اور اوراد و وظائف ہیں۔ ہمارے سلسلہ میں ان کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں جو سنت سے ثابت نہ ہوں۔ ہمارے اختیار کردہ وظائف و معمولات میں سے اگر کسی چیز پر بدعت کا اطلاق ہوتا ہے تو ثبوت پیش کیجیے۔ کتاب و سنت کی واضح تعلیمات ہمارے سامنے ہیں۔ انہی کو مشعلِ راہ، مصدرِ ہدایت اور معیارِ ہدایت سمجھتے ہیں اور بس۔

Scanned with CamScanner

پہلا اعتراض: تصوف ایک بدعت ہے

جس چیز کا وجود زمانۂ اقدسِ رسول اللہ ﷺ میں نہ ہو، وہ کام ثواب سمجھ کر، عبادت سمجھ کر کیا جائے تو اسے بدعت شرعی کہتے ہیں۔ بعض لوگ جب بدعت پر بحث کرتے ہیں تو کچھ اس طرح کی دلیلیں دیتے ہیں کہ جی! حضور ﷺ کے زمانے میں تو چائے بھی نہیں تھی، اب آپ چائے پیتے ہیں تو یہ بدعت ہے کیا؟ بعض کہتے ہیں آج کل کے لباس جیسا لباس تو آپ ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا تو کیا اس کا پہننا بھی بدعت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں مباحات میں سے ہیں اور کوئی چائے پینے کو عبادت یا باعثِ ثواب نہیں سمجھتا، یہ مباحات ہیں۔ لباس کے لیے شرعی جواز وعدمِ جواز شرط ہے۔ اگر وہ شرعی ستر ڈھانپتا ہے، شرع کے تقاضوں کے مطابق ہے تو درست ہے۔ صرف پابندی یہ ہے کہ کسی غیر مسلم قوم کا مخصوص پہناوا جو اس کی پہچان ہو، نہ پہنا جائے۔ جبکہ بدعت کا معاملہ اور ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جو چیزیں حضور ﷺ نے فرمائیں کہ ثواب ہیں، ان میں ایک تو فرض ہے۔ فرض و واجب تو قرآن میں بتا دیئے گئے، سنت بھی واضح ہے۔ اس کے بعد کچھ کام ایسے ہیں جو حضور ﷺ نے پسند فرمائے، وہ مستحب کہلاتے ہیں۔ اور مباحات وہ چیزیں ہیں جن کا کرنا ثواب نہیں، نہ کرنا گناہ نہیں۔ ان سب کے برعکس بدعت وہ چیز ہے جو کسی سنت کو گرا کر کھڑی کی جاتی ہے۔ جہاں کوئی بدعت اختیار کی جاتی ہے وہاں حضور ﷺ کا فرمودہ یا عمل کردہ طریقہ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اسے پسِ پشت ڈال کر ہی نئی بات کو رواج دیا جاسکتا ہے، پھر اسے ثواب بھی سمجھا جاتا ہے، اسی کا نام بدعت ہے۔ اب حضور ﷺ کی نعت پڑھنا ثواب ہے لیکن اسے دین محض سمجھ لیا جائے، یا نماز روزے جیسی عبادات کا درجہ دے دیا جائے اور پھر محافل نعت میں ہر طرح کی خرافات ہوں، یہ قید بھی نہ ہو کہ نعت کے اشعار عقیدۂ اسلام کے مطابق ہیں یا اس سے متصادم، تو یہ سب بھی بدعت بن جائے گا۔ وہ کام جس کا وجود عہد مبارک میں، سلف صالحین کے دور میں نہیں جو سنتِ رسول اور سنتِ خلفائے راشدین سے ثابت نہیں، ایسا کام کرنا اور بغرضِ ثواب کرنا بدعت ہے۔

اب اعتراض یہ ہے کہ تصوف بدعت ہے۔ تصوف کے عین اسلام ہونے کے، حلقۂ ذکر کے، ذکر کے جائز و مطابق دین ہونے کے ثبوت تو پہلے گزر چکے لیکن پھر حضرتؒ جواباً فرماتے ہیں کہ انسان عجیب شئے ہے کہ مختلف چیزیں، خیالات و نظریات اپنے اندر جمع کیے رکھتا ہے۔ اپنے مفاد کے پیشِ نظر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مختلف معیار و اصول اپناتا ہے۔ صحت کا معاملہ ہو تو ماہر سے ماہر ڈاکٹر کو تلاش کرتا ہے، دنیوی مفاد کی بات ہو تو بھی ہر معاملے میں چھان پھٹک سے کام لیتا ہے۔ معالج ہو یا مشیر، ان معاملات میں اونچا معیار رکھتا ہے، اس کے لیے تلاش و جستجو سے کام لیتا ہے لیکن جہاں دین کا معاملہ آتا ہے وہاں کے معیار بدل جاتے ہیں۔ علمائے حق کی تلاش تو درکنار، خود کو عالمِ بے بدل اور عقلِ کل فرض کر لیتے ہیں، پھر جو دل میں آتا ہے کہے چلے جاتے ہیں کہ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ صحیح ہے یہ غلط ہے۔ شریعت کی تشریح اپنی مرضی و خواہش کے مطابق کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے سند اور حرفِ آخر سمجھا جائے۔

Scanned with CamScanner

تصوف کو بدعت کہنا اسی طرزِ فکر کے لوگوں کی افترا پردازی ہے۔ دین کے معاملے میں اول فول بکنے والے لوگ ہی اپنی 'مذہب شناسی' کا ثبوت دینے کے لیے تصوف کو بدعت کہتے ہیں۔ ایک تو دین کی سمجھ نہ ہو اور پھر اگر اپنے آپ کو بڑا سمجھدار بھی سمجھتا ہو کہ میں ہر بڑے سے بڑا مسئلۂ شریعت سمجھتا ہوں۔

تنگ بر ما راہ گذارِ دیں شدہ　　ہر لئیمے رازدارِ دیں شدہ

ہم پر دین کا راستہ تنگ کر دیا گیا　　ہر نامعقول آدمی دین کا ٹھیکیدار بن گیا۔

ایسا شخص پھر ٹھوکریں بھی بڑی بڑی کھاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی دستور کی یعنی قوانین کی کتاب میں تمام جزئیات کا بیان نہیں ہوتا بلکہ اُس میں کلی اصول بیان کیے جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم اسلام کا دستور ہے، اس میں دین کے تمام اصول وکلیات موجود ہیں۔ ان اصول وقوانین پر عمل کیسے کرنا ہے، اس کے لیے اسوۂ حسنۂ رسول اللہ ﷺ رہنمائی کرنے کو موجود ہے۔ ان اصول وکلیات سے جزئیات کے بارے احکام کس طرح نکالنے ہیں، یہ طریقہ بھی نبی اکرم ﷺ نے سکھا دیا۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ نئے مسائل سامنے آتے ہیں تو انہی بنیادی قوانین وکلیات کو سامنے رکھ کر علمائے حق اور مجتہدین اس کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں اور اس کے لیے قانون، کلیہ وضع کرتے ہیں۔ اس کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ دین کے اصول وکلیات مقاصدِ حیات ہیں۔ ان پر عمل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ ذرائع کہلاتے ہیں۔ مثلاً وضو فرض نہیں ہے لیکن جب صلوٰۃ کا وقت ہوتا ہے، صلوٰۃ فرض ہوتی ہے تو وضو خود بخود فرض ہو جاتا ہے۔ اب وضو فرض ہو گیا تو اس کے لیے پانی تلاش کرنا بھی فرض ٹھہرا۔ اب پانی تلاش کرنا فرض تو نہیں۔ پانی بجائے خود مقصد تو نہیں، وضو کا ذریعہ ہے اور وضو ذریعہ ہے نماز کا لیکن فرضیتِ نماز کے ساتھ ہی یہ سارے ذرائع بھی فرض ہو گئے۔ مقاصد اور ذرائع میں یہی فرق ہے۔ مقاصد جزوِ دین ہوتے ہیں، ذریعہ جزوِ دین نہیں ہوتا بلکہ اگر اسے جزوِ دین سمجھ لیا جائے تو بدعت ہو گی یعنی اگر ان کو ثواب وعذاب کا باعث سمجھا جائے تو یہ دین میں اضافہ کرنے کے مترادف ہو گا۔ اگر ان ذرائع کو دین کا حصہ نہ سمجھا جائے تو پھر حصولِ مقاصد کے ذرائع بھی اتنے ہی لازمی ہوں گے جتنا مقاصد کا حصول لازمی ہے۔ مثلاً قرآن میں حکم ہوا:

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ... "اے نبی! آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا، اس کی تبلیغ فرمائیے۔" یا حضور ﷺ نے فرمایا، حکم دیا کہ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً... "میرا (فرمایا ہوا) خواہ ایک جملہ ہی کیوں نہ ہو، اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔" اب قرآن کا حکم ہے اور نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک بھی کہ دین کی بات آگے پہنچاؤ۔ ذرائع پر قید نہیں۔ تحریر سے تبلیغ کرو یا تقریر سے، انٹرنیٹ استعمال کرو یا الیکٹرانک میڈیا، مسجد میں کرو یا میدان میں۔ یہ سب ذرائع ہیں، وسائل ہیں، انہیں متعین نہیں کیا گیا۔ کسی بھی ذریعے سے ہو وہ تبلیغ ہی ہو گی اور چونکہ یہ ذرائع اشاعتِ دین کے ہیں لہٰذا یہ مقدمۂ دین ہوئے کہ جہاں دین پہنچتا ہے پہلے یہ پہنچتے ہیں تو دین پہنچتا ہے۔ جب یہ دین کے لیے، حق بیان کرنے کے لیے استعمال کیے جائیں گے تو اس کے معاون بھی ہوں گے۔

Scanned with CamScanner

اسی طرح ایک اور مثال لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حکم دیا، اُذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِيۡرًا... اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اللہ کا ذکر کرو کثرت کے ساتھ۔ ذکر کا مطلق حکم ہے۔ کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی کہ تنہا ذکر کریں، حلقہ میں بیٹھ کر کریں، زبان سے کریں یا دل سے کریں، چلتے پھرتے کریں یا لیٹ کر بھی کر لیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تو ذرائع ہیں، اصل مقصد ذکرِ الٰہی ہے۔ اگر کوئی ان ذرائع کو بدعت کہے گا تو حصولِ مقصد میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ ہاں! ان ذرائع کو دین کا حصہ سمجھا جائے (مثلاً یہ کہا جائے کہ ذکر صرف حلقہ بنا کر ہی کریں یا بیٹھ کر ہی کریں تو درست ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں صورتوں کو دین کا حصہ بنا دیا گیا) تو ذرائع بدعت ہو جائیں گے۔

فرمایا: میرا مسلک سیدھا سادا ہے، قرآن وسنت اور سلف صالحین کی پیروی۔ تصوف میں پیدا کی گئی تمام بدعتوں کا دشمن ہوں۔ میں کشف کا اعتبار کرتا ہوں لیکن کب؟ جب وہ کتاب وسنت کے مطابق ہو۔ اگر اس کے خلاف ہو تو وہ القائے شیطانی ہوگا۔ میرا سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ ہے جس میں روح سے بھی فیض لیا جاتا ہے مگر روح سے فیض لینے سے مراد وہ نہیں جو جہلاء لیتے ہیں یعنی دنیا کا حصول۔ دولت، عہدہ مل گیا تو سمجھے یہ فلاں بزرگ کا فیض ہے۔ رزق اللہ خود تقسیم کرتا ہے۔ روحانی فیض سے مراد قلبی اور باطنی جلاء اور صفا ہے، روحانی ترقی ہے لیکن یہ بات خصوصاً قابل ذکر ہے کہ جب تک کوئی تربیت کر کے اتنی قوت پیدا نہ کر دے کہ آدمی کی برزخ میں رسائی ہو جائے، ارواح سے کلام کر سکے، اس وقت تک روح سے فیض حاصل کرنا محال ہے۔ تصورِ شیخ تمام سلاسل میں سالک کی تربیت کا لازمہ ہے لیکن اعلیٰ حضرتؒ تصورِ شیخ کے حامی نہیں ہیں۔ تصورِ شیخ کا مطلب کچھ یوں ہے کہ باقی تمام سلاسل میں ذکر سے پہلے سالک تصور کرتا ہے کہ میں اپنے شیخ کے روبرو بیٹھا ہوں۔ وہ تصور میں شیخ کی شکل لاتا ہے اور اس تصور کو پختہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ذکر کے دوران بھی شیخ کی صورت اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ صوفی یہ حیلہ ارتکازِ توجہ حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرتؒ اس بات کے قائل نہیں، آپ فرماتے ہیں کہ میں تصورِ شیخ کا حامی نہیں ہوں۔ وہی تصویر دل میں بیٹھ جاتی ہے، آدمی آگے نکل ہی نہیں سکتا۔ ہمارے سلسلہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمارے سلسلہ میں ذکرِ قلبی کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اور وظائفِ لسانی میں سب سے اعلیٰ وظیفہ تلاوتِ قرآن پاک ہے۔ روزانہ اپنے دن کا آغاز اور اختتام قرآن پاک سے کرنا، استغفار کی تسبیحات اور درود شریف کا کثرت سے ورد کرنا ہے۔

درودِ پاک کے بارے ایک بات گوش گزار کرتا چلوں۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں عرض گزار ہوئے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے دن بھر کے لسانی ذکر کی تقسیم کچھ ایسے کر رکھی ہے کہ دن کے تین حصے باقی تسبیحات کرتا ہوں جبکہ چوتھائی حصے میں درود پاک پڑھتا ہوں تو کیا یہ صحیح ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر درود پاک کچھ زیادہ کر لو تو اچھا ہے۔ صحابیؓ عرض کرنے لگے کہ میں آدھا وقت باقی وظائف کو دوں گا اور آدھا وقت درود پاک کے لیے رکھوں گا۔ حضور ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا کہ درودِ پاک اور بڑھا لو تو اچھا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آئندہ تین حصے درود اور ایک حصہ باقی وظائف کا ہوگا۔ فرمایا اور بڑھا لو تو اچھا ہے۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں وہ سارا وقت جو وظائف کے لیے مختص

کیا تھا، درود پاک کے لیے وقف کر دوں گا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم درود شریف ہی پڑھتے رہو تو دنیا و آخرت کی تمام مصیبتوں کے رفع کے لیے کافی ہے۔ اس لیے ہمارے سلسلے میں تلاوتِ قرآنِ پاک کی تاکید ہے۔ استغفار بھی بہت ضروری ہے کہ روزانہ ایسی خطائیں بھی ہو جاتی ہیں جو ہم جانتے نہیں ہوتے، اس لیے کم از کم ایک تسبیح استغفار ضرور پڑھی جانی چاہیے۔ اور بڑا آسان طریقہ ہے کہ ہر نماز کے بعد اگر کم از کم بیس مرتبہ استغفار پڑھ لیا جائے تو ایک سو ہو جاتا ہے۔ درودِ پاک پر جتنا ہو سکے وقت لگانا چاہیے۔ پھر جو درودِ پاک ہمارے سلسلہ میں پڑھنے کو بتایا جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَآلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

یہ درودِ پاک احادیث میں بتائے گئے بہت سے اوراد میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے حضور ﷺ کا ارشادِ پاک ہے کہ ہر درود کے ثواب کا ایک اندازہ، ایک معیار مقرر ہے لیکن اس درود پاک کا معیار انسانی علم میں نہیں۔ اس کا ثواب انسانی اندازوں سے زیادہ ہے۔ لہٰذا آپؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے سلسلہ میں بڑا وظیفہ قرآن پاک، پھر استغفار اور درود شریف ہے۔ جس طریقے سے ہم ذکر کرتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ جو اس طرح ذکر نہیں کرتا وہ مسلمان ہی نہیں۔ یہ طریقے اور سلیقے ہیں۔ سفر کرنا ہے تو کوئی پیدل جاتا ہے، کوئی سائیکل پر جاتا ہے، جسے گاڑی نصیب ہو جائے گاڑی پہ چلا جاتا ہے۔ یہ سب ذرائع ہیں۔ مقصد تو منزل تک پہنچنا ہے۔ مقصد تو حصولِ رضائے باری اور صفائے باطن ہے۔

ایک اور بدعت جو سلاسل میں پھیل رہی ہے کہ ایسے وظائف بتائے جاتے ہیں جو سنت سے ثابت نہیں۔ ہم ایسے وظائف کو جائز نہیں سمجھتے۔ کتاب و سنت کی واضح تعلیمات ہمارے سامنے ہیں۔ انہی کو مشعلِ راہ، مقصد ہدایت اور معیارِ ہدایت سمجھتے ہیں۔ یہاں برسبیلِ تذکرہ وظائف کی بات آ گئی تو میں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں خصوصاً عورتوں کی عادت ہے کہ ہر عورت کوئی نہ کوئی وظیفہ پوچھ رہی ہوتی ہے۔ مجھے خطوط اور ای میلز (E-mails) آتی ہیں کہ فلاں کام کے لیے مجھے کوئی وظیفہ بتا دیں۔ بھئی خدا کے بندو! دنیا میں کون سا وظیفہ ہے جو اللہ کو کسی کام کے کرنے پہ مجبور کر دے۔ کیا اس کائنات میں کوئی ایسی طاقت ہے، کوئی ایسا کلام ہے، کوئی ایسی تسبیح ہے جو کوئی پڑھے اور اللہ چاہے نہ چاہے، اسے وہ کام کرنا پڑ جائے؟ یہ تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں جو وظیفے ہیں وہ رضائے باری کو حاصل کرنے کے لیے ہیں کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے۔ تکالیف سے نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا سب سے بڑا وظیفہ ہے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، مجھے اس تکلیف، پریشانی یا مسئلے سے نجات دے اور میرے لیے آسانیاں پیدا فرما۔

سب سے بڑا وظیفہ کلامِ الٰہی، اللہ کی کتاب ہے جسے روز پڑھنا چاہیے۔ اگر زبانی پڑھنا چاہتے ہیں تو پھر درود شریف جیسا وظیفہ کوئی نہیں۔ حضور ﷺ نے اسے دنیا و آخرت کی تمام مصیبتوں کا علاج بتایا ہے۔ اور یہاں یہ عالم ہے کہ گو میں ذاتی طور پر نقش لکھنا، دینا پسند نہیں کرتا لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر نقش نہ دیئے جائیں تو پھر لوگ بے دینوں اور عاملوں کے پاس جانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلسلہ میں بھی کئی ایسے ہیں جو میرے پاس عموماً تب آتے ہیں جب جادوگروں اور عاملوں سے تھک جاتے ہیں۔ یہاں خاص طور پر خواتین، اڑوس پڑوس میں جو جادوگر ملے گا، اس کے پاس پہنچ

Scanned with CamScanner

جائیں گی۔ پھر مجھے لکھتی ہیں، بڑے دردناک خطوط آتے ہیں کہ جی میں نے اتنے پیسے لگائے، اتنے عاملوں کے پاس گئی لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ او خدا کے بندو! اللہ کی کائنات میں شیطانوں کا کوئی دخل نہیں۔ یہ عامل، بے دین اور شیطان کا گروہ ہیں، ان کے پاس کیوں جاتے ہو، خصوصاً جب تمہیں بیعت کا دعویٰ بھی ہے۔ اس پہ مستزاد یہ کہ نقش لے جائیں گے یا کوئی پتھر دم کرا کے لے جائیں گے اور ساتھ میں کوئی اور وظیفہ بھی شروع کر دیں گے۔ یوں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی چیز (نقش، دم شدہ پتھر وغیرہ) شیخ سے لے کر جاتے ہیں تو پھر اس پر اعتماد بھی کریں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر کام کا مالک اللہ ہے۔ ہر انسان کے وجود میں دس کھرب کے قریب خلیے (Cell) ہوتے ہیں۔ ہر خلیے کو کب کہاں پیدا کرنا ہے کب موت دینی ہے، یہ اللہ کا کام ہے۔ وہ رب کائنات جو انسانی وجود کے اندر ایک ایک خلیے کی خبر رکھتا ہے، کائنات کے سارے مادے کا ایک ایک ایٹم اس کی نظر میں ہے وہ جادوگروں کے قابو میں آتا ہے؟ خدا کا خوف کرنا چاہیے۔ اللہ کے مقابلے میں جادوگروں اور عاملوں کا کوئی بس چلتا ہے کیا؟ تم اس ذات سے وابستہ کیوں نہیں ہو جاتے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ کائنات ہے۔

دوسرا اعتراض: اظہارِ کشف والہام جائز نہیں

یہ بات یونہی مشہور ہو چکی ہے کہ امورِ کشفیہ کو ظاہر نہ کیا جائے۔ عوام تو کیا خواص تک اس اظہار کو حرام سمجھتے ہیں اور ان پر نکیر کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اول اظہارِ علمِ سلوک ضروری ہے بطور اظہارِ نعمت کے۔ دوم یہ کہ سلوک دین کا شعبہ ہے اور اظہارِ دین ضروری ہے۔ سوم یہ کہ اظہار کی ضرورت انکار کے مقابلے میں ہوتی ہے اور انکار حد سے گزر چکا ہے اور یہ شعبۂ دین کا انکار ہے اس لیے اظہار ضروری ہے۔

دوسرا اعتراض: اظہارِ کشف والہام جائز نہیں

اس سلسلے میں بڑا اعتراض کیا جاتا ہے کہ کشف والہام، اسرارِ الٰہی ہیں ان کا اظہار جائز نہیں۔ قرآن کی تفسیر "اسرار التنزیل" میں بعض چیزیں ایسی آ گئیں جہاں میں نے کچھ مکاشفات کا ذکر تفسیر کے ضمن میں کر دیا تو مجھے ایک مولانا کا خط آیا کہ "یہ چیزیں جو آپ نے لکھی ہیں، متقدمین میں، تفاسیر میں تو ہمیں اس طرح کی باتیں نہیں ملتیں۔ یہ اسرارِ الٰہی ہیں، ان کا اظہار جائز نہیں۔" میں نے جواباً انہیں لکھا کہ حضرت اگر کوئی چیز قرآن و سنت اور متقدمین کی رائے کے خلاف ہے تو اس کی نشاندہی فرمایئے تاکہ میں توبہ کروں اور اس کی تصحیح کروں لیکن اگر میری تفسیر، قرآن و سنت کے اور متقدمین کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق ہے تو پھر اگر میں زیادہ تفصیل میں چلا گیا ہوں تو یہ تو اچھی بات ہے۔ تفسیر لکھی ہی کلامِ الٰہی کی تفہیم کے لیے جاتی ہے، لوگوں کو بات اچھی طرح سمجھ آنی چاہیے۔ دوسری بات آپ نے کہی کہ یہ اسرارِ الٰہی ہیں میں نے انہیں کیوں ظاہر کر دیا؟ تو آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے آپ سے بہتر جانتا ہے۔ اسے پتا تھا کہ اس بندے کو میں جو بات بتاؤں گا

Scanned with CamScanner

یہ آگے دوسروں کو بتا دے گا، سو اللہ نے کوئی بات چھپائی ہوتی تو وہ مجھے بھی نہ بتاتا۔ یہ تو اس کی حکمت ہے۔ تیسری بات میں نے ان سے یہ کہی کہ مولانا یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اسرار ظاہر کر دیئے؟ آپ جنہیں اسرار سمجھتے ہیں میرے نزدیک وہ عام باتیں ہیں اور میں نے بیان بھی اس لیے کر دیں۔ ورنہ اسرار تو پتا نہیں اللہ نے مجھے کتنے دیئے ہوں، الحمد للہ ان کی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی ہے۔ اسرارِ الٰہی تو میرے سینے میں ہیں اور بفضل تعالیٰ میں ان کا امین ہوں۔ میں بالفرض محال اگر کچھ بیان کر دوں تو آپ بھی برداشت نہ کر پائیں۔

تو سمجھ لیں کہ جو چیزیں بیان کر دی جاتی ہیں، وہ اسرار نہیں ہوتیں۔ ان باتوں سے نابلد لوگ کہتے ہیں کہ کشف والہام اور ایسی چیزوں کا اظہار جائز نہیں اور اس سلسلے میں مولانا تھانویؒ کا ایک فقرہ پیش کیا جاتا ہے "نبوت کا اظہار واجب ہے اور ولایت کا استتار واجب ہے۔" یعنی نبوت کا اظہار ضروری ہے اور ولایت کو چھپانا ضروری ہے۔ لیکن مولانا تھانویؒ (جو خود بھی صاحب حال صوفی تھے اور انہوں نے بھی اپنے مشاہدات بارہا بیان کیے ہیں) کی اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حقائق جو عام آدمی سمجھ نہ سکے اور بیان کرنے سے اس کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو، یا کم از کم یہ کہ وہ یہ کہتا پھرے کہ یہ سب جھوٹ ہے تو ایسے لوگوں کے سامنے وہ حقیقتیں بیان نہیں کرنی چاہئیں۔ نبیؐ پر جو کچھ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس کا ماننا سب کے لیے ضروری ہوتا ہے اس لیے نبوت کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کی ولایت کا ماننا کسی کے لیے ضروری نہیں، ولی کی ولایت پر ایمان لانا ضروری نہیں، اس کے کشف کو ماننا ضروری نہیں۔ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول دیا ہے کہ لوگوں کی سمجھ کے مطابق ان سے بات کرو، عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ... کا پیمانہ مقرر فرمایا ہے کہ جو بات وہ سمجھ سکیں وہ ان سے کرو۔ لیکن یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔

تحدیثِ نعمت اور اظہارِ دین

تحدیثِ نعمت از روئے حکم باری تعالیٰ ضروری ہے۔ صاحب تفسیر مظہری نے اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱) میں فرمایا کہ صوفیاء کرام کے اس اظہار پر تنکیر نہ کی جائے، اور ارشاد الطالبین میں مذکور ہے کہ:

فَمَنْ اَنْكَرَ عَلٰى مَا هٰؤُلَاءِ الرِّجَالِ فِيْ مِثْلِ هٰذِهِ الْمَقَالِ فَكَاَنَّهٗ اَنْكَرَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ الْكَرِيْمَةَ مِنَ اللّٰهِ ذِي الْجَلَالِ... (تفسیر مظہری، ۱۰:۲۲۵؛ ارشاد الطالبین، ۲۲)

"جس نے اس قسم کی باتوں میں صوفیاء کا انکار کیا گویا اس نے آیت قرآنی کا انکار کیا۔"

اور مشکوٰۃ، کتاب اللباس، فصل دوم میں حضرت عمرو بن شعیب سے روایت ہے:

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّرٰى اَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ... (مشکوٰۃ، کتاب اللباس، الفصل الثانی، ۳۷۵)

"اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی نعمت کا اظہار کیا جائے جو بندہ پر ہوئی۔"

Scanned with CamScanner

اور اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں ہے کہ:

"ازیں جا معلوم شود کہ پوشیدہ کردن نعمت و کتمان آں روا نیست و گویا موجبِ کفرانِ نعمت است و ہم چنیں ہر نعمتے کہ وے تعالی بر بندہ داد، مثل علم و فضل باید کہ ظاہر کند تا مردم بشناسند و استفادہ نمایند و در مصادق مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ داخل شود۔" (اشعۃ اللمعات، کتاب اللباس، فصل دوم، ۵۴۸:۳)

"اس سے معلوم ہوا کہ نعمت کا چھپانا جائز نہیں، گویا یہ نعمت کی ناشکری ہے۔ اسی طرح وہ نعمت جو اللہ تعالی نے بندہ پر ارزانی مثلاً علم اور فضیلت (خواہ علم ظاہری ہو یا باطنی) اس کا اظہار ضروری ہے تاکہ لوگ واقف ہو جائیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور قرآن مجید کی آیت "جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں" کے مصداق میں داخل ہو جائے۔"

فائدہ:

اظہارِ کمالاتِ باطنیہ برائے فائدہ خلق جائز اور چھپانا ناجائز اور چھپانے والا ماخوذ ہوگا۔ ہاں مدار نیت پر ہے۔

اور تفسیر جمل میں اسی آیت (سورۂ یوسف، تحت الآیۃ، ۵۵) کے ضمن میں مذکور ہے:

وَلِذٰلِكَ جَوَّزُوْا لِلْخَامِلِ اَنْ يُّعَيِّنَ نَفْسَهٗ حَتّٰى يُعْرَفَ فَيُقْتَبَسُ مِنْهُ لَمْ يَكُنْ مِّنْ بَابِ التَّزْكِيَةِ... (حاشیۃ الجمل علی الجلالین، ۵۰:۴)

"اسی وجہ سے گمنام آدمی کے لیے جائز ہے کہ اپنے آپ کو ظاہر کرے کہ لوگ اس کو پہچان کر اس سے فائدہ اٹھائیں تو اس کا اپنے اوصاف بیان کرنا فخر میں داخل نہ ہوگا۔"

اور تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ:

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ... (یوسف:۵۵)

مَدَحَ نَفْسَهٗ وَيَجُوْزُ لِلرَّجُلِ ذٰلِكَ اِذَا جَهِلَ اَمْرَهٗ لِلْحَاجَةِ... (تفسیر ابن کثیر، ۴۸۲:۲)

"مجھے خزانوں پر مامور کر دے (حضرت یوسف کا یہ فرمانا) اپنی مدح کا بیان ہے اور آدمی کے لیے ایسا اظہار اور مدح جائز ہے جب لوگوں کو ضرورت ہو اور اس کا کمال پوشیدہ ہو۔"

اور اسی آیت کے تحت تفسیر جمل میں ہے کہ:

اَمَّا اِذَا قَصَدَ بِتَزْكِيَةِ النَّفْسِ وَمَدْحِهَا اِيْصَالَ الْخَيْرِ وَالنَّفْعِ اِلَى الْغَيْرِ فَلَا يُكْرَهُ ذٰلِكَ وَلَا يَحْرُمُ بَلْ يَجِبُ عَلَيْهِ ذٰلِكَ مِثَالُهٗ اَنْ يَّكُوْنَ بَعْضُ النَّاسِ عِنْدَهٗ عِلْمٌ نَافِعٌ وَلَا يُعْرَفُ بِهٖ فَاِنَّهٗ يَجِبُ عَلَيْهِ اَنْ يَّقُوْلَ اَنَا عَالِمٌ... (حاشیۃ الجمل علی الجلالین، ۵۰:۴)

مگر کوئی شخص اپنی تعریف محض لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کرتا ہے تو یہ نہ مکروہ ہے نہ حرام بلکہ

Scanned with CamScanner

اس کا اظہار واجب ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس علم ہے اور نافع علم اور لوگوں کو اس کی واقفیت نہیں تو اس پر واجب ہے کہ یہ اعلان کرے کہ میں اس علم کا عالم ہوں۔"

تحدیثِ نعمت اور اظہارِ دین

کشف والہام کے متعلق حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کا انعام ہے اور اللہ کے عطا کردہ انعامات کا اظہار ضروری ہے کہ یہ بھی شکر ادا کرنے کا ایک انداز ہے۔ تصوف دین کا حصہ ہے اور دین کا اظہار ضروری ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اظہار کی ضرورت انکار کے مقابلے میں پیش آتی ہے۔ اگر لوگوں نے اس شعبے کا انکار ہی کر دیا تو پھر جتنی شدت سے انکار ہے اتنی شدت سے اظہار بھی ضروری ہے تاکہ جو طالب ہے خواہشمند ہے، وہ اس منزل تک پہنچ سکے۔ صاحبِ تفسیر مظہری اس سلسلے میں کچھ ایسا ہی فرماتے ہیں۔ وہ بھی تحدیثِ نعمت از رُوئے حکم باری تعالیٰ ضروری سمجھتے ہیں:

وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ... (الضحیٰ:11) اس آیۂ کریمہ کے تحت فرمایا کہ صوفیاءِ کرام کے کشف والہام کے اظہار پر تنکیر نہ کی جائے اور 'ارشاد الطالبین' میں لکھا ہے کہ "جس نے صوفیا کے ان ارشادات کا انکار کیا اس نے اس آیت کا انکار کیا۔" یعنی جو شخص صوفیا کے کشف والہام کے اظہار کی تنکیر کرتا ہے (تنکیر کا مطلب ہے کسی کے کام کو ناپسند کرنا کہ وہ کرے) وہ قرآن کی اس آیتِ مذکورہ کا انکار کرتا ہے۔

مشکوٰۃ شریف، باب للباس، فصل دوم میں حضرت عمر بن شعیب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،

"اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بندے پر جو اس کی (عطا کردہ) نعمت ہے اس کا اظہار کیا جائے۔"

جیب میں لاکھوں روپے رکھ کر پھٹے پرانے کپڑے پہن لینا، مساکین کا حلیہ بنالینا اللہ کو ناپسند ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ جس کی جتنی حیثیت ہو، ویسا ہی اس کا لباس ہو کہ یہ بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت کا اظہار اور شکر ادا کرنے کا ایک انداز ہے۔

ہمارے ہاں عموماً ولی اسے سمجھا جاتا ہے جو چیتھڑے لٹکائے پھرے، اچھا کھائے پہنے نہ اچھی رہائش رکھے، لوگوں کو ملنا پسند نہ کرے اور جنگلوں میں رہے۔ بھلا ایسی ولایت کس کام کی جو انسانوں سے الگ کر دے، جنگلوں میں بھیج دے۔ ولی کی ولایت سے استفادہ تو انسانوں نے کرنا ہے، تربیت کی ضرورت تو انسانوں کو ہے۔ جنگلی جانوروں میں جا کر رہنا کس لیے؟ مشکوٰۃ شریف کی شرح 'اشعۃ اللمعات' میں ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو چھپانا جائز نہیں۔ یہ کفران ہے اُس نعمت کا جو اللہ تعالیٰ نے بندے کو دی۔ جیسے کسی کے پاس علم ہے یا نورِ بصیرت ہے یا ذکر و اذکار ہیں تو وہ دوسروں پر اس کا اظہار کرے تاکہ لوگوں کو پتا چلے اور وہ اس سے فائدہ حاصل کریں۔ انہوں نے دوسری آیت کا حوالہ بھی دیا ہے،

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ... متقی لوگوں کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "جو رزق ہم نے انہیں دیا وہ اس میں سے میری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔" تو فرمایا کہ اظہارِ نعمت بھی اس ضمن میں آئے گا۔ لوگوں کو پتا چلے گا کہ فلاں کے پاس اللہ کی یہ نعمت ہے تبھی تو وہ اس سے فائدہ حاصل کریں گے۔

Scanned with CamScanner

فائدہ: خلق کے فائدے کے پیشِ نظر کمالاتِ باطنیہ کا اظہار جائز ہے۔ اگر کوئی ان کمالات کو چھپائے گا، خلقت محروم رہے گی۔ اس کے کمالات سے فائدہ حاصل نہ کر سکے گی تو وہ شخص اس کے لیے جواب دہ ہوگا۔ ہاں امدار نیت پر ہے کہ بتانے والا خلوص سے دوسروں کی اصلاح کے لیے اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے، یا اپنی ذات کی بڑائی مقصود ہے۔ اور چھپانے والا کہیں غرورِ ذات سے بچنے کے لیے تو نہیں چھپا رہا۔ 'تفسیر جمل' باب التزکیہ میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے کہ کوئی شخص اگر کمالاتِ باطنیہ رکھتا ہے مگر لوگ نہیں جانتے تو اسے چاہیے کہ ان کا اظہار کرے۔ اگر وہ یہ نیت رکھتا ہے کہ لوگوں کو اس اظہار سے فائدہ پہنچے گا تو یہ اظہار فخر و غرور میں داخل نہ ہوگا۔

'تفسیر ابن کثیر' میں اس ضمن میں حضرت یوسفؑ کی مثال دی گئی ہے قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ... حضرت یوسفؑ نے عزیزِ مصر سے فرمایا کہ ملک کے امورِ خزانہ میرے سپرد کر دو۔ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ... "میں اس فن کو جانتا ہوں اور امانتدار بھی ہوں۔" حضرت یوسفؑ کا یہ فرمانا کہ مجھے خزانوں پر مامور کر دے بظاہر اپنی مدح کا بیان کرنا ہے لیکن آدمی کے لیے ایسا اظہار اور مدح جائز ہے جب لوگوں کو اس کی ضرورت ہو اور اس کا کمال پوشیدہ ہو۔ حضرت یوسفؑ کو لوگ ایک خوبصورت غلام کی حیثیت سے جانتے تھے جسے قید کر دیا گیا تھا۔ عزیزِ مصر بھی انہیں ایک قیدی ہی سمجھتا تھا تو انہوں نے خود فرمایا کہ ملکی خزانے یا آج کل کی زبان میں وزارتِ خزانہ میرے سپرد کر دو کیونکہ میں اس فن کو جانتا ہوں اور امانتدار بھی ہوں۔ حضرت یوسفؑ کے اپنا کمال بتانے سے سارے ملک کو ہی نہیں آس پاس کے علاقوں کی بے پناہ خلقت کو فائدہ ہوا۔

اسی آیت کے تحت 'تفسیر جمل' میں ہے "اگر کوئی شخص اپنی تعریف محض لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کرتا ہے تو یہ مکروہ ہے نہ حرام بلکہ اس کا اظہار واجب ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس علم ہے اور نافع علم ہے لیکن لوگوں کو اس سے واقفیت نہیں تو اس پر واجب ہے کہ اعلان کرے کہ میں اس علم کا ماہر ہوں۔"

عدم اظہار مشروط بہ شرط ہے

جو شخص اظہار میں فخر سمجھتا ہو یا اس اظہار سے ایسا فائدہ اٹھانا چاہتا ہو جو شرعاً حلال نہیں تو اس کا اظہار ریا، خودنمائی اور فخر میں داخل ہوگا اور یہ ناجائز ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ایک قانون کی نشاندہی کی ہے:

وَمِنْ هٰذَا يُؤْخَذُ الْاَمْرُ بِكِتْمَانِ النِّعْمَةِ حَتّٰى تُوْجَدَ وَتَظْهَرَ كَمَا وَرَدَ فِي الْحَدِيْثِ اِسْتَعِيْنُوْا عَلٰى قَضَاءِ الْحَوَآئِجِ بِكِتْمَانِهَا فَاِنَّ كُلَّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ... (تفسیر ابن کثیر، ۲:۴۶۹)

"اس سے معلوم ہوا کہ نعمت کا اس وقت تک کتمان ضروری ہے جب تک وہ ظاہر ہو کر وجود میں نہ آ جائے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اپنی حاجتوں کی امداد انہیں (پورا ہونے تک) پوشیدہ رکھ کر کرو کیونکہ ہر صاحبِ نعمت محسود ہوتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

فائدہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ پر انعام کرنا چاہتا ہے اور اس بندہ کو بذریعہ کشف والہام مطلع فرما دیتا ہے تو جب تک انعام حاصل نہ ہو جائے، اظہار نہ کرے شاید وہ نعمت روک لی جائے۔

۲۔ جس پر انعام زیادہ ہوگا اس کے حاسد بھی اسی نسبت سے بہت ہوں گے۔

۳۔ وہ اسرار و رموز جو اللہ تعالیٰ اور ولی اللہ کے درمیان خاص ہیں اور ان کے اظہار سے مخلوق کو کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اظہار فتنہ مخلوق کا سبب بنے تو ان کا اظہار صحیح نہیں۔ ان امور کو ظاہر نہ کرے تاکہ صاحبِ اسرار بن جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ کمال خواہ کسی قسم اور کسی درجے کا ہو ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے۔

نیکو روئی تاب مستوری ندارد چو بندی در ز روزن سر بر آرد

اگر اظہار نہ ہو تو حق باطل میں تمیز کیسے ہو؟ حقیقی صوفیاء اور بے معنی مدعیانِ تصوف میں فرق کیونکر ظاہر ہو لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہے؟ عوام کی تو یہ حالت ہے کہ ہر دیوانے کو مجذوب سمجھنے کے لیے تیار ہیں اور مدعیانِ تصوف میں سے جسے چاہیں قطبِ زماں سمجھتے ہیں۔

عدمِ اظہار مشروط بہ شرط ہے

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بعض چیزیں کشفاً سمجھ میں آجاتی ہیں لیکن اگر ان کا اظہار کر دیا جائے تو بعض اوقات من جانب اللہ روک دیا جاتا ہے۔ تو یہ بھی ایک شرط ہے اظہار نہ کرنے کی کہ جس چیز کی سمجھ آئی ہے اسے مکمل ہونے دو، پھر بتا دینا کہ اللہ نے مجھے پہلے مطلع کر دیا تھا۔ جب تک اللہ کریم اس کی تکمیل نہیں فرماتے صوفی کو چاہیے کہ یہ نہ بتاتا پھرے کہ اللہ ایسا کرنے والا ہے۔ ورنہ وہ قادر ہے، روک دے گا اور تمہاری بات غلط ہو جائے گی۔ اور پھر مزید فرماتے ہیں کہ جس کے پاس جتنی بڑی نعمت ہوتی ہے، اتنے ہی زیادہ اس کے حاسد ہوتے ہیں، اس لیے حاسدین سے بچنے کے لیے نعمتوں کے اظہار میں احتیاط کرنی چاہیے۔ تیسری بات یہ کہ بعض امور خاص اس بندے کے لیے ہوتے ہیں جو اللہ اور اس بندے کے درمیان ہوتے ہیں۔ ویسے بھی ہر آدمی کی سمجھ کی استعداد ایک سطح کی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ امور کسی دوسرے کو بتائے جائیں تو وہ سمجھ نہیں پاتا، ہضم ہی نہیں کر سکتا بلکہ ان باتوں کے اظہار سے فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے اسرارِ الٰہی کا اظہار مناسب نہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ کشف والہام کا اظہار نہ بھی کیا جائے تو یہ چیزیں چھپتی نہیں ہیں۔

نیکو روئی تاب مستوری ندارد چو بندی در ز روزن سر بر آرد

کمال کسی قسم کا ہو، ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے اور اگر اظہار نہ ہو، اگر بات نہ کی جائے، بتایا نہ جائے تو سچ اور جھوٹ کا فرق کوئی کیسے سمجھے گا؟ کس طرح پتا چلے گا کہ حقیقی صوفی کون ہے اور کون محض تصوف کا دعویدار بن کر چندے جمع کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہے؟ عوام کی تو یہ حالت ہے کہ ہر دیوانے کو مجذوب سمجھنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور مدعیانِ تصوف میں جس کو جو عہدہ چاہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ غوث، قطب تو عام ہو گئے ہیں۔ لوگوں کو اس بارے علم بھی نہیں اور تمیز بھی نہیں۔ کئی بار میں نے لکھا ہوا دیکھا ہے، پہلے لکھیں گے غوثِ زمان، پھر لکھیں گے قطبِ دوراں۔ اب قطب، غوث کے ماتحت ہوتے ہیں اور آپ ہیں کہ غوث پہلے لکھ دیا اور قطب بعد میں، جیسے کسی کا لکھیں کہ جرنل ہے، پھر لکھیں کپتان بھی ہے۔ لوگوں کو ان عہدوں کی درجہ بندی تک کی خبر نہیں۔ ان عہدوں کا شعور تک نہیں ہے کہ یہ کیا ہیں کس لیے ہیں؟ تو ایسوں کو اگر سچ بھی نہ بتایا جائے تو انہیں جھوٹ سچ کا پتا کیونکر چلے گا۔

تیسرا اعتراض: جب سماعِ موتیٰ ممکن ہی نہیں تو ان سے رابطہ کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ اصول پیشِ نظر رہے کہ جو معارف یا کمالاتِ علمی، روح اس دنیا میں رہ کر حاصل کرتی ہے وہ بعد از مفارقتِ بدن اس سے سلب نہیں کیے جاتے بلکہ ان مکسوبہ علوم و معارف میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور روح کے ادراکات وسیع ہو جاتے ہیں۔ ہاں روح سے وہ افعال و اعمال سلب ہو جاتے ہیں جو بدن کے وسیلہ سے کرتی تھی۔ دنیا میں روح مادی کانوں، آنکھوں اور زبان کی محتاج تھی کیونکہ مادیات کو سنانا اور دکھانا وغیرہ مقصود تھا۔ جب مادہ سے مفارقت ہوئی تو مادی آلات سلب ہو گئے، مگر روح میں بولنے، سننے اور دیکھنے کی قوت باقی رہی۔ یہ روح کی ذاتی صفات ہیں پس روح زندہ ہے، کلام کرتی ہے، دیکھتی ہے، سنتی ہے، کلام کا جواب دیتی ہے۔ یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے احیاء میں مفصل بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

فَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ لَا يَمُوْتُ وَعِلْمُهٗ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا يُمْحٰى وَصَفَاؤُهٗ لَا يَتَكَدَّرُ...

(احیاء علوم الدین، بیان معنی النفس والروح والقلب والعقل وما هو المراد بهذه الأسامی، ۳:۲۲)

"مومن کا قلب نہیں مرتا۔ اس کا علم اس سے سلب نہیں کیا جاتا۔ اس کی صفائی کو مکدر نہیں کیا جاتا۔"

دوسری یہ بات کہ سماعِ موتیٰ کا مسئلہ کشف سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں گفتگو کا حق بھی اصحابِ کشف کو ہے جیسا کہ صاحبِ کشف الاستار نے وضاحت فرمائی ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ اَعْلَى الْكَلَامِ وَاَقْصَى الْمَرَامِ اَنَّ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةَ لَيْسَتْ مِمَّا يَبْحَثُ فِيْهِ الْفَاظُوْنَ يَنْقُلُهُ النَّقَّالُوْنَ بَلْ هُوَ مِنَ الْاِنْكِشَافِ الصِّفَاتِيِّ الَّذِيْ يَكْشِفُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى بَعْضِ اَوْلِيَائِهٖ...

(الدر المختار وعلى هامشه كشف الاستار، باب اليمين فی الضرب والقتل، ۱:۳۱۱)

"خوب سمجھ لو کہ بہترین بات اور منتہائے مقصود یہ ہے کہ (سماعِ موتیٰ) کا مسئلہ اس قبیل سے نہیں

کہ لفظوں سے کھیلنے والے اس بحث میں پڑیں یا محض نقل کرنے والے اسے نقل کر دیں بلکہ یہ تو انکشافِ صفاتی سے ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے بعض اولیاء پر منکشف فرماتے ہیں۔"

فائدہ:

اس سے یہ مراد نہیں کہ کشف کوئی مستقل دلیلِ شرعی ہے مگر جب دلیلِ قطعی کے مطابق ہو تو صاحبِ کشف کے لیے یقینی حجت ہے۔

تیسرا اعتراض: جب سماعِ موتیٰ ممکن ہی نہیں تو ان سے رابطہ کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے؟

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مرنے والے سے بات کرنا تو ممکن نہیں تو ان سے رابطہ کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے؟ جو دنیا سے گزر جاتا ہے اس کو بات سنانا، اس کی بات سننا کیا یہ قرآن میں آیا ہے کہ ممکن ہی نہیں......؟ یہ اعتراض کرنے والے پہلی بات تو یہ یاد رکھیں کہ جو علمی یا ظاہری کمالات کسی کے پاس ہوتے ہیں، مرنے کے بعد روح ان کمالات کی حامل رہتی ہے وہ سلب نہیں ہو جاتے۔ اگر دنیا میں کوئی طبیب تھا تو مرنے کے بعد بھی اس کی روح کو طب کے سارے نسخے یاد ہوں گے۔ اگر کوئی عالم تھا تو سارے مسائل روح کو بھی یاد ہیں۔ اگر کوئی صوفی تھا تو اس کے سارے کمالات روح کے ساتھ موجود ہیں، وہ روح سے سلب نہیں کیے جاتے بلکہ بدن کا حجاب ہٹ جاتا ہے تو اُن علوم میں، اور وضاحت اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ روح کی نظر اور بھی دور رس ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ اعمال و افعال روح سے سلب کر لیے جاتے ہیں جنہیں وہ بدن کے ذریعے کرتی تھی۔ جو کام بدن کرتا تھا، بدن نہ رہا تو وہ کام بھی نہ رہے۔ دنیا میں روح جسمِ مادی کی محتاج تھی کیونکہ مادی دنیا میں رہنا، مادی چیزوں کا استعمال کرنا، مادی انسانوں کو سنانا اور دیکھنا مقصود تھا۔ جب روح مادے سے الگ ہو گئی تو مادی آلات سلب ہو گئے۔ مگر دیکھنا، سننا، محسوس کرنا، کلام کرنا، یہ روح کی ذاتی صفات ہیں۔ روح زندہ ہے، اس کی صفات پسِ مرگ بھی برقرار ہوتی ہیں۔ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے 'احیاء العلوم' میں مفصل بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے مومن کا قلب نہیں مرتا، اس کا علم اس سے سلب نہیں کیا جاتا، اس کی صفائی کو مکدر نہیں کیا جا سکتا۔ رہ گیا سماعِ موتیٰ کا مسئلہ تو اس سلسلے میں 'کشف الاستار' میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان لوگوں کے بات کرنے کا ہے جو صاحبِ حال اور صاحبِ کشف ہیں۔ یہ نرے لفظوں سے کھیلنے والوں اور محض نقل کر دینے والوں کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ان کے بحث کرنے کی چیز ہی نہیں۔

بعد موتِ جسمانی، روح کا علم اور حافظہ موجود رہتا ہے

قَالَ تَعَالیٰ: قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ... قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَ جَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ... (یٰس: ۲۶، ۲۷)

Scanned with CamScanner

"ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو۔ کہنے لگا کاش! میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت داروں میں شامل کر دیا۔"

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ قوم نے جو سلوک اُس مردِ مومن کے ساتھ کیا تھا وہ اسے یاد تھا۔ اس نے یہ بات بھی اظہار افسوس کے طور پر کی۔

بعد موتِ جسمانی، روح کا علم اور حافظہ موجود رہتا ہے

جسم پر موت واقع ہو جانے کے بعد روح کا حافظہ قائم رہتا ہے جو علم اس نے حاصل کیا ہو، موجود رہتا ہے۔ جیسے سورۂ یٰسین میں جب اس بندے کو جنت میں داخل ہونے کا حکم ملا تو اس نے کہا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور عزت داروں میں شامل کر دیا۔ یہ برزخی جنت کی بات ہو رہی ہے جس میں مومن دنیا سے جانے کے بعد داخل ہو جاتا ہے۔ سورہ یٰسین میں واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ تین نبی ایک گاؤں میں مبعوث ہوئے، گاؤں والوں نے ان کی تکذیب کی اور انہیں نقصان پہنچانے پر آمادہ ہوئے۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ...

ایک شخص بستی کے پرلے کنارے سے بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم! یہ رسول ہیں، ان کی اطاعت کرو۔ لوگوں نے اسے شہید کر دیا۔ قرآن میں ہے کہ اللہ نے اسے جنت میں داخل کر دیا تو وہ کہنے لگا،

قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ...

"کاش! میری قوم کو پتا چل جائے کہ مجھے میرے رب نے بخش دیا اور مجھے بڑے معزز لوگوں میں شامل کر لیا ہے۔"

مرنے کے بعد روح کو وہ سلوک یاد تھا جو اس سے کیا گیا تھا۔ یہی دکھ اُس نے ظاہر کیا کہ کاش میرے لوگوں کو پتا چل جائے کہ انہوں نے مجھے قتل کر دیا تھا لیکن مجھے مرتبۂ شہادت ملا اور اللہ نے مجھے جنت میں داخل کر دیا ہے، تاکہ وہ بھی رسولوں کی اطاعت اختیار کر لیں۔

روح غنی بھی ہے:

قَالَ تَعَالٰی: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى...

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا... (البقرہ:۲۶۰)

Scanned with CamScanner

"اُس وقت کو یاد کر جبکہ ابراہیمؑ نے عرض کیا، اے میرے پروردگار مجھ کو دکھلا دیجئے، آپ مُردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔ ارشاد ہوا۔ اچھا تو تم چار پرندے لو، پھر انہیں پال کر اپنے لیے ہلا لو، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان سب کو بلاؤ دیکھو تمہارے پاس سب دوڑتے چلے آئیں گے۔"

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں معتزلہ کا رد ان الفاظ سے فرمایا:

وَ لَمَّا دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى حُصُوْلِ فَهْمِ النِّدَآءِ وَ الْقُدْرَةِ عَلَى السَّعْيِ لِتِلْكَ الْاَجْزَاءِ حَالَ تَفَرُّقِهَا... كَانَ دَلِيْلًا قَاطِعًا عَلٰى اَنَّ الْبِنْيَةَ لَيْسَتْ شَرْطًا لِّلْحَيَاةِ... (تفسیر الکبیر، ۲:۳۲۹)

"آیت اس حقیقت پر دال ہے کہ پرندوں کے اجزاء نے آواز کو سنا، سمجھا اور چلنے پر قادر ہوئے باوجود اس بات کے کہ متفرق اجزاء تھے۔ پس یہ آیت اس امر پر دلیل قاطع ہوئی کہ حیات کے لیے وجود صحیح کا ہونا شرط نہیں۔"

آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے واضح ہے۔ روح کے سماع میں تو اختلاف ہے ہی نہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ بدن سنتا ہے یا نہیں؟ نکیرین کے سوال و جواب کے وقت اعادہ روح کا کیا جاتا ہے جو احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ پس اختلاف اس میں ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب کے بعد بدن سنتا ہے یا نہیں؟

روح سنتی بھی ہے

روح کیسے سنتی ہے؟ فرمایا، روح تو پھر روح ہے کہ جسمِ لطیف ہے۔ مادی جسم کے ذرات بھی سنتے ہیں، جیسے ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ یا اللہ! مجھے وہ منظر دکھا دے، تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا، مجھے وہ منظر دکھا،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى... پوچھا گیا، اَوَلَمْ تُؤْمِنْ... آپ کو یقین نہیں ہے؟ بالکل یقین ہے۔ یا اللہ! میرا ایمان ہے کہ تُو زندہ کرے گا لیکن میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں کہ تُو ایسا کس کیفیت سے کرے گا، یا یہ کہ مردے کس کیفیت سے زندہ ہوں گے۔

توحکم ہوا کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ... چار پرندے لے لو جو مختلف نسلوں سے ہوں جیسے مور، کبوتر، مرغا، کوا وغیرہ اور ان چاروں کو فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ... اچھی طرح اپنے ساتھ مانوس کر لو۔ انہیں پالو، دانہ دنکا کھلاؤ تو وہ آپ کے ساتھ خوب مانوس ہو جائیں گے۔ پھر ان کو ذبح کر کے ان کو پروں کھال سمیت کاٹ کوٹ کر ایک کر دو، پھر ان میں تھوڑا تھوڑا تمام پہاڑوں پر پھینک دو۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ... اس کے بعد انہیں بلاؤ (جس طرح پالنے اور سدھانے کے دوران انہیں اپنی طرف بلاتے تھے)، يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا... آپ دیکھیں گے کہ وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس چلے آئیں گے۔ اسی طرح مُردوں کو زندہ کرنے کا منظر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو دکھا دیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک ایک پرندے کا نام لے کر پکارا تو جس کا نام پکارتے، اس کے ذرّات ان ڈھیروں سے الگ ہو ہو کر اڑتے ہوئے آتے اور آپؑ کے سامنے ایک دوسرے سے جڑ کر پرندہ

Scanned with CamScanner

سن گئے اور زندہ ہو گئے۔ یعنی مردہ پرندوں کے وجود کا ایک ایک ذرہ نہ صرف سن رہا تھا بلکہ سن کر سمجھ بھی رہا تھا، تو پھر روح کیوں نہیں سن سکتی؟

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں معتزلہ کا رد ان الفاظ میں فرمایا (معتزلہ ایک فرقہ ہے)، وَمِمَّا دَلَّتِ الْآيَةُ عَلٰی حُصُوْلِ فَهْمِ النِّدَآءِ وَالْقُدْرَةِ عَلَى السَّعْيِ... یعنی اس آیت نے یہ ثابت کر دیا کہ ان ذرات نے آواز بھی سنی، فَهْمِ النِّدَآءِ... اسے سمجھا بھی، اور وَالْقُدْرَةِ عَلَى السَّعْيِ... ان ذرات کو اللہ نے یہ قدرت بھی دی کہ وہ بھاگ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ حالانکہ وہ متفرق اجزا تھے اور مختلف پہاڑوں پر پڑے تھے۔ كَانَ دَلِيْلًا قَاطِعًا عَلٰی اَنَّ الْبِنْيَةَ لَيْسَتْ شَرْطًا لِّلْحَيَاةِ... تفسیر کبیر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بہت وزنی دلیل ہے کہ حیات کے لیے وجود کا مکمل یا صحیح ہونا شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو سنوا سکتا ہے۔ پرندوں کا وجود ریزہ ریزہ تھا اور دور دور بکھرا ہوا تھا لیکن انہوں نے سنا بھی اور دوڑ کر بھی آئے۔

اس بات میں تو کبھی اختلاف رہا ہی نہیں کہ روح نہیں سنتی۔ علماء میں اختلاف یہ رہا ہے کہ مرنے کے بعد بدن سنتا ہے کہ نہیں؟ مرنے کے بعد جب منکر نکیر سوال کرنے آتے ہیں تو روح کو بدن میں لوٹا دیا جاتا ہے، روح اور بدن مل کر جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ جب یہ سوال جواب ختم ہو جاتے ہیں تو روح بدن سے الگ ہو جاتی ہے۔ تب بدن یا اس کے ذرات سنتے ہیں کہ نہیں؟ اس آیہ کریمہ سے یہ سمجھ آ رہی ہے کہ اللہ قادر ہے۔ بدن کے ذرات بھی سنتے ہیں۔ جیسے ان پرندوں کے مرنے کے بعد ان کے بدن کے ذرات نے سنا اور دوڑے چلے آئے۔

سوال و جواب نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن

قَالَ شَيْخُ الْاِسْلَامِ الْاَحَادِيْثُ الصَّحِيْحَةُ الْمُتَوَاتِرَةُ تَدُلُّ عَلٰى عَوْدِ الرُّوْحِ اِلَى الْبَدَنِ وَقْتَ السُّوَالِ وَ سُوَالُ الْبَدَنِ بِلَا رُوْحٍ قَوْلٌ قَالَهٗ طَآئِفَةٌ مِّنَ النَّاسِ وَاَنْكَرَهُ الْجُمْهُوْرُ... (کتاب الروح، ۶۲)

"شیخ الاسلام نے فرمایا کہ صحیح اور متواتر احادیث نکیرین کے سوال کے وقت عودِ روح الی البدن پر دلالت کرتی ہیں مگر ایک جماعت متواتر احادیث کی مخالفت کرتی ہے اور جمہور علماء نے اس جماعت کی مخالفت کی ہے۔"

اور علامہ سیوطیؒ نے فرمایا:

قَالَ ابْنُ تَيْمِيَه: اَلْاَحَادِيْثُ مُتَوَاتِرَةٌ عَلٰى عَوْدِ الرُّوْحِ اِلَى الْبَدَنِ وَقْتَ السُّوَالِ وَ سُوَالُ الْبَدَنِ بِلَا رُوْحٍ قَوْلُ طَائِفَةٍ مِّنْهُمُ ابْنُ الزَّاغُوْنِيْ وَ حَكٰى عَنِ ابْنِ جَرِيْرٍ وَ اَنْكَرَهُ الْجُمْهُوْرُ... (شرح الصدور بشرح حال الموتٰی فی القبور، ۹۶)

"امام ابن تیمیہ نے فرمایا کہ سوال نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن کی احادیث صحیح اور متواتر ہیں۔
ایک گروہ سوال بلا روح کا قائل ہے جیسا ابن الزاغونی، ابن جریر (اور کرامیہ)، اور جمہور علماء ان کے مخالف ہیں۔"

قَالَ السَّلَفِيُّ. عَوْدُ الرُّوْحِ اِلَى الْجَسَدِ فِي الْقَبْرِ ثَابِتٌ فِي الصَّحِيْحِ لِسَائِرِ الْمَوْتٰى... وَ اِنَّمَا النَّظْرُ فِي اِسْتِمْرَارِهَا فِي الْبَدَنِ... (شرح الصدور بشرح حال الموتٰی فی القبور، ۱۳۷)

"علامہ سلفی نے کہا کہ قبر میں عودِ روح الی البدن ثابت ہے اور تمام موتی کے لیے ہے، اور یہی صحیح مذہب ہے۔ خلاف صرف روح کے بدن میں ہمیشہ رہنے میں ہے۔"

شَيْخُ الْاِسْلَامِ اَبُوالْفَضْلِ بْنُ حَجَرٍ سُئِلَ عَنِ الْمَيِّتِ اِذَا سُئِلَ هَلْ يُقْعَدُ اَمْ يُسْاَلُ وَهُوَ رَاقِدٌ فَاَجَابَ يُقْعَدُ وَسُئِلَ عَنِ الرُّوْحِ هَلْ تُلْبَسُ حِيْنَئِذٍ الْجُثَّةُ كَمَا كَانَتْ فَاَجَابَ نَعَمْ لٰكِنْ ظَاهِرَ الْخَبَرِ اَنَّهَا تَحُلُّ فِي نِصْفِهِ الْاَعْلٰى... (ایضا، ۹۶)

"شیخ الاسلام علامہ ابن حجر سے سوال کیا گیا کہ وقتِ سوال و جواب میت کو قبر میں بٹھایا جاتا ہے یا حالت فراش میں ہی سوال ہوتا ہے۔ تو جواب دیا، بٹھایا جاتا ہے۔ پھر سوال ہوا روح بدن اوڑھ لیتی ہے؟ جواب دیا، ہاں! مگر احادیث میں آتا ہے کہ روح کا تعلق بدن کے اوپر کے حصے سے ہوتا ہے۔"

پھر چند سطور کے بعد فرمایا:

وَهِيَ لَا تَزَالُ مُتَعَلِّقَةً بِهٖ وَاِنْ بَلٰى وَ تَمَزَّقَ وَ تُقْسَمُ وَ تُفَرَّقُ...

(شرح الصدور بشرح حال الموتٰی فی القبور، ۹۶)

"اور یہ تعلق روح کا بدن سے ہمیشہ رہتا ہے اگرچہ جسم ریزہ ریزہ اور چورا چورا ہو جائے۔"

فائدہ:

قبر میں میت سے سوال و جواب کے وقت روح کا تعلق بدن سے پیدا ہو جاتا ہے۔ روح کا تعلق جسم کے بالائی حصہ سے ہوتا ہے کیونکہ قلب بالائی حصہ میں ہے اور سمجھنے کا آلہ ہے۔

سوال وجواب نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن

"کتاب الروح" میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ صحیح اور متواترہ احادیث کے مطابق نکیرین کے سوال وجواب کے وقت روح بدن میں دوبارہ آجاتی ہے۔ سوال وجواب کے وقت روح کا بدن کے ساتھ تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ علما کی ایک جماعت متواتر احادیث کی مخالفت کرتی ہے۔ وہ لوگ ان احادیث کا انکار کرتے ہیں لیکن جمہور علما نے ان لوگوں کا انکار کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے "شرح الصدر" میں لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ" فرماتے ہیں کہ جب منکر نکیر سوال کرتے ہیں تو روح کو بدن

Scanned with CamScanner

کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور اس پر صحیح اور متواتر احادیث ہیں جبکہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ روح تو اپنی جگہ (علیین یا سجین) میں چلی جاتی ہے، سوال بدن سے ہوتا ہے۔ ان علما میں ابن الزاغونی، ابنِ جریر (اور کرامیہ) شامل ہیں، اور جمہور علما نے ان کی مخالفت کی ہے یعنی پوری امت ان سے اختلاف کرتی ہے۔ علامہ سلفی کہتے ہیں کہ قبر میں روح کا جسم کی طرف پلٹ کر آنا تو تمام مرنے والوں کے لیے ثابت ہے اور یہی صحیح مذہب ہے۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ اس کے بعد بدن کا تعلق روح سے رہتا ہے یا نہیں۔ یعنی سوال و جواب کے لیے تو روح کا تعلق بدن سے قائم کیا جاتا ہے، اس کے بعد بدن کے ساتھ روح کا تعلق رہتا ہے یا نہیں، اختلاف اس میں ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن حجر سے سوال کیا گیا کہ بوقت سوال و جواب روح لیٹے لیٹے جواب دیتی ہے یا اسے بٹھایا جاتا ہے؟ جواب ملا بٹھایا جاتا ہے۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا روح بدن میں اسی طرح ہو جاتی ہے جس طرح زندگی میں تھی؟ تو انہوں نے فرمایا، ہاں! مگر احادیث میں آتا ہے کہ روح کا تعلق بدن کے اوپر کے حصے سے ہوتا ہے کیونکہ وہاں دل ہوتا ہے اور سمجھنے کی صلاحیت اور عقل وشعور دل میں ہی ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ بدن کے ساتھ روح کا ایک تعلق ہمیشہ ہر حال میں رہتا ہے اگرچہ جسم ریزہ ریزہ ہو جائے، خاک میں مل جائے۔ جہاں بھی وہ اجزا ہوں گے روح کا تعلق ان کے ساتھ بہر طور رہتا ہے۔

قبر میں انبیاءؑ کے جسم کا تعلق روح سے دائمی ہوتا ہے

فَجَاءَ اَبُوْ بَكْرٍ فَكَشَفَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبَّلَهٗ فَقَالَ: بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ طِبْتَ حَيًّا وَمَيِّتًا... وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُذِيْقُكَ اللّٰهُ الْمَوْتَتَيْنِ اَبَدًا...

(صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب قول نبی ﷺ: لو کنت متخذا خلیلا، ۱:۵۱۷)

یا (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب فضائل اصحاب النبی، باب قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم: لو کنت متخذا خلیلا، ۲:۲۸۹)

"پھر حضرت ابوبکرؓ آئے۔ حضور اکرم ﷺ (کے چہرۂ انور) سے کپڑا اٹھایا، بوسہ لیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں! آپ حیات میں اور بعدِ حیات پاکیزہ ہی رہے۔ اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے آپ کو اللہ تعالیٰ دوبارہ موت نہ دے گا۔"

اس کی شرح میں ابن حجر نے فرمایا:

وَاَحْسَنُ مِنْ هٰذَا الْجَوَابِ اَنْ يُّقَالَ: اِنَّ حَيَاتَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقَبْرِ لَا يَعْقُبُهَا مَوْتٌ بَلْ يَسْتَمِرُّ حَيًّا وَالْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب قول النبی ﷺ (لو کنت متخذا خلیلا)، ۷:۲۹)

صاحب فتح الباری نے فرمایا کہ "اس سے احسن جواب یہ ہے کہ کہا جائے کہ قبر مبارک میں حضور ﷺ کی زندگی ایسی دائمی ہے جس کے بعد موت نہیں، اور انبیاء قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔"

فائدہ:
قبر میں سوال کے وقت روح کا جو تعلق بدن سے پیدا ہوتا ہے وہ انبیاء کے اجساد کے ساتھ دائمی رہتا ہے، اس تعلق کو توڑا نہیں جاتا۔ اسی تعلق کی وجہ سے انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ اہل السنۃ والجماعت کا یہی مذہب ہے۔

قبر میں انبیاءؑ کے جسم کا تعلق روح سے دائمی ہوتا ہے

جہاں تک انبیاءؑ کا تعلق ہے تو انبیاءؑ کی مقدس ارواح ہمیشہ ان کے وجودِ اطہر میں رہتی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ حاضر ہوئے، تشریف لائے اور چہرۂ اقدس سے کپڑا ہٹایا فَقَبَّلَهٗ... حضور اقدس ﷺ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور عرض کیا بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ طِبْتَ حَیًّا وَّمَیِّتًا... میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، یا رسول اللہ ﷺ! آپ زندگی میں بھی اور موت میں بھی ہمیشہ ہی پاکیزہ رہے۔ پھر فرمایا،

وَاللّٰهِ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا یُذِیْقُكَ اللّٰهُ الْمَوْتَتَیْنِ... "اُس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اللہ آپ ﷺ کو دو موتیں نہیں دے گا۔" یعنی دنیا سے گزر جانے کے بعد روحِ اطہر بدن سے الگ نہیں ہوگی۔

اس کی شرح میں علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ قبر مبارک میں حضور ﷺ کی زندگی ایسی دائمی ہے جس کے بعد موت نہیں۔ انبیاء قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ قبر میں سوال کے وقت روح کا جو تعلق بدن سے پیدا ہوتا ہے، انبیاءؑ کے اجساد کے ساتھ دائمی ہوتا ہے۔ روح سوال و جواب کے وقت ان کے مبارک جسموں میں واپس آتی ہے تو پھر نہیں نکلتی۔ اس تعلق کو توڑا نہیں جاتا۔ اسی وجہ سے انبیاءؑ اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے۔

عذابِ قبر جسم اور روح دونوں پر ہوتا ہے

وَانْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ عَلٰی عَذَابِ الْقَبْرِ عَلَی الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ جَمِیْعًا... (تفسیر مظہری، ۹:۷۷)

"اس پر اجماعِ امت ہے کہ ثواب و عذابِ قبر روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔"

وَقَدْ دَلَّتِ الْاَحَادِیْثُ مَا لَا یُحْصٰی عَلٰی عَذَابِ الْقَبْرِ وَ انْعَقَدَ عَلَیْهِ اِجْمَاعُ السَّلَفِ... (تفسیر مظہری، ۱۰:۷۷)

"اور بے شمار احادیث عذابِ قبر پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔"

اَلْاَوَّلُ الْمَیِّتُ حَیٌّ فِیْ قَبْرِهٖ فَیُعَذَّبُ وَهٰذَا هُوَ مَذْهَبُ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْحَقِّ...
(خلاصۃ الایوبی علی الخیالی، ۱۱۸)

Scanned with CamScanner

"اول یہ کہ میت قبر میں زندہ ہوتا ہے، اسے عذاب دیا جاتا ہے اور یہی مذہب اہل السنۃ والجماعت کا ہے۔"

اِحْيَاءُ الْمَوْتٰى فِیْ قُبُوْرِهِمْ وَ مَسْئَلَةُ مُنْكَرٍ وَ نَكِيْرٍ لَهُمْ وَ عَذَابُ الْقَبْرِ لِلْكَافِرِ وَالْفَاسِقِ كُلُّهَا حَقٌّ عِنْدَنَا وَاتَّفَقَ عَلَيْهِ سَلَفُ الْاُمَّةِ۔۔۔(شرح مواقف، ۷۱۵)

"قبروں میں مُردوں کا زندہ ہونا، منکر نکیر کا سوال ہونا، عذاب قبر کافر اور فاسق کے لیے ہونا سب حق ہے۔ اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔"

فائدہ:

ثواب و عذاب قبر چاہتے ہیں حیات کو۔ حیات چاہتی ہے تعلق روح کا بدن سے، اور یہ چاہتا ہے عودِ روح الی الجسد کو اور عودِ روح متواترات سے ہے اور عذاب وثواب روح و بدن دونوں پر اجماعِ امت ہے۔ اور یہی مذہب اہل السنۃ والجماعت کا ہے۔

عذابِ قبر جسم اور روح دونوں پر ہوتا ہے

دنیا میں مکلف بالذات جسم ہوتا ہے، روح اس کے تابع ہوتی ہے۔ جسم نیکی کرتا ہے تو روح کو بھی جلا ملتی ہے، صفا ملتی ہے، انوارات ملتے ہیں۔ جسم برائی کرتا ہے تو روح پر بھی ظلمت طاری ہوجاتی ہے۔ مرنے کے بعد مکلف بالذات روح ہوجاتی ہے، جسم اس کے تابع ہوجاتا ہے۔ لہٰذا برزخ کا عذاب وثواب براہ راست روح کو ہوتا ہے، لیکن جس طرح روح کو ہوتا ہے اسی طرح جسم کے ہر ذرے کو پہنچتا رہتا ہے۔ اکثر قاعدہ یہ ہے کہ جسم قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ جسم جل جاتا ہے یا کسی کو درندہ کھا جاتا ہے، کوئی پانی میں غرق ہو کر وہیں گل سڑ جاتا ہے۔ کچھ ہوجائے، جسم کا ہر ذرہ بلکہ ہر وہ ذرہ جو کبھی بھی جزوِ بدن رہا ہو خواہ کتنی ہی صورتیں بدل لے، مادے کی کسی بھی شکل میں چلا جائے اور جہاں بھی جائے، روح کا تعلق اس سے رہتا ہے۔ اگر روح عذاب میں ہے تو اُس (حصہ بدن) کو عذاب پہنچتا رہتا ہے۔ روح نجات میں ہے، اسے ثواب مل رہا ہے تو بدن کو بھی وہ لذت مسلسل پہنچتی ہے۔ 'تفسیر مظہری' میں ہے کہ بے شمار احادیث عذابِ قبر پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ 'حاشیہ خیالی' میں بھی اسی طرح کی بات کی گئی ہے کہ فرمایا، "اول یہ کہ میت قبر میں زندہ ہوتی ہے۔" یعنی اس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ میت کے زندہ ہونے کی بات سن کر لوگوں کے ذہن میں دنیوی زندگی کا تصور آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ دنیا میں بھی اگر ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلے جائیں تو وہاں کے موسم الگ ہوتے ہیں، اوقات الگ ہوتے ہیں، غذائیں الگ ہوتی ہیں، زبان الگ ہوتی ہے، اور وہ تو عالم ہی دوسرا ہے۔ جب کوئی برزخ میں چلا جاتا ہے تو وہاں کی زندگی برزخ کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کی ضروریات برزخ کی ہوتی ہیں، شب و روز برزخ کے ہوتے ہیں۔ اس زندگی کو دنیوی زندگی پر قیاس کر کے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ برزخ میں میت زندہ ہوتی ہے، اسے ثواب و عذاب ہو رہا ہوتا ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ قبروں میں مُردوں کا زندہ ہونا، منکر نکیر کا سوال ہونا، عذابِ قبر کافر اور فاسق کے لیے ہونا سب حق ہے۔ اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔

Scanned with CamScanner

فائدہ:

دکھ یا تکلیف یا آرام وآسائش زندہ کے لیے ہوتا ہے۔ جس میں حیات نہیں اس میں ان چیزوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کا تصور ہی تب بنتا ہے جب روح کا تعلق بدن سے ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ روح جسم کے ساتھ واپس جوڑ دی جائے۔ اور یہ متواترات یعنی حضور ﷺ سے لے کر آج تک متواتر ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ روح کو بدن کی طرف لوٹا یا جاتا ہے، لیکن اس تعلق کی کیفیت پھر اپنی اپنی ہے۔ انبیاءؑ میں روح وبدن کا تعلق ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کہ دنیوی زندگی میں ہوتا ہے۔ شہداً کا تعلق بھی دنیوی زندگی کا سا ہوتا ہے۔ صالحین کے روح وبدن کا تعلق بھی بہت مضبوط بلکہ بالکل (دنیوی) زندگی جیسا ہوتا ہے۔ عامۃ الناس میں بھی یہ تعلق ہوتا ہے، اگرچہ اُس درجے کا نہیں ہوتا جیسا کہ شہداً اور صالحین کا ہوتا ہے۔ بدن گل سڑ جاتا ہے لیکن پھر بھی ہر ذرہ احساسات رکھتا ہے یعنی بعد الموت ہر انسانی بدن کے ساتھ روح کا تعلق رہتا ہے لیکن اعمال اور درجات کی بنا پر تعلق کی کیفیت ونوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ روح وبدن کے اس تعلق پر امت کا اجماع ہے۔

سماع موتی پر اجماع امت ہے

حضور اکرم ﷺ نے امت کو تعلیم دی ہے کہ جب قبرستان سے گزریں تو کہیں السلام علیکم دار قوم مومنین۔

وَ هٰذَا خِطَابٌ لِمَنْ يَّسْمَعُ وَ يَعْقِلُ وَ لَوْ لَا هٰذَا لَخِطَابُ لَكَانُوْا بِمَنْزِلَةِ خِطَابِ الْمَعْدُوْمِ وَ الْجِمَادِ وَ السَّلَفُ مُجْمِعُوْنَ عَلٰى هٰذَا وَ قَدْ تَوَاتَرَاتِ الْآثَارُ عَنْهُمْ بِاَنَّ الْمَيِّتَ يَعْرِفُ بِزِيَارَتِ الْحَيِّ لَهٗ وَ يَسْتَبْشِرُ... ثُمَّ قَالَ، وَالْخِطَابُ وَ النِّدَآءُ لِمَوْجُوْدٍ يَسْمَعُ وَ يُخَاطِبُ وَ يَعْقِلُ وَ يَرُدُّ وَاِنْ لَّمْ يَسْتَمِعِ الْمُسْلِمُ اَوْ يَسْمَعُ...

(تفسیر ابن کثیر، ۳:۴۳۸، ۴۳۹)

"یہ خطاب (سلام کہنا) اس شخص کے لیے ہے جو سنتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بمنزلہ خطاب معدوم اور پتھر کے تھا (اور یہ محال ہے)۔ سماع موتی پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ اور متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ میت اس زندہ کو پہچانتا ہے جو اس کی زیارت کو جاتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے۔"
پھر ابن کثیر نے فرمایا، "یہ خطاب ایسے آدمی کے لیے ہوتا ہے جو سنتا ہے، سمجھتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے خواہ سلام کہنے والا جواب سنے یا نہ سنے۔"

فائدہ:

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قبر سے مراد یہی گڑھا ہے۔ اسی میں عذاب ہوتا ہے، بدن اسی گڑھے میں ہے۔ ہاں یہ برزخ کا حصہ ہے۔ جیسے انسان دنیا میں آباد ہے مگر زمین کے کسی حصہ میں آباد ہوتا ہے، اسی طرح میت برزخ میں ہے مگر کسی حصہ میں ہے اور وہ حصہ قبر ہے جس میں مدفون ہے۔

سوال: اگر قبر سے عالمِ برزخ مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ گڑھا مراد ہو تو کئی حدیثوں کی تکذیب لازم آئے گی۔ مثلاً جس میت کو درندے کھا گئے، پانی میں ڈوب گیا، آگ میں جل گیا تو اس کی قبر کہاں؟ پس قبر کے ایسے معنی عام لیے جائیں جس میں تمام افراد شامل ہوں، نیز رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج میں کسی کو خونی نہر میں معذّب پایا، کسی کو تنور میں وغیرہ۔ حالانکہ وہ قبر میں نہ تھے۔

الجواب: علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

اِنَّمَا اُضِيْفَ الْعَذَابُ اِلَى الْقَبْرِ لِكَوْنِ مُعْظَمِهٖ يَقَعُ فِيْهِ، وَ لِكَوْنِ الْغَالِبِ عَلَى الْمَوْتٰى اَنْ يُّقْبَرُوْا۔۔۔(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر، ۳: ۲۳۳)

"عذاب کی نسبت قبر کی طرف بوجہ اکثریت کے کی گئی ہے کہ اکثر قبر ہی میں عذاب ہوتا ہے۔ اور غالب حکم یہی ہے کہ میت کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔"

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ قبر میں دفن کرنا ایک قانون ہے۔ اس کے خلاف واقعہ شاذ ہوگا جو قانون کو توڑ نہیں سکتا۔ پانی میں ڈوب جانے کے متعلق قرآن مجید نے بتا دیا کہ: اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا (نوح: ۲۵) فرعونی غرق کیے گئے اور فوراً آگ میں داخل کر دیئے گئے۔ یعنی جہاں بدن کے ذرات ہوں گے ان سے روح کا تعلق عذاب وثواب کے لیے لازمی ہوگا۔

آگ میں جل جانے کے متعلق بخاری میں صاحبِ وصیّت کا واقعہ موجود ہے، جس نے وصیت کی تھی کہ میرے جسم کو جلا دیا جائے۔ راکھ کو پانی میں پھینک دیا جائے، کچھ ہوا میں اڑا دی جائے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اجزأ کو جمع کر کے زندہ کیا اور سوال کیا۔۔۔۔ الخ۔ زندہ کرنا بتاتا ہے کہ سوال و جواب کے وقت بدن میں روح آجاتی ہے۔ صاحبِ وصیت کی روح تو زندہ تھی، پھر ذرات کا جمع کرنا اور زندہ کرنا بتاتا ہے کہ روح کا تعلق بدن سے قائم کیا گیا ہے۔ رہا یہ امر کہ شبِ معراج میں حضور ﷺ نے روح کو معذّب پایا نہ کہ جسم کو، تو ثابت کیا جا چکا ہے کہ روح اور جسم دونوں کو عذاب ہوتا ہے اور روح جہاں بھی ہو اس کا تعلق بدن سے رہتا ہے۔ شبِ معراج، برزخ میں روح کو معذب دیکھنے سے جسم کے عذاب کی نفی کیسے لازم آئی؟ خوب سمجھ لو کہ اگر بدن کو عذاب نہ ہوتا تو اعادۂ روح کی حاجت نہ تھی، روح جہاں ہوتی عذاب ہو جاتا۔ اور یہ کہ قبر سے گڑھا مراد ہے ورنہ تعاد الروح الی جسدہ۔۔۔ بے فائدہ ہے یعنی روح تو پہلے برزخ میں تھی پھر اعادہ برزخ سے برزخ کی طرف کیونکر ہوا؟

سوال: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى۔۔۔(النمل: ۸۰)، اور وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ۔۔۔(الفاطر: ۲۲) میں کفار کو حقیقی موتی سے تشبیہ دی گئی ہے جو حقیقی معنوں میں موتی ہیں۔ ان سے تو نفی سماع یقیناً ثابت ہوتی ہے۔

الجواب: اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ میت پر حقیقی معنیٰ موت کا اطلاق ہو جائے اور ہونا بھی چاہیے۔ رہا لَا تُسْمِعُ۔۔۔

کا معاملہ تو یہ حقیقی معنوں پر محمول نہ ہوگا بلکہ مجاز مراد لیا جائے گا۔ قاعدہ ہے کہ مشبّہ کو مشبّہ بہ سے، ایک وصفِ مشہور
میں، جو مشبہ بہ کو لازم ہے، تشبیہ دی جاتی ہے۔ تشبیہ کی حقیقت یہ ہے کہ اِشْتِرَاکُ الشَّیْئَیْنِ فِیْ وَصْفٍ لَازِمٌ لِاَحَدِھِمَا وَ مَشْھُوْرٌ بِہٖ... جیسے زید اسد۔ یہاں کفار کو وصفِ موت میں تو تشبیہ نہیں دی گئی کیونکہ
وصف دونوں میں مشترک نہیں۔ کفار تو حیات ہیں، بلکہ سماع میں تشبیہ دی گئی ہے۔ سماع میں یہ دونوں شریک
ہیں۔ لیکن سماع سے مطلق سماع مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ اس وصف میں دونوں مشترک نہیں۔ کفار کان رکھتے تھے
خوب سنتے تھے، پھر مطلق سماع کی نفی کیسے مراد ہوسکتی ہے؟ لہٰذا یہاں "اطلاق مطلق علی المقید" ہے۔ یعنی
سماع نافع، جو نفع سے مقید ہے، مطلق سماع مراد نہیں۔ پس آیت مذکرہ بالا میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح انبیاء
کی تبلیغ کا مُردوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اسی طرح اُن کی تبلیغ کفار کو بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی کیونکہ وہ موتی القلوب
ہیں۔ ثابت ہوا کہ یہاں مطلق کی نفی نہیں ہورہی بلکہ اُس سماع کی نفی ہے جو انسان کے لیے مفید ثابت ہو، اور یہی
وصف ان میں مشترک ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں "اسماع" کی نفی ہے، "سماع" کی نہیں۔ اس بنیاد پر بعض جدید مفسرین قرآن جو
فی الحقیقت محرفینِ قرآن ہیں اور جو فنِ تحریفِ کتابِ الٰہی میں اہلِ کتاب اور دیگر محرفین حضرات سے بھی سبقت لے گئے ہیں،
یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ "سماع مطاوع ہے اسماع کا، اور مطاوع تابع ہوتا ہے اپنے مطاوعہ کا جو اصل ہے، اور فرع اپنے اصل کے
مخالف نہیں ہوتا۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ سماع کو اسماع کا مطاوع بنانا ہی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ از قبیل تَرَتُّبُ اَحَدِ
الْفِعْلَیْنِ عَلَی الْاٰخَرِ مِنْ غَیْرِ تَاْثِیْرٍ... ہے، جیسے اَسْمَعْتُہٗ فَلَمْ یَسْمَعْ... یا، ھَدَاہُ فَلَمْ یَھْتَدِ...
یہ افعال تَرَتُّبُ اَحَدِ الْفِعْلَیْنِ عَلَی الْاٰخَرِ مِنْ غَیْرِ تَاْثِیْرٍ ہیں۔

جواب ثانی: افعالِ انسانی دو قسم ہیں۔ عادیہ طبعیہ یعنی بطورِ عادت اور خرقِ عادت۔
قسم ثانی کے افعال کا صدور انسان سے خواہ اپنے اختیار سے ہی ہو جائے اُن کی نسبت انسان کی طرف نہیں کی
جاتی بلکہ باری تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے۔ آیت بالا میں اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ تم نہیں سنا سکتے، میں سنا سکتا ہوں۔
اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ... (فاطر:۲۲)، اور وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی
(الانفال:۱۷)، اور فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ (الانفال:۱۷)، وغیرہ
اسی طرح اولیاء اللہ جو برزخ والوں سے کلام کرتے ہیں، وہ بھی خرقِ عادت کے طور پر ہوتی ہے۔ امورِ عادیہ سے نہیں ہوتی۔

سوال: کسی نے حلف اٹھایا کہ میں زید سے کلام نہیں کروں گا یا کپڑا نہیں پہناؤں گا، یا اسے نہیں پیٹوں گا۔ اگر اس سے
یہ افعال زید کی موت کے بعد صادر ہوئے تو حانث نہ ہوگا کیونکہ میت میں حس نہیں، نہ سنتا ہے نہ مارنے سے
متألم ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

الجواب: ایمان کی بنیاد عرف پر ہے، عرف میں کلام کرنا، مارنا وغیرہ افعال حیاتِ حالی سے مقید ہیں۔ مثلاً زید مر گیا، اس کی میراث تقسیم ہو گئی، بیوی دوسری جگہ نکاح کر گئی۔ پھر کسی نبی کے معجزہ یا ولی کی کرامت سے زندہ ہوا تو اُسے نہ عورت ملے گی نہ میراث، کیونکہ اس کا تعلق سابقہ حیات سے تھا۔ یا مثلاً ایک کافر مر گیا، کسی نبی کے معجزہ سے زندہ ہوا، اب اگر ایمان لائے تو قبول نہ ہوگا کیونکہ کفر و ایمان کا تعلق حیاتِ سابقہ سے تھا۔ اسی طرح اس حلف کا تعلق بھی حیاتِ معروف سے ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ میت سنتا نہیں، یا متالم نہیں ہوتا حماقت ہے۔ پھر اس استدلال کو آئمہ کرام سے منسوب کرنا اُن پر بہتان ہے۔

وَاَمَّا اَئِمَّتُنَا فَهُمْ بَرِيْئُوْنَ عَنْ اِنْكَارِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ وَاِنَّمَا حَكَمُوْا فِي الْحَلْفِ بِالضَّرْبِ وَ الْكَلَامِ وَ الدُّخُوْلِ عَلَيْهِ وَ نَحْوِهَا بِعَدَمِ الْحِنْثِ عِنْدَ وُجُوْدِ هٰذِهِ الْاَشْيَاءِ بِالْمَيِّتِ لِكَوْنَ الْاِيْمَانِ مَبْنِيَّةً عَلَى الْعُرْفِ وَ الْعُرْفُ قَاضٍ عَلٰى اَنَّ هٰذِهِ الْاُمُوْرَ يُرَادُ بِهَا اِرْتِبَاطُهَا مَا دَامَ الْحَيَاةُ لَا بَعْدَ الْمَوْتِ فَالْكَلَامِ بِالْمَيِّتِ وَاِنْ كَانَ كَلَامًا حَقِيْقَةً وَيُوْجَدُ فِيْهِ الْاِسْمَاعُ وَ الْاِفْهَامُ لٰكِنَّ الْعُرْفَ يَحْكُمُ بِاَنَّ الْمُرَادَ فِيْ قَوْلِهٖ لَا اُكَلِّمُكَ هُوَ الْكَلَامُ حَالَةَ حَيَاتِهٖ وَ كَذَا الْاِيْلَامُ وَاِنْ كَانَ يَتَحَقَّقُ فِي الْمَيِّتِ لٰكِنَّ الْعُرْفَ قَاضٍ عَلٰى اَنَّ الْمُرَادَ فِيْ قَوْلِهٖ لَا اَضْرِبُكَ هُوَ ضَرْبُهٗ حَيًّا لَا ضَرْبِهٖ مَيِّتًا ...
(شرح وقایہ، ۲: ۲۵۴)

"جہاں تک ہمارے آئمہ کرام کا تعلق ہے، وہ ان امور کے انکار سے بری ہیں۔ انہوں نے میت کو مارنے، اس سے کلام کرنے وغیرہ افعال کی صورت میں حانث نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ ایمان کی بنا عرف پر ہے اور عرف پر ہی ان امور کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد حالی زندگی میں لی جاتی ہے، نہ کہ بعد موت۔ اور میت سے جو کلام کی جائے اگرچہ وہ کلام حقیقی ہوتی ہے اور اس میں اسماع و افہام پایا جاتا ہے لیکن عرف کی رُو سے اس کے قول کا تعلق کہ میں کلام نہیں کروں گا، حالتِ حیات سے ہے، اور یہی صورت ایلام کے بارے میں ہے خواہ اس کا تحقق میت میں ہو جائے۔ لیکن عرف کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قول سے مراد کہ میں اسے نہ ماروں گا، حیات سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ بعد موت سے۔"

سوال: حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عائشہؓ سماع موتی کا انکار فرماتے ہیں، آخر کیوں؟

الجواب: فاروق اعظمؓ کے مبینہ انکار کی بنیاد جس روایت پر رکھی گئی ہے، اس کی حقیقت ملاحظہ ہو:

وَكَانَ اِذَا ظَهَرَ عَلٰى قَوْمٍ اَقَامَ بِالْعَرْصَةِ ثَلٰثَ لَيَالٍ. فَلَمَّا كَانَ بِبَدْرٍ الْيَوْمِ الثَّالِثِ اَمَرَ بِرَاحِلَتِهٖ فَشُدَّ عَلَيْهَا رَحْلُهَا ثُمَّ مَشٰى وَاتَّبَعَهٗ اَصْحَابُهٗ حَتّٰى قَامَ عَلٰى شَفَةِ الرَّكِيِّ فَجَعَلَ يُنَادِيْهِمْ بِاَسْمَائِهِمْ .... فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ مَا تُكَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ

Scanned with CamScanner

لَا اَرْوَاحَ لَهَا قَالَ النَّبِيُّ ﷺ وَ الَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ... (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب حکم الاسراء، ۳۴۵)

"حضور ﷺ کی عادت مبارک یہ تھی کہ جب کسی قوم پر فتح پاتے تو تین دن رات وہاں قیام فرماتے۔ جب بدر میں تیسرا دن آیا تو سواری کا حکم دیا، اس پر پالان رکھا گیا۔ پھر آپ ﷺ بدر کے گڑھے کی طرف چلے گئے اور اُس کنوئیں کے کنارے کھڑے ہوئے جس میں صنادیدِ قریش کی لاشیں پڑی تھیں، پھر اُن کا نام لے لے کر پکارنے لگے۔۔۔پس حضرت عمرؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! آپ ان اجساد سے کیسے کلام فرمارہے ہیں جن میں ارواح نہیں؟ تو حضور ﷺ نے جواب دیا، قسم اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے۔۔۔الخ"

فائدہ:

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا سوال انکار پر مبنی نہیں تھا بلکہ دریافت مسئلہ کے لیے تھا۔ جب حضور اکرم ﷺ کا جواب سنا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، تو کیا عمر فاروقؓ جیسے شخص کے انکار کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے؟ اس کے بعد انکار تو کیا حضرت عمرؓ کے تعجب ہی کی کوئی دلیل پیش کیجیے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعجب اس بات پر تھا کہ ان کو مرے ہوئے تین دن گزر گئے ہیں، نکیرین کے سوال و جواب کا وقت تو گزر چکا، تو کیا اب بھی یہ لوگ سنتے ہیں؟ اس امر کی شہادت دوسری روایات سے ملتی ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ امْرَاَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَسَاَلَ عَنْهَا بَعْدَ اَيَّامٍ فَقِيْلَ لَهٗ: اِنَّهَا مَاتَتْ... (الترغیب والترہیب، ۱:۱۹۶؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلاۃ علی القبر، ۱:۱۱۱)

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ رنگ کی عورت مسجد میں رہتی تھی۔ حضور ﷺ نے ایک روز اُسے نہ پایا۔ چند روز کے بعد اس کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ مر چکی ہے۔"

دوسری روایت عبیداللہ ابن مرزوق سے:

فَمَرَّ عَلٰى قَبْرِهَا فَقَالَ: مَا هٰذَا الْقَبْرُ فَقَالُوْا: قَبْرُ اُمِّ مِحْجَنٍ، قَالَ الَّتِيْ: تَقُمُّ الْمَسْجِدَ، قَالُوْا: نَعَمْ فَصَفَّ النَّاسَ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ قَالَ: اَيُّ الْعَمَلِ وَجَدْتِ اَفْضَلَ؟ قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ ﷺ اَتَسْمَعُ؟ قَالَ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهَا فَذَكَرَ اَنَّهَا اَجَابَتْهُ قُمُّ الْمَسْجِدِ... (الترغیب والترہیب، ۱:۱۹۷)

"ابن مرزوق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ اس کی قبر کے پاس سے گزرے، پوچھا، یہ کس کی قبر ہے؟ عرض کیا، اُم محجنؓ کی۔ فرمایا، جو مسجد میں جھاڑو دیتی تھی؟ عرض کی، جی ہاں! پھر صف باندھی گئی، نماز جنازہ پڑھی، پھر اُم محجنؓ سے سوال کیا

نے کون سا عمل افضل پایا؟ صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ آپ کی آواز سن رہی ہے؟ فرمایا، تم اس سے زیادہ نہیں سن سکتے۔ پھر عورت نے جواب دیا، مسجد میں جھاڑو دینے کے عمل کو افضل پایا۔"

فائدہ:

ان احادیث سے دوام سماع کا ثبوت ملتا ہے (اگر اللہ تعالیٰ چاہے)۔ اُم محجنؓ سے حضور اکرم ﷺ نے کئی دنوں کے بعد پوچھا کہ تُو نے کس عمل کو افضل پایا؟ تو اس نے جواب دیا۔ معلوم ہوا کہ میت سے سوال و جواب کے لیے وقت کی قید جو منکرین سماع موتیٰ پیش کرتے ہیں، غلط ہے۔

مشکوٰۃ اور الترغیب کی روایات ملانے سے یہ معلوم ہوا کہ سماع موتیٰ کا ثبوت حضور اکرم ﷺ سے ایک صورت میں تین دن بعد اور دوسری صورت میں کئی دن بعد ثابت ہے۔ یہ ہے حضرت عمرؓ کے مبینہ انکار سماع موتیٰ کی حقیقت، اور بس۔

رہا حضرت عائشہؓ کے انکار کا سوال تو اُن کی زبانی ایک روایت ملاحظہ ہو:

قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ مَا مِنْ رَجُلٍ یَزُوْرُ قَبْرَ اَخِیْہِ وَ یَجلِسُ عِنْدَہٗ اِلَّا اِسْتَأْنَسَ بِہٖ وَرَدَّ عَلَیْہِ۔۔۔ (تفسیر ابن کثیر، ۴۳۸:۳)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرے اور قبر کے پاس بیٹھے تو وہ میت اس سے مانوس ہوتا اور سلام کا جواب دیتا ہے۔"

یہ حدیث سماع موتیٰ کے حق میں واضح ہے۔ مگر منکرین اس پر جرح کرتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، لیکن جب اس کی شواہد مرفوع حدیثیں موجود ہیں تو یہ قوی ہوگئی جیسا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا مَا مِنْ اَحَدٍ یَمُرُّ بِقَبْرِ اَخِیْہِ الْمُسْلِمِ کَانَ یَعْرِفُہٗ فِی الدُّنْیَا فَیُسَلِّمُ عَلَیْہِ اِلَّا رَدَّ اللہُ عَلَیْہِ رُوْحَہٗ حَتّٰی یَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ رَوَاہُ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ مُصَحِّحًا لَہٗ۔۔۔ وَفِیْ رِوَایَۃٍ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ اِذَا مَرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرٍ یَعْرِفُہٗ فَسَلَّمَ عَلَیْہِ رَدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ۔۔۔ (تفسیر ابن کثیر، ۴۳۸:۳)

"ابن عباس سے صحت کے ساتھ مرفوعاً مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص جو اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر سے گزرے جو اسے دنیا میں پہچانتا تھا اور اسے سلام کہے تو اللہ تعالیٰ میت کی روح کو لوٹا دیتا ہے اور وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی ایسے آدمی کی قبر سے گزرے جسے وہ پہچانتا ہو اور وہ سلام کہے تو میت اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔"

ثُمَّ قَالَ هٰذَا بَابٌ فِیْہِ اٰثَارٌ کَثِیْرَۃٌ عَنِ الصَّحَابَۃِ۔۔۔ (ایضاً، ۴۳۹:۳)

"پھر ابن کثیر نے فرمایا کہ سماع میت کے بارے میں صحابہؓ کے بہت سے آثار منقول ہیں۔"

Scanned with CamScanner

کتب فقہ میں عدم سماع کا ذکر باب یمین میں ہے اور یہ مشائخ کا اپنا استخراج ہے۔ ورنہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے کوئی روایت عدم سماع کی نہیں۔ "شرح وقایہ کے حاشیہ پر ترجمانِ حنفیت مولانا عبدالحئی لکھنوی فرماتے ہیں:

وَ بِالْجُمْلَةِ لَمْ يَدُلَّ دَلِيْلٌ قَوِيٌّ عَلٰى نَفْيِ سِمَاعِ الْمَيِّتِ وَ اِدْرَاكِهٖ وَ فَهْمِهٖ وَ تَأَلُّمِهٖ لَا مِنَ الْكِتَابِ وَ لَا مِنَ السُّنَّةِ بَلِ السُّنَنُ الصَّحِيْحَةُ الصَّرِيْحَةُ دَالَّةٌ عَلٰى ثُبُوْتِهَا لَهٗ وَ الْحَقُّ فِيْ هٰذَا الْمَقَامِ اَنَّ هٰذَا كُلَّهٗ مِنْ تَقْرِيْرَاتِ الْمَشَآئِخِ وَ تَوْجِيْهَاتِهِمْ وَ تَكَلُّفَاتِهِمْ وَ لَا عِبْرَةَ بِهَا حِيْنَ مُخَالَفَتِهَا لِلْاَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَةِ وَ آثَارِ الصَّحَابَةِ الصَّرِيْحَة... (شرح وقایہ، ۲: ۲۵۴)

"حاصلِ کلام یہ ہے کہ کوئی دلیلِ قوی، نفی سماع میت پر، یا نفی ادراکِ میت، یا نفی فہم میت پر، یا میت کے متالم نہ ہونے پر، نہ قرآن کریم سے ثابت ہے نہ حدیث نبوی ﷺ سے۔ بلکہ احادیث صحیح تو سماع موتی کے ثبوت پر دال ہیں اور حق بات یہ ہے کہ عدم سماع کی تمام تقریریں مشائخ کی ہیں۔ انہی کی توجیہات اور انہی کے تکلفات بارد ہیں۔ ان تقریرات کا کوئی اعتبار نہ ہوگا جب وہ احادیثِ صحیحہ اور صریح آثار صحابہؓ کے خلاف ہیں۔"

فوائد:

(۱) قرآن مجید میں کوئی آیت موجود نہیں جس کا مدلول عدمِ سماعِ میت ہو۔

(۲) جو آیاتِ قرآنی عدم سماع کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں وہ تاویلاتِ باطلہ کے ارتکاب کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ حضور اکرم ﷺ کا عقیدہ اور صحابہ کرامؓ کا عقیدہ خلافِ قرآن تھا۔ (العیاذ باللہ!)

(۳) حضرت عزیزؑ اور اصحابِ کہف کے واقعہ سے عدم سماع ثابت کرنا اسی قسم کی غلطی ہے، حالانکہ ان میں علم کی نفی مقصود ہے، سماع کی نفی مراد نہیں اور عدمِ علم، عدمِ سماع کو مستلزم نہیں۔ باقی جس قدر آیاتِ قرآنی اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں ان کا مدلول عدم سماع نہیں بلکہ عدم مختاریت اور عدم الوہیت ہے۔ کفار چونکہ آلہٗ باطلہ کو مختارِ کل اور مختار بالذات سمجھتے تھے، اس لیے مختاریت کی نفی کی گئی ہے۔

(۴) ان احادیث اور آثارِ صحابہؓ سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ کا عقیدہ سماع موتی کے حق میں تھا۔ جمہور علما کا بھی یہی عقیدہ تھا جیسا کہ فتح الباری کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے۔ فقہ کے آئمہ اربعہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ کی رائے اس سلسلہ میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

Scanned with CamScanner

تنبیہ: یہ امر خصوصیت سے پیش نظر رہے کہ سماع موتی سے مراد اہلِ قبور اور اولیاء اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا نہیں بلکہ اس سے مراد وہی ہے جو احادیث میں بیان کی گئی ہے، ورنہ نداء غائبانہ تو شرک ہے اور قبور کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ فاعلِ مختار صرف اللہ کی ذات ہے۔ انبیاء اور اولیاء سب اُس کے محتاج ہیں۔

سماعِ موتی پر اجماعِ امت ہے

اس پر اجماعِ امت ہے کہ قبروں والے سنتے ہیں۔ علماء و اکابرینِ امت نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے (حدیث شریف میں ہے) کہ مسلمانوں کے قبرستان سے گزریں تو انہیں اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ... کہیں۔ یعنی اے ایمان والی قوم کے گھر والو! تم سب پر اللہ کی سلامتی ہو۔ پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطاب کا حکم دیا تو اس کا مطلب ہے کہ جسے مخاطب کیا جاتا ہے وہ سنتا اور سمجھتا بھی ہے، ورنہ کسی پتھر، دیوار کو تو کوئی سلام نہیں کہتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ایسا حکم دینا ہی بعید ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ "یہ خطاب (سلام کہنا) اُس شخص کے لیے ہے جو سنتا ہو اور سمجھتا بھی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بمنزلہ خطاب معدوم اور پتھر کے تھا" اور پتھروں کو سلام کون کرتا ہے؟

چونکہ سلام کرنے کا حکم ہر مسلمان کو ہے اور ہر مسلمان میں یہ قوت نہیں کہ وہ ارواح سے کلام کر سکے، یہ تو اخص الخاص لوگوں کو نصیب ہوتی ہے لیکن سلام کرنے والا سنے یا نہ سنے، اہلِ قبر اس کا سلام سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ ایک اور بڑی خوبصورت بات علامہ ابن کثیرؒ نے نقل فرمائی کہ میت اس زندہ کو پہچانتا ہے جو اس کی قبر پر جاتا ہے۔ پہچاننے سے مراد یہ کہ زندگی میں اس کو جانتا تھا تو ہی بعد الموت اسے پہچانتا ہے۔ اور وہ (میت) اسے دیکھ کر خوش بھی ہوتا ہے۔ اسے خوشی ہوتی ہے کہ یہ میرا حال پوچھنے کو آیا۔ بات ہو رہی ہے تو ایک ضمنی بات عرض کرتا چلوں۔ ساتھیوں کو اعلیٰ حضرتؒ کی قبر مبارک پر جانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ ہونا بھی چاہیے، وہ ہمارے شیخ ہیں اور وہ سارے فیض کی اساس ہیں لیکن جو بات حضرتؒ نے ارشاد فرمائی وہ یہ ہے کہ "جو لوگ زندگی میں مجھ سے ملتے تھے وہ میری قبر پر آئیں تو مجھے ان سے اُنس ہوتا ہے، لیکن جن لوگوں کو میں جانتا نہیں ان کے یہاں آنے کا فائدہ؟ انہیں اپنے شیخ سے فیض لینا ہے۔ فیض میرے پاس وہ بھی لینے نہ آئے جو زندگی میں مجھ سے ملتا تھا۔ میں اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہوں، اب جن کی ذمہ داری ہے وہ پوری کریں۔" جس زمانے میں ہم چار پانچ ساتھی حضرتؒ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم میں سے ایک ساتھی بڑے اچھے زمیندار تھے۔ انہیں کسی کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔ واپسی پر حضرتؒ سے ملنے آئے، میں بھی حاضرِ خدمت تھا۔ بتانے لگے کہ میں لاہور گیا تو سوچا کہ آیا ہوا ہوں تو داتا صاحب کے مزار پر حاضری دیتا چلوں۔ میں مزار مبارک پر گیا، پہلے تو وہ قبرِ مبارک میں نظر نہ آئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد تشریف آوری ہوئی تو میں نے سلام عرض کیا۔ آپؒ کا سلام بھی پہنچایا۔ بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں تو میں نے ان سے عرض کیا کہ باہر لوگ مزار کو سجدے کر رہے ہیں، دیواروں کو بوسے دے

Scanned with CamScanner

رہے ہیں، شرک وبت پرستی ہورہی ہے تو حضرت آپ ان لوگوں کو منع کیوں نہیں کرتے؟ فرمانے لگے "میں تو اکثر اپنی آخری منازل میں رہتا ہوں، قبر کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا ہوں چونکہ جو کچھ یہاں ہورہا ہوتا ہے وہ میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ اور حق بات یہ ہے کہ جب ہم دنیا میں تھے، ہم نے توحید کی تبلیغ کی، شرک وبت پرستی کے خلاف جہاد کیا لیکن مرنے کے بعد ہم تبلیغ کرنے کے مکلف نہیں رہے۔ اب یہ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے اسے تم نبھاؤ۔ میری ذمہ داری نہیں ہے کہ میں برزخ سے زندوں کو تبلیغ کرتا پھروں۔" داتا صاحب کی یہ بات سادہ لوح زمیندار کے پلے نہ پڑی۔ پھر حضرتؒ نے فرمایا! بڑا اہم سا مسئلہ ہے۔ انہوں نے بالکل ٹھیک فرمایا۔ جو دنیا سے گزر گیا وہ اس بات کا مکلف نہیں کہ دنیا والوں کو تبلیغ کرتا پھرے۔ یہ ان کا کام ہے جو پیچھے رہ گئے۔

فائدہ:

اس سے ثابت ہوا کہ قبر سے مراد یہی گڑھا ہے (جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے)۔ جب ثواب وعذاب قبر کا انکار ممکن نہ رہا تو یار لوگوں نے ایک شوشہ چھوڑا کہ جی! قبر سے مراد علیین اور سجین ہے، عالم برزخ مراد ہے۔ یہ بے سروپا بات تھی کہ جب قرآن حکیم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمایا گیا کہ آپ منافقین کا جنازہ بھی نہ پڑھیں اور ان کی قبر پر بھی تشریف نہ لے جائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم برزخ میں تو تشریف نہیں لے جاتے تھے، یقیناً قبر سے مراد وہ گڑھا ہی تھا جس میں منافقین دفن تھے۔ قبرستان سے گزرتے ہوئے سلام کہنے کا جو حکم دیا گیا ہے کہ قبرستان سے گزرو تو انہیں کہو کہ اے اہل ایمان جو قبروں میں ہو! میں تمہیں السلام علیکم کہتا ہوں تو اس سے بھی اس گڑھے کے ہی قبر ہونے کا ثبوت ملتا ہے، اسی میں ثواب وعذاب ہوتا ہے۔ ہاں! یہ برزخ کا حصہ ہے جیسے انسان دنیا میں آباد ہے مگر زمین کے کسی حصے میں آباد ہوتا ہے۔ اسی طرح میت برزخ میں ہے مگر کسی ایک حصہ میں اور وہ حصہ قبر ہے جس میں وہ مدفون ہے۔

سوال: اگر قبر سے عالمِ برزخ مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ گڑھا مراد ہو تو کئی حدیثوں کی تکذیب لازم آئے گی۔ مثلاً جس میت کو درندے کھا گئے یا کوئی پانی میں ڈوب گیا، آگ میں جل گیا تو اس کی قبر کہاں ہوگی؟ پس قبر کے ایسے معنیٰ عام لیے جائیں جس میں تمام لوگ شامل ہوں۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کسی کو خونی نہر میں معذب پایا، کسی کو آگ کے تنور میں وغیرہ حالانکہ وہ قبر میں نہ تھے۔

الجواب: حضرتؒ جواب میں فرماتے ہیں۔ علامہ ابنِ حجر فرماتے ہیں "عذاب کی نسبت قبر کی طرف بوجہ اکثریت کے کی گئی ہے یعنی لوگوں کی غالب اکثریت قبر میں دفن کی جاتی ہے۔ ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی جل کر کوئلہ ہی ہو جائے یا درندے کھا جائیں وغیرہ، تو کہیں قبر نہ بن سکے۔ معمول کے خلاف کوئی ایک واقعہ اصول کو توڑ نہیں سکتا۔

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ قبر میں دفن کرنا ایک قانون ہے۔ اس کے خلاف واقعہ 'شاذ' ہوگا جس کی بناء پر قانون منسوخ نہیں ہوتا۔ ہندو، سکھ اپنے مردے جلا دیتے ہیں۔ جل جانے کے بعد بھی اجزائے بدن مادے کی کسی نہ کسی صورت میں موجود

Scanned with CamScanner

ہی رہتے ہیں۔ مادہ فنا نہیں ہوتا اس لیے وہ ذرات بدن جو شکل بھی اختیار کریں، انہیں عذاب ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ہمسایہ گاؤں نور پور میں اکثریت سکھوں کی تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھر بہت کم تھے۔ وہ جگہ جہاں وہ لوگ اپنے مردے جلاتے تھے وہ ہمارے کھیتوں کے ساتھ تھی۔ سکھ اپنی اہم شخصیات کو نالے کے پار ایک مخصوص جگہ پر جلاتے تھے۔ جہاں چتا جلاتے اوپر ڈھیری سی بنا دیتے جسے یہ لوگ سمادھی کہتے ہیں۔ ایک چار دیواری میں ایک تھڑا سا بنا کر اس پر قدم کا نشان بنا رکھا تھا جس پر وہ ماتھا ٹیکتے تھے۔ اسی تھڑے کے گرداگرد سکھوں کی سمادھیاں تھیں۔ میں اور حاجی خدا بخش مرحوم ایک دن وہاں سے گزر رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا تو میں نے ان سے کہا کہ یار حاجی! ان سکھوں میں سے کسی سے پوچھو تو سہی کہ انہوں نے برزخ کو کیسا پایا؟ ایک سمادھی کے سکھ نے جواب دیا کہ مرنے کے بعد مجھے اٹھا کر یہاں لایا گیا اور آگ لگا دی۔ وہ آگ روز بروز تیز ہوتی گئی، بھڑک رہی ہے اور بھڑکتی ہی جا رہی ہے۔ یعنی جہاں اس سکھ کی راکھ پڑی تھی وہیں اس کو عذاب ہو رہا تھا۔ عذاب وثواب تو ہر حال میں ہوتا ہے۔ روح کو بھی ہوتا ہے، اجزائے بدن جہاں جہاں ہوں انہیں وہیں ہو رہا ہے۔ جیسے اگر کسی کو ثواب ملنا ہو، اسے کوئی جلا بھی دے تو بظاہر بدن جلتا رہے لیکن در حقیقت اس میں اسے راحت محسوس ہوتی ہے۔ اللہ قادر ہے وہ اس کے لیے آگ میں بھی جنت کی ہوائیں اور خنکی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ کسی شہید کو کوئی جلا دے۔ کوئی جل کر راکھ ہی کیوں نہ بن جائے لیکن نتائج ایمان اور اعمال کے مطابق بدل جاتے ہیں اور ہر ایک کے ایمان کے مطابق اس کے ساتھ سلوک ہوتا ہے۔

پانی میں ڈوب جانے والوں کے متعلق قرآن مجید نے بتا دیا کہ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق ہوئے۔ قرآن نے ان کا انجام بتا دیا کہ غرق تو پانی میں ہوئے، داخل آگ میں ہو گئے۔ جہاں بھی بدن کے ذرات ہوں گے ان سے روح کا تعلق عذاب وثواب کے لیے لازمی ہوگا۔ اسی طرح آگ میں جل جانے کے متعلق بخاری شریف میں 'صاحبِ وصیت' کا قصہ موجود ہے کہ ایک شخص نے وصیت کی کہ میں مر جاؤں تو مجھے جلا کر میری راکھ کو بہت دور دور تک بکھیر دینا، اڑا دینا، کچھ پانی میں پھینک دینا، پہاڑوں پر بکھیر دینا وغیرہ۔ اس کی وصیت پر عمل کیا گیا۔ پھر اللہ کے حکم سے سارے اجزا اکٹھے ہو کر وہ زندہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا کہ تُو نے ایسا کیوں کیا، یہ حیلہ کس لیے تھا؟ تو اس نے عرض کی، بار الٰہ! میں تیرے عذاب سے ڈرتا تھا۔ سوچا کہ میں ہوں گا نہ مجھے عذاب ہوگا۔ کیونکہ عذاب سے ڈرنا ایمان کی علامت ہے، دلیل ایمان ہے، اسی سبب سے اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ تو یہاں حضرتؒ فرماتے ہیں کہ زندہ کرنا بتاتا ہے کہ سوال وجواب کے وقت بدن میں روح آ جاتی ہے۔ صاحبِ وصیت کی روح تو زندہ تھی پھر بھی ذرات کا جمع کرنا اور زندہ کرنا بتاتا ہے کہ روح کا تعلق بدن سے قائم کیا گیا۔ رہا یہ سوال کہ حضور اکرم ﷺ نے شب معراج صرف روحوں کو عذاب میں دیکھا، وہاں بدن نہیں تھے۔ لیکن اس سے صرف روح کے لیے عذاب کیسے ثابت ہوتا ہے؟ روح کو جو عذاب ہوتا ہے حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق بدن کے ہر ذرے کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں ہو۔ روح کو برزخ میں عذاب ہو رہا ہے تو بدنِ مادی، دنیا میں جہاں کہیں بھی اس کے اجزا ہیں اسے عذاب ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ جان لیں کہ اگر بدن کو عذاب نہ ہوتا تو اعادۂ روح کی حاجت نہ تھی۔ کیا

ضرورت تھی کہ قبر میں دوبارہ روح کو بدن کی طرف لوٹایا جاتا، بدن تو مر کر ختم ہو گیا تھا؟ سوال جواب صرف روح سے ہی کر لیے جاتے۔ اور قبر سے مراد یہی گڑھا ہے جس میں جسم کو دفن کیا جاتا ہے کیونکہ تُعَادُ الرُّوْحُ اِلَى الْجَسَدِ قبر ہی کی طرف ہوتا ہے کہ جسم تو قبر میں ہے۔ ورنہ اگر قبر بھی برزخ میں ہے تو پھر روح کو برزخ سے برزخ کی طرف لوٹایا جانا کیا معنی رکھتا ہے۔

سوال: اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى... اور وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ... میں کفار کو حقیقی موتی سے تشبیہ دی گئی ہے جو حقیقی معنوں میں موتی ہیں۔ ان آیات سے تو نفی سماع یقیناً ثابت ہوتی ہے۔

الجواب: "آپ ﷺ مُردوں کو نہیں سنا سکتے" اور "نہ یہ آپ ﷺ کی ذمہ داری ہے کہ ان کو سنائیں جو قبروں میں ہیں" ان دونوں آیاتِ کریمہ کو معترضین اپنے اعتراض کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ میت پر حقیقی معنیٰ میں موت کا اطلاق ہو جائے اور ہونا بھی چاہیے۔ رہا لَا تُسْمِعُ... کا معاملہ تو یہ حقیقی معنوں پر محمول نہ ہوگا بلکہ مجاز مراد لیا جائے گا کیونکہ جب حضور ﷺ ارشاد فرماتے تھے تو کیا کافر سنتے نہیں تھے؟ اگر نہیں سنتے تھے تو ناراض کیوں ہوتے تھے؟ جواب کیوں دیتے تھے؟ اعتراض کیسے کرتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ بظاہر تو سنتے تھے لیکن 'نہ سننے' کا مطلب یہ ہے کہ سننے سے انہیں فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ نصیحت کو سن کر سمجھا نہ جائے، اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے بلکہ ناصح اور نصیحت دونوں پر اعتراض کیا جائے تو اس کا سننا، نہ سننے کے برابر ہوتا ہے۔ اس لیے ان آیاتِ کریمہ سے مجازی معنیٰ مراد لیے جائیں گے (ورنہ آپ ﷺ کے ارشادات مومنین اور کفار دونوں ہی سنتے تھے)۔

گرامر کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو لَا تُسْمِعُ... کا معاملہ حقیقی معنوں پر محمول نہ ہوگا بلکہ مجاز مراد لیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جسے جس شئے سے تشبیہ دی جاتی ہے، اس میں اور تشبیہ دی جانے والی چیز میں کوئی وصف مشترک ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ "فلاں تو شیر ہے"۔ اب فلاں کوئی درندہ تو نہیں ہوتا۔ شیر میں اور فلاں میں جرأت اور دلیری وصفِ مشترک ہے جس کی بنا پر اسے بھی شیر کہہ دیا گیا ہے کیونکہ تشبیہ کی حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایک وصف مشترک ہوتا ہے جو دونوں میں لازم ہوتا ہے اور وہ اس مشترکہ حوالے سے مشہور ہوتے ہیں۔ جیسے کہا جائے کہ زیدٌ اسدٌ۔ زید شیر ہے۔ زید تو انسان ہے، وہ جانوروں کو مار کر نہیں کھاتا، خون نہیں چاٹتا، کچا گوشت نہیں کھاتا، پس کوئی ایک وصف زید میں اور شیر میں بہت نمایاں ہے جس کی بنا پر زید کو شیر کہہ دیا گیا۔

سماعِ موتیٰ کی نفی میں جو دو آیاتِ قرآنی اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى... "بے شک آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے" اور وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ... "آپ ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں"، پیش کی جاتی ہیں۔ ان آیات کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہاں اسماع یعنی سنانے کی نفی ہے، 'سماع' یعنی سننے کی نہیں۔ اسی بات میں سے بعض جدید مفسرین جو تفسیرِ قرآن کے پردے میں تحریفِ قرآن کی سعیٔ مذموم کرتے ہیں، نکتہ اٹھاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'سماع' مطاوع (اثر قبول کرنے والا یا کہہ لیں کہ مفعول) ہے اور یہ تابع ہے اپنے مطاوعہ 'اسماع' کے (مطاوعہ اثر مرتب کرنے

Scanned with CamScanner

والے کو کہتے ہیں۔اسے فاعل سمجھ لیں)۔یعنی اگر سنایا جائے گا تو سنا بھی جائے گا اور اگر سنایا ہی نہ جاسکے تو سنا کیسے جائے گا وغیرہ۔لہٰذا اگر ان آیات میں سنانے کی نفی کی گئی ہے تو پھر مردے کے لیے سننے کی نفی خودبخود ہوگئی کیونکہ اسماع اصل ہے اور سماع فرع۔اور فرع اپنے اصل کے مخالف نہیں ہوتا۔

حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل مطاوعت کی دو اقسام ہیں۔ پہلی یہ کہ مطاوعہ (فاعل) کا اثر مطاوع (مفعول) قبول کرے۔ دوسری یہ ہے کہ مطاوعہ اپنا اثر مرتب کرے لیکن مطاوع اس اثر کو قبول نہ کرے۔ ان نام نہاد مفسرین کا یہ کہنا ہے کہ 'سماع مطاوع ہے اسماع کا۔' گرائمر کی رُو سے ہی غلط ٹھہرتا ہے۔'سماع' ثلاثی مجرد کے باب 'افعال' سے تعلق رکھتا ہے اور بابِ افعال میں مطاوع والا خاصہ ہے ہی نہیں (یہ خاصہ تَفَعُّل تَفَاعُل کے ابواب میں ہوتا ہے)۔ اور یہ ہی بات اعلیٰ حضرتؒ نے دلیل کے طور پر کہی ہے کہ سماع اور اسماع اس قبیل سے ہیں کہ ایک کے فعل کا دوسرے پر مرتب ہونا، تاثیر کے بغیر ہے (یعنی ضروری نہیں کہ فاعل کا اثر مفعول قبول کرے)، مثلاً اَسْمَعْتُهٗ ''میں نے اس کو سنایا'' فَلَمْ یَسْمَعْ... ''اس نے نہیں سنا''۔ یعنی سنانے کا ترتب تو ہے لیکن تاثیر نہیں ہے۔ دوسری مثال ہے ھداہ... ''اُس نے اُس کو ہدایت دی''، لیکن فَلَمْ یَهْتَدِ... ''اس نے ہدایت نہیں پکڑی''۔ یعنی دوسرے پر ہدایت کا ترتب تو ہے لیکن بغیر تاثیر کے۔ لہٰذا لَا تَسْمِعُ... کا مطلب لَا یَسْمَعُ... ہرگز نہیں ہوسکتا۔

وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ... میں کفار کو وصفِ موت سے تو تشبیہہ نہیں دی گئی کیونکہ یہ وصف دونوں میں مشترک نہیں۔ کفار کو میت نہیں کہا گیا بلکہ سماع کے اعتبار سے نفی کی گئی ہے۔ جس طرح میت کو سننے کا فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے عمل کی مہلت ختم ہوچکی، وہ مکلف نہیں رہا۔ اب وہ کسی نبیؑ کی یا عالم اور ولی کی بات سنتا بھی ہے تو اس کی توبہ کا وقت تو گزر چکا۔ اسی طرح کافر کو بھی ارشاداتِ عالیہ سننے کا فائدہ نہیں ہوتا خواہ اس کی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ صورتِ حال کچھ بھی ہو، فائدہ نہ اٹھا سکنے کی قدر دونوں میں مشترک ہے۔ تشبیہہ بھی سماع میں ہی دی گئی ہے۔ لیکن سماع سے مطلق سماع مراد نہیں ہے کیونکہ اس وصف میں دونوں مشترک نہیں۔ کفار کان رکھتے تھے، خوب سنتے تھے، پھر مطلق سماع کی نفی کیسے مراد ہوسکتی ہے؟ لہٰذا یہاں 'اطلاقِ مطلق علی المقید' ہے یعنی وہ کسی خاص حصے پر اس کا مقید ہے جو متعین کردیا گیا ہے۔ تو یہاں سماع مطلق ہے لیکن اس کا وہ حصہ مراد ہے جس سے سن کر فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بندہ اس پر عمل کرسکتا ہے۔ میت تو عہدِ عمل سے گزر گیا کہ وہ سن کر عمل کرسکے۔ اسی طرح کافر سنتا تو ہے مگر (اپنی ضد کی وجہ سے ہی سہی) عمل نہیں کرسکتا۔ نہ کر سکنے کا وصف دونوں میں مشترک ہے۔ انبیاءؑ کی تبلیغ کا مُردوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اسی طرح کافر کو بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی کیونکہ 'موتی القلوب' ہیں، ان کے دل مرچکے ہیں۔

بعض مفسرین جدید جو تفسیر کے پردے میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ نام نہاد مسلمان تحریفِ قرآنی کی کوشش میں یہود و نصاریٰ سے سبقت لے گئے۔ الفاظِ قرآنی کا بدلنا تو بعید از قیاس ہے، اس لیے تفسیر اور توضیح میں مختلف مطالب اور گرائمر کے ہیر پھیر سے آیات کے معنی مختلف کردیتے ہیں، یا تشریح کا رخ غلط سمت میں پھیر دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

کتاب کے باہر مسلمان کا نام دیکھ کر لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں 'اسماع' کی نفی ہے 'سماع' کی نہیں۔ اس بنیاد پر یہ جدید مفسرین نکتہ اٹھاتے ہیں کہ 'سماع مطاوع' ہے اسماع کا۔ اور مطاوع تابع ہوتا ہے اپنے مطاوعہ کا جو اصل ہے اور فرع اپنے اصل کے مخالف نہیں ہوتا۔

جوابِ ثانی:

انسانی افعال دو قسم کے ہیں۔ ایک امورِ عادیہ ہیں جسے ہر انسان کر سکتا ہے، دوسرے خرقِ عادت ہیں یعنی عادت سے بالاتر جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔ مخصوص لوگوں میں کوئی خاص قوت ہوتی ہے، وہی کر سکتے ہیں۔ خرقِ عادت یا کرامت کا اظہار صاحبِ کرامت کی خواہش پر بھی ہو تو یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ اس کا فعل ہے کیونکہ اس فعل کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ جتنے امور خرقِ عادت ہیں، وہ نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت، اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے کہ یہ اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ آیت بالا میں اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ ''تم نہیں سنا سکتے، میں سنا سکتا ہوں۔'' یعنی کہ 'تم نہیں سنا سکتے' سے یہاں یہ مراد ہے کہ اگر میں چاہوں تو سناؤں یعنی بطور خرقِ عادت میت بھی سن سکتا ہے، عادتاً نہیں سنا سکتا۔

إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ یعنی آپ نہیں سنا سکتے، اللہ جسے چاہے سنا سکتا ہے، یا وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى... جیسے بدر میں مٹھی بھر ریت حضور ﷺ نے پھینکی جو ہر کافر کی آنکھ میں پڑ گئی، لیکن قرآن میں آیا وَمَا رَمَيْتَ... آپ ﷺ نے ریت نہیں پھینکی۔ إِذْ رَمَيْتَ... جب آپ ﷺ نے پھینکی تھی، تو آپ ﷺ نے نہیں پھینکی یعنی بظاہر تو فعل حضور ﷺ کے دستِ اقدس سے صادر ہوا لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں، آپ ﷺ نے نہیں پھینکی۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى... یہ تو اللہ نے پھینکی ہے۔ یعنی بظاہر تو ریت آپ ﷺ نے پھینکی لیکن درحقیقت یہ اللہ کا فعل تھا۔ اس نے ریت کے ذرات ہر کافر کی آنکھ تک پہنچائے۔ اور فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ... ''(بدر میں) آپ لوگوں نے (کفار کو) قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا۔'' حالانکہ قتل کا فعل صادر تو صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں ہوا۔ اسی طرح کچھ لوگ امورِ عادیہ سمجھ کر انکار کیے جا رہے ہیں حالانکہ اہلِ قبور سے بات چیت خرقِ عادت کے طور پر ہوتی ہے۔

سوال: کسی نے حلف اٹھایا کہ میں زید سے کلام نہیں کروں گا، اسے کپڑے نہیں پہناؤں گا، یا اسے نہیں پیٹوں گا۔ اگر اس سے یہ افعال زید کی موت کے بعد صادر ہوئے تو حانث نہ ہوگا کیونکہ میت میں حس نہیں۔ سنتا ہے نہ مارنے سے تالم ہوتا ہے۔

الجواب: اعتراض کرنے والے بھی عجیب ذوق رکھتے ہیں۔ اعتراض یہ کیا ہے کہ کسی نے قسم کھائی ہو کہ میں اس بندے سے نہ بات کروں گا نہ اسے نہلاؤں دھلاؤں گا، نہ کپڑے پہناؤں گا۔ اب وہ بندہ مر گیا ہے تو اس کے بعد وہ اسے مخاطب کرتا ہے، غسل دیتا ہے اور کفن پہناتا ہے تو اس سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ مرنے کے بعد وہ بندہ تو رہا نہیں، یہ میت ہے۔ اس کا جواب حضرتؒ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

ایمان کی بنیاد عرف (جو چیز معروف ہو) پر ہے۔ اسی طرح قسم کی بنیاد معروف چیز پر ہوگی۔ معروف یہ ہے کہ کسی سے بات نہیں کرنی ہے، تو اگر وہ زندہ ہوگا تو قطع کلام کرے گا، مارے گا بھی تب جب وہ زندہ ہوگا۔ ایک شخص

Scanned with CamScanner

مر گیا، اس کی میراث تقسیم ہوگئی، بیوی دوسری جگہ نکاح کر گئی، اب وہ شخص کسی نبیؑ کے معجزہ سے یا کسی ولی کی کرامت سے زندہ ہوگیا تو اسے نہ اس کی عورت دوبارہ ملے گی نہ ہی میراث کیونکہ ان چیزوں کا تعلق سابقہ حیات سے تھا۔ اسی طرح اگر کوئی مرا تو کفر پر تھا، نبیؑ کے معجزے سے زندہ ہوگیا۔ اب وہ کہے کہ میں ایمان لاتا ہوں تو وہ قبول نہیں ہوگا کیونکہ ایمان سابقہ حیات کی شرط تھا۔ تب تک وہ مکلف تھا جب تک اس کے پاس حیاتِ ارضی تھی۔ کفر و ایمان کا تعلق حیاتِ سابقہ سے تھا، اسی طرح حلف کا تعلق بھی حیاتِ معروف سے ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ میت سنتا نہیں یا متالم نہیں ہوتا، حماقت ہے۔ پھر اس استدلال کو آئمہ کرام سے منسوب کرنا ان پر بہتان ہے۔

شرح وقایہ کے حاشیہ پر مولانا عبدالحق نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "جہاں تک ہمارے آئمہ کرام کا تعلق ہے، وہ ان امور کے انکار سے بری ہیں یعنی انہوں نے سماعِ موتی کا انکار نہیں فرمایا۔ انہوں نے میت کو مارنے، اس سے کلام کرنے وغیرہ افعال کی صورت میں حانث نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ ایمان کی بنیاد عرف پر ہے اور عرف پر ہی ان امور کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد حالی زندگی میں لی جاتی ہے یعنی زندگی میں وہ قسم لاگو تھی، جب زندگی بدل گئی، برزخی ہوگئی تو وہ قسم نہ رہی۔ اور میت سے جو کلام کی جائے، اگرچہ وہ کلام حقیقی ہوتی ہے اور اس میں اسماع و افہام پایا جاتا ہے لیکن عرف کی رُو سے اس کے قول کا تعلق کہ میں کلام نہیں کروں گا، حالاتِ حیات سے ہے۔ اور یہی صورت ایلام کے بارے میں ہے خواہ اس کا تحقق میت میں ہو جائے۔ لیکن عرف کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قول سے مراد کہ میں اسے نہ ماروں گا، حیات سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ بعد موت سے۔

اگلا سوال یہ ہے کہ

سوال: حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عائشہؓ سماعِ موتی کا انکار فرماتے ہیں۔ آخر کیوں؟

الجواب: اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جس روایت کی بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ سماعِ موتی کا انکار فرماتے ہیں اس کی حقیقت ملاحظہ ہو۔ نبی کریم ﷺ جب کسی جگہ کسی جنگ میں فتح پاتے تو عادتِ مبارکہ تھی کہ وہاں تین دن قیام فرماتے۔ میدانِ بدر میں بھی جب تیسرا دن آیا تو آپ ﷺ نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس پر پالان رکھا گیا، آپ سوار ہوئے اور بدر کے گڑھے کی طرف چلے۔ جا کر اس کے کنارے کھڑے ہوگئے (اس گڑھے کو قلیبِ بدر کہتے ہیں)، اس میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی ستر لاشیں موجود تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک ایک کا نام لے کر آواز دی کہ "اے فلاں ابن فلاں! اے فلاں ابن فلاں! اللہ نے جو وعدہ کیا تھا ہم نے تو اس کو سچ پایا، تم بتاؤ تم نے بھی سچ پایا کہ نہیں؟" حضرت عمرؓ حیران ہو کر پوچھنے لگے "یارسول اللہ ﷺ! آپ ان سے بات کر رہے ہیں جن کی صرف لاشیں پڑی ہیں؟ ان میں روح تو نہیں ہے۔" حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا، "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے ...... الخ۔" صاف ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں حضرت عمرؓ نے انکار تو نہیں کیا، مسئلہ پوچھا ہے کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ تو مردہ پڑے ہیں، قتل ہو چکے، آج تیسرا دن ہے انہیں

Scanned with CamScanner

مرے ہوئے اور ان کی روحیں تو ان میں نہیں ہیں تو آپ ﷺ ان سے کیسے کلام فرما رہے ہیں؟ جب حضور ﷺ نے یہ جواب ارشاد فرمایا تو عمر فاروقؓ جیسی ہستی پھر انکار کی گنجائش کہاں رکھتی تھی بلکہ اس کے بعد تو آپؓ نے بھی سماع موتی پر تعجب بھی نہیں کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ رنگ کی عورت مسجد میں رہتی تھی۔ حضور ﷺ نے ایک روز اُسے نہ پایا۔ اس کے متعلق پوچھا تو عرض کیا گیا کہ وہ فوت ہو گئی ہے۔ دوسری روایت عبداللہ ابن مرزوق سے ہے کہ حضور ﷺ کا گزر ہوا تو ساتھ ایک قبر تھی، اس کے پاس سے گزرے تو پوچھا، ''یہ کس کی قبر ہے؟'' عرض کیا گیا ''ام محجنؓ کی۔'' تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ ''وہ ام محجنؓ جو مسجد میں رہتی اور مسجد میں جھاڑو دیتی تھی؟'' عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ! وہی ہے۔ حضور ﷺ نے رفقاء کو صف بنانے کا حکم دیا اور اس عورت کا جنازہ پڑھا۔ وہ عورت چونکہ رات کو فوت ہوئی تھی، اس لیے صحابہ کرامؓ نے اس کا جنازہ پڑھا اور رات ہی کو دفن کر دیا۔ حضور ﷺ کو مطلع نہیں کیا گیا تھا کیونکہ حجرہ مبارک کے باہر سے آواز دینا اللہ کے حکم سے منع کر دیا گیا تھا اور حضور ﷺ سو جاتے تو کوئی بیدار کرنے کی جرأت بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ آپ ﷺ پر سوتے ہوئے بھی وحی نازل ہوا کرتی تھی۔

ایک بات اور بھی ہے جس کی وضاحت میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں ایک وتیرہ بن چکا ہے کہ کوئی مر جائے تو لاش کو کئی کئی دن تک انتظار میں رکھا جاتا ہے کہ فلاں عزیز کویت سے آ رہا ہے، فلاں کو امریکہ میں کوئی فلائیٹ نہیں مل رہی وغیرہ۔ جبکہ قانون یہ ہے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو جتنی جلدی ہو سکے اسے دفن کر دیا جائے۔ ام محجنؓ کا معاملہ بھی یہی ہوا۔ ان کی وفات رات کو ہوئی جب حضور ﷺ حجرہ مبارک میں رونق افروز ہو چکے تھے۔ چونکہ آپ ﷺ کا حکم مبارک تھا (اور ہے) کہ میت کو جتنی جلدی ہو سکے دفن کر دیا جائے، چنانچہ انتظار نہیں کیا گیا کہ صبح ہو اور آپ ﷺ تشریف لے آئیں۔ یہ سوچنے کی بجائے کہ مسجد کی خادمہ ہے، آپ ﷺ شفقت فرماتے ہیں، پھر جنازہ آپ ﷺ پڑھائیں تو باعث صد ہزار برکت و رحمت بھی ہو، آپ ﷺ کے حکم پر عمل کیا گیا اور ام محجنؓ دفن کر دی گئیں۔ اس کے کئی روز بعد آپ ﷺ کا گزر ان کی قبر سے ہوا، پوچھا قبر کس کی ہے؟ عرض کیا گیا ام محجنؓ کی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''صف بناؤ، اس کا جنازہ پڑھیں گے۔'' اس خاتون کی خوش نصیبی کہ حضور ﷺ کی عنایت و کرم کی سزاوار ٹھہریں اور آپ ﷺ نے ان کی قبر پر دوبارہ جنازہ پڑھایا۔ اب ہمارے ہاں کا رواج ہی الٹ ہے کہ میت ہفتوں پڑی رہتی ہے۔ جو ساٹھ ستر سال بعد فوت ہوا ہے اتنے سال اس کا چہرہ کیا نہیں دیکھا۔ وہ فوت ہو گیا ہے تو اسے اس کے گھر پہنچاؤ۔ پھر ایک اور بدعت ایجاد کر لی گئی ہے یعنی جنازہ پڑھ کے دعا مانگنا۔ طریقہ یہ ہے کہ میت کا جنازہ پڑھو، فوراً میت کو قبر پر لے جاؤ، قبر میں دفن کر کے مٹی برابر کرو، پھر اس پر کھڑے ہو کر دعا پڑھو۔ یہی مسنون طریقہ ہے۔

جب بھی آپ ﷺ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی، کہیں دور لڑی گئی جنگ کے شہداؑ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی تو آپ ﷺ نے نماز کے بعد دعا فرمائی کیونکہ میت تو تھی نہیں جسے جنازے کے بعد دفن کرنا ہوتا۔ یہ تمام باتیں حضور ﷺ

Scanned with CamScanner

کی سنت ہیں، انہیں معمولی بات کہہ کر نظر انداز کرنا انتہا درجہ کی غلطی ہے۔ آپ ﷺ کی کوئی بات معمولی نہیں۔ آپ ﷺ کی ہر بات، ہر حرکت و سکوت عظیم ہے اور ہر بات کا اتباع لازمی ہے کیونکہ آپ ﷺ کا ہر فعل سنت ہے اور ہر سنت دین ہے۔ اگر نماز جنازہ پڑھ کر فوراً دعا مانگنا شروع کردی جائے تو یہ خلاف سنت ہوگا، بدعت ہوگی۔ ایک سنت گرے گی تو ایک بدعت کھڑی ہوگی۔ میں جنازے کے فوراً بعد دعا نہیں مانگتا تو لوگ ناراض ہوجاتے ہیں بلکہ بعض تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ جنازہ ہی نہیں ہوا۔ دعا حضور ﷺ کے طریقۂ مبارکہ پر جنازہ پڑھنے، میت کو قبر میں اتارنے، دفن کرکے مٹی برابر کرنے کے بعد مانگنا چاہیے۔ نہ یہ کہ اس بدعت کو کفر و اسلام کا معیار ہی بنالیا جائے کہ یہ جنازہ کے فوراً بعد دعا مانگتا ہے تو مسلمان ہے، نہیں مانگتا تو مسلمان نہیں ہے۔

بات ام محجن ؓ کی ہورہی تھی۔ جنازہ پڑھا کر حضور ﷺ نے قبر پہ کھڑے ہوکر ام محجن ؓ سے سوال کیا "تم نے کون سا عمل افضل پایا؟" تو انہوں نے جواباً عرض کیا، "یا رسول اللہ ﷺ! مسجد میں جھاڑو دینا ہی میں نے افضل پایا۔" (چونکہ ان کا وہی کام تھا، وہی مقبول ہوگیا) تو صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ آپ ﷺ کی آواز سن رہی ہے؟" فرمایا، "تم اس سے زیادہ نہیں سن سکتے۔"

فائدہ:

ان احادیث سے دوامِ سماع کا ثبوت ملتا ہے (اگر اللہ چاہے) کیونکہ یہ خرقِ عادت ہے۔ عادتاً ایسا نہیں ہوتا اور خرقِ عادت امور، اللہ کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ نے میت سے تدفین کے کئی دنوں بعد بات کی تھی۔ سماع موتی کے منکرین کہتے ہیں کہ منکر نکیر کے سوال و جواب کے لیے تو روح کا تعلق بدن سے قائم کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد ختم کردیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس کی تردید ہوگئی کیونکہ حضور ﷺ نے نکیرین کے سوال و جواب کے کئی دن بعد بات کی۔

اب یہ جو کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ ؓ بھی سماع موتی کا انکار کرتی تھیں تو اس سلسلے میں ایک روایت حقیقت بیان کرتی ہے۔ 'ابن کثیر' میں ہے کہ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، "جو شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرے اور قبر کے پاس بیٹھے تو وہ میت اس سے مانوس ہوتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے۔" حضور ﷺ سے یہ روایت سیدہ ؓ نقل کررہی ہیں تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سماع موتی سے انکاری ہیں۔ اور یہ حدیث سماع موتی کے حق میں واضح ہے۔ منکرین اس حدیث پر جرح کرتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ لیکن جب دوسری مرفوع حدیثیں (مرفوع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا کوئی راوی ضعیف نہ ہو، وہ حضور ﷺ تک بلا عذر پہنچے) اس کی تائید کرتی ہیں تو پھر یہ بھی قوی ہوگئی۔ پھر اگر اس کا راوی کمزور بھی ہے تو بھی حدیث صحیح ہے۔ 'ابن کثیر' سے دوسری حدیث جو حضرت ؒ نے نقل فرمائی وہ حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا، "جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی قبر سے گزرتا ہے جس سے وہ دنیا میں واقف تھا، وہ سلام کرتا ہے تو وہ (صاحب قبر) اس کو پہچانتا بھی ہے، خوش ہوتا ہے اور اس کے سلام کا جواب بھی دیتا ہے۔" ایک اور حدیث حضرت ابن عباس ؓ اور ابی ہریرہ ؓ دونوں سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی قبر

Scanned with CamScanner

سے گزرتا ہے اور اسے سلام دیتا ہے تو اللہ صاحبِ قبر کی روح کو لوٹا دیتا ہے اور وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے۔"

ابن کثیر فرماتے ہیں، کہ سماعِ موتی کی تصدیق بہت سے صحابہؓ سے نقل کی گئی ہے۔

فقہ کی کتابوں میں سماعِ موتی کا ذکر 'بابِ یمین' قسم کے باب میں ہے کہ قسم کا اطلاق مرنے کے بعد ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ انکار، سماع کا باب نہیں ہے بلکہ 'قسم' سے متعلق ہے۔ کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا کیا مرنے کے بعد بات کی تو وہ قسم ٹوٹ گئی یا نہیں؟ یہ ذکر مرنے والے کا مسئلہ قسم کے ضمن میں آیا اور یہ مشائخ کا اپنا استخراج ہے ورنہ امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے کوئی روایت عدمِ سماع کی نہیں ہے۔ 'شرح وقایہ' کے حاشیہ پر ترجمانِ حنفیت مولانا عبدالحئی لکھنوی فرماتے ہیں، "حاصلِ کلام یہ ہے کہ کوئی دلیلِ قوی، نفیِ سماعِ میت یا نفیِ ادراکِ میت یا نفیِ الم میت یا میت کے متالم نہ ہونے پر، نہ قرآن کریم سے ثابت ہے نہ حدیثِ نبوی سے بلکہ احادیثِ صحیحہ تو سماعِ موتی کے ثبوت پر دال ہیں اور حق یہ ہے کہ عدمِ سماع کی تمام تقریریں مشائخ کی ہیں۔ انہی کی توجیہات اور انہی کے تکلفات بارد ہیں۔ ان تقریروں کا کوئی اعتبار نہ ہوگا جب وہ احادیثِ صحیحہ اور صریح آثارِ صحابہؓ کے خلاف ہیں۔

فوائد:

1۔ قرآن مجید میں کوئی آیت موجود نہیں جس سے عدمِ سماعِ میت پر دلیل نکال سکیں۔

2۔ جو آیاتِ قرآنی عدمِ سماع کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں، درحقیقت ان کی غلط تاویل پیش کی جاتی ہے۔ اگر قرآن کی آیت سے یہ مراد ہے تو پھر حضور ﷺ مردے سے کلام کیوں فرما رہے ہیں؟ صحابہ کرامؓ مردے سے کیوں بات کر رہے ہیں؟ اگر تاویلات کو صحیح مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عقیدہ خلافِ قرآن تھا۔ العیاذ باللہ!

3۔ حضرت عزیزؑ اور اصحابِ کہف کے واقعہ سے عدمِ سماع ثابت کرنا اسی قسم کی غلطی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت عزیزؑ سو سال فوت شدہ حالت میں رہے اور انہیں حالات کی کچھ سمجھ نہ آئی۔ اصحابِ کہف تین سو سال حالتِ نیند میں رہے اٹھے تو سمجھے کہ کوئی دن بھر ہی گزرا ہے، انہیں بھی تین صدیاں یاد نہیں تھیں۔ یعنی قصہ مختصر کہ مرنے کے بعد کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ان واقعات میں علم کی نفی مقصود ہے، سماع کی نفی مراد نہیں۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہ معروف موت نہیں تھی، اللہ کی طرف سے ایک چیز کا اظہار تھا جس میں انہیں علم سے محروم رکھا گیا اور نہ وہ حقیقی موت تھی۔ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس بات کو لازم نہیں کہ وہ بات سنی بھی نہ جا سکے اور یہ دونوں واقعات خرقِ عادت واقعات تھے۔ قدرت کی طرف سے یہ معجزہ مخلوق کو دکھایا گیا۔ اصحابِ کہف کو تین سو سال سے زیادہ عرصہ غار میں رکھا گیا۔ وہ مشرک بادشاہ مر گیا، اُس دور کے لوگ گزر گئے اور شہر اجڑ گئے۔ پھر اس کے بعد وہاں جو لوگ آباد ہوئے وہ اللہ پر یقین رکھتے تھے۔ بادشاہ اور رعایا اُس وقت کے مذہب عیسائیت کے پیروکار تھے۔ اُس دور میں ان عیسائیوں کے اندر ایک فتنہ پیدا ہو گیا۔ لوگ انکارِ قیامت کرنے لگے، حیات بعد الموت کا انکار کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا وغیرہ۔ علماء کی دلیلیں بھی بیکار جا رہی تھیں۔ انہیں اس فسادِ عقیدہ کا سدباب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اللہ کریم نے اصحابِ کہف کو بیدار کر دیا۔ اب

Scanned with CamScanner

صورتحال سے بے خبر اپنے وقت کا سکہ لے کر گئے کہ بازار سے کھانا لے آئیں۔ شہر میں پہنچے تو لوگوں کی زبان اور لباس مختلف، سب کچھ ہی بدلا ہوا پایا۔ جب دکاندار کو پیسے دیئے۔ عجیب وغریب لباس اور حلیے کا، کوئی اور ہی زبان بولتا ہوا اجنبی، تین سو سال پرانا سکہ دے رہا تھا، ایک شور مچ گیا۔ معاملہ بادشاہ تک پہنچا، اصحابِ کہف بادشاہ کو اس غار تک لائے اصل بات کھل گئی۔ اس کے بعد اللہ کریم نے انہیں پنہاں کر دیا اور موت دے دی اور وہ برزخ میں چلے گئے۔ لوگوں نے غار بند کر کے اوپر مسجد بنا دی۔ لیکن یہ واقعہ لوگوں کے لیے دلیل بن گیا کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی مل سکتی ہے اور ملتی ہے۔ حیات بعد الموت کا انکار ختم ہو گیا، لوگوں کو یقین آ گیا کہ اللہ قیامت کو اسی طرح مردے زندہ کرے گا۔ اسی طرح عزیرؑ کا واقعہ بھی خرقِ عادت ہے اور اس میں بھی عدمِ علم ہے کہ انہیں اس کے علم سے روک دیا گیا۔ اب یہ قاعدہ عام نہیں کہ ہر مُردہ نہیں سن سکتا۔ اور اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ اللہ مختارِ کل ہے، کوئی بندہ، نبی ہو یا ولی ہو، اس کے اختیار میں شریک نہیں۔ حضرت عزیرؑ جیسا نبی نہیں تو یہ پتھر کے گھڑے ہوئے بت کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟ اس بات میں تو یہ نکتہ پوشیدہ ہے نہ کہ سماعِ موتی۔

4۔ ان احادیث اور آثارِ صحابہؓ سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ کا عقیدہ سماعِ موتی کے حق میں تھا۔ جمہور علما کا بھی یہی عقیدہ تھا جیسا کہ 'فتح الباری' کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا۔ فقہ کے آئمہ اربعہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کی رائے اس سلسلہ میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنبیہ:

یہ بات اعلیٰ حضرتؒ نے تنبیہ کے طور پر لکھی ہے کہ اگر میت سنتا ہے تو ولی اللہ کی قبر پر جا کر یہ سمجھنا کہ یہ میری بات سن کر حاجت پوری کرے گا، یہ شرک ہے۔ میت حاجت روا، یا مشکل کشا نہیں ہے۔ اس کی حیثیت وہی ہے جو حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ آپ سلام کریں وہ جواب دیں گے۔ کسی نیک کی قبر پر جا کر دعا کریں لیکن دعا اللہ سے کریں۔ جگہ سے یہ فرق پڑتا ہے کہ آپ سڑک پر کھڑے ہو کر دعا کریں، بات اور ہے۔ مسجد میں دعا کریں تو مسجد کی برکت سے تاثیر بدل جائے گی۔ اسی طرح ولی اللہ کی قبر پر اس کی برکات شاملِ دعا ہو جاتی ہیں لیکن وہ ولی آپ کا حاجت روا نہیں ہے، حاجت روا وہی وحدہٗ لاشریک ہے، اور غائبانہ ندا کرنا تو شرک ہے۔ یہ صفت صرف اللہ کی ہے۔ قبور کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ فاعلِ مختار صرف اللہ کی ذات ہے۔ انبیاءؑ و اولیاء سب اس کے محتاج ہیں۔

چوتھا اعتراض: روح سے اکتسابِ فیض ممکن نہیں

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جو معارف اور کمالاتِ علمی، انسان نے دنیا میں حاصل کیے وہ بدن کی مفارقت کے بعد روح سے سلب نہیں کیے جاتے بلکہ برزخ میں جا کر دنیا کے مقابلے میں زیادہ واضح اور وسیع ہو جاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا دنیا کا کوئی انسان برزخ میں ارواح سے ملاقات کر سکتا ہے اور ان سے اخذِ فیض کر سکتا ہے یا نہیں؟

Scanned with CamScanner

چوتھا اعتراض: روح سے اکتسابِ فیض ممکن نہیں

فرمایا، یہ بیان تو کیا جا چکا ہے کہ جو معارف و کمالاتِ علمی انسان نے دنیا میں حاصل کیے، وہ بدن کی مفارقت کے بعد روح سے سلب نہیں کیے جاتے بلکہ برزخ میں جا کر دنیا کے مقابلے میں زیادہ واضح اور وسیع ہو جاتے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ دنیا کا کوئی انسان برزخ میں ارواح سے ملاقات کر سکتا ہے اور ان سے اخذِ فیض کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں سب سے پہلی دلیل حضرتؒ نے دی ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کی ارواحِ انبیاءؑ سے ملاقات

واقعہ معراج کے سلسلے میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ثُمَّ لَقِيَ اَرْوَاحَ الْاَنْبِيَآءِ فَاَثْنَوْا عَلٰى رَبِّهِمْ... (تفسیر ابن کثیر، ۳:۱۸)

"پھر حضورِ اکرم ﷺ نے انبیاء کے ارواح سے ملاقات کی اور ان ارواح نے اللہ تعالیٰ کی صفت وثنا کی۔"

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ:

قَالَ: لَقِيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى عَلَيْهِمُ السَّلَامُ قَالَ: فَتَذَاكَرُوْا اَمْرَ السَّاعَةِ قَالَ: فَرَدُّوْا اَمْرَهُمْ اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ، فَقَالَ: لَا عِلْمَ لِيْ بِهَا... فَرَدُّوْا اَمْرَهُمْ اِلٰى مُوْسٰى. فَقَالَ: لَا عِلْمَ لِيْ بِهَا... فَرَدُّوا الْاَمْرَ اِلٰى عِيْسٰى... الخ (تفسیر ابن کثیر، ۳:۱۶؛ مسند احمد، مسند عبداللہ بن مسعود، ۶:۱۹)

"حضور ﷺ نے فرمایا، میں معراج کی رات حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ملا۔ آپس میں قیامت کے متعلق گفتگو ہوئی، سب نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ کیا، پھر حضرت موسیٰؑ پھر حضرت عیسیٰؑ کی طرف مگر سب حضرات نے فرمایا، ہمیں قیامت کے متعلق کوئی علم نہیں۔"

حضورِ اکرم ﷺ کی ارواحِ انبیاءؑ سے ملاقات

واقعہ معراج کے سلسلے میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"پھر حضورِ اکرم ﷺ نے انبیاءؑ کے ارواح سے ملاقات کی اور ان ارواح نے اللہ تعالیٰ کی صفت وثنا کی۔"

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا، "میں معراج کی رات حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے ملا، آپس میں قیامت کے متعلق گفتگو ہوئی۔ سب نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ کیا پھر حضرت موسیٰؑ پھر حضرت عیسیٰؑ کی طرف مگر سب حضرات نے فرمایا، ہمیں قیامت کے متعلق کوئی علم نہیں۔" اور یہ روح سے ملاقات کی دلیل ہے۔ اب روح سے فائدہ حاصل کرنا یا اکتسابِ فیض کیسے ممکن ہے؟

Scanned with CamScanner

روح سے کسبِ فیض

فَمَرَرْتُ عَلٰی مُوْسٰی فَقَالَ بِمَا اُمِرْتَ قُلْتُ خَمْسِیْنَ صَلٰوۃً کُلَّ یَوْمٍ قَالَ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِیْعُ بِخَمْسِیْنَ صَلٰوۃً کُلَّ یَوْمٍ وَاِنِّیْ وَاللّٰہِ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اَشَدَّ الْمُعَالَجَۃِ فَارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَاسْئَلْہُ التَّخْفِیْفَ لِاُمَّتِكَ...
(مشکوۃ المصابیح، کتاب الفتن، باب المعراج، ۵۲۷،۵۲۸)

"حضور ﷺ نے فرمایا، میرا گزر حضرت موسیٰ پر ہوا، انہوں نے پوچھا آپ ﷺ کو کس چیز کا حکم ہوا؟ میں نے کہا دن رات میں پچاس نمازوں کا۔ انہوں نے فرمایا، آپ ﷺ کی امت پچاس نمازوں کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں نے آپ ﷺ سے پہلے لوگوں کا بڑا تجربہ کیا اور بنی اسرائیل کی اصلاح میں نہایت درجے کی کوشش کی۔ پس آپ ﷺ اپنے رب کے پاس لوٹ جائیں اور اپنی امت کے لیے تخفیف کی درخواست کریں۔"

فائدہ:

حضرت موسیٰ کے مشورہ سے حضور ﷺ بار بار لوٹ کر جاتے رہے حتیٰ کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔

لَقِیْتُ اِبْرَاھِیْمَ لَیْلَۃَ اُسْرِیَ بِیْ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِقْرَأْ اُمَّتَكَ مِنِّی السَّلَامَ وَاَخْبِرْھُمْ اَنَّ الْجَنَّۃَ طَیِّبَۃُ التُّرْبَۃِ عَذْبَۃُ الْمَآءِ وَاِنَّھَا قِیْعَانٌ وَاَنَّ غِرَاسَھَا سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ... (مشکوۃ المصابیح، کتاب الاسماء، باب ثواب التسبیح، ۲۰۲)

"حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ معراج کی رات میری ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی۔ آپؑ نے فرمایا، اپنی امت کو میرا سلام پہنچائیں اور انہیں بتائیں کہ جنت پاک صاف مٹی ہے، پانی میٹھا ہے، صاف میدان ہے، اس میں باغ لگانے والے یہ کلمات ہیں۔ سبحان اللہ۔۔۔۔ الخ۔"

فائدہ:

ان روایات سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے ارواحِ انبیاء سے ملاقات کی۔ ان کے پیغامات سنے اور ان کے مشورہ پر عمل کر کے امت کے حق میں تخفیف کرائی۔

یہ اصول پیشِ نظر رہے کہ جو کام حضور اکرم ﷺ نے کیا، یا فرمایا، یا انکار نہیں کیا، یا جو کام کسی نے آپ ﷺ کے سامنے کیا اور آپ ﷺ نے پسند فرمایا، یا آپ ﷺ نے کسی کام کا اشارہ فرمایا، یا سوچا، یا قصدِ فعل کیا، یہ سب الہام حدیث ہیں، اور امت رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہر فعل میں شریک ہے جب تک کہ تخصیص کی کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔ حضور اکرم ﷺ کے ایک فعل کی تفصیل تو ہم نے بیان کر دی، اب امت میں اس کی مثالیں دیکھیے۔

Scanned with CamScanner

روح سے کسبِ فیض

اس ضمن میں اعلیٰ حضرتؒ ایک حدیثِ مبارکہ مشکوٰۃ شریف، باب المعراج سے پیش کرتے ہیں "حضور ﷺ نے فرمایا، میرا گزر حضرت موسیٰؑ پر ہوا، انہوں نے پوچھا، 'آپ کو کس چیز کا حکم ہوا؟' میں نے کہا، دن رات میں پچاس نمازوں کا۔ انہوں نے فرمایا، آپ کی امت پچاس نمازوں کی طاقت نہیں رکھتی، میں نے آپ ﷺ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کی اصلاح میں نہایت درجے کی کوشش کی، پس آپ ﷺ اپنے رب کے پاس لوٹ جائیں اور تخفیف کی درخواست کریں۔"

فائدہ:

حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے حضور ﷺ بار بار لوٹ کر جاتے حتیٰ کہ پانچ نمازیں رہ گئیں اور یہ بھی ایک طرح سے حضرت موسیٰؑ کی روحِ اقدس سے فیض ہی حاصل ہوا۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "معراج کی رات میری ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی، آپؑ نے فرمایا، اپنی امت کو میرا اسلام پہنچائیں اور انہیں بتائیں کہ جنت پاک صاف مٹی ہے، پانی میٹھا ہے، صاف میدان ہے، اس میں باغ لگانے والے یہ کلمات ہیں، سبحان اللہ...... الخ۔"

فائدہ:

ان روایات سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے ارواحِ انبیاءؑ سے ملاقات کی، ان کے پیغامات سنے اور ان کے مشورے پر عمل کر کے امت کے حق میں تخفیف کروائی۔

یہ اصول پیشِ نظر رہے کہ جو کام حضور اکرم ﷺ نے کیا، یا کرنے کا حکم فرمایا، یا انکار نہیں کیا، یا جو کام کسی نے آپ ﷺ کے سامنے کیا اور آپ ﷺ نے پسند فرمایا، یا آپ ﷺ نے کسی کام کا اشارہ فرمایا، یا سوچا، یا قصدِ فعل کیا، یہ سب اقسامِ حدیث ہیں اور امت رسول کریم ﷺ کے ساتھ ہر فعل میں شریک ہے جب تک کہ کسی کام کی تخصیص نہ ہو جائے۔ یعنی ساری امت پر وہ کام اسی طرح لازم ہے۔ ہاں! اگر کسی کام کی کسی دلیل سے تخصیص کر دی جائے کہ یہ حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہے تو وہ الگ بات ہے۔

حضور ﷺ کے ایک فعل کی تفصیل تو بیان کر دی گئی۔ اب امت میں اس کی مثالیں دیکھتے ہیں۔

روح سے اجرائے فیض

حرہ کی جنگ کے سلسلے میں سعید بن عبدالعزیز کی زبانی حضرت سعیدؓ بن المسیب کا واقعہ سنیے:

قَالَ لَمَّا كَانَ اَيَّامُ الْحَرَّةِ لَمْ يُؤَذَّنْ فِيْ مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ ثَلَاثًا وَ لَمْ يُقَمْ۔ وَلَمْ يَبْرَحْ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ الْمَسْجِدَ وَ كَانَ لَا يَعْرِفُ وَقْتَ الصَّلٰوةِ اِلَّا بِهَمْهَمَةٍ يَّسْمَعُهَا

Scanned with CamScanner

مِنْ قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ۔۔۔(مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفتن، باب الکرامات، الفصل الثانی، ۵۴۵)

"فرمایا، ایامِ حرہ میں تین دن تک مسجد نبوی ﷺ میں نہ اذان ہوئی نہ اقامت، اور سعید بن المسیب ؒ برابر مسجد نبوی ہی میں رہے، اور انہیں نماز کے وقت کا علم صرف اُس آواز سے ہوتا تھا جو نبی اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک سے سنائی دیتی تھی۔"

روح سے اخذِ فیض کے متعلق علامہ ابن تیمیہ ؒ فرماتے ہیں:

وَقَالَ لَا يَدْخُلُ فِيْ هٰذَا الْبَابِ: مَا يُرْوٰى مِنْ اَنَّ قَوْمًا سَمِعُوا رَدَّ السَّلَامِ مِنْ قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ اَوْ قُبُوْرِ غَيْرِهٖ مِنَ الصَّالِحِيْنَ وَاَنَّ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ كَانَ يَسْمَعُ الْاَذَانَ مِنَ الْقَبْرِ لَيَالِيَ الْحَرَّةِ. وَنَحْوُ ذٰلِكَ وَهٰذَا كُلُّهٗ حَقٌّ لَيْسَ مِمَّا نَحْنُ فِيْهِ وَالْاَمْرُ اَجَلُّ مِنْ ذٰلِكَ وَاَعْظَمُ وَ كَذٰلِكَ اَيْضًا مَا يُرْوٰى: "اَنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلٰى قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ. فَشَكَا اِلَيْهِ الْجَدْبَ عَامَ الرَّمَادِ فَرَاٰهُ وَهُوَ يَاْمُرُهٗ اَنْ يَّاْتِيَ عُمَرَ فَيَاْمُرُهٗ اَنْ يَّخْرُجَ يَسْتَسْقِيْ بِالنَّاسِ فَاِنَّ هٰذَا لَيْسَ مِنْ هٰذَا الْبَابِ وَمِثْلُ هٰذَا يَقَعُ كَثِيْرًا لِمَنْ هُوَ دُوْنَ النَّبِيِّ ﷺ اَوْ لِغَيْرِهٖ مِنْ اُمَّتِهٖ۔۔۔(اقتضاء الصراط المستقیم مخالفۃ اصحاب الجحیم، ۱۷۹)

"فرمایا، شرک و بدعت میں یہ چیز داخل نہیں جو روایت کی گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول کریم ﷺ کی قبر سے سلام کا جواب سنا اور باقی اولیاء اللہ کی قبروں سے بھی سنا۔ اور یہ کہ سعید بن المسیب ؒ نے ایامِ حرہ میں حضور اکرم ﷺ کی قبر سے تین دن اذان کی آواز سنی۔ اس قسم کے تمام واقعات حق ہیں مگر میری بحث ان واقعات سے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑے بڑے واقعات بھی ہوئے ہیں، جیسے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی قبرِ مبارک کے پاس آیا اور عامِ رماد کی قحط سالی کی شکایت کی۔ اس نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اسے حکم دے رہے ہیں کہ عمرؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ نماز استسقاء پڑھائیں۔ یہ واقعات شرک و بدعت کے باب سے نہیں ہیں۔ اس قسم کے کثیر واقعات نبی اکرم ﷺ کے علاوہ آپ ﷺ کی امت کے بزرگانِ دین سے بھی ثابت ہیں۔"

یہ قحط سالی کا واقعہ فتح الباری میں ابن ابی شیبہ کی روایت سے باسنادِ صحیح مرقوم ہے۔

(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الاستسقاء، سوال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا، ۲:۴۹۷)

ان احادیث سے روح کا نظر آنا، کلام کرنا، روح کو علم ہونا، حالات یاد ہونا، زندہ کو سلام بھیجنا، روح سے استفادہ ثابت ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے ارواحِ انبیاءؑ سے استفادہ کیا۔ قحط کی شکایت کرنے والے نے بیداری میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، کلام سنی، حضرت عمرؓ کو پیغام دیا۔ سعید بن المسیب ؒ نے بیداری میں اذان کی آواز سنی۔

Scanned with CamScanner

یہ ہیں روح سے کسبِ فیض کے سمعی دلائل۔ یہ ہے سنتِ رسول ﷺ جسے مسلمان بھول چکے ہیں۔ آج اس مردہ سنت کو جو شخص زندہ کرے گا وہ سو شہیدوں کا ثواب حاصل کرے گا۔ افسوس ہے اُن علماء سوء پر جو تصوف وسلوک کو بدعت کہتے ہیں۔ سلوک اور باطنی فیض حاصل کیے بغیر یہ سنت زندہ نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک ذوقی دلائل کا تعلق ہے، صوفیا کائنہٗ اور محققین علمائے ظواہر اس پر متفق ہیں کہ خواصِ امت کو روح سے فیض ملتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیسے ملتا ہے؟ تو اس حقیقت کا سمجھ میں آنا عارفین کاملین کا دامن پکڑے بغیر محال ہے۔ اس کا تعلق ظاہری علم سے نہیں کہ کتابوں سے پڑھ کر آدمی روح سے اخذِ فیض کا طریقہ سیکھ لے۔ اس شعبہ میں آ کر ایک عام جاہل آدمی اور عالمِ ظاہر بیں میں کوئی فرق نہیں۔ فرشتے بڑی مقدس ہستیاں ہیں مگر شادی کی کیفیت اور شہد کی لذت سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس لیے مَنۡ ذَاقَ ذَاقَ وَ مَنۡ وَّجَدَ وَجَدَ۔۔۔ سو روح سے اکتسابِ فیض کا طریقہ یہی ہے کہ کسی کامل کی شاگردی اختیار کرو، رضائے الٰہی مقصد رکھو، ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاؤ، تو یہ نشاناتِ راہ نظر آ جائیں گے۔

پہلے بیان کر چکا ہوں کہ آدمی رضائے الٰہی کو مقصد بنا کر اور طلبِ صادق لے کر ہمارے سلسلہ میں آ جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ چھ ماہ کے عرصہ میں روح سے کلام بھی کر لے گا، روح کو دیکھ بھی لے گا، حتیٰ کہ یہ بھی دیکھ لے گا روح علیین میں ہو اور بدن صحیح ہو تو روح کا تعلق بدن سے کس طرح ہوتا ہے، اور اگر بدن صحیح نہ ہو تو ذراتِ جسم کے ساتھ روح کا تعلق کیسے ہوتا ہے، اور یہ بھی دیکھ لے گا کہ نبی کریم ﷺ کی روحِ مبارک کا تعلق آپ ﷺ کے جسمِ اقدس سے جس صورت میں ہے اُس کی کیفیت کیا ہے، اور آپ ﷺ قبرِ مبارک میں کس کیفیت سے زندہ ہیں۔ بلکہ یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضور ﷺ کے سینۂ مبارک سے انوار کی بارش کس طرح ہوتی ہے اور ان انوار کی تاریں کس طرح مسلمانوں کے قلوب تک پہنچتی ہیں اور یہ فیض کی تاریں کس طرح مومنوں کے ایمان کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ میری ان باتوں سے بعض لوگوں کو سخت تکلیف ہوگی۔ مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہر زمانے میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ مگر میری غرض اظہارِ حق ہے اور تصوف وسلوکِ اسلامی کو حقیقی رنگ میں پیش کرنا ہے جسے دنیا پرست دکانداروں نے ایسا مسخ کر دیا ہے کہ اس کا پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ آنے والی نسلیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گی۔

روح سے اجرائے فیض

حرہ کی جنگ کے سلسلے میں سعید بن عبدالعزیز کی زبانی حضرت سعید بن المسیب ؓ کا واقعہ سنیے۔ یزید کی فوجوں نے مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی اور تین دن تک مدینہ میں خانہ جنگی ہوتی رہی۔ تین دن تک مسجدِ نبوی میں اذان دی جا سکی، نہ نماز پڑھی گئی۔ حضرت سعید بن المسیب ؓ ایک بزرگ صحابی تھے۔ بڑھاپا بھی تھا اور بینائی بھی نہیں تھی۔ وہ ان تینوں دنوں کے

Scanned with CamScanner

دوران مسجدِ نبوی میں ہی رہے، کیونکہ بینائی نہ ہونے اور بڑھاپے کے سبب کہیں آنے جانے کے قابل نہیں تھے۔ مسجد میں تین دن اذان و نماز نہیں ہوئی۔ حضرت سعیدؒ کو نماز کے اوقات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن حضور ﷺ کے روضۂ اقدس سے آنے والی اذان کی آواز سے وہ تمام نمازیں صحیح اوقات پر پڑھتے رہے۔ روح سے اخذِ فیض کے متعلق علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب 'اقتضائے صراط مستقیم' میں فرماتے ہیں کہ شرک و بدعت میں یہ چیز داخل نہیں جو روایت کی گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول کریم ﷺ کی قبر سے سلام کا جواب سنا اور باقی اولیاء اللہ کی قبروں سے بھی سنا، اور یہ کہ سعید بن المسیبؒ نے ایام حرہ میں حضور اکرم ﷺ کی قبر سے تین دن اذان کی آواز سنی۔ اس قسم کے تمام واقعات حق ہیں مگر میری بحث ان واقعات سے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑے بڑے واقعات بھی ہوئے ہیں، جیسے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی قبرِ مبارک کے پاس آیا اور عامِ رمادی قحط سالی کی شکایت کی۔ اس نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اسے حکم دے رہے ہیں کہ عمرؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ نماز استسقاء پڑھائیں۔ یہ واقعات شرک و بدعت کے باب سے نہیں ہیں۔ اس قسم کے کثیر واقعات نبی اکرم ﷺ کے علاوہ آپ ﷺ کی امت کے بزرگانِ دین سے بھی ثابت ہیں۔

علامہ ابنِ تیمیہؒ اس (شرک و بدعت) معاملے میں سب سے سخت شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ یہ شرک و بدعت میں نہیں آتا۔ قحط سالی پر آپ ﷺ کا ایک شخص کو عمرؓ کے لیے نماز استسقاء پڑھانے کے لیے پیغام دینے کا واقعہ 'فتح الباری' میں ابن شیبہ کی روایت سے باسنادِ صحیح لکھا گیا ہے۔

فائدہ:

ان احادیث سے روح کا نظر آنا، کلام کرنا، روح کو علم ہونا، حالات یاد ہونا، زندہ کو سلام بھیجنا، روح سے استفادہ کرنا ثابت ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے ارواحِ انبیاءؑ سے استفادہ کیا۔ قحط کی شکایت کرنے والے نے بیداری میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، کلام سنا، حضرت عمرؓ کو پیغام دیا۔ سعیدؓ بن المسیب نے بیداری میں روضۂ اطہر سے اذان کی آواز سنی۔ یہ ہیں روح سے کسبِ فیض کے سمعی دلائل اور یہ ہے سنتِ رسول اکرم ﷺ جسے مسلمان بھول چکے ہیں۔ آج اس مردہ سنت کو جو شخص زندہ کرے گا وہ سو شہیدوں کا ثواب حاصل کرے گا۔ افسوس ہے ان علمائے سوء پر جو تصوف و سلوک کو بدعت کہتے ہیں۔ سلوک اور باطنی فیض حاصل کیے بغیر یہ سنت زندہ نہیں رہ سکتی۔

یہ تو نقلی دلائل تھے جو نسل در نسل کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ جہاں تک ذوقی دلائل کا تعلق ہے، صوفیاء کا قبیلہ (صوفیا کا گروہ) اور محققین علمائے ظواہر اس پر متفق ہیں کہ خواصِ امت کو روح سے فیض ملتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیسے ملتا ہے؟ تو اس حقیقت کا سمجھ میں آنا عارفینِ کاملین کا دامن پکڑے بغیر محال ہے۔ اس کا تعلق ظاہری علم سے نہیں کہ کتابوں سے پڑھ کر آدمی روح سے اخذِ فیض کا طریقہ سیکھ لے۔ اس شعبے میں آکر ایک عام جاہل آدمی اور عالمِ ظاہر بین میں کوئی فرق نہیں رہتا یعنی دونوں کو ابتدا سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ فرشتے بڑی مقدس ہستیاں ہیں مگر شادی کی کیفیت اور شہد کی لذت سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ وہ کھانے پینے کی حاجت سے آزاد ہیں، ان کو کیسے پتا چلے گا کہ شہد کا کیا ذائقہ ہے؟ اسی طرح اکتسابِ فیض

Scanned with CamScanner

کا طریقہ یہی ہے کہ کسی کامل کی شاگردی اختیار کرے، رضائے الٰہی کو اس ساری جستجو کا مقصد رکھے، ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے تو یہ نشانات راہ نظر آجائیں گے۔

پہلے بیان کر چکا ہوں کہ آدمی رضائے الٰہی کو مقصد بنا کر اور طلب صادق لے کر ہمارے سلسلہ میں آجائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ چھ ماہ کے عرصہ میں روح سے کلام بھی کرے گا، یہ بھی دیکھ لے گا کہ روح علیین میں ہو اور بدن صحیح ہو تو روح کا تعلق بدن سے کس طرح ہوتا ہے، اور اگر بدن صحیح حالت میں نہ ہو تو ذرات جسم کے ساتھ روح کا تعلق کیسے ہوگا، اور یہ بھی دیکھ لے گا کہ نبی کریم ﷺ کی روح مبارک کا تعلق آپ ﷺ کے جسم اقدس سے جس صورت میں ہے، اس کی کیفیت کیا ہے اور آپ ﷺ قبر مبارک میں کس کیفیت سے زندہ ہیں بلکہ یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضور ﷺ کے سینۂ مبارک سے انوار کی بارش کس طرح ہوتی ہے اور ان انوار کی تاریں کس طرح مسلمانوں کے قلوب تک پہنچتی ہیں، اور یہ فیض کی تاریں کس طرح مومنوں کے ایمان کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ میری ان باتوں سے بعض لوگوں کو سخت تکلیف ہوگی مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ ہم عصر ایک دوسرے کے کمالات کو کب تسلیم کرتے ہیں؟ بلکہ بعید نہیں کہ پیشہ ور فتویٰ باز حرکت میں آئیں کیونکہ ہر زمانے میں ایسا ہوتا رہا ہے، مگر میری غرض اظہار حق ہے اور تصوف و سلوک اسلامی کو حقیقی رنگ میں پیش کرنا ہے جسے دنیا پرست دکانداروں نے ایسا مسخ کر دیا ہے کہ اس کا پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ آنے والی نسلیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گی۔

پانچواں اعتراض:

اگر صوفیاء عارفین رسول کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں تو صحابی ہوئے، اور حضور اکرم ﷺ سے کلام کرتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ سے جو کلام سنتے ہیں وہ حدیث ہوئی۔ پھر صحابہؓ اور ان صوفیاء میں کیا فرق ہوا؟ اور حدیث نبوی ﷺ میں اور ان سے کلام کے سلسلے میں حضور ﷺ کے فرمان میں کیا فرق ہوا؟

الجواب: صحابی ہونے کی شرط:

صحابی ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں: اول، حیات جسمانی اور مکلف ہونا یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ فرائض ادا کرنا اور احکام شرعی کی پابندی کرنا۔ دوم، اسی عالم آب و گل میں صحبت کا شرف حاصل ہونا۔

وَلَا يَلْزَمُ مِنْ ذٰلِكَ اَنَّ الرَّائِيْ صَحَابِيٌّ لِاَنَّ شَرْطَ الرُّؤْيَةِ فِيْ عَالَمِ الْمُلْكِ لَا فِيْ عَالَمِ الْمَلَكُوْتِ... (فتاویٰ الحدیثیہ، ۲۵۸)

"اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دیکھنے والا صحابی بن جائے کیونکہ رویت کی شرط اسی عالم آب و گل کے ساتھ مختص ہے عالم ملکوت سے نہیں۔"

Scanned with CamScanner

صوفیاء کرام کی رؤیت میں یہ دونوں شرطیں مفقود ہیں۔ انہیں یہ شرف صحبت عالمِ برزخ میں روحانی طور پر حاصل ہوتا ہے جہاں روح کا تعلق بدن سے تو ہے مگر تدبیر و تصرف کا تعلق نہیں، پس صحابی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پانچواں اعتراض:

اگر صوفیاء عارفین رسول کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں تو صحابی ہوئے اور حضور ﷺ سے کلام کرتے ہیں تو حضور اکرم ﷺ سے جو کلام سنتے ہیں وہ حدیث ہوئی۔ پھر صحابہؓ اور ان صوفیاء میں کیا فرق ہوا؟ اور حدیثِ نبوی ﷺ میں اور ان سے کلام کے سلسلے میں حضور ﷺ کے فرمان میں کیا فرق ہوا؟

الجواب: صحابی ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں۔ اول، حیاتِ جسمانی اور مکلف ہونا۔ یعنی ارکانِ اسلام ادا کرنا، احکامِ شرعی کی پابندی۔ دوم: اسی عالمِ آب و گل میں صحبت کا شرف حاصل ہونا۔ یعنی صحابی ہونے کی پہلی شرط ہے کہ عاقل و بالغ ہو اور مسلمان ہو، نورِ ایمان ہو اور اس دنیا میں زندہ ہو۔ دوسری شرط ہے کہ اسی دنیوی زندگی میں حضورِ اکرم ﷺ سے ملاقات نصیب ہوئی ہو۔ دونوں شرائط پر بیک وقت پورا اترنے والا صحابی ہوگا۔ 'فتاویٰ الحدیثیہ' میں ہے کہ "اور اس سے لازم نہیں آتا کہ دیکھنے والا صحابی بن جائے کیونکہ رؤیت کی شرط اسی عالمِ آب و گل کے ساتھ مختص ہے، عالمِ ملکوت سے نہیں"۔ صوفیاء کرام کی رؤیت میں یہ دونوں شرائط مفقود ہیں کیونکہ انہیں یہ شرف صحبت عالمِ برزخ میں روحانی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ جہاں روح کا تعلق بدن سے ہے تو سہی، مگر تدبیر و تصرف کا نہیں ہے۔ پس صحابی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حدیث کی حقیقت

جو کلام رسول اکرم ﷺ نے تلقیٔ روحانی سے اخذ کیا ہو اور جسمِ مادی کی زبان سے بیان فرمایا ہو، وہ حدیث ہے۔ پس صوفیاء کے روحانی کلام پر حدیث کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ البتہ حضور اکرم ﷺ سے صحیح حدیث کی تصدیق کرائی جا سکتی ہے اور اس کی مثال موجود ہے۔ مشکوٰۃ میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ابی عیاش صحابیؓ نے لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کے فضائل بیان کیے تو رات کو ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا اور اس کی تصدیق کرائی۔

فَرَاٰی رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِیْمَا یَرَی النَّائِمُ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبَا عَیَّاشٍ یُحَدِّثُ عَنْكَ بِكَذَا وَ كَذَا قَالَ صَدَقَ اَبُوْ عَیَّاشٍ...

(مشکوٰۃ، کتاب الاسماء، باب یقول عند الصباح والمساء والمنام، ۲۱۰)

"ایک شخص نے خواب میں حضور اکرم ﷺ کو دیکھا اور عرض کیا حضور ﷺ ابو عیاش کلمہ لا الٰہ الا اللہ ...الخ، کا ثواب اس طرح بیان کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اس نے سچ کہا۔"

Scanned with CamScanner

فائدہ:

خواب میں تصدیق شدہ حدیث کو کتب حدیث میں داخل کیا گیا ہے، مگر یہ تصدیق اُس حدیث کی تھی جو آپ ﷺ دنیا میں بیان فرما آئے تھے۔ اس تصدیق سے مزید تاکید اور تائید ہوگئی۔ برزخی حدیث سے کوئی نیا حکم ثابت نہ ہوگا، سابقہ احکام کی تائید وتصدیق ہوسکتی ہے اور صوفیاء بھی یہی کرتے ہیں اور بیداری کے عالم میں تصدیق کرا لیتے ہیں۔

صوفیاء کرام میں جو اصحاب کشف ہوتے ہیں وہ صحیح حدیث کی پہچان ایک اور طریقہ سے بھی کر لیتے تھے۔ وہ یوں کہ صحیح حدیث جب پڑھی جائے تو اس کے ساتھ انوار ہوتے ہیں اور موضوع حدیث کے ساتھ ظلمت نکلتی ہے، اور اہل کشف کو وہ انوار اور ظلمت نظر آتے ہیں۔ اس طرح صوفیاء کرام کسی حدیث کی صحت وعدم صحت میں تمیز کر سکتے ہیں۔

حدیث کی حقیقت

جو کلام رسول اکرم ﷺ نے تلقیِ روحانی سے اخذ کیا ہو اور جسمِ مادی کی زبان سے بیان فرمایا ہو، وہ حدیث ہے یعنی آپ ﷺ نے حاصل تو اللہ کریم سے روحانی طور پر، القا کے طور پر کیا ہو اور زبانِ مبارک (جسمِ مادی کی زبانِ اقدس) سے ارشاد فرمایا ہو، وہ حدیث ہے۔ پس صوفیاء کے روحانی کلام پر حدیث کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ البتہ حضور اکرم ﷺ سے صحیح حدیث کی تصدیق کرائی جاسکتی ہے، اور اس کی مثال مشکوٰۃ میں موجود ایک واقعہ ہے کہ ابی عیاش ؓ صحابی نے لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کے فضائل بیان کیے تو رات کو ایک صحابی ؓ نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا اور اس کی تصدیق کرائی۔ ''ایک شخص نے خواب میں حضور اکرم ﷺ کو دیکھا اور عرض کیا! حضور ﷺ! ابو عیاش کلمہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کا ثواب اس طرح بیان کرتا ہے''۔ حضور ﷺ نے فرمایا، اُس نے سچ کہا۔

فائدہ:

خواب میں تصدیق شدہ حدیث کو کتب حدیث میں داخل کیا گیا ہے۔ مگر یہ تصدیق اُس حدیث کی تھی جو آپ ﷺ دنیا میں بیان فرما آئے تھے۔ خواب میں کی گئی تصدیق کی بنیاد پر محدثین نے اُس حدیث کو کتب حدیث میں داخل کر لیا۔ اس تصدیق سے مزید تاکید اور تائید ہوگئی۔ برزخی حدیث سے کوئی نیا حکم نہ ثابت ہوگا، سابقہ احکام کی تصدیق وتائید ہوسکتی ہے، اور صوفیاء بھی یہی کرتے ہیں اور بیداری کے عالم میں تصدیق کرا لیتے ہیں۔ صوفیاء کرام میں جو اصحاب کشف ہوتے ہیں وہ صحیح حدیث کی پہچان ایک اور طریقہ سے بھی کر لیتے ہیں۔ وہ یوں کہ صحیح حدیث پڑھی جائے تو اس کے ساتھ انوار ہوتے ہیں اور موضوع حدیث کے ساتھ ظلمت نکلتی ہے۔ یعنی خود سے گھڑی ہوئی حدیث کے ساتھ ظلمت ہوتی ہے اور اہل کشف کو وہ انوار وظلمت نظر آتے ہیں۔ اس طرح صوفیاء کرام کسی حدیث کی صحت وعدمِ صحت میں تمیز کر سکتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

چھٹا اعتراض:

خلافتِ راشدہ کے دور میں انتخابِ خلیفہ کے بارے میں صحابہؓ کا اختلاف ہوتا رہا۔ پھر جنگ جمل اور صفین میں فتنوں کے دروازے کھلے تو صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ کی روح پرفتوح سے دریافت کر کے یہ مسائل کیوں نہ حل کرا لیے؟ نیز صحابہؓ سے اس قسم کے واقعات منقول نہیں، تو جو چیز صحابہؓ کو حاصل نہیں تھی وہ صوفیاء کو کیونکر حاصل ہو گئی؟

الجواب: اس اعتراض کے دو حصے ہیں۔ پہلے ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ صحابہؓ نے یہ مسائل کیوں نہ حل کرا لیے؟

قرآنِ کریم نے مسئلہ خلافت بیان فرمایا، خلفاء کے اوصاف بھی بیان فرمائے مگر خلیفہ کی تعیین نہیں فرمائی۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے خلافت کے متعلق کئی باتیں بطور پیشین گوئی بیان فرمائیں، خلفاء کے اوصاف بیان فرمائے مگر خلفاء کے نام نہیں گنوائے۔ اسی طرح آنے والے فتنوں کے متعلق حضور ﷺ نے بیان فرمایا۔ دجالوں، کذابوں اور مدعیانِ نبوت کا ذکر فرمایا مگر کسی کا نام نہیں لیا۔ یعنی حضور ﷺ نے اپنی اس دنیا کی زندگی میں خلافت کا مسئلہ نہ حل فرمایا، نہ صحابہؓ نے اس کا حل دریافت کیا، نہ آنے والے فتنوں کا حل صاف صاف آپ ﷺ نے فرمایا، نہ صحابہؓ نے دریافت کیا۔ اب فرمایئے کہ جو مسئلہ اس کی اہمیت کے باوجود حیاتِ نبوی ﷺ میں صحابہؓ نے حل نہ کرایا، بعد وفات اس کے متعلق استفسار کیا معنی رکھتا ہے؟

اب اس کی حقیقت سمجھیں۔ عین حیات میں ان مسائل کے حل نہ بتانے کی وجہ یہ ہے کہ واقعات قبل از وقوع حل نہیں کیے جاتے۔ خلیفہ کا مقرر کرنا امت کا اپنا فرض ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق فتنوں کا بند کرنا بھی ان کا اپنا فرض ہے۔ ہاں حل کے طریقے خود اللہ تعالیٰ نے اور رسول کریم ﷺ نے بتا دیئے، مسلمان اس امر کے مکلف ہیں کہ اپنے اختیار اور صلاحیتوں کو ان طریقوں کے مطابق کام میں لائیں جو خدا اور رسول ﷺ نے بتا دیئے ہیں۔

اس اعتراض کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ صحابہؓ سے اس قسم کے کشف کے واقعات منقول نہیں تو اس کا جواب سنیے:

۱۔ امام رازیؒ نے صدیق اکبرؓ کے دفن کا واقعہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو صحابہؓ نے چارپائی اٹھائی اور اس حجرہ کے دروازہ پر رکھ دی جس میں نبی اکرم ﷺ مدفون تھے۔

لَمَّا حُمِلَتْ جَنَازَتُهُ إِلَىٰ بَابِ قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ وَنُودِيَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ هٰذَا أَبُوبَكْرٍ بِالْبَابِ... فَإِذَا الْبَابُ قَدِ انْفَتَحَ وَإِذَا بِهَاتِفٍ يَهْتِفُ مِنَ الْقَبْرِ أَدْخِلُوا الْحَبِيبَ إِلَى الْحَبِيبِ... (تفسیر الکبیر، ۵:۴۶۵)

"جب حضرت ابوبکرؓ کا جنازہ اٹھا کر قبر النبی ﷺ کے دروازے کے سامنے رکھا گیا اور آواز دی گئی، السلام علیک یا رسول اللہ ﷺ! یہ ابوبکرؓ دروازہ پر ہے۔ اچانک دروازہ کھل گیا اور قبر کے اندر سے آواز آئی، حبیب کو حبیب کے پاس لاؤ۔"

Scanned with CamScanner

فائدہ:

۱۔ 'جوارِ رسول ﷺ' کے موضوع پر شیعہ کے جواب میں مکمل بحث رسالہ 'الفاروق' میں آچکی ہے۔ایک درجن کتابوں کے حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ صدیق اکبرؓ روضہ رسول ﷺ میں حضور ﷺ کی اجازت سے دفن کیے گئے۔اس وقت ہزاروں صحابہ کرامؓ موجود تھے جنھوں نے یہ آواز سنی۔

۲۔ فاروق اعظمؓ کے متعلق ابن کثیر اور ابن حجر نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک جوان مسجد نبوی ﷺ میں رہتا تھا۔ وہ فوت ہوگیا۔ چند روز کے بعد حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا۔آپؓ نے اس کے باپ سے تعزیت کی اور اس کی قبر پر گئے۔

فَذَهَبَ فَصَلّٰى عَلٰى قَبْرِهٖ بِمَنْ مَّعَهٗ ثُمَّ نَادَاهُ عُمَرُ ؓ فَقَالَ يَافَتٰى (لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ)...فَاَجَابَهُ الْفَتٰى مِنْ دَاخِلِ الْقَبْرِ يَاعُمَرُ ؓ قَدْ اَعْطَانِيْهِمَا رَبِّيْ عَزَّوَ جَلَّ فِي الْجَنَّةِ مَرَّتَيْنِ... (تفسیر ابن کثیر،۲:۹۷ ۲؛ الزواجر عن الکبائر،۱:۱۹)

"پس فاروق اعظمؓ اُس کی قبر پر گئے۔ساتھیوں کے ہمراہ جنازہ پڑھا۔پھر اُس جوان کو مخاطب کر کے آیۃ وَلِمَنْ خَافَ... الخ، پڑھی تو جوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا،اے عمرؓ! میرے رب نے مجھے جنت میں وہ نعمت مجھے دوبار عطا فرمائی۔"

۳۔ حضرت سعیدؓ بن المسیب کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔آپ نے تین دن تک مسلسل مسجد نبوی ﷺ میں قیام رکھا اور حضور اکرم ﷺ کی قبر مبارک سے اذان کی آواز سن کر نماز کا وقت پہچانتے اور نماز ادا کرتے رہے۔

۴۔ ایک ایسے شخص کا واقعہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جو حضور اکرم ﷺ کی قبر مبارک پر آیا، قحط سالی کی شکایت کی، حضور ﷺ کا جواب سنا، حضرت عمرؓ کو پیغام پہنچایا۔

۵۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَرَبَ بَعْضُ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خِبَآءَهٗ عَلٰى قَبْرٍ وَ هُوَ لَا يَحْسِبُ اَنَّهٗ قَبْرٌ فَاِذَا فِيْهِ اِنْسَانٌ يَقْرَاُ سُوْرَةَ تَبَارَكَ الَّذِيْ... (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن، فصل الثانی،۱۸۷۔۱۸۸)

"ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے کسی صحابیؓ نے قبر پر خیمہ لگایا۔اسے قبر کا کوئی خیال نہ تھا۔ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ انسان قبر میں سورۃ تبارک الذی پڑھ رہا ہے۔"

ان پانچ روایات کو غور سے پڑھیں۔صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، سعیدؓ ابن المسیب، ایک مرد اور کسی صحابیؓ کے کلام بالارواح کے نمونے پیش کیے ہیں۔صدیق اکبرؓ کے واقعہ میں تو سننے والے ہزاروں صحابیؓ تھے جنھوں نے روح کی کلام اَدْخِلُوا الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ... سنی، اور فاروق اعظمؓ کے ساتھ ایک جماعت تھی جنھوں نے اس جوان کا جواب سنا جس نے قبر کے اندر سے حضرت عمرؓ کا نام لے کر خطاب کیا اور جواب دیا۔کیا اب بھی شبہ ہے کہ صحابہؓ کو کلام بالارواح نہیں ہوتی تھی؟

Scanned with CamScanner

چھٹا اعتراض:

خلافتِ راشدہ کے دور میں انتخابِ خلیفہ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہوتا رہا۔ پھر جنگِ جمل اور صفین میں فتنوں کے دروازے کھلے تو صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ کی روح پرفتوح سے دریافت کرکے یہ مسائل کیوں نہ حل کرا لیے؟ نیز صحابہؓ سے اس قسم کے واقعات منقول نہیں تو جو چیز صحابہؓ کو حاصل نہ تھی، وہ صوفیاء کو کیونکر حاصل ہو گئی؟

الجواب: اس اعتراض کے دو حصے ہیں۔ پہلے ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ صحابہؓ نے یہ مسائل کیوں نہ حل کرا لیے؟

قرآن کریم نے مسئلہ خلافت بیان فرمایا، خلفاء کے اوصاف بیان فرمائے مگر خلیفہ کی تعیین نہیں فرمائی۔ قرآن نے کسی شخص کا نام لے کر نہیں بتایا کہ فلاں خلیفہ ہوگا۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے خلافت کے متعلق کئی باتیں بطور پیشین گوئی بیان فرمائیں، خلفاء کے اوصاف بیان فرمائے مگر خلفاء کے نام نہیں گنوائے۔ اسی طرح آنے والے فتنوں کے متعلق حضور ﷺ نے بیان فرمایا، دجالوں، کذابوں اور مدعیانِ نبوت کا ذکر فرمایا مگر کسی کا نام نہیں لیا۔ یعنی حضور ﷺ نے اپنی اس دنیا کی زندگی میں خلافت کا مسئلہ نہ حل فرمایا، نہ صحابہؓ نے اس کا حل دریافت کیا۔ اب فرمائیے کہ جو مسئلہ اس کی اہمیت کے باوجود حیاتِ نبوی ﷺ میں صحابہ نے حل نہ کروایا، بعد از وفات اس کے متعلق استفسار کیا معنی رکھتا ہے؟

اب اس کی حقیقت سمجھیں۔ عینِ حیات میں ان مسائل کا حل نہ بتانے کی وجہ یہ ہے کہ واقعات قبل از وقوع حل نہیں کیے جاتے۔ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کا حل دیا جاتا ہے۔ ایک بات، ایک واقعہ ہوا ہی نہیں تو اس کا حل آپ کیا دیں گے؟ خلیفہ کا مقرر کرنا امت کا اپنا فرض ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق فتنوں کا باب بند کرنا بھی ان کا اپنا فرض ہے۔ ہاں! حل کے طریقے خود اللہ تعالیٰ نے اور رسولِ کریم ﷺ نے بتا دیئے۔ مسلمان اس امر کے مکلف ہیں کہ اپنے اختیار اور صلاحیتوں کو ان طریقوں کے مطابق کام میں لائیں جو اللہ اور رسول ﷺ نے بتا دیئے ہیں۔

اس اعتراض کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ صحابہؓ سے اس قسم کے کشف کے واقعات منقول نہیں تو اس کا جواب حاضر ہے:

۱۔ امام رازیؒ نے صدیقِ اکبرؓ کے دفن کا واقعہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے یعنی غسل اور کفن دے چکے تو صحابہؓ نے چارپائی اٹھائی اور اس حجرہ کے دروازہ پر رکھ دی جس میں نبی اکرم ﷺ مدفون ہیں، اور آواز دی گئی، "السلام علیک یا رسول اللہ ﷺ! یہ ابوبکرؓ دروازہ پر ہے۔" اچانک دروازہ کھل گیا اور قبر کے اندر سے آواز آئی، "حبیب کو حبیب کے پاس لاؤ"

فائدہ:

۱۔ جوارِ رسول ﷺ کے موضوع پر شیعہ کے جواب میں مکمل بحث رسالہ 'الفاروق' میں آ چکی ہے۔ ایک درجن کتابوں کے حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ صدیقِ اکبرؓ روضۂ رسول میں حضور ﷺ کی اجازت سے دفن کیے گئے۔ اُس وقت ہزاروں صحابہ کرامؓ موجود تھے جنہوں نے یہ آواز سنی۔

Scanned with CamScanner

۲۔ فاروقِ اعظمؓ کے متعلق ابن کثیر اور ابن حجر نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک جوان مسجد نبوی ﷺ میں رہتا تھا، وہ فوت ہو گیا۔ چند روز بعد حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپؓ نے اس کے والد سے تعزیت کی اور اس کی قبر پر گئے۔ ساتھیوں کے ہمراہ جنازہ پڑھا، پھر اس جوان کو مخاطب کر کے آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ... پڑھی تو جوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا، "اے عمرؓ! میرے رب نے جنت میں وہ نعمت مجھے دوبار عطا فرمائی۔"

۳۔ حضرت سعیدؒ ابن المسیب کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔ آپؒ نے تین دن تک مسلسل مسجد نبوی ﷺ میں قیام رکھا اور حضور ﷺ کی قبر مبارک سے اذان کی آواز سن کر نماز کا وقت معلوم کرتے اور نماز ادا کرتے رہے۔

۴۔ ایک ایسے شخص کا واقعہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جو حضورِ اکرم ﷺ کی قبر مبارک پر آیا، قحط سالی کی شکایت کی، حضور ﷺ کا جواب سنا اور حضرت عمرؓ کو پیغام پہنچایا۔

۵۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے کسی صحابیؓ نے قبر پر سہواً خیمہ لگالیا۔ وہاں قبر تو موجود تھی لیکن زمین کے اوپر کوئی نشان نہ تھا، لہٰذا اوپر سے قبر کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اچانک دیکھا کہ قبر میں ایک شخص سورۃ تَبٰرَكَ الَّذِي پڑھ رہا ہے۔ صاحبِ قبر قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اور اُس وقت وہ تَبٰرَكَ الَّذِي... پر پہنچا ہوا تھا۔

ان پانچ روایات کو غور سے پڑھیں۔ صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، سعیدؒ ابن المسیب، ایک مرد اور کسی صحابیؓ کے کلام بالارواح کے نمونے پیش کیے ہیں۔ صدیق اکبرؓ کے واقعہ میں تو سننے والے ہزاروں صحابیؓ تھے جنھوں نے روح کی کلام "ادخلوا الحبیب الی الحبیب" سنی۔ اور فاروقِ اعظمؓ کے ساتھ ایک جماعت تھی جنھوں نے اُس جوان کا جواب سنا جس نے قبر کے اندر سے حضرت عمرؓ کا نام لے کر خطاب کیا اور جواب دیا۔ کیا اب بھی شبہ ہے کہ صحابہؓ کو کلام بالارواح نہیں ہوتی تھی؟

قصدِ رسول ﷺ اور کشفِ قبور

حضرت عائشہؓ نے مشرکین کی اولاد کے متعلق سوال کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا:

اِنْ شِئْتِ اَسْمَعْتُكِ تَضَاغِيَهُمْ فِي النَّارِ...

(ابن کثیر، ۳: ۳۱؛ مسند احمد، مسند الصدیقہ عائشہ بنت الصدیق رضی اللہ عنہا، ۴۲: ۲۸۴)

"اگر تُو چاہتی ہے تو میں ان کی آوازیں دوزخ سے تمہیں سنا دیتا ہوں۔"

نیز مشکوٰۃ میں حضرت زیدؓ بن ثابت کی روایت موجود ہے کہ

فَلَوْ لَا اَنْ لَّا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ تَعَالٰى اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْٓ اَسْمَعُ مِنْهُ... (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب اثبات عذاب القبر، ۲۵)

"اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں دعا کرتا اور اللہ تعالیٰ تمہیں عذابِ قبر سنا دیتا جو میں سنتا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ اگر حضرت عائشہؓ چاہتیں تو دعائے نبوی ﷺ سے بلاکسب کشف ہوجاتا، اور اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ صحابہؓ دفن کرنا چھوڑ دیں تو دعائے نبوی ﷺ سے ہر صحابیؓ کو کسب کے بغیر کشف ہوجاتا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قصدِ رسول ﷺ بھی سنت ہے۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے قصد تو فرمایا، پس اس سنتِ رسول ﷺ کو زندہ کرنا عین اتباعِ سنت ہے۔

قصدِ رسول ﷺ اور کشفِ قبور

قصدِ رسول ﷺ سے مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ کرنا (کوئی کام کرنے کا) بھی سنت ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کام جو نبی اکرم ﷺ نے اگرچہ کیا نہ ہو لیکن اس کے کرنے کا ارادہ فرمایا ہو تو وہ کام بھی سنت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے مشرکین کی اولاد کے متعلق سوال کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا، "اگر تُو چاہتی ہے تو میں ان کی آوازیں دوزخ سے تمہیں سنوا دیتا ہوں۔" نیز 'مشکوٰۃ' میں حضرت زیدؓ بن ثابت کی روایت موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، "اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ تم (اپنے مردے) دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں دعا کرتا اور اللہ تعالیٰ تمہیں عذابِ قبر سنا دیتا جو میں سنتا ہوں۔"

ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ اگر حضرت عائشہ صدیقہؓ چاہتیں تو دعائے نبوی ﷺ سے بلاکسب کشف ہو جاتا اور اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ صحابہؓ مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دیں گے تو دعائے نبوی ﷺ سے ہر صحابیؓ کو کسب کے بغیر کشف ہو جاتا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قصدِ رسول ﷺ بھی سنتِ رسول ﷺ ہے۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے ایک کام کا قصد تو فرمایا، پس اس سنتِ رسول ﷺ کو زندہ کرنا عین اتباعِ سنت ہے۔

مدرسہ محمدیہ ﷺ

حضور اکرم ﷺ کی ذات جامع علوم اور جامع کمالات تھی۔ آپ ﷺ کی خدمت میں اکتسابِ فیض کے لیے مختلف طبائع، مختلف ذہنی صلاحیتوں اور مختلف عملی قوتوں کے لوگ حاضر ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کی صحبت میں معاش و معاد کے ہر شعبہ کے متعلق معلومات اور حقائق ملتے تھے۔ لیکن کسی فردِ واحد میں نہ تو اتنی صلاحیت اور اہلیت کا ہونا ممکن تھا اور نہ ہی حکمت و مشیتِ الٰہی کا یہ تقاضا تھا کہ وہ تمام علوم اور وہ سارے کمالات جو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس میں پائے جاتے تھے وہ کسی ایک فردِ واحد کی ذات میں جمع ہو جائیں۔ اس لیے ہوا یہ کہ ہر شخص کی فطری صلاحیتوں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق اسے حصہ ملا۔ کسی کو ایک علم سے طبعی مناسبت تھی، اسے اسی علم میں مہارت حاصل ہوئی۔ دوسرے کو کسی دوسرے شعبۂ علم میں کمال حاصل ہوا۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق کسی کو کم ملا کسی کو زیادہ۔ کوئی مبلغ، کوئی مدرس، کوئی مفسر ہوا، تو کوئی محدث، کوئی فقیہہ بنا، تو کوئی قاضی۔ کوئی اصولی، تو کوئی متکلم۔ کوئی محقق و مدقق ہوا، تو کوئی صاحبِ کشف و الہام صوفی

Scanned with CamScanner

وعارف۔ کوئی سپاہی، کوئی جنرل، کوئی وزیر سلطنت، کوئی صدر ریاست۔ غرض نہ تو تمام صحابہؓ مفسر وفقیہہ تھے، نہ سارے کے سارے اصولی، جنرل یا صدر ریاست۔ نہ تمام صحابہؓ نے کشف والہام اور سلوک وتصوف میں یکساں مہارت حاصل کی۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ تمام صحابہؓ مفسر اور محدث اور فقیہہ کیوں نہیں تھے؟ مگر یہ بات بڑی بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں کہ سارے صحابہؓ صاحب کشف والہام اور صوفی کیوں نہیں تھے؟

بسوخت عقل ز حیرت که این چه بو العجبی است

دوسری اصولی بات ذہن میں رکھیں کہ ہر شعبہ علم کے متعلق نبی کریم ﷺ جو تعلیم دیتے تھے وہ بنیادی اور اصولی تعلیم ہوتی تھی۔ ان اصول وکلیات سے جزئیات اور فروعات کا استخراج علمائے حق اور مجتہدین امت کے ذمے رہنے دیا۔ اور سنت اللہ یہی ہے کہ انبیاء کلیات ہی بیان فرماتے ہیں۔ اور ان اصول وکلیات سے علمی وعملی مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے کے ذرائع اور وسائل ڈھونڈ نکالنا بھی اُنہی لوگوں کے ذمے تھا جو اُن کلیات سے جزئیات کا استخراج کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

تیسری بات جو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے، یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں اور صحابہؓ کے زمانے میں تمام علوم وفنون اصولی اور اجمالی شکل میں تھے۔ ان کی تفصیل نہیں تھی۔ کسی فن کی مستقل طور پر تدوین بھی نہیں ہوئی تھی۔ فن تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، صرف ونحو، معانی وغیرہ کوئی فن بھی مدوّن نہیں ہوا تھا۔ جس طرح حالات کے تقاضوں کے مطابق دوسرے علوم وفنون اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ مدوّن ہوتے رہے، اسی طرح تصوف وسلوک کی تدوین بھی رفتہ رفتہ عمل میں لائی گئی۔ اس مقام پر پھر وہی حیرت ہوتی ہے کہ لوگ یہ اعتراض تو نہیں کرتے کہ صحابہؓ کے زمانے میں تفسیر، فقہ، صرف ونحو، اسماء الرجال جب مستقل فن کی حیثیت سے مدوّن نہیں تھے، تو اب کیوں ہوئے؟ لیکن یہ اعتراض کرنے میں نہایت بے باک واقع ہوئے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں علم تصوف وسلوک کا وجود نہیں تھا تو اب یہ ایک مستقل شعبہ علم کی صورت میں کیوں عالم وجود میں آ گیا؟ بات یہ ہے کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی طرح صوفیاء کرام نے شعبہ سلوک واحسان کے اصولوں کو بکھرا ہوا پایا تو ان کو سمیٹا، ان اصولوں سے جزوی مسائل کا استخراج کیا۔ پھر اس کے حصول کے ذرائع اور وسائل تلاش کیے، اس طرح یہ فن بھی مدوّن ہو گیا۔ ہاں! ان وسائل کو کوئی محقق صوفی اصل مقصد ہرگز نہیں سمجھتا۔ جس طرح عوام میں سے چوٹی کے عالم وفاضل گنے چنے چند افراد ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان علماء میں سے مختلف خاص علوم میں خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے، اور یہ اصول ہر زمانے میں کارفرما رہا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی ہر صحابیؓ کو اس کے مزاج اور استعداد کے مطابق حصہ ملتا تھا، چنانچہ:

وَمِنْ ثَمَّ كَانَ حُذَيْفَةُ صَاحِبَ السِّرِّ الَّذِي لَا يَعْلَمُهُ غَيْرُهُ حَتّٰى خُصَّ بِمَعْرِفَةِ أَسْمَاءِ الْمُنَافِقِيْنَ وَبِكَثِيْرٍ مِّنَ الْأُمُوْرِ الْآتِيَةِ...

(فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الفتن، کیف الامر اذا لم تکن جماعۃ، ۱۳: ۳۷)

Scanned with CamScanner

"اسی وجہ سے حضرت حذیفہؓ صاحب اسرار تھے، جن اسرار کو ان کے بغیر کوئی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ منافقین کے ناموں کا علم رکھنے اور اکثر آنے والے واقعات کا علم رکھنے میں وہ مخصوص تھے۔ دوسرے صحابہؓ کو اس کا علم نہ تھا۔"

دیکھا! حضرت حذیفہؓ کو کشف و الہام اور علمِ اسرار سے وہ حصۂ وافر ملا جو اور کسی صحابیؓ کو نہیں ملا تھا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ سب صحابیوں کو صاحب السّر کیوں نہیں بنایا گیا تو یہ براہ راست حکمت و مشیت الٰہی پر اعتراض ہے۔

چوتھی اصولی بات یہ ہے کہ تصوف و احسان دین کا اہم شعبہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ

إِذَا ثَبَتَ الشَّيْئُ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهٖ... اور الہام و کشف کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔

فَأَخْبَرَ أَنَّ جَلَاءَ الْقَلْبِ وَ أَبْصَارِهٖ يَحْصُلُ بِالذِّكْرِ وَ إِنَّهٗ لَا يَتَمَكَّنُ مِنْهُ إِلَّا الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَالتَّقْوٰى بَابُ الذِّكْرِ وَالذِّكْرُ بَابُ الْكَشْفِ وَالْكَشْفُ بَابُ الْفَوْزِ الْأَكْبَرِ...

(احیاء علوم الدین، بیان معنی النفس والروح والقلب والعقل وما ھو المراد بھذا الاسامی، ۱۲:۳)

اس لیے دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ دین کے اہم جزو تصوف و احسان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسے تسلیم کیا تو کشف و الہام کو ماننا پڑے گا کیونکہ یہ لازم و ملزوم ہیں بشرطیکہ شیخ کامل ہو اور طلب صادق ہو۔ انبیاء علیہم السلام کے کمالات وہبی ہوتے ہیں اس لیے ان کے ہم نشینوں کو ان کی صحبت کے فیض سے وہبی طور پر بلاکسب حاصل ہو جاتے ہیں اور وہاں بھی خلوصِ نیت شرط ہے، ورنہ انسان عبداللہ بن اُبی ہی رہتا ہے۔ اور اولیاء کے کمالات کسبی ہوتے ہیں اس لیے ان کے ہم نشینوں کو ان کی صحبت کے فیض سے محنت و مجاہدہ کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ صوفیاء کرام مسئلہ کلام بالارواح میں سنتِ نبوی ﷺ اور سنتِ صحابہؓ کے صحیح متبع ہیں۔ صوفیاءؒ نے اس کے حصول کے لیے جو وسائل اور ذرائع اختیار کیے ہیں، وہ نئے سہی لیکن ہیں وسائل۔ اور چونکہ ان کا مقصد محمود تھا لہٰذا ذرائع بھی محمود ہوئے کیونکہ ذرائع حکم و مقاصد میں ہوتے ہیں، اور اولیاء کرام کا تمام تر سرمایہ اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ہے۔ اور زیارتِ رسول ﷺ دراصل محبتِ رسول ﷺ ہی کا ثمرہ ہے۔ تو ان محبانِ رسول ﷺ کو زیارتِ رسول ﷺ نہ ہو تو اور کسے ہو؟ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ:

لٰكِنَّ الْكَثِيْرَ مِنْهُمْ إِذَا ذُكِرَ النَّبِيُّ ﷺ اِشْتَيَاقَ إِلٰى رُؤْيَتِهٖ بِحَيْثُ يُؤْثِرُهَا عَلٰى أَهْلِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَ مَالِهٖ وَ وَالِدِهٖ وَ يَبْذُلُ نَفْسَهٗ فِي الْأُمُوْرِ الْخَطِيْرَةِ وَ يَجِدُ مُخْبَرَ ذٰلِكَ مِنْ نَفْسِهٖ وِجْدَانًا لَا تَرَدُّدَ فِيْهِ وَ قَدْ شُوْهِدَ مِنْ هٰذَا الْجِنْسِ مَنْ يُؤْثِرُ زِيَارَةَ قَبْرِهٖ وَ رُؤْيَةَ مَوَاضِعِ آثَارِهٖ عَلٰى جَمِيْعِ مَا ذُكِرَ لِمَا وَقَرَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِنْ مَحَبَّتِهٖ... غَيْرَ أَنَّ ذٰلِكَ سَرِيْعُ الزَّوَالِ بِتَوَالِي الْغَفَلَاتِ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب رسول ﷺ من الایمان، ۱:۶۰)

Scanned with CamScanner

"ان میں ایسے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں کہ جب نبی کرم ﷺ کا ذکر ان کے سامنے کیا جائے تو زیارتِ رسول ﷺ کے مشتاق ہو جاتے ہیں اور اپنے اہل وعیال، ماں باپ اور مال واسباب کو چھوڑ کر زیارتِ رسول ﷺ کے لیے چل کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو سخت خطرے کے مقام میں ڈال دیتے ہیں کہ کسی طرح زیارت ہو جائے، اور اس کا خبر دینے والا اس کی ذات سے وجدان صحیح ہے۔ اور مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کے آدمی زیارتِ رسول ﷺ قبرِ رسول ﷺ اور ان نشانات کی زیارت جہاں حضور ﷺ بیٹھے یا کھڑے ہوئے، اپنے جان ومال اور اہل وعیال سے مقدم سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں محبتِ رسول ﷺ پیوست ہو چکی ہے۔ ہاں! غفلت کے طاری ہونے سے یہ حالت جلد زائل ہو جاتی ہے۔"

فائدہ:

زیارتِ قبرِ رسول ﷺ محبتِ رسول ﷺ میں داخل ہے۔ ان مقاموں کا دیکھنا جہاں حضور اکرم ﷺ نے قدمِ مبارک رکھے، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہے۔ جب قبرِ رسول ﷺ کی مٹی کی زیارت محبت میں داخل ہے تو عین ذاتِ رسول ﷺ اور حضور اقدس ﷺ کی روحِ مبارک کی زیارت کرنے کی شان کیا ہو گی؟ مگر یہ دولت اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب اتباعِ سنتِ رسول ﷺ کا جذبہ درجۂ کمال تک پہنچ جائے کیونکہ محبتِ رسول ﷺ کی انتہا اتباعِ سنت رسول ﷺ ہے۔

مَنْ أَحْيَاءَ سُنَّتِيْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ ... "جس نے میری سنت کو زندہ کیا، اُس نے مجھ سے محبت رکھی۔"

(سنن ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الأخذ بالسنۃ واجتناب البدع، ۲:۹۲)

ہاں! یہ محبت اس وقت زائل ہو جاتی ہے جب قلب پر غفلت کے پردے پڑ جائیں۔ صوفیاء نے اس غفلت کو دور کرنے کا طریقہ سکھایا۔ وہ وسائل اور ذرائع بتائے جنہیں اختیار کر کے غفلت کو دور کیا جا سکتا ہے، محبت کو جلا دی جا سکتی ہے۔ پھر دربارِ نبوی ﷺ میں حاضری، زیارت اور کلام کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور اللہ کا فضل شاملِ حال ہو تو اس مقام پر پہنچ کر یہ محبت کا رشتہ دائمی ہو جاتا ہے۔ ہمارے سلسلہ میں یہی طریقہ چلا آتا ہے۔ ہمارا کہنا تو یہی ہے کہ اگر زیارتِ نبوی ﷺ سے مشرف ہونا، دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر ہونا اور حضور اکرم ﷺ سے کلام کرنا گناہ ہے تو اس کے حصول کے لیے صوفیاء نے جو ذریعہ اختیار کیا وہ بھی گناہ۔ اور اگر یہ گناہ نہیں بلکہ عین ایمان اور کمالِ ایمان ہے تو اس ذریعہ کو اختیار کرنا بھی دلیلِ ایمان ہے۔

مدرسہ محمدیہ ﷺ

حضور اکرم ﷺ کی ذات جامع العلوم اور جامع کمالات تھی (اور ہے)۔ آپ ﷺ کی خدمت میں اکتسابِ فیض کے لیے مختلف طبائع، مختلف ذہنی صلاحیتوں اور مختلف عملی قوتوں کے لوگ حاضر ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کی صحبت میں

Scanned with CamScanner

معاش و معاد کے ہر شعبہ کے متعلق معلومات اور حقائق ملتے تھے لیکن کسی فردِ واحد میں نہ تو اتنی صلاحیت اور اہلیت کا ہونا ممکن تھا اور نہ ہی حکمت و مشیتِ الٰہی کا یہ تقاضا تھا کہ وہ تمام علوم اور وہ سارے کمالات جو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس میں پائے جاتے تھے، وہ کسی ایک فردِ واحد کی ذات میں جمع ہو جائیں۔ اس لیے یوں ہوا کہ ہر شخص کی فطری صلاحیتوں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق اسے حصہ ملا۔ کسی کو ایک علم طبعی سے مناسبت تھی، اسے اُسی علم میں مہارت حاصل ہوئی۔ دوسرے کو کسی دوسرے شعبۂ علم میں کمال حاصل ہوا۔ اپنے اپنے ظرف کے مطابق کسی کو کم ملا، کسی کو زیادہ۔ کوئی مبلغ، کوئی مدرس، کوئی مفسر ہوا تو کوئی محدث، کوئی فقیہہ بنا اور کوئی قاضی، کوئی اصولی تو کوئی متکلم، کوئی محقق و مدقق ہوا تو کوئی صاحب کشف والہام صوفی و عارف، کوئی سپاہی تو کوئی جرنیل، کوئی وزیر سلطنت کوئی صدرِ ریاست۔ غرض نہ تو تمام صحابہؓ مفسر و فقیہہ تھے نہ سارے کے سارے اصولی جرنیل، نہ تمام صحابہؓ نے کشف والہام اور سلوک و تصوف میں یکساں مہارت حاصل کی۔ پھر حیرت ہے کہ لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ تمام صحابہؓ مفسر، محدث اور فقیہہ کیوں نہیں تھے؟ مگر یہ بات بڑی دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ سارے صحابہ کرامؓ صاحب کشف والہام اور صوفی کیوں نہیں تھے؟

دوسری اصولی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر شعبۂ علم کے متعلق نبی کریم ﷺ جو تعلیم دیتے تھے وہ بنیادی اور اصولی تعلیم ہوتی تھی۔ ان اصول و کلیات سے جزئیات اور فروعات کا استخراج علمائے حق اور مجتہدینِ امت کے ذمے رہنے دیا اور سنت اللہ یہی ہے کہ انبیاء کلیات ہی بیان فرماتے ہیں۔ ان اصول و کلیات سے علمی مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے کے ذرائع اور وسائل ڈھونڈ نکالنا بھی انہی لوگوں کے ذمے تھا جو ان کلیات سے جزئیات کا استخراج کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ حاصل بحث یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور سنتِ رسول ﷺ اصول وضع کرتے، اصول بتا دیتے ہیں۔ ان اصولوں سے مجتہدین اجتہاد کر کے جزئیات کا استخراج کرتے ہیں۔

تیسری بات جو ذہن میں رکھنی بہت ضروری ہے یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں تمام علوم و فنون اصولی اور اجمالی شکل میں تھے۔ ان کی تفصیل نہیں تھی، کسی فن کی مستقل طور پر تدوین بھی نہیں ہوئی تھی۔ کوئی فن مستقل کتابی شکل میں مدون نہیں ہوا تھا۔ فنِ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، صرف و نحو، معانی وغیرہ کوئی فن بھی مدون نہیں ہوا تھا۔ جس طرح حالات کے تقاضوں کے مطابق دوسرے علوم و فنون اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات سمیت مدون ہوتے رہے، اسی طرح تصوف و سلوک کی تدوین بھی رفتہ رفتہ عمل میں لائی گئی۔ اس مقام پر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ یہ اعتراض تو نہیں کرتے کہ صحابہؓ کے زمانے میں تفسیر، فقہ، صرف و نحو، اسماء الرجال تو نہیں تھے جبکہ بعد میں یہ تمام علوم مستقل اہمیت کے مستند اور بنیادی علوم قرار پائے، لیکن معترضین نہایت بے باکی سے کہہ دیتے ہیں کہ جب حضور ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں علم تصوف و سلوک کا وجود نہیں تھا تو اب یہ ایک مستقل شعبہ کی صورت میں کیوں عالمِ وجود میں آ گیا؟ بات یہ ہے کہ دوسرے علوم و فنون کے ماہرین کی طرح صوفیاء کرام نے شعبۂ سلوک و احسان کے اصولوں کو بکھرا ہوا پایا تو ان کو سمیٹا، ان اصولوں سے جزوی مسائل کا استخراج کیا، پھر اس کے حصول کے ذرائع اور وسائل تلاش کیے۔ اس طرح یہ فن بھی مدون ہو گیا۔ ہاں! ان وسائل کو کوئی محقق صوفی اصل مقصد ہرگز نہیں سمجھتا۔ جس طرح عوام میں سے چوٹی کے عالم و فاضل، گنے چنے

Scanned with CamScanner

چند افراد ہوتے ہیں، اسی طرح ان علماء میں سے مختلف خاص علوم میں مہارتِ خصوصی رکھنے والے افراد کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے۔ اور یہ اصول ہر زمانے میں کارفرما رہا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ہر صحابیؓ کو اس کے مزاج اور استعداد کے مطابق حصہ ملتا تھا۔ 'فتح الباری' میں ہے کہ حضرت حذیفہؓ صاحب اسرار تھے۔ جن اسرار کو ان کے بغیر کوئی نہیں جانتا تھا، حتیٰ کہ منافقین کے ناموں کا علم رکھتے اور اکثر آنے والے واقعات کا علم رکھنے میں وہ مخصوص تھے جبکہ دوسرے صحابہؓ کو اس کا علم نہ تھا۔ یعنی اُس زمانے میں بھی خاص لوگوں کو خاص علوم حاصل ہوتے تھے۔ حضرت حذیفہؓ کو کشف والہام اور علم الاسرار سے وہ وافر حصہ ملا جو اور کسی صحابیؓ کو نہیں ملا تھا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ سب صحابہؓ کو صاحب اسرار کیوں نہیں بنایا گیا؟ تو یہ براہِ راست حکمت ومشیتِ الٰہی پر اعتراض ہے۔

چوتھی اصولی بات یہ ہے کہ تصوف واحسان دین کا اہم شعبہ ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ إِذَا ثَبَتَ الشَّيْءُ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهِ... "جب کسی چیز کا وجود ثابت ہو جائے تو جتنے اس کے متعلقات اور لوازمات ہیں وہ از خود ثابت ہو جاتے ہیں۔" الہام وکشف کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔ اس لیے دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ دین کے اہم جز تصوف واحسان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسے تسلیم کیا تو کشف والہام کو ماننا پڑے گا کیونکہ یہ لازم وملزم ہیں بشرطیکہ شیخ کامل ہو اور طلب صادق ہو۔ انبیاءؑ کے کمالات وہبی ہوتے ہیں یعنی انہیں اللہ کی طرف سے عطا کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے ہم نشینوں کو ان کے صحبت کے فیض سے وہبی طور پر بلا کسب (بغیر ریاضت ومجاہدے کے) حاصل ہو جاتے ہیں۔ یعنی نبیؑ کے پاس جو برکات ہوتی ہیں وہ اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہیں اور جسے براہِ راست اللہ کے نبی کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے، وہ برکات منعکس ہو کر اس میں بھی آ جاتی ہیں۔ اس کے لیے ماہ وسال کی قید نہیں، ایک لمحہ کی صحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی صاحب ایمان کو شرف صحابیت سے سرفراز کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہاں خلوصِ نیت شرط ہے ورنہ انسان عبداللہ بن ابی ہی رہتا ہے۔ اولیاء اللہ کے کمالات کسبی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس جو برکات ہوتی ہیں ان کا تعلق کسب یعنی ان کی محنت ومجاہدہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی خدمت میں جو لوگ جاتے ہیں انہیں بھی محنت وریاضت سے یہ گنجِ گراں مایہ حاصل ہوتا ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہوا کہ صوفیاء کرام مسئلہ کلام بالارواح میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنتِ صحابہؓ کے صحیح متبع ہیں۔ صوفیاء نے برکات کے حصول کے لیے جو وسائل اور ذرائع اختیار کیے ہیں، وہ نئے سہی لیکن شریعت کے مطابق تھے اور محض وسائل تھے، مقصود نہیں تھے۔ اور ان کا مقصد محمود تھا یعنی مبارک تھا کہ مقصد حصولِ رضائے باری تھا تو اس کے لیے جو وسائل اختیار کیے جائیں گے وہ بھی محمود اور مبارک ہوں گے۔ کسی چیز کے حصول کے ذرائع، حکمِ مقاصد میں ہوتے ہیں۔ اب وضو فرض نہیں، جب نماز کا وقت ہوگا، نماز فرض ہوگی تو وضو فرض ہو جائے گا تو یہ ذریعہ ہے۔ ذرائع مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں یعنی جو حکم مقصد پہ لگتا ہے وہی ذریعے پہ بھی لگتا ہے۔ اولیاء کرام کا تمام تر سرمایہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور زیارتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دراصل محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ثمرہ ہے۔ ان محبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیارتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہو تو اور کسے ہو؟ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ 'فتح الباری' کے مطابق:

"ان میں ایسے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کے سامنے کیا جائے تو زیارتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشتاق ہو جاتے ہیں اور اپنے اہل وعیال، ماں باپ اور مال واسباب کو چھوڑ کر زیارتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے لیے چل کھڑے ہوتے ہیں۔اپنے آپ کو سخت خطرے کے مقام میں ڈال دیتے ہیں کہ کسی طرح زیارت ہوجائے،اور اس کا خبر دینے والا اس کی ذات سے وجدانِ صحیح ہے یعنی اس کے اندر کی آواز اسے چل پڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کے آدمی زیارتِ رسول،قبرِ رسول اوران نشانات کی زیارت جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے یا کھڑے ہوئے،کو اپنی جان و مال اور اہل وعیال سے مقدم سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیوست ہوچکی ہے۔ہاں!غفلت کے طاری ہونے سے یہ حالت جلد زائل ہوجاتی ہے۔"

جب قلب پرغفلت کے پردے پڑ جائیں تو صوفیاء نے اس غفلت کو دور کرنے کا طریقہ سکھایا۔وہ وسائل اور ذرائع بتائے جنہیں اختیار کر کے غفلت کو دور کیا جاسکتا ہے،محبت کو جلا دی جاسکتی ہے۔پھر دربارِ نبوی میں حاضری،زیارت اور کلام کا شرف بھی حاصل ہوجاتا ہے اور اللہ کا فضل شامل حال ہوا اس مقام پر پہنچ کر محبت کا یہ رشتہ دائمی ہوجاتا ہے۔ہمارے سلسلے میں یہی طریقہ چلا آتا ہے۔ہمارا کہنا تو یہی ہے کہ اگر زیارتِ نبوی سے مشرف ہونا،دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہونا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلام کرنا گناہ ہے تو اس کے حصول کے لیے صوفیا نے جو ذریعہ اختیار کیا وہ بھی گناہ ہے۔اور اگر یہ گناہ نہیں بلکہ عین ایمان اور کمالِ ایمان ہے تو اس ذریعہ کو اختیار کرنا بھی دلیلِ ایمان ہے۔

دورِ صحابہؓ کے بعد کشف والہام میں اضافہ کیوں ہوگیا؟

اس موقع پر یہ ایک ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے۔جس کا جواب دینا ضروری ہے۔یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے کہ کرامات وانکشافات کا اظہار اُن اولیاء کرام سے زیادہ ہوا جو صحابہؓ کا دور ختم ہونے کے بعد اس دنیا میں تشریف لائے۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا تعلق عوام کے قوت وضعفِ ایمانی کے ساتھ ہے۔ایمان قوی ہو تو کشف وکرامت کے صدور اور اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ایمان میں ضعف آگیا تو ایسے امور کی ضرورت زیادہ پیش آئی جو خرقِ عادت کی قبیل سے ہوں۔دورِ صحابہؓ میں اُن حضرات کے ایمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضِ صحبت کی وجہ سے نہایت قوی تھے،انہیں ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔بعد میں ایمان کمزور ہو گئے تو اولیاء کرام سے ان اسناد کا مطالبہ ہونے لگا۔یہ خیال رہے کہ خرقِ عادت امور،نہ شرطِ ولایت ہیں نہ جزوِ ولایت۔ہاں!دلائل وعلامات ولایت کی حیثیت سے بطور سند عطا کیے جاتے ہیں۔

ہم یہ بیان کر آئے ہیں کہ کشف والہام نائبِ وحی اور خلفاء ہیں۔دورِ صحابہؓ میں جب خود وحی موجود تھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات آفتابِ عالم تاب کی طرح برابر ضیا پاشی کر رہی تھی تو نائبِ وحی کی ضرورت کیا تھی؟اور سورج کے مقابلے میں ان چاند ستاروں اور چراغوں،قندیلوں کی کیا ضرورت تھی؟قاعدہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد روشنی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر فوری طور پر تاریکی نہیں چھا جاتی بلکہ آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ تاریکی بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے۔یہی صورت صحابہؓ،تابعین،تبع تابعین اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے معاملہ میں پیش آئی۔صوفیاء کرام نے بعد کی تاریکیوں میں روشنی پھیلانے کا اہتمام جاری رکھا۔ان کے فیض سے کہیں کوئی چراغ روشن ہوا کہیں شمع،کہیں کوئی ستارہ اُبھرا کہیں کوئی چاند نکلا۔بہر حال اُن کے دم قدم

Scanned with CamScanner

سے روشنی خواہ کسی درجے کی سہی، موجود رہی۔ بہر حال ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ کشف والہام کی کمی بیشی قوت وضعفِ ایمان کے تناسب سے ہوتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ہی کشف وکرامات کا اظہار اصولاً زیادہ ہونا چاہیے تھا، اور ایسا ہی ہوا۔ اس موضوع پر اگر تفصیلی معلومات درکار ہوں تو ہم مولانا جامیؒ کی شواہد النبوۃ (صفحہ ۱۴۷)، اور فتاویٰ الحدیثیہ (صفحہ ۲۶۱) کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

دورِ صحابہؓ کے بعد کشف والہام میں اضافہ کیوں ہو گیا؟

اس موقع پر یہ ایک ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے کہ کرامات و انکشافات کا اظہار اُن اولیاء کرام سے زیادہ ہوا جو صحابہؓ کا دور ختم ہونے کے بعد اس دنیا میں تشریف لائے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا تعلق عوام کے قوت وضعفِ ایمانی کے ساتھ ہے۔ ایمان مضبوط ہو تو کرامات اور معجزات کی ضرورت نہیں اور ایمان کمزور ہو تو پھر اسے کرامات سے مدد ملتی ہے۔ دورِ صحابہؓ میں ان حضرات کے ایمان حضور اکرم ﷺ کے فیضِ محبت کی وجہ سے نہایت قوی تھے، انہیں ان چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ بعد میں ایمان کمزور ہو گئے تو اولیاء کرام سے ان اسناد کا مطالبہ ہونے لگا۔ یہ خیال رہے کہ کسی سے کرامت کا اظہار ہونا شرطِ ولایت نہیں ہے نہ ہی کرامت، ولایت کا جزو ہے۔ ہاں اس کا صدور کسی کی ولایت کی دلیل ضرور ہے اور یہ اس ولی کے حق پر ہونے کی سند ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے پاس کوئی مولانا کہیں کابل کی طرف سے آئے۔ تین مہینے قیام کیا، ایک دن اجازت چاہی تو حضرتؒ نے فرمایا، آپ تین مہینے تک رہے، میں نے ہی پوچھا نہ آپ نے بتایا کہ آپ کس مقصد کے لیے آئے اور واپس کیوں جا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا، حضرت! میں تو سلوک وتصوف اور اللہ اللہ سیکھنے کے لیے آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ سے کوئی کرامت کا صدور ہوگا، کرامت دیکھوں گا تو مجھے آپ کی ولایت وکمال کا اعتبار ہو جائے گا لیکن تین ماہ میں مَیں نے کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ اب زیادہ انتظار کرنے میں فائدہ نہیں سمجھتا، اس لیے جا تا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا، ''تین مہینے بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ رات دن تم مسجد میں میرے ساتھ رہے، اس دوران تم نے میرا کوئی کام خلافِ سنت دیکھا ہے؟'' وہ شخص کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کہنے لگا نہیں! ایسا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ تو فرمایا، ''اس سے بڑی کرامت کیا ہوگی؟ سب سے بڑی کرامت تو یہی ہے کہ زندگی سنت کے تابع ہو جائے۔ تمہیں اس سے بڑی کس کرامت کا انتظار تھا؟'' اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس دور میں لوگوں کو کرامت کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

ہم یہ پہلے بیان کر آئے ہیں کہ کشف والہام نائبِ وحی اور خلفاء ہیں۔ دورِ صحابہ میں جب وحی موجود تھی، اور پھر حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات تابندہ آفتاب کی طرح برابر ضیا پاشی کر رہی تھی تو نائبِ وحی کی کیا ضرورت تھی؟ سورج کے مقابلے میں ان چاند ستاروں اور چراغوں قندیلوں کی کیا ضرورت تھی؟ قاعدہ یہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد روشنی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر فوری طور پر تاریکی نہیں چھا جاتی بلکہ آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتی جاتی ہے اور زندگی

Scanned with CamScanner

تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھیلتی جاتی ہے۔ یہی صورت صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین اور بعد میں آنے والے مسلمانوں کے معاملہ میں پیش آئی۔ صوفیاء کرام نے بعد کی تاریکیوں میں روشنی پھیلانے کا اہتمام جاری رکھا۔ ان کے فیض سے کہیں کوئی چراغ روشن ہوا، کہیں شمع جلی، کہیں ستارہ اُبھرا کہیں کوئی چاند نکل آیا۔ ان کے دم قدم سے کسی درجے تک سہی، روشنی بہر طور موجود رہی۔ بہر حال ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ کشف والہام کی کمی بیشی قوت وضعفِ ایمان کے تناسب سے ہوتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ہی کشف وکرامات کا اظہار اصولاً زیادہ ہونا چاہیے تھا، اور ایسا ہی ہوا۔ اس موضوع پر اگر تفصیلی معلومات درکار ہوں تو مولانا جامیؒ کی 'شواہد النبوۃ' (صفحہ ۱۴۷) اور 'فتاویٰ الحدیثیہ' (صفحہ ۲۶۱) کا مطالعہ مفید ہوگا۔

ساتوں اعتراض: قرأت سلسلہ مشائخ کی کوئی سند نہیں بلکہ یہ شرک ہے

الجواب: قَالَ تَعَالٰی: قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللهُ... (آل عمران:۳۱)

"آپ فرما دیجیے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔"

فَقَالَ النَّبِیُّ وَ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَقَدْ وَرَدَ فِی السُّنَّةِ ذِكْرُ الْاَسْبَابِ الَّتِیْ یَتَسَبَّبُ بِهَا اِلٰی مَحَبَّةِ اللهِ تَعَالٰی سُبْحَانَهٗ وَسَاَلَهٗ حُبَّ مَنْ یُّحِبُّهٗ فَاِنَّهٗ لَا یُحِبُّ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ اِلَّا الْمُخْلِصَ مِنْ عِبَادِهٖ فَحُبُّهُمْ طَاعَةٌ مِّنَ الطَّاعَاتِ وَقُرْبَةٌ مِّنَ الْقُرَبِ... لِاَنَّهٗ مَنْ اَحَبَّ الشَّیْئَ اَسْتَکْثَرَ مِنْهُ وَدَوَامَ عَلَیْهِ... (تحفۃ الذاکرین ،۱:۴۳۱)

"حضور اکرم ﷺ نے دعا کی کہ الٰہی! میں تجھ سے تیری محبت کی درخواست کرتا ہوں اور اُن لوگوں کی محبت کی درخواست کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اور حدیث میں ان اسباب کا ذکر آیا جن کو اختیار کر کے انسان محبتِ الٰہی تک پہنچتا ہے اور حضور ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی محبت کی درخواست کی جن سے اللہ تعالیٰ کو پیار ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے تو وہی ہیں جو مخلص ہوں۔ پس ان کی محبت طاعتِ الٰہی بھی ہے اور قربِ الٰہی بھی۔ کیونکہ جو شخص کسی چیز کو محبوب جانتا ہے اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے اور اس پر مداومت کرتا ہے۔"

فائدہ:

قرآن مجید کی آیت مذکورہ بالا اور حدیث نبوی ﷺ سے تین امور ثابت ہوئے:

۱۔ ذکر الٰہی کے لیے اسباب کا اختیار کرنا اور ان اسباب کا ذکر الٰہی میں داخل ہونا۔

۲۔ اولیاء اللہ کی محبت اور ان کا ذکر طاعتِ الٰہی اور قربِ الٰہی میں داخل ہے۔

۳۔ جس چیز کو انسان محبوب سمجھتا ہے اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔

پس سلاسل اولیاء اللہ کی مشروعیت بھی ثابت ہوگئی۔

Scanned with CamScanner

علم حدیث کی تعلیم میں متن حدیث سے پہلے جو سند پڑھی جاتی ہے اس کا پڑھنا ثواب ہے کیونکہ حدیثِ نبوی ﷺ کو نبی کریم ﷺ تک پہنچانے کا واحد سبب یہی سند ہے۔ اگر سند نہ ہو تو متنِ حدیث بیکار ہو جائے کیونکہ سچ جھوٹ کی تمیز ناممکن ہو جائے۔ جو عظمت واہمیت فن حدیث میں سندِ حدیث کی ہے، وہی حیثیت تصوف وسلوک میں سلاسل اور شجرۂ مشائخ کے پڑھنے کی ہے۔ تصوف جسے حدیثِ جبرئیل میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو خلاصۂ دین اور ثمرۂ عبادت ہے وہ بذریعہ سلاسل ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جب سلسلہ کو اپنے شیخ سے رسول کریم ﷺ تک پہنچا دیا تو اس کے صدق وکذب کا فیصلہ کیا جا سکے گا، جس طرح محدثینِ کرام حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ دینے سے پہلے سلسلہ رواۃ کی خوب جانچ پڑتال کر لیتے ہیں۔

تاریخ حدیث میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ امام علی رضا جب نیشاپور تشریف لے گئے تو حافظ حدیث امام ابوذرعہ اور امام محمد بن اسلم الطوسی نے حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک حدیث اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے رسول کریم ﷺ تک پڑھیں۔ آپ نے پڑھی اور بیس ہزار کے قریب حاضرین نے اسے قلمبند کیا۔ اس کے متعلق امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

لَوْ قُرِأَتْ هٰذَا الْاِسْنَادُ عَلٰی مَجْنُوْنٍ لَبَرِئَ مِنْ جُنَّتِهٖ ... (صواعق محرقہ، ۲۰۵)

"یعنی اگر یہ سند مسلسل کسی پاگل پر پڑھی جائے تو اس کا جنون جاتا رہے گا۔"

تنبیہ:

سلسلۂ مشائخ میں اولیاء اللہ کے نام اس نیت سے پڑھنا کہ ان کے ذریعہ ہمیں قرب الٰہی نصیب ہو اور یہ لوگ محبت الٰہی پیدا کرنے اور سنت نبوی ﷺ کی اتباع کرنے میں سبب اور وسیلہ ہیں، کارِ ثواب ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان حضرات کو موثر، مختار، متصرف، حاضر ناظر سمجھ کر شجرہ پڑھے تو اس نے اپنا دین برباد کیا اور عاقبت خراب کی۔

ساتواں اعتراض:

قرأتِ سلسلہ مشائخ کی کوئی سند نہیں بلکہ یہ شرک ہے۔

جو شجرۂ مبارک پڑھا جاتا ہے اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ متعدد اسمائے گرامی لے کر دعا کی جاتی ہے، شرک ہے۔

الجواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "میرے حبیب ﷺ! لوگوں کو بتائیے کہ اگر تمہیں اپنے اللہ سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت رکھے گا۔" (آل عمران: ۳۱) 'تحفۃ الذاکرین' میں ہے کہ "حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ الٰہی! میں تجھ سے تیری محبت کی درخواست کرتا ہوں اور اُن لوگوں کی محبت کی درخواست کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتے ہیں۔" اور حدیث میں ان اسباب کا ذکر آیا جن کو اختیار کر کے انسان محبت الٰہی تک پہنچتا ہے اور حضور ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی محبت کی درخواست کی جن سے اللہ تعالیٰ کو پیار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے تو وہی ہیں جو مخلص ہوں۔ پس ان کی صحبت اطاعتِ الٰہی بھی ہے اور قربِ الٰہی بھی۔ کیونکہ جو شخص کسی چیز کو محبوب جانتا ہے اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے اور اس پر مداومت کرتا ہے یعنی اسے ہمیشہ کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

فائدہ:

قرآن کی آیتِ مذکورہ بالا اور حدیث نبوی ﷺ سے تین امور ثابت ہوئے:

1۔ ذکرِ الٰہی کے لیے اسباب کا اختیار کرنا اور ان اسباب کا ذکرِ الٰہی میں داخل ہونا۔

2۔ اولیاء اللہ کی محبت اور ان کا ذکر اطاعتِ الٰہی اور قربِ الٰہی میں داخل ہے۔

3۔ جس چیز کو انسان محبوب سمجھتا ہے، اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ پس سلاسلِ اولیاء کی مشروعیت بھی ثابت ہوگئی۔

علمِ حدیث کی تعلیم میں متنِ حدیث سے پہلے جو سند پڑھی جاتی ہے اس کا پڑھنا ثواب ہے۔ یعنی جب کوئی حدیث پڑھی جاتی ہے تو پہلے ایک سند پڑھتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے سنی، فلاں نے فلاں سے، فلاں نے فلاں سے حتیٰ کہ وہ نبی کریم ﷺ تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ سند ہر حدیث کے ساتھ ضروری ہوتی ہے اور اس کا پڑھنا ثواب بھی ہے۔ کیونکہ سند جو پڑھی جاتی ہے، وہ واحد سبب یا ذریعہ ہے جو اس حدیث کو حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس تک پہنچاتی ہے۔ حدیث کے ساتھ اگر سند نہ ہو تو اس کی صحت کا کوئی اعتبار نہیں رہتا کیونکہ سچ اور جھوٹ کی تمیز ناممکن ہو جاتی ہے۔

جو عظمت و اہمیت فنِ حدیث میں سندِ حدیث کی ہے، وہی حیثیت تصوف و سلوک میں سلاسل و شجرۂ مشائخ کے پڑھنے کی ہے۔ تصوف جسے حدیثِ جبریئل میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو خلاصۂ دین ہے اور ثمرۂ عبادت ہے وہ بذریعہ سلاسل ہی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ جب سلسلہ کو اپنے شیخ سے رسول کریم ﷺ تک پہنچا دیا تو اس کے سچا جھوٹا ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے جس طرح محدثین کرام حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ دینے سے پہلے سلسلۂ رواۃ کی خوب جانچ پڑتال کر لیتے ہیں۔ تاریخ حدیث میں ایک مشہور واقعہ ہے کہ امام علی رضا جب نیشاپور تشریف لے گئے تو حافظ حدیث امام ابوزرعہ اور امام طوسی نے حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک حدیث اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے رسول اکرم ﷺ تک پڑھیں، جس میں آپ کے آباؤ اجداد یعنی خاندانِ نبوت کا ہی تذکرہ ہو، دوسرا باہر کا راوی کوئی نہ ہو۔ آپؓ نے پڑھی اور بیس ہزار کے قریب حاضرین نے اسے قلمبند کیا۔ اس کے متعلق امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

لَوْ قُرِأَتْ هٰذَا الْاِسْنَادُ عَلٰى مَجْنُوْنٍ لَبَرِئَ مِنْ جُنَّتِهٖ۔ (صواعق محرقہ، ۲۰۵)

”اگر یہ سند مسلسل کسی پاگل پر پڑھی جائے تو اس کا جنون جاتا رہے گا۔“

تنبیہ:

سلسلۂ مشائخ میں اولیاء اللہ کے نام اس نیت سے پڑھنا کہ ان کے ذریعے ہمیں قربِ الٰہی نصیب ہو اور یہ لوگ محبتِ الٰہی پیدا کرنے اور سنتِ الٰہی کی اتباع کرنے میں سبب اور وسیلہ ہیں، کارِ ثواب ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان حضرات کو مؤثر، مختار، متصرف، حاضر و ناظر سمجھ کر شجرہ پڑھے تو اس نے اپنا دین برباد کیا اور عاقبت خراب کی۔

Scanned with CamScanner

آٹھواں اعتراض:

کہا جاتا ہے کہ تصوف تواتر سے ثابت ہے۔
جب امام حسن بصریؒ کی ملاقات حضرت علیؓ سے ثابت ہی نہیں تو تواتر کیسے ثابت ہوا؟

الجواب: صوفیاء کرام تو سب کے سب لقاء پر متفق ہیں۔ سید احمد قشاشی نے اَلْعِقْدُ الْفَرِيْدُ فِيْ سَلَاسِلِ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ میں طویل بحث کر کے حضرت حسن بصریؒ کی ملاقات ثابت کی ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لقاء پر صوفیا کا اجماع بتایا ہے۔

وَالْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ يُنْسَبُ اِلٰى سَيِّدِنَا عَلِيٍّ ﷺ عِنْدَ اَهْلِ السُّلُوْكِ قَاطِبَةً وَاِنْ كَانَ اَهْلُ الْحَدِيْثِ لَا يُثْبِتُوْنَ ذٰلِكَ... (الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، ۲۳)

"اہل سلوک کے نزدیک امام حسن بصریؒ کی نسبت مکمل طور پر حضرت علیؓ سے ثابت ہے، اگرچہ اہل حدیث ثابت نہیں کرتے۔"

فائدہ:

اہل سلوک اور اہل حدیث کے فیصلوں میں فرق اتنا ہے کہ اہل سلوک کے ہاں تو لقاء کا ثبوت قاطبہ ہے مگر اہل حدیث کے ہاں عدم ثبوت قاطبۃً نہیں کیونکہ ثبوت بھی موجود ہے۔

اہل حدیث کے نزدیک ملاقات اور رویت بالاتفاق ثابت ہے، ہاں صحبتِ طویلہ کی بالاتفاق نفی ہے۔ اگر فیض کے لیے صحبتِ طویلہ کو شرط قرار دیا جائے تو پھر بھی فیضِ باطنی بالواسطہ تو ممکن ہے، محال نہیں۔ ہاں فیض باطنی بلاواسطہ کی نفی ہوگی مگر بالواسطہ کی نفی کہاں لازم آئی؟ اسی طرح سماع حدیث اور روایت حدیث میں بھی اختلاف ہے مگر راجح اور صحیح بات یہ ہے کہ سماع ثابت ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر کسب فیض بالواسطہ کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو وہ واسطہ کون سا ہے؟
جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے ملنے والے ہزاروں صحابیؓ امام حسن بصریؒ سے ملے تھے، کسی سے فیض حاصل کر لیا ہو۔ یہ کوئی ظاہری چیز تو ہے نہیں کہ ظاہری چیز کی نفی سے باطنی فیض کی نفی ہو جائے۔ کیونکہ عدمِ علم اور عدمِ وجدان سے، عدمِ معلوم اور عدمِ موجود لازم نہیں آتا۔ جب رویت اور ملاقات بالاتفاق محدثین سے بھی ثابت ہے اور سماع حدیث بھی راجح ہے تو اس امر میں کون سی چیز مانع ہے کہ کسب فیض کی ابتدا حضرت علیؓ سے کی ہو، پھر بالواسطہ ترقی کرتے چلے گئے ہوں۔

آٹھواں اعتراض:

کہا جاتا ہے کہ تصوف تواتر سے ثابت نہیں۔
جب امام حسن بصریؒ کی ملاقات حضرت علیؓ سے ثابت ہی نہیں تو تواتر کیسے ثابت ہوا؟
الجواب: سوائے نسبت اویسیہ کے ساری نسبتیں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ الکریم سے چلتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

حضرت علیؓ کے فوراً بعد تمام سلاسل میں جس ہستی کا نام آتا ہے وہ امام حسن بصریؒ ہیں۔اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ اس کے جواب میں اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں:

"صوفیاء کرام تو سب کے سب ملاقات پر متفق ہیں۔سید احمد قشاشی نے 'العقد الفرید فی سلاسل اہل التوحید' میں طویل بحث کر کے حضرت حسن بصریؒ کی ملاقات ثابت کی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لقاء (ملاقات) پر صوفیاء کا اجماع بتایا ہے، یعنی اس بات پر صوفیا کا اجماع ہے کہ حسن بصریؒ کی ملاقات حضرت علیؓ سے ہوئی تھی۔اہلِ سلوک کے نزدیک امام حسن بصریؒ کی نسبت مکمل طور پر حضرت علیؓ سے ثابت ہے اگرچہ اہلِ حدیث ثابت نہیں کرتے۔

فائدہ:

اہلِ سلوک اور اہلِ حدیث کے فیصلوں میں فرق اتنا سا ہے کہ اہلِ سلوک کے ہاں تو لقاء کا ثبوت قاطبۃً (یقینی) ہے، مگر اہلِ حدیث کے ہاں عدم ثبوت قاطبۃً نہیں کیونکہ ثبوت بھی موجود ہے۔اہلِ حدیث کے نزدیک ملاقات اور رؤیت بالاتفاق ثابت ہے، ہاں صحبتِ طویلہ کی نفی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ملاقات تو ہوئی لیکن لمبی صحبت اور اخذِ فیض کا اتفاق نہیں ہوا۔ حضرتؒ فرماتے ہیں اگر صحبتِ طویلہ یعنی لمبے عرصے تک صحبت میں رہنے کو ضروری قرار دیا جائے تو بھی بالواسطہ اخذِ فیض تو ممکن ہے کہ صحبت تو ہو گئی۔اب اس کے بعد اگر کوئی اور ہستی بطورِ واسطہ درمیان میں آ جائے جو حضرت علیؓ سے فیض حاصل کر رہی ہو اور حسن بصریؒ ان سے فیض حاصل کر رہے ہوں تو اس طرح بالواسطہ حصولِ فیض ممکن ہے۔ہاں بلاواسطہ کی نفی ہو گی، لیکن کلی فیض کی نفی تو نہیں ہو سکتی۔بعض کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے کوئی حدیث نقل نہیں کی، بعض کہتے ہیں کہ نقل کی ہے، لیکن حق یہ ہے کہ حضرت حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے احادیث نقل کی ہیں۔اب رہا یہ سوال کہ اگر کسبِ فیض بالواسطہ کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو وہ واسطہ کون سا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے ملنے والے ہزاروں صحابیؓ امام حسن بصریؒ سے ملے تھے۔حضرت علیؓ سے ان کی لمبی مجلس اس لیے نہ رہی کہ جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو دارالخلافہ کوفہ لے گئے۔امام حسن بصریؒ مدینہ منورہ میں رہتے تھے لیکن ان کا بچپن کاشانۂ نبوی میں گزرا، اس لیے حضرت علیؓ سے یقیناً مجلس تو رہی ہو گی۔ ۱۴ سال کی عمر میں آپؒ خاندان کے ساتھ بصرہ چلے آئے اور وہاں بھی حضرت علیؓ سے ملاقات و کسبِ فیض کے واقعات ملتے ہیں۔

بہرحال حضرت علیؓ سے ملنے والے ہزاروں صحابیؓ تو حسن بصریؒ سے ملے۔لہٰذا فیض بالواسطہ تھا تو ہو سکتا ہے کہ ان صحابہؓ سے اخذِ فیض کر لیا ہو۔یہ کوئی ظاہری چیز تو نہیں کہ ظاہری چیز سے نفی کی جائے۔کیونکہ عدمِ علم اور عدمِ وجدان سے عدمِ معلوم اور عدمِ وجود لازم نہیں آتا، یعنی کسی چیز کا پتا نہ ہو تو یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔حضرت علیؓ سے انؒ کی ملاقات تو ثابت ہے، پھر اس کے بعد دوسرے صحابہؓ سے اخذِ فیض کرتے رہے ہوں جنھوں نے حضرت علیؓ سے اخذِ فیض کیا ہو، اور اسماء الرجال سے اس کی شہادت ملتی ہے۔

Scanned with CamScanner

اسماء الرجال سے شواہد

۱۔ **ملاقات اور سماع:**

قَالَ ابْنُ سَعْدٍ۔ وُلِدَ سَنَتَيْنِ بَقِيَتَا مِنْ خَلَافَةِ عُمَرَ ؓ وَ نَشَاءَ بِوَادِي الْقُرَى وَ كَانَ فَصِيْحًا وَ رَأى عَلِيًّا ... (تہذیب التہذیب، ۲: ۲۶۳)

"خلافت فاروقی کے دو سال باقی تھے کہ امام حسن بصریؒ پیدا ہوئے۔ وادی القریٰ میں پرورش پائی، بڑے فصیح تھے، حضرت علیؓ سے ملاقات کی۔"

۲۔ **روایت حدیث:**

رُوِيَ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ وَ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ وَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ؓ وَلَمْ يُدْرِكْهُمْ وَ عَنْ ثَوْبَانَ وَ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ وَ أَبِي هُرَيْرَةَ وَ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ وَ مَعْقِلِ بْنِ سِنَانٍ وَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْهُمْ وَ عَنْ عُثْمَانَ وَ عَلِيٍّ ... (ایضاً، ۲۶۴)

"امام حسن بصریؒ نے ابی بن کعب، سعد بن عبادہ، عمر بن الخطابؓ سے روایت کی مگر ملاقات نہیں ہوئی اور ثوبانؓ، عمارؓ بن یاسر اور ابو ہریرہؓ اور عثمانؓ بن ابی العاص اور معقلؓ بن یسار سے روایت کی مگر حدیث نہیں سنی، اور عثمانؓ اور علیؓ سے روایت کی۔"

۳۔ سُئِلَ أَبُو زُرْعَةَ هَلْ سَمِعَ الْحَسَنُ أَحَدًا مِنَ الْبَدْرِيِّيْنَ قَالَ رَآهُمْ رُؤْيَةً عُثْمَانَ وَ عَلِيًّا وَ قِيْلَ هَلْ سَمِعَ مِنْهُمَا حَدِيْثًا. قَالَ لَا. رَأى عَلِيًّا بِالْمَدِيْنَةِ وَ خَرَجَ عَلِيٌّ إِلَى الْكُوفَةِ وَ الْبَصْرَةِ وَلَمْ يَلْقَهُ الْحَسَنُ بَعْدَ ذَالِكَ... وَ قَالَ الْحَسَنُ رَأَيْتُ الزُّبَيْرَ يُبَايِعُ عَلِيًّا وَ قَالَ عَلِيُّ بْنُ الْمَدِيْنِيِّ لَمْ يَرَى عَلِيًّا إِلَّا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ ... (ایضاً، ۲۶۶۔۲۶۷)

"امام ابو زرعہ سے پوچھا گیا کہ امام حسن بصریؒ نے کسی بدری سے کوئی حدیث سنی تھی۔ کہا اصحاب بدر کو دیکھا تو تھا مگر ان سے حدیث نہیں سنی تھی۔ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو بھی دیکھا ہے مگر ان سے حدیث نہیں سنی۔ اور حضرت علیؓ کو مدینہ میں دیکھا تھا، پھر حضرت علیؓ کوفہ اور بصرہ چلے گئے اور امام حسنؒ کی ملاقات ان سے نہ ہوئی۔ امام حسنؒ نے کہا کہ میں نے حضرت زبیرؓ کو حضرت علیؓ سے بیعت کرتے دیکھا تھا، اور علی المدینی نے کہا کہ امامؒ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں دیکھا تھا۔"

فائدہ:

۱ ملاقات اور رؤیت بالاتفاق ثابت ہوئی۔

۲۔ سماع میں اختلاف ہے۔

۳۔ راجح سماع مرجوح عدم سماع، کیونکہ ملاقات ہوئی تو سماع یقیناً ہوگا، کوئی بات تو سنی ہوگی۔

Scanned with CamScanner

۴۔ تہذیب الکمال میں حضرت حسن بصری کے ترجمہ (رقم الترجمہ ۱۲۱۶) کے تحت یہ عبارت درج ہے:

عَنْ يُوْنُسَ بْنِ عُبَيْدٍ سَأَلْتُ الْحَسَنَ قُلْتُ يَا اَبَا سَعِيْدٍ اِنَّكَ تَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاِنَّكَ لَمْ تُدْرِكْهُ قَالَ يَا ابْنَ اَخِيْ لَقَدْ سَأَلْتَنِيْ عَنْ شَيْءٍ مَا سَأَلَنِيْ عَنْهُ اَحَدٌ قَبْلَكَ وَلَوْلَا مَنْزِلَتُكَ مِنِّيْ مَا اَخْبَرْتُكَ اِنِّيْ فِيْ زَمَانٍ كَمَا تَرٰى وَكَانَ فِيْ عَمَلِ الْحَجَّاجِ... كُلُّ شَيْءٍ سَمِعْتَنِيْ اَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَهُوَ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ غَيْرَ اَنِّيْ فِيْ زَمَانٍ لَا اَسْتَطِيْعُ اَنْ اَذْكُرَ عَلِيًّا... (تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، ۶: ۱۲۴)

"یونس بن عبید نے کہا کہ میں نے امام حسن بصریؒ سے پوچھا کہ "آپ کہتے ہیں رسول کریم ﷺ نے فرمایا حالانکہ آپ نے حضور ﷺ کو نہیں دیکھا" امام نے کہا: "میرے بھتیجے تو نے مجھ سے ایسی بات پوچھی جو تجھ سے پہلے کسی نے نہیں پوچھی۔ اگر میرے دل میں تیری عزت نہ ہوتی تو میں تمہیں ہرگز نہ بتاتا۔ سنو! میں ایسے دور میں ہوں (آپ حجاج کے عہد میں تھے) کہ تو دیکھ رہا ہے، اس لیے جو حدیث تو مجھ سے اس طرح بیان کرتے ہوئے سنے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تو وہ حدیث علیؓ ابن ابی طالب کی روایت ہوگی۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں ایسے دور میں ہوں کہ برملا حضرت علیؓ کا نام لینے کی ہمت نہیں پاتا۔"

فائدہ:

۱۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ دلیلِ مثبت دلیلِ نافی پر مقدم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں سماع اور رؤیت کی روایات عدم سماع اور عدم رؤیت کی روایات پر مقدم ہوں گی۔

۲۔ امام حسن بصریؒ دو سال خلافتِ فاروقی میں، پھر ۱۲ سال خلافتِ عثمانی میں، پھر ابتدائے خلافتِ علوی تک مدینہ میں رہے۔ اس لیے کسی صحابیؓ یا بدری صحابیؓ یا حضرت علیؓ سے کوئی حدیث نہ سننا خلافِ قیاس و عقل ہے۔ لہٰذا ملاقات سے سماع اور روایت بھی یقینی ہے۔ گو دوسرا احتمال بھی ہے مگر خلافِ عقل ہے اس لیے مرجوح ہے۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

اَنْكَرَ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْحُفَّاظِ سِمَاعَ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ مِنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ وَتَمَسَّكَ بِهٰذَا بَعْضُ الْمُتَاَخِّرِيْنَ... وَاَثْبَتَهُ جَمَاعَةٌ وَهُوَ الرَّاجِحُ عِنْدِيْ لِوُجُوْهٍ وَقَدْ رَجَّحَهُ اَيْضًا الْحَافِظُ ضِيَاءُ الدِّيْنِ الْمَقْدِسِيُّ فِي الْمُخْتَارَةِ قَالَ الْحَسَنُ ابْنُ الْحَسَنِ الْبَصْرِيُّ عَنْ عَلِيٍّ... اَلْوَجْهُ الْاَوَّلُ اَنَّ الْعُلَمَاءَ ذَكَرُوْا فِي الْاُصُوْلِ وُجُوْهَ التَّرْجِيْحِ اَنَّ الْمُثْبِتَ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّافِيْ لِاَنَّ مَعَهُ زِيَادَةَ عِلْمٍ... اَلثَّانِيْ اَنَّ الْحَسَنَ وُلِدَ لِسَنَتَيْنِ بَقِيَتَا مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ بِاتِّفَاقٍ وَكَانَتْ اُمُّهُ خَيْرَةُ مَوْلَاةَ اُمِّ سَلَمَةَ فَكَانَتْ اُمُّ سَلَمَةَ تُخْرِجُهُ اِلَى الصَّحَابَةِ يُبَارِكُوْنَ عَلَيْهِ وَاَخْرَجَتْهُ اِلٰى عُمَرَ فَدَعَا لَهُ اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَحَبِّبْهُ اِلَى النَّاسِ... ذَكَرَهُ الْحَافِظُ جَمَالُ الدِّيْنِ الْمِزِّيُّ فِي التَّهْذِيْبِ... اَنَّهُ حَضَرَ يَوْمَ الدَّارِ وَلَهُ اَرْبَعَةَ عَشَرَةَ

Scanned with CamScanner

سَنَةً وَمِنَ الْمَعْلُوْمِ اَنَّهُ مِنْ حِيْنَ بَلَغَ سَبْعَ سِنِيْنَ اُمِرَ بِالصَّلٰوةِ فَكَانَ يَحْضُرُ الْجَمَاعَةَ وَ يُصَلِّيْ خَلْفَ عُثْمَانَ اِلٰى اَنْ قُتِلَ عُثْمَانُ وَ عَلِيٌّ اِذْ ذَاكَ بِالْمَدِيْنَةِ فَاِنَّهُ لَمْ يَخْرُجْ مِنْهَا اِلَى الْكُوْفَةِ اِلَّا بَعْدَ قَتْلِ عُثْمَانَ فَكَيْفَ يُسْتَنْكَرُ سِمَاعُهُ مِنْهُ وَ هُوَ كُلَّ يَوْمٍ يَجْتَمِعُ بِهٖ فِي الْمَسْجِدِ خَمْسَ مَرَّاتٍ مِنْ حِيْنَ... اِلٰى اَنْ بَلَغَ اَرْبَعَ عَشْرَةَ سَنَةً وَزِيَادَةً عَلٰى ذٰلِكَ اَنَّ عَلِيًّا كَانَ يَزُوْرُ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمِنْهُنَّ اُمُّ سَلَمَةَ وَالْحَسَنُ فِيْ بَيْتِهَا هُوَ وَاُمُّهٗ...

(الحاوی للفتاوی، ۲: ۱۹۱، ۱۹۲)

"حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصریؒ کے سماع کا انکار کیا ہے اور بعض متاخرین نے اسی انکار سے استدلال کیا ہے، اور دوسری جماعت نے سماع کا اثبات کیا ہے اور میرے نزدیک یہی راجح مذہب ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ حافظ ضیاء الدین مقدسی نے مختارہ میں اسی کو ترجیح دی ہے کہ حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی۔ وجہِ اول: علمائے اصول وجوہ ترجیح کے بارے میں فرمایا ہے کہ دلیلِ مثبت دلیلِ نافی پر مقدم ہوتی ہے کیونکہ اس کے پاس زیادہ علم ہوتا ہے۔ وجہِ ثانی: حضرت حسنؒ اس وقت پیدا ہوئے جب خلافتِ فاروقی کے دو سال باقی تھے اور ان کی والدہ حضرت اُمِ سلمہؓ کی لونڈی تھیں اور امِ سلمہؓ حضرت حسنؒ کو دعائے برکت کے لیے صحابہؓ کے پاس بھیجتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ آپ نے ان کے حق میں دعا کی کہ الٰہی اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور لوگوں کے ہاں اسے محبوب بنا۔ حافظ جمال الدین مزی نے تہذیب میں کہا ہے کہ امام حسنؒ محاصرۂ عثمانؓ کے دن چودہ سال کے تھے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ جب وہ سات سال کے ہوئے تو انہیں نماز کا حکم دیا گیا اور امام حسنؒ جماعت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ شہید ہوگئے اور حضرت علیؓ کے پیچھے بھی نماز پڑھتے رہے جب تک وہ مدینہ میں رہے، اور شہادتِ عثمانؓ کے بعد ہی حضرت علیؓ کوفہ گئے، پھر حضرت علیؓ سے امام کے سماع کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ حالانکہ امام حسنؒ حضرت علیؓ کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھتے تھے۔ یہ معمول سنِ تمیز یعنی چودہ سال کی عمر تک رہا۔ مزید یہ کہ حضرت علیؓ امہات المومنین کی زیارت کے لیے جاتے تھے اور ان میں ایک ام سلمہؓ تھیں، اور حضرت ام سلمہؓ کے ہاں امام حسنؒ مع والدہ کے رہتے تھے۔"

اسماء الرجال سے شواہد

1۔ ملاقات اور سماع:

'تہذیب التہذیب' ترجمہ حسن بصری میں لکھا ہے کہ خلافتِ فاروقی کے دو سال باقی تھے کہ امام حسن بصریؒ پیدا ہوئے۔ وادی القریٰ میں پرورش پائی، بڑے فصیح تھے، حضرت علیؓ سے ملاقات کی۔"

2۔ روایتِ حدیث:

روایتِ حدیث میں اس کے بارے میں ہے کہ امام حسن بصریؒ نے ابی بن کعبؓ، سعد بن عبادہؓ، عمرؓ بن الخطاب سے روایت کی مگر ملاقات نہیں ہوئی، اور ثوبانؓ، عمار ابنِ یاسرؓ اور عثمانؓ بن ابی العاص اور موکل بن یسارؓ سے روایت کی مگر حدیث نہیں سنی اور عثمانؓ اور علیؓ سے روایت کی۔

3۔ امام ابوزرعہؒ سے پوچھا گیا کہ امام حسن بصریؒ نے کسی بدری صحابیؓ سے کوئی حدیث سنی تھی؟ کہا! اصحابِ بدر کو دیکھا تو تھا مگر ان سے حدیث نہیں سنی تھی، اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو بھی دیکھا ہے مگر ان سے حدیث نہیں سنی۔ اور حضرت علیؓ کو مدینہ میں دیکھا تھا پھر حضرت علیؓ کوفہ اور بصرہ چلے گئے اور امام حسن بصریؒ کی ملاقات ان سے نہ ہوئی۔ امام حسن بصریؒ نے کہا کہ "میں نے حضرت زبیرؓ کو حضرت علیؓ سے بیعت کرتے دیکھا۔" اور علی المدینی نے کہا کہ امامؒ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں دیکھا تھا۔

فائدہ:

۱۔ ملاقات اور رؤیت بالاتفاق ثابت ہوئی۔

۲۔ سماع میں اختلاف ہے۔ یعنی اس بات میں اختلاف ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ سے کوئی حدیث سنی یا نہیں لیکن ملاقات میں کوئی اختلاف نہیں۔ زیادہ دلائل سماع کی طرف ہیں کہ حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے حدیث سنی۔ نہ سننے کی طرف دلائل کم ہیں کیونکہ ملاقات ہوئی تو سماع یقیناً ہوگا۔ ملاقات ہوئی تو بات بھی ضرور سنی ہوگی۔

۴۔ 'تہذیب الکمال' میں یہ روایت موجود ہے کہ

"یونس بن عبید نے کہا کہ میں نے امام حسن بصریؒ سے پوچھا کہ" آپ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، لیکن آپ نے حضور ﷺ کو نہیں دیکھا۔" امام حسنؒ نے کہا، "میرے بھتیجے! تُو نے مجھ سے ایسی بات پوچھی جو تجھ سے پہلے کسی نے نہیں پوچھی۔" دراصل امامؒ بعض احادیث بیان کرتے تو سیدھی نبی کریم ﷺ سے روایت فرما دیتے تھے حالانکہ آپ کی پیدائش تو حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی۔ حضرت حسن بصری کی والدہ ماجدہ اُمّ المومنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں اور کاشانۂ نبوی پہ ہی رہتی تھیں۔ آپؒ بھی وہیں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے لیکن کیونکہ وصال النبی ﷺ کے بعد پیدا ہوئے تھے، اسی لیے یونس بن عبید نے حیرت کا اظہار کیا کہ حسنؒ براہ راست نبی اکرم ﷺ سے روایت کیوں فرما دیتے ہیں؟ درمیان کے راوی کا نام کیوں نہیں لیتے؟

حسنؒ نے ارشاد فرمایا، "اگر میرے دل میں تیری عزت نہ ہوتی تو میں تمھیں (اس کی وجہ) نہ بتاتا۔ سنو! میں ایسے دور میں ہوں کہ تُو دیکھ رہا ہے (اُس وقت حجاج بن یوسف کا عہد تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا نام لینا مشکل تھا)، اس لیے جو حدیث تُو مجھے اس طرح بیان کرتے ہوئے سنے کہ "حضور ﷺ نے فرمایا" وہ دراصل میں نے حضرت علیؓ سے سنی تھی۔ حجاج کے ڈر سے میں حضرت علیؓ کا نام نہیں لیتا کہ فتنے میں کہیں پکڑا نہ جاؤں۔

Scanned with CamScanner

فائدہ:

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ دلیلِ مثبت دلیلِ نافی پر مقدم ہوتی ہے یعنی ایک اصول ہے کہ کوئی دلیل کسی چیز کا انکار کرنے کے لیے دی جاتی ہے، لیکن جو دلیل اس چیز کو ثابت کرنے کے لیے اس کے اثبات، اس کے حق میں دی جاتی ہے، اہمیت اس کو دی جاتی ہے۔ اثبات نفی پر زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔ اس لیے جو روایتیں امام حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے ملاقات، حدیث کے سماع کا ثبوت دیتی ہیں ان کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔

۲۔ حضرت حسن بصریؒ دو سال عہد فاروقی، بارہ سال عہد عثمانی اور دورِ علوی کے ابتدائی حصے تک مدینہ میں رہے۔ اس لیے کسی صحابیؓ، بدری صحابیؓ یا حضرت علیؓ سے کوئی حدیث نہ سننا، اس بات کو عقل اور اندازہ دونوں ہی تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا ملاقات سے سماع اور روایت دونوں ہی یقینی ہیں۔ گو اس بات کی نفی کا احتمال بھی ہے مگر خلافِ عقل ہے اس لیے مرجوح ہے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں ''حفاظِ حدیث کی ایک جماعت نے حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصریؒ کے سماع کا انکار کیا ہے اور بعض متاخرین نے اسی انکار سے استدلال کیا ہے اور دوسری جماعت نے سماع کا اثبات کیا ہے اور اعلیٰ حضرتؒ فرما رہے ہیں، میرے نزدیک یہی راجح مذہب ہے، یعنی خواجہ حسن بصریؒ کا حضرت علیؓ سے سننا ثابت ہے۔ میرے اس اثبات کی کئی وجوہات ہیں۔ حافظ ضیاء الدین مقدسی نے 'مختارہ' میں اسی کو ترجیح دی ہے کہ حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر اسے اہمیت دی جاتی ہے، اس کے بارے میں فرمایا کہ دلیلِ مثبت دلیلِ نافی پر مقدم ہے۔ دلیلِ مثبت کو اہمیت اس لیے دی جاتی ہے کیونکہ اس کے پاس علم زیادہ ہوتا ہے۔ ترجیح دینے کی دوسری وجہ پہلے بھی تفصیلاً بیان کی گئی ہے یعنی امام حسن بصریؒ تقریباً پندرہ سال کی عمر تک مدینہ میں رہے۔ کاشانۂ نبوت میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی۔ ام المومنین ام سلمہؓ کی گود میں پروان چڑھے۔ سیدہؓ آپؒ کو صحابہؓ کے پاس دعائے برکت کے لیے بھیجتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ آپؓ نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ ''الٰہی! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور لوگوں کے ہاں اسے محبوب بنا۔'' حافظ جمال الدین مزی نے 'تہذیب' میں کہا ہے کہ امام حسنؒ محاصرۂ عثمانؓ کے دن چودہ سال کے تھے اور یہ مسلّم ہے کہ جب وہ سات سال کے ہوئے تو انہیں نماز کا حکم دیا گیا اور حسن بصریؒ نماز باجماعت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھتے رہے، آپؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے پیچھے بھی نماز پڑھتے جب تک کہ وہ مدینہ میں رہے۔ اور شہادتِ عثمانؓ کے بعد ہی حضرت علیؓ کوفہ گئے، پھر حضرت علیؓ سے امامؒ کے سماع کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ حالانکہ امام حسنؒ حضرت علیؓ کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھتے تھے۔ یہ معمول سنِ تمیز تک یعنی چودہ سال کی عمر تک رہا۔ مزید یہ کہ حضرت علیؓ امہات المومنینؓ کی زیارت کے لیے جاتے تھے اور ان میں ایک اُمِ سلمیٰؓ تھیں اور حضرت ام سلمیٰؓ کے ہاں امام حسن بصریؒ معہ والدہ کے رہتے تھے۔

دلائل نقلی:

علامہ سیوطی نے الحاوی للفتاوی (جلد دوم، صفحات ۱۹۲ تا ۱۹۵) میں چند احادیث نقل کی ہیں جو امام حسن بصریؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہیں۔

۱. أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ :يَقُولُ: رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ... (الحاوی للفتاوی، ۱۹۲:۲؛ مسند احمد، مسند علی بن ابی طالب، ۲۵۴:۲)

۲. عَنْ قَتَادَةَ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ...
(الحاوی للفتاوی، ۱۹۳:۲؛ السنن الکبری للنسائی، ۳۲۶:۳)

۳. حَدَّثَنَا الْعَوْفُ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِعَلِيٍّ: يَا عَلِيُّ قَدْ جَعَلْنَا إِلَيْكَ هٰذِهِ السَّبْقَةَ بَيْنَ النَّاسِ... (الحاوی للفتاوی، ۱۹۳:۲؛ سنن الدار قطنی، کتاب السبق بین الخیل، ۳۰۵:۴)

۴. عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ الْخَلِيَّةُ وَالْبَرِيَّةُ وَالْبَتَّةُ، وَالْبَائِنُ وَالْحَرَامُ ثَلَاثٌ لَا تَحِلُّ لَهُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ... (الحاوی للفتاوی، ۱۹۳:۲؛ ایضاً، کتاب الطلاق والخلع والایلاء وغیرہ، ۳۲:۴)

۵. قَالَ الْحَسَنُ، وَقَالَ عَلِيٌّ: إِذَا وَسَّعَ اللهُ عَلَيْكُمْ فَاجْعَلُوهُ صَاعًا مِنْ بُرٍّ وَغَيْرِهِ...
(الحاوی للفتاوی، ۱۹۳:۲؛ ایضاً، کتاب زکوۃ الفطر، ۸۸:۳)

۶. عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَ: أَنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرَوْنَ فِي مَسِّ الذَّكَرِ وُضُوءً...
(الحاوی للفتاوی، ۱۹۴:۲؛ شرح معانی الآثار، باب مس الفرج هل یجب فیه الوضوء أم لا، ۱۴۳:۱)

۷. عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: طُوبٰى لِكُلِّ عَبْدٍ نُوَمَةٍ عَرَفَ النَّاسَ وَلَمْ يَعْرِفْهُ النَّاسُ...
(الحاوی للفتاوی، ۱۹۴:۲؛ حلیۃ الأولیاء وطبقات الاصفیاء، ۷۶:۱)

۸. عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: كُفِّنَ النَّبِيُّ ﷺ فِي قَمِيصٍ أَبْيَضَ وَثَوْبَيْ حِبَرَةٍ...
(الحاوی للفتاوی، ۱۹۴:۲)

۹. قَالَ الْحَافِظُ ابْنُ حَجَرٍ وَوَقَعَ فِي مُسْنَدِ أَبِي يَعْلٰى قَالَ: يَقُولُ أَيِ الْحَسَنُ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ (مَثَلُ أُمَّتِي مَثَلُ الْمَطَرِ)... (الحاوی للفتاوی، ۱۹۵:۲)

۱۰. (عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: شَهِدْتُ عَلِيًّا بِالْمَدِينَةِ وَسَمِعَ صَوْتًا، فَقَالَ: مَا هٰذَا؟ قَالُوا قُتِلَ عُثْمَانُ قَالَ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ أَنِّي لَمْ أَرْضَ... وَلَمْ أُمَالِئْ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا) شَرْحُ أُصُولِ اِعْتِقَادِ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ، بَابُ جِمَاعِ فَضَائِلِ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ، فِي فَضَائِلِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ ؓ، (الحاوی للفتاوی، ۱۹۵:۲) تلك عشرة كاملة...

ان دس حدیثوں سے حضرت حسن بصریؒ کی حضرت علیؓ سے ملاقات ثابت ہوئی۔

Scanned with CamScanner

وَقَالَ اَبُوْ زُرْعَةَ كَانَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ يَوْمَ بُوْيِعَ لِعَلِيٍّ ابْنَ أَرْبَعَ عَشَرَةَ سَنَةً وَرَاٰى عَلِيًّا بِالْمَدِيْنَةِ، قُلْتُ: وَفِي هٰذَا الْقَدْرِ كِفَايَةٌ . وَيُحْمَلُ قَوْلُ النَّافِي عَلٰى مَابَعْدَ خُرُوْجِ عَلِيٍّ مِنَ الْمَدِيْنَةِ (ایضاً، ۲: ۱۹۳)

''امام ابوذرعہ نے کہا کہ جس روز حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت ہوئی، امام حسن بصریؒ، چودہ سال کی عمر کے تھے اور انہوں نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں دیکھا۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں،'' میں کہتا ہوں کہ حضرت علیؓ سے امام حسن بصریؒ کے سماع روایت حدیث اور ملاقات کی شہادت کے لیے یہ دس حدیثیں کافی ہیں۔ اور وہ قول جو عدم لقا اور عدم روایت پر دلالت کرتا ہے اس کا اطلاق اس دور پر ہوگا جب حضرت علیؓ مدینہ چھوڑ کر کوفہ چلے گئے۔''

دلائلِ نقلی:

دلائلِ نقلی سے مراد وہ دلائل ہیں جو نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں۔ یہاں اعلیٰ حضرتؒ نے دس احادیث نقل کی ہیں جو امام حسن بصریؒ نے براہ راست حضرت علیؓ سے روایت کی ہیں۔ احادیث پیش کرنے کے بعد حضرتؒ فرماتے ہیں، 'امام ابوذرعہ نے کہا،'' جس روز حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت ہوئی امام حسن بصریؒ چودہ برس کے تھے اور انہوں نے مدینہ میں حضرت علیؓ کو دیکھا۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں'' میں کہتا ہوں کہ حضرت علیؓ سے امام حسن بصریؒ کے سماع، روایتِ حدیث اور ملاقات کی شہادت کے لیے یہ دس حدیثیں کافی ہیں۔ وہ قول جو عدمِ القاء اور عدمِ روایت پر دلالت کرتا ہے، اس کا اطلاق اس دور پر ہوگا جب حضرت علیؓ مدینہ چھوڑ کر کوفہ تشریف لے گئے۔ یعنی جو لوگ حسن بصریؒ اور حضرت علیؓ کی ملاقات اور روایت کے انکاری ہیں، انہوں نے حضرت علیؓ کے جانے کے بعد کے دور میں حسن بصریؒ کو مدینہ میں دیکھا۔

نواں اعتراض:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشائخ کی قبروں پر یا دوسری قبروں پر جا کر ان کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا یا بیٹھنا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ممنوع ہے۔

الجواب: اس اعتراض کے دو حصے ہیں۔ اول یہ کہ قبر کے پاس جا کر ہاتھ اٹھا کے دعا کرنا ممنوع ہے۔ دوسرا یہ کہ قبر کی طرف منہ کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا ممنوع ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ دعا کرنے کے خاص آداب ہیں اور ان آداب کا لحاظ رکھنا اتباعِ سنت میں داخل ہے۔

قَالَ النَّوَوِيُّ: قَالَ الْعُلَمَاءُ: السُّنَّةُ فِي كُلِّ دُعَاءٍ لِرَفْعِ الْبَلَاءِ اَنْ يَّرْفَعَ يَدَيْهِ جَاعِلًا ظُهُوْرَ كَفَّيْهِ اِلَى السَّمَاءِ، وَاِذَا دَعَا بِسُؤَالِ شَيْءٍ وَتَحْصِيْلِهِ اَنْ يَّجْعَلَ كَفَّيْهِ اِلَى السَّمَاءِ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الاستسقاء، رفع الامام یدہ فی الاستسقاء، ۲: ۵۱۸)

Scanned with CamScanner

"امام نووی نے کہا کہ علماء نے کہا ہے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ ہر وہ دعاء جو دفع بلا کے لیے ہو اس میں ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف ہو اور وہ دعا جو کسی چیز کی طلب وحصول کے لیے ہو اس میں ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں۔"

اور علامہ شوکانی تحفۃ الذاکرین میں فرماتے ہیں کہ:

وَبَسَطَ یَدَیْهِ وَرَفَعَهُمَا حَذْوَ مَنْكِبَیْهِ۔ أَقُوْلُ یَدُلُّ عَلٰی ذٰلِكَ مَا وَقَعَ مِنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ یَدَیْهِ فِیْ نَحْوِ ثَلَاثِیْنَ مَوْضِعًا فِیْ أَدْعِیَةٍ مُتَنَوِّعَةٍ... عَنْ سَلْمَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ حَیٌّ كَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ إِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ إِلَیْهِ یَدَیْهِ أَنْ یَرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَیْنِ.... رَوَاهُ الْحَاكِمُ وَقَالَ صَحِیْحٌ عَلٰی شَرْطِ الشَّیْخَیْنِ... (تحفۃ الذاکرین، ۴۳)

"ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھا کے پھیلانا۔ میں کہتا ہوں کہ اس امر پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تیس حدیثیں دال ہیں جو مختلف قسم کی دعا کرنے کے سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔

سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بڑا حیادار اور سخی ہے۔ جب بندہ ہاتھ اٹھا کر اس سے سوال کرتا ہے تو اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دینے میں اللہ کو حیا آتی ہے۔"

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ رَحِیْمٌ حَیٌّ كَرِیْمٌ یَسْتَحْیِیْ مِنْ عَبْدِهٖ أَنْ یَرْفَعَ إِلَیْهِ یَدَیْهِ ثُمَّ لَا یَضَعُ فِیْهِمَا خَیْرًا... (تحفۃ الذاکرین، ۴۳؛ المستدرک علی الصحیحین، کتاب الدعاء والتکبیر، والتہلیل والتسبیح والذکر، باب ان اللہ حی کریم یستحی من عبدہ ان یبسط الیہ یدیہ ثم یردھا خائبتین، ۱:۴۹۸)

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم وکریم ہے۔ اسے حیا آتی ہے کہ جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھائے تو وہ ان میں کوئی چیز نہ ڈالے۔"

عَنْ مَالِكِ ابْنِ بَشَّارٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ بِبُطُوْنِ أَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا... (تحفۃ الذاکرین، ۴۳)

"مالک بن بشارؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ سے کچھ مانگو تو ہاتھوں کو اس طرح اٹھاؤ کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں، ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف نہ ہو۔"

فائدہ:

ان روایات سے ثابت ہوا کہ:

(۱) دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا مسنون ہے۔

(۲) دفع بلاء کے لیے دعا کرتے وقت ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف ہونا اور طلب وحصول شیء کے لیے دعا کرتے

Scanned with CamScanner

وقت ہتھیلیاں آسمان کی طرف کرنا باتفاق علما مسنون ہے۔

رہا یہ سوال کہ دعا کے وقت ہاتھ کیوں اٹھائے جاتے ہیں تو اس کا جواب متکلمین کی زبانی سنیئے:۔

فَاِنْ قِيْلَ فَمَا بَالُ الْاَيْدِيْ تُرْفَعُ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ جِهَةُ الْعُلُوِّ... اُجِيْبَ بِاَنَّ السَّمَآءَ قِبْلَةُ الدُّعَاءِ تُسْتَقْبَلُ بِالْاَيْدِيْ كَمَا اَنَّ الْبَيْتَ قِبْلَةُ الصَّلٰوةِ تُسْتَقْبَلُ بِالصَّدْرِ وَالْوَجْهِ... (مسامرہ،۳۰)

"اگر کہا جائے کہ دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ کیوں اٹھائے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ جہت بلندی کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے جہت ثابت ہوتی ہے تو جواب یہ ہے کہ آسمان، دعا کا قبلہ ہے اس قبلہ کی طرف ہاتھوں کا رخ کیا جاتا ہے۔ جیسے کعبہ نماز کا قبلہ ہے اس لیے نماز میں چہرہ اور سینہ کا رخ اس طرف ہوتا ہے۔"

اور امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ:

فَكَذٰلِكَ السَّمَآءُ قِبْلَةُ الدُّعَاءِ كَمَا اَنَّ الْبَيْتَ قِبْلَةُ الصَّلٰوةِ وَالْمَعْبُوْدُ بِالصَّلٰوةِ وَالْمَقْصُوْدُ بِالدُّعَاءِ مُنَزَّهٌ عَنِ الْحُلُوْلِ فِي الْبَيْتِ وَالسَّمَآءِ...

(الاقتصاد فی الاعتقاد،۲۳۰)

"اسی طرح آسمان قبلہ ہے دعا کا جیسے کعبہ قبلہ ہے نماز کا۔ اور نماز میں جو معبود ہے اور دعا میں جو مقصود ہے وہ اس بات سے پاک ہے کہ کعبہ یا آسمان میں حلول کرے۔"

فائدہ:

۱۔ معلوم ہوا کہ جس طرح کعبہ کی طرف رخ کیے بغیر نماز ادا کی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی اور نہ ہی قبول ہوتی ہے۔ اسی طرح ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کی جائے تو وہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

۲۔ یہاں سے یہ ثابت ہوا کہ اگر قبر کے پاس ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کی جائے تو مقبول نہیں۔ اگر دعا مقبول نہیں تو میت کو ثواب کس چیز کا پہنچے گا۔ گویا قبر کے پاس جا کر بغیر ہاتھ اٹھائے دعا کرنا ایک بے کار فعل ہوا۔

پس ثابت ہوا کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا مسنون ہے۔ اس میں قبر اور غیر قبر کی قید نہیں۔

قبر کے پاس جا کر دعا کرنے کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت فعلی ملاحظہ ہو۔

عَنْ عَآئِشَةَ رضی اللہ عنہا... ثُمَّ انْطَلَقْتُ عَلٰى اِثْرِهٖ حَتّٰى جَآءَ الْبَقِيْعَ فَقَامَ. فَاَطَالَ الْقِيَامَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ انْحَرَفَ... (صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب مایقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها،۲:۲۶۹)

قَالَ النَّوَوِيُّ فِيْهِ اِسْتِحْبَابُ اِطَالَةِ الدُّعَاءِ وَتَكْرِيْرِهٖ وَرَفْعِ الْيَدَيْنِ فِيْهِ وَفِيْهِ اَنَّ دُعَاءَ الْقَائِمِ اَكْمَلُ مِنْ دُعَاءِ جَالِسٍ فِي الْقُبُوْرِ... (شرح النووی علی مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی التسلیم علی اهل القبور والدعا والاستغفار لهم، اللهم اغفر لأهل بقیع، ۱: ۳۱۳)

Scanned with CamScanner

"(حضور ﷺ رات کو جنت البقیع میں گئے) تو میں بھی ان کے پیچھے چلی گئی حتیٰ کہ آپ جنت البقیع میں پہنچے، دیر تک کھڑے رہے پھر ہاتھ اٹھا کر تین بار دعا مانگی پھر واپس چلے آئے۔ امام نووی نے فرمایا کہ یہ استحباب دعائے طویل، تکرار دعا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کی دلیل ہے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ قبر کے پاس کھڑا ہو کر دعا کرنا بیٹھ کر دعا کرنے کی نسبت زیادہ مکمل ہے۔"

منکرین دعاء علی القبر نے دعا کرتے وقت قبر کی طرف پشت کرنے کا جو نظریہ پیش کیا ہے اسے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کر کے اپنے دعویٰ کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے اس کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

یہ درست ہے کہ علامہ کرمانی اور ابواللیث سمرقندیؒ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ان دونوں کی رائے کو امام ابوحنیفہؒ کا مذہب قرار دیا جائے جبکہ امام صاحب کا اپنا قول اس کے برعکس موجود ہے۔ وھو ھذا

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مِنَ السُّنَّةِ اَنْ تَاْتِیَ قَبْرَ النَّبِیِّ ﷺ مِنْ قِبَلِ الْقِبْلَةِ وَتَجْعَلَ ظَهْرَكَ اِلَی الْقِبْلَةِ وَتَسْتَقْبِلَ الْقَبْرَ لِوَجْهِكَ ثُمَّ تَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ ﷺ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ...

(مسند الامام الاعظم، کتاب الحج، بیان بیأة زیارة قبر النبی ﷺ، ۲۷)

"امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ تم حضور ﷺ کی قبر مبارک پر قبلہ کی طرف سے آؤ، پشت قبلہ کی طرف اور منہ مزار کی طرف ہو۔ پھر کہو السلام علیک۔۔۔الخ۔"

وَقَالَ بَعْضُهُمْ رَاَیْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ اَتٰی قَبْرَ النَّبِیِّ ﷺ فَوَقَفَ فَرَفَعَ یَدَیْهِ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّهُ افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ. قَالَ مَالِكٌ فِیْ رِوَایَةِ ابْنِ وَهْبٍ: اِذَا سَلَّمَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ وَدَعَا یَقِفُ وَوَجْهُهٗ اِلَی الْقَبْرِ لَا اِلَی الْقِبْلَةِ... (شفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، ۲:۸۴)

"بعض صحابہؓ نے کہا کہ انسؓ بن مالک حضور ﷺ کے مزار پر جاتے تھے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر قبر کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ شاید آپ نے نماز شروع کر دی ہے۔" "امام مالکؒ نے ابن وہب سے بیان کیا ہے کہ ابن وہب جب حضور ﷺ کی خدمت میں سلام پیش کرتے تو منہ قبر مبارک کی طرف ہوتا اور پشت قبلہ کی طرف کر کے دعا مانگتے تھے۔"

الغرض:

ان روایات سے ثابت ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اور جلیل القدر صحابہؓ کا عمل یہی ہے کہ قبر کے پاس جاؤ تو منہ قبر کی طرف اور پشت قبلہ کی طرف ہو اور اس حالت میں دعا مانگو۔

آخر میں علامہ شوکانی کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔

وَجَرَّبَ اِسْتِجَابَةَ الدُّعَاءِ عِنْدَ قُبُوْرِ الصَّالِحِیْنَ بِشُرُوْطٍ مَعْرُوْفَةٍ... (تحفة الذاکرین، ۵۵)

Scanned with CamScanner

"تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اولیاء اللہ کی قبروں کے پاس جا کر شرائط معروفہ کے ساتھ دعا کی جائے تو جلد قبول ہوتی ہے۔"
مختصر یہ کہ قبرستان میں جا کر قبر کی طرف منہ کر کے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر، ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مسنون ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

اور بقول علامہ شوکانی:

"تجربہ شاہد ہے کہ صالحین کی قبروں کے پاس جا کر شرائطِ معروضہ کے ساتھ دعا کی جائے تو جلد قبول ہوتی ہے۔"
خیال رہے کہ اہلِ قبور کو حاجت روا، مشکل کشا اور مافوق الاسباب ہستیاں سمجھنا جہلاء کا فاسد عقیدہ ہے۔ دعا تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ہی مانگنی چاہیے۔

نواں اعتراض:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشائخ کی قبروں پر یا دوسری قبروں پر جا کر، ان کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونا یا بیٹھنا اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ممنوع ہے۔

الجواب: اس اعتراض کے دو حصے ہیں۔ اوّل یہ کہ قبر کے پاس جا کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ممنوع ہے دوسرا یہ کہ قبر کی طرف منہ کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا ممنوع ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ دعا کرنے کے خاص آداب ہیں اور ان آداب کا لحاظ رکھنا اتباعِ سنت میں داخل ہے۔ امام نووی نے کہا ہے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ ہر وہ دعا جو دفع وبلا کے لیے ہو، اس میں ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف ہو تا کہ اللہ اس چیز کو الٹ دے اور وہ دعا جو کسی چیز کی طلب و حصول کے لیے ہو اس میں ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں۔ اور علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھا کر پھیلانا چاہیے یعنی ہاتھ کندھے کے برابر ہوں اور پھیلے ہوئے ہوں۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ کی وہ تیس حدیثیں دلالت کرتی ہیں جو مختلف قسم کی دعا کرنے کے سلسلے میں حضور اکرم ﷺ سے منقول ہیں۔ ان میں حضور اکرم ﷺ نے یہ دونوں اندازِ دعا اپنائے ہیں۔ بارش کے لیے دعا کی تو آپ ﷺ نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے دعا کی اور حصولِ برکات کے لیے دعا کی تو تیس احادیث ملتی ہیں جن میں حضور ﷺ نے دعا فرمائی تو ہاتھ کندھوں تک اٹھائے اور پھیلا کر رکھے۔

سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بڑا حیادار اور سخی ہے۔ جب بندہ ہاتھ اٹھا کر اس سے سوال کرتا ہے تو اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دینے میں اللہ کو حیا آتی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ اسے حیا آتی ہے کہ جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھائے تو وہ ان میں کوئی چیز نہ ڈالے۔

مالک بن بشارؓ فرماتے ہیں کہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ سے کچھ مانگو تو ہاتھوں کو اس طرح اٹھاؤ کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں۔ ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف نہ ہو۔

Scanned with CamScanner

لوگوں کو کیسے معلوم ہو کہ صحیح اسلامی تصوف کیا ہے؟ عوام کی تو یہ حالت ہے کہ ہر دیوانے کو مجذوب سمجھنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور مدعیان تصوف میں جس کو جو عہدہ چاہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ غوث، قطب تو عام ہو گئے ہیں۔ لوگوں کو اس بارے علم بھی نہیں اور تمیز بھی نہیں۔ کئی بار میں نے لکھا ہوا دیکھا ہے، پہلے لکھیں گے غوثِ زمان، پھر لکھیں گے قطبِ دوراں۔ اب قطب، غوث کے ماتحت ہوتے ہیں اور آپ ہیں کہ غوث پہلے لکھ دیا اور قطب بعد میں، جیسے کسی کا لکھیں کہ جنرل ہے، پھر لکھیں کپتان بھی ہے۔ لوگوں کو ان عہدوں کی درجہ بندی تک کی خبر نہیں۔ ان عہدوں کا شعور تک نہیں ہے کہ یہ کیا ہیں کس لیے ہیں؟ تو ایسوں کو اگر سچ بھی نہ بتایا جائے تو انہیں جھوٹ سچ کا پتا کیونکر چلے گا۔

تیسرا اعتراض: جب سماعِ موتی ممکن ہی نہیں تو ان سے رابطہ کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ اصول پیشِ نظر رہے کہ جو معارف یا کمالاتِ علمی، روح اس دنیا میں رہ کر حاصل کرتی ہے وہ بعد از مفارقتِ بدن اس سے سلب نہیں کیے جاتے بلکہ ان مکسوبہ علوم و معارف میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور روح کے ادراکات وسیع ہو جاتے ہیں۔ ہاں روح سے وہ افعال و اعمال سلب ہو جاتے ہیں جو بدن کے وسیلہ سے کرتی تھی۔ دنیا میں روح مادی کانوں، آنکھوں اور زبان کی محتاج تھی کیونکہ مادیات کو سنانا اور دکھانا وغیرہ مقصود تھا۔ جب مادہ سے مفارقت ہوئی تو مادی آلات سلب ہو گئے، مگر روح میں بولنے، سننے اور دیکھنے کی قوت باقی رہی۔ یہ روح کی ذاتی صفات ہیں پس روح زندہ ہے، کلام کرتی ہے، دیکھتی ہے، سنتی ہے، کلام کا جواب دیتی ہے۔ یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے احیاء میں مفصل بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

فَقَلْبُ الْمُؤْمِنِ لَا یَمُوْتُ وَعِلْمُهٗ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا یُمْحٰی وَصَفَاؤُهٗ لَا یَتَکَدَّرُ...

(احیاء علوم الدین، بیان معنی النفس والروح والقلب والعقل وما ھو المراد بھذہ الأسامی، ۳:۲۲)

"مومن کا قلب نہیں مرتا۔ اس کا علم اس سے سلب نہیں کیا جاتا۔ اس کی صفائی کو مکدر نہیں کیا جاتا۔"

دوسری یہ بات کہ سماعِ موتی کا مسئلہ کشف سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں گفتگو کا حق بھی اصحابِ کشف کو ہے جیسے کہ صاحبِ کشف الاستار نے وضاحت فرمائی ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ اَعْلَی الْکَلَامِ وَاَقْصَی الْمَرَامِ اَنَّ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةَ لَیْسَتْ مِمَّا یَبْحَثُ فِیْهِ الْفَاظُوْنَ یَنْقُلُهُ النَّقَّالُوْنَ بَلْ هُوَ مِنَ الْاِنْکِشَافِ الصِّفَاتِیِّ الَّذِیْ یَکْشِفُهُ اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی بَعْضِ اَوْلِیَائِهٖ...

(الدر المختار وعلی هامشه کشف الاستار باب الیمین فی الضرب والقتل، ۱:۱۱۱۳)

"خوب سمجھ لو کہ بہترین بات اور منتہائے مقصود یہ ہے کہ (سماعِ موتی) کا مسئلہ اس قبیل سے نہیں

Scanned with CamScanner

کہ لفظوں سے کھیلنے والے اس بحث میں پڑیں یا محض نقل کرنے والے اسے نقل کر دیں بلکہ یہ تو انکشاف صفاتی سے ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے بعض اولیاء پر منکشف فرماتے ہیں۔"

فائدہ:

اس سے یہ مراد نہیں کہ کشف کوئی مستقل دلیلِ شرعی ہے مگر جب دلیلِ قطعی کے مطابق ہو تو صاحبِ کشف کے لیے یقینی حجت ہے۔

تیسرا اعتراض: جب سماعِ موتیٰ ممکن ہی نہیں تو ان سے رابطہ کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے؟

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مرنے والے سے بات کرنا تو ممکن نہیں تو ان سے رابطہ کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے؟ جو دنیا سے گزر جاتا ہے اس کو بات سنانا، اس کی بات سننا کیا یہ قرآن میں آیا ہے کہ ممکن ہی نہیں......؟ یہ اعتراض کرنے والے پہلی بات تو یہ یاد رکھیں کہ جو علمی یا ظاہری کمالات کسی کے پاس ہوتے ہیں، مرنے کے بعد روح ان کمالات کی حامل رہتی ہے وہ سلب نہیں ہو جاتے۔ اگر دنیا میں کوئی طبیب تھا تو مرنے کے بعد بھی اس کی روح کو طب کے سارے نسخے یاد ہوں گے۔ اگر کوئی عالم تھا تو سارے مسائل روح کو بھی یاد ہیں۔ اگر کوئی صوفی تھا تو اس کے سارے کمالات روح کے ساتھ موجود ہیں، وہ روح سے سلب نہیں کیے جاتے بلکہ بدن کا حجاب ہٹ جاتا ہے تو اُن علوم میں، اور وضاحت اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ روح کی نظر اور بھی دور رس ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ اعمال و افعال روح سے سلب کر لیے جاتے ہیں جنہیں وہ بدن کے ذریعے کرتی تھی۔ جو کام بدن کرتا تھا، بدن نہ رہا تو وہ کام بھی نہ رہے۔ دنیا میں روح جسمِ مادی کی محتاج تھی کیونکہ مادی دنیا میں رہنا، مادی چیزوں کا استعمال کرنا، مادی انسانوں کو سنانا اور دیکھنا مقصود تھا۔ جب روح مادے سے الگ ہو گئی تو مادی آلات سلب ہو گئے۔ مگر دیکھنا، سننا، محسوس کرنا، کلام کرنا، یہ روح کی ذاتی صفات ہیں۔ روح زندہ ہے، اس کی صفات پسِ مرگ بھی برقرار ہوتی ہیں۔ یہ ایک متفقہ مسئلہ ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے 'احیاء العلوم' میں مفصل بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے مومن کا قلب نہیں مرتا، اس کا علم اس سے سلب نہیں کیا جاتا، اس کی صفائی کو مکدر نہیں کیا جا سکتا۔ رہ گیا سماعِ موتیٰ کا مسئلہ تو اس سلسلے میں 'کشف الاستار' میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان لوگوں کے بات کرنے کا ہے جو صاحبِ حال اور صاحبِ کشف ہیں۔ یہ نرے لفظوں سے کھیلنے والوں اور محض نقل کر دینے والوں کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ان کے بحث کرنے کی چیز ہی نہیں۔

بعد موتِ جسمانی، روح کا علم اور حافظہ موجود رہتا ہے

قَالَ تَعَالٰی: قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ... قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ... (یٰس: ۲۶، ۲۷)

Scanned with CamScanner

"ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو۔ کہنے لگا کاش امیری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت داروں میں شامل کر دیا۔"

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ قوم نے جو سلوک اُس مردِ مومن کے ساتھ کیا تھا وہ اسے یاد تھا۔ اس نے یہ بات بھی اظہار افسوس کے طور پر کی۔

بعدِ موتِ جسمانی، روح کا علم اور حافظہ موجود رہتا ہے

جسم پر موت واقع ہو جانے کے بعد روح کا حافظہ قائم رہتا ہے جو علم اس نے حاصل کیا ہو، موجود رہتا ہے۔ جیسے سورہ یٰسین میں جب اس بندے کو جنت میں داخل ہونے کا حکم ملا تو اس نے کہا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور عزت داروں میں شامل کر دیا۔ یہ برزخی جنت کی بات ہو رہی ہے جس میں مومن دنیا سے جانے کے بعد داخل ہو جاتا ہے۔ سورہ یٰسین میں واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ تین نبی ایک گاؤں میں مبعوث ہوئے، گاؤں والوں نے ان کی تکذیب کی اور انہیں نقصان پہنچانے پر آمادہ ہوئے۔

وَجَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ رَجُلٌ يَّسۡعٰى قَالَ يٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِيۡنَ...

ایک شخص بستی کے پرلے کنارے سے بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ اے میری قوم! یہ رسول ہیں، ان کی اطاعت کرو۔ لوگوں نے اسے شہید کر دیا۔ قرآن میں ہے کہ اللہ نے اسے جنت میں داخل کر دیا تو وہ کہنے لگا،

قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ يَعۡلَمُوۡنَ بِمَا غَفَرَ لِىۡ رَبِّىۡ وَجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ...

"کاش! میری قوم کو پتا چل جائے کہ مجھے میرے رب نے بخش دیا اور مجھے بڑے معزز لوگوں میں شامل کر لیا ہے۔"

مرنے کے بعد روح کو وہ سلوک یاد تھا جو اس سے کیا گیا تھا۔ یہی دکھ اُس نے ظاہر کیا کہ کاش میرے لوگوں کو پتا چل جائے کہ انہوں نے مجھے قتل کر دیا تھا لیکن مجھے مرتبۂ شہادت ملا اور اللہ نے مجھے جنت میں داخل کر دیا ہے، تا کہ وہ بھی رسولوں کی اطاعت اختیار کر لیں۔

روح سنتی بھی ہے:

قَالَ تَعَالٰی: وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى...

قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ... (البقرہ:۲۶۰)

Scanned with CamScanner

"اس وقت کو یاد کر جبکہ ابراہیمؑ نے عرض کیا، اے میرے پروردگار مجھ کو دکھلا دیجئے، آپ مُردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔ ارشاد ہوا۔ اچھا تو تم چار پرندے لو، پھر انہیں پال کر اپنے لیے ہلا لو، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان سب کو بلاؤ دیکھو تمہارے پاس سب دوڑتے چلے آئیں گے۔"

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں معتزلہ کا رد ان الفاظ سے فرمایا:

وَ لَمَّا دَلَّتِ الْاٰیَةُ عَلٰی حُصُوْلِ فَهْمِ النِّدَآءِ وَ الْقُدْرَةِ عَلَی السَّعْیِ لِتِلْكَ الْاَجْزَآءِ حَالَ تَفَرُّقِهَا... کَانَ دَلِیْلًا قَاطِعًا عَلٰی اَنَّ الْبِنْیَةَ لَیْسَتْ شَرْطًا لِلْحَیَاةِ... (تفسیر الکبیر، ۳۲۹:۲)

"آیت اس حقیقت پر دال ہے کہ پرندوں کے اجزا نے آواز کو سنا، سمجھا اور چلنے پر قادر ہوئے باوجود اس بات کے کہ متفرق اجزا تھے۔ پس یہ آیت اس امر پر دلیل قاطع ہوئی کہ حیات کے لیے وجود صحیح کا ہونا شرط نہیں۔"

آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے واضح ہے۔ روح کے سماع میں تو اختلاف ہے ہی نہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ بدن سنتا ہے یا نہیں؟ نکیرین کے سوال و جواب کے وقت اعادہ روح کا کیا جاتا ہے جو احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ پس اختلاف اس میں ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب کے بعد بدن سنتا ہے یا نہیں؟

روح سنتی بھی ہے

روح کیسے سنتی ہے؟ فرمایا، روح تو پھر روح ہے کہ جسمِ لطیف ہے۔ مادی جسم کے ذرات بھی سنتے ہیں، جیسے ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ یا اللہ! مجھے وہ منظر دکھا دے، تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا، مجھے وہ منظر دکھا،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی... پوچھا گیا، اَوَلَمْ تُؤْمِنْ... آپ کو یقین نہیں ہے؟ بالکل یقین ہے۔ یا اللہ! میرا ایمان ہے کہ تُو زندہ کرے گا لیکن میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں کہ تُو ایسا کس کیفیت سے کرے گا، یا یہ کہ مردے کس کیفیت سے زندہ ہوں گے۔

تو حکم ہوا کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ... چار پرندے لے لو جو مختلف نسلوں سے ہوں جیسے مور، کبوتر، مرغا، کوا، وغیرہ اور ان چاروں کو فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ... اچھی طرح اپنے ساتھ مانوس کر لو۔ انہیں پالو، دانہ دنکا کھلاؤ تو وہ آپ کے ساتھ خوب مانوس ہو جائیں گے۔ پھر ان کو ذبح کر کے ان کو پروں کھال سمیت کاٹ کوٹ کر ایک کر دو، پھر ان میں تھوڑا تھوڑا تمام پہاڑوں پر پھینک دو۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ... اس کے بعد انہیں بلاؤ (جس طرح پالنے اور سدھانے کے دوران انہیں اپنی طرف بلاتے تھے) یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا... آپ دیکھیں گے کہ وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس چلے آئیں گے۔ اسی طرح مُردوں کو زندہ کرنے کا منظر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو دکھا دیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک ایک پرندے کا نام لے کر پکارا تو جس کا نام پکارتے، اس کے ذرات ان ڈھیروں سے الگ ہو ہو کر اڑتے ہوئے آتے اور آپؑ کے سامنے ایک دوسرے سے جڑ کر پرندہ

Scanned with CamScanner

بن گئے اور زندہ ہو گئے۔ یعنی مردہ پرندوں کے وجود کا ایک ایک ذرہ نہ صرف سن رہا تھا بلکہ سن کر سمجھ بھی رہا تھا، تو پھر روح کیوں نہیں سن سکتی؟

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں معتزلہ کا رد ان الفاظ میں فرمایا (معتزلہ ایک فرقہ ہے)، وَمِمَّا دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى حُصُوْلِ فَهْمِ النِّدَاءِ وَالْقُدْرَةِ عَلَى السَّعْيِ... یعنی اس آیت نے یہ ثابت کر دیا کہ ان ذرات نے آواز بھی سنی، فَهْمِ النِّدَاءِ... اسے سمجھا بھی، اور وَالْقُدْرَةِ عَلَى السَّعْيِ... ان ذرات کو اللہ نے یہ قدرت بھی دی کہ وہ بھاگ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ حالانکہ وہ متفرق اجزا تھے اور مختلف پہاڑوں پر پڑے تھے۔ كَانَ دَلِيْلًا قَاطِعًا عَلٰى اَنَّ الْبِنْيَةَ لَيْسَتْ شَرْطًا لِلْحَيَاةِ... تفسیر کبیر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بہت وزنی دلیل ہے کہ حیات کے لیے وجود کا مکمل یا صحیح ہونا شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو سنوا سکتا ہے۔ پرندوں کا وجود ریزہ ریزہ تھا اور دور دور بکھرا ہوا تھا لیکن انہوں نے سنا بھی اور دوڑ کر بھی آئے۔

اس بات میں تو کبھی اختلاف رہا ہی نہیں کہ روح نہیں سنتی۔ علماء میں اختلاف یہ رہا ہے کہ مرنے کے بعد بدن سنتا ہے کہ نہیں؟ مرنے کے بعد جب منکر نکیر سوال کرنے آتے ہیں تو روح کو بدن میں لوٹا دیا جاتا ہے، روح اور بدن مل کر جواب دیتے ہیں۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ جب یہ سوال جواب ختم ہو جاتے ہیں تو روح بدن سے الگ ہو جاتی ہے۔ تب بدن یا اس کے ذرات سنتے ہیں کہ نہیں؟ اس آیہ کریمہ سے یہ سمجھ آ رہی ہے کہ اللہ قادر ہے۔ بدن کے ذرات بھی سنتے ہیں۔ جیسے ان پرندوں کے مرنے کے بعد ان کے بدن کے ذرات نے سنا اور دوڑے چلے آئے۔

سوال و جواب نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن

قَالَ شَيْخُ الْاِسْلَامِ الْاَحَادِيْثُ الصَّحِيْحَةُ الْمُتَوَاتِرَةُ تَدُلُّ عَلٰى عَوْدِ الرُّوْحِ اِلَى الْبَدَنِ وَقْتَ السُّؤَالِ وَ سُؤَالُ الْبَدَنِ بِلَا رُوْحٍ قَوْلٌ قَالَهٗ طَائِفَةٌ مِّنَ النَّاسِ وَاَنْكَرَهُ الْجُمْهُوْرُ... (کتاب الروح، ۶۲)

"شیخ الاسلام نے فرمایا کہ صحیح اور متواتر احادیث نکیرین کے سوال کے وقت عودِ روح الی البدن پر دلالت کرتی ہیں مگر ایک جماعت متواتر احادیث کی مخالفت کرتی ہے اور جمہور علماء نے اس جماعت کی مخالفت کی ہے۔"

اور علامہ سیوطیؒ نے فرمایا:

قَالَ ابْنُ تَيْمِيَه: اَلْاَحَادِيْثُ مُتَوَاتِرَةٌ عَلٰى عَوْدِ الرُّوْحِ اِلَى الْبَدَنِ وَقْتَ السُّؤَالِ وَ سُؤَالُ الْبَدَنِ بِلَا رُوْحٍ قَوْلُ طَائِفَةٍ مِّنْهُمُ ابْنُ الزَّاغُوْنِيْ وَ حَكَىٰ عَنِ ابْنِ جَرِيْرٍ وَ اَنْكَرَهُ الْجُمْهُوْرُ... (شرح الصدور بشرح حال الموتٰی فی القبور، ۹۶)

"امام ابن تیمیہ نے فرمایا کہ سوال نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن کی احادیث صحیح اور متواتر ہیں۔
ایک گروہ سوال بلا روح کا قائل ہے جیسا ابن الزاغونی، ابن جریر (اور کرامیہ)، اور جمہور علماء
ان کے مخالف ہیں۔"

قَالَ السَّلَفِيُّ. عَوْدُ الرُّوحِ إِلَى الْجَسَدِ فِي الْقَبْرِ ثَابِتٌ فِي الصَّحِيحِ لِسَائِرِ الْمَوْتٰى... وَ إِنَّمَا النَّظَرُ فِي اسْتِمْرَارِهَا فِي الْبَدَنِ... (شرح الصدور بشرح حال الموتٰی فی القبور، ۱۳۷)

"علامہ سلفی نے کہا کہ قبر میں عودِ روح الی البدن ثابت ہے اور تمام موتی کے لیے ہے، اور یہی صحیح مذہب ہے۔ خلاف صرف روح کے بدن میں ہمیشہ رہنے میں ہے۔"

شَيْخُ الْإِسْلَامِ اَبُو الْفَضْلِ بْنُ حَجَرٍ سُئِلَ عَنِ الْمَيِّتِ إِذَا سُئِلَ هَلْ يُقْعَدُ اَمْ يُسْئَلُ وَهُوَ رَاقِدٌ فَأَجَابَ يُقْعَدُ وَسُئِلَ عَنِ الرُّوحِ هَلْ تَلْبَسُ حِيْنَئِذٍ الْجُثَّةَ كَمَا كَانَتْ فَأَجَابَ نَعَمْ لٰكِنْ ظَاهِرَ الْخَبَرِ أَنَّهَا تَحُلُّ فِي نِصْفِهِ الْأَعْلٰى... (ایضاً، ۹٦)

"شیخ الاسلام علامہ ابن حجر سے سوال کیا گیا کہ وقتِ سوال و جواب میت کو قبر میں بٹھایا جاتا ہے یا حالت فراش میں ہی سوال ہوتا ہے۔ تو جواب دیا، بٹھایا جاتا ہے۔ پھر سوال ہوا روح بدن اوڑھ لیتی ہے؟ جواب دیا، ہاں! مگر احادیث میں آتا ہے کہ روح کا تعلق بدن کے اوپر کے حصے سے ہوتا ہے۔"

پھر چند سطور کے بعد فرمایا:

وَهِيَ لَا تَزَالُ مُتَعَلِّقَةً بِهٖ وَإِنْ بَلِيَ وَتُمَزَّقُ وَتُقْسَمُ وَتُفَرَّقُ...

(شرح الصدور بشرح حال الموتٰی فی القبور، ۹٦)

"اور یہ تعلق روح کا بدن سے ہمیشہ رہتا ہے اگرچہ جسم ریزہ ریزہ اور چورا چورا ہو جائے۔"

فائدہ:

قبر میں میت سے سوال و جواب کے وقت روح کا تعلق بدن سے پیدا ہو جاتا ہے۔ روح کا تعلق جسم کے بالائی حصہ سے ہوتا ہے کیونکہ قلب بالائی حصہ میں ہے اور سمجھنے کا آلہ ہے۔

سوال و جواب نکیرین کے وقت عودِ روح الی البدن

'کتاب الروح' میں ہے کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ صحیح اور متواترہ احادیث کے مطابق نکیرین کے سوال و جواب کے وقت روح بدن میں دوبارہ آجاتی ہے۔ سوال و جواب کے وقت روح کا بدن کے ساتھ تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ علما کی ایک جماعت متواتر احادیث کی مخالفت کرتی ہے۔ وہ لوگ ان احادیث کا انکار کرتے ہیں لیکن جمہور علما نے ان لوگوں کا انکار کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے 'شرح الصدر' میں لکھا ہے کہ امام ابن تیمیہ "فرماتے ہیں کہ جب منکر نکیر سوال کرتے ہیں تو روح کو بدن

Scanned with CamScanner

کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور اس پر صحیح اور متواتر احادیث ہیں جبکہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ روح تو اپنی جگہ (علیین یا سجین) میں چلی جاتی ہے، سوال بدن سے ہوتا ہے۔ ان علما میں ابن الزاغونی، ابن جریر (اور کرامیہ) شامل ہیں، اور جمہور علما نے ان کی مخالفت کی ہے یعنی پوری امت ان سے اختلاف کرتی ہے۔ علامہ سلفی کہتے ہیں کہ قبر میں روح کا جسم کی طرف پلٹ کر آنا تو تمام مرنے والوں کے لیے ثابت ہے اور یہی صحیح مذہب ہے۔ اختلاف صرف یہ ہے کہ اس کے بعد بدن کا تعلق روح سے رہتا ہے یا نہیں۔ یعنی سوال و جواب کے لیے تو روح کا تعلق بدن سے قائم کیا جاتا ہے، اس کے بعد بدن کے ساتھ روح کا تعلق رہتا ہے یا نہیں، اختلاف اس میں ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن حجر سے سوال کیا گیا کہ بوقت سوال و جواب روح لیٹے لیٹے جواب دیتی ہے یا اسے بٹھایا جاتا ہے؟ جواب ملا بٹھایا جاتا ہے۔ پھر سوال کیا گیا کہ کیا روح بدن میں اسی طرح ہوجاتی ہے جس طرح زندگی میں تھی؟ تو انہوں نے فرمایا، ہاں! مگر احادیث میں آتا ہے کہ روح کا تعلق بدن کے اوپر کے حصے سے ہوتا ہے کیونکہ وہاں دل ہوتا ہے اور سمجھنے کی صلاحیت اور عقل و شعور دل میں ہی ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ بدن کے ساتھ روح کا ایک تعلق ہمیشہ ہر حال میں رہتا ہے اگرچہ جسم ریزہ ریزہ ہوجائے، خاک میں مل جائے۔ جہاں بھی وہ اجزا ہوں گے روح کا تعلق ان کے ساتھ بہر طور رہتا ہے۔

قبر میں انبیاءؑ کے جسم کا تعلق روح سے دائمی ہوتا ہے

فَجَاءَ اَبُوْ بَكْرٍ فَكَشَفَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَبَّلَهٗ فَقَالَ: بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ طِبْتَ حَيًّا وَمَيِّتًا ... وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُذِيْقُكَ اللّٰهُ الْمَوْتَتَيْنِ اَبَدًا ...

(صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب قول نبی ﷺ: لو کنت متخذا خلیلا، ۱:۵۱۷)

یا (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب فضائل اصحاب النبی، باب قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم: لو کنت متخذا خلیلا، ۲:۲۸۹)

"پھر حضرت ابوبکرؓ آئے۔ حضور اکرم ﷺ (کے چہرۂ انور) سے کپڑا اٹھایا، بوسہ لیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوجائیں! آپ حیات میں اور بعدِ حیات پاکیزہ ہی رہے۔ اور اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے آپ کو اللہ تعالیٰ دوبارہ موت نہ دے گا۔"

اس کی شرح میں ابن حجر نے فرمایا:

وَاَحْسَنُ مِنْ هٰذَا الْجَوَابِ اَنْ يُّقَالَ: اِنَّ حَيَاتَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقَبْرِ لَا يَعْقُبُهَا مَوْتٌ بَلْ يَسْتَمِرُّ حَيًّا وَالْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ ... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب قول النبی ﷺ (لو کنت متخذا خلیلا)، ۷:۲۹)

صاحب فتح الباری نے فرمایا کہ "اس سے احسن جواب یہ ہے کہ کہا جائے کہ قبر مبارک میں حضور ﷺ کی زندگی ایسی دائمی ہے جس کے بعد موت نہیں، اور انبیاء قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔"

فائدہ:

قبر میں سوال کے وقت روح کا جو تعلق بدن سے پیدا ہوتا ہے وہ انبیاء کے اجساد کے ساتھ دائمی رہتا ہے، اس تعلق کو توڑا نہیں جاتا۔ اسی تعلق کی وجہ سے انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ اہل السنۃ والجماعت کا یہی مذہب ہے۔

قبر میں انبیاءؑ کے جسم کا تعلق روح سے دائمی ہوتا ہے

جہاں تک انبیاءؑ کا تعلق ہے تو انبیاءؑ کی مقدس ارواح ہمیشہ ان کے وجودِ اطہر میں رہتی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ حاضر ہوئے، تشریف لائے اور چہرۂ اقدس سے کپڑا ہٹایا فَقَبَّلَهٗ... حضور اقدس ﷺ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور عرض کیا بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي طِبْتَ حَيًّا وَمَيِّتًا... میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، یارسول اللہ ﷺ! آپ زندگی میں بھی اور موت میں بھی ہمیشہ ہی پاکیزہ رہے۔ پھر فرمایا،

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَا يُذِيقُكَ اللّٰهُ الْمَوْتَتَيْنِ... "اس اللہ کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! اللہ آپ ﷺ کو دو موتیں نہیں دے گا۔" یعنی دنیا سے گزر جانے کے بعد روحِ اطہر بدن سے الگ نہیں ہوگی۔

اس کی شرح میں علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ قبر مبارک میں حضور ﷺ کی زندگی ایسی دائمی ہے جس کے بعد موت نہیں۔ انبیاءؑ قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ قبر میں سوال کے وقت روح کا جو تعلق بدن سے پیدا ہوتا ہے، انبیاءؑ کے اجساد کے ساتھ دائمی ہوتا ہے۔ روح سوال و جواب کے وقت ان کے مبارک جسموں میں واپس آتی ہے تو پھر نہیں نکلتی۔ اس تعلق کو توڑا نہیں جاتا۔ اسی وجہ سے انبیاءؑ اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے۔

عذابِ قبر جسم اور روح دونوں پر ہوتا ہے

وَانْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ عَلٰى عَذَابِ الْقَبْرِ عَلَى الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ جَمِيْعًا... (تفسیر مظہری، ۹:۷۷)

"اس پر اجماع امت ہے کہ ثواب و عذابِ قبر روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔"

وَقَدْ دَلَّتِ الْاَحَادِيْثُ مَا لَا يُحْصٰى عَلٰى عَذَابِ الْقَبْرِ وَ انْعَقَدَ عَلَيْهِ اِجْمَاعُ السَّلَفِ... (تفسیر مظہری، ۱۰:۷۷)

"اور بے شمار احادیث عذابِ قبر پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔"

اَلْاَوَّلُ الْمَيِّتُ حَيٌّ فِيْ قَبْرِهٖ فَيُعَذَّبُ وَهٰذَا هُوَ مَذْهَبُ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْحَقِّ...

(خلاصۃ الایوبی علی الخیالی، ۱۱۸)

Scanned with CamScanner

"اول یہ کہ میت قبر میں زندہ ہوتا ہے، اسے عذاب دیا جاتا ہے اور یہی مذہب اہل السنۃ والجماعت کا ہے۔"

إِحْيَاءُ الْمَوْتٰى فِيْ قُبُوْرِهِمْ وَ مَسْئَلَةُ مُنْكَرٍ وَ نَكِيْرٍ لَهُمْ وَ عَذَابُ الْقَبْرِ لِلْكَافِرِ وَالْفَاسِقِ كُلُّهَا حَقٌّ عِنْدَنَا وَاتَّفَقَ عَلَيْهِ سَلَفُ الْأُمَّةِ... (شرح مواقف، ۱۵۷)

"قبروں میں مُردوں کا زندہ ہونا، منکر نکیر کا سوال ہونا، عذاب قبر کافر اور فاسق کے لیے ہونا سب حق ہے۔ اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔"

فائدہ:

ثواب و عذاب قبر چاہتے ہیں حیات کو۔ حیات چاہتی ہے تعلق روح کا بدن سے، اور یہ چاہتا ہے عودِ روح الی الجسد کو اور عودِ روح متواترات سے ہے اور عذاب و ثواب روح و بدن دونوں پر اجماع امت ہے۔ اور یہی مذہب اہل السنۃ والجماعت کا ہے۔

عذاب قبر جسم اور روح دونوں پر ہوتا ہے

دنیا میں مکلف بالذات جسم ہوتا ہے، روح اس کے تابع ہوتی ہے۔ جسم نیکی کرتا ہے تو روح کو بھی جلا ملتی ہے، صفا ملتی ہے، انوارات ملتے ہیں۔ جسم برائی کرتا ہے تو روح پر بھی ظلمت طاری ہو جاتی ہے۔ مرنے کے بعد مکلف بالذات روح ہو جاتی ہے، جسم اس کے تابع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا برزخ کا عذاب و ثواب براہ راست روح کو ہوتا ہے، لیکن جس طرح روح کو ہوتا ہے اسی طرح جسم کے ہر ذرے کو پہنچتا رہتا ہے۔ اکثر قاعدہ یہ ہے کہ جسم قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جسم جل جاتا ہے یا کسی کو درندہ کھا جاتا ہے، کوئی پانی میں غرق ہو کر وہیں گل سڑ جاتا ہے۔ کچھ ہو جائے، جسم کا ہر ذرہ بلکہ ہر وہ ذرہ جو کبھی بھی جزوِ بدن رہا ہو خواہ کتنی ہی صورتیں بدل لے، مادے کی کسی بھی شکل میں چلا جائے اور جہاں بھی جائے، روح کا تعلق اس سے رہتا ہے۔ اگر روح عذاب میں ہے تو اُس (حصہ بدن) کو عذاب پہنچتا رہتا ہے۔ روح نجات میں ہے، اسے ثواب مل رہا ہے تو بدن کو بھی وہ لذت مسلسل پہنچتی ہے۔ 'تفسیر مظہری' میں ہے کہ بے شمار احادیث عذاب قبر پر دلالت کرتی ہیں اور اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ 'حاشیہ خیالی' میں بھی اسی طرح کی بات کی گئی ہے کہ فرمایا، ''اول یہ کہ میت قبر میں زندہ ہوتی ہے۔'' یعنی اس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ میت کے زندہ ہونے کی بات سن کر لوگوں کے ذہن میں دنیوی زندگی کا تصور آ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ دنیا میں بھی اگر ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلے جائیں تو وہاں کے موسم الگ ہوتے ہیں، اوقات الگ ہوتے ہیں، غذائیں الگ ہوتی ہیں، زبان الگ ہوتی ہے، اور وہ تو عالم ہی دوسرا ہے۔ جب کوئی برزخ میں چلا جاتا ہے تو وہاں کی زندگی برزخ کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کی ضروریات برزخ کی ہوتی ہیں، شب و روز برزخ کے ہوتے ہیں۔ اس زندگی کو دنیوی زندگی پر قیاس کر کے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ برزخ میں میت زندہ ہوتی ہے، اسے ثواب و عذاب ہو رہا ہوتا ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔ قبروں میں مُردوں کا زندہ ہونا، منکر نکیر کا سوال ہونا، عذاب قبر کافر اور فاسق کے لیے ہونا سب حق ہے۔ اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔

Scanned with CamScanner

فائدہ:

دکھ یا تکلیف یا آرام و آسائش زندہ کے لیے ہوتا ہے۔ جس میں حیات نہیں اس میں ان چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ انسانی زندگی کا تصور ہی تب بنتا ہے جب روح کا تعلق بدن سے ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ روح جسم کے ساتھ واپس جوڑ دی جائے۔ اور یہ متواترات یعنی حضور ﷺ سے لے کر آج تک متواتر ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ روح کو بدن کی طرف لوٹایا جاتا ہے، لیکن اس تعلق کی کیفیت پھر اپنی اپنی ہے۔ انبیاءؑ میں روح و بدن کا تعلق ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کہ دنیوی زندگی میں ہوتا ہے۔ شہداً کا تعلق بھی دنیوی زندگی کا سا ہوتا ہے۔ صالحین کے روح و بدن کا تعلق بھی بہت مضبوط بلکہ بالکل (دنیوی) زندگی جیسا ہوتا ہے۔ عامۃ الناس میں بھی یہ تعلق ہوتا ہے، اگرچہ اُس درجے کا نہیں ہوتا جیسا کہ شہداً اور صالحین کا ہوتا ہے۔ بدن گل سڑ جاتا ہے لیکن پھر بھی ہر ذرہ احساسات رکھتا ہے یعنی بعد الموت ہر انسانی بدن کے ساتھ روح کا تعلق رہتا ہے لیکن اعمال و درجات کی بنا پر تعلق کی کیفیت و نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ روح و بدن کے اس تعلق پر امت کا اجماع ہے۔

سماع موتیٰ پر اجماع امت ہے

حضور اکرم ﷺ نے امت کو تعلیم دی ہے کہ جب قبرستان سے گزریں تو کہیں السلام علیکم دارِ قوم مومنین۔

وَ هٰذَا خِطَابٌ لِمَنْ يَّسْمَعُ وَ يَعْقِلُ وَ لَوْ لَا هٰذَا الْخِطَابُ لَكَانُوْا بِمَنْزِلَةِ خِطَابِ الْمَعْدُوْمِ وَ الْجَمَادِ وَ السَّلَفُ مُجْمِعُوْنَ عَلٰى هٰذَا وَ قَدْ تَوَاتَرَاتِ الْاٰثَارُ عَنْهُمْ بِاَنَّ الْمَيِّتَ يَعْرِفُ بِزِيَارَتِ الْحَيِّ لَهٗ وَ يَسْتَبْشِرُ... ثُمَّ قَالَ، وَالْخِطَابُ وَ النِّدَاءُ لِمَوْجُوْدٍ يَسْمَعُ وَ يُخَاطِبُ وَ يَعْقِلُ وَ يَرُدُّ وَ اِنْ لَّمْ يَسْتَمِعِ الْمُسْلِمُ اَوْ يَسْمَعُ...
(تفسیر ابن کثیر، ۳:۴۳۸، ۴۳۹)

"یہ خطاب (سلام کہنا) اس شخص کے لیے ہے جو سنتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بمنزلہ خطاب معدوم اور پتھر کے تھا (اور یہ محال ہے)۔ سماع موتیٰ پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ اور متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ میت اس زندہ کو پہچانتا ہے جو اس کی زیارت کو جاتا ہے اور خوش بھی ہوتا ہے۔"
پھر ابن کثیرؒ نے فرمایا، "یہ خطاب ایسے آدمی کے لیے ہوتا ہے جو سنتا ہے، سمجھتا ہے اور سلام کا جواب دیتا ہے خواہ سلام کہنے والا جواب سنے یا نہ سنے۔"

فائدہ:

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قبر سے مراد یہی گڑھا ہے۔ اسی میں عذاب ہوتا ہے، بدن اسی گڑھے میں ہے۔ ہاں! یہ برزخ کا حصہ ہے۔ جیسے انسان دنیا میں آباد ہے مگر زمین کے کسی حصہ میں آباد ہوتا ہے، اسی طرح میت برزخ میں ہے مگر کسی حصہ میں ہے اور وہ حصہ قبر ہے جس میں مدفون ہے۔

Scanned with CamScanner

سوال: اگر قبر سے عالم برزخ مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ گڑھا مراد ہو تو کئی حدیثوں کی تکذیب لازم آئے گی۔ مثلاً جس میت کو درندے کھا گئے، پانی میں ڈوب گیا، آگ میں جل گیا تو اس کی قبر کہاں؟ پس قبر کے ایسے معنی عام لیے جائیں جس میں تمام افراد شامل ہوں، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں کسی کو خونی نہر میں معذب پایا، کسی کو تنور میں وغیرہ۔ حالانکہ وہ قبر میں نہ تھے۔

الجواب: علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

إِنَّمَا أُضِيفَ الْعَذَابُ إِلَى الْقَبْرِ لِكَوْنِ مُعْظَمِهِ يَقَعُ فِيهِ، وَ لِكَوْنِ الْغَالِبِ عَلَى الْمَوْتَى أَنْ يُقْبَرُوا... (فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر، ۳: ۲۳۳)

"عذاب کی نسبت قبر کی طرف بوجہ اکثریت کے کی گئی ہے کہ اکثر قبر ہی میں عذاب ہوتا ہے۔ اور غالب حکم یہی ہے کہ میت کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔"

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ قبر میں دفن کرنا ایک قانون ہے۔ اس کے خلاف واقعہ شاذ ہوگا جو قانون کو توڑ نہیں سکتا۔

پانی میں ڈوب جانے کے متعلق قرآن مجید نے بتادیا کہ: أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا (نوح: ۲۵) فرعونی غرق کیے گئے اور فوراً آگ میں داخل کر دیے گئے۔ یعنی جہاں بدن کے ذرات ہوں گے ان سے روح کا تعلق عذاب و ثواب کے لیے لازمی ہوگا۔

آگ میں جل جانے کے متعلق بخاری میں صاحب وصیت کا واقعہ موجود ہے، جس نے وصیت کی تھی کہ میرے جسم کو جلا دیا جائے۔ راکھ کو پانی میں پھینک دیا جائے، کچھ ہوا میں اڑادی جائے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اجزا کو جمع کر کے زندہ کیا اور سوال کیا۔۔۔۔ الخ۔ زندہ کرنا بتاتا ہے کہ سوال و جواب کے وقت بدن میں روح آجاتی ہے۔ صاحب وصیت کی روح تو زندہ تھی، پھر ذرات کا جمع کرنا اور زندہ کرنا بتاتا ہے کہ روح کا تعلق بدن سے قائم کیا گیا ہے۔ رہا یہ امر کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روح کو معذب پایا نہ کہ جسم کو، تو ثابت کیا جاچکا ہے کہ روح اور جسم دونوں کو عذاب ہوتا ہے اور روح جہاں بھی ہو اس کا تعلق بدن سے رہتا ہے۔ شب معراج، برزخ میں روح کو معذب دیکھنے سے جسم کے عذاب کی نفی کیسے لازم آگئی؟ خوب سمجھ لو کہ اگر بدن کو عذاب نہ ہوتا تو اعادۂ روح کی حاجت نہ تھی، روح جہاں ہوتی عذاب ہو جاتا۔ اور یہ کہ قبر سے گڑھا مراد ہے ورنہ تعاد الروح الی جسدہ... بے فائدہ ہے یعنی روح تو پہلے برزخ میں تھی پھر اعادہ برزخ سے برزخ کی طرف کیونکر ہوا؟

سوال: إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَى... (النمل: ۸۰)، اور وَ مَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ... (الفاطر: ۲۲) میں کفار کو حقیقی موتی سے تشبیہ دی گئی ہے جو حقیقی معنوں میں موتی ہیں۔ ان سے تو نفی سماع یقیناً ثابت ہوتی ہے۔

الجواب: اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ میت پر حقیقی معنی موت کا اطلاق ہو جائے اور ہونا بھی چاہیے۔ رہا لَا تُسْمِعُ...

Scanned with CamScanner

کا معاملہ تو یہ حقیقی معنوں پر محمول نہ ہوگا بلکہ مجاز مراد لیا جائے گا۔ قاعدہ ہے کہ مشبہ کو مشبہ بہ سے، ایک وصف مشہور میں، جو مشبہ بہ کو لازم ہے، تشبیہ دی جاتی ہے۔ تشبیہ کی حقیقت یہ ہے کہ اِشْتِرَاكُ الشَّيْئَيْنِ فِي وَصْفٍ هُوَ لَازِمٌ لِأَحَدِهِمَا وَ مَشْهُوْرٌ بِهٖ... جیسے زید اسد۔ یہاں کفار کو وصفِ موت میں تو تشبیہ نہیں دی گئی کیونکہ وصف دونوں میں مشترک نہیں۔ کفار تو حیات ہیں، بلکہ سماع میں تشبیہ دی گئی ہے۔ سماع میں یہ دونوں شریک ہیں۔ لیکن سماع سے مطلق سماع مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ اس وصف میں دونوں مشترک نہیں۔ کفار کان رکھتے تھے، خوب سنتے تھے، پھر مطلق سماع کی نفی کیسے مراد ہوسکتی ہے؟ لہٰذا یہاں ''اطلاق مطلق علی المقید'' ہے۔ یعنی سماع نافع، جو نفع سے مقید ہے، مطلق سماع مراد نہیں۔ پس آیت متذکرہ بالا میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح انبیاء کی تبلیغ کا مُردوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اسی طرح اُن کی تبلیغ کفار کو بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی کیونکہ وہ موتی القلوب ہیں۔ ثابت ہوا کہ یہاں مطلق کی نفی نہیں ہو رہی بلکہ اُس سماع کی نفی ہے جو انسان کے لیے مفید ثابت ہو، اور یہی وصف ان میں مشترک ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں ''اسماع'' کی نفی ہے، ''سماع'' کی نہیں۔ اس بنیاد پر بعض جدید مفسرین قرآن جو فی الحقیقت محرفینِ قرآن ہیں اور جو فنِ تحریفِ کتابِ الٰہی میں اہلِ کتاب اور دیگر محرفین حضرات سے بھی سبقت لے گئے ہیں، یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ ''سماع مطاوع ہے اسماع کا، اور مطاوع تابع ہوتا ہے اپنے مطاوعہ کا جو اصل ہے، اور فرع اپنے اصل کے مخالف نہیں ہوتا۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ سماع کو اسماع کا مطاوع بتانا ہی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ از قبیل تَرَتُّبُ اَحَدِ الْفِعْلَيْنِ عَلَى الْاٰخَرِ مِنْ غَيْرِ تَاْثِيْرٍ... ہے، جیسے اَسْمَعْتُهٗ فَلَمْ يَسْمَعْ... یا، هَدَاهُ فَلَمْ يَهْتَدِ... یہ افعال تَرَتُّبُ اَحَدِ الْفِعْلَيْنِ عَلَى الْاٰخَرِ مِنْ غَيْرِ تَاْثِيْرٍ ہیں۔

جواب ثانی: افعالِ انسانی دو قسم ہیں۔ عادیہ طبعیہ یعنی بطورِ عادت اور خرقِ عادت۔

قسم ثانی کے افعال کا صدور انسان سے خواہ اپنے اختیار سے ہی ہو جائے اُن کی نسبت انسان کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ باری تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے۔ آیت بالا میں اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ تم نہیں سنا سکتے، میں سنا سکتا ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ... (فاطر:۲۲)، اور وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۷)، اور فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (الانفال:۱۷)، وغیرہ

اسی طرح اولیاء اللہ جو برزخ والوں سے کلام کرتے ہیں، وہ بھی خرقِ عادت کے طور پر ہوتی ہے۔ امورِ عادیہ سے نہیں ہوتی۔

سوال: کسی نے حلف اٹھایا کہ میں زید سے کلام نہیں کروں گا یا کپڑا نہیں پہناؤں گا، یا اسے نہیں پیٹوں گا۔ اگر اس سے یہ افعال زید کی موت کے بعد صادر ہوئے تو حانث نہ ہوگا کیونکہ میت میں حس نہیں، نہ سنتا ہے نہ مارنے سے متألم ہوتا ہے۔

الجواب: ایمان کی بنیاد عرف پر ہے، عرف میں کلام کرنا، مارنا وغیرہ افعال حیاتِ حالی سے مقید ہیں۔ مثلاً زید مر گیا، اس کی میراث تقسیم ہو گئی، بیوی دوسری جگہ نکاح کر گئی۔ پھر کسی نبی کے معجزہ یا ولی کی کرامت سے زندہ ہوا تو اُسے نہ عورت ملے گی نہ میراث، کیونکہ اس کا تعلق سابقہ حیات سے تھا۔ یا مثلاً ایک کافر مر گیا، کسی نبی کے معجزہ سے زندہ ہوا، اب اگر ایمان لائے تو قبول نہ ہوگا کیونکہ کفر و ایمان کا تعلق حیات سابقہ سے تھا۔ اسی طرح اس حلف کا تعلق بھی حیاتِ معروف سے ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ میت سنتا نہیں، یا متألم نہیں ہوتا حماقت ہے۔ پھر اس استدلال کو آئمہ کرام سے منسوب کرنا اُن پر بہتان ہے۔

وَاَمَّا اَئِمَّتُنَا فَهُمْ بَرِيْئُوْنَ عَنْ اِنْكَارِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ وَاِنَّمَا حَكَمُوْا فِي الْحَلْفِ بِالضَّرْبِ وَالْكَلَامِ وَالدُّخُوْلِ عَلَيْهِ وَنَحْوِهَا بِعَدَمِ الْحِنْثِ عِنْدَ وُجُوْدِ هٰذِهِ الْاَشْيَاءِ بِالْمَيِّتِ لِكَوْنِ الْاِيْمَانِ مَبْنِيَّةً عَلَى الْعُرْفِ وَالْعُرْفُ قَاضٍ عَلٰى اَنَّ هٰذِهِ الْاُمُوْرَ يُرَادُ بِهَا اِرْتِبَاطُهَا مَا دَامَ الْحَيَاةُ لَا بَعْدَ الْمَوْتِ فَالْكَلَامُ بِالْمَيِّتِ وَاِنْ كَانَ كَلَامًا حَقِيْقَةً وَيُوْجَدُ فِيْهِ الْاِسْمَاعُ وَالْاِفْهَامُ لٰكِنَّ الْعُرْفَ يَحْكُمُ بِاَنَّ الْمُرَادَ فِيْ قَوْلِهٖ لَا اُكَلِّمُكَ هُوَ الْكَلَامُ حَالَةَ حَيَاتِهٖ وَكَذَا الْاِيْلَامُ وَاِنْ كَانَ يَتَحَقَّقُ فِي الْمَيِّتِ لٰكِنَّ الْعُرْفَ قَاضٍ عَلٰى اَنَّ الْمُرَادَ فِيْ قَوْلِهٖ لَا اَضْرِبُكَ هُوَ ضَرْبُهٗ حَيًّا لَا ضَرْبُهٗ مَيِّتًا ...
(شرح وقایہ، ۲: ۲۵۴)

"جہاں تک ہمارے آئمہ کرام کا تعلق ہے، وہ ان امور کے انکار سے بری ہیں۔ انہوں نے میت کو مارنے، اس سے کلام کرنے وغیرہ افعال کی صورت میں حانث نہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ ایمان کی بنا عرف پر ہے اور عرف پر ہی ان امور کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد حالی زندگی میں لی جاتی ہے، نہ کہ بعد موت۔ اور میت سے جو کلام کی جائے اگرچہ وہ کلام حقیقی ہوتی ہے اور اس میں اسماع و افہام پایا جاتا ہے لیکن عرف کی رُو سے اس کے قول کا تعلق کہ میں کلام نہیں کروں گا، حالتِ حیات سے ہے، اور یہی صورت ایلام کے بارے میں ہے خواہ اس کا تحقق میت میں ہو جائے۔ لیکن عرف کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قول سے مراد کہ میں اسے نہ ماروں گا، حیات سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ بعد موت سے۔"

سوال: حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عائشہؓ سماع موتی کا انکار فرماتے ہیں، آخر کیوں؟

الجواب: فاروق اعظمؓ کے مبینہ انکار کی بنیاد جس روایت پر رکھی گئی ہے، اس کی حقیقت ملاحظہ ہو:

وَكَانَ اِذَا ظَهَرَ عَلٰى قَوْمٍ اَقَامَ بِالْعَرْصَةِ ثَلٰثَ لَيَالٍ. فَلَمَّا كَانَ بِبَدْرٍ الْيَوْمَ الثَّالِثَ اَمَرَ بِرَاحِلَتِهٖ فَشُدَّ عَلَيْهَا رَحْلُهَا ثُمَّ مَشٰى وَاتَّبَعَهٗ اَصْحَابُهٗ حَتّٰى قَامَ عَلٰى شَفَةِ الرَّكِيِّ فَجَعَلَ يُنَادِيْهِمْ بِاَسْمَائِهِمْ .... فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا تُكَلِّمُ مِنْ اَجْسَادٍ

Scanned with CamScanner

لَا اَرْوَاحَ لَهَا قَالَ النَّبِيُّ ﷺ وَ الَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ لِمَا اَقُوْلُ مِنْهُمْ... (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، باب حکم الاسراء، ۳۴۵)

"حضور ﷺ کی عادت مبارک یہ تھی کہ جب کسی قوم پر فتح پاتے تو تین دن رات وہاں قیام فرماتے۔ جب بدر میں تیسرا دن آیا تو سواری کا حکم دیا، اس پر پالان رکھا گیا۔ پھر آپ ﷺ بدر کے گڑھے کی طرف چلے گئے اور اُس کنوئیں کے کنارے کھڑے ہوئے جس میں صنادیدِ قریش کی لاشیں پڑی تھیں، پھر اُن کا نام لے لے کر پکارنے لگے۔۔۔ پس حضرت عمرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ ان اجساد سے کیسے کلام فرما رہے ہیں جن میں ارواح نہیں؟ تو حضور ﷺ نے جواب دیا، قسم اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے۔۔۔ الخ"

فائدہ:

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا سوال انکار پر مبنی نہیں تھا بلکہ دریافت مسئلہ کے لیے تھا۔ جب حضور اکرم ﷺ کا جواب سنا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، تو کیا عمر فاروقؓ جیسے شخص کے انکار کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے؟ اس کے بعد انکار تو کیا حضرت عمرؓ کے تعجب ہی کی کوئی دلیل پیش کیجیے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تعجب اس بات پر تھا کہ ان کو مرے ہوئے تین دن گزر گئے ہیں، نکیرین کے سوال و جواب کا وقت تو گزر چکا، تو کیا اب بھی یہ لوگ سنتے ہیں؟ اس امر کی شہادت دوسری روایات سے ملتی ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ امْرَاَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَسَاَلَ عَنْهَا بَعْدَ اَیَّامٍ فَقِیْلَ لَهٗ: اِنَّهَا مَاتَتْ... (الترغیب والترہیب، ۱:۱۹۶؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الصلاۃ علی القبر، ۱:۱۱۱)

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ رنگ کی عورت مسجد میں رہتی تھی۔ حضور ﷺ نے ایک روز اُسے نہ پایا۔ چند روز کے بعد اس کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ مر چکی ہے۔"

دوسری روایت عبید اللہ ابن مرزوق سے:

فَمَرَّ عَلٰی قَبْرِهَا فَقَالَ: مَا هٰذَا الْقَبْرُ فَقَالُوْا: قَبْرُ اُمِّ مِحْجَنٍ، قَالَ الَّتِیْ: تَقُمُّ الْمَسْجِدَ، قَالُوْا: نَعَمْ فَصَفَّ النَّاسَ فَصَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ قَالَ: اَیُّ الْعَمَلِ وَجَدْتِ اَفْضَلَ؟ قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَتَسْمَعُ؟ قَالَ مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهَا فَذَكَرَ اَنَّهَا اَجَابَتْهُ قَمُّ الْمَسْجِدِ... (الترغیب والترہیب، ۱:۱۹۷)

"ابن مرزوق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ اُس کی قبر کے پاس سے گزرے، پوچھا، یہ کس کی قبر ہے؟ عرض کیا، اُمِ محجنؓ کی۔ فرمایا، جو مسجد میں جھاڑو دیتی تھی؟ عرض کی، جی ہاں! پھر صف باندھی گئی، نماز جنازہ پڑھی، پھر اُمِ محجنؓ سے سوال کیا

تم نے کون سا عمل افضل پایا؟ صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا یہ آپ کی آواز سن رہی ہے؟ فرمایا، تم اس سے زیادہ نہیں سن سکتے۔ پھر عورت نے جواب دیا، مسجد میں جھاڑو دینے کے عمل کو افضل پایا۔"

فائدہ:

ان احادیث سے دوام سماع کا ثبوت ملتا ہے (اگر اللہ تعالیٰ چاہے)۔ اُم مِحجنؓ سے حضور اکرم ﷺ نے کئی دنوں کے بعد پوچھا کہ تُو نے کس عمل کو افضل پایا؟ تو اس نے جواب دیا۔ معلوم ہوا کہ میت سے سوال و جواب کے لیے وقت کی قید جو منکرین سماع موتی پیش کرتے ہیں، غلط ہے۔

مشکوٰۃ اور الترغیب کی روایات ملانے سے یہ معلوم ہوا کہ سماعِ موتی کا ثبوت حضور اکرم ﷺ سے ایک صورت میں تین دن بعد اور دوسری صورت میں کئی دن بعد ثابت ہے۔ یہ ہے حضرت عمرؓ کے مبینہ انکارِ سماعِ موتی کی حقیقت، اور بس۔

رہا حضرت عائشہؓ کے انکار کا سوال تو اُن کی زبانی ایک روایت ملاحظہ ہو:

قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَا مِنْ رَجُلٍ يَزُوْرُ قَبْرَ اَخِيْهِ وَ يَجلِسُ عِنْدَهٗ اِلَّا اِسْتَاْنَسَ بِهٖ وَرَدَّ عَلَيْهِ... (تفسیر ابن کثیر، ۳: ۴۳۸)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرے اور قبر کے پاس بیٹھے تو وہ میت اس سے مانوس ہوتا اور سلام کا جواب دیتا ہے۔"

یہ حدیث سماعِ موتی کے حق میں واضح ہے۔ مگر منکرین اس پر جرح کرتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، لیکن جب اس کی شواہد مرفوع حدیثیں موجود ہیں تو یہ قوی ہو گئی جیسا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوْعًا مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُرُّ بِقَبْرِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ كَانَ يَعْرِفُهٗ فِي الدُّنْيَا فَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ اِلَّا رَدَّ اللهُ عَلَيْهِ رُوْحَهٗ حَتّٰى يَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ رَوَاهُ ابْنُ عَبْدِالْبَرِّ مُصَحِّحًا لَهٗ...وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِذَا مَرَّ الرَّجُلُ بِقَبْرٍ يَّعْرِفُهٗ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ... (تفسیر ابن کثیر، ۳: ۴۳۸)

"ابن عباس سے صحت کے ساتھ مرفوعاً مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص جو اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر سے گزرے جو اسے دنیا میں پہچانتا تھا اور اسے سلام کہے تو اللہ تعالیٰ میت کی روح کو لوٹا دیتا ہے اور وہ اسے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی کسی ایسے آدمی کی قبر سے گزرے جسے وہ پہچانتا ہو اور وہ سلام کہے تو میت اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔"

ثُمَّ قَالَ هٰذَا بَابٌ فِيْهِ اٰثَارٌ كَثِيْرَةٌ عَنِ الصَّحَابَةِ... (ایضاً، ۳: ۴۳۹)

"پھر ابن کثیر نے فرمایا کہ سماعِ میت کے بارے میں صحابہؓ کے بہت سے آثار منقول ہیں۔"

Scanned with CamScanner

کتب فقہ میں عدم سماع کا ذکر باب یمین میں ہے اور یہ مشائخ کا اپنا استخراج ہے۔ ورنہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے کوئی روایت عدم سماع کی نہیں۔ شرح وقایہ کے حاشیہ پر ترجمانِ حنفیت مولانا عبدالحی لکھنوی فرماتے ہیں:

وَبِالْجُمْلَةِ لَمْ يَدُلَّ دَلِيْلٌ قَوِيٌّ عَلٰى نَفْيِ سِمَاعِ الْمَيِّتِ وَإِدْرَاكِهٖ وَفَهْمِهٖ وَتَأَلُّمِهٖ لَا مِنَ الْكِتَابِ وَلَا مِنَ السُّنَّةِ بَلِ السُّنَنُ الصَّحِيْحَةُ الصَّرِيْحَةُ دَالَّةٌ عَلٰى ثُبُوْتِهَا لَهٗ وَالْحَقُّ فِيْ هٰذَا الْمَقَامِ اَنَّ هٰذَا كُلَّهٗ مِنْ تَقْرِيْرَاتِ الْمَشَائِخِ وَتَوْجِيْهَاتِهِمْ وَتَكَلُّفَاتِهِمْ وَلَا عِبْرَةَ بِهَا حِيْنَ مُخَالَفَتِهَا لِلْاَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَةِ وَاٰثَارِ الصَّحَابَةِ الصَّرِيْحَةِ... (شرح وقایہ، ۲: ۲۵۴)

" حاصلِ کلام یہ ہے کہ کوئی دلیلِ قوی، نفی سماعِ میت پر، یا نفی ادراکِ میت، یا نفی فہمِ میت پر، یا میت کے متالم نہ ہونے پر، نہ قرآن کریم سے ثابت ہے نہ حدیث نبوی ﷺ سے۔ بلکہ احادیث صحیحہ تو سماعِ موتی کے ثبوت پر دال ہیں اور حق بات یہ ہے کہ عدم سماع کی تمام تقریریں مشائخ کی ہیں۔ انہی کی توجیہات اور انہی کے تکلفات باردہ ہیں۔ ان تقریرات کا کوئی اعتبار نہ ہوگا جب وہ احادیثِ صحیحہ اور صریح آثارِ صحابہؓ کے خلاف ہیں۔"

فوائد:

(۱) قرآن مجید میں کوئی آیت موجود نہیں جس کا مدلول عدمِ سماعِ میت ہو۔

(۲) جو آیاتِ قرآنی عدمِ سماع کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں وہ تاویلاتِ باطلہ کے ارتکاب کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ حضور اکرم ﷺ کا عقیدہ اور صحابہ کرامؓ کا عقیدہ خلافِ قرآن تھا۔ (العیاذ باللہ!)

(۳) حضرت عزیرؑ اور اصحابِ کہف کے واقعہ سے عدمِ سماع ثابت کرنا اسی قسم کی غلطی ہے، حالانکہ ان میں علم کی نفی مقصود ہے، سماع کی نفی مراد نہیں اور عدمِ علم، عدمِ سماع کو مستلزم نہیں۔ باقی جس قدر آیاتِ قرآنی اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہیں ان کا مدلول عدمِ سماع نہیں بلکہ عدمِ مختاریت اور عدمِ الوہیت ہے۔ کفار چونکہ آلہٴ باطلہ کو مختارِ کل اور مختار بالذات سمجھتے تھے، اس لیے مختاریت کی نفی کی گئی ہے۔

(۴) ان احادیث اور آثارِ صحابہؓ سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ کا عقیدہ سماعِ موتی کے حق میں تھا۔ جمہور علما کا بھی یہی عقیدہ تھا جیسا کہ فتح الباری کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے۔ فقہ کے آئمہ اربعہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی رائے اس سلسلہ میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

Scanned with CamScanner

تصوف وسلوک از ابتداء تا انتہا ادب ہی ادب ہے

شیخ اور سالک کا تعلق بظاہر استاد اور شاگرد کا سا نظر آتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ حصولِ تعلیم کے سلسلہ میں ایک شاگرد کے دل میں اگر استاد کا احترام موجود نہ ہو، جب بھی حصولِ علم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی مگر ایک سالک کو اپنے شیخ سے جس قسم کا قلبی تعلق ہوتا ہے اس میں اگر معمولی سا فرق بھی آ جائے تو حصولِ فیض میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ جب سالک کو توجہ دینے لگتا ہے تو جہاں رحمت باری شیخ کی طرف متوجہ ہوتی ہے وہاں رضائے باری تعالیٰ بھی شیخ سے وابستہ ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں شیخ کے واسطہ سے سالک کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ سالک خواہ کتنے بلند منازل طے کر جائے اس کی باگ ڈور شیخ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسے کاغذ کی پتنگ ہوا میں خواہ کتنی بلند ہو جائے، اس کی ڈور اڑانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے جب چاہے اسے اتارے یا موجودہ ایٹمی دور میں جس طرح فضا کی طرف جانے والے راکٹوں کا کنٹرول زمین پر ہوتا ہے وہ خواہ ہزاروں میل زمین سے دور چلے جائیں اپنے مرکز کے کنٹرول سے جب چاہیں واپس لا سکتے ہیں۔

اس تعلق کو 'عوارف المعارف' میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

اَلتَّصَوُّفُ كُلُّهٗ اَدَبٌ وَلِكُلِّ وَقْتٍ اَدَبٌ وَلِكُلِّ حَالٍ اَدَبٌ وَلِكُلِّ مَقَامٍ اَدَبٌ وَمَنْ يَلْزَمُ الْاَدَبَ يَبْلُغُ مَبْلَغَ الرِّجَالِ وَمَنْ حُرِمَ الْاَدَبَ فَهُوَ بَعِيْدٌ مِنْ حَيْثُ يَظُنُّ الْقُرْبَ مِنَ اللّٰهِ وَمَرْدُوْدٌ۔۔۔(عوارف المعارف، ۲:۶۱)

"اور تصوف سارے کا سارا ادب ہی ہے، ہر وقت کے لیے ادب ہے، ہر حال اور ہر مقام کے لیے ادب ہے، جس نے ادب کو لازم پکڑا وہ مردانِ خدا کے درجے پر پہنچا اور جو ادب سے محروم ہوا وہ خدا سے دور اور مردود ہوا۔"

ظاہری علوم اور تصوف میں ایک اور فرق بھی ہے کہ استاد کے بغیر بھی کسی نہ کسی درجے کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے مگر تصوف وسلوک کی راہ میں شیخ کامل کی رہبری کے بغیر چلنا محال اور قربِ الٰہی کی منزل تک پہنچنا ناممکن۔

امام رازیؒ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔۔۔(الفاتحہ: ۵،۶) کی تفسیر میں فرمایا ہے:

وَ فِيْ هٰذَا الْبَدَلِ اِشَارَةٌ اِنَّ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ لَا يَتَأَتّٰى بِدُوْنِ مُتَابَعَةِ اَهْلِ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيْمِ وَلَا يَكْفِيْ فِيْهِ الزُّبُرُ وَالْاَوْرَاقُ۔۔۔

"اس بدل میں اشارہ ہے کہ انسان صراطِ مستقیم پر نہیں چل سکتا، جب تک اس راہ پر چلنے والے سابقہ لوگوں کی اتباع نہ کرے۔ اس راہ پر چلنے کے لیے صرف کتابوں کی ورق گردانی کام نہیں دے سکتی۔"

وَ هٰذَا يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْمُرِيْدَ لَا سَبِيْلَ لَهٗ اِلَى الْوُصُوْلِ اِلٰى مَقَامَاتِ الْهِدَايَةِ وَ

Scanned with CamScanner

الْمُكَاشَفَةِ إِلَّا إِذَا اقْتَدٰى بِشَيْخٍ يَهْدِيْهِ إِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ يُجَنِّبُهُ عَنْ مَوَاقِعِ الْأَغَالِيْطِ وَ الْأَضَالِيْلِ وَ ذٰلِكَ لِأَنَّ النَّقْصَ غَالِبٌ عَلٰى أَكْثَرِ الْخَلْقِ وَ عُقُوْلُهُمْ غَيْرُ وَافِيَةٍ بِإِدْرَاكِ الْحَقِّ وَتَمْيِيْزِ الصَّوَابِ عَنِ الْغَلَطِ لَا بُدَّ مِنْ كَامِلٍ يَقْتَدِيْ بِهِ النَّاقِصُ حَتّٰى يَتَقَوّٰى عَقْلُ ذٰلِكَ النَّاقِصِ بِنُوْرِ عَقْلِ ذٰلِكَ الْكَامِلِ فَحِيْنَئِذٍ يَصِلُ إِلٰى مَدَارِجِ السَّعَادَاتِ وَمَعَارِجِ الْكَمَالَاتِ...(تفسیر الکبیر ۱:۹۴)

"اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ مرید طالب کے لیے ہدایت کے مقامات اور مکاشفات تک پہنچنے کا اس کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں کہ کسی شیخ کامل کی اقتداء کرے جو اس کی رہنمائی کرے گا اور اسے غلطیوں اور گمراہیوں سے بچائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقص اکثر مخلوق پر غالب ہے اور صرف عقول انسانی ادراکِ حقیقت کے لیے ناکافی اور حق اور باطل میں کما حقہ تمیز کر لینا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔

لہٰذا یہ ضروری ٹھہرا کہ شیخ کامل کی تلاش کرے اور اس کی اقتداء کرے تاکہ اس ناقص کی عقل، کامل کے نورِ عقل سے کامل بن جائے اور ناقص سعادت کے مدارج اور کمال کے اوج تک پہنچ سکے۔"

اس آیت کی تفسیر سے ظاہر ہے کہ شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر منازل سلوک طے نہیں ہو سکتیں اور سالک کا مقصد وصول الی المحبوب ہوتا ہے اور ارشادِ ربانی، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ...(البقرۃ: ۱۶۵) کے تحت رب العالمین ہی مومن کا محبوب ہے اور شیخ چونکہ محبوب تک پہنچانے والا ہے، شیخ بھی محبوب ہے۔ جس شیخ نے خدا کو سالک کا محبوب بنایا اور وہ خدا کا محبوب بنا، جیسے فرمایا: يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ...(المائدۃ: ۵۴) ایسا شیخ کیوں نہ محبوب ٹھہرے۔ لیکن شیخ کی محبت اور اظہارِ محبت میں حدودِ شرعی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ فرطِ محبت میں شیخ کو خدا سمجھنے لگے، یا شیخ کو سجدہ کرنے لگے، اوّل شرک اور ثانی قطعی حرام۔

یہ ضروری نہیں کہ شیخ لازماً مرید سے علم میں بڑا ہو، یا ورع تقویٰ میں زیادہ ہو۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ شیخ سے جو علوم حاصل کرنے ہیں ان میں شیخ لازماً کامل اور مکمل ہو۔ دیکھ لیجیے! حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضرؑ کے مقابلے میں علم اور ورع تقویٰ میں کہیں بڑھ کر تھے مگر وہ خاص علم حاصل کرنے کے لیے حضرت خضرؑ کے پاس تشریف لے گئے۔

شیخ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرید سے ہر حال میں شریعت کی پوری پابندی کرائے، کیونکہ شریعت سے ہٹ کر طریقت کا تصور زندقہ اور الحاد ہے۔

جامع کراماتِ الاولیاء میں ارشاد ہے:۔

قَالَ الشَّيْخُ أَبُو الْعَبَّاسِ... لَمْ تَكُنِ الْأَقْطَابُ أَقْطَابًا وَالْأَوْتَادُ أَوْتَادًا وَ الْأَوْلِيَاءُ أَوْلِيَاءَ إِلَّا بِتَعْظِيْمِهِمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَعْرِفَتِهِمْ بِهٖ وَ إِجْلَالِهِمْ لِشَرِيْعَتِهٖ وَقِيَامِهِمْ بِآدَابِهٖ...(جامع کرامات الاولیاء ۱:۵۱۱)

Scanned with CamScanner

"(شیخ ابوالعباسؒ نے فرمایا) کہ کوئی قطب قطب نہیں ہوسکتا، نہ اوتاد اوتاد ہو سکتے ہیں اور نہ کوئی ولی ولی ہوسکتا ہے جب تک کہ اس کے دل میں حضور اکرم ﷺ کی تعظیم نہ ہو اور آپ کی شریعت اور اس کے احکام بجا نہ لائے۔"

کسی شیخ سے تعلق رکھنے اور مدتیں گزر جانے کے باوجود اگر سالک کے دل میں نہ شریعت سے لگاؤ پیدا ہو نہ اسلامی شعائر کی تعظیم کا جذبہ، اور نہ شریعت کے احکام کی پابندی کا شوق پیدا ہو تو نہ ایسا شخص شیخ ہے نہ ایسا مرید سالک۔ دونوں خود فریبی اور خدا فریبی میں مبتلا ہیں۔

سالک کو احکامِ شریعت کی پابندی کرنے اور فرائض و واجبات کی پابندی کا خوگر بنانے اور اتباعِ سنت کا شوق پیدا کرنے کے بنیادی کام کے ساتھ ساتھ شیخ کو اپنی بصیرت سے سالک کے قلب کی زمین کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس کی فطری صلاحیت کے مطابق اس کی روحانی تربیت کرنی چاہیے۔ ذکرِ الٰہی بالخصوص ذکرِ اسمِ ذات سے اس کی روحانی تربیت شروع کرے۔ جیسے ایک زمیندار زمین کی نوعیت کے مطابق اس میں تخم ریزی کرتا ہے اور اس بیج سے فصل اگتے، نشوونما پاتے اور پھل دیتے ہیں اسی طرح جب سالک کے قلب میں اسمِ ذات راسخ ہو جائے گا تو اسے اعلیٰ منازل سلوک کی طرف رہنمائی کرے گا۔ پھر شیخ سالک کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کسی کو ذکر لسانی کرائے گا کسی کو لطائف، کسی کو فنا و بقا اور سلوک کی اعلیٰ منازل کی طرف لے جائے گا۔ اگر شیخ کامل تمام سالکین کو شروع ہی سے سب لطائف کرانا شروع کر دے تو یہ محض دعوتِ عام کے فرض کی ادائیگی کی ایک صورت ہے جس میں کسی کی تخصیص نہیں۔ ہاں! لطائف کے بعد سلوک کے اونچے منازل، سالک کی استعداد کے مطابق ہی کرائے جا سکتے ہیں۔ اور یہ صورت حضور اکرم ﷺ کی اس سنت کے عین مطابق ہے کہ كَلِّمُوا عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِ النَّاسِ...

شیخ شہاب الدین سہروردی نے 'عوارف المعارف' میں فرمایا ہے۔

وَ رُتْبَةُ الْمَشْيَخَةِ مِنْ أَعْلَى الرُّتَبِ فِي طَرِيْقِ الصُّوْفِيَّةِ وَنِيَابَةِ النُّبُوَّةِ فِي الدُّعَاءِ إِلَى اللهِ وَ يَنْبَغِيْ أَنْ يَكُوْنَ دَعْوَتُهُ عَامَّةً يَدْعُوا الْكُلَّ أَحَدٍ عَلَى الْإِطْلَاقِ... (عوارف المعارف، ۱:۴۴)

"مشیخیت کا مرتبہ تصوف کے اعلیٰ مراتب سے ہے اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں نیابتِ نبوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے شیخ کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک کو دعوتِ عام دے۔"

روحانی تربیت کا عمل اس طرح کیا جائے جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے، بلکہ شیخ کی شفقت ماں باپ کی شفقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جیسا کہ امام رازی نے 'تفسیر کبیر' میں فرمایا:

اَلْعَالِمُ أَرْفَعُ إِفْ بِالتِّلْمِيْذِ مِنَ الْأَبِ وَالْأُمِّ لِأَنَّ الْآبَاءَ وَالْأُمَّهَاتِ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ نَارِ الدُّنْيَا وَآفَاتِهَا وَالْعُلَمَاءُ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ نَارِ الْآخِرَةِ وَشَدَائِدِهَا... (تفسیر الکبیر ۱:۲۶۱)

Scanned with CamScanner

"شیخ کا مرتبہ ماں باپ سے اونچا ہے کیونکہ ماں باپ دنیا کی آگ اور اس کی آفتوں سے بچاتے ہیں اور شیخ اسے دوزخ کی آگ اور اس کی سختی سے بچاتے ہیں۔"

علامہ ابراہیم عبیدی مالکیؒ نے اپنی کتاب 'عمدۃ التحقیق فی بشائر آل الصدیق' میں فرمایا:

اَلْوَلَدُ عَلٰی قِسْمَیْنِ وَلَدُ صُلْبٍ وَ وَلَدُ قَلْبٍ وَ عِنْدَ الْعَارِفِیْنَ وَلَدُ الْقَلْبِ مُقَدَّمٌ عَلٰی وَلَدِ الصُّلْبِ... (عمدۃ التحقیق فی بشائر آل الصدیق، ۳۳۰)

"اولاد دو قسم کی ہوتی ہے: نسبی اور قلبی۔ صوفیا عارفین کے نزدیک قلبی اولاد، نسبی سے مقدم ہے۔"

قلبی اولاد کی اس برتری کی وجہ یہ ہے کہ والد نسبی اپنی اولاد کے بدن کی پرورش مادّی غذا سے کرتا ہے اور یہ دونوں فانی ہیں اور شیخ سالک کی روحانی تربیت ذکرِ الٰہی کی غذا سے کرتا ہے اور یہ دونوں غیر فانی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ باقی رہنے والی چیز فنا ہونے والی چیز سے مقدم ہے۔ مولانا جامیؒ نے شیخ کامل کے اسی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی:

بکارِ نیک گردد یاورِ تُو
بکوئے نیک نامی رہبرِ تُو
چنیں یارے کہ یابی خاکِ اوشُو
اسیرِ حلقۂ فتراکِ او شُو
مکن با صوفیانِ خام یاری
کہ باشد کارِ خاماں خام کاری

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شیخ ایک تو روحانی باپ ہے دوسرا استاد اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیخ سے سالک کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے۔

تصوف اور سلوک از ابتداء تا انتہا ادب ہی ادب ہے

شیخ اور سالک کا تعلق بظاہر استاد شاگرد کا سا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں شاگرد کے دل میں استاد کا احترام نہ بھی ہو تو حصولِ علم میں رکاوٹ نہیں ہوتی، علمِ ظاہری میں اگر کوئی شاگرد استاد کو اچھا نہ بھی سمجھتا ہو تو جو کچھ وہ پڑھاتا ہے وہ پڑھ سکتا ہے مگر سالک نے کیفیاتِ قلبی حاصل کرنا ہوتی ہیں اور سالک کو اپنے شیخ سے جس قسم کا قلبی تعلق ہوتا ہے اُس میں معمولی سا فرق بھی آجائے تو حصولِ فیض میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ جب شیخ سالک کو توجہ دینے لگتا ہے تو جہاں رحمتِ باری شیخ کی طرف متوجہ ہوتی ہے وہاں رضائے باری تعالیٰ بھی شیخ سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں شیخ کے واسطے سے سالک کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ سالک خواہ کتنی بلند منازل طے کرلے، اُس کی باگ ڈور شیخ کے ہاتھ میں

Scanned with CamScanner

ہوتی ہے جیسے کاغذ کی پتنگ کتنی بلند ہوجائے، ڈور اُڑانے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جب چاہے نیچے اتار لے۔ اسی طرح طالب یا شاگرد کی منازل کتنی بھی بلند ہوجائیں، شیخ کے ساتھ اُس کا تعلق وہی رہتا ہے۔ ظاہر دنیا میں بھی ایسا ہے کہ بیٹا اگر جرنیل بھی ہوجائے تو باپ جرنیل کا باپ ہوتا ہے۔ باپ باپ ہی ہوتا ہے۔ اس تعلق کو عوارف المعارف' جلد دوم، صفحہ ۱۶ پر اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: ''تصوف سارے کا سارا ادب ہے۔ ہر وقت کے لیے ادب، ہر حال اور ہر مقام کے لیے ادب، جس نے ادب کو لازم پکڑا وہ مردانِ خدا کے درجے پر پہنچا اور جو ادب سے محروم ہوا، اللہ سے دور ہوا، مردود ہوا۔''

ظاہری علوم اور تصوف میں ایک فرق اور بھی ہے کہ علومِ ظاہری کے لیے کالج یا سکول نہیں گیا تو بھی کتابیں دیکھ کر، کسی نہ کسی موضوع پر اُسے کچھ پڑھنا آجائے تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیتا ہے، مگر تصوف وسلوک کی راہ میں شیخ کامل کی رہبری کے بغیر چلنا محال اور قربِ الٰہی تک پہنچنا ناممکن ہے۔ امام رازیؒ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ... کی تفسیر میں فرمایا کہ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ''انسان صراطِ مستقیم پر نہیں چل سکتا جب تک اس راہ پر چلنے والے سابقہ لوگوں کا اتباع نہ کرے اور اس راہ پر چلنے کے لیے صرف کتابوں کی ورق گردانی کام نہیں دے سکتی''۔

یہ امر اس کی دلیل ہے کہ مرید یا طالب کے لیے ہدایت کے مقامات اور مکاشفات تک پہنچنے کا اس کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں کہ شیخِ کامل کی اقتدا کرے جو اس کی رہنمائی کرے گا اور اسے غلطیوں اور گمراہیوں سے بچائے گا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ نقص اکثر مخلوق پر غالب ہے اور عقولِ انسانی ادراکِ حقیقت کے لیے ناکافی ہیں یعنی انسان کمزوری اور نقص کی طرف بھاگتا ہے، نافرمانی کی طرف اس کا جھکاؤ زیادہ ہے۔ حق اور باطل میں کماحقہ تمیز کرلینا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں لہٰذا یہ ضروری ٹھہرا کہ شیخِ کامل کی تلاش کرے، اُس کی اقتدا کرے تاکہ اس کی ناقص عقل کامل کے نورِ عقل سے کامل بن جائے اور ناقص سعادت کے مدارجِ کمال کے اوج تک پہنچ سکیں۔ اس آیت کی تفسیر سے ظاہر ہے کہ شیخِ کامل کی رہنمائی کے بغیر منازلِ سلوک طے نہیں ہوسکتے اور سالک کا مقصد وصول الی المحبوب ہوتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ... (البقرہ: ۱۶۵)

اس آیت کے تحت ربّ العالمین ہی مومن کا محبوب ہے۔ شیخ چونکہ محبوب تک پہنچانے والا ہے، شیخ بھی محبوب ہے۔ اس شیخ نے اللہ کو سالک کا محبوب بنایا، وہ اللہ کا محبوب بنا، جیسے فرمایا: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ... (المائدہ: ۵۴) شیخ کیوں نہ محبوب ٹھہرے، لیکن شیخ کی محبت اور اظہارِ محبت میں حدودِ شرعی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ یعنی انسانوں سے انسانوں کے تعلقات کی شریعت میں حدود مقرر کردی گئی ہیں لہٰذا اُن حدود کا دھیان رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ فرطِ محبت میں شیخ کو خدا سمجھنے لگے۔ اگر شیخ کو معبود سمجھ لیا تو یہ شرک ہے اور اگر سمجھتا ہے کہ تعظیم میں سجدے کر رہا ہوں تو یہ بھی حرام ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ شیخ لازماً علم میں مرید سے زیادہ ہو، ورع وتقوئی میں زیادہ ہو اور ہاں یہ ضروری ہے کہ شیخ سے جو علوم حاصل کرتے ہیں ان میں شیخ لازماً کامل اور مکمل ہو۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مرید شیخ سے کسی دنیوی علم یا دنیوی کمال، مال و دولت، درجے، عہدے یا حکومت میں آگے ہو لیکن جو کمال شیخ کے پاس ہے وہ مرید کے پاس نہیں ہے۔ جیسے بعد کا کوئی

Scanned with CamScanner

شخص کسی خاص علم میں صحابہؓ سے زیادہ دسترس رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں شاید ایسے صحابہؓ مل جائیں جنھوں نے اتنی کثرت سے نوافل نہیں پڑھے جتنے بعد میں کسی ولی اللہ نے پڑھے، لیکن کیا وہ صحابیؓ کے درجے کو پہنچ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ صحابیؓ صحابیؓ ہے اور ولی اللہ ولی اللہ ہے۔۔ لہٰذا مرید کی نظر اُس کمال پر ہونی چاہیے جس کا وہ طالب ہے۔ یہ خیال نہ رکھے کہ شیخ نے کالج میں نہیں پڑھا، میں نے تو کالج میں تین دفعہ ایم اے کیا ہے، یا پی۔ ایچ۔ ڈی کرلی ہے۔ الحمدللہ! میرے ساتھ کبھی کسی نے حضرتؒ کے بارے میں بات کرنے کی جسارت ہی نہیں کی۔ یہ اللہ کا بڑا احسان ہے اور تقریباً ربع صدی حضرتؒ کی رفاقت کی سعادت رہی۔ ہماری حاضری کثرت سے ہوتی تھی۔ ماہ و سال کیا، ہفتہ بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ خواہ ایک رات ٹھہرتے لیکن جاتے ضرور تھے۔ میں ونده شاه بلاول سے پیدل جاتا تھا۔ اُس زمانے میں بسیں بھی اتنی نہیں ہوتی تھیں۔ یہاں سے جاتے جاتے شام ہو جاتی تھی، عموماً ہم عصر کے وقت پہنچتے تھے۔ واپسی پر صبح نکلتے تو شام کو واپس آتے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں حضرت جیؒ سے رخصت ہو کر نکلا تو کچھ اور لوگ جو ونده شاہ بلاول آ نا چاہ رہے تھے، راستے میں میرا اور اُن کا ساتھ ہو گیا۔ وہ پانچ چھ تھے، سب کے پاس بندوقیں تھیں، بدمعاش تھے۔ چکڑالہ ایک بڑا سا گاؤں ہے، وہاں کے بڑے بڑے بدمعاش اور چور اچکے مشہور ہیں۔ اس میں بڑے تگڑے، لڑنے مرنے مارنے والے لوگ اب بھی لڑتے بھڑتے قتل کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ امیر محمد خان نواب آف کالاباغ کا ایک باڈی گارڈ تھا، یہ لوگ اُسے رخصت کرنے جا رہے تھے۔ تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھا، کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ میں نے اُسے بتایا: حضرت جیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، وہ گروپ حضرتؒ کے سخت خلاف تھا۔ ایک واقعہ ہوا تھا، اُن کے ایک بندے نے خاتون کو طلاق دے دی اور جس طرح جاہل کہتے ہیں اُس نے ایک ہی بار سات طلاقیں دے دیں پھر جیسا کہ طلاق دینے والے کو جلدی احساس ہو جاتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے بھی احساس ہو گیا۔ انہوں نے حضرت جیؒ سے رجوع کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا: سات میں سے تین تو واقع ہو گئیں اور چار زائد دینے کا گناہ تم پر باقی ہے۔ حضرتؒ کا فتویٰ چونکہ اُن کے خلاف تھا اس لیے وہ بڑے خفا تھے۔ وہ کہنے لگے: یار! تم بڑے عجیب آدمی ہو، اتنی دور سے آتے ہو اور مولانا تو اچھے آدمی نہیں، دیکھو اس طرح واقعہ ہوا تو ہمارے خلاف فتویٰ دے دیا۔ تم اُن کے پاس کیوں آتے ہو؟ میں نے کہا: مجھے اس فتوے کا تو علم نہیں، تمھاری زبانی سن رہا ہوں۔ مجھے اتنی فقہ آتی بھی نہیں، میں مفتی نہیں، وہ مفتی ہیں، فتویٰ دے سکتے ہیں۔ اُن کا کام ہے اُن کو پتہ ہو گا کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں، میں اللہ اللہ سیکھنے کے لیے اُن کی خدمت میں آتا ہوں اور وہ مجھے بڑا خوب سکھاتے ہیں۔ تمھارے علم میں اس فن کا کوئی اور بندہ ہے کہ ان کے پاس نہ آئیں اور اُس کے پاس چلے جائیں۔ کہنے لگے نہیں ایسا تو کوئی بندہ نہیں۔ میں نے کہا: میری تو مجبوری ہے، میں تو آؤں گا۔ تم راضی رہو، یا ناراض۔ یہ تمھارا مقامی مسئلہ ہے۔ میں تو اپنی ضرورت سے آتا ہوں اور میری ضرورت کا علم اسی ہستی کے پاس ہے۔ یہ بات تو انھوں نے بھی مانی کہ اللہ اللہ تو یہی کرتے ہیں۔ ایسا دوسرا بندہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

یہاں حضرتؒ یہی بات فرما رہے ہیں کہ شیخ کے احترام کی جو وجہ ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ کیفیات ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت خضر علیہ السلام کے مقابلے میں علم اور ورع حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں بڑے تھے۔

Scanned with CamScanner

وہ تو اللہ کے اولوالعزم رسول تھے جبکہ حضرت خضر علیہ السلام ایک ولی تھے اور وہ بھی دنیا سے گزر چکے تھے۔ کہاں نبی کی عظمت اور کہاں ولی کی حیثیت لیکن وہ خاص تکوینی علم جو اللہ نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن سے وہ علم حاصل کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ چونکہ نبی کے پاس شریعت ہوتی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سارے علوم تشریعی تھے اور یہ شیخ کی ہی ذمہ داری ہے کہ مریدوں کو تلقین کرتا رہے کہ وہ شریعت کی پابندی کریں۔ جامع کرامات، جلد اوّل، صفحہ ۵۱۱ پر ارشاد ہے:

شیخ ابوالعباسؒ نے فرمایا:

کوئی قطب، قطب نہیں ہوسکتا نہ اوتاد، اوتاد ہو سکتے ہیں، نہ کوئی ولی ولی ہوسکتا ہے جب تک اُس کے دل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم نہ ہو، یہ بڑے غضب کی بات ہے۔ یوں تو جو برائے نام مسلمان ہے اُس کا بھی دعویٰ ہے کہ میرے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا احترام ہے۔ کوئی جو نہ نماز پڑھتا ہے، نہ روزہ رکھتا ہے، چوری کرتا ہے، ڈاکہ ڈالتا ہے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی آتا ہے تو انگوٹھے چوم لیتا ہے، آنکھوں پہ لگاتا ہے۔ شیخ ابوالعباسؒ فرماتے ہیں کہ یہ ادب نہیں ہے، اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے احکام بجا لائے اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ جو بندہ عملی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پرواہ نہیں کرتا اور زبانی کلامی کہتا ہے کہ میرے دل میں ادب ہے، وہ جھوٹ بولتا ہے۔ جس ہستی کا احترام آپ کے دل میں ہے اُس کی بات نہ ماننے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے مراد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل میں اپنی پوری کوشش صرف کر دے۔ یہ ہی شیخ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرید کے دل کی زمین کو دیکھ کر اُس کی تربیت کرے اور اُس کے مطابق اُسے چلائے، جس طرح کاشت کار زمین کو دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے (چونکہ میں کاشت کار بھی ہوں، ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ اس بار زمین میں باجرہ، مکئی وغیرہ کاشت کر دی جائے یا اس سال یہ گندم کی اہلیت نہیں رکھتی یا زمین کے یہ ٹکڑے گندم کاشت کرنے کے لیے اچھے ہیں، یہ گندم کی فصل دیں گے۔ یہ ریتلی سی زمین ہے اس میں مونگ پھلی کاشت کر دی جائے۔ یہ فیصلے زمین کی تراوت اور سارے آثار دیکھ کر کیے جاتے ہیں۔) اسی طرح شیخ بھی مرید کے دل کی زمین کو دیکھے۔ یہاں میں ایک بات عرض کر دوں، ہمارے بعض ساتھی جن کے ذمہ ذکر کروانا لگایا گیا ہے، بعض صاحب مجاز ہیں، بعض امیر ہیں تو وہ وہاں سے چٹھی لکھ کر بھیج دیتے ہیں کہ فلاں کو فلاں مراقبات کرا دیے جائیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انھیں یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ شیخ کے لیے حکم نامہ بھیجیں۔ انھیں تو زیادہ مؤدب ہونا چاہیے کیونکہ اُن کے پاس تو امارت ہے یا وہ صاحب مجاز ہیں، انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ حکم نامہ بھیجیں۔

دوسری بات یہ کہ اگر اُن کا کسی کے ساتھ تعلق، دوستی یا رشتہ داری ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منازل، مراقبات، رشتہ داری پہ تقسیم ہوں گے، یہ تو قلبی استعداد پہ تقسیم ہوں گے۔ یہاں دیکھا جائے گا کہ جتنی اُس میں استعداد ہے اتنے اسے مراقبات کرائے جائیں۔ اُس کی طبیعت میں کتنا خلوص ہے، کتنی قبولیت کی استعداد ہے اور کتنی قوت برداشت ہے لہٰذا کسی سفارش یا چٹھی کی ضرورت نہیں۔ یہ ساری سفارشیں فضول ہیں، ہاں رائے دینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ رائے اور سفارش میں ایک فرق ہوتا ہے۔ رائے یہ ہوتی ہے جیسے کوئی صاحب مجاز یہ لکھ دیتا ہے کہ میری رائے میں اس میں ان مراقبات

Scanned with CamScanner

کی استعداد ہے۔ آپ دیکھ لیجیے، اگر آپ کی رائے میں بھی ہو تو کرا دیجیے، نہ ہو تو اللہ کی مرضی۔ جبکہ سفارش یہ ہوتی ہے کہ فلاں کو یہ کرا دیں پھر اُس پر زور بھی دیا جاتا ہے، مہربانی فرمائیں، کرم فرمائیں، یہ ضرور کریں۔ یہ غلط ہے، ایسا نہیں ہوتا۔ یہ شیخ کی ذمہ داری ہے کہ قلب کی زمین کا جائزہ لے اور شیخ سالک کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کسی کو ذکر کرائے۔ پورے مجمع کو اگر لطائف کرا دے تو یہ دعوتِ عام ہے لیکن یہ تربیتِ خصوصی نہیں۔ تربیتِ خصوصی تو یہ ہے کہ اُس کے قلب کا اندازہ کرے۔ ابتدأ شاید وہ ایک لطیفہ کر سکے۔ ہفتے بعد شاید سات ہی کر لے، یا شاید مہینے دو مہینے بعد اسے دوسرا لطیفہ کرنا نصیب ہو۔ یہ اللہ کریم کی دین اور اپنی استعداد ہوتی ہے۔

ایسے حضرات بھی تھے جنھیں دو دو سال میں ایک لطیفہ کروایا، پرانے ساتھیوں میں حضرت قاضی صاحب تھے۔ قاضی صاحب کی ملاقات جب حضرتؒ سے ہوئی۔ حضرتؒ اُن کے گاؤں میں گئے۔ نکاح کا جھگڑا تھا تو حضرتؒ تشریف لے گئے اور شرعی طور پر حضرتؒ نے فیصلہ فرما دیا۔ وہاں سے تھوڑی دور بس کا اڈہ تھا، اڈے تک چھوڑنے کے لیے حضرتؒ کو گھوڑی پر لے گئے۔ قاضی صاحب ساتھ تھے۔ دندہ شاہ بلاول، ایک حضرت صاحب ہوتے تھے۔ اب اُن کا وہاں مزار ہے۔ حضرت شاہ بلاول اُن کے خاندان سے تھے۔ میرے خیال میں شاید وہ آخری ہستی تھے جن کے پاس تصوف وسلوک کی منازل تھیں۔ (اُس کے بعد پھر وہاں بھی رسم ہی رہ گئی، گدی نشینی رہ گئی ہے)۔ تو قاضی صاحب ان سے سبق لیتے تھے۔ قاضی صاحب نے حضرتؒ کو بتایا کہ میں آٹھ سال اُن کی خدمت میں جاتا رہا اور چار لطائف میں نے کر لیے ہیں پھر حضرتؒ کا وصال ہو گیا اور میں نے جہاں تک سنا ہے حضرتؒ فرماتے تھے پانچ لطیفے ہیں مگر اب مجھے کوئی بندہ نہیں ملتا جو پانچواں لطیفہ کروائے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے تھے کہ میں نے ہنس کر کہا کہ قاضی صاحب میں ہی وہ بندہ بن جاؤں تو؟ وہ بڑے حیران ہوئے کہ آپ کو سلوک بھی آتا ہے؟ چونکہ حضرتؒ مقرر، مناظر اور مفتی مشہور تھے۔ مناظروں میں حضرتؒ نے تمام مذاہب باطلہ، ہندوؤں، عیسائیوں کے خلاف اور باطل نظریات جو مسلمانوں میں فروغ پا گئے تھے، سب کے خلاف مقابلے کیے۔ چونکہ آپؒ مناظر کی حیثیت سے بہت مشہور تھے اور مناظر عموماً صوفی نہیں ہوتے اس لیے قاضی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ مشائخ کی اپنی استعداد بھی ہوتی ہے، کچھ طالب کی قوتِ وصول ہوتی ہے تو اُس کے مطابق انھوں نے ایک لطیفہ دو دو سال بھی کرایا۔ لطائف کے بعد سلوک کے منازل سالک کی استعداد کے مطابق بھی کرائے جاسکتے ہیں۔ یہ صورت خود حضور ﷺ کی اُس سنت کے عین مطابق ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

كَلِّمُوْهُمْ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ ... ''لوگوں سے اتنی بات کرو جتنی وہ سمجھ سکیں۔''

یعنی لوگوں میں جتنی بات سمجھنے کی صلاحیت ہے اتنی بات اُن کو بتائی جائے۔

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوارف المعارف (جلد اوّل، صفحہ ۴۴) پر فرمایا:

مشیخیت کا مرتبہ تصوف کے اعلیٰ مراتب سے ہے اور دعوت الی اللہ کے سلسلے میں نیابتِ نبوت کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے شیخ کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک کو دعوتِ عام دے۔ یعنی یہ تخصیص نہ کرے کہ اسے اللہ اللہ سکھاتا ہوں اور اسے نہیں سکھاتا۔ امیر، غریب، فقیر، مالدار، عالم، جاہل جو اُس کی خدمت میں آئے، اُس میں جتنی استعداد ہو اُسے اتنا ضرور سکھائے،

Scanned with CamScanner

بلکہ شیخ کی شفقت ماں باپ کی شفقت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

جیسے امام رازیؒ نے تفسیر کبیر (جلد اوّل، صفحہ ۲۶۱) پر فرمایا کہ شیخ کامل کا مرتبہ ماں باپ سے اونچا ہے کیونکہ ماں باپ دنیا کی آگ اور اس کی آفتوں سے بچاتے ہیں اور شیخ دوزخ کی آگ اور اُس کی سختی سے بچاتا ہے۔

علامہ ابراہیم عبیدی مالکیؒ نے اپنی کتاب عمدۃ التحقیق فی بشائر آل صدیق، کے صفحہ ۳۳۰ پر فرمایا:

اولاد دو قسم کی ہوتی ہے نسبی اور قلبی۔ صوفیا عارفین کے نزدیک قلبی اولاد، نسبی سے مقدم ہے۔ قلبی اولاد کی اس برتری کی وجہ یہ ہے کہ نسبی والد اپنی اولاد کے بدن کی پرورش مادّی غذا سے کرتا ہے اور یہ دونوں فانی ہیں جبکہ شیخ، سالک کی روحانی تربیت ذکر الٰہی کی غذا سے کرتا ہے اور یہ دونوں غیر فانی ہیں، ہمیشہ رہنے والی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ غیر فانی چیز فنا ہونے والی چیز سے مقدم ہے۔ مولانا جامیؒ نے شیخ کامل کے اسی پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی:

بکارِ نیک گردد یاورِ تُو
بکوئے نیک نامی رہبر تُو
چنیں یارے کہ یابی خاکِ اوشُو
اسیرِ حلقۂ فتراک او شُو
مکن با صوفیانِ خام یاری
کہ باشد کارِ خاماں خام کاری

فرمایا کہ نیکی کے کام میں شیخ تیرا مددگار ہوتا ہے اور نیک نامی کے کوچے میں تیری رہبری فرماتا ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی بندہ ملے تو اُس کی خاک بن جا اور اُس کے جوتوں کا خادم بن جا۔ کچے صوفیوں سے دوستی نہ کرنا کہ وہ تمھیں (خام کاری) یعنی کچے اور ناپختہ کاموں میں لگا دیں گے۔

اخذِ فیض کے لیے آداب

۱۔ شیخ کامل سے اخذِ فیض اور کامل تربیت حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ امر ضروری ہے کہ طالب کے دل میں شیخ سے پوری عقیدت ہو اور وہ پوری استقامت سے اس پر جما رہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے توحیدِ مطلب کہتے ہیں۔ 'جامع کرامات الاولیا' میں ارشاد ہے:

يَنْبَغِيْ لِلْمُرِيْدِ اَنْ يَّكُوْنَ رَاسِخَ الْقَدَمِ لَا يُزِيْحُهٗ كُلُّ شَيْئٍ عَمَّا هُوَ فِيْهِ وَلَا يَتَبَدَّلُ اِعْتِقَادُهٗ فِيْ شَيْخِهٖ بِوَجْهٍ مِّنَ الْوُجُوْهِ اَصْلًا حَتّٰى لَوْ رَاٰى الْخِضْرَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا يَلْتَفِتُ اِلَيْهِ... (جامع کرامات الاولیا، ۱:۲۴۸)

"مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ راسخ القدم ہو اسے کوئی چیز اس راہ سے ہٹا نہ سکے اور اپنے شیخ کے متعلق اس کی عقیدت میں تبدیلی نہ آئے حتیٰ کہ اگر حضرت خضرؑ بھی سامنے آ جائیں تو ان کی طرف توجہ نہ کرے۔"

یہ صورت اس وقت ضروری ہے جب ایک طرف شیخ کامل ہو اور دوسری طرف طالب صادق ہو، اور اگر کسی وجہ سے کسی ناقص آدمی سے کوئی طالب صادق تعلق قائم کر لے اور اسے کوئی روحانی فائدہ نہ پہنچے اور ظاہر ہے کہ جو خود ناقص ہے وہ دوسرے کو کیا سلوک سکھائے گا تو ایسی صورت میں طالب صادق کو کسی شیخ کامل کی تلاش کر لینی چاہیے ورنہ یہ ثابت ہوگا کہ وہ طالب مولیٰ نہیں شخصیت پرستی کے مرض میں مبتلا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ نہ شیخ کامل اور نہ طالب صادق تو یہ تعلق محض ایک سیپ ہوگی، جس کا تصوف و سلوک سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلی صورت میں طالب صادق کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ جس شیخ سے اس کا تعلق ہے اس کے ہزاروں مریدوں میں سے اگر چہ ایک بھی ایسے نہیں ملتے جن کو سلوک کی راہ میں ترقی حاصل ہوئی تو بس سمجھ لیجیے کہ شیخ کے ناقص ہونے میں کوئی شک نہیں اس لیے ایسے شیخ کو ترک کرنا فرض ہے۔ شیخ کامل تو ان لوگوں کو اللہ کے فضل سے عارف باللہ بنا دیتا ہے، جن کی زندگیاں نائٹ کلبوں میں ناچ گانے اور پینے پلانے کے شغل میں گزری تھیں۔

۲۔ شیخ سے غلط بیانی نہ کرے، بات صاف صاف کرے

اَلصِّدْقُ اَجْمَلُ وَاَحْسَنُ... وَلَا تَسْتَعْمِلِ الْكِذْبَ اِيَّاكَ وَ الْكِذْبِ عَلَى الشَّيْخِ...
(جامع کرامات الاولیا ،۱: ۳۴۷۔۳۴۸)

"سچ بات بہت اچھی اور عمدہ چیز ہے اور طالب کو چاہیے جھوٹ نہ بولے۔ شیخ کے سامنے اور شیخ کے متعلق جھوٹ بولنے سے بچتے رہو۔"

۳۔ شیخ کے ساتھ خیانت کا برتاؤ نہ کرے حتیٰ کہ شیخ کے کلام، راز اور اسرار کے معاملے میں بھی امانت کا ثبوت دے۔ جو شخص معمولی چیزوں میں خیانت کا مرتکب ہو وہ اسرار الٰہی اور مناصب باطنی کے معاملے میں کب امین بنایا جا سکتا ہے اس سلسلے میں بے احتیاطی سے مناصب بھی سلب ہو جاتے ہیں۔

۴۔ جو کچھ اپنی ذات کے لیے محبوب جانتا ہے شیخ کی ذات کے لیے بھی محبوب جانے۔

۵۔ شیخ کی بات غور سے سنے اور اس پر دل سے کاربند ہو۔ شیخ کی مجلس میں شیخ کی بات سننے کی نیت سے جائے اپنی بات سنانے کا شوق لے کر نہ جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک آدمی کو ابو حفص نیشاپوریؒ کی خدمت میں دیکھا جو نہایت خاموشی سے شیخ اور رفقاء کی خدمت میں مصروف ہے۔ میں نے اس کے متعلق پوچھ گچھ کی، مجھے ایک رفیق نے بتایا۔

قَالَ هٰذَا اِنْسَانٌ يَصْحَبُ اَبَا حَفْصٍ وَيَخْدِمُنَا وَقَدْ اَنْفَقَ عَلَى الشَّيْخِ مِائَةَ اَلْفِ دِرْهَمٍ كَانَتْ لَهٗ وَاسْتَدَانَ اَلْفِ اُخْرٰى وَاَنْفَقَهَا عَلَيْهِ مَا يَسُوْغُ لَهٗ اَبُوْ حَفْصٍ اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ وَاحِدَةٍ...(عوارف المعارف، ۲: ۶۳)

Scanned with CamScanner

"یہ آدمی حضرت ابوحفصؒ کی خدمت میں رہتا ہے اور ہم سب کی خدمت کرتا ہے۔اس نے اپنے شیخ کے لیے دولاکھ درہم خرچ کر دیے ہیں مگر اب تک شیخ کے سامنے ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا۔"

۶۔ شیخ سے اس بات کا مطالبہ یا تقاضا نہ کرے کہ مجھے اگلے منازل سلوک میں ترقی دی جائے۔
جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرمایا۔

إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ... (الاعراف:۱۴۴)

"اے موسیٰؑ میں نے تجھے اپنے پیغامات کے لیے چن لیا ہے، اس لیے جو کچھ میں نے تجھے دیا اسے لے لے اور شکر گزاروں میں سے ہو جا۔"

اس لیے طالب صادق کو چاہیے کہ جو منازلِ سلوک طے ہوتے ہیں ان کی حفاظت کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔ اللہ اپنے وعدے کے مطابق اور عطا کرے گا۔

۷۔ شیخ کی مجلس میں بیٹھا ہو تو شیخ کے چہرے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھے بلکہ اپنے قلب کی طرف متوجہ ہو کر ذکر قلبی میں مشغول رہے یا اپنے منازل کی نگہداشت کرے۔

۸۔ شیخ سے کوئی بات پوچھے تو سیکھنے کی غرض سے اور طالب علمانہ انداز سے پوچھے، اعتراض کے طور پر کوئی سوال نہ کرے کیونکہ شیخ پر اعتراض مانع فیض ہے۔
جیسا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے 'عوارف المعارف' میں فرمایا:

مَنْ لَمْ يُعَظِّمْ حُرْمَتِ جَوَابِ الشَّيْخِ حُرِمَ بَرَكَتِهِ وَمَنْ قَالَ فِي جَوَابِ الشَّيْخِ "لَا" أَنَّهُ لَا يُفْلِحُ أَبَدًا... (عوارف المعارف، ۲:۶۳)

"جس شخص نے شیخ کے جواب کا احترام ملحوظ نہ رکھا وہ شیخ کے فیض سے محروم ہو گیا اور جس نے شیخ کی بات کے جواب میں "نہیں" کہہ دیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔"

اگر شیخ کی رائے سے بہتر کوئی صورت سالک کی معلومات میں موجود ہو تو یوں کہے کہ اس مسئلے کی ایک اور صورت بھی ہے ممکن ہے وہ بہتر ہو۔

۹۔ چلتے وقت شیخ کے آگے نہ چلے، کما قال تعالیٰ، لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ... (الحجرات:۱)
یعنی اپنے مربی کی عزت اور اس کا احترام کرنا اللہ اور رسول کا احترام ہے۔

۱۰۔ شیخ کی خدمت میں جب حاضر ہو خالی ہاتھ نہ جائے جیسا کہ 'تھادو اتحابوا' میں یہ ادب سکھایا گیا ہے۔ ہاں شیخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرید کے مال پر نگاہ رکھ کے نہ بیٹھا ہو، اس کو اشراف نفس، یا اشراف الی مال المرید کہتے ہیں۔ یہ جائز نہیں۔

Scanned with CamScanner

۱۱۔ شیخ کی عدم موجودگی میں شیخ کے مقرر کردہ خلیفہ کا احترام اسی طرح کرے جس طرح شیخ کا احترام کرتا ہے، اس میں کوتاہی نہ کرے۔ بالخصوص اصحابِ مناصب کی عزت اور احترام نہایت ضروری ہے اور یہ ادب اور احترام حدود شرعی کے اندر ہو۔

۱۲۔ جس شیخ سے فیض لینا مقصود ہو اس کے پاس مدعی بن کر نہ جائے اپنے کمالات کا اظہار نہ کرتا رہے۔ حضرت موسیٰ اور خضرؑ کے واقعہ میں کیا عمدہ تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے الفاظ قابلِ غور ہیں:

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ... (الکھف:۶۶)

"کیا میں آپ کی پیروی اس غرض سے کروں کہ آپ مجھے وہ کچھ سکھائیں جو بھلائی آپ کو سکھائی گئی ہے۔"

اتباع اور اطاعت نہ کرنے سے انسان مرتبۂ انسانیت سے گر جاتا ہے۔

فَالْكَلْبُ بَعْدَ طَاعَةِ مَالِكِهٖ صَارَ فِي حُكْمِ الْمَالِكِ (اَيْ فِي حُكْمِ الْاِنْسَانِ) وَالْمَالِكُ بِمَعْصِيَةِ مَوْلَاهُ صَارَ اَسْوَءَ مِنَ الْكَلْبِ...

(فیض الباری، کتاب الوضوء، باب اذا شرب۔۔ الخ، ۱:۲۷۷)

"کتا اپنے مالک کی اطاعت کی وجہ سے انسان کے حکم میں آ گیا اور انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے کتے سے بھی برا بن گیا۔"

دیکھیے شکاری کتا سدھانے سے مالک کا پوری طرح مطیع ہو جاتا ہے اس لیے جب اسے شکار پر چھوڑا جاتا ہے تو اس کا مارا ہوا شکار حلال ہوتا ہے، گویا کتا ذابح انسان کے حکم میں آ گیا۔ اور بلعم باعور جیسا انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے جانوروں سے بدتر ہو گیا۔

۱۳۔ شیخ کی وفات کے بعد بھی شیخ کا ادب اسی طرح کرنا چاہیے جیسے شیخ کی زندگی میں کیا جاتا ہے اور شیخ کے رشتہ داروں کا بھی ادب احترام کرنا چاہیے۔

۱۴۔ شیخ کے سامنے شیخ کے آنے پر کھڑا ہو جانا اظہارِ ادب کی ایک صورت مروج ہے لیکن اس میں اختلاف بھی ہے، اس سلسلے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ فیض الباری میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَاعْلَمْ اَنَّ الْقِيَامَ لِلتَّوْقِيْرِ رُخْصَةٌ اَوْ مُسْتَحَبٌّ اِذَا كَانَ هٰذَا الْمُعَظَّمُ يَقْصِدُ نَحْوَهٗ وَيَجِيْءُ اِلَيْهِ وَاَمَّا اِذَا كَانَ يَذْهَبُ لِحَاجَةٍ لَهٗ فَلَا يَقُمْ...

(فیض الباری، کتاب بدء الخلق، باب المناقب، ۴:۴۰)

"یہ بات جان لو کہ شیخ یا استاد کے لیے کھڑا ہونے کی اجازت ہے یا مستحب طریقہ ہے۔ بشرطیکہ وہ قابلِ احترام ہستی اس شخص کی طرف آ رہی ہو اور اگر وہ بزرگ اپنے کسی کام کے لیے جا رہے ہوں تو پھر نہ اٹھے۔"

اسی طرح استاد یا شیخ کے ہاتھوں کو چومنا بھی جائز ہے، ہاں، یہ دیکھ لینا چاہیے کہ شیخ کہیں ایسا نہ ہو جس نے عمر بھر

Scanned with CamScanner

ہاتھ بھی نہ دھوئے ہوں۔ اظہارِ ادب کی یہ صورت مستحسن یا مستحب سمجھنے کے بعد اپنی طرف سے اضافہ کر کے نئی نئی صورتیں اختیار کرنے کی اجازت نہیں، مثلاً شیخ کے سامنے انحناء یا سجدہ کرنا قطعاً حرام ہے۔

اخذِ فیض کے لیے آداب

شیخ سے برکات حاصل کرنے کے کچھ آداب، قاعدے، طریقے اور ضابطے ہیں۔

۱۔ توحیدِ مطلب:

شیخ سے دلی عقیدت ہو اور اُس پر استقامت کے ساتھ جما بھی رہے۔ اسے اصطلاحِ تصوف میں توحیدِ مطلب کہتے ہیں۔ توحیدِ مطلب سے مراد ہے کہ صرف اسی کو اپنا مقصد بنا لے، دوسری کوئی چیز اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ شیخ بنانے سے پہلے تحقیقات کر لے، جستجو کر لے، پوچھ لے، جو سوال دل میں آتے ہیں جان لے، تسلی ہو جائے تو پھر اُس پہ جم جائے۔ شیخ اختیار کرنے میں احتیاط بہت ضروری ہے اور کم از کم یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ شیخ کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟ انھیں کچھ فائدہ ہوا، اُن میں کوئی مثبت تبدیلی آئی یا نہیں؟ لیکن شیخ اختیار کرنے کے بعد اپنے مقصد پر جم جائے، پھر توحیدِ مطلب رکھے یعنی اپنا ایک ہی مقصد ہو کہ مجھے اپنی اصلاح کرنی ہے اور برکاتِ نبوی ﷺ حاصل کرنی ہیں۔ ایسا راسخ القدم ہو کہ اسے کوئی چیز راہ سے ہٹا نہ سکے، پھر یہ نہیں کہ کسی نے کوئی بات کہہ دی تو دوسرے دن اُس کا یقین متزلزل ہو گیا۔ کوئی بڑے سے بڑا بھی ہو تو توقعات اپنے شیخ سے رکھے۔ اُسے جو کچھ ملنا ہے وہیں سے ملے گا۔ کوئی بڑا بھی ہے تو وہ اپنی جگہ ہے، اُس کی اپنی حیثیت ہے۔ یہ صورت اس وقت ضروری ہے جب ایک طرف شیخ کامل ہو اور دوسری طرف طالبِ صادق ہو اور اگر کسی وجہ سے کسی ناقص آدمی سے کوئی طالبِ صادق تعلق قائم کر لے اور اُسے کوئی روحانی فائدہ نہ پہنچے اور ظاہر ہے کہ جو خود ناقص ہے وہ دوسرے کو کیا سکھائے گا تو ایسی صورت میں طالبِ صادق کو کسی شیخِ کامل کی تلاش کر لینی چاہیے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کی شہرت ہوتی ہے اور لوگ رسمی طور پر اُس کے ساتھ متعلق ہو جاتے ہیں لیکن کچھ عرصہ رہنے کے بعد انسان خود محسوس کر لیتا ہے کہ روحانی طور پر اُس میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ اگر اُس کی طلب صادق ہے اور شیخ سے فائدہ نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب ہے کہ اُسے دینے کے لیے شیخ کے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو خود ناقص ہے وہ دوسرے کو کیا سکھائے گا، لہٰذا عمر ضائع نہ کرے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگوں نے مشیخیت کا دعویٰ کیا ہوا ہے، طرح طرح کے لباس، چغے، رومال اور ٹوپیاں پہن کر حلیے بنائے ہوئے ہیں۔ گلے یا ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور صرف شعر و شاعری، نعتوں اور قوالیوں پر لوگوں کو رکھا ہوا ہے۔ لوگ ساری ساری عمر اُس میں بیٹھے رہتے ہیں، کردار اور فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آتی نہ ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ تو اس طرح عمر ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ ایک ہی بار دنیا میں موقع ملتا ہے، عمر بار بار نہیں ملتی۔ اگر ایسی صورت ہو تو انسان کو چاہیے کہ کسی کامل شیخ کو تلاش کر لے اور اگر یہ صورت ہو کہ طالب بھی صادق نہ ہو، اُس کا مقصد رضائے باری نہ ہو، وہ بھی کسی دنیوی یا ذاتی مفاد کے لیے چمٹا ہوا ہو اور شیخ بھی کامل نہ ہو تو پھر اس کا کیا فائدہ ہو گا۔ وہ تو کسی کام کی چیز نہیں ہے۔ اگر کسی شیخ

Scanned with CamScanner

کے پاس ہزاروں مرید ہیں اُن میں سے چند کو بھی منازلِ سلوک نصیب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے شیخ تو کامل ہے، اگر کسی کو نصیب نہیں ہو رہے تو کمی اُس کی طرف سے ہے۔ شیخ کامل نہ ہوتا تو چند کو بھی نصیب نہ ہوتے۔ اگر شیخ کامل ہو تو جو لوگ زندگیاں ضائع کر رہے ہوتے ہیں، جن کی زندگیاں کلبوں اور ناچ گانوں میں گزر رہی ہوتی ہیں اُن کو بھی اللہ کا بندہ بنا دیتا ہے، نیک بنا دیتا ہے۔ پہلی بات تو تھی عقیدت کی اور عقیدت کے سمجھنے کے لیے ذرائع بھی بتا دیے گئے ہیں کہ اس طرح سمجھ آ جاتی۔

۲: شیخ سے غلط بیانی نہ کرے، بات صاف صاف کرے:

یہ عجیب لوگ ہوتے ہیں، من جانب اللہ ان کے مزاج ایسے ہو جاتے ہیں کہ یہ بڑے نازک مزاج اور سیدھے سادھے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے بات سیدھی کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ ہوتا ہے، میرے خیال میں ہر دوسرے تیسرے دن یہ جھگڑا ہوتا ہے۔ کوئی بندہ آتا ہے، جی اسلام علیکم، میری عادت ہے میں آتے ہی پوچھتا ہوں کس کام سے آئے ہو؟ ''جی بس زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں''، ''ٹھیک ہے بیٹھو''۔ اب بیٹھے رہیں گے۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا، گھنٹہ گزر گیا اور لوگ آ گئے، اچھا بھئی اب آپ جائیں، ''جی مجھے تو تعویذ لینے تھے''، بھئی جب میں نے پوچھا کس کام سے آئے ہو تو کیوں نہیں بتایا کہ تعویذ لینے ہیں۔ یعنی آنے والے کے نزدیک یہ کوئی غلط بیانی نہیں ہے۔ بظاہر یہ عام سی بات ہے لیکن مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے کہ میں نے گھنٹہ پہلے پوچھا تھا کیا کام ہے۔ یہ شخص گھنٹہ بیٹھا رہا اور اب کہتا ہے مجھے تعویذ لینے ہیں، اس وقت کہہ رہا تھا زیارت کے لیے آیا ہوں۔

بظاہر یہ عام سی بات ہے لیکن نہیں! سیدھی سی بات کرنی چاہیے۔ آپ تعویذ لینے آئے ہیں، آپ کہیں جی مجھے فلاں تکلیف ہے، اس کے بعد بیٹھیں، ملاقات تو ہو ہی گئی۔ یہ معمولی باتیں بھی اپنا بڑا اثر رکھتی ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اسے لوگ جھوٹ سمجھتے ہی نہیں حالانکہ یہ بھی جھوٹ ہے۔ جامع کرامات الاولیا میں ارشاد ہے کہ ''سچ بات بہت اچھی اور عمدہ چیز ہے۔ طالب کو چاہیے شیخ کے سامنے جھوٹ نہ بولے اور شیخ کے متعلق بھی جھوٹ بولنے سے بچتا رہے۔''

۳: شیخ کی بات کو امانت کے طور پر رکھے:

سالک کو چاہیے کہ شیخ کی بات کو امانت کے طور پر رکھے۔ کوئی اسرار و رموز اور کرامات دیکھے تو وہ بھی اس کے پاس امانت ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں جو بندہ جھوٹ بول جاتا ہے اور پرواہ ہی نہیں کرتا، اور سمجھتا ہی نہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ جو چھوٹی باتوں میں بے پروائی کرتا ہے اس کو اسرارِ الٰہی کا امین کیسے بنایا جا سکتا ہے، وہ کس طرح برکات حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی کتنے بھی منازل طے کر چکا ہو اس طرح کے واقعات ہو جائیں تو وہ سارے منازل سلب ہو جاتے ہیں کیونکہ اس سارے کی بنیاد سچائی اور خلوص پر ہے۔ عمارت سو منزلہ بھی ہو اس کی بنیاد ہٹا دیں تو وہ گر جائے گی۔

۴: جو کچھ اپنی ذات کے لیے محبوب جانتا ہے، شیخ کی ذات کے لیے بھی محبوب جانے۔

۵: شیخ کی بات کو غور سے سنیں اور اس پر دل سے کاربند ہو:

شیخ کی مجلس میں شیخ کی بات سننے کی نیت سے جائے اپنی بات سنانے کا شوق لے کر نہ جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک آدمی کو حضرت ابو حفص نیشاپوریؒ کی خدمت میں دیکھا جو نہایت خاموشی سے شیخ اور

Scanned with CamScanner

رفقاء کی خدمت میں مصروف ہے۔ میں نے اس کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ مجھے ایک رفیق نے بتایا کہ یہ آدمی حضرت ابوحفصؒ کی خدمت میں رہتا ہے اور ہم سب کی خدمت کرتا ہے، اس نے شیخ کے لیے دو لاکھ درہم خرچ کر دیے ہیں مگر اب تک شیخ کے سامنے اپنی کوئی بات نہیں کی۔

۶: شیخ سے اگلے منازل میں ترقی کا مطالبہ نہ کرے:

فرمایا، شیخ سے اس بات کا بھی تقاضا نہ کیا جائے کہ مجھے اگلے منازلِ سلوک میں ترقی دی جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا! ''اے موسیٰؑ! میں نے تجھے اپنے پیغام کے لیے چن لیا اس لیے جو کچھ میں نے دیا ہے وہ لے لے اور شکر ادا کر''۔ تو یہ تقاضا کرنا کہ مجھے اگلے منازل کرائے جائیں یہ درست نہیں۔ یہ ایک فطری اور قدرتی عمل ہے جتنا کوئی مجاہدہ کرتا ہے، اس کے نتیجے میں جتنی استعداد پیدا ہوتی ہے اسے اتنی ترقی نصیب ہو جاتی ہے۔ اگر منازل کا شوق ہے تو محنت اور مجاہدہ کرے، اللہ سے دعا کرے، خلوص سے کام کرے، اللہ مزید دے دے گا۔ یہ اللہ کی عطا ہوتی ہے۔ یہ بڑے عجیب معاملات ہیں۔ ہم ایک دفعہ گجرات کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ عموماً میں ہی گاڑی چلا رہا ہوتا تھا۔ حضرتؒ نے مجھے فرمایا، یہاں ذرا رک جاؤ، ویرانہ سا تھا بے آبادسی جگہ تھی، دونوں طرف کھیت تھے آبادی نہیں تھی۔ ایک طرف کنارے پر تھوڑی سی اونچی جگہ پر ایک قبر تھی۔ کچھ دیر رکے، پھر حضرتؒ نے فرمایا، چلو، چند منٹ رکے ہوں گے۔ فرمانے لگے کہ یہ بندہ جس کی قبر ہے اس نے ساری زندگی شیخِ کامل کی تلاش میں گزار دی اور اسے کوئی بندہ نہیں ملا جو اسے سلوک سکھاتا۔ اسی طلب میں فوت ہو گیا۔ اب پتا نہیں کب کا دفن ہے، مٹی کی کچی قبر تھی۔ فرمایا، میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ من جانب اللہ مجھے القاء ہوا کہ اسے مراقباتِ ثلاثہ کرا دو۔ میں نے اسے توجہ دی ہے، لطائف کرائے ہیں، مراقباتِ ثلاثہ کرا دیے ہیں۔ چونکہ اس کی طلب خالص تھی، اللہ نے مرنے کے بعد پوری کر دی۔ پتا نہیں اُسے فوت ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہوگا۔ وہ زندگی بھر نہ جانے کہاں کہاں گیا ہوگا کس کس درگاہ اور کس کس پیر کے پاس گیا ہوگا۔ جس چیز کا طالب تھا وہ نہ مل سکی اس کی طلب اور جستجو میں فرق نہ آیا۔ اس کی قبر کا کوئی جاننے والا نہیں تھا اور نہ وہاں کوئی قبرستان تھا۔ کسی زمانے میں قبرستان ہوگا پھر آہستہ آہستہ کھیتوں میں مل گیا۔ ایک اس کی قبر بچی تھی، بلند جگہ پر تھی۔ اس کی زندگی ختم ہو گئی، مرنے کے بعد بھی اللہ نے اہتمام فرما دیا کہ اس کی طلبِ صادق کا اسے نتیجہ مل گیا۔ یہ اللہ کا اپنا انتظام ہے اور طلبِ صادق کا یہ اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بندہ محنت اور مجاہدہ کرتا ہے تو اُس میں ایک استعداد پیدا ہوتی ہے اور جہاں استعداد ہوتی ہے وہاں اتنی برکات آ جاتی ہیں اس کا کاسۂ طلب خالی نہیں رہتا۔ جہاں استعداد نہیں ہوتی وہاں زبردستی تو ٹھونسی نہیں جا سکتیں۔

اور فرمایا: طالبِ صادق کو چاہیے کہ جتنے منازل سلوک طے ہوتے ہیں، ان کی حفاظت کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں سورہ الاعراف کی آیت نمبر ۱۴۳ میں ملتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی تھی، یا اللہ مجھے اپنا دیدار کرا دیں میں اسی دنیا میں اپنی ظاہری آنکھوں سے آپ کا حُسن جہاں آرا دیکھنا چاہتا ہوں تو

Scanned with CamScanner

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان ظاہری آنکھوں سے اس دارِ دنیا میں میری ذات کو دیکھ سکے۔ فرمایا، سامنے والے پہاڑ پر دیکھو، اگر اس نے برداشت کرلیا تو پھر تم بھی برداشت کرلو گے۔ ذرا سی تجلیٔ باری پہاڑ پر پڑی اور وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰؑ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو توبہ کی کہ بارِالٰہ میں توبہ کرتا ہوں، جو تو نے عطا کیا بہت ہے۔ تو نے مجھے پہلے ہی بہت نواز رکھا ہے۔ اُس وقت حکم دیا۔ اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ... موسیٰؑ میں نے تو آپ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ کو اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے اور براہِ راست اپنے کلام سے نوازا ہے۔ تب ارشاد ہوا کہ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ... جو عطا ہوا ہے اسے قابو میں رکھو اور میرا شکر ادا کرو۔ یہی معاملہ شیخ اور طالب میں ہوتا ہے کہ جو عطا ہو گیا ہے اسے سنبھالے اور قابو میں رکھے۔ اس عطا ہوئے پر کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں کرنا چاہیے اس کی کوشش کرے اور اللہ کا شکر ادا کرتا رہے۔

جتنی استعداد ہوتی ہے از خود ملتا رہتا ہے۔

:۷ شیخ کی مجلس میں اپنے قلب کی طرف متوجہ رہیں:

شیخ کی مجلس میں بیٹھے ہوں تو شیخ کے چہرے کی طرف آنکھیں پھاڑ کر نہ دیکھیں بلکہ اپنے قلب کی طرف متوجہ ہو کر ذکرِ قلبی میں مشغول رہیں یا اپنے منازل کی نگہداشت کریں کیونکہ جتنی دیر مجلس نصیب ہوتی ہے انعکاسی طور پر برکات نصیب ہوتی رہتی ہیں تو اس کی فکر کرے۔

:۸ شیخ پر اعتراض مانعِ فیض ہے:

شیخ سے کوئی بات پوچھے تو سیکھنے کی غرض سے ہو اور طالب علمانہ انداز میں پوچھے، اعتراض کے طور پر سوال نہ کرے کیونکہ شیخ پر اعتراض مانعِ فیض ہے۔ اعتراض کرنے سے فیض منقطع ہو جاتا ہے۔

حضرتؒ کے پاس بعض علما حضرات آجاتے تھے۔ جب وہ علمی سوال کرنے لگتے تو حضرتؒ پوچھ لیتے تھے کہ آپ کوئی بات سمجھنے سمجھانے کے لیے تشریف لائے ہیں یا بیعت کا ارادہ ہے۔ اگر کوئی عرض کرتا کہ حضرت بیعت کا ارادہ ہے تو فرماتے بیعت ہونے سے پہلے پہلے جو سوال کرنا ہے یا کوئی اعتراض کرنا ہے تو کرلو، بیعت کے بعد تمہارا اختیار نہیں رہے گا پھر تمہیں صرف اطاعت کرنا ہوگی۔ اسی طرح شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے 'عوارف المعارف' میں لکھا ہے کہ جس شخص نے شیخ کے جواب کا احترام ملحوظ نہ رکھا وہ شیخ کے فیض سے محروم ہوگیا۔ اور جس شخص نے شیخ کی بات کے جواب میں "نہیں" کہہ دیا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ اگر شیخ کی رائے سے بہتر کوئی صورت سالک کی معلومات میں ہو تو یوں کہے کہ اس مسئلے کی اور بھی صورت ممکن ہے اور ہوسکتا ہے وہ بہتر ہو۔ یعنی اپنی رائے دے، مسلط کرنے کی کوشش نہ کرے۔ یوں تو حضور ﷺ کے پسند فرمانے پر صحابہ کرامؓ بھی حضور ﷺ کو رائے دیتے تھے لیکن اس پر اصرار نہیں کرتے تھے کہ ضرور میری رائے مانی جائے۔

:۹ چلتے وقت شیخ کے آگے نہ چلے:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا،

Scanned with CamScanner

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ... یعنی برکاتِ نبوت ﷺ کا حامل ہونے کے ناطے اپنے مربی کی عزت اور احترام کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا احترام کرنا ہے۔

۱۰: شیخ کی خدمت میں جب حاضر ہو تو خالی ہاتھ نہ جائے:

جیسا کہ تَهَادَوْا وَ تَحَابُّوْا... (خدمت کرو اور فائدہ اٹھاؤ) میں یہ ادب سکھایا گیا ہے کہ یہ شیخ کے لیے جائز نہیں کہ وہ مرید کے مال پر نظر رکھے لیکن مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ضرور خدمت کرے۔

۱۱: اصحابِ مناصب کا بھی احترام کیا جائے:

اصحابِ مناصب سے مراد ہے جنہیں امیر یا صاحبِ مجاز بنا دیا جاتا ہے یا جنہیں کوئی منصب دے دیا جاتا ہے۔ یہاں دو باتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ صاحبِ مجاز کی یا تو کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا یا پھر کچھ لوگ اس سے اتنا چمٹ جاتے ہیں کہ اس کو شیخ پر بھی فضیلت دے دیتے ہیں اور اسی کی بات مانتے ہیں شیخ کی بھی نہیں سنتے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اعتدال میں سلامتی ہے۔ شیخ کا احترام ہو یا کسی صاحبِ مجاز کا، شرعی حدود کے اندر ہوگا۔ غیر شرعی کام کر کے راضی کرنا ادب نہیں ہے۔

۱۲: شیخ کے پاس مدعی بن کر نہ جائے:

شیخ سے فیض لینا مقصود ہو تو اس کے پاس مدعی بن کر نہ جائے یعنی جب لینے کے لیے جاتا ہے تو پھر ہمارے حکمرانوں والا طریقہ اختیار نہ کرے۔ آپ نے دیکھا کہ ہمارے حکمران پیسے مانگنے کے لیے باہر جاتے ہیں تو ان کے سوٹ میں لاکھوں کی ٹائی ہوتی ہے لاکھوں کا ایک کوٹ ہوتا ہے کئی لاکھ کے جوتے ہوتے ہیں، اسی طرح جہاز بھی بڑا شاندار ہوتا ہے۔ جن سے مانگنے جاتے ہیں وہ عام لباس میں بیٹھے ہوتے ہیں جو مانگنے جاتے ہیں وہ ان سے دس گنا قیمتی لباس میں ہوتے ہیں۔ جن سے مانگنے جاتے ہیں وہ حیران ہوتے ہیں کہ یہ ہم سے مانگنے آئے ہیں؟ اور کہتے ہیں کہ یہ تو خود بڑے عیاش اور امیر کبیر لوگ ہیں، ہم سے کیوں پیسے مانگتے ہیں، کیا یہ ہمیں بے وقوف بناتے ہیں؟ لہٰذا سالک بھی جب شیخ کے پاس جائے تو اپنی بڑائی اور کمالات کا اظہار نہ کرتا پھرے۔ بلکہ لینے کے لیے وہاں مانگنے والے کی صورت میں جائے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ میں عمدہ تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ ایک اولوالعزم رسول تھے، حضرت خضرؑ ایک ولی تھے لیکن وہ امورِ تکوینی جو حضرت خضرؑ کے علم میں تھے، حضرت موسیٰؑ کے علم میں نہیں تھے کیونکہ موسیٰؑ نبی تھے اور نبی کا علم تشریعی ہوتا ہے۔ تو موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے فرمایا! هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا... (الکہف:۶۶) ''میں آپ کا اتباع کروں تو آپ اپنے ان علوم میں سے جو اللہ نے آپ کو دیئے ہیں۔ مجھے بھی عطا کریں۔''

اتباع اور اطاعت نہ کرنے سے انسان مرتبۂ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ 'فیض الباری' جلد اول، صفحہ ۲۷۷ میں ہے کہ کتا اپنے مالک کی اطاعت کی وجہ سے انسان کے حکم میں آ گیا اور انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے

Scanned with CamScanner

کتے سے بھی برا بن گیا۔ یعنی شکاری کتا مالک کے سدھانے سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ شکار کرنے میں مالک کی مدد کرتا ہے اور اس کا روکا ہوا جانور ذبح کر کے کھا لیا جاتا ہے۔ بلعم بن باعور جیسا انسان اپنے رب کی نافرمانی کر کے جانوروں سے بھی بدتر ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بلعم بن باعور اسرائیل کا ایک صاحب حال آدمی تھا وہ اس سے پہلے کے دین پر تھا۔ لوگ اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جب موسیٰؑ کا اس طرف جانا ہوا تو بلعم کے لوگوں کا موسیٰؑ کے لوگوں سے آمنا سامنا ہوا۔ لوگوں نے سمجھا کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکیں گے تو وہ بلعم بن باعور کے پاس گئے کہ آپ نیک اور مستجاب الدعوات ہیں آپ اللہ سے ہماری فتح کی دعا کر دیجیے۔ انہوں نے کہا میں تو ایک عام ولی ہوں اور وہ اللہ کے رسولؑ ہیں۔ میرے لیے تو حکم اور موقع ہے کہ میں ان کی اطاعت کروں اور بھاگ کر ان کے قدموں سے لپٹ جاؤں، تم مجھے الٹی طرف لے جا رہے ہو۔ قوم نے مجبور کیا تو اس نے انہیں سکھایا کہ نوجوان لڑکیوں کو سودا سلف دے کر موسیٰؑ کے لشکر میں بھیج دو اور انہیں کہو کہ کوئی انہیں چھیڑے تو برا نہ مانیں۔ اس سے وہاں برائی پھیلے گی، نبیؑ کی برکات ان سے اٹھ جائیں گی (چونکہ بدکاروں میں وہ برکات نہیں رہتیں) یہ چیز ان کی کمزوری کا باعث بنے گی۔ چنانچہ اس قوم نے ایسا ہی کیا اور اس سے واقعی وہی نتیجہ نکلا۔ موسیٰؑ نے محسوس کیا اور شدت سے منع فرمایا، انہیں وہاں سے نکال دیا۔ یہ بلعم بن باعور ہی کا شروع کردہ طریقہ ہے کہ آج آپ کو ہر جگہ ایک سیلز گرل ملتی ہے، ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس ملتی ہے، ہر دکان میں بیچنے والی نوجوان لڑکیاں ہیں۔ بلعم بن باعور کی اس حرکت کے نتیجے میں نہ صرف اس کے مقامات سلب ہو گئے بلکہ ایمان بھی سلب ہو گیا۔ شکل مسخ ہو گئی اور تڑپتا ہوا واصلِ جہنم ہوا۔ پھر فرمایا:

۱۳: بعد از وفات شیخ کا ادب:

شیخ کی وفات کے بعد بھی شیخ کا ادب اسی طرح کرنا چاہیے جس طرح شیخ کی زندگی میں کیا جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ یہ چیزیں حدودِ شرعی کے اندر رہیں۔ کوئی غیر شرعی کام ادب و احترام کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

۱۴: شیخ کے آنے پر اظہارِ ادب:

شیخ کے آنے پر کھڑا ہو جانا اظہارِ ادب کی ایک صورت مروج ہے لیکن اس میں اختلاف بھی ہے۔ اس سلسلے میں احتیاط کی ضرورت ہے جیسا کہ 'فیض الباری' میں ہے کہ اگر شیخ آپ کی طرف تشریف لا رہے ہیں تو یہ درست ہے کہ آپ کھڑے ہو کر استقبال کر لیجیے لیکن اگر وہ کسی اور طرف جا رہے ہیں تو آپ خواہ مخواہ نہ کھڑے رہیں یعنی شریعت میں تکلفات نہیں ہیں۔ اس میں تو خلوص اور سیدھی سیدھی اور سادہ سادہ باتیں ہیں۔ اسی طرح استاد یا شیخ کے ہاتھ چومنا بھی جائز ہے۔ اظہارِ ادب کی یہ صورت مستحسن اور مستحب ہے۔ ادب و احترام خلوصِ دل سے اور کردار سے ناپا جاتا ہے، ظاہری احوال سے نہیں۔ اپنی طرف سے اضافہ کر کے نئی نئی صورتیں اختیار کرنا، شیخ کے آگے سجدہ کرنا، جھکنا یا رکوع کی حالت میں ہو جانا، سب حرام ہے۔

Scanned with CamScanner

باب (23)

باب الکرامات

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام افضل ترین اور برگزیدہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ وہ خدا کے بندوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے ہیں حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے مبعوث ہونے پر دین مکمل ہو گیا اور سلسلۂ نبوت ختم ہوا۔ ہر نبیؑ کو اس سلسلے میں بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا کہ پورا معاشرہ اور وقت کی حکومت اور اس کی ہر طاقت انبیا کے مقابلے میں آوازِ حق کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ادھر انبیاءؑ ہمیشہ بے سروسامانی کے ساتھ میدانِ عمل میں آتے رہے۔ ان کے پاس کوئی مادی طاقت نہیں ہوتی تھی، فوج نہ اسلحہ نہ خزانہ۔ ظاہر ہے کہ طاقت کے مقابلے میں اپنی صداقت اور برتری کا ثبوت مادی طاقت کی برتری کے بغیر کیا ہو سکتا ہے مگر انبیا کرام نے اپنی صداقت کی سند کے طور پر ہمیشہ ایسے امور پیش کیے جو خرقِ عادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہی کو اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔ انبیاء کرامؑ کے معجزات سے تاریخ انسانی بھری پڑی ہے۔ انبیاء کرامؑ کی میراث، ان کی تعلیمات اور ان کے معجزات ہوتے ہیں اور اس دنیا سے ان کے رخصت ہو جانے پر ان کی میراث ان کی روحانی اولاد کو منتقل ہوتی ہے بشرطیکہ وہ روحانی اولاد ان کی کامل متبع ہو کیونکہ نافرمان اولاد کو تو عاق کر دیا جاتا ہے اور وہ مادی ورثہ سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ اس لیے نبیؑ کے کامل متبع کو ولی اللہ کہتے ہیں اور اولیاء کرام ہی کو انبیاءؑ کی روحانی میراث ملتی ہے۔ چنانچہ نبیؑ کا معجزہ جب ولی کو بطور وراثت پہنچتا ہے تو اس کا اصطلاحی نام کرامت ہوتا ہے۔ جس طرح نبیؑ کا معجزہ اس کی نبوت کی سند ہوتا ہے اسی طرح ولی کی کرامت اس کی ولایت کی سند ہوتی ہے۔ نیز ولی کی کرامت درحقیقت اس نبیؑ کا معجزہ ہوتا ہے جس کا ولی متبع ہوتا ہے۔

امام رازی نے 'اربعین' میں فرمایا:

إِنَّمَا قُلْنَا أَنَّ الْأَتْقٰى أَفْضَلُ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ فَإِثْبَاتُ الْكَرَامَةِ مَقْرُوْنٌ بِذِكْرِ التَّقْوٰى يَدُلُّ عَلٰى أَنَّ تِلْكَ الْكَرَامَةَ مُعَلَّلَةٌ بِالتَّقْوٰى فَحَيْثُ كَانَ التَّقْوٰى أَكْثَرُ وَجَبَ أَنْ تَكُوْنَ الْكَرَامَةُ وَالْفَضِيْلَةُ أَكْثَرَ... (اربعین، ۳۷۶)

"ہم کہتے ہیں کہ تقویٰ افضل ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تم میں سب سے افضل وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ ولی کی کرامت کا مقرون بالتقویٰ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ بغیر متقی صالح کے کرامات کا صدور محال ہے۔ جہاں تقویٰ زیادہ ہوگا وہاں کرامت وفضیلت بھی زیادہ ہوگی۔"

اسی طرح 'الیواقیت والجواہر' میں علامہ شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ:

لَا يَكُوْنُ قَطُّ الْكَرَامَةِ لِوَلِيٍّ إِلَّا تَبَعًا لِمَنْ هُوَ وَارِثُهٗ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَ لِذٰلِكَ كَانَ خَوَاصُّ هٰذِهِ الْأُمَّةِ... (الیواقیت والجواهر، ۲: ۱۰۳)

Scanned with CamScanner

"کرامت صرف اس ولی سے صادر ہوتی ہے جو اپنے نبی کا کامل متبع ہو، اسی وجہ سے وہ ولی اس امت کے خواص میں سے ہوتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ کرامت کا صدور متقی، صالح اور کامل متبع سنت کے بغیر کسی سے نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہی نبی کی صحیح روحانی اولاد ہے۔

اور "الیواقیت والجواہر" میں ہے کہ:

أَعْطَى اللّٰهُ الْكَرَامَةَ لِلْأَوْلِيَاءِ الَّتِيْ هِيَ فَرْعُ الْمُعْجِزَاتِ... مَا كَانَ مُعْجِزَةً لِنَبِيٍّ جَازَ أَنْ يَكُوْنَ كَرَامَةً لِوَلِيٍّ... (ایضاً، ۱:۱۶۰)

"اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے کرامتیں عطا فرمائی ہیں۔ کرامت، فرع ہے معجزہ کی۔ جو چیز نبی کا معجزہ ہے وہی ولی کی کرامت ہے۔"

کرامت گو ولی کی ذات سے صادر ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ اس نبی کا معجزہ ہوتا ہے جس کا وہ ولی کامل متبع ہوتا ہے۔

باب الکرامات

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انبیا کرام افضل ترین اور برگزیدہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ وہ اللہ کے بندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے ہیں حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے مبعوث ہونے پر دین مکمل ہو گیا اور سلسلۂ نبوت تمام ہوا۔ حضور اکرم ﷺ ساری انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے۔ ہر نبی کو اس سلسلے میں بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ پورا معاشرہ، وقت کی حکومت، اس کی ہر طاقت انبیاءؑ کے مقابلے میں آوازِ حق کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقی انبیاءؑ مخصوص قوموں، ملکوں اور مخصوص عرصے کے لیے مبعوث ہوئے۔ وہ جتنے لوگوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان میں سے کچھ ایمان لائے یا اگر سارے نہ لائے تو بھی اکثریت ایمان لے آئی۔ یا پھر اگر کوئی بھی ایمان نہ لایا تو انہیں اس قوم کی مخالفت بھگتنا پڑی۔ نبی کریم ﷺ کیونکہ پوری انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے تھے لہٰذا آپ ﷺ کو روئے زمین کے سارے کفر کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے حضور ﷺ فرماتے تھے کہ کسی نبیؑ پر اتنی تکلیفیں نہیں آئیں جتنی تکلیفوں کا سامنا مجھے کرنا پڑا۔ پھر دوسری بات یہ کہ انبیاءؑ ہمیشہ بے سروسامانی کے عالم میں میدانِ عمل میں آتے ہیں۔ ان کے پاس مادی طاقت ہوتی ہے نہ فوج، اسلحہ نہ خزانہ، ظاہر ہے کہ طاقت کے مقابلے میں اپنی صداقت اور برتری کا ثبوت مادی طاقت کی برتری کے بغیر کیا ہو سکتا ہے۔ مگر انبیائے کرام نے اپنی صداقت کی سند کے طور پر ایسے امور پیش کیے جو خرقِ عادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ خرقِ عادت ان امور کو کہتے ہیں جو عادتاً محال ہوں۔ یعنی جب نبیؑ مبعوث ہوتا ہے تو اس کے پاس کوئی لشکر، کوئی حکومت، کوئی خزانہ نہیں ہوتا جبکہ مقابلے میں جو طاغوتی طاقتیں ہوتی ہیں ان کے پاس اقتدار بھی ہوتا ہے، لاؤ لشکر بھی ہوتے ہیں، دولت بھی ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں نبیؑ اپنے معجزات سے مقابلہ کرتا ہے۔ انبیائے کرام کے معجزات سے تاریخ انسانی بھری

Scanned with CamScanner

پڑی ہے۔ انبیائے کرام کی میراث ان کی تعلیمات اوران کے معجزات ہوتے ہیں۔ یعنی کسی نبیؐ کی مادی وراثت نہیں ہوتی۔ انبیاؑ کی میراث ان کی تعلیمات اور معجزات ہوتے ہیں۔ دنیا سے رخصت ہوجانے پر ان کی میراث ان کی روحانی اولاد کو منتقل ہوتی ہے بشرطیکہ ان کی روحانی اولاد ان کی کامل متبع ہو۔ کیونکہ نافرمان اولاد کو عاق کردیا جاتا ہے اس لیے وہ مادی ورثہ سے بھی محروم ہوجاتی ہے۔ نبیؐ کا کامل متبع ولی اللہ ہوتا ہے اس لیے اولیائے کرام کو انبیاؑ کی روحانی میراث ملتی ہے۔ چنانچہ نبیؐ کا معجزہ ولی کو بطور وراثت پہنچتا ہے تو اس کا اصطلاحی نام کرامت ہوتا ہے۔ یعنی اسے اصطلاح میں کرامت کہتے ہیں۔ جس طرح نبیؐ کا معجزہ اس کی نبوت کی سند ہوتی ہے اسی طرح ولی کی کرامت اس کی ولایت کی سند ہوتی ہے۔ ولی کی کرامت درحقیقت نبیؐ کا معجزہ ہوتا ہے جس کا ولی متبع ہے۔ امام رازیؒ 'اربعین' صفحہ: ۳۷۶ پر فرماتے ہیں "ہم کہتے ہیں کہ تقویٰ افضل ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ... (الحجرات: ۱۳) تم میں افضل وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے"۔ ولی کی کرامت کا مقرون بالتقویٰ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ بغیر متقی، صالح کے کرامات کا صدور محال ہے۔ جہاں تقویٰ زیادہ ہوگا وہاں کرامت وفضیلت بھی زیادہ ہوگی۔ تو فرمایا: انہی معززین کو کرامات دی جاتی ہیں۔ یعنی کرامات کا صدور اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی متقی ہے۔ کرامت صرف اس ولی سے صادر ہوتی ہے جو اپنے نبیؐ کا کامل متبع ہو اور اس وجہ سے ولی اس امتِ خاص میں شمار ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کرامت کا صدور متقی، کامل متبعِ سنت کے بغیر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہی نبیؐ کی صحیح روحانی اولاد ہے۔

'الیواقیت والجواہر' کی جلد اول، صفحہ نمبر ۱۶۰ پر ہے کہ

اولیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے کرامتیں عطا فرمائی ہیں۔ کرامت فرع ہے معجزہ کی۔ جو چیز نبیؐ کا معجزہ ہے وہی ولی کی کرامت ہے۔ کرامت گو صادر تو ولی سے ہوتی ہے لیکن درحقیقت نبیؐ کا معجزہ ہوتا ہے۔ اور کرامت سے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اصولی طور پر ہر عجیب چیز کرامت نہیں ہوتی۔ یوں تو مداری اور شعبدہ باز بھی بڑی عجیب وغریب چیزیں دکھاتا ہے لیکن وہ کرامت نہیں ہوتی۔ کرامت کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے جس پر نبیؐ کے معجزے کی بنیاد ہوتی ہے۔ نبیؐ کا معجزہ نبوت کی صداقت کی دلیل کے طور پر اور دین کو سچ ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ولی کی کرامت بھی احقاق حق کے لیے ہوتی ہے کہ حق اور دین کو ثابت کیا جائے محض لوگوں کو حیران کرنے اور ان سے پیسے لینے کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ کسی شخص کی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے بھی نہیں ہوتی بلکہ جہاں دین کا مقابلہ آتا ہے تو دین کو غالب کرنے کے لیے بھی ولی کی کرامت کا صدور ہوتا ہے۔

کراماتِ اولیاء تواتر سے ثابت ہیں

اولیائے کرام کا وجود کسی ایک دور یا خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دور میں اور ہر ملک میں اولیائے کرام پائے جاتے رہے، اس لیے ان کی کرامات کا وجود بھی ہر دور میں ملتا ہے۔ اسی لیے وہ حدِ تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔

Scanned with CamScanner

قَدْ تَوَاتَرَتِ الْأَخْبَارُ فِيْهَا أَيْ فِي الْكَرَامَةِ بِحَيْثُ لَا يَسُوْغُ مِنْهَا الْإِنْكَارُ وَلٰكِنْ مَنْ يَحْرُمُ عَنِ الْخَيْرِ يَجْعَلُ رِزْقَهُ أَنَّهُ يُكَذِّبُ بِالْكَرَامَاتِ وَ الْبَرَكَاتِ وَ يَزْعَمُهُ مُسْتَحِيْلًا ... (فیض الباری، کتاب التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل، ۱۹۸:۴)

"متواتر اخبار، کرامات کے صدور میں اس قدر وارد ہو چکی ہیں کہ ان کا انکار جائز ہی نہیں۔ ہاں جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھائی سے محروم کر دیا ہو اس کا حصہ ہی تکذیب، کرامات و برکات اولیا ہے اور وہ اسے محال خیال کرتا ہے۔"

امام ذہبی جو جماعت صوفیا کے سخت مخالف ہیں، کرامات اور ان کے انکار کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

اِعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى عَزَّوَجَلَّ قَدْ أَخْبَرَنَا وَ هُوَ صِدْقُ الصَّادِقِيْنَ وَ الْقَائِلِيْنَ بِأَنَّ عَرْشَ بِلْقِيْسَ عَرْشٌ عَظِيْمٌ فَقَالَ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ وَ مَا نُحِيْطُ الْآنَ عِلْمًا بِتَفَاصِيْلِهَا أَيْ تَفْصِيْلِ عَرْشِهَا وَ لَا بِمِقْدَارِهِ وَ لَا بِمَا هِيَتِهِ وَ قَدْ أَتٰى بِهِ بَعْضُ رَعِيَّةِ سُلَيْمَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلٰى بَيْنَ يَدَيْهِ قَبْلَ ارْتِدَادِ طَرْفِهِ...

"خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی اور اس سے زیادہ سچی خبر دینے والا اور کوئی نہیں کہ بلقیس کا تخت بڑا عظیم تھا۔ اتنا بڑا کہ ہم اس کی تفصیل نہ سمجھ سکتے ہیں نہ بیان کر سکتے ہیں، نہ اس کی مقدار و ماہیت سمجھ سکتے ہیں۔ اور یہی عظیم تخت حضرت سلیمانؑ کی رعیت کا ایک آدمی اٹھا لایا تھا اور آنکھ جھپکنے سے پہلے حضرتؑ کی خدمت میں پیش کر دیا۔"

كَمَا قَالَ تَعَالٰى: أَنَا آتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ فَمَا يُنْكِرُ كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ إِلَّا جَاهِلٌ فَهَلْ فَوْقَ هٰذِهٖ كَرَامَةٌ إِلٰى أَنْ قَالَ وَلَا مَجَالَ لِلْعَقْلِ فِيْ ذٰلِكَ بَلْ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ... (کتاب العلو د العرش: ۵۶)

"جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ اس لیے کرامات اولیا کا انکار ایک جاہل آدمی کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا۔ بھلا اس عظیم تخت کے آنکھ جھپکنے کی دیر میں لے آنے سے بڑھ کر بھی کوئی کرامت ہو سکتی ہے؟ یہ بات عقل کی دسترس سے باہر ہے اس لیے ہم اس کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم ایمان لائے اور کرامت اولیا کی تصدیق کی۔"

اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۳ پر امام ذہبی نے کرامات کے تواتر کے سلسلے میں بیان کیا ہے:

سَمِعْتُ الْحَافِظَ أَبَا الْحَسَنِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ الشَّيْخَ عِزَّ الدِّيْنِ بْنَ عَبْدِ السَّلَامِ بِمِصْرَ يَقُوْلُ مَا نَعْرِفُ أَحَدًا كَرَامَاتُهٗ مُتَوَاتِرَةٌ كَالشَّيْخِ عَبْدِ الْقَادِرِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى...

"میں نے حافظ ابوالحسن سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام سے مصر میں سنا

Scanned with CamScanner

کہ فرماتے تھے، مجھے تواتر کے ساتھ جتنی کرامتیں شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ کی معلوم ہوئی ہیں کسی اور ولی اللہ کی اتنی نہیں پہنچیں۔"

امام ذہبی کے بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں کہ:

۱۔ کرامات اولیا تواتر سے ثابت ہیں۔

۲۔ کرامات کا انکار صرف وہی آدمی کرسکتا ہے جو جاہلِ مطلق ہو۔

ابن الحجرؒ نے 'فتاوی الحدیثیہ' میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق فرمایا۔

اِنَّ اللهَ مَنَّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَعَارِفِ وَالْخَوَارِقِ الظَّاهِرَةِ وَالْبَاطِنَةِ وَمَا اَنْبَاعَنْهُ مَاظَهَرَ عَلَيْهِ وَتَوَاتَرَ مِنْ اَحْوَالِهٖ...(فتاوی الحدیثیہ، ۱۷۴)

"اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالقادرؒ پر جو احسان فرمایا، اس کا اظہار ان کے معارف اور ان کی کرامات سے ہوتا ہے اور ان سے جو امور ظاہر ہوئے جو ہم تک پہنچے، یہ سب اللہ کا ان پر احسان ہے۔ اور ان کے یہ حالات تواتر کے ساتھ منقول ہوئے ہیں۔"

اور امام یافعیؒ نے شیخ کی کرامت کے متعلق 'کفایۃ المعتقد' میں فرمایا:

وَ قَدْ ذَكَرَ بَعْضُ اَهْلِ الْعِلْمِ اَنَّ كَرَامَاتِهٖ قَرُبَا مِنَ التَّوَاتُرِ قُلْتُ قُرْبَ حُصُوْلِ الْعِلْمِ بِوُجُوْهِهَا مِنَ الْعِلْمِ الْقَطْعِيِّ الْحَاصِلِ بِكَثْرَةِ الرُّوَاةِ الْبَالِغِيْنَ حَدَّ التَّوَاتُرِ الْمَعْرُوْفِ بِكَثْرَةِ الْمُخْبِرِيْنَ عَنْهَا...(کفایۃ المعتقد، ۲۹۵)

"بعض علما نے ذکر کیا کہ شیخ جیلانیؒ کی کرامات تواتر کے قریب ہیں، میں کہتا ہوں ان کی کرامات کے وجود کا علم قطعی طور پر حاصل ہو چکا ہے اور اس کی وجہ ان کرامات کی خبر دینے والے راویوں کی کثرت ہے۔ یہ کثرت حدِ تواتر تک پہنچتی ہے۔"

امام ذہبی، حافظ ابن حجرؒ اور امام یافعیؒ اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی کرامات حدِ تواتر تک پہنچتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جس کو علم سے ذرا سا مس بھی ہو، وہ متواترات کا انکار نہیں کرسکتا۔

علامہ شعرانیؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول نقل کیا ہے جو قولِ فیصل ہے، فرمایا:

لَا يَاْبَى الْكَرَامَةَ اِلَّا حِمَارٌ رَوَاهُ دَيْلَمِيٌّ وَ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ قَوْلِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ...

(اسنی المطالب فی احادیث مختلفۃ المراتب، ۲۶۱)

"کرامتِ ولی کا انکار صرف ایک گدھا ہی کرسکتا ہے۔"

کرامت کے انکار میں معتزلہ سب سے پیش پیش ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخ میں دو نام اور ملتے ہیں، ابن حزم اور

Scanned with CamScanner

ابو اسحٰق اسفرائنی۔ ان کے انکار کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اگر ولی سے کرامت صادر ہو تو نبیؑ کے معجزہ اور ولی کی کرامت میں فرق کیا رہ جائے گا؟

اس حقیقت کا اظہار ابن خلدونؒ نے اپنے مقدمہ میں صفحہ ۴۵۱ پر فرمایا ہے۔

علامہ انور شاہ کاشمیری نے 'فیض الباری' میں لکھا ہے کہ ابنِ حزم کرامات کا منکر نہیں تھا، اور 'کتاب النبوات' میں ابن تیمیہ نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ثُمَّ قَالَ ابْنُ حَزْمٍ قَائِلٌ بِاسْتِجَابَةِ الدُّعَاءِ مَعَ اِنْكَارِهِ الْكَرَامَةَ قُلْتُ اِذَا اشْتَمَلَ الدُّعَاءُ عَلٰى اَمْرٍ خَارِقٍ لِلْعَادَةِ فَهُوَ الْكَرَامَةُ فَلَمْ يَبْقَ النِّزَاعُ اِلَّا فِي التَّسْمِيَةِ فَمَا الْفَائِدَةُ فِي اِنْكَارِ الْكَرَامَةِ۔۔۔ (فیض الباری، کتاب الصلوۃ، باب من عند النبی ﷺ، ۲:۶۱)

"ابن حزم نے انکارِ کرامت کے باوجود یہ کہا کہ میں دعا کی قبولیت کا قائل ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ جب قبولیتِ دعا خرقِ عادت کے طور پر ثابت ہوگئی تو یہی کرامت ہے پھر تنازعہ محض لفظی رہ گیا، پھر ایسے انکار کا کیا فائدہ؟"

یعنی حقیقتِ کرامت کا اقرار ہے اور لفظِ کرامت کا انکار حالانکہ کرامت کے لیے یہ شرط تو نہیں کہ دعا کے بغیر ہی ظاہر ہو بلکہ دعا بھی اکثر بطور کرامت ہوتی ہے۔ صاحبِ کرامت ولی، خدا سے ایک چیز کی درخواست کرتا ہے پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے اس چیز کا ظہور ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے پہلے خدا سے دعا کی پھر وہ عرش حاضر ہوگیا۔

علامہ ابو اسحاق الفرائنی کے رد میں ابن خلدون کہتا ہے:۔

"یہ عقلی احتمال ہے کہ کرامت اور معجزہ میں فرق کیا رہ جائے گا؟ عقلی بحثیں، حقائق کو جھٹلا نہیں سکتیں۔ مشاہدات اور واقعات کے سامنے عقلی احتمالات کیا حقیقت رکھتے ہیں؟ ہزارہا اولیا اور صوفیا سے کرامتیں ظاہر ہوئی ہیں، سلفِ صالحین اور صحابہ کرامؓ سے کرامتیں ظاہر ہوئی ہیں۔ ان تمام مشاہدات کو کون غلط ثابت کر سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص ایسی غلطی کرتا ہے تو اس کی وجہ ہٹ دھرمی، ضد اور عناد ہے، عقلی احتمالات نہیں"۔ (مقدمہ ابن خلدون، ۲:۳۷۴)

اس موقع پر معجزہ، کرامت، سحر اور کہانت میں فرق واضح کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کراماتِ اولیا تواتر سے ثابت ہیں

اولیائے کرام کا وجود کسی ایک زمانے یا کسی ایک خطۂ زمین سے مخصوص نہیں، ہر دور اور ہر ملک میں اولیائے کرام پائے جاتے رہے ہیں۔ ان کی کرامات کا وجود ہر دور میں اس درجہ ملتا ہے کہ وہ حدِ تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ تواتر ہوتا ہے جو چیز متواتر متقدمین سے آج تک ہر عہد میں ثابت ہوتی ہے تو 'فیض الباری' جلد چہارم، صفحہ ۱۹۸ پر ہے، متواتر اخبار، کرامات کے صدور میں اس قدر وارد ہو چکی ہیں کہ ان کا انکار جائز نہیں ہاں کسی کو اللہ نے بھلائی سے محروم کر دیا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ حضرت امام ذہبیؒ کیونکہ صوفی نہ تھے اور شاید ان کی رسائی اس بات تک نہیں ہو سکی، وہ صوفیوں کی مخالفت کرتے تھے لیکن

جب ان سے کسی نے کراماتِ اولیا کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا بھی کرامتِ ولی کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ آخر سلیمانؑ کے خادموں میں سے جو آدمی ولی اللہ تھا نبی تو نہیں تھا، نبی تو سلیمانؑ تھے۔ بلقیس کا تخت اس کے خاص کمرۂ شاہی کے اندر بنایا گیا تھا اور جتنا کمرے کا سائز تھا کوئی شاید تھوڑی جگہ بچی ہو، اس میں وہ تخت تھا اور اس میں بے شمار ہیرے جواہرات لگے ہوئے تھے۔ اس کا وزن، لمبائی اور چوڑائی کتنی تھی یہ کسی نے بیان نہیں کی لیکن یہ تھا کہ اس کمرے سے بغیر توڑے پھوڑے اس کا نکالنا ممکن نہیں تھا اور پھر وہ سینکڑوں میل دور بھی تھا۔ جب حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ کیا اس کا تخت کوئی لے آئے گا، تو بہت بڑا جن وہاں موجود تھا، اس نے کہا جی میں ایک دن میں لے آؤں گا۔ آپؑ نے فرمایا نہیں دن تو بڑا لمبا عرصہ ہے تو ایک خادم نے کہا کہ میں آنکھ جھپکنے سے پہلے وہ تخت آپ کی خدمت میں حاضر کر دیتا ہوں اور آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت وہاں موجود تھا۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ جب ایسی باتیں موجود ہیں تو کرامات کا انکار کون کر سکتا ہے۔ یہ سب ہمت، مجاہدے اور قوت کی بات ہے۔ اب وہ مجاہدہ ہی نہیں رہا لوگوں میں مناظرے کرنے کا شوق زیادہ ہوتا ہے لیکن مجاہدہ کرنے کا شوق کم ہو گیا ہے، اس کے برعکس محنت کم کی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ نے ایک دفعہ ہمیں یہ کیفیت دکھلائی۔ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا کہ آنکھ جھپکنے میں تخت حاضر تھا۔ تو حضرتؒ نے فرمایا اس شخص نے اپنے قلب کے انوارات القا کیے، تخت کو انوارات میں لپیٹا اور انوارات کو ایک دفعہ اشارہ کیا تو تخت سامنے پڑا تھا۔ اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹۳ پر امام ذہبیؒ نے کرامات کے تواتر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

''میں نے حافظ ابوالحسن سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے شیخ اظہر الدین بن عبدالسلام سے مصر میں سنا، فرماتے ہیں مجھے تواتر کے ساتھ جتنی کرامات حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی معلوم ہوئی ہیں اتنی کسی اور ولی اللہ کی نہیں پہنچیں''۔ امام ذہبیؒ کے بیان سے دو باتیں ظاہر ہوئیں کہ کراماتِ اولیا تواتر سے ثابت ہیں۔ کراماتِ اولیا کا انکار وہی کر سکتا ہے جو جاہل ہو۔ ابن حجر نے 'فتاویٰ الحدیثیہ'، صفحہ ۲۱۴ پر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق فرمایا، اللہ تعالیٰ نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پر جو احسان فرمایا، اس کا اظہار ان کے معارف اور ان کی کرامات سے ہوتا ہے اور ان سے جو امور ظاہر ہوئے ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں یہ سب ان پر اللہ کا احسان ہے۔ ان کے یہ حالات تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ امام یافعیؒ نے شیخ کی کرامات کے متعلق 'کفایۃ المعتقد'، صفحہ نمبر ۲۹۵ پر فرمایا، بعض علما نے ذکر کیا کہ شیخ جیلانیؒ کی کرامات تواتر سے ہیں، میں کہتا ہوں ان کی کرامات کے وجود کا علم قطعی طور پر حاصل ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے ان کرامات کی خبر دینے والے راویوں کی کثرت ہے اور یہ کثرت حدِ تواتر تک پہنچتی ہے۔ حضرت امام ذہبیؒ، حضرت امام یافعیؒ، حضرت حافظ ابن حجر اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامات حدِ تواتر تک پہنچتی ہیں۔ ظاہر ہے جس کو علم سے ذرا سا مس ہے وہ متواترات کا انکار نہیں کر سکتا۔ علامہ شعرانیؒ نے 'اسنی المطالب فی احادیث المختلفۃ المراتب'، صفحہ ۲۶۱ پر حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جو قولِ فیصل ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں، "کرامتِ ولی کا انکار صرف ایک گدھا ہی کر سکتا ہے"۔ کرامت کے انکار میں معتزلہ سب سے پیش پیش ہیں۔ (معتزلہ اہل تشیع کا ایک فرقہ ہے) اس کے علاوہ تاریخ میں دو نام اور ملتے ہیں، ابن حزم اور ابواسحٰق اسفرائنی۔ ان کے خیال کی بنیاد اس بات پر ہے کہ

Scanned with CamScanner

اگر ولی سے کرامت صادر ہو تو نبیؑ کے معجزے اور ولی کی کرامت میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ابن خلدونؒ نے اپنے مقدموں میں صفحہ ۴۵۱ پر فرمایا۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے 'فیض الباری'، جلد دوم، صفحہ ۶۱ پر لکھا، ابن حزم کرامات کا منکر نہیں تھا اور 'کتاب النبوات' میں ابن تیمیہ نے بھی اس رائے کا اظہار کیا۔ ابن حزم نے کرامت کے انکار کے باوجود یہ کہا کہ میں دعا کی قبولیت کا قائل ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ جب قبولیتِ دعا خرقِ عادت کے طور پر ثابت ہوگئی تو یہی کرامت ہے پھر تنازعہ محض لفظی رہ گیا پھر انکار کا کیا فائدہ۔ یعنی حقیقتِ کرامت کا انکار ہے اور لفظِ کرامت کا انکار نہیں حالانکہ کرامت کے لیے یہ شرط تو نہیں کہ دعا کے بغیر ہی ظاہر ہو بلکہ دعا بھی اکثر بطور کرامت ہوتی ہے۔ صاحب کرامت ولی، اللہ سے ایک چیز کی درخواست کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس چیز کا ظہور ہوتا ہے۔ جیسے حضرت سلیمانؑ کے وزیر نے پہلے اللہ سے دعا کی اور پھر وہ تخت حاضر ہو گیا۔ علامہ ابو اسحاق اسفرائنی کے رد میں ابنِ خلدون کہتا ہے، یہ عقلی احتمال ہے کہ کرامت اور معجزے میں فرق کیا رہ جائے گا۔ عقلی بحثیں حقائق کو جھٹلا نہیں سکتیں۔ مشاہدات اور واقعات کے سامنے عقلی احتمال کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ ہزارہا صوفیا اور اولیا سے کراماتیں ظاہر ہوئیں، سلف صالحین، صحابہ کرامؓ سے کراماتیں ظاہر ہوئیں۔ ان مشاہدات کو کون شخص غلط ثابت کر سکتا ہے اگر کوئی شخص ایسی غلطی کرتا ہے تو حد درجہ ہٹ دھرمی، ضد، فساد اور عناد اس کی وجہ ہے، عقلی احتمالات نہیں۔ اس موقع پر معجزہ، کرامت، سحر اور کہانت میں فرق واضح کر دینا بھی معروف ہے۔ اسی ضمن میں عرض کرتا چلوں کہ مجھے حضرتؒ کی خدمت میں تقریباً ۲۵ سال کا تجربہ رہا اور بڑی عجیب بات ہے کہ ان ۲۵ سالوں میں، میں نے نوٹ کیا کہ جب کوئی ایسا کام آجاتا کہ ہم بے بس ہو جاتے یا جس میں ہم سمجھتے مشکل بن گئی ہے یعنی کوئی مصیبت ہے یا بیماری، یا کوئی اور دنیوی امور ہوتے تھے تو جب ہم اتنے بے بس ہو جاتے کہ کوئی چارہ نہیں رہتا تھا تب میں حضرتؒ سے عرض کیا کرتا تھا لیکن مجھے نہیں یاد کہ اس سارے عرصے میں حضرتؒ نے کبھی کوئی جواب بھی دیا ہو۔ جب بات عرض کی جاتی تو سن لیتے، متفکر ہو جاتے کہ چہرے پر ایک تفکر سا آجاتا، خاموش ہو جاتے اور تشریف لے جاتے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے فرمایا ہو کہ اللہ بہتر کرے گا، ٹھیک ہو جائے گا یا کوئی دعا فرمائی۔ بات سنتے، ان کے چہرے پہ وہ اثرات نظر آتے کہ آپؒ کو فکر لگ گئی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ کام اسی وقت درست ہو جاتا اور اگر کسی مصیبت میں ہمیں رہنا ہوتا تھا یعنی مصیبت میں ہی رکھنا اللہ کو منظور ہوتا تھا تو حضرتؒ سے بیان کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا لیکن جو بات بھی کی جاتی تھی کبھی حضرتؒ نے جواب نہیں دیا، نہ کہا دعا کریں گے، نہ کہا بہتر ہوگا لیکن وہ کام ہو جاتا تھا۔

آگے فرماتے ہیں کہ کرامت، شعبدہ اور استدراج میں کیا فرق ہے؟ تو استدراج ایسے عجیب وغریب کاموں کو کہتے ہیں جو کسی شیطانی عمل سے شیطان کر دیتا ہے۔ جو لوگ شیطان کی پوجا کرتے ہیں یا اس کی بات مانتے ہیں تو جو شیطان کے لیے ممکن ہوتا ہے وہ بھی عجیب وغریب حرکتیں کرتا ہے کہ ان کی کراماتیں مشہور ہوتی رہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اب کرامت، شعبدے اور استدراج میں فرق کو تفصیلاً دیکھتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

۱۔فرقِ فاعلی

نبی، پاکیزہ نفس، پاکیزہ صفات، پاکیزہ اخلاق ہوتا ہے، اس کے اعمال صالحہ ہوتے ہیں۔ مخلوق کا خیر خواہ، داعی الی اللہ، حق کی طرف رہنمائی کرنے والا، صادق القول، پاکیزہ تعلیم دینے والا، طالب آخرت، تارک الدنیا، ذکی الطبع اور عادل ہوتا ہے۔
جبکہ کاہن وساحر، خبیث النفس اور خبیث الصفات ہوتا ہے۔ اپنے فن سے مخلوق کو نقصان پہنچانے والا بداخلاق، بداعمال، جھوٹا، دنیا پرست ہوتا ہے، وہ حب جاہ، حب مال کا مریض ہوتا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ:

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ (الشعرأ:۲۲۱۔۲۲۲)

"کیا میں بتاؤں کہ شیطان کس پر نازل ہوتے ہیں؟ ہر جھوٹے اور گنہگار پر نازل ہوتے ہیں وہ ان کی باتوں پر کان لگاتے ہیں، اور ان میں اکثر جھوٹے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ جن کی خبروں کا ماخذ شیاطین ہوں جھوٹ کے بغیر اور بول ہی کیا سکتے ہیں۔ اور شیاطین سے اخذِ فیض کرنے والا، بدکار کے بغیر کون ہو سکتا ہے؟

۱۔فرقِ فاعلی:

فاعلی فرق یہ ہے کہ نبیؑ کا کردار ایمان سے لے کر عمل تک بہت صالح، دوسروں کی بھلائی چاہنے والا، آخرت کا طالب، دنیا اور دنیا کے رتبوں سے متنفر ہوتا ہے جبکہ جادوگر، کاہن وغیرہ بدکار، جھوٹے، بے دین، دولتِ دنیا کے طالب اور غلیظ رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ جادوگر، کاہن اور ساحر بداعمال، بداخلاق، جھوٹا، دنیا پرست، حبِّ جاہ کا طالب اور حبِّ مال کا مریض ہوتا ہے۔ یہ واضح فرق ہے نبیؑ اور جادوگر میں کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک روزِ روشن کی طرح ہے اور دوسرا اندھیری رات۔ قرآنِ حکیم میں بھی بیان ہوا ہے کہ شیطان ایسے لوگوں پر نازل ہوتے ہیں جو جھوٹے، گنہگار اور بدکار ہوں۔ وہ ان (شیاطین) کی باتیں سنتے ہیں حالانکہ شیاطین اکثر ان سے جھوٹ بولتے ہیں اور انہیں جھوٹی خبریں دیتے ہیں۔

۲۔فرقِ مادی

کاہن کے فن کا مدار القائے شیطانی اور امدادِ ارواحِ خبیثہ پر ہوتا ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہے۔
نبی کا معجزہ بلا سبب اور بلا کسب ہوتا ہے جیسا کہ یدِ بیضا اور عصائے موسیٰ علیہ السلام۔ ان کا سبب رب العالمین کی قدرت اور نبی کی طہارت و پاکیزگی تھی۔

۲۔فرقِ مادی

کاہن کے فن کا مدار القائے شیطانی اور ارواحِ خبیثہ پر ہوتا ہے۔ نبی کا معجزہ بلا کسب، بلا سبب ہوتا ہے۔ معجزے یا کرامت کے لیے کوئی مجاہدہ نہیں کیا جاتا۔ اس کا کوئی سبب نہیں ہوتا جیسا کہ ید بیضا اور عصائے موسیٰ کا سبب رب العالمین کی قدرت اور نبیؑ کی طہارت و پاکیزگی تھی یعنی حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی یا یدِ بیضاء، (کہ ان کا ہاتھ روشن ہو جاتا تھا) اس میں کسی کسب، محنت یا مجاہدے کا دخل نہیں تھا۔ وہ اللہ کی عطا تھی۔ یہ مادی فرق ہوتا ہے۔

۳۔فرق صوری

صورت ہمیشہ اپنے مادہ کے تحت ہوتی ہے۔ مادہ خبیث ہے تو صورت بھی خبیث، کہانت کا مادہ امداد و القائے شیطانی ہے، اس لیے صورت بھی خبیث ہوتی ہے۔ نبیؑ کے معجزہ کا مادہ، رب العالمین کی قدرت ہے تو صورت بھی پاکیزہ ہوتی ہے۔

۳۔فرقِ صوری

صورت ہمیشہ اپنے مادے کے تحت ہوتی ہے۔ مادہ خبیث ہے تو صورت بھی خبیث ہوگی۔ کہانت کا مادہ، امداد و القائے شیطانی ہے تو اس کی صورت بھی خبیث ہوتی ہے یعنی جو کہانت یا جادو وغیرہ سے نتائج نکلتے ہیں وہ کسی نہ کسی کو دکھ دینے کو ہوتے ہیں۔ نبیؑ کے معجزے کا مادہ رب العالمین کی قدرت ہے وہ صورت کے لحاظ سے بھی پاکیزہ ہوتی ہے یعنی کرامت یا معجزے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں اس میں مخلوق کی بہتری اور بھلائی ہوتی ہے۔

۴۔علتِ غائی

علتِ غائی ہمیشہ ظاہر امر کے تابع ہوتی ہے، جیسے فرعون اور آلِ فرعون کو غرق کر کے مصر کو کفر و شرک اور ظلم و تعدی سے پاک کرنا مقصود تھا اور بنی اسرائیل کو اس ظلم سے نجات دلا کر برتری اور فضیلت کے انعام سے نوازنا تھا۔ یہ اس معجزہ کی علتِ غائی تھی۔

۴۔علتِ غائی

علتِ غائی اس مقصد کو کہتے ہیں کہ جس کی وجہ سے کرامت ظاہر ہوئی یعنی وہ مقصد، کرامت کی علتِ غائی ہوتی ہے۔ جیسے ظالم، بدکار، جابر، متکبر فرعون اور اس کے ساتھیوں کو جو تباہی پھیلا رہے تھے غرق کر کے ان لوگوں کو نجات دلانا مقصود تھا جو مسکین اور مظلوم تھے۔ ظلم کا خاتمہ اور نیکی کو پھیلانا ہی اس معجزے کی علتِ غائی تھی۔

Scanned with CamScanner

۵۔ کہانت اور جادو

کہانت اور جادو موقوف ہے کسب واکتساب، تعلیم وتعلم اور ذاتی کوشش پر اور نبوت اور معجزہ میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔

i۔ کہانت اور جادو کا تعلق خرق عادت امور سے نہیں، ہاں امور عجیبہ اور غریبہ سے ہے۔ جس شخص نے یہ علم یا فن نہ سیکھا ہو اس کے لیے تو یہ امور عجیب بھی ہوں گے اور خرق عادت بھی، مگر جس دوسرے شخص یا جن اشخاص نے کہانت یا جادو کا فن سیکھ لیا اس کے لیے نہ یہ امور عجیبہ ہوں گے نہ خرق عادت ہوں گے۔

نبیؑ کے معجزہ کے مقابلے میں کوئی انسان یا جن اس پر قادر نہ ہوگا کہ ایسی بات کر سکے کیونکہ معجزہ کا تعلق کسب واکتساب سے نہیں بلکہ یہ تو وہبی ہوتا ہے۔

ii۔ جادو کے اثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جس پر جادو کیا گیا ہے اگر جادوگر اس سے توجہ ہٹا لے تو جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ معجزہ میں یہ بات نہیں۔

iii۔ جادوگر جب کسی کامل ہستی کے مقابلے میں آئے تو اس وقت صرف جادو کا اثر ہی زائل نہیں ہوتا بلکہ جادو کے تمام آلات بھی نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ساحرینِ فرعون کے ساتھ ہوا۔ ساحرین کے لیڈر نے اپنے ایمان لانے کی وجہ بتاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم ہمیشہ جادوگروں سے مقابلہ کرتے آئے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے، یہ منظر کہیں نہیں دیکھا کہ ہماری تمام رسیاں، سوٹیاں اور سارے آلات کو لاٹھی والا سانپ نگل گیا۔ اس کے باوجود پھر وہی چھ فٹ لاٹھی کی لاٹھی ہی رہی۔

iv۔ جادوگر کی غفلت سے جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ نبیؑ کے معجزہ کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ 'فیض الباری' میں مولانا رومی کی ''مثنوی'' سے ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک لڑکے نے اپنے والد سے سوال کیا کہ حضرت موسیٰؑ کے نبی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ والد نے کہا کہ جب حضرت موسیٰؑ سو رہے ہوں تو ان کا عصا لے لینا اگر وہ سانپ بن گیا تو معجزہ ہے ورنہ جادو۔

فَذَهَبَ إِلَيْهِ وَجَعَلَ يَجُرُّ عَصَاهُ فَانْقَلَبَ ثُعْبَانًا فَكَادَ الْغُلَامُ أَنْ يُهْلِكَ...

(فیض الباری، کتاب الأدب، باب قول اللہ۔۔ الخ، ۴:۳۹۱)

''لڑکا گیا۔ عصائے موسیٰ لے لیا، وہ سانپ بن گیا۔ قریب تھا کہ لڑکا ہلاک ہو جائے۔''

معجزہ، جادو اور کہانت میں جو فرق ہے، ہم نے اجمالی طور پر بیان کر دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

۵۔ کہانت اور جادو

کہانت اور جادو کی علتِ غائی کچھ اور ہوتی ہے۔ جادو اور کہانت جہاں بھی ہوتی ہے وہاں مقصد یہ نہیں ہوتا کہ نیکی پھیلائی جائے۔ وہاں کہیں پیسہ بٹورنا، کہیں دوسرے کو تکلیف دینا، پریشان کرنا یا اسے اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا مقصد ہوتا ہے یعنی اس کا اثر ہی الگ ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جادو اور کہانت سیکھنے پڑتے ہیں اور اس کے لیے بڑے مجاہدے کرنے پڑتے ہیں لیکن معجزے اور کرامت سیکھنے نہیں پڑتے یہ اللہ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں۔ ہاں جادو کا تعلق خرقِ عادت سے نہیں بلکہ امورِ عجیبہ سے ہے یعنی آپ ایک آدمی کو بجلی کا کرنٹ لگاتے ہیں تو اس کا بازو شل ہو جاتا ہے کوئی اس پر جادو کرتا ہے تو بھی بازو شل ہو جاتا ہے۔ تو جادو سے بازو کا شل ہو جانا ایک عجیب بات ہے لیکن خرقِ عادت نہیں ہے کیونکہ ویسا مادی طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر کوئی جادو کرتا ہے تو کسی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے دوسرا بندہ اسے اتنے زور سے ڈنڈا مارتا ہے کہ اس کے بعد وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ جادوگر، کاہن یا ساحر جادو سے کرتا ہے تو وہ طریقہ عجیب ہے خرقِ عادت نہیں کیونکہ عادتاً بھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اور جس شخص نے یہ فن نہ سیکھا ہو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ خرقِ عادت ہے مگر جادوگر کو یہ کام عجیب نہیں لگتے وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہو سکتا ہے۔

جو چیز نبیؑ سے بطورِ معجزہ یا ولی سے بطورِ کرامت صادر ہوتی ہے کوئی دوسرا اس طرح کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اگر ایک جادوگر کوئی عجیب کام کر سکتا ہے تو دس جادوگر بھی ایسا کر سکتے ہیں یا مادی طور پر بھی ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن کرامت اور معجزے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ جس نبیؑ سے جو معجزہ ظاہر ہوتا ہے وہ اس کے عہد میں نبیؑ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کوئی دوسرا مقابلے پر آ کر ویسا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ولی کی کرامت ظاہر ہوتی ہے تو ہر آدمی اٹھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں کیونکہ معجزہ اور کرامت کا تعلق سیکھنے سکھانے سے نہیں یہ اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ یہ وہبی ہے۔ جادو کے اثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جس پر جادو کیا گیا، جب جادوگر توجہ ہٹا لے تو اثر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر معجزے میں یہ بات نہیں۔ جادوگر جب کسی کامل ہستی کے مقابلے میں آیا تو اس وقت صرف جادو کا اثر ہی زائل نہیں ہوتا بلکہ جادو کے آلات ہی نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ زندہ ہستی تو بڑی دور کی بات ہے جہاں اولیا اللہ کے مقابر ہوتے ہیں، جہاں ان کا مدفن ہوتا ہے تو جادوگر اس سے میلوں دور رہتے ہیں قریب نہیں جاتے کیونکہ ان (جادوگروں) کے ساتھ شیاطین ہوتے ہیں جنہیں وہ مؤکل کہتے ہیں۔ مؤکل کیا ہے؟ مکلف مخلوق تو چار قسم کی ہے فرشتہ، جن، شیطان اور انسان، یہ پانچویں مخلوق کدھر سے آ گئی اس کا تو کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا۔ وہی شیاطین جو ان کے جادو کرنے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہوتے ہیں انہیں انہوں نے مؤکل کا نام دے رکھا ہے۔ یعنی وہ شیاطین جو عجیب و غریب حرکات کرنے سے ان کے ساتھ لگ جاتے ہیں مثلاً بعض قرآنی آیات کو الٹا سیدھا پڑھیں گے، ذبح کے وقت جو دمِ مسفوح نکلتا ہے اس سے قرآنی آیات لکھیں گے اور پیشاب سے قرآنی آیات لکھیں گے۔ یہ اہل اللہ کے قریب جانے سے بھی گھبراتے ہیں کہ وہاں انوارات ہوتے ہیں تو یہ مؤکلات بھاگ جاتے ہیں جیسا کہ ساحرینِ فرعون کے ساتھ ہوا۔ ساحرین کے لیڈر نے اپنے ایمان لانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ہم ہمیشہ جادوگروں کا مقابلہ کرتے آئے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر دوسرا جادوگر زیادہ طاقت ور ہے تو اس کے جادو کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر موسیٰ ؑ بھی جادوگر ہوتے تو ہمارے رسے لاٹھیاں اور لکڑیاں جو ہم نے اژدھا بنائی تھیں تو لوگوں کو اژدھا نظر آنا بند ہو جاتا، ان کا وجود تو باقی رہتا۔ یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ دوسرے کے وجود سے ان کا جادو بھی ختم ہو جائے۔ موسیٰ ؑ کے ہاتھ میں جو چھوٹی سی لاٹھی تھی وہ ساری رسیاں بھی کھا گئی، لکڑیاں بھی اور جب پکڑی تو لاٹھی تھی۔ تو یہ جادو نہیں ہے، یہ اللہ کا نبی ؑ ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔

جادوگر کسی پر جادو کرتا ہے تو پیچھے اس کی تائید بھی رکھنی پڑتی ہے۔ چھوڑ دے تو اثر ختم ہو جاتا ہے۔ نبی ؑ کے معجزے کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ 'فیض الباری' جلد ۴، صفحہ ۳۹۱ پر ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک لڑکے نے اپنے والد سے سوال کیا کہ حضرت موسیٰ ؑ کے نبی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو والد نے کہا کہ جب حضرت موسیٰ ؑ سو رہے ہوں تو ان کی لاٹھی لینا اگر وہ سانپ بن گئی پھر تو معجزہ ہے اور اگر لاٹھی کی لاٹھی رہے تو پھر جادو ہے کیونکہ جادوگر جب اس طرف متوجہ نہ ہو تو پھر اس کا جادو اثر نہیں کرتا۔ لڑکا گیا اس نے لاٹھی اٹھائی، وہ سانپ بن گئی۔ قریب تھا کہ اسے نگل جاتی تو وہ پھینک کر بھاگ گیا۔

معجزہ، کہانت اور جادو میں جو فرق ہے وہ ہم نے اجمالی طور پر بیان کر دیا ہے۔

۶۔ معجزہ اور کرامت میں فرق

ولی کی کرامت دراصل اس نبی ؐ کا معجزہ ہوتا ہے جس کا وہ متبع ہوتا ہے۔ جیسا کہ 'الیواقیت والجواہر' کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور جب کرامت کے صدور کے لیے نبی ؐ کا کامل اتباع شرط ہے تو کرامت ولی، معجزہ نبی ؑ کی فرع ٹھہری۔ اس لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر عجیب بات جو کسی سے ظاہر ہو، کرامت نہیں ہوا کرتی بلکہ کرامت کا اطلاق صرف اس خرقِ عادت امر پر ہوتا ہے جو کسی کامل متبع شریعت سے ظاہر ہو۔ معجزہ کا اظہار نبی ؑ کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح کرامت کا صادر ہونا ولی کے اختیار کی چیز نہیں، دونوں من جانب اللہ ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے انبیا اور اولیا کی برگزیدہ ہستیوں کو منتخب کر لیتا ہے۔

کرامت کی دو قسمیں ہیں:

اوّل معنوی، جسے اہلِ دانش و بینش سمجھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں اور یہی حقیقی کرامت ہے۔

اِعْلَمْ اَنَّ اَعْظَمَ الْكَرَامَاتِ وَ اَجَلَّهَا النَّبِيُّ لِلْاَوْلِيَاءِ دَوَامُ التَّوْفِيْقِ لِلطَّاعَاتِ وَ الْعِبَادَاتِ وَالْحِفْظِ مِنَ الْمَعَاصِيْ وَالْمُخَالِفَاتِ...

"خوب سمجھ لو کہ اولیا کی سب سے بڑی اور عظیم کرامت شریعت کا کامل اتباع اس پر استقامت، خلاف شرع امور سے بچ کر رہنا ہے۔"

ان کی یہ کرامت جب ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے تو اللہ کی مخلوق جو خدا سے دور ہو چکی ہوتی ہے، اس کی کشش سے اللہ کی یاد اور اللہ کی عبادت کی طرف کھنچی چلی آتی ہے اور ان کے دل میں یقین اور ایمان کی شمعیں روشن ہونے لگتی ہیں اور انہیں

Scanned with CamScanner

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا خیال آنے لگتا ہے۔ رذائل دور ہوتے ہیں اور فضائل کے حصول کا جذبہ اور شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ اولیاء اللہ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک ہستی نے بالکل نامساعد حالات میں دعوت الی اللہ کا کام کر کے ہزاروں بگڑے ہوئے لوگوں کو اللہ کا بندہ بنا دیا۔ عوام تک ہی محدود نہیں، ان بے نوا فقیروں نے بیسیوں شاہانِ وقت کو راہ ہدایت پر لگا دیا۔

دوسری قسم کی کرامت حسی ہے، یہ عوام کے ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔ چونکہ ان کی ذہنی سطح پست ہوتی ہے، اس لیے معنوی کرامت کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے اور ان کی نگاہیں حسیات اور مادیات میں ہی اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں دس برس رہا۔ آخر مایوسی کی کیفیت کے ساتھ واپس ہونے لگا۔ آپ نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا، بڑی شہرت سنی تھی کہ جنید بڑا ولی اللہ ہے مگر دس برس میں ایک کرامت بھی نہیں دیکھی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ اس عرصے میں جنید کا کوئی کام ایسا بھی دیکھا جو سنت نبوی ﷺ کے خلاف ہو؟ کہنے لگا ایسا تو نہیں۔ فرمایا، یہی سب سے بڑی اور حقیقی کرامت ہے۔

کرامت کے سلسلے میں ایک سوال بعض نابالغ ذہنوں میں ابھرتا ہے اور زبان پر آتا ہے کہ جب ولی کی کرامت اپنے اختیار میں نہیں ہوتی تو کشفِ قبور بھی اپنے بس کی بات نہیں کیونکہ کشف بھی تو کرامت ہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ تمام مخلوقات کا مالک اور مختار کل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انسان ہی کو دیکھیے، اسے پیدا کرنا وجود بخشنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ ایک آلہ ہے، آنکھیں دینا اور ان میں بینائی پیدا کرنا صرف اسی کے اختیار میں ہے پھر دیکھنے کی قدرت دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ آنکھ کو دیکھنے کے لیے استعمال کرنا انسان کا کام ہے۔ جب آنکھیں کھلی ہیں ان میں بینائی بھی ہے تو ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو نظر بھی آئے گی۔ ہاں، اس چیز اور آنکھ کے درمیان کوئی پردہ حائل ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھ کھلی بھی ہو، اس میں بینائی بھی ہو اور وہ دیکھے نہیں۔ اسی طرح جب دل کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے اور حجاب اٹھ جاتا ہے تو لطیف چیزیں ملائکہ، جن، عذاب وثوابِ قبر، جنت دوزخ اجمالی طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو اصول بصارت کے لیے مقرر فرمایا ہے وہی اصول بصیرت کے دائرے میں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح سر کی آنکھ جس میں بصارت ہے، دیکھنے کے لیے اس وقت تک آزاد ہے، جب تک عارضی طور پر کسی حکمت کے تحت اسے کسی چیز کے دیکھنے سے روک نہ دیا جائے اسی طرح دل کی آنکھ جس میں بصیرت ہے وہ لطیف اشیاء کو دیکھنے کے لیے آزاد ہے جب تک عارضی طور پر، کسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ کوئی پردہ حائل نہ کر دے۔

کسی کامل شیخ کی رہنمائی میں اللہ کے ذکر کی کثرت سے جب دل کی آنکھ وا ہو جاتی ہے تو کشف یا الہام و وجدان جیسی نعمتیں مل جایا کرتی ہیں۔ کشف و الہام تک حواس و عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس لیے ان کا انکار بھی کر دیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ابن خلدون نے اس سلسلے میں پتے کی بات کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"کشف و علم مغیبات کا مسئلہ آیات متشابہات کی مانند ہے کہ مطلب نہیں کھلتا اور صوفیا کے ذوق و وجدان پر اس کی بناء ہے۔ جس کو ان صوفیا جیسا ذوق نہیں وہ ان کے کلمات کو کیا حل کر سکتا ہے۔ واضع لغت نے ان کشفیات اور وجدانیات صوفیا کے لیے کوئی الفاظ وضع نہیں کیے کہ ان سے ان کے کلام کی عقدہ کشائی کی جائے۔ چونکہ اہل لغت وغیرہ ان معانی کے لیے الفاظ وضع کرتے ہیں جو حواسِ ظاہری سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ صوفیا کے امور باطنی کے لیے الفاظ وضع ہی نہیں کیے گئے۔ اب جو شخص ان کے رنگ میں رنگین ہو کر ان کے کلام کو شریعت کی روشنی میں حل کرے تو اس شخص کی خوش بختی ہے اور سب سے اعلیٰ بات یہ ہے کہ صوفیا کے اس کلام کی گتھی سلجھانے کی کوشش ہی نہ کی جائے جو علمائے ظواہر کے فہم سے بالاتر ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون، ۲: ۴۷۳)

ملا علی قاری نے ٹھیک فرمایا کہ جس نعمت سے انسان محروم ہوتا ہے، اس کا انکار ہی کر دیتا ہے۔ اب ہم چند اولیاء اللہ کی کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔ صحابہؓ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ صحابیت وہ شرف ہے کہ اس کے مقابلے میں ولایت کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ (ایضاً)

۶۔ معجزہ اور کرامت میں فرق

ولی کی کرامت دراصل اس نبی کا معجزہ ہوتا ہے جس کا وہ تبع ہوتا ہے۔ جیسا کہ "الیواقیت والجواہر" کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور جب کرامت کے صدور کے لیے نبی کی کامل اتباع شرط ہے تو کرامتِ ولی، معجزۂ نبیؑ کی فرع ٹھہری۔ اس لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر عجیب بات جو کسی سے ظاہر ہو، کرامت نہیں ہوا کرتی بلکہ کرامت کا اطلاق صرف اس خرقِ عادت امر پر ہوتا ہے جو کسی کامل تبع شریعت سے ظاہر ہو۔ معجزہ کا اظہار نبیؑ کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح کرامت کا صادر ہونا ولی کے اختیار کی چیز نہیں دونوں من جانب اللہ ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے انبیا اور اولیا کی برگزیدہ ہستیوں کو منتخب کر لیتا ہے۔

کرامت کی دو قسمیں ہیں:

اول معنوی، جسے اہل دانش و بینش سمجھتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں، اور یہی حقیقی کرامت ہے۔

اِعْلَمْ اَنَّ اَعْظَمَ الْكَرَامَاتِ وَاَجَلَّهَا النَّبِيُّ لِلْاَوْلِيَاءِ دَوَامُ التَّوْفِيْقِ لِلطَّاعَاتِ وَالْعِبَادَاتِ وَالْحِفْظِ مِنَ الْمَعَاصِي وَالْمُخَالِفَاتِ...

"خوب سمجھ لو کہ اولیا کی سب سے بڑی اور عظیم کرامت شریعت کی کامل اتباع، اس پر استقامت، خلاف شرع امور سے بچ کر رہنا ہے۔"

یعنی پہلی ایک قسم کرامتِ معنوی ہے جسے صاحب شعور لوگ سمجھتے ہیں۔ شریعت پر عمل کرنے میں استقامت اور

Scanned with CamScanner

خلاف شرع امور سے بچنا یہ معنوی کرامت ہے۔ اس میں بظاہر عجیب بات نہیں ہوتی لیکن یہ بہت عظیم بات ہوتی ہے کیونکہ اس طرح رہنا آسان نہیں۔ نفس سے جہاد کو اس لیے جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔ یہ معنوی کرامت ہے کہ کسی وجود کی برکت سے بے شمار لوگوں کو ہدایت نصیب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ عام آدمی اسے کرامت نہیں سمجھتا حالانکہ یہی حقیقی کرامت ہے۔

ان کی یہ کرامت جب ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے تو اللہ کی مخلوق جو اللہ سے دور ہو چکی ہوتی ہے اس کی کشش سے اللہ کی یاد اور اللہ کی عبادت کی طرف کھنچی چلی آتی ہے اور ان کے دل میں یقین اور ایمان کی شمعیں روشن ہونے لگتی ہیں اور انہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا خیال آنے لگتا ہے، رذائل دور ہوتے ہیں اور فضائل کے حصول کا جذبہ اور شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ اولیاء اللہ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک ہستی نے بالکل نامساعد حالات میں دعوت الی اللہ کا کام کر کے ہزاروں بگڑے ہوئے لوگوں کو اللہ کا بندہ بنا دیا۔ عوام تک ہی محدود نہیں، ان بے نوا فقیروں نے بیسیوں شاہان وقت کو راہ ہدایت پر لگا دیا۔

دوسری قسم، کرامتِ حسی ہے۔ یہ عوام کے ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔ چونکہ ان کی ذہنی سطح پست ہوتی ہے، اس لیے معنوی کرامت کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے اور ان کی نگاہیں حسیات اور مادیات میں ہی اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں دس برس رہا، آخر مایوسی کی کیفیت کے ساتھ واپس ہونے لگا، آپ نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا بڑی شہرت سنی تھی کہ جنید بڑا ولی اللہ ہے مگر دس برس میں ایک کرامت بھی نہیں دیکھی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس عرصے میں جنید کا کوئی کام ایسا بھی دیکھا جو سنت نبوی ﷺ کے خلاف ہو؟ کہنے لگا ایسا تو نہیں۔ فرمایا، یہی سب سے بڑی اور حقیقی کرامت ہے۔

کرامت کے سلسلے میں ایک سوال بعض نابالغ ذہنوں میں ابھرتا ہے اور زبان پر آتا ہے کہ جب ولی کی کرامت اپنے اختیار میں نہیں ہوتی تو کشفِ قبور بھی اپنے بس کی بات نہیں کیونکہ کشف بھی تو کرامت ہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ تمام مخلوقات کا مالک اور مختارِ کُل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ انسان ہی کو دیکھیے اسے پیدا کرنا، وجود بخشنا اللہ کے اختیار میں ہے، دیکھنے کے لیے آنکھیں ایک آلہ ہے، آنکھیں دینا اور ان میں بینائی پیدا کرنا صرف اسی کے اختیار میں ہے پھر دیکھنے کی قدرت دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ آنکھ کو دیکھنے کے لیے استعمال کرنا انسان کا کام ہے۔ جب آنکھیں کھلی ہیں ان میں بینائی بھی ہے تو ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو نظر بھی آئے گی، ہاں، اس چیز اور آنکھ کے درمیان کوئی پردہ حائل ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھ کھلی بھی ہو اس میں بینائی بھی ہو اور وہ دیکھے نہیں۔ اسی طرح جب دل کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے اور حجاب اٹھ جاتا ہے تو لطیف چیزیں ملائکہ، جن، عذاب و ثواب قبر، جنت و دوزخ اجمالی طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو اصول بصارت کے لیے مقرر فرمایا ہے وہی اصول بصیرت کے دائرے میں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح سر کی آنکھ جس میں بصارت، دیکھنے کے لیے آزاد ہے جب تک عارضی طور پر کسی حکمت کے تحت کسی چیز کے دیکھنے سے روک نہ دیا جائے۔ اسی طرح دل کی آنکھ جس میں بصیرت ہے وہ لطیف

Scanned with CamScanner

اشیاء کو دیکھنے کے لیے آزاد ہے جب تک عارضی طور پر کسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ کوئی پردہ حائل نہ کر دے۔

کسی کامل شیخ کی رہنمائی میں اللہ کے ذکر کی کثرت سے جب دل کی آنکھ وا ہو جاتی ہے تو کشف یا الہام و وجدان جیسی نعمتیں مل جایا کرتی ہیں۔ کشف و الہام تک حواس و عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس لیے ان کا انکار بھی کر دیا جاتا ہے۔

ابن خلدون نے اس سلسلے میں پتے کی بات کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"کشف و علم مغیبات کا مسئلہ آیات متشابہات کی مانند ہے کہ مطلب نہیں کھلتا اور صوفیا کے ذوق و وجدان پر اس کی بناء ہے۔ جس کو ان صوفیا جیسا ذوق نہیں وہ ان کے کلمات کو کیا حل کر سکتا ہے۔ واضع لغت نے ان کشفیات اور وجدانیاتِ صوفیا کے لیے کوئی الفاظ وضع نہیں کیے کہ ان سے ان کے کلام کی عقدہ کشائی کی جائے۔ چونکہ اہل لغت وغیرہ ان معانی کے لیے الفاظ وضع کرتے ہیں جو حواسِ ظاہری سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ صوفیا کے امور باطنی کے لیے الفاظ وضع ہی نہیں کیے گئے۔ اب جو شخص ان کے رنگ میں رنگین ہو کر ان کے کلام کو شریعت کی روشنی میں حل کرے تو اس شخص کی خوش بختی ہے اور سب سے اعلیٰ بات یہ ہے کہ صوفیا کے اس کلام کی گتھی سلجھانے کی کوشش ہی نہ کی جائے جو علمائے ظواہر کے فہم سے بالاتر ہے۔"

ملا علی قاری نے ٹھیک فرمایا کہ جس نعمت سے انسان محروم ہوتا ہے، اس کا انکار ہی کر دیتا ہے۔ اب ہم چند اولیا اللہ کی کرامات کا ذکر کرتے ہیں، صحابہؓ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ صحابیت وہ شرف ہے کہ اس کے مقابلے میں ولایت کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

ا۔ المرشدی

اصل نام محمد بن عبد اللہ بن ابی المجد ابراہیم ہے، المرشدی کے نام سے مشہور تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد یمن کے علاقہ میں مرشدی نام کی ایک بستی میں مقیم ہو گئے۔ یہ بستی ریگستانی علاقے میں ایسے موقع پر آباد تھی جو حاجیوں اور عام قافلوں کی گزرگاہ تھی۔ علامہ ابن حجر محدث کبیر حافظ العصر نے 'درکامنہ' میں لکھا ہے کہ:

قَرْيَةٌ صَغِيْرَةٌ فِي طَرِيْقِ الرَّمْلِ... (درکامنہ، ۴: ۸۳)

"ریگستانی راستہ پر چھوٹی سی بستی ہے۔"

انہی کی زبانی ان کے گھر کی حالت بھی سن لیجیے۔

لَيْسَ لَهُ خَادِمٌ وَلَا عُرِفَ لَهُ طَبَاخَةٌ وَلَا قِدْرٌ وَلَا مِغْرَفَةٌ وَلَا مُوْقِدُ نَارٍ... (ایضًا)

"ان کا نہ کوئی خادم تھا نہ کھانا پکانے والی کوئی عورت تھی، نہ ہانڈی تھی نہ چمچہ، نہ کوئی آگ جلانے والا تھا۔"

اس سے زیادہ بے سروسامانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اب "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" کے چند مناظر ملاحظہ ہوں:

Scanned with CamScanner

كَانَتْ لَهُ أَحْوَالٌ وَهِمَّةٌ وَهِمَّةٌ فِي خِدْمَةِ النَّاسِ وَضِيَافَتِهِمْ بِحَيْثُ يُطْعِمُ كُلَّ مَنْ مَرَّ بِهِ صَغِيْرٌ وَكَبِيْرٌ وَقَلِيْلٌ وَكَثِيْرٌ...(ایضاً:۸۲)

"لوگوں کی خدمت اور مہمان نوازی ان کا خاص وصف تھا۔ ان کا طریقہ تھا کہ جو وہاں سے گزرتا، چھوٹا ہو یا بڑا، کم آدمی ہوں یا زیادہ سب کو کھانا کھلاتے تھے۔"

۲۔ امام یافعیؒ نے اپنے چشم دید حالات بیان کیے ہیں کہ ایک چھوٹا سا حجرہ تھا، جب کوئی مسافر آتا، آپ اکیلے اس کمرے میں جاتے اور چند منٹوں کے بعد اس کے مزاج اور خواہش کے مطابق کھانا لا کر حاضر کر دیتے۔ (مراۃ الجنان، ۴: ۲۲۲)

يَأْتِيهِ الْأُمَرَاءُ وَالْوُزَرَاءُ غَيْرُهُمْ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا لَوِ اجْتَمَعَ عِنْدَهُ أَكْثَرُ عَسْكَرٍ فِي الْوَرٰى لَعَجَّلَ إِلَيْهِمْ فِي الْحَالِ مَا أَحَبَّ مِنَ الْقِرٰى...

"ان کے پاس دنیادار امراء وزراء تک آتے، اگر ان کے پاس مخلوق کے لشکر ہی آجاتے تو فوراً ان کا من بھاتا کھانا حاضر کر دیتے تھے۔"

۳۔ حافظ ابن حجر نے 'درر کامنہ'، ۱: ۴۸۶ پر بیان کیا ہے کہ مصر میں 'بکتمر الساقی' کے نام سے ایک بہت بڑا امیر تھا، جس کے پاس ایک لاکھ غلام تھے۔ اس کے گھوڑوں کا اصطبل ۹۵ لاکھ اشرفیوں سے تیار ہوا تھا اور گھوڑوں کی خدمت کے لیے ایک سو سائس مقرر تھے۔ یہ امیر اپنے خادموں اور غلاموں کے ہمراہ شیخ المرشدی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور شیخ ان سب کو کھانا کھلاتے تھے اور کھانا بھی معمولی نہیں ہوتا تھا بلکہ حافظ نے لکھا ہے:۔

كَانَ يَخْرُجُ لِلْحَاضِرِيْنَ الْأَطْعِمَةَ الْفَاخِرَةَ...
لَا يُوْجَدُ إِلَّا فِي الْقَاهِرَةِ أَوْ دِمَشْقَ (ایضاً: ۸۳)

"حاضرین کے لیے اس اعلیٰ قسم کا کھانا پیش کرتے تھے جو قاہرہ، دمشق جیسے بڑے شہروں کے بغیر کہیں نہیں مل سکتا تھا۔" اس پر طرہ یہ کہ:

يُقَدِّمُ لِكُلِّ أَحَدٍ مَا يَقَعُ فِي خَاطِرِهِ...

"ہر شخص کو اس کی ذاتی پسند کے مطابق کھانا ملتا تھا۔"

اس سلسلے میں امام یافعیؒ نے 'مراۃ الجنان' میں اپنا واقعہ بیان کیا ہے۔

كَانَ فِي نَفْسِي شَهْوَةُ طَعَامٍ مَخْصُوْصٍ مَا كُنْتُ ذُقْتُهُ فِي جَمِيْعِ عُمْرِي أَحْضَرَهُ فِي ذٰلِكَ السِّمَاطِ...(مراۃ الجنان، ۲: ۲۹۳)

"مدت سے میرے دل میں ایک خاص قسم کے کھانے کی خواہش تھی اور عمر بھر وہ مجھے میسر نہ آیا تھا۔

Scanned with CamScanner

الرشدی نے وہ کھانا اپنے دسترخوان پر مجھے پیش کیا۔"

۴۔ ایک دفعہ الرشدی حج کے لیے تشریف لے گئے۔ شیخ نے اعلان کیا کہ پورے قافلے کے آنے جانے کا خرچ میرے ذمے ہوگا۔ اس کا نقشہ امام یافعیؒ نے یوں پیش کیا۔

يُنْفِقُ كُلَّ لَيْلَةٍ عَلَيْهِمْ تَارَةً أَلْفًا وَتَارَةً أَكْثَرَ وَأَنْفَقَ فِي ثَلَاثِ لَيَالٍ مَا قِيمَتُهُ أَلْفُ دِينَارٍ وَفِي خَمْسِ لَيَالٍ أُخْرَى) مَا قِيمَتُهُ نَحْوَ الْخَمْسَةِ وَعِشْرِينَ أَلْفًا ... (درکامنہ، ۴:۸۲)

"ایک رات کبھی ایک ہزار اور کبھی اس سے زائد خرچ اٹھتا تھا، تین رات کا خرچ ایک ہزار اشرفی اور بعد کی پانچ راتوں میں پچیس ہزار اشرفیاں خرچ کیں۔"

اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ کھانا پکانے کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر ہو، سو اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ نہ کوئی خادم نہ بیوی نہ ہانڈی نہ چمچہ بلکہ آگ تک نہیں جلائی جاتی تھی۔ دوسری یہ کہ کوئی بڑا خزانہ پاس ہو جس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو ممکن ہے کہ لوگ نذرانہ پیش کرتے ہوں۔ ان دونوں باتوں کے متعلق دو بیان ملاحظہ ہوں۔

۱۔ لَمْ يَكُنْ يَقْبَلُ لِأَحَدٍ شَيْئًا ۔۔۔ (درکامنہ، ۴:۸۲) "کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے تھے۔"

۲۔ وَكَانَ يَخْدِمُ الْوَارِدِينَ بِنَفْسِهِ ... وَلَا يَدْخُلُهَا أَحَدٌ غَيْرَهُ ... وَغَابَ هُنَيْئَةً وَأَحْضَرَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ مَا اقْتَرَحَ ... (ایضاً)

"مسافروں کی خدمت خود ہی کرتے تھے، اس کمرے میں ان کے سوا کوئی داخل نہ ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اندر جاتے اور ہر آدمی کی خواہش کے مطابق کھانا حاضر کر دیتے تھے۔"

ان دو مادی اسباب کے بغیر کوئی تیسری صورت باقی نہیں رہ جاتی مگر علامہ ابن تیمیہ نے ایک اور احتمال پیش کیا ہے۔ شیخ الرشدی، علامہ موصوف کے ہم عصر تھے۔ جب شیخ کے حالات سنے تو کہنے لگے کہ جنات یہ کھانے لاتے ہوں گے۔ خدا جانے علامہ موصوف کو یہ کیوں نہ سوجھی کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور اس نے اعلان کیا ہے کہ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ... اور اس نے حضرت عیسیٰؑ کے لیے روٹیاں آسمان سے نازل کر دی تھیں اور حضرت مریم کو بے موسم کے پھل بغیر کسی ظاہری واسطہ کے پہنچاتا تھا۔ علامہ کے اس عقلی احتمال کی خود انہی کا ایک قول تردید کر رہا ہے۔ 'کتاب النبوات' میں لکھتے ہیں:

مَنْ يَكُونُ إِخْبَارُهُ عَنْ شَيَاطِينٍ تُخْبِرُهُ لَا يُكَاشِفُ أَهْلَ الْإِيمَانِ وَالتَّوْحِيدِ وَ أَهْلَ الْقُلُوبِ الْمُنَوَّرَةِ بِنُورِ اللهِ بَلْ يَهْرِبُ مِنْهُمْ وَ يَعْتَرِفُ أَنَّهُ لَا يُكَاشِفُ هٰؤُلَاءِ وَ أَمْثَالَهُمْ ... فَأَهْلُ الْإِخْلَاصِ وَالْإِيمَانِ لَا سُلْطَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ وَلِهٰذَا يَهْرُبُونَ ... (کتاب النبوات، ۲۶۴، ۲۶۵)

"جن لوگوں کو شیاطین الجن خبریں پہنچایا کرتے ہیں، ان کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ ارباب ایمان، اصحاب توحید اور روشن ضمیر لوگ جن کے دل انوار خداوندی سے منور ہوں، شیاطین الجن ان سے دور بھاگتے ہیں۔ ان کے دل کی باتوں

Scanned with CamScanner

سے شیاطین واقف نہیں ہو سکتے، اہل ایمان اور مخلص لوگوں پر شیاطین غالب نہیں آسکتے بلکہ ان سے بھاگتے ہیں"۔

ظاہر ہے کہ جب اولیا اللہ سے شیاطین الجن دور بھاگتے ہیں اور ان کے دل کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے تو ان کی خدمت کیونکر کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شیخ موصوف میں ان اوصاف کا پایا جانا ثابت ہے۔ امام یافعی 'مراۃ الجنان' میں لکھتے ہیں:۔

اَلشَّیْخُ الْکَبِیْرُ الْوَلِیُّ الشَّھِیْرُ ذُوالْعَجَائِبِ الْعَظِیْمَۃِ وَالْکَرَامَاتِ الْکَرِیْمَۃِ وَ الْھِمَمِ الْعَالِیَۃِ وَ الشَّمَائِلِ الرَّضِیَّۃِ وَ الْمُکَاشِفَاتِ الْجلیلَۃِ وَ الْاٰیَاتِ الْبَاھِرَۃِ وَالْاَنْوَارِ الظَّاھِرَۃ۔۔۔(مراۃ الجنان، ۲۹۲، ۲۹۳)

"شیخ کبیر، مشہور ولی اللہ، عظیم عجائبات کے مالک، بڑی بڑی کرامات والے، عالی ہمت، اعلیٰ اوصاف کے مالک، بڑے بڑے مکاشفات اور واضح انوار اور بڑی کرامات کے مالک تھے۔"

امام ذہبی کی زبانی الرشدی کے حالات سنیے حالانکہ امام ذہبی صوفیا کے سخت مخالف تھے۔ علامہ ابن حجر نے 'دُرکامنہ' میں امام ذہبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:۔

وَ کَانَ یَتَکَلَّمُ عَلَی الْخَوَاطِرِ وَ کَانَ قَلِیْلَ الدَّعْوٰی عَظِیْمَ الشَّطْحِ حَسَنَ الْمُعْتَقَدِ۔۔۔(الدر الکامنۃ، ۴:۸۳)

"لوگوں کے دلوں کا حال بتایا کرتے تھے، بڑائی کا دعویٰ نہ تھا اور اچھے عقیدے کے مالک تھے"۔

معلوم ہوا کہ شیخ الرشدی ان اوصاف کے مالک تھے جن کے پاس شیاطین الجن بار نہیں پا سکتے تھے، چنانچہ امام یافعیؒ نے علامہ کے جواب میں لکھا ہے:

فَاِنَّ الْجَانَّ لَیْسَ لَھُمْ اِطِّلَاعٌ عَلٰی بَوَاطِنِ الْعِبَادِ ۔ وَ مَا یَخْطُرَ فِیْ بَوَاطِنِھِمْ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ سُوْءِ الْاِعْتِقَادِ۔۔۔(مراۃ الجنان، ۴:۲۹۵)

"جنوں کو لوگوں کے دلوں کے حال معلوم نہیں ہو سکتے نہ ان کے باطن سے وہ واقف ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بداعتقادی سے پناہ میں رکھے"۔

لہٰذا علامہ ابن تیمیہ کا احتمال عقلی ان کے اپنے بیان کردہ قانون کے مطابق غلط ثابت ہوا۔ جہاں تک دل کے منور ہونے کا تعلق ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص کے لطائف منور ہو کر راسخ ہو جائیں پھر مراقبات ثلاثہ راسخ ہو جائیں تو جنات اس پر قابو نہیں پا سکتے اور شیاطین اس سے بھاگتے ہیں۔ اس وقت عارف کا سینہ آسمان کی مانند ہو جاتا ہے اور لطائف کے انوار ستاروں کی مانند ہو جاتے ہیں تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ۔۔۔ بنایا ہے، اسی طرح اللہ کے ذکر سے جب سینہ عارف منور ہو جاتا ہے تو شیاطین اور جن اس سے بھاگتے ہیں۔ پھر الرشدی جیسے عارف کامل کے

Scanned with CamScanner

پاس جن آئیں اور لوگوں کی دلی خواہش کے مطابق کھانے لائیں بھلا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اس لیے یہ جنوں کی کارروائی نہیں، بلکہ شیخ کی کرامت ہے۔

آخر میں ایک اور واقعہ بھی بیان کر دیتے ہیں کہ المرشدی کے پاس مصر کا بادشاہ الناصر آیا کرتا تھا، علامہ عبدالرؤف مناوی اور ابن بطوطہ نے اسے چشم دید واقعہ کے طور پر لکھا ہے۔

ا۔ المرشدی

اصل نام محمد بن عبداللہ بن ابی محمد ابراہیم ہے۔ المرشدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ علومِ ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد یمن کے علاقے میں المرشدی نام کی ایک بستی میں مقیم ہو گئے اس لیے انہیں مرشدی کہتے تھے۔ یہ بستی ریگستانی علاقے میں ایسے موقع پر آباد تھی جو حاجیوں اور عام قافلوں کی گزرگاہ تھی۔ علامہ ابن حجر محدثِ کبیر، حافظ العصر نے 'درر کامنہ' میں لکھا ہے، "ریگستانی راستے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے"۔ انہی کی زبانی اُن (المرشدی) کے گھر کے حالات بھی سن لیجیے۔ "ان کا نہ کوئی خادم تھا نہ کھانا پکانے والی کوئی عورت تھی نہ ہانڈی تھی نہ چمچہ نہ کوئی آگ جلانے والا تھا"۔ اس سے زیادہ بے سروسامانی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اب وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ... الخ (الطلاق:۲۔۳) کے چند مناظر ملاحظہ ہوں۔ 'درر کامنہ' صفحہ ۸۲ پر ہے کہ لوگوں کی خدمت اور ان کی مہمان نوازی ان کا خاص وصف تھا۔ ان کا طریقہ تھا کہ جو وہاں سے گزرتا، چھوٹا ہو یا بڑا، کم آدمی ہوں یا زیادہ، سب کو کھانا کھلاتے تھے۔ یہ ان کی کرامت تھی کہ گھر میں کھانے پینے کا سامان کیا برتن تک نہیں تھے لیکن ہر آنے جانے والے کو، زیادہ آدمی ہوں یا کم، کھانا کھلاتے تھے۔ امام یافعیؒ نے اپنے چشم دید حالات بیان کیے کہ چھوٹا سا حجرہ تھا جب کوئی مسافر آتا تو آپ اکیلے حجرے میں جاتے اور چند منٹوں بعد اس کے مزاج اور خواہش کے مطابق کھانا لا کر سامنے رکھ دیتے۔ ان کے پاس دنیادار، امراء، وزراء تک آتے۔ اگر ان کے پاس مخلوق کے لشکر بھی آجاتے تو فوراً ان کا پسندیدہ کھانا حاضر کر دیتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے 'درر کامنہ' جلد ا، صفحہ ۴۸۶ پر بیان کیا ہے کہ مصر میں بکتمر السباقی کے نام کا ایک بہت بڑا امیر تھا۔ اس کے پاس ایک لاکھ غلام تھے۔ اس کے گھوڑوں کا اصطبل ۹۵ لاکھ اشرفیوں سے تیار ہوا تھا اور گھوڑوں کی خدمت کے لیے ۱۰۰ سائیس تھے۔ یہ امیر اپنے خادموں اور غلاموں کے ہمراہ شیخ المرشدی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور شیخ ان سب کو کھانا کھلاتے تھے۔ کھانا بھی معمولی نہیں ہوتا تھا بلکہ حافظ نے لکھا ہے کہ حاضرین کے لیے ایسا اعلیٰ قسم کا کھانا پیش کرتے تھے جو قاہرہ یا دمشق جیسے بڑے شہروں کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہر شخص کو اس کی ذاتی پسند کے مطابق کھانا ملتا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت امام یافعیؒ نے 'مراۃ الجنان' جلد ۲، صفحہ ۲۹۳ پر اپنا واقعہ لکھا ہے کہ مدت سے میرے دل میں ایک خاص قسم کے کھانے کی خواہش تھی اور عمر بھر مجھے وہ میسر نہ آیا، المرشدی نے وہ کھانا اپنے دسترخوان پر مجھے پیش کیا۔ ایک دفعہ المرشدی حج کے لیے تشریف لے گئے، شیخ نے اعلان کیا کہ پورے قافلے کے آنے جانے کا

Scanned with CamScanner

خرچ میرے ذمہ ہوگا۔ اس کا نقشہ امام یافعیؒ نے 'مراۃ الجنان' میں یوں پیش کیا ہے، ایک رات کبھی ایک ہزار کبھی اس سے زائد خرچ اٹھتا تھا۔ تین رات کا خرچ ایک ہزار اشرفی اور بعد کی پانچ راتوں میں ۲۵ ہزار اشرفیاں خرچ کیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں اول یہ کہ کھانا پکانے کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا۔ اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ نہ کوئی خادم، نہ بیوی، نہ ہانڈی، نہ چمچہ بلکہ آگ نہیں جلائی جاتی تھی۔ دوسری یہ کہ نہ کوئی بڑا خزانہ پاس جس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو ممکن ہے لوگ نذرانہ پیش کرتے ہوں۔ ان دونوں باتوں کے متعلق دو بیان میں عرض کروں۔ کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ مسافروں کی خدمت خود کرتے تھے اس کمرے میں ان کے سوا کوئی داخل نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اندر جاتے اور ہر آدمی کی خواہش کے مطابق کھانا حاضر کر دیتے۔ ان دو مادی اسباب کے بغیر کوئی تیسری صورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن علامہ ابن تیمیہ نے ایک اور احتمال پیش کیا، شیخ المرشدی علامہ موصوف کے ہم عصر تھے۔ جب شیخ کے حالات سنے تو کہنے لگے جنات یہ کھانے لاتے ہوں گے۔ اللہ جانے علامہ موصوف کو یہ کیوں نہ سوجھی کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے اور اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ... کہ "ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا" اور اس نے حضرت عیسیٰ کے لیے آسمان سے روٹی نازل کر دی تھی۔ حضرت مریمؑ کو بے موسم کے پھل بغیر کسی ظاہری واسطے کے پہنچا دیتا تھا۔ علامہ کے اس عقلی احتمال کی خود انہی کا ایک قول تردید کر رہا ہے 'کتاب النبوات' صفحہ ۲۶۴۔۲۶۵ پر خود علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "جن لوگوں کو شیاطین اور جن خبریں پہنچایا کرتے تھے ان کے متعلق معلوم ہونا چاہیے کہ ارباب ایمان، اصحاب توحید اور روشن ضمیر لوگ جن کے دل انوار خداوندی سے منور ہوں، شیاطین اور جن ان سے دور بھاگتے ہیں۔ اور ان کے دل کی باتوں سے شیاطین واقف نہیں ہو سکتے۔ اہلِ ایمان اور مخلص لوگوں پر شیاطین غالب نہیں آ سکتے بلکہ ان سے بھاگتے ہیں۔" خود علامہ ابن تیمیہ یہ بات بھی لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ علامہ المرشدی کے گھر کھانا، جن لاتے ہوں گے۔ حالانکہ علامہ المرشدی نہایت اعلیٰ پائے کے صوفی، نہایت روشن ضمیر اور روشن قلب آدمی تھے۔ ظاہر ہے کہ جب اولیا اللہ سے شیاطین اور جن دور بھاگتے ہیں، ان کے دل سے واقف ہو نہیں سکتے تو ان کی خدمت کیونکر کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شیخ موصوف میں ان اوصاف کا پایا جانا ثابت ہے۔

امام یافعیؒ "مراۃ الجنان' میں لکھتے ہیں کہ شیخ کبیر، مشہور ولی اللہ، عظیم عجائبات کے مالک، بڑی کرامات والے، عالی ہمت، اعلیٰ اوصاف کے مالک، بڑے بڑے مکاشفات اور واضح انوار اور بڑی بڑی کرامات کے مالک تھے"۔ علامہ امام ذہبی کی زبانی المرشدی کے حالات سنیے، حالانکہ امام ذہبی صوفیا کے سخت مخالف تھے۔ علامہ ابن حجر نے 'درر کامنہ' میں امام ذہبی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ "المرشدی لوگوں کے دلوں کا حال بتایا کرتے تھے۔ بڑائی کا دعویٰ نہ تھا، اچھے عقیدے کے مالک تھے"۔ معلوم ہوا کہ علامہ المرشدی ان اوصاف کے مالک تھے جن کے حامل افراد کے پاس جن یا شیاطین بار نہیں پا سکتے تھے۔ لہٰذا امام یافعیؒ نے علامہ ابن تیمیہ کے جواب میں لکھا ہے کہ جنوں کو لوگوں کے دلوں کا حال معلوم نہیں ہو سکتا نہ وہ ان کے باطن سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بداعتقادی سے پناہ میں رکھے۔ لہٰذا علامہ ابن تیمیہ کا احتمالِ عقلی ان کے اپنے بیان کردہ قانون کے مطابق غلط ثابت ہوا۔ جہاں تک دل کے منور ہونے کا تعلق ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس شخص کے لطائف منور ہو کر راسخ ہو جائیں پھر مراقباتِ ثلاثہ

Scanned with CamScanner

راسخ ہو جائیں تو جنات اس پر قابو نہیں پا سکتے اور شیاطین اس سے بھاگتے ہیں۔ اس وقت عارف کا سینہ آسمان کی مانند ہو جاتا ہے۔ لطائف کے انوار ستاروں کی مانند ہو جاتے ہیں تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ... بنایا ہے اسی طرح اللہ کے ذکر سے جب سینہ منور ہو جاتا ہے تو شیاطین اور جن اس سے بھاگتے ہیں۔ پھر المرشدی جیسے کامل عارف کے پاس جن آئیں اور لوگوں کی خواہش کے مطابق کھانا لائیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ جنوں کی کاروائی نہیں بلکہ شیخ کی کرامت ہے۔ یہاں سے ان لوگوں کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔ وہ مرد و خواتین جو جنوں کی شکایت لیے پھرتے ہیں اور تعویذ وغیرہ سے اپنا علاج کراتے ہیں، وہ اللہ اللہ کر کے دلوں کو روشن کیوں نہیں کرتے تاکہ جنوں کی دسترس سے باہر ہو جائیں۔ ان کے سینے منور ہو جائیں اور بیماری سے بھی نجات ملے۔ دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی سنور جائے۔ آخر میں ایک اور واقعہ بھی بیان کر دیتے ہیں کہ المرشدی کے پاس مصر کا بادشاہ الناصر آیا کرتا تھا۔ علامہ عبدالرؤف مناوی اور ابن بطوطہ نے اسے چشم دید واقعہ کے طور پر لکھا ہے۔

۲۔ محمد بن حمزہ

اصلی نام شمس الدین تھا۔ آپ روحانی طبیب ہونے کے علاوہ طب جسمانی میں بھی ماہر تھے۔ فن طب میں ان کی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ طب میں ان کی ریسرچ بھی از قبیل کرامت ہے۔

۱۔ اِنَّ الْاَعْشَابَ كَانَتْ تُنَادِيْهِ وَتَقُوْلُ اَنَا شِفَاءٌ مِّنْ مَّرَضِ الْفُلَانِیْ...

(جامع کرامات الاولیا، ۱: ۲۷۴)

"جڑی بوٹیاں ان کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ میں فلاں مرض کی دوا ہوں۔"

۲۔ سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ پر حملہ کرنا چاہا تو شیخ کو جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔ شیخ نے سلطان کے قاصد احمد پاشا سے کہا کہ فلاں دن، فلاں تاریخ، دن کے گیارہ بجے قلعہ فتح ہو جائے گا۔

فَقَالَ الشَّيْخُ: سَيَدْخُلُ الْمُسْلِمُوْنَ الْقَلْعَةَ فِي الْمَوْضَعِ الْفُلَانِیْ فِي الْيَوْمِ الْفُلَانِیْ فِیْ وَقْتِ ضَحْوَةِ الْكُبْرٰی... (ایضاً)

"شیخ نے فرمایا کہ فلاں جگہ، فلاں روز، دن کے گیارہ بجے کے قریب مسلمان قلعہ میں داخل ہو جائیں گے۔"

اتفاق دیکھیے کہ وقت قریب آ گیا مگر قلعہ فتح ہونے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیخ کی اولاد میں سے ایک آدمی کو فکر لاحق ہوئی کہ شیخ کی بات پوری نہ ہوئی تو ممکن ہے بادشاہ، شیخ پر تشدد کرے۔ وہ دوڑتا ہوا شیخ کے خیمہ کی طرف گیا۔ اندر جھانکا تو دیکھا کہ شیخ ننگے سر ہیں، سجدے سے سر اٹھایا ہے اور یہ کہہ رہے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ مَنَحَنَا اللّٰهُ فَتْحَ الْقَلْعَةِ قَالَ: فَنَظَرْتُ اِلٰی جَانِبِ الْقَلْعَةِ فَاِذَا الْعَسْكَرُ قَدْ دَخَلُوْا بِاَجْمَعِهِمْ فَفَتَحَ اللّٰهُ تَعَالٰی بِبَرَكَةِ دُعَائِهٖ وَكَانَتْ دَعْوَتُهٗ

Scanned with CamScanner

تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ...(ایضاً)

"اللہ کا احسان ہے کہ اس نے قلعہ کی فتح نصیب فرمائی۔ قاصد کہتا ہے، میں نے مڑ کے قلعہ کی طرف نگاہ کی، کیا دیکھتا ہوں کہ فوج قلعہ میں داخل ہو چکی ہے۔ شیخ کی دعا کی برکت سے قلعہ کی دیوار پھٹ کر گر پڑی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ شیخ کی دعا آسمانوں کو چیر کر اوپر جا رہی تھی کہ قلعہ فتح ہو گیا۔"

۳۔ اس فتح کے بعد شیخ سے درخواست کی گئی کہ حضرت ابو ایوب انصاری ؓ کا مدفن تلاش کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں جگہ انوار نظر آتے ہیں۔ پھر مراقبہ کیا اور فرمایا کہ یہ جگہ ہے اور حضرت ؓ کی روح سے کلام ہوئی۔ آپ نے پہلے تو فتح کی مبارک باد دی پھر فرمایا کہ شکر ہے کفار کے قبضہ سے مجھے چھڑایا ہے۔ جب سلطان محمد فاتح کو اس کا علم ہوا تو حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ کی بات پر یقین ہے مگر اطمینان کے لیے کوئی نشانی بتا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جگہ قبر کے سر کی جگہ ہے، دو ہاتھ زمین کھودو، ایک سفید پتھر نکلے گا، اس پر عبرانی یا سریانی زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے۔

فَلَمَّا حَفَرُوْا مِقْدَارَ ذِرَاعَيْنِ ظَهَرَ رُخَامٌ عَلَيْهِ خَطٌّ فَقَرَاءَ مَنْ يَعْرِفُهٗ وَفَسَّرَهٗ فَإِذَا هُوَ مَا قَرَّرَهُ الشَّيْخُ فَتَحَيَّرَ السُّلْطَانُ وَ غَلَبَ عَلَيْهِ الْحَالُ حَتّٰى كَادَ يَسْقُطُ لَوْ لَا اَخَذُوْهُ...(جامع کرامات الاولیا، ۱:۲۷۵)

"جب انہوں نے دو ہاتھ کے مقدار زمین کھودی، ایک پتھر نکلا۔ جو شخص وہ زبان جانتا تھا اس نے پڑھ کے مطلب بتلایا، وہی بات تھی جو شیخ نے بتائی تھی۔ بادشاہ ششدر رہ گیا۔ اس پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ گرنے لگا مگر لوگوں نے اسے سنبھال لیا۔"

بادشاہ نے اس جگہ مسجد بنوائی اور شیخ کے قیام کے لیے حجرے بنوائے اور درخواست کی کہ شیخ یہیں قیام کریں، مگر شیخ نے انکار کر دیا کہ میں اپنے شہر میں قیام کروں گا۔

۲۔ محمد بن حمزہ

اصلی نام شمس الدین تھا۔ آپ روحانی طبیب ہونے کے علاوہ طبِ جسمانی کے بھی ماہر تھے۔ فنِ طب میں ان کی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ طِب میں اُن کی ریسرچ بھی ایک کرامت ہے۔ 'جامعہ کرامات اولیا اللہ' میں لکھا ہے، ''جڑی بوٹیاں ان کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ میں فلاں مرض کی دوا ہوں۔'' سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ پر حملہ کرنا چاہا تو شیخ کو جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔ شیخ نے سلطان کے قاصد احمد پاشا سے کہا کہ فلاں دن، فلاں تاریخ، دن کے گیارہ بجے قلعہ فتح ہو جائے گا۔ اتفاق دیکھیے کہ وقت قریب آ گیا مگر قلعہ کے فتح ہونے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیخ کی اولاد میں سے ایک آدمی کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر شیخ کی بات پوری نہ ہوئی تو ممکن ہے بادشاہ، شیخ پر تشدد کرے۔ وہ دوڑتا ہوا شیخ کے خیمہ کی طرف گیا۔

Scanned with CamScanner

اندر جھانکا تو شیخ ننگے سر ہیں، سجدے سے سر اٹھایا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ اللہ کا احسان ہے، اس نے قلعہ کی فتح نصیب فرمائی۔ قاصد کہتا ہے کہ میں نے مڑ کر قلعہ کی طرف دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فوج قلعہ میں داخل ہو چکی ہے۔ شیخ کی دعا کی برکت سے قلعہ کی دیوار پھٹ کر گر پڑی، قلعہ فتح ہو گیا۔ اور شیخ کی دعا آسمانوں کو چیر کر اوپر جا رہی تھی۔ اس فتح کے بعد شیخ سے درخواست کی گئی کہ حضرت ابوایوب انصاری ؓ کا مدفن تلاش کریں۔ آپ نے فرمایا، فلاں جگہ انوار نظر آتے ہیں پھر مراقبہ کیا اور فرمایا، یہ جگہ ہے اور حضرت ؓ کی روح سے کلام کیا۔ آپ نے پہلے تو فتح کی مبارک باد دی پھر فرمایا کہ شکر ہے کفار کے قبضہ سے مجھے نجات ملی۔ سلطان محمد فاتح کو اس کا علم ہوا تو حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ پر یقین ہے لیکن اطمینان کے لیے کوئی نشانی بتا دیں۔ آپ نے فرمایا، یہ قبر کے سر کی جگہ ہے اور دو ہاتھ زمین کھودو تو ایک سفید پتھر نکلے گا اس پر عبرانی یا سریانی زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے۔ جب انہوں نے دو ہاتھ کی مقدار پر زمین کھودی تو ایک پتھر نکلا۔ جو شخص وہ زبان جانتا تھا اس نے پڑھ کر مطلب بتایا تو وہی بات تھی جو شیخ نے بتائی۔ بادشاہ ششدر رہ گیا اس پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ گرنے لگا مگر لوگوں نے اسے سنبھال لیا۔ بادشاہ نے اس جگہ مسجد بنوائی۔ شیخ کے قیام کے لیے حجرے بنوائے اور درخواست کی کہ شیخ یہیں قیام کریں مگر شیخ نے انکار کر دیا کہ میں اپنے شہر میں قیام کروں گا۔

۳۔ عمر بن مبارکؒ

ولی اللہ، صالح، متقی خوش الحان واعظ تھے۔

ایک دفعہ حج پر گئے۔ روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر حضور ﷺ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا پھر شیخین کی مدح میں قصیدے پڑھے۔ جب فارغ ہوئے تو ایک آدمی آیا، عرض کی میرے گھر چلیے، آپ کی دعوت کرتا ہوں۔ آپ چلے گئے، جب کمرے کے اندر بیٹھے تو اس نے تلوار اٹھائی اور کہا:

فَقَالَ الرَّافِضِیُّ اِخْتَرْ اِمَّا اَقْطَعَ رَاْسَكَ اَوْ لِسَانَكَ الَّذِیْ مَدَحْتَ بِهِ الْفَاعِلَیْنِ...

"رافضی نے کہا، چاہو تو تمہارا سر کاٹ دوں، چاہو تو زبان، جس سے تم نے ابوبکر و عمر کی مدح کی ہے۔" پھر

الضَّائِعِیْنَ وَشَتَمَ وَسَبَّ فَقَطَعَ لِسَانَهٗ فَاَخَذَهٗ وَجَآءَ بِهٖ اِلَى الْقَبْرِ الشَّرِیْفِ وَتَضَرَّعَ وَنَامَ فَرَاٰی الْمُصْطَفٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ فِی النَّوْمِ فَاَعَادَهٗ فَانْتَبَهَ فَوَجَدَهٗ کَمَا کَانَ...

(جامع کرامات الاولیا، ۲: ۴۱۴؛ طبقات الخواص اہلِ صدق والاخلاص، ۱۰۵۔۱۰۶)

"انہیں گالیاں دیں اور ان کی زبان کاٹ کر ان کے ہاتھ میں دے دی۔ آپ روضۂ شریف پر حاضر ہوئے، روئے، نیند آ گئی دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ نے کٹے ہوئے ٹکڑے کو اصلی جگہ پر جوڑ دیا۔ جاگے تو زبان بالکل درست تھی۔"

دوسرے سال پھر تشریف لائے اور اسی طرح قصیدے پڑھے۔ ایک آدمی آیا، دعوت دی اور گھر لے گیا پہچان

Scanned with CamScanner

گئے کہ گھر تو وہی گزشتہ برس والا ہے، خیر کھانا کھایا، پھر وہ شخص انہیں ایک کمرے میں لے گیا، دیکھا کہ ایک بندر ستون سے بندھا ہوا ہے۔ اس شخص نے بتایا کہ یہ میرا والد ہے جس نے آپ کی زبان کاٹی تھی۔ اسی رات اس کی شکل مسخ ہوگئی اور ہم نے اسے اس ستون کے ساتھ باندھ دیا اور میں مذہب شیعہ سے تائب ہوگیا۔ آپ اللہ کے لیے دعا کریں کہ اس کی شکل پھر سے انسانی صورت میں بدل جائے۔ آپ خاموش ہوگئے اور وہاں سے چلے آئے۔

دونوں واقعات خرقِ عادت ہیں اور ولی اللہ کی کرامتیں ہیں۔

۳۔ عمر بن مبارکؒ

ولی اللہ، صالح، متقی اور خوش الحان واعظ تھے۔ 'کفایۃ المعتقد' میں ان کے متعلق ایک واقعہ درج ہے کہ ایک دفعہ حج پر گئے۔ روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر حضور ﷺ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا پھر شیخین کی مدح میں قصائد پڑھے۔ جب فارغ ہوئے تو ایک آدمی آیا اور کہا میرے گھر چلیے آپ کی دعوت کرتا ہوں۔ آپ چلے گئے جب کمرے کے اندر بیٹھے تو اس نے تلوار اٹھائی، کہا کہ چاہو تو تمہارا سر کاٹ دوں، چاہو تو زبان، جس سے تم نے ابوبکر و عمر کی مدح کی ہے۔ وہ شخص رافضی تھا۔ پھر انہیں گالیاں دیں اور ان کی زبان کاٹ کر ان کے ہاتھ میں دے دی۔ آپ روضہ شریف پر حاضر ہوئے، روئے اور نیند آگئی دیکھا کہ حضور ﷺ نے کٹے ہوئے ٹکڑے کو اصل جگہ پر جوڑ دیا ہے۔ جاگے تو زبان درست تھی۔

دوسرے سال پھر تشریف لائے اسی طرح قصیدے پڑھے، ایک آدمی آیا، دعوت دی اور گھر لے گیا۔ پہچان گئے کہ گھر تو وہی گزشتہ برس والا ہے۔ خیر کھانا کھایا پھر وہ شخص انہیں ایک کمرے میں لے گیا، دیکھا کہ ایک بندر ستون سے بندھا ہوا ہے۔ اس شخص نے بتایا کہ یہ میرا والد ہے جس نے آپ کی زبان کاٹی تھی۔ اسی رات اس کی شکل مسخ ہوگئی اور ہم نے اسے اس ستون سے باندھ دیا ہے اور میں مذہب شیعہ سے تائب ہوگیا ہوں۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ اس کی شکل پھر انسانی صورت میں بدل جائے۔ آپ خاموش ہوگئے اور وہاں سے تشریف لے گئے۔

یہ دونوں واقعات خرقِ عادت ہیں اور ولی اللہ کی کرامات ہیں۔

۴۔ محمد بن یوسف بولاقیؒ

آپ کی خدمت میں ایک عورت آئی کہ حبشیوں کی ایک جماعت نے میرا بچہ چھین لیا ہے اور جہاز پر لاد کر وہ سمندر میں جا رہے ہیں۔ آپ نے جہاز والوں کو آواز دی کہ بچہ اس کی ماں کو واپس دے دو، مگر کون سنے۔

ثُمَّ قَالَ یَا سَفِیْنَۃُ قِفِیْ فَوَقَفَتْ ثُمَّ مَشٰی عَلَی الْمَآءِ وَاَخَذَ الصَّبِیَّ مِنَ السَّفِیْنَۃِ وَ اَحْضَرَہٗ اِلٰی اُمِّہٖ ...(جامع الکرامات اولیاء اللہ، ۱:۱۷۲)

Scanned with CamScanner

"پھر آپ نے فرمایا، اے جہاز رک جا، جہاز رک گیا۔ آپ سمندر میں داخل ہو کر جہاز کی طرف چلے، جیسے کوئی خشک زمین پر چلتا ہے۔ جہاز میں پہنچ کر بچہ کو پکڑا، اسے لے کر واپس کنارے پر آئے اور اس کی ماں کے حوالے کیا۔"

۴۔ محمد بن یوسف بولاقیؒ

آپؒ کی خدمت میں ایک عورت آئی کہ حبشیوں کی ایک جماعت نے میرا بچہ چھین لیا ہے اور جہاز پر لاد کر سمندر پار جا رہے ہیں۔ آپؒ نے جہاز والوں کو آواز دی کہ بچہ اس کی ماں کو واپس دے دو۔ مگر کون سنے؟ پھر آپؒ نے فرمایا، اے جہاز رک جا، آپؒ سمندر میں داخل ہو کر جہاز کی طرف چلے جیسے کوئی خشک زمین پر چلتا ہے جہاز پر پہنچ کر بچے کو پکڑا، واپس کنارے پر آئے اور پھر واپس آ کر ماں کے حوالے کر دیا۔

۵۔ ابوالغیث بن جمیلؒ:

آپ ایک مرتبہ اپنے شیخ کا گدھا لے کر جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گئے۔ جنگل میں شیر آیا اور گدھے کو پھاڑ کھایا۔ آپ نے شیر کو کان سے پکڑا، لکڑیاں اس پر لاد دیں اور کہا:۔

اَحْمِلُ حَطَبِیْ عَلٰی ظَهْرِكَ فَحَمَلَهٗ حَتّٰی بَلَغَ الْمَدِيْنَةَ فَاَنْزَلَهٗ وَقَالَ اُخْرُجْ وَاِيَّاكَ اَنْ تَضُرَّ اَحَدًا حَتّٰی تَرْجِعَ مَوْضِعَكَ... (جامع الکرامات اولیاء اللہ، ۱:۴۷۰)

"میں تمہاری پیٹھ پر لکڑیاں لادوں گا، چنانچہ لاد کر چل دیے جب شہر میں پہنچے تو لکڑیاں اتار لیں اور فرمایا، جا نکل جا۔ اپنی جگہ پر پہنچنے تک کسی چیز کو نقصان نہ پہنچانا۔"

۵۔ ابوالغیث بن جمیلؒ

آپ ایک مرتبہ اپنے شیخ کا گدھا لے کر جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گئے۔ جنگل میں شیر آیا اور گدھے کو پھاڑ کھایا، آپ نے شیر کو کان سے پکڑا، لکڑیاں لاد دیں اور کہا کہ میں تمہاری پیٹھ پر لکڑیاں لادوں گا، لاد کر چل دیئے جب شہر پہنچے تو لکڑیاں اتاریں اور کہا "جا نکل جا" اپنی جگہ پر پہنچ جا اور کسی چیز کو نقصان نہ پہنچانا۔

Scanned with CamScanner

۶۔ عامر بن عبد اللہؒ

ایک قافلہ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جنگل سے گزر ہوا۔ ایک شیر آیا اور قافلے کا راستہ روک لیا۔ اتنے میں عامر بن عبد اللہ کا وہاں سے گزر ہوا۔

فَقَالَ مَالَكُمْ قَالُوْا الْاَسَدُ فَمَرَّ اِلَيْهِ وَ وَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى فِيْهِ فَمَرَّتِ الْقَافِلَةُ...

(جامع کرامات الاولیاء اللہ، ۲:۱۳۷)

"پوچھا کیوں رکے کھڑے ہو؟ اہل قافلہ نے کہا کہ شیر نے روک رکھا ہے۔ آپ شیر کے پاس گئے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور قافلہ خیریت سے گزرا۔"

۶۔ عامر بن عبد اللہؒ

ایک قافلہ کہیں جا رہا تھا ایک شیر آیا اور قافلے کا راستہ روک لیا۔ اتنے میں عامر بن عبد اللہ کا وہاں سے گزر ہوا انہوں نے پوچھا کیوں کھڑے ہو؟ اہل قافلہ نے کہا کہ شیر نے راستہ روک رکھا ہے۔ آپ شیر کے پاس گئے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھا اور قافلہ بخیریت گزر گیا۔

۷۔ شیبان الراعیؒ

ایک دفعہ حضرت سفیان ثوریؒ، شیبان راعیؒ کے ساتھ حج کو گئے۔ راستے میں ایک شیر سامنے آ گیا۔ ثوریؒ کہنے لگے، شیبان! شیر تو قریب آ گیا ہے۔ فرمایا، کیا ہوا وہ بھی ایک کتا ہے۔

فَمَا هُوَ اِلَّا اَنَّ الْاَسَدَ سَمِعَ كَلَامَ شَيْبَانَ فَبَصْبَصَ وَ حَرَّكَ ذَنْبَهٗ مِثْلَ الْكَلْبِ، فَالْتَفَتَ اِلَيْهِ شَيْبَانُ وَعَرَكَ اُذُنَهٗ فَقُلْتُ لَهٗ: مَاهٰذِهِ الشُّهْرَةُ ؟فَقَالَ وَاَيُّ شُهْرَةٍ هٰذِهٖ يَا ثَوْرِيُّ، لَوْلَا كَرَاهِيَةُ الشُّهْرَةِ مَا حَمَلْتُ زَادِيْ اِلٰى مَكَّةَ اِلَّا عَلٰى ظَهْرِهٖ...

(جامع کرامات الاولیاء اللہ، ۱:۱۶۷)

"جب شیر نے شیبانؒ کی بات سنی سر جھکا دیا اور کتے کی طرح دم ہلانے لگا۔ شیبانؒ اس کی طرف متوجہ ہوئے، شیر کو کان سے پکڑ لیا۔ سفیان ثوریؒ نے فرمایا، شیبانؒ! یہ کیا شہرت ہے؟ فرمایا، کونسی شہرت ثوری! اگر مجھے شہرت ناپسند نہ ہوتی تو میں اپنا زادِ سفر اس کی پیٹھ پر لاد کر مکہ تک لے جاتا۔"

Scanned with CamScanner

۷۔ شیبان الراعیؒ

ایک دفعہ حضرت سفیان ثوریؒ، حضرت شیبان راعیؒ کے ساتھ حج کو گئے۔ راستے میں شیر آ گیا، ثوریؒ کہنے لگے، شیبانؒ! شیر تو قریب آ گیا ہے۔ فرمایا کیا ہوا وہ بھی ایک کتا ہے۔ شیر نے شیبانؒ کی بات سنی تو سر جھکا دیا اور کتے کی طرح دم ہلانے لگا۔ شیبانؒ اس کی طرف متوجہ ہوئے شیر کو کان سے پکڑ لیا۔ سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ شیبانؒ یہ کیا شہرت ہے؟ شیبانؒ نے کہا، کون سی شہرت ثوریؒ؟ اگر مجھے شہرت ناپسند نہ ہوتی تو میں اپنا زادِ سفر اس کی پیٹھ پر لاد کر مکہ مکرمہ تک لے جاتا۔

۸۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

'فتاوی الحدیثیہ'، صفحہ ۱۷۴ اور 'فیض الباری'، جلد دوم، صفحہ ۶۱ اور 'قلائد الجواہر'، جلد ۳، صفحہ ۷۳

۱۔ مِمَّا عَلِمْنَاهُ بِالسَّنَدِ الصَّحِيْحِ الْمُتَّصِلِ اَنَّ الشَّيْخَ عَبْدَ الْقَادِرِ الْجِيْلَانِيَّ اَكَلَ دَجَاجَةً ثُمَّ لَمَّا لَمْ يَبْقَ غَيْرَ الْعَظْمِ تَوَجَّهَ اِلَى اللّٰهِ فِيْ اِحْيَائِهَا فَاَحْيَاهَا اللّٰهُ اِلَيْهِ وَقَامَتْ تَجْرِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ كَمَا كَانَتْ قَبْلَ ذَبْحِهَا وَطَبْخِهَا...

(فتاوی الحدیثیہ، ۱۷۴)

"ہمیں سندِ صحیح متصل کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ شیخ نے مرغی کا گوشت کھایا پھر تمام ہڈیوں کو اکٹھا کر کے اللہ تعالی سے درخواست کی کہ وہ زندہ ہو جائے چنانچہ وہ زندہ ہو گئی اور چلنا پھرنا شروع کر دیا جیسے وہ ذبح ہونے اور پکنے سے پہلے تھی۔"

اور 'جامع کرامات الاولیاء'، ۲: ۲۰۳ پر اس واقعہ کا بیان ان الفاظ میں ہوا۔

فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْعِظَامِ وَقَالَ: قُوْمِيْ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَقَامَتْ...

"آپ نے مرغی کی ہڈیوں پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑی ہو۔ چنانچہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔"

۲۔ شیخ کی ایک مجلسِ وعظ کا واقعہ 'فیض الباری'، جلد دوم، صفحہ ۶۱ اور 'خزینۃ الاسرار'، صفحہ ۲۵

اِنَّهُ كَانَ يُذَكِّرُ النَّاسَ اِذْ جَاءَتْ حِدَيَا تَصِيْحُ حَتّٰى شَوَّشَتْ عَلَى الشَّيْخِ كَلَامَهُ فَدَعَا وَقَالَ مَالَكَ قَطَعَ اللّٰهُ عُنُقَكَ فَسَقَطَتْ عَلَى الْاَرْضِ مَيِّتَةً مِنْ سَاعَتِهَا ثُمَّ اِذَا فَرَغَ الشَّيْخُ مِنَ الْوَعْظِ قَامَ وَرَاٰهَا مَيِّتَةً فِيْ فِنَاءِ الْمَسْجِدِ... فَقَالَ بِهَا قُوْمِيْ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَطَارَتْ... (فیض الباری، کتاب الصلاۃ، باب من عند النبی ﷺ، ۲: ۶۱)

"آپ وعظ فرما رہے تھے کہ ایک چیل شور کرتی آئی اور آپ کے کلام میں مخل ہوئی۔ آپ کے منہ سے نکلا، خدا تیری گردن کاٹے۔ فوراً زمین پر گری اور مر گئی۔ جب آپ فارغ ہوئے تو مسجد کے صحن میں اسے مردہ پایا۔ آپ نے فرمایا، اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑی ہو چنانچہ وہ زندہ ہو کر اڑ گئی۔"

Scanned with CamScanner

حضرت انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اپنے زمانے کے ایک ولی اللہ کا واقعہ لکھا جن سے ان کی ملاقات بھی ہوئی:۔

هٰكَذَا جَاءَ رَجُلٌ فِي بَجْنَوْرٍ فَقَطَعَ عُنُقَ طَائِرٍ حَتّٰى فَصَلَهَا بَيْنَ أَعْيُنِ النَّاسِ ثُمَّ ضَمَّهَا فَكَانَتْ كَمَا كَانَتْ قَبْلَهُ وَأَحْيَى الطَّائِرَ وَزَارَنِي هٰذَا الرَّجُلَ...

(فیض الباری، کتاب الصلاۃ، باب من عند النبی ﷺ، ۲:۶۱-۶۲)

"ایک آدمی بجنور میں آیا اور لوگوں کے سامنے اس نے پرندہ کا سر کاٹا پھر اسے جوڑ دیا۔ پرندہ زندہ ہوگیا اور اڑ گیا۔ اس شخص سے میں نے ملاقات کی۔"

۸۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ

'فتاویٰ الحدیثیہ'، 'فیض الباری' اور 'قلائد الجواہر' میں لکھا ہے، ہمیں سند صحیح متصل کے ساتھ معلوم ہے کہ شیخ نے مرغی کا گوشت کھایا پھر تمام ہڈیوں کو اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ زندہ ہوجائے اور وہ زندہ ہوگئی اور چلنا پھرنا شروع کردیا جیسے ذبح ہونے اور کٹنے سے پہلے تھی۔ 'جامع کرامات الاولیا اللہ' میں اس واقعہ کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے کہ آپ نے مرغی کی ہڈیوں پر ہاتھ رکھا اور کہا اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑی ہو۔ چنانچہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیخ کے وعظ کا واقعہ 'فیض الباری' اور 'خزینۃ الاسرار' میں اس طرح سے ہے کہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ ایک چیل شور کرتی آئی اور آپ کے کلام میں مخل ہوئی آپ کے منہ سے نکلا اللہ تیری گردن کاٹے۔ فوراً زمین پر گری اور مرگئی۔ جب آپ فارغ ہوئے تو مسجد کے صحن میں اسے مردہ پایا۔ آپ نے فرمایا، اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑی ہو، چنانچہ وہ زندہ ہوکر اڑ گئی۔

حضرت انور شاہ کشمیریؒ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اپنے زمانے کے ایک ولی اللہ کا واقعہ لکھا جس سے ان کی ملاقات بھی ہوئی۔ ایک آدمی بجنور میں آیا اور لوگوں کے سامنے پرندے کا سر کاٹا پھر اسے جوڑ دیا۔ پرندہ زندہ ہوگیا اور اڑ گیا۔ اس شخص سے میں نے ملاقات کی ہے۔

۹۔ ذوالنون مصریؒ

'حلیۃ الاولیا' میں تاج المحدثین ابونعیم نے بیان کیا۔

خَرَجْتُ إِلَى شَطِّ نِيْلِ مِصْرَ فَرَأَيْتُ امْرَأَةً تَبْكِيْ وَتَصْرُخُ فَأَدْرَكَهَا ذُو النُّوْنِ فَقَالَ لَهَا: مَالَكِ تَبْكِيْنَ فَقَالَتْ: كَانَ وَلَدِيْ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ عَلٰى صَدْرِيْ فَخَرَجَ تِمْسَاحٌ فَاسْتَلَبَ مِنِّيْ وَلَدِيْ قَالَ فَأَقْبَلَ ذُو النُّوْنِ عَلَى الصَّلٰوةِ وَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَدَعَا بِدَعَوَاتٍ فَإِذَا

Scanned with CamScanner

التِّمْسَاحُ خَرَجَ مِنَ النِّيْلِ وَالْوَلَدُ مَعَهُ وَدَفَعَهُ إِلَى أُمِّهِ... (حلیۃ الاولیا، ۹:۳۶۶)

"میں نیل کے کنارے گیا۔ دیکھا ایک عورت چلا چلا کر رو رہی ہے۔ ذوالنون اس کے پاس گئے، پوچھا، کیوں رو رہی ہو؟ اس نے کہا۔ میرا بچہ، میری آنکھوں کی ٹھنڈک میرے سینے سے چمٹا ہوا تھا، مگر مچھ آیا اور چھین لے گیا۔" ذوالنونؒ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ اور خدا سے دعا مانگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مگر مچھ دریا سے نکلا اور بچے کو صحیح وسلامت باہر رکھ دیا۔ ذوالنون نے بچہ ماں کے حوالے کر دیا۔"

ذوالنونؒ کی وجہ تسمیہ بھی ایک کرامت ہے۔

آپؒ ایک کشتی میں سوار دریا عبور کر رہے تھے۔ کسی کا ایک قیمتی موتی گم ہو گیا۔ حقیقتاً وہ دریا میں گر گیا تھا۔ اس نے ذوالنونؒ کو چور قرار دیا۔ انہوں نے قسم کھائی مگر مالک نے اعتبار نہ کیا۔

فَلَمَّا أَخْطَرَ تَوَجَّهَ سَاعَةً فَأَتَى حُوتٌ مِنَ الْبَحْرِ بِذٰلِكَ الْجَوْهَرِ...

"جب آپ پریشان ہوئے تو اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی بے بسی پیش کی۔ اتنے میں دریا سے ایک مچھلی وہی موتی لے کر باہر آ گئی۔"

اس وجہ سے ان کا نام ذوالنونؒ پڑ گیا۔

۹۔ ذوالنون مصریؒ

'حلیۃ الاولیا' میں تاج المحدثین ابونعیم نے بیان فرمایا، میں نیل کے کنارے گیا، دیکھا ایک عورت چلا چلا کر رو رہی ہے۔ حضرت ذوالنونؒ اس کے پاس گئے اور پوچھا "کیوں رو رہی ہو"؟ اس نے کہا میرا بچہ، میری آنکھوں کی ٹھنڈک میرے سینے سے چمٹا ہوا تھا مگر مچھ آیا اور چھین کر لے گیا۔ حضرت ذوالنونؒ نے نماز پڑھی اور اللہ سے دعا مانگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مگر مچھ دریا سے نکلا اور بچے کو صحیح سلامت باہر رکھ دیا۔ حضرت ذوالنونؒ نے بچہ ماں کے حوالے کر دیا۔

حضرت ذوالنونؒ کی وجہ تسمیہ بھی ایک کرامت ہے۔ آپ ایک کشتی میں سوار ایک دریا عبور کر رہے تھے کہ کسی کا ایک قیمتی موتی گم ہو گیا۔ حقیقتاً وہ دریا میں گر گیا تھا۔ اس نے حضرت ذوالنونؒ کو چور قرار دیا۔ انہوں نے قسم کھائی مگر مالک نے اعتبار نہ کیا۔ جب آپ پریشان ہوئے، اللہ کی طرف متوجہ اور اپنی بے بسی پیش کی اتنے میں دریا سے ایک مچھلی وہی موتی لے کر باہر آ گئی۔ اس وجہ سے ان کا نام ذوالنونؒ پڑ گیا۔

۱۰۔ غوث یوسف ہمدانی بغدادیؒ

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے اور 'کتاب المشروح الدوی' میں بھی موجود ہے۔ 'جامع کرامات الاولیاء اللہ، جلد دوم، صفحہ ۵۲۹ پر یوں بیان ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

امام ابوسعید عبداللہ بن عصرون بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور عبدالقادر جیلانی اور علامہ ابن سقا، یوسف ہمدانی کی ملاقات کے لیے گھر سے نکلے۔ راستے میں ہم نے ابن سقا سے پوچھا، تم کس غرض سے جا رہے ہو؟ اس نے کہا میں غوث سے ایسا سوال کروں گا جس کا جواب وہ نہیں دے سکیں گے۔ پھر ہم تینوں نے اپنا اپنا عندیہ بیان کیا۔

فَقَالَ ابْنُ السَّقَاءِ لَأَسْأَلَنَّهُ مَسْأَلَةً لَا يَدْرِيْ جَوَابَهَا...

"ابن سقا نے کہا میں شیخ سے ایسا سوال کروں گا کہ وہ جواب نہ دے سکیں گے۔"

فَقَالَ عَبْدُ الْقَادِرِ الْجِيْلَانِيُّ مَعَاذَ اللّٰهِ أَنْ أَسْأَلَهُ شَيْئًا وَأَنَا بَيْنَ يَدَيْهِ أَنْتَظِرُ بَرَكَتَهُ...

"شیخ عبدالقادرؒ نے کہا، ایسا سوال پوچھنے سے خدا کی پناہ۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر فیض و برکت کا انتظار کروں گا۔"

وَقَالَ ابْنُ عَصْرُوْنٍ أَنَا أَسْأَلُهُ مَسْأَلَةً وَأَنْظُرُ مَاذَا يَقُوْلُ...

"ابن عصرون نے کہا کہ میں ایک درخواست کروں گا اور دیکھوں گا کہ وہ کیا فرماتے ہیں؟
(وہ درخواست تھی کہ غربت دور ہو جائے)۔"

ابن السقاء کو شیخ نے فرمایا:

إِنِّيْ لَأَرَىٰ نَارَ الْكُفْرِ تَتَلَهَّبُ فِيْكَ... "میں دیکھتا ہوں کہ تیرے اندر کفر کی آگ شعلہ مار رہی ہے۔"

بعد کے واقعات سے یہ بات درست ثابت ہوئی۔ ابن السقاء، شاہ روم کے بلانے پر مناظرہ کے لیے گیا، بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا۔ وہ شاہ کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا، شادی کی درخواست کی۔ بادشاہ نے کہا، عیسائی ہو جا۔ وہ عیسائی ہو گیا مگر بیمار پڑ گیا۔ عیسائیوں نے بازار میں پھینک دیا، روٹی مانگتا رہتا تھا، آخر موت قریب آ گئی۔ اتفاقاً ایک واقف آدمی کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے پہچان لیا۔ دیکھا کہ مر رہا ہے اس کا منہ قبلہ کی طرف کیا مگر دیکھا کہ فوراً رخ پلٹا اور پشت قبلہ کی طرف ہو گئی۔ پھر اس نے پوچھا کہ قرآن یاد ہے؟

اس نے کہا بس اتنا یاد ہے کہ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ... (الحجر: ۲)

اسی حال میں مر گیا اور جہنم میں داخل ہے۔ اولیاء اللہ کی توہین کا یہی انجام ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادرؒ کے حق میں غوثؒ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم جامعہ بغداد میں منبر پر کھڑے ہو کر کہو گے کہ یہ میرا قدم تمام اولیاء کی گردنوں پر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ نے برسر منبر کہا: قَدَمِيْ هٰذِهٖ عَلٰى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللّٰهِ...

ابن عصرون اپنے متعلق بیان کرتے ہیں:۔

فَأَحْضَرَنِي السُّلْطَانُ نُوْرُ الدِّيْنِ شَهِيْدٌ وَأَكْرَمَنِيْ عَلَىٰ وَلَايَةِ الْأَوْقَافِ فَوَلِيْتُهَا وَأَقْبَلَتِ الدُّنْيَا إِقْبَالًا كَثِيْرًا فَقَدْ صَدَقَ الْغَوْثُ فِيْنَا كُلِّنَا انْتَهٰى...

(جامع کرامات الاولیاء، ۲: ۵۲۹-۵۳۰)

Scanned with CamScanner

"میں دمشق میں سلطان نور الدین شہید کے پاس آیا۔ اس نے مجھے وزارت اوقاف سونپی اور میرے ہاں دولت کی ریل پیل ہونے لگی۔ غوث نے ہم تینوں کے متعلق جو فرمایا تھا، صحیح ثابت ہوا۔"
المشروع الدوی میں ہے کہ یہ قصہ متواترات سے ہے۔ خبر واحد نہیں کہ انکار ہو سکے۔

۱۰۔ غوث یوسف ہمدانی بغدادیؒ

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے اور کتاب 'المشروع الدوی' میں بھی موجود ہے۔ 'جامع کرامات الاولیاء اللہ' جلد دوم، صفحہ ۵۲۹ پر یوں بیان ہوا ہے۔ امام ابوسعید عبداللہ بن عصرون یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ،عبدالقادر جیلانیؒ ، علامہ ابن سقا، یوسف ہمدانیؒ سے ملاقات کے لیے گھر سے نکلے۔ راستے میں ہم نے ابن سقا سے پوچھا! تم کس غرض سے جا رہے ہو؟ پھر ہم تینوں نے اپنا اپنا عندیہ بیان کیا۔

ابن سقا نے کہا، میں شیخ سے ایسا سوال کروں گا کہ وہ جواب نہ دے سکیں گے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے کہا، ایسا سوال پوچھنے سے اللہ کی پناہ، میں ان کے پاس بیٹھ کر فیض و برکت کا انتظار کروں گا۔

ابن خلکان نے کہا کہ میں ایک درخواست کروں گا، دیکھوں گا وہ کیا فرماتے ہیں اور درخواست یہ ہے کہ میری غربت دور ہو جائے۔ جب شیخ کی خدمت میں پہنچے۔ وہ جس نے کہا تھا کہ میں ایسا سوال کروں گا کہ وہ جواب نہ دے سکیں گے تو سوال کرنے سے پہلے ہی انہوں نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تیرے اندر کفر کی آگ شعلہ مار رہی ہے۔ بعد میں واقعات سے یہ بات درست ثابت ہوئی۔ ابن سقا، شاہِ روم کے بلانے پر مناظرہ کے لیے گیا۔ بادشاہ اس سے خوش ہوا اور وہ شاہ کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ شادی کی درخواست کی، بادشاہ نے کہا عیسائی ہو جاؤ وہ عیسائی ہو گیا اور بیمار پڑ گیا۔ عیسائیوں نے بازار میں پھینک دیا، روٹی مانگتا رہتا تھا، آخر موت قریب آگئی۔ ایک واقف کار کا گزر ہوا اس نے پہچان لیا۔ دیکھا کہ مر رہا ہے اس نے اس کا منہ قبلہ کی طرف کیا مگر دیکھا تو فوراً رخ پلٹا اور پشت قبلہ کی طرف ہو گئی۔ پھر اس نے پوچھا کہ قرآن یاد ہے؟ اس نے کہا اتنا یاد ہے کہ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ...کہ کافر آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ اس حال میں مر گیا اور جہنم واصل ہوا۔ اولیاء اللہ کی توہین کا یہی انجام ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادرؒ کے حق میں غوثؒ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم جامعہ بغداد میں منبر پر کھڑے ہو کر کہو گے کہ میرا یہ قدم تمام اولیاء کی گردنوں پر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا آپ نے برسرِ منبر کہا "قَدَمِي هَٰذِهِ عَلَىٰ رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللهِ..."

ابن عصرون ابن الحسنؒ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں۔ میں دمشق میں سلطان نور الدین شہید کے پاس آیا اس نے مجھے وزارتِ اوقاف سونپی اور میرے یہاں دولت کی ریل پیل ہونے لگی۔ غوث نے ہم تینوں کے متعلق جو فرمایا تھا صحیح ثابت ہوا۔ 'المشروع الدوری' میں ہے کہ یہ قصہ متواترات سے ہے فرد واحد نہیں کہ انکار ہو سکے۔

۱۱۔ حضرت ابراہیم دسوقیؒ

یہ قطب تھے۔ ان کے پاس ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ میرے بچے کو ایک مگرمچھ کھا گیا ہے، آپ دریا کے کنارے آئے، آواز دی۔

یَامَعْشَرَ التَّمَاسِیْحِ مَنِ ابْتَلَعَ صَبِیًّا فَلْیَطْلُعْ بِہٖ فَطَلَعَ وَمَشٰی مَعَہٗ اِلَی الشَّیْخِ، فَاَمَرَہٗ اَنْ یَلْفِظَ فَلَفَظَہٗ حَیًّا۔۔۔ (جامع کرامات الاولیاء اللہ، ۱:۳۹۸)

"اے مگرمچھو! جس نے بچہ نگلا ہے، ظاہر کردے۔ ایک مگرمچھ نکلا اور شیخ کی طرف آیا۔ شیخ نے اسے حکم دیا کہ بچہ اگل دے، جانور نے زندہ بچہ اگل دیا۔"

۱۲۔ اولیاء کی کرامات میں ایک بڑی کرامت کلام بالموتی یا کلام بالارواح ہے۔ اس کے متعلق 'جامع کرامت اولیاء اللہ' میں درج ہے۔

مِمَّنْ یَجْتَمِعُ بِالنَّبِیِّ ﷺ۔۔۔ اِنَّ ھٰذَا الْکَرَامَۃَ ھِیَ مِنْ اَعْظَمِ الْکَرَامَاتِ وَاَعْلَی الْمَقَامَاتِ۔۔۔ وَھٰذَا مِنْ اَکْبَرِ نِعَمِ اللہِ تَعَالٰی۔۔۔ (جامع کرامات الاولیاء اللہ، ۲:۴۰۹)

"سب سے بڑی کرامت نبی کریم ﷺ کے دربار میں حاضری اور آپ کی معیت ہے۔ اور یہ سلوک کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے اور اللہ کی نعمت ہے۔"

یہ نعمت تمام کبار اولیا کو عطا ہوتی رہی ہے۔ بفضل اللہ تعالیٰ ہمارے سلسلے کے اکثر رفقاء کو یہ نعمت عطا ہوئی ہے۔ ارواح سے کلام کرنے والے ہمارے رفقاء کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلہِ عَلٰی نَعْمَآئِہٖ۔۔۔

۱۱۔ حضرت ابراہیم دسوقیؒ

حضرت ابراہیم دسوقیؒ جو قطب تھے ان کے پاس ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ میرے بچے کو مگرمچھ کھا گیا۔ آپ دریا کے کنارے آئے اور آواز دی، اے مگرمچھ! جس نے بچہ نگلا ہے ظاہر کردے۔ ایک مگرمچھ نکلا، شیخ کی طرف آیا۔ شیخ نے اسے حکم دیا، بچہ اگل دے، جانور نے زندہ بچہ اگل دیا، اولیا اللہ کی کرامت میں ایک بڑی کرامت کلام بالموتی یا کلام بالا رواح ہے اس کے متعلق 'جامع کرامات الاولیا اللہ' جلد ۲، صفحہ ۴۰۹ پر درج ہے۔ سب سے بڑی کرامت نبی ﷺ کے دربار میں حاضری اور آپ ﷺ کی معیت ہے اور یہ سلوک کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ یہ نعمت تمام کبائر اولیا اللہ کی عطا ہوتی رہتی ہے۔ بفضل تعالیٰ ہمارے سلسلے کے اکثر رفقاء کو یہ نعمت عطا ہوئی ہے اور اراوح سے کلام کرنے والے ہمارے رفقاء کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلہِ عَلٰی نَعْمَآئِہٖ۔۔۔

Scanned with CamScanner

باب (24)

سلسلہ اویسیہ

اس وسیع کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ... (التین: ۴) اور وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ... (الاسراء: ۷۰) کا شرف عطا فرما کر اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کیا اور اسے خلافت ارضی کا منصب جلیلہ سونپا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں لیکن انسان کو جس خصوصی نعمت سے نوازا گیا وہ انبیاء کرامؑ کے ذریعے اس کی ہدایت کا سامان ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جہاں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ... (المائدہ: ۳) کا اعلان فرمایا وہاں اہل ایمان کو اپنا یہ احسان بھی یاد دلایا کہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ... (آل عمران: ۱۶۴) اور اس احسان کی تفصیل میں یہ ارشاد فرمایا کہ اس آخری رسول ﷺ کے ذریعے اللہ کی اس نعمت سے مستفید ہونے کی ایک صورت یہ مقرر کی کہ یہ رسول ان کا تزکیۂ باطن اور ان کی روحانی تربیت کرتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ اپنے جلیل القدر شاگردوں یعنی صحابہ کرامؓ کی اس طرح تربیت کی اور تزکیۂ باطن کے وہ نمونے پیدا کیے کہ رہتی دنیا تک اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ جس طرح تعلیم کتاب اور تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ کی جماعت سے آگے منتقل ہوتا چلا آیا اسی طرح تزکیۂ باطن اور تربیتِ روحانی کا طریقہ بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور اکرم ﷺ سے سیکھ کر آئندہ نسلوں کو پہنچایا اور مختلف ادوار کے تقاضوں کے مطابق تدوین حدیث وفقہ کی طرح تزکیہ وتربیت کے پہلو کی تدوینِ منظم صورت میں عمل میں آئی۔ اوّل اوّل تو یہ صورت تھی کہ جو صحابیؓ یا تابعیؒ جہاں پہنچا، معاشرے کی تربیت شروع کر دی۔ بعد میں دین کا یہ پہلو جب منظم ہوا تو تربیت وتزکیہ کے چار بڑے سلسلے ہمارے ہاں رائج اور مقبول ہو گئے۔ جنہیں سلسلۂ قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور چشتیہ کہتے ہیں۔ ان سلسلوں میں تربیتِ روحانی کا بنیادی اصول ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے ذکرِ الٰہی کی کثرت۔ البتہ ذکرِ الٰہی کے طریقوں میں ہر صاحبِ سلسلہ نے مختلف رنگ اختیار کیا۔ اس طرح طریقۂ کار میں جزوی اختلاف کی وجہ سے چار بڑے طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے۔ ممکن ہے طریقِ تربیت میں اختلاف آب وہوا، مزاج اور طبائع کے اختلاف کی وجہ سے انتخاب کیا گیا جیسے ایک ماہر طبیب ایک ہی دوا مختلف مزاج والے مریضوں کو مختلف صورتوں میں دیا کرتا ہے۔

ان چاروں سلسلوں میں دو پہلو ہمیشہ جاذبِ توجہ رہتے ہیں۔ اول یہ کہ اس سلسلے میں طریقۂ تربیت باطنی کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی سلسلے کے شیخ کو یہ فن حضور اکرم ﷺ سے کن واسطوں سے پہنچا۔ اسی پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ بات لازماً سامنے آجاتی ہے کہ ہر شیخ نے یہ فن اپنے شیخ کی صحبت میں رہ کر اس سے سیکھا ہوگا اور اس کے شیخ نے اسے ایک خاص درجے تک تربیت کرنے کے بعد دوسروں کی تربیت کرنے کی اجازت دی ہوگی۔ اس اجازت نامے کو صوفیا کی اصطلاح میں خرقہ

Scanned with CamScanner

کہتے ہیں۔ خواہ اس کی صورت کوئی بھی ہو اگر کسی شیخ کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے کسی کامل سے اس کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل نہیں کیا اور اجازت نامہ نہیں لیا تو اس کا سلسلہ منقطع شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں اتصال اور تسلسل نہیں پایا جاتا۔

بظاہر یہ بات قاعدہ کلیہ کی صورت میں سامنے آتی ہے، حقیقت میں یہ ''قاعدہ اکثریہ'' ہو سکتا ہے، مگر ''قاعدہ کلیہ'' نہیں کیونکہ اول تو روحانی تربیت، روح کا معاملہ ہے اور روح سے اخذ فیض یا اجرائے فیض کا انحصار بدن کے اتصال پر نہیں۔ اس کی مثالیں صوفیائے کرام میں جا بجا ملتی ہیں۔ مثلاً ابوالحسن خرقانیؒ کو حضرت بایزید بسطامیؒ سے روحانی فیض بھی ملا، اجازت تربیت بھی ملی اور آپ کے خلیفہ مجاز بنے حالانکہ بایزید بسطامی ان سے قریباً ایک سو سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے اپنے شیخ حضرت بایزید بسطامیؒ کا نہ تو زمانہ پایا، نہ ان کی صحبت میں رہے، نہ ان سے تربیت و اجازت ملی تو پھر اس کی صورت اس کے بغیر کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی روح سے فیض اور خرقہ حاصل کیا۔

روح سے فیض حاصل کرنے کو اصطلاحِ صوفیا میں اویسی طریقہ کہتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ سلسلہ حضرت اویس قرنیؒ سے ملتا ہے بلکہ اویسیہ سے مراد مطلق روح سے فیض حاصل کرنا ہے۔ چونکہ روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض دونوں صورتیں ہوتی ہیں اس لیے سلسلہ اویسیہ کی یہی دونوں خصوصیات ہیں۔ اس اصطلاح کو حضرت اویس قرنیؒ سے اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو شاید اس بناء پر کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت میں رہ کر تربیت حاصل نہیں کی تھی بلکہ حضور ﷺ کی روحِ پرفتوح سے اخذِ فیض کیا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے اویسی تھے۔

ہمارے سلسلے کا نام نقشبندیہ اویسیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے شاگردوں کی تربیت نقشبندیہ طریقہ کے مطابق کرتا ہوں۔ اور میں نے اپنے محبوب شیخ رحمۃ اللہ کی روح سے اخذِ فیض اور اجازت لی ہے۔ میرے اور میرے شیخ مکرمؒ کے درمیان کوئی ۴۰۰ سال کا فاصلہ ہے، انہوں نے اسی اویسی طریقہ سے اپنے شیخ کی روح سے فیض بھی حاصل کیا، خلافت بھی ملی، اور بحمداللہ میرے محبوب شیخ کا فیض تربیت اس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے 'ہمعات' صفحہ ۸۶ پر سلسلۂ اویسیہ کی خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے:۔

ایں فقیر را آگاہ کردہ اند کہ طریقہ جیلانیہ بمنزلہ جوئے است کہ مسافتے بر زمین میرود و مسافتے دیگر در زمین مستتر می گردد در مسام زمین نفوذ میکند۔ بعد ازاں بوضع چشمہ باز ظاہری شود و مسافتے بر روئے زمین رود ثم ہکذا ہکذا۔ و تسلسل خرقہ دریں طریقہ اگر متصل است اما تسلسل اخذ نسبت دریں طریقہ متصل نیست یک بار سلسلہ ظاہر میشود بعد ازاں مفقود میگردد باز بطریق اویسیہ از باطن کسے ظہور می نماید ایں طریقہ بحقیقت ہمہ اویسیہ است و متوسلان ایں طریق در روحانیاں علو و مہابتے وارند۔

واما القادریۃ فقریبۃ من الاویسیۃ الروحانیۃ۔ (ہمعات، ۸۶)

Scanned with CamScanner

خلاصہ یہ ہے کہ جیسے پانی زیر زمین موجود رہتا ہے، کسی وقت چشمہ کی صورت میں باہر ابل پڑتا ہے اور زمین کو سیراب کرتا ہے، اسی طرح حقیقی تصوف وسلوک بھی کبھی کبھی غائب ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو پیدا کرتا ہے اور اس کی ذات کے واسطہ سے تصوف وسلوک کا چشمہ ابل پڑتا ہے اور ایک مخلوق کے قلوب کو سیراب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سلسلہ اویسیہ ظاہر میں متصل نہیں ہوتا مگر حقیقت میں وہ متصل ہوتا ہے۔ جو لوگ روح سے اخذ فیض اور اجرائے فیض سے واقف نہیں ہوتے وہ بے چارے اس اتصال کی حقیقت کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ اور اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ... کے تحت جاہلانہ اعتراض کے بغیر کچھ کر نہیں پاتے۔

۱۔ حضرت امام الہندؒ کی عبارت سے یہ معلوم ہوا سب سے زیادہ زود اثر سلسلہ اویسیہ ہے کیونکہ روحانی سلسلہ پھر قادریہ ہے۔

۲۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سلسلہ اویسیہ کے متوسلین بڑی عظمت اور ہیبت کے مالک ہوتے ہیں۔

ھمعات میں صفحہ ۶۳ پر اسی وجہ سے فرمایا کہ 'بسا است کہ ایں عالم ارواح است اجمالاً' یعنی سلسلہ عالم ارواح ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ھمعات میں فرماتے ہیں:

حاصل کلام آں این است کہ یک خانوادہ میان مشائخ عظام اویسی است کہ اکثر بزرگان دریں خانوادہ بودند وسردار سلسلہ ایشاں خواجہ اویس قرنی است کہ بحسب باطنی از سرور ﷺ تربیت یافتہ پس حضرت شیخ بدیع الدین ہم پیر اویسی است کہ در باطن تربیت از روحانیت پیغمبر ﷺ یافتہ است واز کبار مشائخ ہندوستان است۔ (ھمعات، ۲۱)

"حضرت مشائخ عظام میں ایک سلسلہ اویسیہ بھی ہے جس کے سردار خواجہ اویس قرنیؒ ہیں۔ ان کو حضور اکرم ﷺ سے روحانی طور پر فیض حاصل ہوا اور شیخ بدیع الدین کو بھی حضور اکرم ﷺ سے روحانی طور پر فیض ملا اور وہ ہندوستان کے کبار مشائخ سے ہوئے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ:

- اویسی وہ ہوتا ہے جسے کسی ولی اللہ کی روح سے فیض حاصل ہوا ہو۔
- بڑے بڑے اولیا اللہ اس سلسلہ اویسیہ کے طریقہ سے فیض لیتے رہے ہیں۔
- اس سلسلہ والے حضور اکرم ﷺ کی روح پر فتوح سے بھی فیض لیتے ہیں۔

بحمد اللہ کہ اس فقیر کو اب بھی حضور اکرم ﷺ کی روح پر فتوح سے فیض حاصل ہو رہا ہے۔

اس سلسلے کے متعلق اصل بات جو نہ جاننے والوں یا نادانوں کو کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ کیا روح سے اخذِ فیض اور اجرا۔

Scanned with CamScanner

ہوسکتا ہے؟ اس کے جواب کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو جاننے والوں پر اعتماد کرو یا اس بحر میں خود اتر کر دیکھو۔ دوسری صورت تو وہی اختیار کر سکتا ہے جس میں طلب اور خلوص ہو۔ البتہ پہلی صورت کے سلسلے میں چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، 'فتاویٰ عزیزیہ' کی جلد اول، صفحہ ۹۳ پر فرماتے ہیں:

سوال: کسے صاحب باطن یا صاحب کشف بر قبور ایشاں مراقب شدہ چیزے از باطن اخذ مین تواند یا نہ؟

"کوئی صاحب باطن یا صاحب کشف کسی ولی اللہ کی قبر پر جا کر مراقبہ کرے تو اس سے روحانی فیض لے سکتا ہے یا نہیں؟"

جواب: 'می تواند شود۔' "ہاں! لے سکتا ہے۔"

فتویٰ کی زبان میں اختصار ملحوظ ہوتا ہے اس لیے حضرت نے مختصر جواب دیا۔ اس کی تفصیل 'شفاء العلیل'، صفحہ: ۱۷۸، پر دی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ میں نے حضرت ولی نعمت" یعنی مصنف سے پوچھا کہ شیخ ابو علی فارمدیؒ کو کہ ابو الحسن خرقانیؒ کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں، ان کا اس رسالہ میں کیونکر ذکر نہ کیا۔ فرمایا، کہ یہ نسبت اویسیہ کی ہے یعنی روحی فیض ہے۔ اس رسالہ میں غرض یہ ہے کہ نسبت صحبت کی من و عن عالم شہادت میں جو ثابت ہے مذکور ہو لیکن اویسیت کی نسبت قوی اور صحیح ہے۔

شیخ ابو علی فارمدیؒ کو ابو الحسن خرقانیؒ سے روحی فیض ہوا ہے ان کو بایزید بسطامیؒ کی روح سے اور ان کو امام جعفر صادق" کی روحانیت سے تربیت ہے۔ چنانچہ رسالہ قدسیہ میں خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ:

"امام جعفر صادقؒ کو اپنے نانا حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ سے نسبت حاصل ہوئی ہے، ان کو حضرت سلمان فارسیؓ سے، ان کو حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اور ان کو حضور اکرم ﷺ سے۔" (شفاء العلیل: ۱۷۸)

خواجہ ابو علی فارمدی کو نسبت اویسیت حاصل ہے ابو الحسن خرقانی" کے ساتھ اور ان کو بایزید بسطامیؒ سے روحی فیض پہنچا اور ان کی تربیت امام جعفر صادق" کی روحانیت سے ہوئی اور امام جعفر صادقؒ کو اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق" کے ساتھ انتساب حاصل ہے اور ان کو حضرت سلمان فارسیؓ اور آپ کو خلیفۂ رسول اللہ، صدیق اکبر ابو بکرؓ بن ابی قحافہ کے ساتھ اور حضرت صدیقؓ نے جو کچھ حاصل کیا، سرور عالم محمد مصطفیٰ ﷺ سے حاصل کیا۔ اس نسبت اویسیت کو صدیقیہ، نقشبندیہ، نظامیہ قدوسیہ کہتے ہیں۔ (تذکرۃ الرشید، ۲:۱۰۸)

حضرت امام ربانی قدس سرہ کا تربیت باطنی و فیوضات روحانی میں قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کی ذات بابرکات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھنا نسبتِ اویست و فیضانِ روحانیت کے علاوہ اس لیے بھی ہے کہ سلاسل اربعہ مشہورہ میں حضرت شیخ کا واسطہ غالباً قائم ہے (ایضاً، ۲:۱۱۰)

۲۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں 'شفاء العلیل' کی یہ عبارت نقل کر کے لکھا ہے۔

"اس عبارت سے واضح ہوا کہ نسبتِ اویست کے معنی روحی فیض کے ہیں اور یہ نسبت قوی اور صحیح ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ نسبتِ اویسیہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ خواجہ اویس قرنیؓ سے کوئی مرید ہوا ہو۔ اور یہ

Scanned with CamScanner

بھی واضح ہوا کہ نسبتِ اویسیہ کا انکار غلط ہے۔ چونکہ حضرت اویس قرنیؒ کو آنحضرت ﷺ سے روحی فیض حاصل ہوا اور صحبت آنحضرت ﷺ کی ان کو حاصل نہیں ہوئی۔۔۔اس لیے جس کو روحی فیض، کسی بزرگ سے حاصل ہوگا اس کو نسبتِ اویسیہ سے تعبیر کریں گے۔" (فتاویٰ دار العلوم دیوبند، ۱:۱۴۰)

۴۔ عقائد علمائے دیوبند مرکزی رسالہ ہے جس پر مسلک دیوبندی کا مدار ہے اس میں سوال نمبر ۱۱، روح سے فیض باطنی کے متعلق ہوا ہے اور علمائے دیوبند نے مفصل جواب دیا کہ وہ روح سے باطنی فیض کے قائل ہیں اور صرف قائل نہیں بلکہ:

وَ اَمَّا الْاِسْتِفَادَةُ مِنْ رُوْحَانِيَّةِ الْمَشَائِخِ الْاَجِلَّةِ وَ وُصُوْلِ الْفُيُوْضِ الْبَاطِنِيَّةِ مِنْ صُدُوْرِهِمْ اَوْ قُبُوْرِهِمْ صَحِيْحٌ عَلَى الطَّرِيْقَةِ الْمَعْرُوْفَةِ فِيْ اَهْلِهَا وَخَوَاصِّهَا لَا بِمَا هُوَ شَائِعٌ فِي الْعَوَامِ... (رسالہ عقائد علمائے دیوبند، ۳۷)

"بہر حال مشائخ سے روحانی فیض حاصل کرنا اور فیضِ باطنی کا پہنچنا ان کے سینوں سے یا ان کی قبروں سے صحیح ہے، اس مشہور و معروف طریقے سے جو ان اولیا و صوفیا میں مروج ہے اور خاص خاص بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ طریقہ نہیں جو عوام میں مروج ہے۔"

یہ تو روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض کے علمی جوابات ہیں۔ رہی دوسری صورت تو وہ ذوقی چیز ہے،

لطف ایں مے نشاسی بخدا تا نہ چشی

اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ ذوقی جواب بھی چاہتا ہے تو صلائے عام ہے۔ طلب اور خلوص لے کر آجائے اور ممکن اور محال میں تمیز کرے۔ ورنہ صرف باتیں بنانے سے وہ حاصل نہیں ہو سکتا جو عملی طور پر کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

لباس فہم بر بالائے او تنگ
سمندِ وہم در صحرائے اولنگ
نہ چندی گنجد آنجا و نہ چونی
فرو بند لب از کم وز فزونی؟

مشائخ اور علمائے حق کی توضیحات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض صرف ممکن ہی نہیں بلکہ امرِ واقع ہے۔ اور امام الہند کے کلام سے معلوم ہوگیا کہ سلسلہ اویسیہ میں روح سے اخذِ فیض ہوتا ہے اور اس کے لیے اتصال ظاہری شرط نہیں۔ ہاں، اتصالِ نسبت ضرور ہوتا ہے۔ یہی نسبتِ اویسیہ ہوتی ہے۔

سلسلہ اویسیہ

اس وسیع کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ... (التین:۴) اور وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ... الخ (بنی الاسرائیل:۷۰) کا شرف عطا فرما کر اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز کیا اور

اسے خلافتِ ارضی کا منصب جلیلہ سونپا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں لیکن انسان کو جس خصوصی نعمت سے نوازا گیا وہ انبیائے کرام کے ذریعے اس کی ہدایت کا سامان ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جہاں اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ... الخ (المائدہ: ۳) کا اعلان فرمایا وہاں اہل ایمان کو یہ احسان بھی یاد دلایا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ... الخ (آل عمران: ۱۶۴)۔ اس احسان کی تفصیل میں یہ ارشاد فرمایا کہ آخری رسول ﷺ کے ذریعے اللہ کی اس نعمت سے مستفید ہونے کی ایک صورت یہ مقرر کی کہ یہ رسول ﷺ ان کا تزکیۂ باطن اور ان کی روحانی تربیت کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت آیات اور تعلیمِ کتاب وحکمت کے ساتھ اپنے جلیل القدر شاگردوں یعنی صحابہ کرامؓ کی اس طرح تربیت کیا اور تزکیۂ باطن کے وہ نمونے پیدا کیے کہ رہتی دنیا تک اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ جس طرح تعلیم کتاب اور تدوین شریعت کا یہ سلسلہ صحابہ کرامؓ کی جماعت سے آگے منتقل ہوتا چلا گیا اسی طرح تزکیۂ باطن اور تربیتِ روحانی کا یہ طریقہ صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ سے سیکھ کر آئندہ نسلوں تک پہنچایا اور مختلف ادوار کے تقاضوں کے مطابق تدوینِ حدیث وفقہ کی طرح تزکیہ وتربیت کے پہلو کی تدوین منظم صورت میں عمل میں آئی۔ اول اول تو یہ صورت تھی کہ جو صحابیؓ یا تابعیؒ جہاں پہنچا، معاشرے کی تربیت شروع کر دی۔ بعد میں دین کا یہ پہلو جب منظم ہوا تو تربیت وتزکیہ کے چار بڑے سلاسل ہمارے یہاں رائج اور مقبول ہوئے جن میں سلسلۂ قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان سلسلوں سے تربیتِ روحانی کا بنیادی اصول ایک ہی ظاہر ہوا ہے اور وہ ہے ذکرِ الٰہی کی کثرت۔ البتہ ذکرِ الٰہی کے طریقوں میں ہر صاحبِ سلسلہ نے مختلف رنگ اختیار کیا۔ اس طرح طریقۂ کار میں جزوی اختلاف کی وجہ سے چار بڑے طریقے مسلمانوں میں رائج ہیں کیونکہ ممکن ہے تربیت میں اختلاف آب وہوا، مزاج یا طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔ جیسے ایک ماہر طبیب ایک ہی دوا مختلف مزاج والے مریضوں کو مختلف صورتوں میں دیا کرتا ہے۔

ان چاروں سلسلوں میں دو پہلو ہمیشہ جاذبِ توجہ رہتے ہیں۔ اول یہ کہ سلسلے میں طریقۂ تربیتِ باطنی کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شیخ کو یہ فن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کن واسطوں سے پہنچا۔ اسی پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر شیخ نے یہ فن اپنے شیخ کی صحبت میں رہ کر سیکھا ہوگا۔ اس کے شیخ نے اسے تربیت کرنے کے بعد دوسروں کی تربیت کی اجازت دی ہوگی۔ اس اجازت نامے کو صوفیا کی اصطلاح میں خرقہ کہتے ہیں۔ خواہ اس کی صورت کوئی بھی ہو اگر کسی شیخ کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے کسی ولیٔ کامل کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل نہیں کیا اور اجازت نامہ نہیں لیا تو اس کا سلسلہ منقطع شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اتصال اور تسلسل نہیں پایا جاتا۔

بظاہر یہ بات ''قاعدہ کلیہ'' کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ حقیقت میں یہ ''قاعدہ اکثریہ'' ہو سکتا ہے یعنی اکثر ایسا ہوتا ہے یہ کوئی حتمی قانون نہیں یعنی قاعدہ، کلیہ نہیں کیونکہ اول تو یہ روحانی تربیت، روح کا معاملہ ہے۔ روح سے فیض کا انحصار بدن کے اتصال پر نہیں۔ یعنی جب برکات روح سے حاصل کرنی ہوں تو یہ ضروری نہیں کہ ایک زمانے میں ایک ہی جگہ پر

Scanned with CamScanner

دو انسان اکٹھے ہوں۔ اس کی مثالیں صوفیائے کرام میں جا بجا ملتی ہیں مثلاً ابوالحسن خرقانیؒ کو حضرت بایزید بسطامیؒ سے روحانی فیض ملا، اجازتِ تربیت بھی ملی۔ آپ کے خلیفۂ مجاز بھی بنے حالانکہ بایزید بسطامیؒ ان سے تقریباً سو سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے اپنے شیخ بایزید بسطامیؒ کا نہ تو زمانہ پایا اور نہ صحبت۔ ان سے تربیت اور اجازت ملی تو اس کی صورت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی روح سے فیض اور خرقہ حاصل کیا۔ روح سے فیض حاصل کرنے کو اصطلاحِ صوفیا میں اویسی طریقہ کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ یہ سلسلہ حضرت اویس قرنیؒ سے ملتا ہے بلکہ اویسیہ سے مراد مطلق روح سے فیض حاصل کرنا ہے کیونکہ روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض دونوں صورتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے سلسلہ اویسیہ کی یہی دو خصوصیات ہیں۔ اس اصطلاح کو حضرت اویس قرنیؒ سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو شاید اس بناء پر کہ انہوں نے بھی حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں رہ کر تربیت حاصل نہیں کی بلکہ روحِ پرفتوح سے فیض حاصل کیا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے اویسی تھے۔

ہمارے اس سلسلہ کا نام سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے شاگردوں کی تربیت نقشبندیہ طریقے کے مطابق کرتا ہوں اور میں نے اپنے محبوب شیخ کی روح سے اخذِ فیض اور اجازت لی ہے۔ میرے اور میرے شیخ کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ ہے میں نے اسی اویسی طریقے سے اپنے شیخ کی روح سے فیض بھی حاصل کیا، خلافت بھی حاصل کی اور بحمد للہ! میرے محبوب شیخؒ کا فیض تربیت اس وقت دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے 'ھمعات' صفحہ ۲۱ پر سلسلہ اویسیہ کی خصوصیات کا ذکر فرمایا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

ایں فقیر را آگاہ کردہ......الخ

ترجمہ: کچھ یوں ہے "اس فقیر کو یہ پتا چلا کہ یہ طریقہ ایک ندی کی مانند ہے جو کبھی تو سامنے ہو جاتی ہے اور کبھی زمین کے اندر جذب ہو جاتی ہے اور دور تک چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر کہیں چشمے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر زمین پر دور دور تک پھیل جاتی ہے۔"

اس سلسلے میں اجازت نامے کا طریقہ بھی متصل ہے کہ شیخ سے کسی زندہ شیخ کو فیض مل جاتا ہے لیکن دراصل اس میں اخذِ فیض اور اخذِ نسبت کا طریقہ متصل نہیں ہے۔

ایک بار یہ سلسلہ ظاہر ہوتا ہے تو پھر وہ غائب ہو جاتا ہے اور پھر طریقۂ اویسیہ سے کسی کے باطن سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا سلسلہ بھی اویسیہ ہے اور اس سے تعلق رکھنے والے لوگ روحانی اور بلند مرتبہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جیسے پانی زیرِ زمین موجود ہے کسی وقت چشمے کی صورت میں ابل پڑتا ہے اور زمین کو سیراب کرتا ہے اسی طرح حقیقی تصوف و سلوک بھی کبھی کبھی غائب ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو پیدا کرتا ہے، اس کی ذات کے واسطے سے تصوف و سلوک کا چشمہ ابل پڑتا ہے اور ایک مخلوق کے قلوب کو سیراب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اویسیہ ظاہر میں متصل نہیں ہوتا مگر حقیقت میں متصل ہے۔ جو لوگ روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض سے واقف نہیں وہ بے چارے اس اتصال کی

Scanned with CamScanner

حقیقت کو کیسے سمجھ سکتے ہیں اور آخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ... (البقرہ:۲۰۶) "غرور اسے اور گناہ میں ڈال دیتا ہے" کے تحت جاہلانہ اعتراض کے بغیر کچھ نہیں کر پاتے۔ حضرت امام الہندؒ کی اس بات سے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ زود اثر سلسلہ اویسیہ ہے کیونکہ روحانی سلسلہ ہے۔ دوسرا سلسلہ سلسلۂ قادریہ ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلسلہ اویسیہ کے متوسلین بڑی عظمت اور ہیبت کے مالک ہوتے ہیں اسی وجہ سے فرمایا کہ "بساست کہ ایسی عالم ارواح...... الخ" یعنی سلسلہ اویسیہ ایک عالمِ ارواح کی سی کیفیت رکھتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے 'ہمعات' کے صفحہ ۲۱ پر فرمایا کہ مشائخ عظام میں ایک سلسلہ اویسیہ بھی ہے جس کے سردار خواجہ اویس قرنیؒ ہیں۔ ان کو حضور اکرم ﷺ سے روحانی طور پر فیض ہوا اور شیخ بدیع الدینؒ کو بھی حضور ﷺ سے روحانی طور پر فیض ملا اور وہ ہندوستان کے کبار مشائخ سے ہوئے۔

معلوم ہوا کہ اویسی وہ ہوتا ہے جس کو کسی ولی اللہ کی روح سے فیض حاصل ہوا ہو۔ بڑے بڑے اولیا اس سلسلۂ اویسیہ کے طریقے سے فیض لیتے رہے۔ اس سلسلے والے حضور اکرم ﷺ کی روح پر فتوح سے بھی فیض لیتے ہیں۔ الحمدللہ! اس فقیر کو اب بھی حضور اکرم ﷺ کی روح سے فیض حاصل ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کے متعلق جو بات نا جاننے والوں یا نادانوں کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ کیا روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو جاننے والوں پر اعتماد کرو یا اس بحر میں خود اتر کر دیکھو، یعنی یا تو ان کی بات مانو جنہیں یہ فیض حاصل ہو رہا ہے یا اگر نہیں مانتے تو پھر خود محنت کر کے دیکھ لو اور دوسری صورت تو وہی اختیار کر سکتا ہے جس میں طلب اور خلوص ہو۔ البتہ پہلی صورت کے سلسلہ میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہے۔ 'فتاویٰ عزیزیہ' میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کوئی صاحب باطن یا صاحب کشف کسی ولی اللہ کی قبر پر جا کر مراقبہ کرے تو اس سے روحانی فیض لے سکتا ہے یا نہیں؟ تو جواب دیتے ہیں، ہاں! لے سکتا ہے۔ فتویٰ کی زبان میں اختصار ملحوظ ہوتا ہے اس لیے حضرت نے مختصر جواب دیا۔ اس کی تفصیل 'شفاء العلیل'، صفحہ ۷۸ پر بھی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں نے حضرت ولی نعمت یعنی مصنف سے پوچھا کہ شیخ ابو ولی فارمدی جو ابوالحسن خرقانیؒ کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں ان کا اس رسالہ میں کیونکر ذکر نہ کیا۔ فرمایا، یہ نسبت اویسیہ ہے یعنی روحی فیض ہے۔ اس رسالہ میں غرض یہ ہے کہ نسبت صحبت کی من وعن عالم شہادت میں جو ثابت ہے وہ مذکور ہو۔ لیکن اویسیت کی نسبت قوی اور صحیح ہے۔

شیخ ابوعلی فارمدیؒ کو ابوالحسن خرقانیؒ سے فیض حاصل ہوا، ان کو بایزید بسطامیؒ کی روح سے اور ان کو امام جعفر صادقؒ کی روح سے تربیت ملی۔ چنانچہ رسالہ قدسیہ میں خواجہ محمد پارساؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام جعفر صادقؒ کو اپنے نانا حضرت قاسمؒ بن محمد بن ابی بکر سے نسبت حاصل ہوئی ان کو حضرت سلمان فارسیؓ سے اور ان کو ابو بکر صدیقؓ سے اور ان کو حضور اکرم ﷺ سے۔ خواجہ ابوعلی فارمدیؒ کو ابوالحسنؒ خرقانی کے ساتھ نسبت اویسی حاصل ہے اور ابوالحسنؒ کو بایزید بسطامیؒ سے روحی فیض پہنچا۔ بایزید بسطامیؒ کی تربیت امام جعفر صادقؒ کی روحانیت سے ہوئی۔ امام جعفر صادقؒ کو اپنے نانا قاسمؒ بن محمد بن ابی بکر صدیق کے ساتھ انتساب ہے ان کو حضرت سلمان فارسیؓ سے اور سلمان فارسیؓ کو خلیفہ رسول اللہ ﷺ، صدیق اکبر حضرت ابو بکرؓ بن ابی قحافہ کے ساتھ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جو حاصل کیا وہ سرورِ دو عالم محمد مصطفی ﷺ سے حاصل کیا۔ اس نسبت کو نقشبندیہ اویسیہ نظامیہ قدوسیہ کہتے ہیں۔

'تذکرۃ الرشید' حصہ دوم صفحہ ۱۱۰ پر ہے،

حضرت امام ربانی قدوسی کا تربیتِ باطنی اور فیوضاتِ روحانی میں قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی ذات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھنا نسبت اویسیہ اور فیضانِ روحانیہ کے علاوہ اس لیے بھی ہے کہ سلاسلِ اربعہ مشہورہ میں حضرت شیخ کا واسطہ غالباً قائم ہے۔

'فتاویٰ دارالعلوم دیوبند' صفحہ ۱۴۰، جلد اول پر 'شفاالعلیل' کی یہ عبارت نقل کر کے لکھا ہے کہ نسبت اویسیہ کے معنی روحی فیض کے ہیں۔ یہ نسبت قوی اور صحیح ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نسبتِ اویسیہ کے لیے ضروری نہیں کہ خواجہ اویس قرنیؒ سے کوئی مرید ہوا ہو۔ اور یہ بھی واضح ہوا کہ نسبتِ اویسیہ کا انکار غلط ہے کیونکہ اویس قرنیؓ کو حضور ﷺ سے روحی فیض حاصل ہوا اور صحبتِ رسول اللہ ﷺ ان کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے کسی کو روحی فیض کسی بزرگ سے حاصل ہو گا تو اس کو نسبتِ اویسیہ سے تعبیر کریں گے۔ 'عقائد علمائے دیوبند' مرکزی رسالہ ہے جس پر مسلک دیوبندی کا مدار ہے۔ اس میں سوال نمبر ۱۱ روح سے فیض باطنی کے متعلق ہوا ہے اور علمائے دیوبند نے مفصل جواب دیا کہ وہ روح سے باطنی فیض کے قائل ہیں اور صرف قائل نہیں بلکہ:

وَاَمَّا الْاِسْتِفَادَۃُ مِنْ رُوْحَانِیَّۃِ الْمَشَائِخِ... اَلْاَجِلَّۃِ وَوُصُوْلُ الْفَیْضِ الْبَاطِنِیَّۃِ مِنْ صُدُوْرِھِمْ اَوْ قُبُوْرِھِمْ صَحِیْحٌ عَلَی الطَّرِیْقَۃِ الْمَعْرُوْفَۃِ فِیْ اَھْلِھَا خَوَاصِّھَا لَا ھُوَ شَائِعٌ فِی الْعَوَامِ... الخ۔

بہر حال مشائخ سے روحانی فیض حاصل کرنا اور ان کے سینوں یا قبروں سے فیضِ باطنی کا پہنچنا صحیح ہے۔ اس مشہور و معروف طریقے سے جو ان اولیاء و صوفیاء میں مروج ہے اور خاص خاص بندوں کو حاصل ہوتا ہے، وہ طریقہ نہیں جو عوام میں مروج ہے۔ یہ تو روح سے اخذ فیض اور اجرائے فیض کے علمی جوابات ہیں رہی دوسری صورت تو وہ ذوقی چیز ہے۔ ''لطف این مے نشناسی بخدا تانہ چشی'' اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ ذوقی جواب بھی چاہتا ہے تو صلائے عام ہے طلب اور خلوص لے کر آ جائے اور ممکن اور محال میں تمیز کرے۔ باتیں بنانے سے وہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ عملی طور پر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

لباسِ فہم بر بالائے اوتنگ
سمندِ وہم در صحرائے اولنگ
نہ چندی گنجد آنجا ونہ چونی
فرو بند لب از کم وز فزونی

یعنی عقل و فہم میں چوں و چناں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ زبان بند کرو اور عقل کے سوالات کو چھوڑ کر عملی طور پر محنت کر کے اس کو حاصل کر کے دیکھو کہ یہ کیا چیز ہے۔

Scanned with CamScanner

مشائخ اور علمائے حق کی توضیحات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ روح سے اخذِ فیض اور اجرائے فیض ممکن ہی نہیں بلکہ امرِ واقع ہے۔ اور امام الہند کے کلام سے معلوم ہوگیا کہ سلسلہ اویسیہ میں روح سے اخذِ فیض ہوتا ہے اور اس کے لیے اتصالِ ظاہری شرط نہیں ہاں اتصالِ نسبت ضرور ہوتا ہے اور یہی نسبتِ اویسیہ ہے یعنی اتصال ظاہری ہوتا ہے کہ کوئی حاضر بدن سے ایک زمانے میں اور ایک جگہ پر کسی سے ملے تو یہ ضروری نہیں ہے لیکن نسبت کا انتساب جس نسبت سے وہ برکات لے رہے ہیں وہ اس شیخ تک پہنچے، یہ ضروری ہے۔

ملتان کے ایک مشہور پیر صاحب نے ہمارے حلقے کے ایک مولوی صاحب کو فرمایا کہ آپ کا سلسلہ متصل نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت جس سلسلہ میں شیخ اپنے شاگرد کی روحانی تربیت اس طرح کرے کہ اس کے لیے زمان و مکان کی قید اٹھ جائے اور اسے عالمِ برزخ میں پہنچا کر حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کردے اور حضور ﷺ کے دستِ مبارک میں اپنے شاگرد کا ہاتھ دے کر یہ منظر دکھادے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ... الخ (الفتح:١٠) جو آپ (ﷺ) سے بیعت ہوتے ہیں وہ اللہ سے بیعت ہوتے ہیں تو وہ سلسلہ تو ٹھہرا منقطع۔ یعنی اس سلسلے کو تو آپ منقطع کہتے ہیں اور جس سلسلے میں مرید مدتوں رہے اور ساری عمر اس کے پاس آنے جانے میں کھپادے اور شیخ میں اتنا نور بھی نہ ہو کہ مرید کے لطیفۂ قلب کو منور کر سکے۔ آپ کہتے ہیں وہ سلسلہ متصل ہے؟ قربان جائیے اس اتصال پر جن لوگوں کی بایں جبہ وقبہ حضور اکرم ﷺ تک رسائی نہ ہو، ان کا سلسلہ متصل اور جو اللہ کا بندہ ایک دو نہیں سینکڑوں شاگردوں کو دربارِ نبوی ﷺ تک پہنچائے اس کا سلسلہ منقطع ہے۔ آپ کو یہ اتصال مبارک ہو جو آپ کو نبی کریم ﷺ کے پاس نہ پھٹکنے دے، ہمیں یہ انقطاع اچھا جو دربارِ نبوی ﷺ میں پہنچا کر دائمی حضوری عطا کردے۔

کسی ایسے منظر ہی کو دیکھ کر کہنے والے نے کہہ دیا۔

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اللہ تعالیٰ دین کا صحیح فہم عطا فرمادے تو بڑی نعمت ہے۔

Scanned with CamScanner

حرفِ آخر

اَلطَّاعَاتُ عِنْدَنَا مَحْصُوْرَةٌ فِیْ نَوْعَیْنِ التَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللهِ وَ الشَّفَقَةُ عَلٰی خَلْقِ اللهِ کَمَا قَالَ تَعَالٰی: اِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ وَ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ فِی الْخَیْرَاتِ اَمْرَانِ الْمُوَاظَبَةُ عَلَی الْاَعْمَالِ الْمُشْعِرَةِ بِتَعْظِیْمِ الْمَعْبُوْدِ وَ السَّعْیِ فِیْ اِیْصَالِ النَّفْعِ اِلَی الْخَلْقِ اَلتَّعَلُّقُ الْقَلْبِیُّ بِشَیْءٍ مِّمَّا سِوَی اللهِ تَعَالٰی فِیْ طَرِیْقِ الْعُبُوْدِیَّةِ یَقْرُبُ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ تَعَلُّقًا بِالْوَثَنِ فَلِذٰلِكَ قَالَ اَهْلُ السُّلُوْكِ هُوَ شِرْكٌ خَفِیٌّ وَ لِلسَّالِکِیْنَ اَمْرَانِ الْبِدَایَةُ وَالنِّهَایَةُ اَمَّا الْبِدَایَةُ فَالْاِشْتِغَالُ بِالْعُبُوْدِیَّةِ وَاَمَّا النِّهَایَةُ فَقَطْعُ النَّظَرِ عَنِ الْاَسْبَابِ وَ تَفْوِیْضِ الْاَمْرِ کُلِّهَا اِلٰی مُسَبِّبِ الْاَسْبَابِ وَذٰلِكَ هُوَ الْمُسَمّٰی بِالتَّوَکُّلِ عَلَی اللهِ۔ وَهٰذَیْنِ الْمَقَامَیْنِ ذُکِرَ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی فَاعْبُدْهُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْهِ وَفِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ... تَنْبِیْهٌ عَلٰی اَنَّ اِیْمَانَ الْعَبْدِ لَا یَکْمُلُ اِلَّا عِنْدَ الْاِعْرَاضِ عَنِ الْاَسْبَابِ وَ الْاِقْبَالِ بِالْکُلِّیَّةِ عَلٰی مُسَبِّبِ الْاَسْبَابِ لِاَنَّ حُبَّ الدُّنْیَا لَا یَجْتَمِعُ سَعَادَةَ الْاٰخِرَةِ فَبِقَدْرِ مَا یَزْدَادُ اَحَدُهُمَا یَنْقُصُ الْاٰخِرُ وَ ذٰلِكَ لِاَنَّ الدُّنْیَا لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِاِشْتِغَالِ الْقَلْبِ الدُّنْیَا وَ سَعَادَةِ الْاٰخِرَةِ لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِفِرَاغِ الْقَلْبِ مِنْ کُلِّ مَاسِوَی اللهِ تَعَالٰی وَ امْتِلَائِهٖ مِنْ حُبِّ اللهِ تَعَالٰی... وَهٰذَانِ الْاَمْرَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ وَ التَّمَرُّغُ فِیْ وُصُوْلِ الدُّنْیَا مِنْ اَخْلَاقِ الْهَالِکِیْنَ ...وَالْاَخْبَارُ فِیْ ذَالِكَ کَثِیْرٌ۔ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ دَخَلَ فِی الدُّنْیَا کَالتَّاجِرِ الَّذِیْ یَشْتَرِیْ بِطَاعَتِهٖ سَعَادَةَ الْاٰخِرَةِ لِاَنَّ قَصْدَ الْاَقْصٰی مِنَ الْخَلْقِ الْعِبَادَةُ کَمَا قَالَ تَعَالٰی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ... وَالْمَقْصَدُ الْاَعْلٰی فِی الْعِبَادَةِ حُصُوْلُ مَحَبَّةِ اللهِ تَعَالٰی کَمَا وَرَدَ فِی الْحَدِیْثِ لَایَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ وَکُلُّ مَنْ کَانَ قَلْبُهٗ اَشَدَّ اِمْتِلَاءً مِنْ مُحَبَّةِ اللهِ تَعَالٰی فَهُوَ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللهِ لٰکِنْ لِلْقَلْبِ تَرْجُمَانٌ وَ هُوَ لِسَانٌ... وَلِلِّسَانِ مُصَدِّقَاتٌ وَهِیَ الْاَعْضَاءُ وَلِهٰذَا الْمُصَدِّقَاتِ مُزَکِّیَاتٌ... فَاِذَا قَالَ الْاِنْسَانُ اٰمَنْتُ بِاللِّسَانِ فَقَدْ اِدَّعٰی مَحَبَّةَ اللهِ تَعَالٰی فِیْ جِنَانٍ... فَلَا بُدَّ مِنْ شُهُوْدٍ۔ فَاِذَا اسْتَعْمَلَ الْاَرْکَانَ فِی الْاِتْیَانِ بِمَا عَلَیْهِ بُنْیَانُ الْاِیْمَانِ حَصَلَ لَهٗ عَلٰی دَعْوَاهُ شُهُوْدٌ مُصَدِّقَاتٌ فَهِیَ الْاَعْضَاءُ

Scanned with CamScanner

فَإِذَا بَذَلَ فِي سَبِيلِ اللهِ نَفْسَهُ وَمَالَهُ وَزَكَّى بِتَرْكِ مَاسِوَاهُ أَعْمَالَهُ زَكَّى شُهُودُ الَّذِينَ صَدَّقُوهُ فِيمَا قَالَهُ فَيُحَرَّرُ فِي جَرَائِدِ الْمُحِبِّينَ اِسْمُهُ وَيُقَرَّرُ فِي أَقْسَامِ الْمُقَرَّبِينَ قِسْمَهُ وَإِلَيْهِ أَشَارَ بِقَوْلِهِ تَعَالَى أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ...

"ہمارے نزدیک طاعات کا انحصار دو باتوں پر ہے: اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو احسان کرنے والے ہیں۔ اور نیک کاموں میں بہترین عمل دو ہیں۔ اول، ان اعمال پر مداومت جن سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ہو۔ دوم، مخلوق کو نفع رسانی میں جدوجہد۔ عبودیت کی راہ میں غیر اللہ سے تعلق رکھنا درحقیقت بت پرستی کے زیادہ قریب ہے اس لیے اہل سلوک نے اسے شرک خفی قرار دیا ہے۔ اور سالکین کے لیے دو حالتیں ہیں۔ ابتدا اور انتہا۔ ابتدا عبودیت میں مشغول ہونا ہے اور انتہا اسباب سے نگاہ ہٹالینا اور تمام امور کو مسبب الاسباب کے سپرد کر دینا ہے اسی کا نام توکل علی اللہ ہے۔

انہی دو مقامات کا بیان کتاب اللہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے کہ۔ اس کی عبادت کر اور اس پر توکل کر۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ اس کے بغیر انسان کا ایمان کامل ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اسباب سے قطع نظر کر لے اور اس کی نگاہ مکمل طور پر مسبب پر جمی رہے۔ کیونکہ حُبِّ دنیا اور سعادتِ اُخروی کا جمع ہونا ممکن نہیں۔ جس قدر ایک میں اضافہ ہوگا دوسری میں کمی واقع ہوگی اس کی وجہ یہ ہے کہ حصولِ دنیا کے لیے ضروری ہے کہ دل کو طلبِ دنیا میں مشغول رکھا جائے اور سعادتِ اخروی کا حصول اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ غیر اللہ سے دل کو بالکل خالی رکھا جائے اور اس میں اللہ کی محبت کے بغیر کچھ بھی نہ رہنے پائے اور یہ دونوں باتیں ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ حصولِ دنیا میں ہمہ تن محو ہو جانا ہلاک ہونے والوں کے اوصاف میں سے ہے۔ اس ضمن میں احادیث و اخبار کثرت سے ملتی ہیں کیونکہ انسان اس دنیا میں ایک تاجر کی حیثیت سے آیا ہے جسے طاعات کے بدلے سعادتِ اخروی حاصل کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوق کا منتہائے مقصود عبادت ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ "اور ہم نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا"۔ اور عبادت سے مقصود محبتِ الٰہی کا حصول ہے جیسا کہ حدیث میں آیا کہ "جب میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب ڈھونڈتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔" اور جس دل میں اللہ کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی وہی اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہوگا۔

لیکن قلب کا ایک ترجمان ہے اور وہ زبان ہے اور زبان کی تصدیق کرنے والے اعضاء ہیں اور ان مصدقات کے مزکیات بھی ہیں۔

Scanned with CamScanner

جب انسان زبان سے کہتا ہے۔"میں ایمان لایا" تو گویا اس نے اپنے دل میں اللہ کی محبت کے موجود ہونے کا دعویٰ کیا پھر اس کی شہادت پیش کرنا لازمی ہے۔ جب انسان اپنے اعضاء و جوارح سے ان اصولوں پر عمل کرتا ہے جو ایمان کی بنیاد ہیں تو اس نے اپنے دعوے کی شہادت پیش کردی۔ جب اس نے اللہ کی راہ میں جان مال خرچ کیا اور ماسوئی کی محبت سے اپنے اعمال کو پاک کرلیا تو اس نے اپنے شاہدوں کی صداقت کا ثبوت پیش کردیا۔ اسوقت اس کا نام محبانِ الٰہی کی فہرست میں لکھا جاتا ہے اور مقربین کے گروہ میں شامل ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ"کیا لوگوں نے خیال کرلیا ہے کہ انہیں صرف اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لائے اور انہیں آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا۔"

عقل زاہد عشق صوفی میں بس اتنا فرق ہے
اس کو خوفِ آخرت ہے اس کو ذوقِ آخرت

حرفِ آخر

ہمارے نزدیک اطاعت کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت۔ یعنی اللہ کی اطاعت اور عبادت دو چیزوں میں ہے۔ ایک اللہ کے احکام کی بجا آوری اور دوسرا اللہ کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ، شفقت۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا"اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور جو احسان کرنے والے ہیں"۔ نیک کاموں میں بہترین عمل دو ہیں۔ اول، ان اعمال پر مداومت جن سے اللہ کی عظمت کا اظہار ہو۔ دوم، مخلوق کو نفع رسانی میں جدوجہد۔ عبودیت کی راہ میں غیر اللہ سے تعلق رکھنا درحقیقت بت پرستی کے زیادہ قریب ہے اس لیے اہلِ سلوک نے اس کو شرکِ خفی قرار دیا ہے۔ سالکین کے لیے دو حالتیں ہیں ابتدا اور انتہا۔ ابتدا عبودیت میں مشغول ہونا ہے اور انتہا اسباب سے نگاہ ہٹالینا اور تمام امور کو مسبب الاسباب کے سپرد کردینا ہے، اُس کا نام توکل علی اللہ ہے۔ انہی دو مقامات کا بیان قرآن، کتاب اللہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے کہ"اس کی عبادت کر اور اس پر توکل کر"۔ اس آیت میں تنبیہہ ہے کہ اس کے بغیر انسان کا ایمان کامل نہیں ہوسکتا کہ وہ اسباب سے قطع نظر کرے اور اُس کی نگاہ مکمل طور پر مسبب الاسباب پر جمی رہے۔ حبِ دنیا اور سعادت اخروی کا جمع ہونا ممکن نہیں کیونکہ جس قدر ایک میں اضافہ ہوگا دوسری میں کمی ہوگی۔ یعنی دنیا کی محبت اور آخرت کی محبت یکجا نہیں رہتی۔ ایک میں زیادتی ہوگی، دوسری میں کمی ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ حصولِ دنیا کے لیے ضروری ہے کہ دل کو طلبِ دنیا میں مشغول رکھا جائے۔ سعادتِ اخروی کا حصول اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ غیر اللہ کو دل سے نکال دیا جائے اور اس میں اللہ کی محبت کے بغیر کچھ نہ رہنے پائے۔ یہ دونوں باتیں ایک وقت میں جمع نہیں ہوسکتیں اور حصولِ دنیا میں ہمہ تن محو ہوجانا ہلاک ہونے والوں کے اوصاف میں سے ہے۔ اس ضمن میں احادیث اور اخبار کثرت سے ملتی ہیں کیونکہ انسان اس دنیا میں ایک تاجر کی حیثیت سے آیا جسے اطاعت کے بدلے سعادتِ اخروی حاصل کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوق کا منتہائے مقصود عبادت

Scanned with CamScanner

ہے جیسے قرآن کریم میں ہے کہ ''ہم نے انسانوں اور جنوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا، اور عبادت سے مقصود محبتِ الٰہی کا حصول ہے۔ جیسا حدیث میں آیا ہے کہ ''جب بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب ڈھونڈتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔'' اور جس دل میں اللہ کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی وہی اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ قدر ہوگا لیکن قلب کا ایک ترجمان ہے اور وہ زبان ہے۔ زبان کی تصدیق کرنے والے اعضاء ہیں اور ان مصدقات کے مزکیات بھی ہیں۔ جب انسان زبان سے کہتا ہے میں ایمان لایا تو گویا اس نے اپنے دل میں محبت کے موجود ہونے کا دعویٰ کیا تو اس کی شہادت پیش کرنا لازمی ہے۔ جب انسان اپنے اعضاء و جوارح سے ان اصولوں پر عمل کرتا ہے جو ایمان کی بنیاد ہیں تو اس نے اپنے دعوے کی شہادت پیش کردی۔ جب اس نے اللہ کی راہ میں جان و مال کو خرچ کیا، ماسوا کی محبت سے اعمال کو پاک کرلیا تو اس نے اپنے شاہدوں کی صداقت کا ثبوت پیش کردیا۔ اس وقت اس کا نام محبانِ الٰہی کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے، وہ مقربین کے گروہ میں شامل ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ''کیا لوگوں نے خیال کرلیا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لائے اور انہیں آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا''۔

عقل زاہد عشق صوفی میں بس اتنا فرق ہے
اس کو خوفِ آخرت ہے اس کو ذوقِ آخرت

جو صوفی نہیں، صرف عبادت کرتا ہے اس کی عقل کو آخرت کا ڈر ہے اور جو صوفی ہے اسے آخرت میں جانے کا شوق پیدا ہوجاتا ہے۔ صوفی اور زاہد میں یہی فرق ہے۔

کابل (افغانستان) سے ایک عالمِ دین کا خط

بگرامی خدمت شیخ المکرم حضرت مولانا کاشف اسرار شریعت و طریقت وحاوی للفروع والاصول

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دَامَ فُیُوْضُکُمْ وَبَرَکَاتُکُمْ عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ...

مجھے دلائل السلوک دیکھنے کا بذریعہ دلاور خان موقع میسر آیا۔ جس سے میرے دل میں نورِ ایمان کی لہر اٹھی اور حیران ہوگیا کہ اس دورِ ظلماتی اور الحادی میں ایسا ہیرا، موتی یگانہ، دُرِ یکتا، وحید الدہر اور سراجِ منیر اس سرزمین پاک و ہند میں منور ہوا۔ اگر میں خود اپنی آنکھوں سے کتاب نہ دیکھتا، کوئی دوسرا آدمی زبانی ان واقعات و حالات کو بیان کرتا تو یقیناً دل قبول نہ کرتا، نہ ہی قابلِ قبول تھیں ظاہراً۔ گو یہ اہل السنت والجماعت کا مذہب ہے کہ ان لوگوں سے زمین خالی نہیں ہوتی، مگر ایسے جامع شریعت و حقیقت ہستی کا اس دور میں پایا جانا اگر محال نہیں تھا تو یقیناً کمیاب تو تھا اور ہے۔

میں خود اس مرض کا قدیم المریض ہوں۔ طبیبِ قلب کا سالہا سال سے متلاشی ہوں مگر جو ملا آخر وہ دکاندار ہی ثابت ہوا، اس لیے میری کشتی کنارے نہ لگ سکی نہ ہی مرض سے نجات ملی۔ اگر کوئی صورت حاضری کی میسر آئی تو حاضرِ خدمت ہوں

Scanned with CamScanner

گا۔وقتِ آخری ہے اور میں چند ایک معروضات پیش کر کے جواب لینا چاہتا ہوں۔

۱۔ کیا اذکار و اشغال مشائخ و ہیئت جلسہ ذکر، اور دو وقت ذکر کرنے اور مجموعی طور پر ذکر کرنے کا وجود قرون ثلثہ میں ملتا ہے جو قرون مشہود بالخیر ہیں۔ اگر ان کا وجود قرون ثلثہ میں موجود نہ تھا تو اس کو بدعت کہنا بعید نہ ہوگا۔

۲۔ کیا نجاتِ اخروی کے لیے اور دیگر تمام کمالات کے حصول کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول کافی نہیں کہ مزید اذکار و اشغال مشائخ بایں قیودات و تخصیصات اختیار کیے جائیں جب کہ انسان عامل بالکتاب والسنت ہے۔

۳۔ کیا علمِ سلوک و تصوف جزو دین ہے؟ اگر ہے تو قرون ثلثہ اس سے کیوں خالی رہے؟ اگر نہیں تو اس کے حصول کا کیا فائدہ؟

۴۔ اگر علمِ سلوک جزو دین ہے تو اس کے حصول کے لیے ولی کامل اور مرشد کامل کو موقوف علیہ ٹھہرانا کہاں ثابت ہے۔ اس کا حصول تو کتبِ تصوف اور کتاب اللہ اور سنت سے ہو سکتا ہے۔

۵۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ علمِ سلوک ایک باطنی علم ہے مگر حصولِ علم کے لیے زندہ اشخاص کافی ہیں علام علوم باطنیہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر جو صوفیائے کرام اور اولیائے عظام میں مشہور ہے کہ فیض روح سے بھی ہو سکتا ہے تو اہل قبور سے کس طرح ہو سکتا ہے جب بعد الدارین ہو چکا ہے، نیز فقہا میں تو بعض سرے سے سماعِ موتیٰ کا انکار کرتے ہیں جب حال یہ ہے تو فیض حاصل کرنا کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور امام صاحب کا مذہب بھی بعض عدم سماع بتاتے ہیں۔

۶۔ خدا تعالیٰ نے سوال کیے بغیر پیدائشِ انسانی، جنات و شیاطین قرآن میں بیان فرما دیں مگر روح کی پیدائش اور حقیقت باوجود سوال کے نہ بتائی جس سے خوب واضح ہوتا ہے کہ روح کوئی فرشتہ اور جن سے بھی زیادہ الطف چیز ہے تو ایسی لطیف ہستی سے فیض حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ فیض کے لیے اول روح سے ہم مجلس ہو، پھر اس کو دیکھے وہ نظر آئے پھر اس سے ہمکلام ہو، اس کی کلام سنی جائے، پھر اس سے اخذ فیض کیا جائے، چہ جائیکہ اس سے خرقہ خلافت لیا جائے جس کی کوئی نظیر آپ فرمائیں، گر ہے تو۔ جب عدم سماع بھی سامنے ہے۔

۷۔ کیا روح پر موت طاری نہیں ہوتی؟ قرآن میں كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ موجود ہے، اس کلیہ سے آپ روح کو کیسے مستثنیٰ فرماتے ہیں؟ کیا روح کے لیے بھی روح ہے جبکہ حیات کا موقوف علیہ ہی روح ہے۔

۸۔ فنا فی الرسول، فنا فی اللہ اور بقا باللہ اور مراقبات کی بھی کوئی حقیقت ہے؟ صوفیائے کرام کے نزدیک اور ان کے حصول و تحصیل کی کیا صورت ہے؟ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ طریقہ آپ ہم کو لکھ کر ارسال کر سکتے ہیں کہ ہم بھی ان کو حاصل کر کے خدا کے خاص بندوں میں داخل ہو جائیں۔ آپ سے دور افتادہ ہیں مہربانی کر کے تفصیل سے لکھیں، نیز کشف ملائکہ و جن و کشفِ قبور جن جن وظائف سے حاصل ہو جاتے ہیں وہ بھی مفصل لکھنا، مہربانی ہوگی، میں آپ کے حلقہ کا آدمی ہوں۔

Scanned with CamScanner

خط کا جواب

از حضرت العلام مولانا اللہ یار خانؒ... چکڑالہ، ضلع میانوالی

پہلے سوال کا جواب:

سب سے پہلے بدعت کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے جو چیز بوجودِ شرعی قرونِ ثلٰثہ میں موجود تھی وہ سنت ہے اور جو حکم بوجودِ شرعی قرونِ ثلٰثہ میں موجود نہ تھا وہ بدعت ہے

اب وجودِ شرعی کی تفصیل سنیے:۔

اصطلاحِ اصولِ فقہ میں وجودِ شرعی اسے کہتے ہیں جو بغیر بیانِ رسول کریم ﷺ معلوم نہ ہو سکے اور حسِ عقل کا اس میں دخل نہ ہو، اس شے کا وجود حضور اکرم ﷺ کے فرمان اور بیان پر ہی موقوف ہوگا۔ پھر بیان میں خواہ صراحت ہو، اشارۃ یا دلالۃ ہو یعنی بیان کی کوئی فرع پائی گئی تو اس حکم کا جواز ثابت ہوگا اور اس حکم کا وجود شریعت میں آ گیا، خواہ اس وقت اس حکم کی جنس بھی خارج میں موجود نہ ہو، چہ جائیکہ اس کا جزیہ ضروری ہو۔ پس جس حکم کا جواز کلیۃً ثابت ہو گیا وہ حکم بجمیع جزئیات ثابت ہوگا خواہ اس کا کوئی جزیہ بوجودِ خارجی قرونِ ثلٰثہ میں موجود ہو یا نہ ہو۔ اگر اس کلیہ کا کوئی جزیہ قرونِ ثلٰثہؓ کے بعد خارج میں وجود میں آیا وہ سنت میں داخل ہوگا، بدعت نہ ہوگا۔

یوں تو اقسامِ حدیث میں قولِ رسول ﷺ، فعلِ رسول ﷺ، تقریرِ رسول ﷺ ہوا جس میں نفسِ رسول ﷺ، عزمِ رسول ﷺ، ھمِ رسول ﷺ اور خواطر رسول ﷺ سب ہیں۔ مگر اذکار تو وہ سنت ہے جس کا ثبوت صراحۃً رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اور خیر القرون میں پایا جاتا ہے۔ اذکار و اشغال جن کی اصل کتاب و سنت میں موجود ہو اور ان کی جزئیات مشائخ نے اس اصل سے اخذ کی ہوں وہ داخلِ سنت ہوں گی کیونکہ وسائل و ذرائع حکمِ مقاصد میں داخل ہیں۔

دوسری چیز یہ سمجھ لی جائے کہ تعلق باللہ، نسبت باللہ اور توجہ الی اللہ سب مامور بہ ہیں اگرچہ کلی مشکک ہے جس کا ادنیٰ درجہ مندوب ہے اور اعلیٰ درجہ فرض ہے۔ اور سینکڑوں آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ سے ان کا مامور من اللہ ہونا ثابت ہے بلکہ تمام شریعت کا خلاصہ اجمال یہ ہے کہ مال اور اولاد سے تعلق حفاظت کا ہو اور اللہ تعالیٰ سے تعلق عبادت اور اطاعت کا ہو۔ جو شخص قرآنِ مجید اور حدیث شریف میں غور کرے، سینکڑوں آیات و احادیث سے ان کا مامور من اللہ ہونا پائے گا اور غیر سے قلبی انقطاع کا ثبوت ملے گا۔

تیسری بات یہ سمجھ لیں کہ مامور بہ اور مامور من اللہ مقصود لذاتہ ہے اور جو چیز مامور بہ ہو اس کی تحصیل کے لیے جو ذرائع اور وسائل اختیار کیے جائیں گے یا جو طریقہ مشخص کیا جائے گا یا مقید کیا جائے گا وہ بھی مامور بہ ہوگا۔ جیسے وضو کو دیکھیے مقصود لذاتہ تو نماز ہے اور نماز موقوف ہے وضو پر، لہٰذا وضو کے لیے پانی مہیا کرنا واجب ہوگا کیونکہ وہی تو وسیلہ اور ذریعہ

Scanned with CamScanner

طہارت ہے۔ اسی طرح نماز کے لیے سترِ عورت فرض ہے لہٰذا لباس کا مہیا کرنا بھی فرض ہوا، لہٰذا ذکر الٰہی کے سلسلے میں مشائخ نے جو وسائل اور ذرائع اختیار کیے یا جن ذرائع کو اصل مقصود کے لیے مشخص کیا یا مقید کیا یا موکد وغیر موکد کیا، جن پر مقصود ذاتی موقوف تھا، وہ بھی مقاصد میں داخل ہوئے، ان کو بدعت میں نہیں کہا جائے گا۔ یہ احداث فی الدین نہیں ہوگا، ہاں! احداث للدین ہوگا۔ جس طرح طبیب ہر زمانہ اور ہر موسم میں ادویہ بدلتا اور تجویز کرتا ہے، طبیب کا اصل مقصد تو صحتِ بدن انسانی ہے، اسی طرح اذکار کا اصل مقصد تعلق مع اللہ اور توجہ الی اللہ ہے جس طریقہ سے حاصل ہو وہ اختیار کرنا فرض کے حکم میں داخل ہوگا۔

یا مثلاً اعلائے کلمۃ اللہ ایک مقصد ہے اور جہاد بھی اس کا ایک ذریعہ ہے۔ جہاد جن آلاتِ حرب پر موقوف ہوگا ان کی تحصیل بھی فرض ہوگی۔ جیسے آج کے حالات کے مطابق توپ، ٹینک، ہوائی جہاز وغیرہ، ان کو اس وجہ سے بدعت نہیں کہا جائے گا کہ رسول کریم ﷺ یا صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں یا خیر القرون میں ان کا وجود نہیں تھا، بس تلوار، نیزے سے ہی کام لینا سنت ہوگا۔ معلوم ہوا کہ مقصد جب اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنا ہے مگر اس مقصد کے حصول کے لیے حالات کے مطابق ذرائع مہیا کرنا، جن پر یہ موقوف ہے وہ بھی واجب ہوگا اسے بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

چوتھی بات یہ سمجھ لیجیے کہ حدیثِ جبرئیل میں احسان کو جزوِ دین کہا گیا ہے اس لیے اس کا حاصل کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ احسان صرف جزوِ دین ہی نہیں بلکہ دین کی روح اور خلاصہ ہے۔ جس نے اسے حاصل نہ کیا اس کا دین ناقص ہے کیونکہ احسان کی حقیقت یہ بیان ہوتی ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ... حدیث میں دین کے تینوں اجزاء کا ذکر ہے۔ ایمان جو اصل ہے، اعمال جو فرع ہیں اور احسان جو ثمرہ ہے اسے چھوڑ دینا ایسا ہے جیسے ایک شخص مغرب کی نماز میں فرض کی دو رکعت پڑھ کر فارغ ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس کی نماز نہ ہوگی۔ اسی طرح احسان کو چھوڑ دینا دین کے ایک عظیم جزو کو ترک کرنا ہے، اس لیے دین ناقص رہ جائے گا۔

پانچویں یہ بات سمجھ لیجیے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہ درجۂ احسان صرف صحبتِ رسول ﷺ سے حاصل ہو جاتا تھا، صرف فرائض کی پابندی کے ساتھ صحبتِ رسول ﷺ ہوگئی تو درجۂ احسان حاصل ہو گیا اور وہ بھی اس پایہ کا کہ بڑے سے بڑا ولی ایک ادنیٰ درجے کے صحابیؓ کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب آفتابِ نبوت اوجھل ہو گیا تو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ دین کا یہ اہم حصہ جو دین کا ماحصل، کمال کا اعلیٰ درجہ اور مقصود لذاتہ ہے، حاصل ہو سکے۔

رہا دو وقت ذکر کرنے کا سوال تو یہ نص سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔

(۱) اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (صٓ: ۱۸، ۱۹)

اس حقیقت کو کشفِ صحیح کی تائید بھی حاصل ہے، اولیاء اللہ نے اس آیت سے دو امور ثابت کیے ہیں:

اول: اجتماعی ذکر، اس میں ذاکرین کے انوار کا عکس ایک دوسرے پر پڑتا ہے جس سے نحوست دور ہوتی ہے، قلب میں انبساط پیدا ہوتا ہے، ہمت قوی ہو جاتی ہے اور اس اجتماعی ذکر سے جو تاثیر پیدا ہوتی ہے وہ الفاظ میں بیان نہیں ہو

Scanned with CamScanner

سکتی، یہ کیفیت چھدنی ہے گفتنی نہیں۔

(۲) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۔۔۔(الاعراف:۲۰۵)

اس آیت میں ذکر قلبی کرنے کا حکم ہے کیونکہ خوف کا تعلق دل سے ہے زبان سے نہیں۔

دوم: صبح وشام ذکر کرنے کا حکم ہے، آخری بات یہ نکلی کہ جو شخص اس طرح ذکر نہیں کرتا وہ خدا سے غافل ہے اور ظاہر ہے کہ خدا سے غافل ہو جانے سے بڑھ کر محرومی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اس غفلت سے دین میں جو نقص پیدا ہو جاتا ہے، اس میں کلام کی گنجائش کہاں ہے؟

(۳) وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ۔۔۔(الکہف:۲۸)

(۴) وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ۔(الانعام:۵۲)

یوں تو ہر حالت میں ذکر کرنے اور ذکر کثیر کرنے کا حکم ہے مگر دو وقت اہتمام سے ذکر کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اجتماعی ذکر کے سلسلے میں صحیح حدیث موجود ہے کہ:

مَا مِنْ قَوْمٍ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْ بِهِمُ الْمَلَآئِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَتَنَزَّلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا يَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ۔۔۔(جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ماجاء فی القوم یجلسون فیذکرون اللہ مالھم من الفضل، ۲:۱۷۳)

اس حدیث میں اجتماعی ذکر کا ثبوت موجود ہے، پھر اس نعمت کا ذکر ہے کہ اس مجلس کو ملائکہ گھیر لیتے ہیں، رحمت باری اور سکونِ قلبی نازل ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس مجلس میں بیٹھنے والا بھی بدبخت نہیں رہ سکتا۔

پھر صحیح حدیث موجود ہے کہ ملائکہ کی ایک جماعت حلقۂ ذکر کی تلاش میں پھرتی رہتی ہے، جہاں کہیں کوئی مجلسِ ذکر پاتے ہیں دوسرے فرشتوں کو بلاتے ہیں اور اس مجلس میں بیٹھ جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ذکر کا مامور من اللہ ہونا اور صبح وشام اہتمام سے ذکر کرنا نص سے ثابت ہے۔

دوسرے سوال کا جواب:

ذکرِ کثیر جو تمام اوقات کو شامل ہے اور صبح وشام ذکر کرنے کا مامور من اللہ ہونا نصوص قرآنی اور حدیث نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تو یہ ذکر کرنا بھی عمل بالکتاب والسنت ہے ان کو ایک دوسرے سے جدا کیوں سمجھا جائے؟ حدیث جبرئیل سے ظاہر ہے کہ عقائد (ایمان) اور اعمال (اسلام) کے علاوہ بھی دین کا ایک حصہ ہے جس کا پورا کرنا اور اس فرض کو بجالانا ضروری ہے جسے احسان کہا گیا ہے اسی کو تصوف کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسان، کامل طور پر عامل بالکتاب والسنت ہو ہی نہیں سکتا جب تک ذکر کثیر بالعموم اور صبح وشام ذکر بالخصوص اہتمام سے نہ کرے۔

Scanned with CamScanner

تیسرے سوال کا جواب:

پہلے سوال کے جواب میں بیان کر دیا گیا ہے کہ تصوف جزو دین ہے۔

چوتھے سوال کا جواب:

کوئی علم یا فن کسی استاد کی شاگردی اختیار کیے بغیر نہیں سیکھا جا سکتا۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کا صحیح فہم حاصل کرنا کامل اور ماہر استاد کے تعلیم دینے پر موقوف ہے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے کتاب اللہ کے اسرار اور سنت رسول ﷺ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکتی، پھر اس کلیہ سے تصوف کو مستثنیٰ کیوں کیا جائے، اس کے سیکھنے کے لیے مرشدِ کامل کی ضرورت کا انکار کیوں کیا جائے جبکہ وہی فن سکھانے کی مہارت اور اہلیت رکھتا ہے۔ کتبِ تصوف سے نشانِ راہ تو مل سکتا ہے مگر منزل تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ حالات، واردات، کیفیات اور روحانی ترقی کے لیے مراقبات، کتابوں سے سیکھنے کی چیز ہی نہیں کیونکہ واضع نے ان کے لیے الفاظ وضع ہی نہیں کیے۔ یہ کمالات شیخ کامل کے سینے سے حاصل ہوتے ہیں، شیخ کے باطن سے اور اس کی روح سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس نے ولایت اور معرفت کا عملی نمونہ دیکھا ہی نہیں وہ عارف کیسے بنے گا۔ ہاں! ضرورت اس بات کی ہے کہ شیخ کامل ہو، دل کا اندھا نہ ہو، قوی القلب ہو، جس کے قلب کے انوار اتنے قوی ہوں کہ سالک کی روح اور اس کے باطن کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

پانچویں، چھٹے اور ساتویں سوال کا جواب:

اولیاء اللہ کے ارواح سے اور ان کی قبور سے فیض حاصل کرنا اہلِ سنت والجماعت کا اجماعی مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق سوال کرنا مذہب اہلِ سنت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، رہا بُعد الدارین کا اشکال تو یہ بُعد جسم کے لیے ہے، روح کے لیے بُعد نہیں۔ معراج کی متواتر احادیث کیا آپ کے پیش نظر نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے جا بجا اہلِ برزخ کو دیکھا، ان کو راحت کی حالت میں بھی دیکھا، انبیا کی امامت بھی کرائی، ان سے کلام ہوئی حالانکہ وہ برزخ میں تھے اور حضور ﷺ دنیا میں تھے۔ گو اس میں محدثین کا اختلاف ہے کہ مسجد اقصیٰ میں انبیا کے ارواح حاضر ہوئے یا روح مع الجسم۔ میں ذاتی طور پر امرِ ثانی کا قائل ہوں۔ دیکھیے حضرت موسیٰؑ سے کتنا فیض ہوا کہ پچاس کی جگہ پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ کیا اس کے بعد بھی روح سے فیض لینے میں شبہ رہ سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ سالک روح کو دیکھتا کیسے ہے، کلام کیونکر ہوتی ہے۔ فیض کس طرح ہوتا ہے۔ سوال و جواب کیسے ہوتے ہیں؟ روح کی حیات کس طرح کی ہے وغیرہ؟ تو یہ چیزیں بتائی نہیں جا سکتیں، البتہ سیکھی اور سکھائی جا سکتی ہیں۔ میں تصوف کو جزو دین اور روحِ دین سمجھتا ہوں اور تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ جسے سلوک سیکھنا ہو بندہ کے پاس ان شرائط کے ساتھ رہے جو میں پیش کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ دکھا دوں گا کہ روح سے فیض کیسے اخذ کیا جاتا ہے۔ وہ شخص روح سے کلام کر لے گا، قبر کے عذاب و انعام کو دیکھ لے گا، انبیاءؑ کی روحوں سے ملاقات کرے گا اور حضور اکرم ﷺ کے

Scanned with CamScanner

دستِ مبارک پر روحانی بیعت کرادوں گا بشرطیکہ وہ شخص متبعِ سنت ہو، خلوص لے کر آئے۔ پھر سماعِ موتیٰ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ گو دلائل سمعیہ بھی سماع کے مؤید ہیں، ان کا انکار صرف جاہل اور ضدی ہی کر سکتا ہے۔

دورِ صحابہؓ میں کشف والہام بغیر ریاضت ومجاہدہ کے حاصل ہو جاتا تھا۔ صحبتِ رسول کی موجودگی میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

حیاتِ روح کی حقیقت یہ ہے کہ روح کی حیات نور سے ہے، جس طرح روح، محرکِ بدنِ انسانی ہے، اسی طرح نور، محرکِ روح ہے۔ اور محرکِ نور، ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ روح کے بدن سے جدا ہونے سے تصرف وتدبیر کا تعلق بدن سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس جدائی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ روح فانی نہیں، روح کی فنا ہے اور بقا وزمانی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ... (آل عمران:۱۸۵) کی حقیقت بھی سمجھ لیں۔ قانون ہے کہ ذائق، مذوق کے بعد زندہ رہتا ہے جیسے انسان ذائق ہے اور روٹی مذوق۔ روٹی کھائی گئی، انسان زندہ موجود ہے۔ اسی طرح روح ذائق ہے اور موت مذوق ہے اس لیے موت کے بعد روح زندہ رہتی ہے۔

سماعِ موتیٰ کے مسئلہ میں امام صاحب کے متعلق جو غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ عدمِ سماع کے قائل تھے۔ یہ درست نہیں۔ دیکھیے 'عرف شذی':

وَاشْتَهَرَ عَلَى أَلْسِنَةِ النَّاسِ أَنَّ الْمَوْتٰى لَيْسَ لَهُمْ سِمَاعٌ عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ وَصَنَّفَ مُلَّا عَلِيُّ قَارِيٌّ رِسَالَةً وَذَكَرَ فِيْهَا أَنَّ الْمَشْهُوْرَ لَيْسَ لَهُ أَصْلٌ مِنَ الْأَئِمَّةِ أَصْلًا...

(عرف شذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء ما يقول الرجل اذا دخل المقابر، ۳۸۶)

"اور لوگوں کی زبانوں پر یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سماعِ موتیٰ کے قائل نہیں۔ ملا علی قاری نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ عدمِ سماع کے قائل تھے اس کی کوئی سند نہیں، یہ بالکل بے اصل ہے۔"

اور اہل السنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ میت کو عالمِ برزخ میں دنیا کے حالات کا علم ہوتا ہے، دیکھیے 'عرف شذی':

فِي شَرْحِ الْمَقَاصِدِ أَنَّ عِلْمَ الْمَيِّتِ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ... (ایضًا، ۳۸۷)

"شرح مقاصد میں ہے کہ میت کو علم ہونا اجماعی عقیدہ ہے۔"

اور ظاہر ہے کہ علم بغیر حیات کے محال ہے اور 'عرف شذی' میں ہے۔

وَأَمَّا الْمُحَقِّقُوْنَ أَنَّ أَبَا حَنِيْفَةَ لَا يُنْكِرُ سِمَاعَ الْأَمْوَاتِ... (ایضًا، ۳۸۶، ۳۸۷)

"محققین کا مذہب یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ سماعِ موتیٰ کے منکر نہیں تھے۔"

Scanned with CamScanner

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی 'لمعات' میں فرماتے ہیں:

"وبالجملہ کتاب و سنت مملو د مشحون اند کہ دلالت می کنند بر وجود علم موتی را بدنیا و اہل آنِ پس منکر نشود آنرا مگر جاہل با خبار و منکر دین و مشائخ گفتہ اند ہر کہ ایں اعتقاد ندارد۔ ایمان بحقیقت نبوت ندارد؟" (لمعات، ۳: ۴۰۱)

معلوم ہوا کہ روح زندہ ہے۔ جو کمالات اسے دنیا میں حاصل ہوتے ہیں جسمانی موت کے بعد روح سے چھین نہیں لیے جاتے۔ جو علم اس نے دنیا میں حاصل کیا تھا برزخ میں اس سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ حاصل کرنے والا برزخ سے روح کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی قوت رکھتا ہو جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو نمازوں کی تعداد میں کمی کرنے کی درخواست کرنے اور کم کرانے کا فائدہ حاصل ہوا تھا۔

آٹھویں سوال کا جواب:

فنا فی الرسول، فنا فی اللہ اور بقا باللہ سلوک کے وہ منازل ہیں کہ ہزاروں اللہ کے بندے ان کے حصول کے لیے کوشاں رہے، مجاہدے اور ریاضتیں کرتے رہے اور یہی آرزو لے کر دنیا سے رخصت ہوئے، ان منازل کے حصول کے لیے سچی تڑپ انسان کی سعادت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ مگر یہ منازل صرف زبانی اوراد و وظائف سے حاصل نہیں ہوتے، یہ قلب اور روح کا معاملہ ہے اور صرف ذکرِ لسانی سے تصفیہ قلب اور تزکیۂ باطن نہیں ہو پاتا بلکہ ان منازل کے حصول کے لیے دوسری شرائط ہیں، سب سے پہلے اصلاحِ قلب کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ذکرِ قلبی کثرت سے کیا جائے۔ اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت کا اہتمام کیا جائے۔ اصلاحِ قلب ایسا کمال ہے جو شیخِ کامل کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

اور:

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے
ہست محبوبے نہاں اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنمائمت

شیخ کامل کی رہنمائی میسر آ جائے تو اتباعِ سنت کا اہتمام لازمی طور پر کیا جائے۔

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پے مصطفیٰ

شیخ کامل اس راہ پر اس ترتیب سے چلاتا ہے کہ سب سے پہلے لطائف کراتا ہے، جب وہ منور ہو جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

مراقبہ احدیت کراتا ہے۔ جب یہ رابطہ خوب مضبوط ہو جائے تو شیخ اپنی روحانی قوت سے مراقبہ معیت پھر اقربیت کراتا ہے۔ پھر دوائرِ ثلاثہ، پھر مراقبہ اسم الظاہر والباطن۔ یہ مراقبات عالمِ ملکوت سے گزار کر شیخ کامل کراتا ہے۔ پھر مراقبہ سیر کعبہ، پھر سیر صلوٰۃ پھر سیر قرآن، اس کے بعد مراقبہ فنافی الرسول کراتا ہے اور دربارِ نبوی میں حاضری ہوتی ہے۔ فنافی الرسول کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حضور اکرم ﷺ کی محبت اور آپ کی سیرت میں فنا ہو جائے۔ پھر شیخ کامل توجہ روحانی سے فنافی اللہ اور بقا باللہ کا مراقبہ کراتا ہے۔ یہ ذکرِ لسانی سے حاصل نہیں ہوسکتیں بلکہ شیخ کامل کی توجہ سے ذکرِ قلبی کرنے سے یہ مقامات حاصل ہوتے ہیں۔

مراقبہ عبودیت میں سالک خود کو ایسی جگہ پاتا ہے جہاں زمین و آسمان اور مافیہا، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، میدان، درخت، جھاڑیاں حتیٰ کہ ایک ایک تنکے کو سربسجود پاتا ہے۔

ہر نجم و شجر اللہ کے حضور سجدہ ریز سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی... کہہ رہا ہے۔

کائنات کی ہر چیز کا تسبیح و تحمید کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

قَدْ فَطَرَ اللّٰهُ الْجَمَادَاتِ عَلٰى تَسْبِيْحِهٖ وَتَحْمِيْدِهٖ وَتَنْزِيْهِهٖ لُطْفًا وَتَسْبِيْحُهَا تَسْبِيْحٌ حَقِيْقِيٌّ...

اسی طرح انسانوں کے متعلق بھی تسبیح کے یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مخلوق دو قسم ہے، ذوی العقول اور غیر ذوی العقول۔ ذوی العقول یعنی انسان، معرفت الٰہی اور عبادت الٰہی کے لیے پیدا ہوا ہے اور غیر ذوی العقول، اللہ کی تسبیح و تہلیل کے پیدا ہوئے ہیں۔

ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں ایک مراقبہ جمادات و اشجار بھی ہے۔ میں یہ مراقبہ نہیں کرایا کرتا کیونکہ خام آدمی کے لیے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس مراقبہ میں پتھروں اور درختوں، پانی اور ہوا کی بولی سکھائی جاتی ہے اور صوفی کامل ان غیر ذی روح چیزوں سے کلام کرسکتا ہے اور ان کی کلام سمجھ سکتا ہے۔

ملائکہ، جنات، شیاطین اور روح سے کلام ہونا تو سلوک کی ابتدائی باتیں ہیں۔ ہاں! اس سلسلے میں طبائع انسانی کے اختلاف کی وجہ سے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بعض سالک ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں سلوک میں منازل بالا حاصل ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ عالمِ امر اور عالمِ حیرت کے منازل بھی طے کر لیتے ہیں مگر انہیں مشاہدات نہیں ہوتے۔ یہ بھی اللہ کی شان ہے اور اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت پنہاں ہوتی ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جنہیں بالکل ابتدا میں مشاہدات کی نعمت عنایت فرما دیتا ہے، ایسے لوگوں کو رویئت اشکال کا مراقبہ بھی کرایا جاتا ہے۔ اس مراقبہ میں روح کی اصل شکل بھی جو بعد موت ہوگی سامنے آجاتی ہے۔ اس مادہ پرستی کے دور میں بہت کم ایسے آدمی ملتے ہیں جن کی روح انسانی شکل پر ہو، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ...

علمائے قشر ایسی باتوں کا انکار کر دیتے ہیں، اس کی وجہ عدم علم ہے۔ ایسے انکشافات بالخصوص کشفِ قبور کے متعلق شبہ کی گنجائش تو حال کی سائنس کی ایجادات نے چھوڑی ہی نہیں۔ مثال کے طور پر ٹیلی ویژن کو لیجیے۔ ٹیلی ویژن اسٹیشن اور ریسونگ سیٹ (Receiving Set) کے درمیان طویل مسافت کے باوجود آواز بھی سنائی دیتی ہے، تصویر بھی سامنے آجاتی ہے اور آدمی کی تمام حرکات و سکنات بھی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کشفِ قبور میں جب روح سے کلام ہوتی ہے تو روح بھی سامنے

Scanned with CamScanner

آجاتی ہے، اس کی کلام بھی سنائی دیتی ہے۔

جمادات میں شعور کے موجود ہونے کا ثبوت قرآن وحدیث میں موجود ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ... (بنی اسرائیل: ۴۴)

اور: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ... (بنی اسرائیل: ۴۴)

اور: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ... (الحج: ۱۸)

بعض مفسرین کا قول ہے کہ سجدہ سے دلالت علی الصانع مراد ہے مگر یہ قول درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ الناس کے ساتھ کثیر کی قید نے اس تاویل کو اڑا دیا ہے۔ کیونکہ صانع پر تو تمام جہان دلالت کرتا ہے، مصنوع، دال علی الصانع ہوتا ہے اور كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ... سے ظاہر ہے کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو دال علی الصانع نہیں اور یہ بات اصولاً غلط ہے۔ مصنوع ہو اور دال علی الصانع نہ ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ قول غلط ٹھہرا، لہٰذا سجدہ اور تسبیح حقیقی ثابت ہوئی۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں یہ حدیث موجود ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُلَبِّيْ اِلَّا لَبّٰى مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَ شِمَالِهٖ مِنْ حَجَرٍ اَوْ شَجَرٍ اَوْ مَدَرٍ حَتّٰى يَنْقَطِعَ الْاَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَ هٰهُنَا... (سنن الترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی فضل التلبیة والنحر، ۱:۱۰۲)

"حضرت سہلؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلم تلبیہ کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں کے تمام پتھر درخت ڈھیلے تک تلبیہ کہتے ہیں حتیٰ کہ مشرق سے مغرب تک تمام تلبیہ کہتے ہیں۔" (حاجی کی تلبیہ سن کر)

اس حدیث سے اہلِ کشف کے اس کشف کی تصدیق ہوتی ہے کہ جمادات میں شعور اور حس موجود ہے جس سے وہ تلبیہ کی آواز سنتے ہیں اور خود کلام کرتے ہیں۔

اور ابوداؤد میں ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْحَصَاةَ لَتُنَاشِدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يُخْرِجُهَا مِنَ الْمَسْجِدِ... (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوۃ، باب فی حصی المسجد، ۱:۱۰۹)

"حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص مسجد حرام سے کنکریاں اٹھا کر باہر لے جانا چاہے تو وہ کنکریاں اس کو خدا کا واسطہ دیتی ہیں کہ انہیں وہیں رہنے دے، باہر نہ لے جائے۔"

یہ حدیث بھی اہل کشف کی تصدیق کرتی ہے کہ کنکریوں میں شعور و ادراک ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک حدیث بخاری اور ترمذی میں آئی ہے:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنَّ جَبَلَ اُحُدٍ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ...

"احد ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔"

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَعَ لَهٗ اُحُدٌ فَقَالَ هٰذَا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهٗ...(جامع الترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل المدینه، ۲:۲۳۱؛ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب احد یحبنا، ۲۶:۳)

اس حدیث میں محبت کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جمادات میں شعور اور حس موجود ہے۔ نُحِبُّهٗ... سے محبت حقیقی مراد ہے تو یُحِبُّنَا... میں بھی محبت کا لفظ حقیقی معنوں پر محمول ہوگا۔ ہاں مسئلہ ظنی ہے، داخل عقائد نہ گا۔

جمادات اور اشجار کو تسبیح و تہلیل، تحمید و تنزیہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اپنا مقصدِ تخلیق پورا کر رہے ہیں مگر انسان جو معرفت الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ خدا سے غافل ہو گیا ہے۔ انسان اگر اپنا مقام پہچان لے اور قرب الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول میں لگ جائے تو اس کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی بن جائے اور اس کا واحد ذریعہ ذکرِ الٰہی کی کثرت ہے۔

یہ خیال رہے کہ مشاہدات، مکالمات اور مکاشفات کا حاصل ہو جانا یا جمادات اور ارواح سے کلام کر لینا کمال کی چیز نہیں۔ اصل کمال قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی کا حصول مقصود ہے۔

اللہ کی اطاعت اور عبادت۔ اس لیے صوفی کامل کے لیے ضروری ہے کہ مشاہدات وغیرہ تمام چیزوں سے صرف نظر کرتا ہوا اپنی منزل مقصود یعنی قرب الٰہی کی طرف بڑھتا چلا جائے اور یہ مقصد شیخ کامل کی رہبری سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

کابل (افغانستان) سے ایک عالمِ دین کا خط

جب 'دلائل السلوک' طبع ہوئی اور افغانستان میں کسی عالم کے پاس پہنچی تو انہوں نے حضرتؒ کی خدمت میں یہ خط بھیجا، اس کا جواب بھی حضرتؒ نے دیا۔

پہلا سوال:

کیا اذکار و اشغال مشائخ وہیئت جلسہ ذکر اور دو وقت ذکر کرنے اور مجموعی طور پر ذکر کرنے کا وجود قرونِ ثلٰثہ میں ملتا ہے جو قرون مشہور بالخیر ہیں۔ اگر ان کا وجود قرونِ ثلٰثہ میں موجود نہ تھا تو اس کو بدعت کہنا بعید نہ ہوگا۔

الجواب: جواب میں اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے بدعت کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ بدعت وہ چیز ہے جس کی اساس یا بنیاد خیر القرون میں موجود نہ ہو۔ (نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ کو، تابعین کے زمانہ کو اور تبع تابعین کے زمانہ کو خیر القرون کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سب زمانوں سے بہتر یہ تین زمانے ہیں) اور اگر حکمِ شرعی

سے اس کی بنیاد ہو خواہ اس پر عمل ہو سکا یا نہ ہو سکا تو وہ بدعت نہیں ہے۔اب وجودِ شرعی کی تفصیل سنیے۔وجودِ شرعی کیا چیز ہے۔ وہ چیز جو جب تک حضور ﷺ بیان نہ فرمائیں، معلوم نہ ہو سکے اور محض عقلِ انسانی سے یا اپنی سوچ و بچار سے گھڑی نہ جائے۔وہ چیز واضح حضور ﷺ کا بیان ہو یا اس طرف حضور ﷺ نے کوئی اشارہ فرمایا ہو یا آپ ﷺ کا کوئی عمل اس پر دلالت کرتا ہو تو سنت ہو گی۔یعنی کسی چیز کی اصل اور بنیاد پائی گئی اور حضور ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ ایسا ہونا چاہیے۔ اس وقت وہ نہ ہو سکا تو وہ کام بھی سنت ہو جائے گا اور جس حکم کی بنیاد ثابت ہو گئی اس کے پھر سارے حصے اور جزئیات بھی ثابت ہو جائیں گے۔اس چیز کا کوئی حصہ، جزو یا کوئی ایسا کام جو اسے کرنے کے لیے ضروری ہے وہ بھی بعد میں وجود میں آیا تو سنت میں داخل ہو گا، بدعت نہ ہو گا۔حضور ﷺ کا ارشاد فرمانا حدیث ہے۔آپ ﷺ نے کوئی کام کیا، وہ بھی حدیث ہے، آپ ﷺ کی تقریر یعنی بیان بھی حدیث ہے۔حواجسِ نفس رسول ﷺ یعنی آپ ﷺ کے دل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ پیدا ہوا لیکن اس وقت وہ کام نہ ہو سکا تو اس کام کا کرنا بھی سنت ہے۔عزمِ رسول ﷺ، ھمِ رسول ﷺ (خیالِ رسولؐ) اور خواطرِ رسول ﷺ (سوچ وخیالِ رسول ﷺ) کا مطلب بھی یہی نکلتا ہے۔یہ ساری چیزیں سنت ہیں۔ مگر جہاں تک ذکر اذکار کا تعلق ہے تو یہ تو وہ سنت ہے جس کا تعلق حضور ﷺ سے بھی تھا۔صحابہ کرامؓ کا عمل بھی تھا، خیر القرون کے متقدمین کا عمل بھی تھا۔جب ذکر اذکار کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے، ذکر کرنا حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے ثابت ہے تو پھر ذکر کرنے کے لیے جزئیات مشائخ وضع کرتے ہیں۔لوگوں کے مختلف مزاج ہوتے ہیں، انہیں مختلف طرح سے ذکر کراتے ہیں تو یہ جزئیات بھی سنت ہوں گی کیونکہ مشائخ نے یہ جزئیات بھی قرآن وسنت سے اخذ کی ہوں گی۔وسیلہ اور ذریعہ کسی حکم کا مقصد ہے کہ یہ کرو، تو وہ وسیلہ اور ذریعہ اسی مقصد کے حکم میں داخل ہو گا۔

دوسری چیز یہ سمجھ لی جائے کہ اللہ سے تعلق اور نسبت قائم رکھنا اور متوجہ الی اللہ رہنا، ان کا اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اگرچہ کلی مشکک ہے یعنی کسی فعل کے کئی اجزاء ہوتے ہیں مثلاً ایک سے سو تک اس کے حصے ہیں۔اس کا ایک حصہ بھی ادا کر دیا جائے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے اگرچہ کمال حاصل نہیں ہوتا۔اس کے دس حصے بھی ادا کیے جا سکتے ہیں جتنی اللہ توفیق دیں اور کوئی سو فیصد اس پر عمل کر لیتا ہے تو اسے کہتے ہیں کلی مشکک یعنی اس کا کل کیا جائے یا ایک جزو کیا جائے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ بہت مناسب ہے کہ جو کم از کم درجہ ہے وہ حاصل کیا جائے اور اس کا کمال حاصل کرنا اور اس کے لیے عمر بھر کوشش کرنا، محنت، مجاہدہ کرنا، یہ فرض ہے۔ذکر کا حکم کیونکہ قرآن کی آیت سے ثابت ہے تو ذکر کا حکم کلی مشکک ہے۔یعنی ایسا فعل جس کے بہت سے درجے ہوں اور چھوٹے سے چھوٹے درجے پر عمل کر لیا جائے تو بندہ نافرمان نہیں کہلاتا۔یعنی اس نے جو عمل کیا اس پر قناعت نہ کرے، اس کا کمال حاصل کرنا فرض ہے کیونکہ حکم سو درجے کا ہے تو سو تک پہنچنا چاہیے۔اس کے لیے محنت مجاہدہ کرے کیونکہ یہ فرض ہے۔قرآن کی سینکڑوں آیات اور سینکڑوں احادیثِ مبارکہ سے ذکر کا حکم ثابت ہے۔قرآن وحدیث پر غور کیا جائے تو یہ چیز واضح ہو جاتی ہے۔تمام شریعت کا خلاصۂ اجمال یہ ہے یعنی شریعت کا اصل مغز اور حاصل یہ ہے کہ ہر کام میں اس کی اطاعت کرے اور عبادات میں پختہ تر رہے۔انسان کو دنیا میں رہنا ہے، دنیا سے برتنا ہے، روزی بھی کمانی ہے،

Scanned with CamScanner

بچوں کو بھی پالنا ہے، گھر بھی بنانا ہے، لباس، غذا، ملازمت یا کاروبار کی ضرورت ہے لیکن ان سب چیزوں سے تعلق ایسا ہو جیسا کسی امین کا امانت سے ہوتا ہے کہ یہ چیزیں اللہ کی ہیں، اس نے میرے پاس امانت رکھوائی ہیں۔ اس کی رضا کے لیے اس کی مرضی کے مطابق ان کو سنبھالنا میری ذمہ داری ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق اس کی اطاعت اور عبادت کا ہو۔

تیسری بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ جس چیز کا حکم اللہ کریم دے دیتے ہیں کہ ایسا کرو وہ مقصود لذاتہ ہے یعنی ویسا کرنا مقصدِ حیات بن جاتا ہے کہ وہ ضرور کیا جائے یہ کوئی ضمنی چیز نہیں ہوتی۔ جس کام کے کرنے کا حکم دیا جائے کہ ایسا کرو تو اس کام کے کرنے کے طریقے اور ذرائع اس کے حکم میں داخل ہوں گے مثلاً حکم ملا ہے کہ قرآن کی تلاوت کرو، اب قرآن کا دستیاب کرنا، کتاب اللہ کا لینا، کسی سے سیکھنا، یہ سارے ذرائع ہیں، یہ اسی حکم میں داخل ہوں گے۔ یہاں اعلیٰ حضرتؒ نے مثال دی ہے کہ اللہ نے صلوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے ہر صلوٰۃ اپنے وقت پر فرض ہوتی ہے۔ اب ہم کہیں کہ فجر کے وقت ظہر پڑھ لیں تو نہیں ہوگی۔ جب ظہر کا وقت ہوگا تو فرض ہو جائے گی۔ وضو فرض نہیں ہے لیکن جب صلوٰۃ کا وقت ہوگا تو وضو بھی فرض ہو جائے گا کیونکہ وضو صلوٰۃ کی ضرورت ہے۔ کپڑوں کا پاک ہونا ہر وقت فرض نہیں لیکن جب صلوٰۃ کا وقت ہوگا تو لباس کا پاکیزہ ہونا فرض ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ صرف وضو نہیں، وضو کے لیے پانی کی تلاش بھی واجب ہو جاتی ہے یعنی پانی تلاش کرنا بھی فرض ہو جاتا ہے حالانکہ پانی کو ڈھونڈنا کوئی فرض نہیں۔ اسی طرح نماز کے لیے سترِ عورت فرض ہے یعنی بغیر سترِ عورت کے یا برہنہ حالت میں تو صلوٰۃ ادا نہیں کی جا سکتی لہٰذا لباس کا مہیا کرنا بھی فرض ہو جائے گا کہ صلوٰۃ کے وقت لباس پورا ہو۔ اسی طرح اصل مقصد تو ذکرِ الٰہی ہے جس کا قرآن و سنت میں حکم موجود ہے۔ اب مشائخ حضرات نے جو ذرائع، طریقے اور سلیقے مقرر کیے ہیں وہ اس لیے فرض ہو جائیں گے کہ اصل مقصد تو ذکر کا اور برکات کا حصول ہے اس لیے ان کو بدعت نہیں کہا جائے گا۔ اور یہ احداث فی الدین نہیں ہوگا یعنی یہ دین میں نئی بات گھڑنے کے مطابق نہیں ہوگا۔ احداث ہوتا ہے کوئی نئی چیز گھڑ کے داخل کرنا جس طرح طبیب جب دوا دیتا ہے ایک ہی دوا دس مریضوں کو دیتا ہے تو بدرقہ بدل دیتا ہے، کسی کو کہتا ہے دوا پانی سے لینی ہے، کسی کو چائے سے، کسی کو عرق گلاب سے دوا لینے کی تاکید کرتا ہے حالانکہ مرض ایک ہی ہوتا ہے۔ کہیں بدرقہ بدل دیتا ہے کہیں دوا بدل دیتا ہے۔ ایک بندے کو بخار ہے اسے اور دوا دیتا ہے دوسرے کو بخار ہے تو اسے اور دوا دیتا ہے۔ جتنا بھی بدلتا رہے اس کا اصل مقصد تو حصول صحت ہے۔ اسی طرح اذکار کا اصل مقصد تعلق مع اللہ اور توجہ الی اللہ ہے۔ جس طرح لوگوں کے مزاج اور ضرورتیں ہیں، مشائخ عظام نے شریعت کے مطابق وہ قیدیں لگائی ہیں اور جو بھی طریقے بتائے ہیں وہ اس فرض کے حکم میں داخل ہوں گے مثلاً اللہ جل شانہٗ کے دین کو اور کلمہ کو غالب کرنا مقصد ہے۔ اس کا ایک ذریعہ جہاد ہے۔ اب اگر کفار کے مقابلے میں جہاد فرض ہوگا تو جہاد کے لیے جن ہتھیاروں کی ضرورت ہے وہ بھی فرض ہو جائیں گے حالانکہ ہتھیار جمع کرنا کوئی فرض تو نہیں ہے لیکن جب جہاد فرض ہوگا تو اس مقصد کے حصول کے ذرائع بھی فرض ہو جائیں گے۔ اب اگر کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں تو تلوار تھی اور یہ رائفل، جہاز، ٹینک وغیرہ تو بدعت ہیں، یہ بدعت نہیں ہوں گے۔ زمانے یا وقت کے ساتھ ذرائع بدل گئے، مقصد نہیں بدلا۔ جب مقصد فرض ہے تو ذرائع بھی اسی فرض کے حکم

Scanned with CamScanner

میں داخل ہوں گے لہٰذا اسے بدعت نہیں کہا جائے گا۔

چوتھی بات یہ سمجھ لیجیے کہ حدیثِ جبریٔل میں احسان کو جزوِ دین کہا گیا ہے۔ وہ حدیثِ جبریٔل کہ ایمان کیا ہے، اسلام کیا ہے، اور احسان کیا ہے؟ جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے کہ تُو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو کم از کم یہ یقین ہو کہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ... او کما قال رسول اللہ ﷺ۔"

جب احسان کو جزوِ دین قرار دیا گیا ہے اور یہ دین کا حصہ ہے تو جس طرح دین واجب ہے اسی طرح یہ بھی واجب ہو جائے گا۔ احسان خلوص سے عبادت کرنا ہے اور خلوص کے بغیر تو کوئی کام بھی نہیں۔ ایمان میں اگر خلوص نہیں تو وہ منافقت ہے، عبادات میں خلوص نہیں تو وہ ریاء ہے یعنی عقیدے سے لے کر عمل تک کوئی کام خلوص کے بغیر نامکمل ہے اور خلوص ہی کو احسان کہا گیا ہے۔ جس نے اسے حاصل نہ کیا اس کا دین ناقص ہے کیونکہ احسان کی حقیقت یہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ حدیث میں دین کے تین اجزاء بیان ہوئے ہیں۔ ایمان اصل ہے اور اعمال فرع (یعنی اس کے حصے) ہیں، ان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کہے کہ میرے پاس مکان تو ہے لیکن اس میں دیواریں اور چھت نہیں ہے تو کون مانے گا کہ اس کے پاس مکان ہے۔ یہ دیواریں چھت اور فرش، دروازے وغیرہ مکان کی فروعات میں شامل ہیں، اس کے جزو اور حصے ہیں۔ ایمان اگر مکان ہے تو اعمال اس کے حصے ہیں ان ہی سے ایمان مکمل ہوتا ہے۔ مکمل ایمان بھی ہو اور عمل بھی ہو تو اس پر جو پھل لگتا ہے وہ خلوص اور احسان ہے اور یہی اس کا ماحصل ہے۔ جب دین کے تین حصے بیان ہوئے۔ ایمان، اعمال اور احسان تو اگر کوئی احسان کو چھوڑ ہی دیتا ہے تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے مغرب کی نماز میں اس کے دو فرض پڑھے، تیسرا چھوڑ دیا تو وہ بھی نامقبول ہوں گے، اس کی نماز پوری نہیں ہوگی۔ اسی طرح احسان کو چھوڑ دینا دین کے ایک عظیم جزو کو ترک کرنا ہے اس لیے دین ناقص رہ جائے گا۔

پانچویں بات یہ سمجھ لیجیے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں درجۂ احسان صرف صحبتِ رسول ﷺ سے حاصل ہو جاتا تھا حالانکہ اس زمانے میں بھی لوگ حلقۂ ذکر بناتے تھے۔ جیسے وہ مشہور حدیث ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی،

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ ... الخ (الکھف:۲۸) تو حضور ﷺ حجرۂ مبارک سے تشریف لائے تو کچھ لوگ ایک طرف بیٹھے مسائل پر بات کر رہے تھے، کوئی دینی موضوع چل رہا تھا کچھ لوگ ایک طرف بیٹھے ذکر کر رہے تھے تو حضور ﷺ ذاکرین کے حلقے میں جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے ویسے لوگ بھی عطا فرما دیئے ہیں۔ تو اگرچہ یہ اس دور میں بھی ثابت ہے لیکن اس دور میں اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ذکر اذکار سے جتنی بھی ہم کوشش کریں وہ بات نہیں بنتی جو ایک نگاہِ رسول ﷺ سے بنتی تھی۔ آپ ﷺ کی نگاہِ عالی جسے نصیب ہوتی وہ شرفِ صحابیت سے سرفراز ہو جاتا۔ حضور ﷺ نے اس کی طرف نہیں دیکھا لیکن ایمان کے ساتھ اس نے حضور ﷺ کو دیکھ لیا تو بھی صحابیؓ ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

فرائض کی پابندی کے ساتھ صحبتِ رسول ﷺ حاصل ہوگئی اور صحابیت کا لفظی ترجمہ تو صحبت حاصل کرنا ہے لیکن اصطلاحی اور شرعی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ کمالاتِ انسانی میں اپنی حیثیت کے مطابق انتہائی درجۂ کمال کو پہنچ جائیں۔ ولایت، صحابیت کی جوتیوں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ ساری دنیا کے ولی اکٹھے کیے جائیں تو کسی صحابیؓ کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوسکتے۔ صحابیت اتنی بلند ہے کہ جہاں سے درجہ صحابیت شروع ہوتا ہے وہاں ہر طرح کی ولایت ختم ہوجاتی ہے۔

تو فرمایا: اس پائے کا بڑے سے بڑا ولی ایک ادنیٰ درجے کے صحابیؓ کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب آفتابِ نبوت اوجھل ہوگیا تو مجاہدات وریاضات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ دین کا یہ اہم حصہ جو دین کا ماحصل اور کمال کا اعلیٰ درجہ یا مقصود لذاتہ (مقصدِ حیات) ہے، حاصل ہوسکے۔ رہا دو وقت ذکر کرنے کا سوال تو یہ نص سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے،

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ○ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ۖ كُلٌّ لَهُ أَوَّابٌ ○ (ص:۱۸۔۱۹)

قرآن کی آیت میں ہے کہ ہم نے پہاڑوں کو حکم دے رکھا ہے کہ ان کے ساتھ صبح اور شام تسبیح کریں اور پرندوں کو بھی جو جمع ہوتے ہیں، حضرت داؤدؑ کے ساتھ۔ تو فرمایا، دو وقت کا ذکر تو قرآن مجید سے ثابت ہے کہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ دو وقت ذکر میں شامل ہوا کریں، ذکر کیا کریں۔ دوسرا اجتماعی ذکر کا بھی فائدہ بتایا کہ اس میں ذاکرین کے انوار کا عکس ایک دوسرے پر پڑتا ہے جس سے نحوست دور ہوتی ہے، قلب میں انبساط پیدا ہوتا ہے ہمت قوی ہوتی ہے اور اجتماعی ذکر سے جو تاثیر پیدا ہوتی ہے وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایسی کیفیت ہے جسے حاصل کر کے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دوسری آیت ہے۔

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ... (الاعراف:۲۰۵)

”اپنے پروردگار کا ذکر کر اپنے دل میں، عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے بغیر آواز بلند کیے، صبح شام اور کبھی بھی غافلوں میں شامل نہ ہو“۔ اس آیت میں ذکرِ قلبی کا حکم ہے کیونکہ خوف کا تعلق دل سے ہے زبان سے نہیں۔ یہ عاجزی اور خوف دل کے فعل ہیں، زبان کے نہیں۔ تو پھر ذکر بھی دل کا ہوگا، قلبی ہوگا۔ دوم یہ کہ صبح شام ذکر کرنے کا حکم ہے۔ آخری بات یہ نکلی کہ جو شخص اس طرح ذکر نہیں کرتا۔ وہ اللہ سے غافل ہے اور ظاہر ہے اللہ سے غافل ہوجانے سے بڑھ کر اور محرومی کیا ہوسکتی ہے۔ اس غفلت سے دین میں جو نقص پیدا ہوتا ہے اس میں کلام کی گنجائش کہاں ہے؟

تیسری آیت کریمہ ہے: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ ...... الخ (الکہف:۲۸)

یعنی ”اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھیے جو صبح شام اپنے پروردگار کا ذکر کرتے ہیں اس کو پکارتے ہیں“۔

چوتھی آیت کریمہ ہے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:۵۲)

”اور ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیے جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں“۔

دوام ذکر کا حکم تو ہے لیکن وقت کی خاص تاکید ہے کہ دونوں وقت ضرور ذکر کیا جائے۔ دن کی ابتدا ذکر سے ہو اور

Scanned with CamScanner

رات کی ابتداذکر سے ہو۔اجتماعی ذکر کے سلسلے میں صحیح حدیث موجود ہے......

لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُونَ اللهَ إِلَّا حَفَّتْ بِهِمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ...الخ

اس حدیث میں اجتماعی ذکر کا ثبوت موجود ہے پھر اس نعمت کا ذکر ہے کہ اس مجلس کو ملائکہ گھیر لیتے ہیں، رحمتِ باری اور سکونِ قلبی نازل ہوتا ہے یہاں تک کہ اس مجلس میں بیٹھنے والا بھی بد بخت نہیں رہ سکتا۔ پھر صحیح حدیث میں موجود ہے کہ ملائکہ کی ایک جماعت حلقۂ ذکر کی تلاش میں پھرتی رہتی ہے جہاں کہیں کوئی مجلسِ ذکر پاتے ہیں دوسرے فرشتوں کو بتاتے ہیں اور مجلس میں بیٹھ جاتے ہیں۔مختصر یہ کہ ذکر اللہ کا حکم ہونا اور صبح وشام پابندی سے ذکر کرنا یہ قرآن کے حکم سے ثابت ہے۔

دوسرا سوال:

کیا نجاتِ اخروی کے لیے اور دیگر تمام کمالات کے حصول کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کافی نہیں کہ مزید اذکار و اشغال بایں قیودات وتخصیصات اختیار کیے جائیں جب کہ انسان عامل بالکتاب والسنت ہے۔

الجواب: ذکرِ کثیر جو تمام اوقات کو شامل ہے اور صبح شام ذکر کرنے کا مامور من اللہ ہونا نصوصِ قرآنی اور حدیثِ نبویؐ سے ثابت ہے۔جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے تو یہ ذکر کرنا بھی عمل بالکتاب وسنت ہے۔یعنی آپ کہتے ہیں کہ قرآن اور سنت پر عمل کرنا کافی نہیں کہ ہم مشائخ کے ساتھ ذکر کرتے پھریں تو اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا کہ ذکر کرنا بھی تو قرآن اور سنت سے ثابت ہے۔اگر نہیں کریں گے تو قرآن اور سنت پر مکمل عمل تو نہ ہوسکا، پوری اطاعت تو نہ ہوسکی۔جیسا کہ حدیث جبرائیلؑ سے ظاہر ہے کہ عقائد (ایمان) اور اعمال (اسلام) کے علاوہ بھی دین کا ایک حصہ ہے جسے پورا کرنا اور اس فرض کو بجالانا ضروری ہے، جسے احسان کہا گیا ہے، اسی کو تصوف کہتے ہیں۔تو معلوم ہوا کہ جب تک صبح شام ذکرِ کثیر اور ذکرِ دوام کا اہتمام نہ کیا جائے تو قرآن اور سنت پر پوری طرح سے عمل ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کا حکم بھی قرآن اور سنت میں موجود ہے۔

تیسرا سوال:

کیا علمِ سلوک وتصوف جزوِ دین ہے:

الجواب: فرمایا، اس کا جواب پہلے سوال کے جواب میں گزر چکا ہے۔

چوتھا سوال:

چوتھا سوال ہے کہ اگر یہ شریعت سے ثابت ہے تو پھر اس کے لیے مرشد کی کیا ضرورت ہے۔قرآن وسنت سے یا تصوف کی کتابوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

الجواب: اعلیٰ حضرتؒ جواب میں فرماتے ہیں کہ کوئی علم یا فن کسی استاد کی شاگردی اختیار کیے بغیر نہیں سیکھا جاسکتا۔کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کا صحیح فہم حاصل کرنا ماہر اور کامل استاد کے تعلیم دینے پر موقوف ہے۔محض رسالے، کتابیں پڑھتے رہیں تو اس سے سمجھ نہیں آتی جب تک باقاعدہ کسی استاد سے یہ حاصل نہ کریں۔

Scanned with CamScanner

پھر اس کلیہ میں تصوف کو مستثنیٰ کیوں کیا جائے، اس کے سیکھنے کے لیے مرشدِ کامل کی ضرورت کا انکار کیوں کیا جائے جب کہ وہی فن سکھانے کی مہارت اور اہلیت رکھتا ہے۔ کتبِ تصوف سے نشانِ راہ تو مل سکتا ہے، منزل تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ کیفیات، مراقبات یا درجات کتابوں سے سیکھنے کی چیز نہیں، کیفیات تو سینہ بہ سینہ دلوں سے دلوں کو چلتی ہیں۔ سینۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ کو ملیں، صحابہؓ سے تابعینؒ کو اور تابعینؒ سے تبع تابعینؒ کو ملیں۔ ان کو لکھا پڑھا جا ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ الفاظ میں نہیں آتیں، ان کے لیے کوئی لفظ بنا ہی نہیں ہے۔ اب عام کیفیات ہی کو لے لیں ایک آدمی کی آپ بھوک پر لکھ دیتے ہیں کہ بھوک لگے تو یہ محسوس ہوتا ہے، بھوک لگے تو وہ محسوس ہوتا ہے۔ اسے آپ مہینوں پڑھاتے رہیں اسے تب اتنا پتا نہیں چلے گا لیکن اسے دو دن آپ بھوکا رکھیں تو اسے صحیح سمجھ آجائے گی کہ بھوک لگے، کھانا نہ ملے تو کیا ہوتا ہے؟ ہم غصے پر تقریر کرتے رہیں کہ غصے میں آدمی یہ محسوس کرتا ہے، غصے میں وہ محسوس کرتا ہے تو ہم نہیں سمجھا پائیں گے۔ کسی کو غصہ دلا دیں تو اسے سمجھ آجائے گی کہ غصہ میں کیا محسوس ہوتا ہے۔ یہ مادی کیفیات بیان نہیں کی جاسکتیں تو روحانی کیفیات کیسے بیان ہوں گی، یہ تو تب سمجھ میں آئیں گی جب کوئی حاصل کرے گا، سیکھے گا، پائے گا۔ کتابوں سے یا لکھنے پڑھنے سے ان کی سمجھ نہیں آتی۔ یہ کمالات شیخ کے سینے سے حاصل ہوتے ہیں، شیخ کے باطن اور اس کے روح سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس نے ولایت اور معرفت کا عملی نمونہ دیکھا ہی نہیں وہ عارف کیسے بنے گا۔ ہاں! ضرورت اس بات کی ہے کہ شیخ کامل ہو، دل کا اندھا نہ ہو، قوی القلب ہو جس کے قلب کے انوار اتنے قوی ہوں کہ سالک کی روح اور اس کے باطن کو اپنی طرف کھینچ سکے یعنی شیخ میں دو صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک تو خود اس کا دل روشن ہو۔ ویسے ہی گدی نشینی کے طور پر یا وراثت کے طور پر یا جھوٹ موٹ کے چغے پہن کر شیخ نہ بنا ہو بلکہ واقعی اس کا دل روشن ہو۔ دوسرا یہ کہ بے شمار ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس فن سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن ان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ دوسرے میں منتقل کر سکیں جیسے ایک آدمی پڑھنا لکھنا تو جانتا ہے لیکن سارے لکھنے پڑھنے والے تو دوسرے کو پڑھا نہیں سکتے۔ استاد ہونے کی ایک الگ صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی بہت سی باتیں جانتا ہے، عالم ہے، مکمل پڑھا ہے لیکن اسے تقریر کرنے کو کہو تو نہیں کر سکے گا کیونکہ اس میں بیان کرنے کی اہلیت ہی نہیں، ہاں بچوں کو پڑھانے کے لیے کہو تو ساری کتابیں پڑھا لیتا ہے۔ شیخ کے لیے بھی دو باتیں ضروری ہیں؛ اول یہ کہ وہ حاملِ کیفیات ہو اور دوسری بات یہ کہ اتنی قوت ہو کہ آگے تقسیم بھی کر سکے۔

پانچواں چھٹا اور ساتواں سوال:

یہ تینوں ایک ہی نوعیت کے سوال ہیں کیونکہ ان میں ایک ہی قسم کی بات کہی گئی ہے کہ بعض سرے سے سماع موتی کا انکار کرتے ہیں جب حال یہ ہے تو اہلِ قبور سے فیض حاصل کرنا کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا روح پر موت طاری نہیں ہوتی؟ یا کیا روح کے لیے بھی روح ہے جبکہ حیات کا موقوف علیہ ہی روح ہے؟

الجواب: ان تینوں سوالوں کا جواب اکٹھا دے دیا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ کے ارواح اور ان کی قبور سے فیض حاصل کرنے پر پوری اہلِ سنت والجماعت متفق ہے۔ اس کے متعلق سوال کرنا ہی اہلِ سنت کے مذہب سے ناواقفیت کی دلیل ہے یعنی کسی عالم کی طرف یہ سوال کیے جانے سے پتا چلتا ہے کہ اسے مذہب اہلِ سنت والجماعت کی خبر نہیں۔ رہا بُعد الدارین کا اشکال، دار کہتے ہیں گھر کو اور دارین دو جہان یعنی آدمی اس دنیا میں ہے اور روح برزخ میں ہے۔ مراد یہ کہ دو جہانوں کا فاصلہ ہے۔ وہ ایک جہان میں اور یہ دوسرے عالم میں۔ تو فرمایا کہ یہ دوری (بُعد) جسم کے لیے ہے، روح کے لیے نہیں کہ ایک کا جسم اس دنیا میں ہے اور دوسرے کا گل سڑ گیا لیکن روح کے لیے یہ بات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ معراج شریف کا واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کیا آپ نے معراج شریف کی احادیث نہیں دیکھیں کہ ان ارواح کو حضور ﷺ نے دیکھا اور انبیاؑ کی ارواح سے کلام فرمایا۔ جن روحوں کو عذاب ہو رہا تھا ان پر عذاب ہوتے ہوئے دیکھا۔ انبیاؑ کی امامت بھی کرائی، ان سے کلام ہوئی حالانکہ وہ برزخ میں تھے اور حضور ﷺ دنیا میں تھے۔ گو اس میں محدثین کا اختلاف ہے کہ مسجدِ اقصیٰ میں انبیاؑ کی ارواح حاضر ہوئیں یا روح مع الجسم۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ انبیاؑ روح مع الجسم کے تشریف لائے تھے کیونکہ صرف روح کو حضور ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھانے کا تو کوئی مقصد نہیں اور جسم بغیر روح کے نماز کیسے پڑھے گا۔ قرآن میں اقتدائے نبوی ﷺ کا حکم تھا۔ تمام انبیاؑ کے لیے روزِ ازل اللہ نے سب سے عہد بھی لیا تھا تو انبیاؑ سے اس عہد کی تکمیل کرائی گئی کہ حضور ﷺ کی اقتداء میں انہوں نے دو رکعت ادا کی۔ تو یہ کہنا کہ وہاں صرف ارواح تھیں تو بھی مقصد پورا نہیں ہوتا اور ارواح نہیں صرف اجسادِ مبارک تھے تو جسم بغیر روح کے کیسے نماز پڑھ سکتا ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاؑ زندہ تشریف لائے اپنی روح اور جسم کے ساتھ۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ صرف روحیں تشریف لائی تھیں۔ اب دیکھیں روح سے فیض کا یہ واقعہ کہ نمازیں شروع میں پچاس فرض ہوئی تھیں، موسیٰؑ حضور ﷺ کو مشورہ دیتے رہے، حضور ﷺ عرض کرتے رہے تو پچاس کی پانچ رہ گئیں۔ کتنا فیض ہوا کہ نمازیں پانچ ادا کرو اور ثواب پچاس کا لو۔ کیا اس کے بعد بھی روح سے فیض لینے میں شبہ رہ سکتا ہے؟ کیا یہ روح سے فیض نہیں ہے؟ رہی یہ بات کہ سالک روح کو دیکھتا کیسے ہے، کلام کیونکر ہوتی ہے، فیض کس طرح ہوتا ہے، سوال وجواب کیسے ہوتے ہیں، روح کی حیات کس طرح کی ہے؟ تو یہ چیزیں بتائی نہیں جا سکتیں البتہ سیکھی اور سکھائی جا سکتی ہیں۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں تصوف کو جزوِ دین اور روحِ دین سمجھتا ہوں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ جسے سلوک سیکھنا ہو بندہ کے پاس ان شرائط کے ساتھ رہے جو میں پیش کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دکھا دوں گا کہ روح سے فیض کیسے اخذ کیا جاتا ہے۔ وہ شخص روح سے کلام کرے گا، قبر کے عذاب وانعام کو دیکھ لے گا۔ انبیاؑ کی روحوں سے ملاقات کرے گا۔ حضور ﷺ کے دستِ مبارک پر روحانی بیعت کرا دوں گا بشرطیکہ وہ شخص متبع سنت ہو، خلوص لے کر آئے۔ پھر سماعِ موتیٰ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ گو دلائل سمعیہ بھی سماع کے موید ہیں۔ دلائل سمعیہ یعنی جو دلائل زبانی دیئے جاتے ہیں، کانوں سے سنے جاتے ہیں وہ بھی سماعِ موتیٰ کے حق میں ہیں۔ ان کا انکار صرف جاہل اور ضدی ہی کر سکتا ہے۔ حیاتِ روح کی حقیقت یہ ہے کہ روح کی پیدائش چونکہ عالمِ امر سے ہے اور روح

Scanned with CamScanner

کی حیات کا سبب اللہ کا نور ہے۔ جس طرح روح، بدن میں ہو تو بدن زندہ، حرکت کرتا ہے۔ اسی طرح نور روح میں ہو تو روح زندہ رہتی ہے۔ جس طرح روح، بدن کی حیات ہے اسی طرح اللہ کا نور روح کی حیات ہے۔ کفر کرنے سے، برائی کرنے سے یا غفلت سے اگر وہ نور نفی ہو جائے تو ظلمت آ جاتی ہے اور روح کو مردہ شمار کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ روح کے بدن سے جدا ہونے سے تصرف و تدبر کا تعلق بدن سے ختم ہو جاتا ہے اس جدائی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ موت کیا ہے؟ روح کا تعلق تصرف و تدبر کا تھا جس سے بدن حرکت کرتا تھا، بات کرتا تھا، دیکھتا تھا، کام کاج کرتا تھا وہ تعلق روح کا ختم ہو گیا، بدن بے حس ہو گیا، اسے موت کہتے ہیں۔ روح کے لیے فنا نہیں، یہ ہمیشہ قائم رہنے کے لیے ہے۔

یہ آیت كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ... حضرتؒ نے خط میں پیش کی تھی کہ اللہ کا حکم ہے کہ ہر چیز کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑے گا تو اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا اس آیت کی حقیقت سمجھ لیں۔ قانون ہے کہ ذائق مذوق کے بعد زندہ رہتا ہے یعنی جیسے انسان ذائق ہے روٹی مذوق، انسان چکھنے والا ہے اور روٹی وہ چیز ہے جسے چکھا گیا۔ آپ کہتے ہیں کہ فلاں نے یہ روٹی چکھی تو جو روٹی اس نے منہ میں ڈالی وہ تو فنا ہو گئی لیکن چکھنے والا باقی ہے، تب اس نے چکھی۔ دونوں مر گئے تو پھر چکھی کس نے، چکھائی کس نے؟ جس طرح انسان ذائق ہے جس نے روٹی چکھی اسی طرح روح ذائق ہے اور موت مذوق ہے یعنی روح ذائقہ چکھنے والا ہے اور موت وہ چیز ہے جس کا ذائقہ چکھا گیا۔ لہٰذا اس آیت سے مراد ہے کہ نفس موت کا مزہ چکھے گا۔ اس پر موت وارد ہو جائے گی لیکن نفس باقی رہے گا تو چکھے گا۔ اس لیے موت کے بعد روح زندہ رہتا ہے۔ امام اعظمؒ کے بارے جو غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہ سماع موتی کے قائل نہیں تھے یہ غلط ہے۔ 'عرف شذی' ص ۳۸۶ پر ہے کہ "لوگوں کو زبانوں پر یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سماع موتی کے قائل نہیں"۔ ملا علی قاری نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ "امام صاحبؒ کے متعلق یہ مشہور ہے، اس کی کوئی سند نہیں، یہ بالکل بے اصل ہے۔"

اور اہل سنت و الجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ میت کو عالمِ برزخ میں دنیا کے حالات کا علم ہوتا ہے۔

عرف شذی، صفحہ ۳۸۷ کی عبارت ہے، شرح مقاصد میں ہے کہ میت کو علم ہونا اجماعی عقیدہ ہے اور ظاہر ہے کہ علم بغیر حیات کے محال ہے یعنی میت یا اس کی روح کو دنیوی حالات کا علم ہوتا ہے اور علم بغیر حیات کے تو ممکن نہیں۔ روح اگر مر گئی ہے تو پھر علم کیسے حاصل کرتی ہے؟ اس کا مطلب روح کی حیات ہے۔ عرف شذی، صفحہ ۳۸۷ پر ہے۔ محققین کا مذہب یہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سماع موتی کے منکر نہیں اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی 'لمعات' جلد ۳، صفحہ ۴۰۱ پر فرماتے ہیں:

> "کتاب و سنت سے اس چیز کی بڑی واضح دلیل ملتی ہے کہ مرنے والے کی روح کو دنیا کے حالات کا علم ہوتا رہتا ہے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ جاہل ہے، وہ دینی اخبار کا منکر ہے اور مشائخ نے فرمایا ہے کہ جو اس کا انکار کرتا ہے وہ ایسا اعتقاد رکھتا ہے کہ حقیقتاً نبوت پر ایمان نہیں رکھتا"۔

معلوم ہوا کہ روح زندہ ہے۔ جو کمالات اسے دنیا میں حاصل ہوتے ہیں، جسمانی موت کے بعد روح سے چھین نہیں لیے جاتے۔ جو علم اس نے دنیا میں حاصل کیا تھا، برزخ میں اس سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ حاصل کرنے

Scanned with CamScanner

والا برزخ میں روح کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی قوت رکھتا ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو نمازوں کی تعداد میں کمی کرنے کی درخواست کرنے والے اور کم کرانے والے کی قوت تھی یعنی جس نے روح سے فیض حاصل کرنا ہے اس میں روح کے ساتھ رابطہ کرنے، کلام کرنے، فیض حاصل کرنے کی قوت ہو، تب ہوگا۔

آٹھواں سوال:

فنافی اللہ، فنافی الرسول ﷺ، بقاء باللہ اور مراقبات کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟

الجواب: فنافی الرسول ﷺ، فنافی اللہ، بقاباللہ، سلوک کے وہ منازل ہیں کہ ہزاروں اللہ کے بندے ان کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ مجاہدے، ریاضتیں کرتے رہے، یہی آرزو لے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان منازل کے حصول کے لیے سچی تڑپ انسان کی سعادت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ مگر یہ منازل صرف زبانی اور اوراد وظائف سے حاصل نہیں ہوتے، یہ قلب اور روح کا معاملہ ہے۔ صرف ذکرِ لسانی سے تصفیۂ قلب اور تزکیۂ باطن نہیں ہوتا بلکہ ان منازل کے حصول کے لیے دوسری شرائط ہیں۔ سب سے پہلے اصلاحِ قلب کی ضرورت ہے اور اس کی صورت ذکرِ قلبی کی کثرت ہے۔ اتباعِ شریعت اور اتباعِ سنت کا اہتمام کیا جائے۔ اصلاحِ قلب ایسا کمال ہے جو شیخِ کامل کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

مولوی، مولائے روم نہ بن سکا جب تک شمس تبریزی کا غلام نہ ہوا

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے

"یعنی مٹی میں سے ایسی چیز پیدا کر جو سونا بنا دینے والی ہو۔"

بوسہ زن بر آستانِ کاملے

"کسی کامل کے دروازے پر بوسہ دے، کسی کامل کی شاگردی اختیار کر تو مٹی سے سونا بننے کی قوت حاصل کرے گا۔"

ہست محبوبے نہاں اندر دلت

"محبوب تو تیرے دل میں بیٹھا ہے۔"

چشم گر داری بیا نمائمت

"اگر تیری آنکھ کھل جائے تو آمیں تجھے بتادوں کہ وہ تیرے دل میں موجود ہے۔"

اگر شیخ کامل مل جائے تو ضروری ہے کہ سنت کا اہتمام لازمی طور پر کیا جائے۔ یہی مجاہدہ ہوگا۔ تب شیخ سے فیض مل سکے گا۔

Scanned with CamScanner

آگے حضرت سعدیؒ کا شعر ہے:

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پے مصطفیٰ

''اے سعدی! یہ محالات میں سے ہے کہ راہِ صفا کو حضور ﷺ کی غلامی کے بغیر طے کیا جا سکے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔''

شیخ کامل اس راہ پر اس ترتیب سے چلاتا ہے کہ سب سے پہلے لطائف کراتا ہے۔ جب وہ منور ہو جائیں تو مراقبۂ احدیت کراتا ہے، جب یہ رابطہ خوب مضبوط ہو جائے تو شیخ اپنی روحانی قوت سے مراقبۂ معیت، پھر اقربیت کراتا ہے۔ پھر دوائرِ ثلاثہ، پھر مراقبۂ اسمِ ظاہر و باطن، پھر مراقبۂ عبودیت۔ شیخِ کامل یہ مراقبات عالمِ ملکوت سے گزار کر کراتا ہے۔ پھر مراقبۂ سیرِ کعبہ، پھر سیرِ صلوٰۃ پھر سیرِ قرآن اس کے بعد مراقبۂ فنافی الرسول ﷺ کراتا ہے اور دربارِ نبوی ﷺ میں حاضری ہوتی ہے۔ فنافی الرسول ﷺ کا مطلب ہے کہ آدمی حضورِ اکرم ﷺ کی محبت اور سیرت میں فنا ہو جائے۔ پھر شیخ توجہ روحانی سے فنافی اللہ اور بقاباللہ کا مراقبہ کراتا ہے۔ یہ ذکرِ لسانی سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ شیخِ کامل کی توجہ سے، ذکرِ قلبی کرنے سے یہ مقامات حاصل ہوتے ہیں۔

مراقبۂ عبودیت میں سالک خود کو ایسی جگہ پاتا ہے جہاں زمین و آسمان اور مافیہا، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، میدان، درخت، جھاڑیاں حتیٰ کہ ایک ایک تنکے کو سربسجود پاتا ہے۔

ہر نجم و شجر اللہ کے حضور سجدہ ریز سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ... کہہ رہا ہوتا ہے۔

کائنات کی ہر چیز کا تسبیح و تحمید کہنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

(ترجمہ): یعنی اللہ نے نباتات، جمادات ہر چیز کے مزاج میں یہ بات پیدا فرما دی ہے کہ وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ اس میں علامہ ابن تیمیہ نے اس آیت کی شرح کی ہے جس میں فرمایا کہ ''کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو''۔

اسی طرح انسانوں کے متعلق بھی تسبیح کے یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مخلوق دو قسم کی ہے، ذوی العقول اور غیر ذوی العقول۔ یعنی ایک وہ جنہیں عقل و خرد سے نوازا، ایک وہ مخلوق جس میں عقل و خرد نہیں، محض خواہشات طبعی ہیں، وہ ان کی پیروی کرتی ہے۔ عقل والی مخلوق وہ ہے جس کی خواہشات جب آتی ہیں تو وہ اس کا اچھا برا جانچتا ہے اور اچھے طریقے سے عمل کرتا ہے۔ مثلاً بیل یا گائے راستے میں گلی یا سڑک میں تو جہاں گوبر آئے گی وہ کر دے گی۔ یعنی ایک خواہش اس کے اندر پیدا ہوئی، اس نے کر دی۔ لیکن انسان ایسا نہیں کرے گا۔ اسے ضرورت محسوس ہوگی تو کہیں پردہ تلاش کرے گا۔ قرآن مجید میں کفار کے بارے ارشاد ہے: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ .... الخ (الاعراف:۱۷۹) جو شریعت پر عمل نہیں کرتے وہ جانوروں کی طرح ہیں یعنی انہوں نے اپنی عقل کو استعمال نہیں کیا۔ اگر عقل استعمال کرتے تو اسی بات پر پہنچتے جو شریعت نے

Scanned with CamScanner

بتائی ہے۔انسان صاحب خرد ہے، وہ اپنے طریقوں، سلیقوں، رویوں اور کردار سے اللہ کی معرفت کو پاتا ہے اور نباتات جمادات اور حیوانات جن میں عقل ہی نہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے تسبیح پر لگا دیا ہے۔ جب کسی سے تسبیح چھوٹتی ہے، فنا ہو جاتا ہے۔ ہمارے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں ایک مراقبۂ جمادات واشجار بھی ہے۔ میں یہ مراقبہ نہیں کرایا کرتا کیونکہ عام آدمی کے لیے نقصان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس مراقبہ میں پتھروں، درختوں، پانی اور ہوا کی بولی سکھائی جاتی ہے۔اور صوفی کامل ان غیر ذی روح چیزوں سے کلام کر سکتا ہے۔ان کی کلام سمجھ سکتا ہے۔مراقبۂ جمادات واشجار اگر کسی طالب کو کرایا جائے تو اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پتھر، گھاس، جڑی بوٹی، درخت، جانور وغیرہ کی بات سن بھی سکتا ہے، سمجھ بھی سکتا ہے۔ شروع شروع میں ہم، چار، پانچ ساتھی ہوا کرتے تھے۔اس وقت حضرتؒ ہمیں یہ سارے مراقبے کرایا کرتے تھے۔ایک فنا بقا تھا آگے فنا الفنا ہے۔ایک فنا فی الرسول ﷺ میں فنا در فنا ہے۔اسی طرح موت القبر کا مراقبہ ہے۔تو حضرتؒ کا فرمان تھا کہ یہ سارے مراقبات عام سب ساتھیوں کو نہ کرائے جائیں کہ ان میں دھوکہ لگنے کا امکان ہے اور غلطی لگ سکتی ہے۔جن لوگوں کو حاصل ہو چکے تھے ان میں ایک قاضی صاحبؒ تھے۔ہم حاجی محمد خانؒ کی بیٹھک میں حضرتؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے، بڑے مزے کی باتیں ہوتی تھیں۔ حاجی صاحب نے کہا کہ بھینس دودھ نہیں دے رہی۔ حضرتؒ نے قاضی صاحب سے کہا کہ قاضی جی! جاؤ بھینس کو دم کر آؤ۔ قاضی صاحب گئے اور جلدی جلدی آگئے۔ حضرتؒ نے فرمایا۔ کیا ہوا، جلدی کیوں آگئے؟ کہنے لگے میں نے دم نہیں کیا۔ حضرت! میں نے تو اس کے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے کہا، اس شخص کا کھاتی ہے، اتنا بھوسہ بھی کھا گئی اتنا چارہ بھی کھا گئی، اور اسے دودھ نہیں دے رہی تو اللہ کو کیا جواب دے گی؟ بھاگ اس لیے آیا ہوں کہ کہیں وہ مجھے نہ کہہ دے کہ تو اللہ کا کتنا کھاتا ہے اور شکر کتنا ادا کرتا ہے؟ حضرتؒ فرماتے ہیں میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ اب دودھ نکالو، اب کچھ نہیں کہے گی۔ آگے فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ انہیں یہ چیزیں دیر سے حاصل ہوتی ہیں بعض کو فوراً حاصل ہو جاتی ہیں۔ہم حضرتؒ کے ساتھ ہوتے تھے۔تو ایک صاحبزادہ صاحب تھے۔بھیرہ میں گدی نشین تھے۔حلقۂ ذکر میں داخل ہوئے۔شریف آدمی تھے۔حضرت نے انہیں تین چار دن ساتھ رکھا۔ ان کے لطائف بھی منور ہو گئے اور مراقبات ثلاثہ بھی ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ ہمیں سال ہونے کو آیا ہے ہمیں احدیت بھی نہیں ہوئی، یہ پرسوں آیا ہے اسے مراقبات ثلاثہ بھی ہو گئے۔تو دل میں حیرت تھی، ہم لوگ بولا نہیں کرتے تھے لیکن انسان ہے، سوچتا تو ہے۔سوچا یہ جا رہا تھا کہ کمی ہم ہی میں ہے ورنہ حضرت کی توجہ کا اثر تو یہ ہے کہ ابھی یہ پرسوں آیا اور اسے مراقبات ہو گئے۔اس نے اجازت چاہی کہ حضرت میں جانا چاہتا ہوں تو حضرتؒ نے فرمایا، بیٹھ جاؤ۔ میں نے بڑی محنت کی ہے تمہارے ساتھ پوری کوشش اور توجہ سے چاہا ہے کہ تمہیں یہ مراقبات ہو جائیں۔اس لیے کہ تم واپس جا کر یہ نہ کہو کہ وہاں تو تھا کچھ نہیں۔اب تمہیں تسلی ہو گئی ناں۔اب میرے پاس تب آنا جب حلال روزی کھانا شروع کرو۔یہ قبر کی آمدنی حرام ہے اور حرام کھانے والوں کو یہ چیزیں نصیب نہیں ہوتیں۔جس دن حلال روزی کا بندوبست ہو جائے اور قبر کی نذر و نیاز کھانا چھوڑ دو تو پھر میرے پاس آ جانا۔نہیں چھوڑو گے تو یہ جو کچھ دیا ہے ختم ہو جائے گا۔روزی تو انہوں نے نہ چھوڑی، سلسلہ ہی چھوڑ

Scanned with CamScanner

گئے۔تو اس طرح ہوتا ہے کسی کو مراقبات جلدی ہو جاتے ہیں کسی کو کچھ وقت لگتا ہے۔

یہاں حضرتؒ بھی یہی فرمارہے ہیں کہ انسانی طبائع کے اختلاف سے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔بعض سالک ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں سلوک میں منازل بالا نصیب ہیں حتیٰ کہ عالم امر اور عالم حیرت کے منازل بھی طے کر لیتے ہیں مگر انہیں مشاہدات نہیں ہوتے۔ یہ بھی اللہ کی شان ہے اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت پنہاں ہے۔بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں بالکل ابتدا میں مشاہدات کی نعمت نصیب ہو جاتی ہے۔ایسے لوگوں کو رویت اشکال کا مراقبہ بھی کرایا جاتا ہے۔اس مراقبہ میں روح کی اصل صورت جو مرنے کے بعد ہوگی، سامنے آجاتی ہے۔مادہ پرستی کے دور میں بہت کم ایسے آدمی ملتے ہیں جن کی روح انسانی شکل پر ہو۔نعوذ باللہ من ذالک۔ اکثر علما ایسی باتوں کا انکار کر دیتے ہیں، اس کی وجہ عدم علم ہے۔ایسے انکشافات بالخصوص کشفِ قبور کے متعلق شبہ کی گنجائش تو سائنس کی ایجادات نے چھوڑی ہی نہیں۔مثال کے طور پر ٹیلی ویژن اسٹیشن اور ریسیونگ سیٹ کے درمیان طویل مسافت کے باوجود آواز بھی سنائی دیتی ہے، تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

اسی طرح جمادات میں شعور کے موجود ہونے کا ثبوت قرآن وحدیث میں موجود ہے۔

قال اللہ تعالیٰ:

يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الحشر: ۲۴)

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ...
(بنی اسرائیل: ۴۴)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ... (الحج: ۱۸)

کیا تم نے نہیں دیکھا یہ کہ جو (مخلوق) آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ اللہ کے آگے سجدہ ریز ہے۔سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔انسان بھی سجدہ کرتے ہیں اور اکثر انسان ایسے ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے، یعنی انہیں سجدہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔بعض مفسرین کا قول ہے کہ سجدہ سے ولایت علی الصانع مراد ہے مگر یہ قول درست نہیں۔معلوم ہوتا ہے عامۃ الناس کے ساتھ کثیر کی قید نے اس تاویل کو اڑا دیا ہے کیونکہ صانع پر تو تمام جہان دلالت کرتا ہے۔یعنی انہوں نے کہا کہ یہ تو قدرت کی طرف سے ان پر مسلط ہے۔فرمایا، نہیں، انسان کی جب بات آتی ہے تو پھر نہیں، ہاں جمادات، نباتات میں اللہ نے فطرت رکھ دی ہے۔لیکن انسان میں یہ چیز فطری نہیں کیونکہ اللہ نے فرمایا اکثر انسان سجدہ کرتے ہیں اور اکثر ایسے بھی ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا؟ اس کا مطلب ہے یہ کام فطری طور پر نہیں کیا جاتا، یہ ارادی طور پر کرنا پڑتا ہے۔

كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ... سے ظاہر ہے کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو دال علی الصانع ہیں اور یہ بات اصولاً غلط ہے۔ایک

Scanned with CamScanner

حدیث ترمذی اور بخاری میں آئی ہے۔ حضرت سہلؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلم تلبیہ کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں کے تمام درخت ڈھیلے تک تلبیہ کہتے ہیں حتیٰ کہ مشرق سے مغرب تک تلبیہ کہتے ہیں۔ (تلبیہ کہتے ہیں لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ...) اہلِ کشف کا کہنا ہے کہ کائنات کی ہر چیز پتھر، درخت وغیرہ سے بات ہو سکتی ہے تو یہ حدیث ان کے اس قول کی دلیل ہے۔ ایک اور جگہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو حدِ حرم سے کنکریاں اٹھا کر حرم سے باہر لے جانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کنکریاں پکار پکار کر اسے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتی ہیں کہ ہمیں یہاں سے باہر نہ لے جاؤ۔ یہ حدیث بھی ایسے اہلِ کشف کی تصدیق کرتی ہے کہ کنکریوں میں شعور و ادراک ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث بخاری اور ترمذی میں آئی ہے۔ اُحد ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم احد سے محبت کرتے ہیں۔ اس حدیث میں محبت کا لفظ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ جمادات میں شعور اور حس موجود ہے۔ احد پہاڑ میں اتنی حس ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پہچانتا بھی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے۔ جمادات اور اشجار کو تسبیح و تہلیل، تحمید و تنزیہہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے، وہ اپنا مقصدِ تخلیق پورا کر رہے ہیں۔ انسان کو معرفتِ الٰہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، وہ اللہ سے غافل ہو گیا ہے۔ انسان اگر اپنا مقام پہچان لے قربِ الٰہی اور معرفتِ الٰہی کے حصول میں لگ جائے تو اس کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی بن جائے اور اس کا واحد ذریعہ ذکرِ الٰہی کی کثرت ہے۔ یہ خیال رہے کہ مشاہدات، مکالمات اور مکاشفات کا حاصل ہونا یا جمادات اور ارواح سے کلام کر لینا کمال کی چیز نہیں۔ اصل کمال قربِ الٰہی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اللہ کی اطاعت اور عبادات اس لیے صوفی کامل کے لیے ضروری ہیں کہ مشاہدات وغیرہ تمام چیزوں سے صرفِ نظر کرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود یعنی قربِ الٰہی کی طرف بڑھتا چلا جائے اور یہ مقصد شیخ کامل کی رہبری سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

Scanned with CamScanner

شجرہ مبارک سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

الٰہی بحرمت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

1 الٰہی بحرمت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

2 الٰہی بحرمت حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

3 الٰہی بحرمت حضرت داوٗد طائی رحمۃ اللہ علیہ

4 الٰہی بحرمت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

5 الٰہی بحرمت حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ

6 الٰہی بحرمت حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ

7 الٰہی بحرمت ابوایوب حضرت محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ

8 الٰہی بحرمت سلطان العارفین حضرت خواجہ اللہ دین مدنی رحمۃ اللہ علیہ

9 الٰہی بحرمت حضرت خواجہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ

10 الٰہی بحرمت قلزمِ فیوضات حضرت العلام مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

11 الٰہی بحرمت قاسمِ فیوضات حضرت امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ

12 الٰہی بحرمت ختم خواجگان خاتمہ من وخاتمہ
الشیخ حضرت امیر عبدالقدیر اعوان مدظلہٗ العالی بخیر گردان

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

شجرہ عالیہ کو زبانی یاد کرلیں اور روزانہ ذکر کے بعد اِسے دعا میں شامل کرلیا کریں

Scanned with CamScanner